رجسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰

مارچ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڑھ

مجلسِ ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی	صدر
(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی،	رکن
(۳) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی،	″
(۴) جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	″
(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی	مرتب
(۶) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے	شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن	حکمائے اسلام جلد اول
یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہبِ اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی بہ تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرونِ وسطیٰ کی پر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے،	دوسری صدی سے لیکر خاندانِ خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ سے مذہب کی تخریب و بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،
(از شاہ معین الدین احمد ندوی)	(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)
قیمت: ہے	قیمت: عہ

جلد [illegible] جنوری ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلس ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی	صدر
(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی،	رکن
(۳) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی،	"
(۴) جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	"
(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی	مرتب
(۶) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے	شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ کی پرفریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: ہے ر

حکمائے اسلام جلد اول

دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ سے مذہب کی تخریب و بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)

قیمت: عہ ر

جلد ۷۵ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۵۵ء عدد ۱

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۲ - ۴

مقالات

حضرت شیخ سماء الدین دہلویؒ — ڈاکٹر نذیر احمد ایم اے، پی ایچ ڈی علیگ، لکھنؤ یونیورسٹی — ۵ - ۲۱

گجراتی بادشاہوں کے سکے — مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی — ۲۲ - ۴۱

اردو شاعری اور سیاست — جناب کلب علی خان صاحب رامپوری — ۴۲ - ۵۴

تصحیح واستدراک

پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں — مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی مئو — ۵۵ - ۵۶

استفسار وجواب

قرآن کی جمع و ترتیب کے سلسلہ میں ایک سوال اور اسکا جواب — مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی — ۵۷ - ۶۳

آثار علمیہ وادبیہ

مکاتیب علامہ اقبالؒ بنام سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ — ۶۳ - ۶۴

ادبیات

آج کل — جناب سید اختر علی صاحب تلہری — ۶۴ - ۶۵

غزل — نواب زادہ سید شمس الحسن خان صاحب — ۶۵

" — جناب عارف عباسی — ۶۶

آئینۂ حیرت — جناب عبدالمجید صاحب حیرت شملوی — "

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۶۷ - ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

انگریزی حکومت پر یہ بڑا الزام تھا کہ اس کا بنایا ہوا نظام تعلیم خالص اس کے اغراض کے مطابق تھا، اس میں ہندستانیوں کی قومی و ملکی ضروریات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا، اس لئے اسی زمانہ سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی تھی، اور تعلیم کو قومی بنانے کا مطالبہ ہونے لگا تھا، ابتدائی بنیادی تعلیم کے مسئلہ میں قریب قریب اسی قسم کی صورتِ حال مسلمانوں کو درپیش ہے، انگریزوں کے زمانہ میں اعلیٰ تعلیم تو بلاشبہ حکومت کے مصالح کے مطابق تھی، مگر ابتدائی تعلیم تمامتر ہندستانیوں کے ہاتھوں میں تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ میں بھی یہ تعلیم مسلمانوں کے جذبات و خیالات سے بالکل خالی اور ہندوؤں کے تہذیبی رنگ و مذاق کی تھی، مگر لازمی نہ تھی، اس لئے مسلمان اس سے کم فائدہ اٹھاتے تھے، لیکن ایک حد تک اس کی تلافی اردو کے اسکولوں اور غیر سرکاری مکاتب اسلامیہ سے ہو جاتی تھی، مگر اب اردو تعلیم سے بالکل خارج کر دی گئی ہے، اور جن شرائط کے ساتھ اس کی تعلیم کی اجازت ہے، اس پر بھی عمل نہیں ہو رہا ہے، اس کے نصاب کی کتابیں محض نام کے لئے اردو کی ہیں، ان کی زبان نہایت خراب ہندی نما اور ان کے خیالات و مضامین تمامتر ہندو تہذیب و روایات پر مشتمل ہیں، مکاتب اسلامیہ کا پرانا نظام محض برائے نام رہ گیا ہے، اور بنیادی تعلیم تمامتر ہندی زبان اور ہندو کلچر کے رنگ میں رنگ دی گئی ہے جس میں اسلامی اثر کا کوئی شائبہ نہیں ہے، اس کا نصاب، طریقۂ تعلیم اور اساتذہ سب کے سب ہندو تہذیب کے ترجمان و مبلغ ہیں، اور یہ تعلیم لازمی بھی ہو گئی ہے، اور مسلمان بچے اس کو حاصل کرنے پر مجبور ہیں، ایسی حالت میں جو لڑکے اسی تعلیم پر رہ جائیں گے، ان کا انجام کیا ہوگا، اور ان کا اپنے مذہب اور اپنی تہذیب و روایات سے کیا علاقہ رہ جائے گا،

ہندوستان کی سیکولر اور جمہوری حکومت نے تمام فرقوں اور اقلیتوں کو اپنی مذہبی اور تہذیبی خصوصیات کو قائم رکھنے کا پورا حق دیا ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ان کی بنیادی تعلیم ان کی ملی ضروریات کے مطابق ہو، اس لئے یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں، بلکہ ہندوستان کی تمام اقلیتوں کا ہے، مگر دوسرے فرقوں کے لئے اس مسئلہ کا حل زیادہ مشکل نہیں ہے، لیکن مسلمانوں کے حالات نے اس کو ان کے لئے بہت دشوار بنا دیا ہے، ان حالات کے پیش نظر [illegible] اس

مسئلہ پر غور کرنے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لئے ۵ و ۶ جنوری کو بمبئی میں ایک آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن منعقد کر رہا ہے جس میں ہر طبقہ کے علماء و مفکرین ماہرین تعلیم اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو شرکت کی دعوت دی ہے، افسوس ہے کہ ہم خصوصی دعوت کے باوجود بعض مجبوریوں کی بنا پر اس اہم کنونشن کی شرکت سے محروم رہا،

ہندوستانی مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں، ایک مذہبی و ملی، دوسری قومی اور وطنی، اور ان پر ان دونوں کے حقوق و فرائض ہیں، اور وہ ان کو اسی وقت ادا کر سکتے ہیں جب ان کی مذہبی و قومی تعلیم میں توازن ہو، تاکہ وہ اپنی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کو بھی برقرار رکھ سکیں، اور ہندوستانی قومیت اور وطنیت سے بھی بیگانہ نہ ہوں، اور ملک و وطن کی محبت اور خدمت میں، ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہے، ایک مسلمان ملک کا اسی وقت سچا خادم بن سکتا ہے جب وہ اپنی دینی روح سے آشنا اور سچا مسلمان ہو، اس لئے کہ مذہب خود وطن کی محبت کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد میں انہی مسلمانوں کا زیادہ حصہ رہا ہے، جو مذہبی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے قومی و وطنی نقطۂ نظر سے بھی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ضروری ہے، اگرچہ اس کے لئے کسی عمر کی قید نہیں لیکن عقائد و خیالات کا نقش ابتدا ہی سے بیٹھتا ہے، اس لئے ابتدائی تعلیم ہی سے دینی تعلیم کی بنیاد پڑنا ضروری ہے، مگر سیکولر حکومت مذہبی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتی، اس لئے مسلمانوں کو خود اس کا نظام قائم کرنا ہوگا،

مگر یہ کام محض چند مقامات پر دینی مکاتب قائم کر دینے یا مذہبی نصاب تیار کر دینے سے انجام نہیں پا سکتا، بلکہ پورے ہندوستان میں اس کا مکمل نظام قائم کرنے کی ضرورت ہوگی، جو مسلمانوں کی اقتصادی حالت اور بے عملی کو دیکھتے ہوئے آسان نہیں ہے، لیکن اب اس کے بغیر چارہ کار نہیں ہے، اگر مسلمان اس تعلیم کا انتظام خود نہیں کرتے، اور اُن کے بچے صرف سرکاری مدارس تعلیم میں پڑھ جاتے ہیں، تو اُن کی آئندہ نسلیں محض نام کی مسلمان رہ جائیں گی، اور ان میں نام کے علاوہ ان کے مذہب و تہذیب کی کوئی نشانی باقی نہ رہ جائیگی، اس لئے کنونشن کی تجویزوں کے مطابق جمعیۃ العلماء کی نگرانی میں اس نظام کو بہر حال قائم کرنا ہے،

اتر پردیش میں حکومت کی تھوڑی سی توجہ اور امداد سے اس صوبہ میں اس کام میں آسانی ہو سکتی ہے، اس کے لئے کسی رعایت کی ضرورت نہیں بلکہ مسلمانوں کو جو تعلیمی حقوق حاصل ہیں ان کو عملاً پورا کیا جائے، مثلاً اگر مسلمان اردو کی تعلیم کے شرائط کے مطابق اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے، اور اُن کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، اس کے نصاب کی معیاری کتابیں مہیا کی جائیں، اسلامی مکاتب کا پرائیویٹ انتظام جسکو رفتہ رفتہ ختم کیا جا رہا ہے، باقی رکھا جائے، اور اسکو ترقی دیا جائے

اور میونسپلٹیوں کو ان کے قائم رکھنے پر مجبور کیا جائے اگر مصارف کی زیادتی کا عذر ہو تو اس مد کی رقم میں اضافہ کیا جائے جب تعلیم کے تمام شعبوں میں توسیع و ترقی اور اُن کے مصارف میں اضافہ ہو رہا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی مکاتب کے مصارف میں تخفیف کیجائے یا ان کو سرے سے ختم کر دیا جائے، اصولاً اس میں بھی اضافہ ہونا چاہیئے، ان مکاتب میں مسلمانوں کی مخصوص تعلیم کے ساتھ دوسرے ضروری مضامین بھی بڑھائے جائیں، اور اُن کا درجہ بیسک سکولوں کے برابر مانا جائے تاکہ مسلمان بچوں کو آیندہ تعلیم میں دشواری نہ ہو اگر حکومت ان مطالبات کو جو مسلمانوں کا تسلیم شدہ حق ہے عملاً مان لے، تو اس صوبہ میں مسلمانوں کی بنیادی تعلیم کا مسئلہ نسبتہً آسان ہو جائیگا مگر اسکی امید نہیں ہے، اگر حکومت کی نیت نیک ہوتی، تو یہ مشکلات ہی نہ پیش آتیں، اسلئے مسلمانوں کو یہ کام اپنی قوت و ہمت کے بھروسہ پر کرنا ہے ورنہ ان کی مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے ساتھ ان کا ملی وجود باقی نہیں رہ سکتا،

سر شانتی سروپ بھٹناگر کی موت ہندوستان کا بڑا قومی حادثہ اور علمی نقصان ہے اُکی موت سے ہندوستان ایک بڑے ماہر سائنس دان سے محروم ہو گیا، وہ سائنس کے عالم ہونے کیساتھ اردو کے خوش مذاق ادیب شاعر بھی تھے، جن کا اجتماع کم ہوتا ہے، یہ ذوق ان کو اپنے نامور نانا سے ورثہ میں ملا تھا، وہ غالب کے مشہور و محبوب شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے نواسے تھے جن کو غالب محبت میں مرزا تفتہ کہا کرتے تھے، مکاتیبِ غالب میں ان کے نام کے بہت سے خطوط ہیں، سر شانتی اردو شاعری کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے، اُن کے کلام کا مجموعہ لاجونتی کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے اردو زبان سے ان کو بڑی محبت تھی، اور غالباً وہ جامعہ اردو علی گڈھ کے عہدہ دار بھی تھے، اب ایسے خوش مذاق صاحبِ علم مشکل سے پیدا ہوں گے،

یہ خوشی کا مقام ہے کہ لکھنؤ میں انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ قائم ہو گئی، پنڈت کشن پرشاد کول اس کے صدر حیات اللہ انصاری جنرل سکریٹری، پروفیسر احتشام حسین خزانچی اور کئی نائب صدر اور جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، اس صوبہ میں اردو کا ملی کام اسی جماعت کو کرنا ہے، اسی نے اردو علاقائی زبان جیسی تحریک کو کامیاب بنایا، اور اب اسکولوں میں اردو کی تعلیم کو عملاً جاری کرانے کی کوشش کر رہی ہے، اور آیندہ بھی اس قسم کے کام یہی جماعت انجام دیگی، اسلئے لکھنؤ میں صوبائی شاخ کے قیام کی بڑی ضرورت تھی، اس سے اس صوبہ میں اردو کے کاموں کو بڑی مدد ملے گی،

مقالات

حضرت شیخ سماء الدین دہلوی

از ڈاکٹر نذیر احمد ایم، اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ،

شیخ سماء الدین[1] کنبو ملتانی ثم دہلوی، نویں صدی ہجری کے اکابر مشائخ میں تھے، جو عوام سے بڑھ کر خواص میں اس حد تک مقبول تھے کہ سلاطین وقت اُن کے آستانے کی خاک کو طرۂ افتخار سمجھتے تھے،

پیدائش سرزمین ملتان کو شیخ سماء الدین کی ولادت کا شرف حاصل تھا، مگر بدقسمتی سے اُن کی پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی، البتہ دوسرے اور واقعات کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۸۰۰ ہجری کے قریب متولد ہوئے ہوں گے حسب ذیل قرائن اس قیاس کے مؤید ہیں،

(۱) خزینۃ الاصفیاء[2] میں شیخ کبیر الدین اسماعیل کی وفات کا ۸۲۵ ہجری درج ہے، چونکہ شیخ سماء الدین نے شیخ کبیر ہی سے خرقۂ خلافت پایا تھا، اس لئے اُن کی وفات کے وقت اول الذکر کی عمر کسی حال میں ۲۵-۳۰ سے کم نہ ہوگی،

(۲) شیخ سماء الدین اپنے سفر گجرات کے موقع پر ۹۰[3] سال کے تھے، وہاں سے واپسی اور ورود دہلی کے درمیان کم از کم دو اور[4] مقامات پر قیام کر چکے تھے، ایک روایت میں ہے، دوسرے بیانات میں، بیانات میں شیخ اس

۱؎ چند جگہ یہ نام بہاء الدین ملتا ہے، مثلاً فرشتہ ج ۱ ص ۲۰۱، اور طبقات اکبری کا ایک نسخہ، مگر یہ غلط ہے۔ ۲؎ ج ۲ ص ۶۵ "شاہ دین اکبر کبیر" تاریخ ہے، مگر یہ تاریخ شبہ سے خالی نہیں ہے۔ ۳؎ سیر العارفین نسخۂ مملوکہ ڈاکٹر ہاشمی ورق ۱۲۵ ا ۴؎ ورق ۱۲۳ ا، ۱۲۵ ب،

وقت مقیم تھے، جب وہاں کا حاکم احمد جلوانی[1] تھا، جو سلطان بہلول لودی سے الگ ہو کر سلطان حسین شرقی سے مل گیا تھا، تاریخوں سے پتہ چلتا ہے[2] کہ سلطان حسین اپنے بھائی محمود کو ہٹا کر ۸۶۵ھ۔۸۶۶ھ میں تخت نشین ہوگیا، اور بہلول سے صلح کرلی، چنانچہ قطب خان لودی[3] کو جو محمود شرقی کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا، سات سال کی قید کے بعد رہا کیا، اس اعتبار سے قطب کی رہائی ۸۶۶ھ میں ہوئی، کچھ مدت بعد حسین شرقی نے پھر بہلول پر چڑھائی کی، مگر جلد ہی صلح ہوگئی، یہ مدت خاصی طویل ہوگی، اس لئے قیاس ہے کہ سلطان حسین کے عہد کو ۸۸۰ھ ہجری کے قریب کا تصور کرنا چاہیے، صلح کی میعاد تین سال کی تھی، اسی درمیان میں احمد جلوانی بھی سلطان حسین سے ملنے کی فکر کر رہا تھا، اس سے شیخ سماء الدین کا قیام بیانہ[4] ۸۸۳ھ ہجری کے قبل پوری طرح ثابت ہے، اس طرح اگر شیخ کی پیدائش ۸۰۰ھ ہجری سے کچھ قبل تسلیم کرلی جائے تو ان کا قیام گجرات ۸۵۰ھ کے قبل ثابت ہوجائے، اور گجرات، مخضبور اور بیانے کے قیام کی مدت تقریباً ۵۔۹ سال کی ہوجائے، جو قرین قیاس ہے،

(۳) شیخ سماء الدین نے حضرت مخدوم جہانیان کے بھائی اور اپنے والد کے پیر و مرشد شیخ راجو قتال کو نہ صرف دیکھا تھا، بلکہ ان سے کسی[5] حد تک مربوط بھی رہ چکے تھے، اگرچہ شیخ راجو کے انتقال کی صحیح[6] تاریخ

---

[1] سیر العارفین میں اور ایک طبقات اکبری میں (ج ۱ ص ۳۰۵ ترجمہ) سلطان احمد جلوانی درج ہے، مگر اول الذکر میں بھی ایک جگہ صرف احمد ہے، سلطان نام کا جز معلوم نہیں ہوتا [2] طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۰۴، فرشتہ جلد ۱ ص ۱۷۶، بدایونی ج ۱ ص ۳۰۰ [3] طبقات ج ۱ ص ۳۰۴ [4] بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۵۷ھ کے قریب دہلی میں موجود تھے۔ [5] ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۲۱ ب [6] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۴۰۶ بحوالہ مدارج النبوۃ کے حوالہ سے وفات کی تاریخ ۲۰ جمادی الآخر ۸۳۴ھ ہجری اور مبارک شاہ ابن خضر خان کا عہد ۲۳ رجب ۸۳۷ھ میں ختم ہوجاتا ہے) صاحب خزینۃ الاصفیا نے "صدر الدین محبوب" اور "ہادی دین" سے دو تاریخیں بھی لکھی ہیں، مگر یہ تاریخ مشکوک ہے، کیونکہ (۱) اسی تذکرہ میں شیخ کبیر الدین اسمٰعیل کی تاریخ

معلوم نہیں مگر اخبار الاخیار میں انکا ذکر دو بزرگوں کے درمیان ہے جن میں پہلے یعنی شیخ نور الدین کی وفات ۹۱۳ھ میں اور دوسرے یعنی شیخ اختیار الدین عمر کی ۹۰۵ھ میں ہوئی، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ راجو کا انتقال ان ہی ایام میں یعنی ۹۱۳ھ کے اندر ہوا ہوگا، ۹۱۳ھ ہجری کے قریب انتقال پانے والے شیخ سے ارتباط رکھنے والے کی پیدایش ۸۰۰ھ سے قبل فرض کرنا پڑے گی،

(۴) اخبار الاخیار[۱] سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے طویل عمر پائی تھی، اگرچہ طویل عمر کا فقرہ مبہم ہے، پھر بھی قیاس ہوتا ہو کہ وہ سو سال سے کم نہ رہے ہوں گے، چونکہ سنہ وفات بالاتفاق ۹۰۱ھ ہجری ہے، اسلئے ۸۰۰ھ کے کچھ قبل تاریخ پیدایش متعین ہو سکتی ہو،

والد اور بچپن کے حالات سیر العارفین[۲] میں ایک واقعہ کے ضمن میں شیخ سماء الدین کے والد ماجد کا ذکر آگیا ہی، چونکہ اس کے راوی خود شیخ موصوف ہیں، اس لئے اس کی صحت مشکوک و مشتبہ بھی نہیں سمجھی جا سکتی، اس واقعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے والد بزرگوار کا اسم گرامی خواجہ بدھ فتح اللہ تھا، ایک بار انھوں نے اپنے ایک پڑوسی ملک نامی کی انتہائی منت و سماجت پر اس کی جاگیر کی درستی محصول کی ذمہ داری قبول کر لی لیکن چند دنوں بعد سلطان المشائخ سید صدر الدین کو خواب میں دیکھا کہ وہ اس کام سے منع فرماتے ہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۶) وفات ۹۱۳ھ ہجری لکھی ہے، حالانکہ سیر العارفین ورق ۱۲ الف میں شیخ سماء الدین کے حوالہ سے شیخ راجو کا انتقال پہلے بتایا گیا ہے (۲) کسی تذکرہ میں شیخ راجو کی طویل عمر نہیں بتائی گئی ہے، حالانکہ ۹۱۳ھ ہجری تک بقید حیات رہنے کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم ۵۲ سال تک صاحب سجادہ تھے (۳) دونوں بھائیوں کی عمروں میں کافی تفاوت ملتا ہے، حضرت مخدوم جہانیان ۷۸۵ھ ہجری میں ۷۸ سال کی عمر میں فوت ہوئے (اخبار الاخیار ص ۱۴۳) لیکن امکان اس کا بھی ہو سکتا ہے کہ شیخ کبیر ہی کی وفات کا سنہ غلط ہو، اس صورت میں شیخ راجو کے سنہ وفات کے مشتبہ ہونے کا کوئی قوی قرینہ باقی نہیں رہتا، بہرحال شیخ سماء الدین کی پیدایش پر ان اختلافات کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، [۱] ص ۲۱۱ [۲] ایضاً [۳] ورق ۷۰ ب،

چنانچہ خواجہ فتح اللہ اس کام کو چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ گئے لیکن ملک کی دوبارہ منت سے مجبور ہو کر خواجہ کو اس کی جاگیر پر پھر جانا پڑا لیکن اسی دن بالاخانہ پر وضو کر رہے تھے کہ سلطان المشائخ نمودار ہوئے، اور انھوں نے خواجہ بدھ کو نیچے ڈھکیل دیا، خواجہ بچ گئے لیکن اس کام سے علٰحدگی اختیار کر کے اہل اللہ کے زمرے میں داخل ہو گئے، اور شیخ راجو قتال سے رابطہ ارادت استوار کر کے سہروردیہ سلسلہ میں شامل ہو گئے، معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سماء الدین بھی باپ کے ہمراہ شیخ راجو کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، سیر العارفین میں ہے[۵۱]

" چنین استماع است کہ پدر بزرگوار ایشان مرید و مربو حضرت محبوب العارفین و مطلوب المحققین حضرت سید صدر الدین[۵۲] محمد بن سید راجو اعمال المعروف بہ شیخ راجو قتال بود، اگرچہ حضرت مخدومی مرشدی[۵۳] و مولائی شیخ سماء الملۃ والدین قدس سرہٗ مربوط و محبوب ایشان بودند لیکن خرقہ خلافت و ارشاد از حضرت شیخ الاسلام وزبدۂ مشائخ عظام کبیر الدین[۵۴] اسماعیل کہ ظاہر و باطن آئینہ انوار نبوی و منظر آثار مصطفوی بود، داشتند "

شیخ سماء الدین کو بچپن سے عبادت میں جس قدر شغف تھا[۵۵] اس کا حال سیر العارفین میں خود شیخ کے حقیقی بھائی شیخ اسحاق کے حوالہ سے بیان ہوا ہے بارہ سال کی عمر سے تہجد کی نماز کبھی فوت نہیں ہوئی، شیخ جمالی نے خود شیخ سماء الدین سے ایک[۵۶] واقعہ نقل کیا ہے، کہ جب بارہ برس کے ہوئے تو ان کے والد آدھی رات کے وقت اپنے پاس بلاتے اور طرح طرح کی نصیحتیں کرتے اور یہ دعا مانگتے،

---

۵۱ ورق ۱۲۱ ب ۵۲ انھوں نے اپنے والد سید احمد کبیر سے ارادت و خلافت پائی، اپنے بھائی مخدوم جہانیان سید جلال بخاری کے بھی خلیفہ تھے، ان کی وفات کے بعد ۵۸۵ھ میں سجادۂ خلافت بھی مل گیا، ہمیشہ عالم استغراق میں رہتے، ملاحظہ ہو اخبار الاخیار ص ۱۴۵، و سیر العارفین ورق ۱۱۶-۱۱۷ و تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۷ ۵۳ حضرت مخدوم جہانیان کے پوتے، اور حضرت شیخ راجو قتال کے شاگرد و خلیفہ تھے، عوارف کو انھوں نے شیخ سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا، ان کے دو صاحبزادے شیخ عبد الشکور اور شیخ عبد الغفور بڑے صاحب حال اہل کمال

" الٰہا بادشاہا ! سماء الدین را از کرم عمیم خود ابواب سعادتِ ابدی ، و اسباب دولتِ سرمدی مفتوح و میسر گردان "،

شیخ سماء الدین خاندان کنبوہ[۵۱] کے چشم و چراغ تھے ، شیخ جمالی جو ان کے عزیز قریب[۵۲] ، شاگرد اور داماد[۵۳] بھی تھے ، وہ دہلی کے اسی خانوادہ کے ایک فرد تھے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان اور دہلی کے ان دو کنبوہ خاندانوں میں عرصہ سے رشتہ داری قائم ہوتی چلی آرہی تھی ،

استاد | اخبار الاخیار[۵۴] سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ موصوف کے استاذ مولانا ثناء الدین[۵۵] تھے ، جو میر شریف جرجانی کے بھی شاگرد رہ چکے تھے ، مگر سیر العارفین میں مولانا ثناء[۵۶] الدین کو مولانا فتح اللہ ملتانی[۵۷] کا استاد بتایا گیا ہے ، تعجب یہ ہے کہ اس واقعہ کے فوراً ہی بعد[۵۸] مولانا سماء الدین کے حوالہ سے خود اُن کے باپ خواجہ بدھ فتح اللہ کا ذکر ملتا ہے مگر کہیں بھی ایسا جملہ نہیں ہے جس سے ظاہر ہو کہ شیخ سماء الدین یا اُن کے والد خواجہ بدھ نے مولانا

(بقیہ حاشیہ ص ۸) گذرے ہیں ، ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۱۷ - ۱۱۸ و تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۸ [۴۹] ورق ۱۲۰ ب [۵۰] سیر العارفین ورق ۱۲۱ ب ،

[۵۱] تذکروں میں بشمول سیر العارفین خاندانی نسبت مذکور نہیں ، مگر تاریخوں میں موجود ہے [۵۲] و [۵۳] تذکرۂ ریاض الشعرا (نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی) ورق ۲۰۰ ، پر شیخ سماء الدین کو شیخ جمالی کا خالو تو بتایا ہے مگر مخزن افغانی میں شیخ جمالی کو داماد بتایا گیا ہے (ملاحظہ ہو ص ۲۸۲) [۵۴] ص ۲۱۱ [۵۵] اخبار الاخیار میں اس لفظ کا املا "ث" سے ہے ، مگر سیر العارفین کی بابت "س" سے آیا ہے [۵۶] ورق ۲۰ بعد . . . . [۵۷] ملتان کے بہت بڑے فاضل تھے ، اس شہر کے بیشتر علماء انہی کے شاگرد تھے ، شیخ جمالی سے بڑا اتحاد و ارتباط تھا ، اُن کے دو ممتاز شاگرد مولانا عزیز اللہ ، اور مولانا امام الدین اس شہر میں بڑے نامور تھے ، ان دونوں سے شیخ جمالی کے خصوصی تعلقات کا پتہ چلتا ہے ، ملاحظہ ہو ، سیر العارفین ورق ۲۲ ، ۲۶ ،

[۵۸] ورق ۲۰ ب ،

ثناء الدین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ہو، البتہ آخرالذکر کا حال کسی قدر تفصیل[۱] کے ساتھ لکھا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان العلماء والفضلاء مولانا ثناء الدین بڑی صلاحیت کے عالم تھے، چند سال شیراز میں رہ کر سید شریف سے بھی علوم حاصل کرکے اپنے ہم عصروں میں بے حد ممتاز ہو گئے، ان کے والد قطب الدین بہرام تھے، جو کبر سنی تک لاولد تھے، کلام اللہ کے حافظ تھے، ہر شب جمعہ کو حضرت بہاء الدین زکریا اور ان کے صاحبزادے حضرت صدر الدین کے مقبرے پر حاضر ہوتے اور ایک ختم قرآن کے بعد واپس آتے، ایک شب ختم کلام کے بعد غنودگی طاری ہوئی، حضرت شیخ صدر الدین کو خواب میں دیکھا کہ وہ خرمے دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ایک خود کھاؤ اور دوسرا اپنی زوجہ محترمہ کو کھلا دو، انشاء اللہ تم کو فرزند نیک بخت حاصل ہوگا"، ابھی اس جگہ سے نکل رہے تھے کہ ایک اور بزرگ نے دو خرمے دیے، ان دونوں کے حسب ارشاد عمل کرنے کا نتیجہ مولانا ثناء الدین کی ذات بابرکات تھی، شیخ جمالی نے اس واقعہ کو خود مولانائے مذکور کے شاگرد مولانا فتح اللہ سے سنکر نقل کیا ہے اور آخرالذکر نے خود اپنے شاگرد سے یہ باتیں سنی تھیں۔

بہرحال شیخ سماء الدین نے خواہ مولانا ثناء الدین سے علم حاصل کیا، یا کسی اور بزرگ سے، یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے علوم ظاہری میں بھی کافی دستگاہ پیدا کر لی تھی، اور ان کا معمول تھا کہ ہر[۲] روز نماز چاشت سے دوپہر تک تفسیر، حدیث، اور اصول فقہ کا درس دیتے جس میں اکابر علماء شریک ہوتے، ایک[۳] بار ان کی یہ بھی خواہش ہوئی کہ علوم ظاہری سے پوری طرح بے تعلق ہو جائیں، مگر اپنے پیر و مرشد کے حکم سے ان علوم سے دلچسپی باقی رکھنا پڑی،

خرقۂ ارادت | اخبار الاخیار[۴] میں لکھا ہے کہ شیخ سماء الدین شیخ کبیر نبیرۂ سید جلال الدین بخاری کے مرید تھے، اور سیر العارفین[۵] سے اس کی پوری وضاحت ہوتی ہے، چنانچہ جیسا اشارہ ہو چکا ہے، بچپن میں ان کے والد خواجہ بدھ نے انھیں بھی شیخ راجو کا معتقد کر دیا تھا، لیکن باقاعدہ ان سے خلافت نہیں ملی تھی، ان کی وفات

---

۱ ورق ۹۰ (ا، ۲ سیر العارفین ورق ۱۲۲ ب ۳ ورق ۱۲۲ ۴ ص ۲۱۱ ۵ مثلاً دیکھیے ورق ۱۲۱ وغیرہ۔

کے بعد شیخ سماء الدین نے حضرت شیخ المشائخ شیخ کبیر الدین اسمٰعیل کی طرف رجوع کیا، سیر العارفین میں خود شیخ مذکور کے حوالے[51] سے لکھا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام صدر الدین محمد المعروف بہ شیخ راجو قتال، جو حضرت شیخ کے والد کے پیر و مرشد تھے، کے انتقال کے بعد وہ ایک روز حضرت کبیر الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر شفقت و رحمت کے طالب ہوئے، حضرت شیخ کبیر نے ایک دوسرے صوفی درویش شیخ فضل اللہ کا ذکر کیا، اور اُن سے خرقۂ خلافت دلانے کا وعدہ کیا، لیکن شیخ سماء الدین نے کچھ بھی نہ کہا اور مکان واپس چلے آئے، کچھ دنوں بعد پھر شیخ کبیر کے آستانہ پر گئے، اور وہی درخواست پیش کی، مگر شیخ نے گذشتہ موقع کی طرح پھر شیخ فضل اللہ کا تذکرہ کیا، اس پر شیخ سماء الدین نے کہا کہ

"پیری و مریدی و مرشدی و مسترشدی بہ رابطۂ قلبی و فرطِ محبت نہادہ اند و من این معنی نسبت حضرت مخدومی مستحکم و مستقیم می یابم"

اس جواب سے شیخ کبیر اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اٹھ کر اُن سے بغل گیر ہوئے، اور حجرۂ خاص میں لیجا کر تلقین و ذکر شروع کیا، ان ہی ایام[52] میں شیخ سماء الدین کے دل میں ترک علم ظاہری کا خیال راسخ ہو گیا تھا، شیخ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ اساس دین کی بنیاد علم ظاہری پر ہے، اس لئے اس کو ترک کرنے کا خیال ختم کر دینا چاہیئے،

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ سماء الدین کا تعلق سہروردیہ سلسلے سے تھا، سیر العارفین میں شیخ کے مرید شیخ جمالی نے اپنے اس تعلق[53] کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اور اپنے سلسلے کے بزرگان شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ صدر الدین، شیخ رکن الدین وغیرہ کا حال بڑی دلچسپی اور عقیدتمندی سے لکھا ہے، خزینۃ الاصفیاء[54] میں لفظ سہروردیہ اُن کے نام کے ساتھ شامل ہی ہے،

---

[51] سیر العارفین ورق ۱۱ وغیرہ [52] ایضاً ورق ۱۲۲ [53] ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۴۰-۱۵۰، بغداد کے قیام کے دوران میں شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ شہاب الدین عمر سہروردی اور حضرت ابو حنیفہ کے مزارات کی زیارت کے موقع پر اور شیخ سہروردی حضرت کے صاحب سجادہ شیخ شہاب الدین احمد کے استفسار کے جواب میں،

[54] ج ۲ ص ۴۴، ۴۴

ملتان سے روانگی اور ناگور میں قیام

ہندوستان کی علمی و تمدنی تاریخ میں ملتان کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، اس شہر میں سینکڑوں ایسے علماء و فضلاء پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے سارے ہندوستان میں علم کا چراغ روشن ہوا، نویں صدی ہجری میں بھی اس خطے نے اپنی قدیم روایات قائم رکھیں، شیخ سماء الدین نے ایسے ہی علمی و ادبی ماحول میں نشو و نما پائی تھی، اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ یہیں بسر ہوا، یہیں انھوں نے ظاہری علوم حاصل کئے، اور یہیں باطنی علوم میں کمال حاصل کرکے اکابر مشائخ میں شامل ہوئے، لیکن چند وجوہ سے، انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا، اخبار الاخیار میں ہے[1] کہ

"از ملتان بنا بر بعضے وقائع کہ دران دیار واقع شدہ برآمد"

منتخب التواریخ[2] میں مولانا عبد اللہ الہ داد طلبنی کے وطن چھوڑنے کی وجہ "خرابی ملتان" لکھی ہے، مولانا ئے مذکور شیخ سماء الدین کے ہم عصر تھے، قیاس ہے کہ صاحب اخبار الاخیار کے "بعض وقائع" اور صاحب منتخب کی "خرابی ملتان" سے ایک ہی چیز مراد ہوگی،

وطن سے روانگی کے وقت شیخ سماء الدین کی عمر ۶۰ سال سے کچھ زیادہ رہی ہوگی، قیاس ہوتا ہے کہ یہاں سے نکل کر وہ ناگور آئے، اور کچھ دنوں قیام کرکے گجرات چلے گئے، اس وقت اُن کی عمر ۶۵ سال کی تھی، اس طرح اُن کے وطن سے نکلنے کی تاریخ ۸۶۰ھ ہجری کے قریب ہوگی، سیر العارفین سے پتہ چلتا ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد چار مقام پر ان کا قیام رہا، اُن میں ناگور سب سے پہلے آتا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملتان سے سیدھے اسی مردم خیز خطے میں وارد ہوئے ہوں گے، یہاں کے قیام کا صرف ایک واقعہ سیر العارفین میں درج ہے[3]، ایک عورت شیخ کی بڑی عقیدت مند تھی، اس کے پاس ایک گائے تھی، اس کا دودھ، دہی وغیرہ شیخ کی خدمت میں بھیجا کرتی تھی ایک رات چور اُسے چرا لے گئے، اُس نے یہ واقعہ شیخ سے کہا، وہ عشاء کی نماز میں تھی کہ اُس نے سُنا گویا شیخ فرما رہے ہیں کہ تمھاری گائے آگئی ہے، نماز کے بعد اُس نے وہ گائے اپنے صحن میں پائی،

---

[1] ص ۲۱۱ [2] ج ۳ ص ۳۲۳ [3] ورق ۱۲۰ (۱۲۱)

سفر گجرات ناگور مین کچھ دنون قیام کے بعد شیخ سماء الدین گجرات کی طرف چلے گئے، اُس وقت اُن کی عمر ۶۵ سال کی تھی، اس لحاظ سے اُن کا سفر ۸۶۲ھ ہجری کے قریب ہوا ہوگا، گجرات کے قیام مین اُن کی ملاقات شیخ وجیہ الدین[۵۱] احمد سے ہوئی جو بقول صاحب سیر العارفین[۵۲] اُس وقت ۱۲۰ سال یا ۱۲۳[۵۳] سال کے تھے، وہ علوم ظاہری مین "ابو حنیفۂ وقت" اور علوم باطنی مین "بایزید زمانہ" تھے، شیخ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو انھون نے اُن کے ساتھ باوجود ناشناسائی کے ایسا برتاؤ کیا، جو کوئی خورد اپنے بزرگ کے ساتھ کرتا ہے، حالانکہ دونون کی عمر مین تقریبًا ۵۰ سال کا فرق تھا، اور اپنا ایک خاص مصلا شیخ سماء الدین کی خدمت مین پیش کیا،

اخبار الاخیار[۵۴] مین متاخرین مشائخ گجرات مین وجیہ الدین نام کے ایک بزرگ کا حال درج ہے، مگر ان دونون نام بزرگون کے حالات کے مقابلے سے یہ حقیقت آئینہ ہوجاتی ہے کہ دونون دو الگ الگ شخص تھے جن کے زمانون مین

---

۵۱ سیر العارفین ورق ۱۲۴ - ۱۲۵ - ۵۲ ان کے والد کا نام ملک اختیار الدین محمد تھا، جو فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہند کے عزیز قریب تھے، باپ کی وفات کے بعد بہت زیادہ دولت و ثروت کے مالک ہوئے، اور ان کی زندگی کے ایام لہو و لعب اور فسق و فجور مین صرف ہونے لگے، اس پر ستم یہ ہوا کہ اس قدر حسین تھے کہ لوگ یوسف ثانی کہتے، ایک روز حضرت ابو اسحاق مغربی کی خانقاہ کی طرف سے گذر ہوا، شیخ نے دیکھتے ہی ایک کلوخ اُن کی طرف مارا اور کہا کہ اے لڑکے اس طرح کی زندگی کب تک بسر کرتا رہے گا، ان الفاظ کو سنتے ہی شیخ وجیہ بیہوش ہوگئے، ابو اسحاق ان کو اپنی خانقاہ مین لے گئے، اور پانی اُن کے حلق مین ٹپکایا، ہوش مین آئے تو حال دگرگون تھا، شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، اور کل دولت مستحقون مین تقسیم کردی، چند ہی دنون مین مرتبۂ قطبیت تک پہنچ گئے، شادی نہین کی تھی، ۱۱ سال مدینۂ طیبہ مین رہے، وہان سے گجرات آئے، سلطان مظفر گجراتی اُن کا بے حد عقیدت مند تھا، احمد آباد شہر کے نزدیک ایک قصبہ مین مدفون ہین، شیخ جمالی نے حج سے واپسی پر اُن کے یہان حاضری دی، (ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۲۵) ۵۳ ایضًا مگر ندوہ کے نسخہ مین صرف ایک سو بیس سال درج ہے ۵۴ ایضًا ص ۱۶۳،

تقریباً سو سال کا فرق ہے۔ شیخ سماء الدین کے دوست جن کا ذکر جمالی نے سیر العارفین میں کیا ہے، اُن کی پیدائش سنہ [illegible] کے کچھ بعد ہوئی ہوگی، سنہ [illegible]ھ میں وہ بقید حیات تھے[1] اور نویں صدی کے ختم کے قریب انتقال پا چکے ہوں گے، شیخ جمالی جب سنہ ۸۹۵ھ کے قریب سیاحت بلاد اسلامی سے واپس آئے ہیں، تو شیخ وجیہ الدین احمد فوت ہو چکے تھے[2]، اخبار الاخیار والے بزرگ سنہ ۹۹۱ھ ہجری تک حیات تھے[3]، اول الذکر بزرگ کے شیخ فیروز تغلق کے عہد کے تھے، اور آخر الذکر اکبری عہد کے،

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ شیخ سماء الدین گجرات میں کب تک مقیم رہے، اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں کس غرض سے تشریف لے گئے تھے،

حکومت رنتھمبور | بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گجرات سے واپسی پر شیخ سماء الدین رنتھمبور[4] کی طرف آئے، اور یہاں کے قلعہ کے قریب بلانیہ[5] نام کے ایک قریہ میں قیام کیا، اسی قریے میں شیخ جمالی نے شیخ سماء الدین سے بیعت کی تھی، شیخ جمالی نے لکھا ہے[6] کہ ایک روز ایک درویش شیخ سماء الدین کی خدمت میں آئے، اُن کے پاس مکتوبات عین القضاۃ ہمدانی کا ایک نسخہ تھا، حضرت نے اُسے اپنے ہاتھ میں لیا، اور چند ورق مطالعہ کرنے کے بعد شیخ عین القضاۃ کا ایک واقعہ نقل کیا، ایک بار اُن کی بیس جگہ دعوت تھی، لیکن وہ حجرہ سے باہر نہ نکلے، اور ہر جگہ موجود بھی تھے، شیخ جمالی کے دل میں شبہہ پیدا ہوا، چنانچہ حسب معمول جب طشت و مشربہ لے کر شیخ سماء الدین کے کمرہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ شیخ اپنی جگہ پر موجود ہیں، اور چاروں کونوں میں اُن کی چار صورتیں کھڑی ہیں، اس کے بعد خود فرمایا کہ "درویشوں میں یہ قوت ہوتی ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی جگہ حاضر ہو جائیں لیکن یہ باتیں ہر شخص سے کہنے سننے کی نہیں ہیں"،

---

[1] سیر العارفین میں [illegible]ھ کے قریب عمر ۱۲۳ یا ۱۲۰ سال کی بتائی گئی ہے، ملاحظہ ہو ورق ۱۲۵ [2] ایضاً [3] اخبار الاخیار ص ۲۰۳، [4] سیر العارفین ورق ۱۲۵ ب [5] ایک نسخہ میں ملانیہ، دوسرے میں بلانیہ ہے [6] سیر العارفین ورق [illegible] ب،

قیام بیانہ | شیخ سماء الدین رحمہ دور سے بیانہ آئے لیکن یہاں آنے کی کوئی تاریخ معلوم نہیں ہو، البتہ یہاں انکا قیام زیادہ دنوں تک معلوم ہوتا ہے، بیانہ ان دنوں سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ اہمیت حاصل کرچکا تھا سلاطین شرقی سلاطین دہلی کے درمیان نبرد آزمائی جاری تھی، اور یہ کبھی حکومت دہلی کا جزو ہو جاتا، اور کبھی سلاطین شرقی اس پر اپنا قبضہ جمالیتے، اس اعتبار سے شیخ کے قیام کو ایک گونہ سیاسی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، اگرچہ شیخ کا تعلق براہ راست سیاست سے بالکل نہ تھا، لیکن سلطان حسین شرقی اور بہلول لودی دونوں شیخ کی توجہ حاصل کرنے کے خواہان تھے، ایک[1] بار سلطان احمد جلوانی[2] حاکم بیانہ شیخ موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کے ہمراہ مرتضیٰ خان رسولدار کے علاوہ چند دوسرے امرا بھی تھے، یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان حسین کے سر میں دہلی پر قبضہ کرنے کا سودا سوار تھا، اور احمد جلوانی مذکور سلطان حسین سے خفیہ سازش کرچکا تھا، چنانچہ شیخ کے حضور میں دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے، اور شیخ سے بھی سلطان حسین کی کامیابی کے لئے دعا کا طالب ہوا، یہ سنتے ہی شیخ نے فرمایا "احمد! تیرے آبا و اجداد بہلول لودی کے پروردہ ہیں، اور تو بھی اسی کا نوازش یافتہ ہے، با وجود اس یقین کے کہ کفران نعمت مذلت و عدم دولت کا موجب ہوتا ہے، اتنے حقوق نعمت پر یکبارگی کیونکر خاک مذلت ڈالتا ہے اور اپنی تقریر اس جملے پر ختم کی،

"مرا چہ نسبت بدعائے ظالمے کہ دست ظلم کشادہ پائے تعدی از دائرۂ عدالت بیرون نہادہ

وبقصد خونریزے رود کہ ہموارہ تشنۂ آں دارد سر تعب از زمین تعہد عبادت بر نمی دارد"

سلطان احمد جلوانی کو یقین ہو گیا کہ سلطان حسین کی کامیابی مشکل ہے، چنانچہ بقول شیخ جمالی[3] وہ سلطان بہلول سے بغاوت کرنے سے باز رہا، لیکن تاریخوں[4] سے معلوم ہوتا ہے کہ چند روز بعد اس نے بہلول لودی سے

---

[1] ورق ۱۲۳ [2] یوسف خان جلوانی کا لڑکا تھا (ملاحظہ ہو طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۰۰)

[3] سیر العارفین ورق ۱۲۳ ب [4] ملاحظہ ہو منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۰۰ اور طبقات اکبری ج ۱ ص ۳۰۰،

باغی ہو کر حسین شرقی کے نام کا خطبہ جاری کر دیا تھا، اگرچہ احمد جلوانی بہت سخت مزاج حاکم تھا، مگر لوگ بیان کرتے تھے کہ اس دن شیخ کی ہیبت اتنی غالب تھی کہ وہ کانپ رہا تھا،

قیام دہلی اور شیخ کے روابط سلاطین لودی سے — شیخ سماء الدینؒ بیانہ سے دہلی چلے آئے، اور تا آخر حیات یہیں مقیم رہے، اگرچہ دہلی آنے کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہے لیکن سیر العارفینؒ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ مذکور کے بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ بیابانی ساٹھ سال سے کچھ زیادہ جنگل و بیابان میں رہ کر راہی ملک بقا ہوئے، چونکہ شیخ عبداللہ کا سنہ وفات ۸۹۲ھ ہے، اس لئے اُن کے ترک تعلقات کرنے کی تاریخ ۸۳۰ھ کے قریب ہوگی، اور یہ بھی معلوم ہے کہ دہلی میں وہ کچھ دنوں باپ کے ساتھ رہ چکے تھے، اس لئے شیخ سماء الدین کے دہلی تشریف لانے کی تاریخ ۸۳۰ھ سے چند سال پہلے ہوگی،

اس عہد میں دہلی کا تاجدار بہلول لودی تھا، وہ شیخ سماء الدین کا بے حد عقیدت مند تھا، اور ان کی خدمت میں کبھی کبھی حاضر ہوتا تھا، شیخ کو بھی بہلول سے بڑی محبت تھی، اور وہ اُسے تخت دہلی کا صحیح وارث اور جانشین تصور کرتے تھے، مگر شیخ کی محبت میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی، اس کی خدا ترسی اور رعایا پروری کا شیخ کافی متاثر ہو چکے تھے، اگر دنیاوی فائدہ پیش نظر ہوتا، تو بیانہ کے قیام کے دوران میں وہاں کے حاکم کی رائے کے خلاف وہ بہلول کی اتنی مدح سرائی اور حسین شرقی کی اتنی مذمت نہ کرتے، ظاہر ہے کہ شیخ کے ان خیالات و جذبات کی ہر شخص کے دل میں جگہ ہوگی، سلطان بہلول کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی ہوگی تو اس کی عقیدت اور بھی زیادہ ہو گئی ہوگی،

سیر العارفین میں شیخ جمالی نے بہلول لودی کی شیخ کے آستانہ پر حاضری کا بیان اس طرح کیا ہے،

۱؎ سیر العارفین ورق ۱۲۳ ب ۲؎ ایضاً ورق ۱۲۲ ب ۳؎ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۸۱، ۸۲، ۴؎ ملاحظہ ہوں وہ الفاظ جو ورق ۱۲۳ پر درج ہیں ۵؎ ورق ۱۲۳، ۱۲۴، میرے پیش نظر نسخہ کی عبارت بہت غلط نقل ہوئی ہے، اس کا مقابلہ ندوہ کے نسخہ سے کر لیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہوں اوراق ۲۵ ا ب بعد)

ایک روز سلطان بہلول زیارت کے لئے آیا، خبر کی گئی کہ بادشاہ قدم بوسی کا ملتمس ہے، شیخ سماء الدین نے حکم دیا کہ اندر بلوا لیا جائے، بادشاہ اندر گیا، حضرت کے قدم مبارک پر سر رکھ دیا، اور سامنے دو زانو بیٹھ گیا، اور تھوڑی دیر بعد عرض کی:

"این مقصد ما دیدہ ظاہر و باطن ناظر بر چہرۂ کرم و شفقت حضرت مخدومی ست زیرا کہ بادشاہ معانی صد ویشان اندر دار ز چین صورت ایشان"

حضرت مخدوم نے فرمایا:

"دیدن و چیدن از صورت ایشان این معانی دارد کہ اگر کسے توفیق رفیق طریق احوال ایشان نیابد بارے با وافعال و اعمال این قوم بشتابد تا اثر صورت ظاہر درویشان رنگ کدورت باطن ایشان بزداید"

اس کے بعد زبان مبارک پر یہ کلمات آئے،

"ہر کس از انعام مستدام حضرت عزت محروم باشند، اول پیرے کہ در معاصی بر دل و جان خود محکم نہ بندد، دوم جوانے کہ با تقید تو بہ باطن خود را بمعصیت پسند د، سوم سلطانے کہ با وجود حصول و نیل مرادات جزوی و کلی چراغ سلطنت خود را صرصر بے دروغ بے فروغ گرداند تا پیر فرمان شنود کہ اے موے سفید سیہ دل تو ابد، ضعف پیری چہ امید زیستن بود کہ دیوار تو بحکم نہ ساختی و زد بغفلت و بقوت معصیت از بنیاد شستی ۔ ۔ انداختی، و با جوان ندا دہند کہ اے جوان نادان ندانستی کہ شیخ و شاب و اطفال را امید حیات بید قدرت و قضاے ربانی است تو کہ با مید تو بہ پیری بصحراے معصیت بجزت می خرامیدی عاقبت ندیدی کہ بہ پیری نہ رسیدی کہ تائب گردی، بادشاہ را کا ذب را بدین خطاب و عتاب در اضطراب اندازند کہ غافل روزگار صروغ از بہر طلب عقبیٰ نہ باشد، مگر از بہاے رباط و ضبط نیاے فانی از ان بہم کم و نخستی کہ تم کذب در فرد عیاں

پیوستہ می گماشتی گو دیری پادشاہی یافتہ و دل خود را از خوفِ الٰہی آگاہی بخشی و خود را از کذب و معصیت باز داری و پیوستہ بشکر نعمت منعم حقیقی مستغرق مانی، بحکم لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَ لَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ"

ان نصائح کا سلطان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ زار زار رونے لگا، اور زبانِ عجز سے یوں کہا:-

"حضرت مخدوم باوجود چندین تقصیرات محبتِ درویشان در خود زمان زمان فریدی یابم امید کہ حق تبارک تعالیٰ ببرکت محبتِ این قوم مرا نجات ارزانی دارد"

بادشاہ نے اس درجہ عجز و نیاز کا اظہار کیا کہ حاضرین مجلس پر عجیب عالم طاری ہوا، آخر کار شیخ نے اسے ایک خاص مصلّا عنایت فرمایا، اور سلطان نے وہاں سے مراجعت کی،

اس تفصیل سے بہلول لودی کی اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو اس کو فقرا و مشائخ سے تھی، اور غالباً اسی ارادتمندی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی ایک لڑکی کی نسبت ایک صوفی درویش شاہ عبداللہ قریشی سے کر دی جو ملتان کے رہنے والے اور حضرت بہاء الدین زکریا کی اولاد میں تھے، شاہ عبداللہ موصوف حضرت شیخ سماء الدین کے ہم وطن تھے، بلکہ دونوں ایک ہی سلسلۂ سہروردیہ سے مربوط تھے، ان دونوں بزرگوں کے اس غیر معمولی خلوص سے یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ سلطان بہلول کو اس سلسلہ سے زیادہ رغبت تھی،

شیخ سماء الدین بہلول لودی کے متعلق جو خیال رکھتے تھے، وہ نیا نہ تھا، کیونکہ ورود دہلی کے قبل ہی انھوں نے حاکم بیانہ کی جس طرح تنبیہ کی تھی، اس کی مثال کمتر ملے گی، دہلی پہنچے بعد ان کا ویسا ہی خیال قائم رہا، سلطان کے مرنے کے بعد اس کے متعلق شیخ کے خیال کا پتہ حسب ذیل واقعہ[3] سے بھی چلتا ہے،

"روزے حضرت مشار الیہ بعد وفات سلطان بہلول لودی نور اللہ مرقدہ بزیارت او قدم رنجہ فرمودا

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۲ [2] سیر العارفین ورق ۱۴۴ ب [3] مخزن افغانی ص ۱۰۵ پر لکھا ہے کہ شیخ بہلول اور سکندر دونوں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گیا تھا یہی صورت افغانی ص ۱۳۰ پر بھی ہے لیکن یہ غلط ہے کیونکہ سکندر شیخ کی وفات کے ۲۲ سال بعد مرا ہے،

"فرمانے بعد ادائے فاتحہ و اخلاص در مراقبہ آوردہ شد و بعد از ان برخاست و بزبان گوہر نثار فرمود سبحان اللہ این مرد دنیا بکام رانی گذرانید و از برکت فرط محبت و اعتقادے کہ با دوستان خدا تعالی داشت اینچنین مرتبہ عالی یافت"

بہلول کی وفات ۸۹۴ھ ہجری میں ہوئی، اس کے بعد اس کا بیٹا سکندر لودی تخت نشین ہوا، باپ کی طرح وہ بھی درویشوں کا بے حد عقیدت مند تھا، حضرت شیخ سماء الدین سے بھی بڑی ارادت رکھتا تھا، چنانچہ جب تخت نشینی کے لئے اس کو دعوت دی گئی، تو سب سے پہلے وہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کا طالب ہوا، تاریخوں میں یہ واقعہ بڑی دلچسپی سے بیان ہوا ہے، طبقات اکبری میں[1] اس طرح ملتا ہے:-

"وقتے کہ سلطان بہلول درگذشت و سلطان سکندر را بجہت سلطنت طلب می داشتند و ارادہ رفتن نمود، در روزے کہ از دہلی[2] بیرون می رفت، بخدمت شیخ سماء الدین[3] کہ از بزرگان وقت بود بجہت التماس فاتحہ رفت و گفت کہ من کتاب میزان الصرف[4] پیش شما می خواہم کہ بخوانم..... چون خواند، بدانشا اسعدک اللہ تعالی فی الدارین" سلطان گفت، باز بگوئید، و تا سہ مرتبہ تکرار کردہ دست آن عزیز را بوسید، سلطان این دعا را بفال نیک گرفتہ روان شد"

بدایونی سے مزید[5] یہ پتہ چلتا ہے کہ سکندر کو ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو شیخ سماء الدین اُس کے دوسرے بھائیوں کی سفارش کریں، اُس کے الفاظ یہ ہیں:-

---

[1] ج ۱ ص ۳۳۴-۳۳۳ [2] طبقات اکبری کے نسخوں میں اختلاف ہے ایک نسخے میں اس طرح آیا ہے:

" در روزے کہ از دہلی نزد سماء الدین بجہت التماس فاتحہ رفت"

مگر یہ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان ایام میں شیخ کا قیام دہلی کے باہر نہیں تھا [3] فرشتہ جلد ۱ ص ۱۸۶ مطبوعہ نسخہ بہاء الدین ہے جو غلط ہے [4] فرشتہ اور طبقات کے ایک نسخہ میں صرف "مختصر" ہے [5] منتخب التواریخ ج ۱ ص ۳۱۳-۳۱۴،

بدایونی کا بیان فرشتہ، طبقات اور مخزن افغانی وغیرہ سے بہت مختلف ہے

"می گویند کہ وقت روان شدن از دہلی بہ تقریب تعادل نزد شیخ سماء الدین کنبوہ پیر شیخ جمالی کہ از علمائے کبار و مشائخ عظام روزگار بود، رفت، باین تقریب مبادا از رضا بہ سلطنت برادران دیگر داشتہ باشد، دستی صرف ہوائے ابانہ ساختہ بیان معنی عبارت اسعدک اللہ ... از خدمت شیخ رسید، چون گفت و نیک بخت گرداناد ترا خدائے تعالیٰ، التماس کرد کہ این لفظ را سہ مرتبہ بزبان مبارک خود برانید، شیخ سہ بار گفت، او برخاستہ عرض داشت کہ من مدعائے خود را حاصل کردم و از شیخ استمداد طلبیدہ متوجہ لشکر شد"

بہرحال ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں شیخ کو غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا مگر بظاہر انھوں نے کبھی اپنے رسوخ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، اور خدا ترس اور رعایا پرور بادشاہ کے لئے ہمیشہ دعا کرتے رہے،

سکندر لودی کو مشائخ سے جو عقیدت تھی، اُس سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، شیخ جمالی سے اس کے بڑے گہرے تعلقات تھے، اُن سے اُس کے حصول نیاز کے سلسلے کی جو تفصیلات ملی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ جمالی جب ۸۹۲ھ ہجری کے کچھ قبل سیر بلاد اسلامی سے واپس ہوئے، تو بادشاہ کو معلوم ہوا کہ شیخ نے اپنے قیام تبریز کے دوران میں ایک بلند پایہ نظم مہر و ماہ کے عنوان سے لکھی ہے، اُس نے ایک منظوم رقعہ دعوت اپنے دستخط خاص سے شیخ کے پاس بھیجا، شیخ اُس کے پاس جانے کے لئے راضی نہ ہوئے البتہ مثنوی مطلوب روانہ کر دی، اس کے مطالعہ کے بعد شیخ سے ملاقات کا اشتیاق زیادہ ہوا، اس لئے سلطان نے ایک رقعہ شیخ سماء الدین کے پاس لکھا، انھوں نے شیخ جمالی کو سکندر لودی کے پاس سنبھل روانہ کر دیا،

لہ ملاحظہ ہو مخزن افغانی ص ۲۰، واقعات افغانی ص ۱۳۵، ےہ یہ تاریخ قیاسی ہے، ان دنوں سلطان سنبھل میں مقیم تھا اور یہیں اُسے شیخ کے آنے کی اطلاع ہوئی، ملاحظہ ہو مخزن و واقعات۔

اگرچہ یہ معاملہ براہ راست شیخ سماء الدین سے تعلق نہیں رکھتا لیکن سلطان سکندر کا ان کے پاس جانا کہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلطان کے رشتہ ارادت میں جو ۸۹۵ھ ہجری سے بہت قبل استوار ہو چکا تھا کسی قسم کی کمزوری کے آثار پیدا نہیں ہوئے تھے، شیخ جمالی کو سکندر کے پاس بھیجنے میں شیخ سماء الدین کی مصلحت صرف اس قدر تھی کہ وہ بادشاہوں کی مجلسوں[۱] میں فقرار کی موجودگی کو باعث برکت سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ فقرا، ہی کی دعاؤں کی وجہ سے بادشاہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں،

---

[۱] یہ الفاظ مخزن اور صولت افغانی میں پائے جاتے ہیں،

بزم صوفیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

جس میں عہد تیموریہ سے پہلے کے صوفیہ کرام حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویری، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ بختیار کاکی، حضرت قاضی حمید الدین ناگوری، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت بوعلی قلندر پانی پتی، حضرت شیخ فخر الدین عراقی، حضرت برہان الدین غریبؒ، حضرت ضیاء الدین نخشبی، حضرت شرف الدین احمد منیری، حضرت جہانیان جہان گشت، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی، اور حضرت خواجہ گیسو دراز کے مستند حالات اور تعلیمات پیش کی گئی ہیں،

قیمت :- ے ؍

"منیجر"

گجراتی بادشاہون کے سکّے

از

مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی

۱۹۱۲ء سے گجراتی سکے میری نظر سے گذرنے شروع ہوئے، اور مین نے اُن کو جمع کرنا شروع کیا، آہستہ آہستہ اُن کی بڑی تعداد میرے پاس جمع ہوگئی، مین نے اس پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اور اس کے بارہ مین کچھ نوٹ بھی کئے، لیکن تاریخ گجرات لکھنے مین کچھ اس طرح مشغول ہوگیا کہ ذہن سے یہ بات فراموش ہوگئی، اب جب کہ اس سے فارغ ہوا، تو پھر اس طرف توجہ کی، میرے پاس اس وقت ہندوستان اور غیر ممالک کے ہزارون سکے موجود ہین، لیکن محمود غزنوی کے کچھ سکون کے علاوہ التمش تک کی کڑی مفقود ہے، باقی بلبن سے لے کر برٹش گورنمنٹ تک کے ہر قسم کے سکّے ہین،

ان مین سے فی الحال صرف گجراتی سلاطین کے بارہ مین لکھا جاتا ہے، کیونکہ گجراتی سکون پر بہت کم لوگون نے قلم اٹھایا ہے، مسٹر ہوڈی والا (جوناگڑھ) مسٹر ٹیلر (جوناگڑھ) اور گورنمنٹ بمبئی کے ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ اور کسی کا مضمون اس موضوع پر میری نظر سے نہین گذرا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل مین بھی کچھ لکھا گیا ہے، مگر مین نے اس کو نہین دیکھا،

سلاطین گجرات کے نام اور حقیقی بات

ان سکون مین بادشاہون کے نام مع خطابات، مقامات ضرب (ٹکسال) اور سنہ درج ہین، قیمت اور وزن نہین ہے، جس سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے، کہ سکے سے یہ نہین معلوم ہوتا کہ اس کی قیمت کیا ہے، صرف اندازہ سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ روپیہ، اٹھنی، چونی، یا پیسہ دھیلا وغیرہ ہو،

سلاطین گجرات مین پہلا شخص سلطان مظفر اوّل ہے، جو محمد شاہ تغلق کی طرف سے یہان کا ناظم (گورنر) مقرر ہوا تھا، اور آخر مین خود مختار ہوگیا، اس کا لڑکا تاتارخان دہلی مین رہتا تھا، تیمور شاہ کے حملہ سنہ کے قبل وہ گجرات چلا آیا، اور باپ کی مرضی کے خلاف خود بادشاہ بن بیٹھا لیکن کثرت مے نوشی کی وجہ سے بہت جلد مرگیا، (سنہ ۸۰۶ھ) پھر کئی برس کے بعد مظفر شاہ جس کا اصلی نام مظفرخان ہو، تخت نشین ہوا لیکن اس کے سکے بہت بہت ہی کم یاب ہین،

جن سلاطین کے نام کے سکے ہین، وہ حسب ذیل ہین،

اسمار مع خطاب	سنہ تخت نشینی
(۱) ناصرالدنیا والدین محمد شاہ تاتارخان اوّل ابن مظفر شاہ بن وجیہ الملک	سنہ ۸۰۶ھ، اس کے دوسرے سکہ مین ہو: الواثق بتائید الرحمٰن افتخار الدنیا والدین ابو المغازی محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان" ہے،
(۲) شمس الدنیا والدین مظفر شاہ بن وجیہ الملک سدھارن،	سنہ ۸۱۰ھ ۸۱۳ھ
(۳) ناصر الدنیا والدین احمد شاہ اوّل بن محمد شاہ اوّل،	سنہ ۸۱۳ھ ۸۴۶ھ (بانی احمد آباد)
(۴) غیاث الدنیا والدین محمد شاہ ثانی بن احمد شاہ اوّل،	سنہ ۸۴۶ھ ۸۵۵ھ
(۵) قطب الدنیا والدین احمد شاہ ثانی بن محمد محمد شاہ ثانی	سنہ ۸۵۵ھ ۸۶۳ھ (بانی کانکریہ تالاب)
(۶) سلطان داؤد شاہ، (چند ماہ)	سنہ ۸۶۳ھ ۸۶۳

اسماء و خطاب	سنہ تخت نشینی
(۷) ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ اول بن محمد شاہ ثانی	سنہ ۸۶۳ھ / ۹۱۷ (فاتح جوناگڈھ و چانپانیر) اس کو محمود بیگڑا بھی کہتے ہیں
(۸) شمس الدنیا والدین ابو النصر مظفر شاہ ثانی بن محمود اول	سنہ ۹۱۷ھ / ۹۳۲ (مظفر حلیم بھی کہتے ہیں) فاتح مالوہ
(۹) الواثق باللہ المنان ابو الفتح ناصر الدنیا والدین سکندر شاہ بن مظفر شاہ ثانی	سنہ ۹۳۲ھ / ۹۳۲
(۱۰) سلطان محمود ثانی	سنہ ۹۳۲ھ / ۹۳۲
(۱۱) قطب الدنیا والدین بہادر شاہ بن مظفر شاہ ثانی	سنہ ۹۳۲ھ / ۹۴۳ (فاتح چتوڑ)
(۱۲) محمد شاہ فاروقی حاکم خاندیس	سنہ ۹۴۳ھ / ۹۴۳ دو ماہ
(۱۳) ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ ثالث بن لطیف خان بن مظفر شاہ ثانی	سنہ ۹۴۳ھ / ۹۶۱
(۱۴) سلطان مظفر سوم	سنہ ۹۴۳ھ (چند ماہ)
(۱۵) ناصر الدنیا والدین اور دوسرے میں غیاث الدنیا والدین اور تیسرے میں معین الدنیا والدین احمد شاہ ثالث	سنہ ۹۶۱ھ / ۹۶۸
(۱۶) شمس الدنیا والدین مظفر شاہ رابع	(سنہ ۹۶۸ھ / ۱۰۰۰) اس کا لڑکا بہادر شاہ ثانی تھا لیکن نہ تخت نشین ہوا نہ کوئی سکہ ملا

واضح رہے کہ آخری سلطان مظفر کی حکومت ۹۸۰ھ میں اکبر نے ختم کر دی تھی، اور گجرات پر مغلیہ سلطنت کی حکومت قائم ہوگئی تھی، اور مظفر شاہ کو اکبر اپنے ساتھ لیتا گیا، مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ گجرات واپس آگیا، اور باغی کی حیثیت سے ۱۰۰۱ھ تک زندہ رہا اور اس کے نام کے سکے ڈھلتے رہے،

ٹنکہ ٹنکہ اصل میں سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی وزن کے ہیں، پھر سکہ کے لئے بولا جانے لگا، اور جہاں سکے ڈھلتے تھے، اسکو ٹنکسال اور پھر ٹکسال کہنے لگے، ٹنکہ چار ماشہ کا ہوتا تھا[1]

ٹنکہ پہلے چاندی کے سکہ کو کہتے تھے، جس کو شیر شاہ کے زمانہ میں "روپیہ" کہنے لگے، کیونکہ وہ روپا یعنی چاندی کا ہوتا تھا، پھر چاندی اور تانبہ کے سکہ کو بھی ٹنکہ کہنے لگے، اور دونوں میں فرق کے لئے ٹنکہ سفید اور ٹنکہ سیاہ کا لفظ استعمال کیا جانے لگا، میں نے سلاطین گجرات کے سکوں میں سلطان محمود بیگڑہ (لمبی مونچھوں والا) کا سکہ (ٹنکہ) جب وزن کیا، تو ایک تولہ کا نکلا، اسی مظفر ثالث کا ۹۹۱ھ ایک تولہ کا محمود بیگڑہ کا ۹۱۰ھ و ۹۱۴ھ ایک تولہ کا، احمد ثالث کا ۹۶۱ھ ایک تولہ کا، پھر دوسرے شاہ عالم کا ایک تولہ کا،

اس عہد میں جو سکے رائج تھے، اُن کے نام محمودی، مظفری، چنگیزی، اور جامی ملتے ہیں، مظفری اور محمودی، تمام گجرات میں، چنگیزی صرف بڑودہ اور جامی کاٹھیاواڑ میں رائج تھے، قدیم کتابوں میں سکے کے متعلق کوئی تفصیل آج تک میری نظر سے نہیں گذری، صرف ابن بطوطہ جلد دوم کے محشی اور دونے اس پر کچھ بحث کی ہے، آئین اکبری میں بھی کوئی تسلی بخش بات مجھے نہیں ملی، اس لئے جو چیز جہاں سے ملی ناظرین کی ضیافت کے لئے درج کی جاتی ہے،

(۱) ٹنکہ طلا، (زرد یا سرخ) ایک تولہ کا (اشرفی) محمودی

(۲) ٹنکہ نقرہ (سفید) ایک تولہ کا، (روپیہ)

(۳) جیتل مس (ریول) تانبہ کا ایک تولہ کا، پچاس جیتل کا ایک ٹنکہ سفید (روپیہ)

---

[1] سنسکرت انگلش ڈکشنری، ایانی دیم صاحب،

(۴)	ایک ٹنکہ سفید	=	آٹھ ہشت گانی (مساوی ایک مصری درہم)
(۵)	ایک ہشت گانی	=	۴ سلطانی
(۶)	ایک سلطانی	=	۲ جیتل
(۷)	ایک جیتل	=	۴ فلوس (پیسہ) آنہ
(۸)	ایک ٹنکہ	=	۶۴ پیسہ
(۹)	ایک ٹنکہ عدلی کے	=	۵۰ جیتل (پول سیاہ)
(۱۰)	ٹنکہ سیاہ جس میں چاندی کم اور تانبہ زیادہ ہوتا	=	۱۶ پول
(۱۱)	ایک ٹنکہ (روپیہ)	=	۱۰۰ دوکڑا
(۱۲)	ایک دوکڑا	=	۱۶ بادام
(۱۳)	ایک روپیہ	=	۱۶۰۰ بادام
(۱۴)	۱۶ جیتل	=	ایک ٹنکہ سیاہ (۴ آنہ)
(۱۵)	۴ ٹنکہ سیاہ	=	ایک ٹنکہ سفید (روپیہ)

ٹکسال | سلاطین گجرات کے عہد میں مختلف مقامات میں ٹکسال قائم کئے گئے، ان میں سے زیادہ مشہور وہ مقامات ہیں جو گجرات کے پایۂ تخت تھے، ان میں سے ۴ شہروں کی خاص اہمیت ہے، ایک احمد آباد جو آخر تک مستقل پایۂ تخت سمجھا جاتا رہا، دوسرا احمد نگر (جس کو آج کل ہمت نگر، یا امر نگر کہتے ہیں، ایڈر کے پاس واقع ہے) تیسرا جوناگڑھ ہے، اصل جوناگڑھ کی آبادی جو قلعہ جوناگڑھ سے فاصلہ پر تھی، عرصۂ دراز سے ویران ہو گئی ہے، موجودہ جوناگڑھ کا اصلی نام مصطفےٰ آباد ہے، یہ سلطان محمود بیگڑہ کا آباد کیا ہوا ہے لیکن قلعہ سے متصل ہونے کے سبب اس کے اصلی نام کی شہرت نہیں ہوئی، اور جوناگڑھ (جو دراصل قلعہ کا نام ہے) کے نام سے مشہور ہو گیا، چوتھا شہر چاپانیر ہے، پاواگڑھ ایک مشہور پہاڑ ہے جس کے دامن میں چاپانیر نامی شہر قدیم زمانہ میں

آباد کیا گیا تھا، اور پہاڑ پر ایک مضبوط قلعہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، محمود بیگڑہ نے اس کو فتح کرکے پہاڑ کے دوسرے جانب ایک جدید شہر کی بنیاد رکھی، جس کا نام "محمد آباد" رکھا، جو دیکھتے ہی دیکھتے احمد آباد کے مقابل کا بہترین شہر ہوگیا، شاہ ہمایون اور سلطان بہادر کی جنگ مین یہ شہر آتش زدگی کے سبب سے ویران ہونا شروع ہوا، اور آج ایک مسجد کے سوا اس کا کوئی نشان باقی نہین ہے، سکّون مین ان چارون شہرون کے نام مندرجۂ ذیل طریقہ سے درج ہین

(۱) شہر معظم احمد آباد (۲) شہر ہمایون احمد نگر (۳) شہر مکرم محمد آباد (چانپانیر) (۴) شہر اعظم مصطفےٰ آباد (جوناگڑھ) باقی ٹکسالون کے نام جو مجھے دستیاب ہوئے مندرجۂ ذیل ہین: (۵) سورت، (۶) کھنبایت (۷) بھروچ، (۸) دیو، (۹) گودھرہ،

ان ٹکسالون مین زیادہ تر تانبہ اور چاندی کے سکّے ڈھالے جاتے تھے، یہان کا ڈھلا ہوا سونے کا کوئی سکہ آج تک نظر سے نہین گذرا، سونے کے جو سکّے مین نے دیکھے ہین، وہ زیادہ تر احمد آباد کے مسکوک تھے،

ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ ان سکّون مین "سلطان" کا لفظ کبھی نام کے آگے آتا ہے، اور کبھی پیچھے، گجراتی سکّے تمام عربی حروف اور عربی زبان مین ہین، صرف ایک سکّہ محمد شاہ ثانی کا فارسی نظم مین ہے، یہان جس قدر سکّے مجھے ملے ہین، انہی کے متعلق لکھا ہے، سلاطین گجرات کے اور سکّے جو مختلف قسم کے مسکوک ہوئے، اور مجھے نہین ملے وہ اس مین درج نہین ہین، گو دوسرون کی فہرست مین ہین،

سلطان مظفر اوّل گجرات مین تھاسرا مشہور جگہ ہے، وہان دو بھائی راجپوت خاندان کے رہتے تھے، جو غالباً گاؤن کے مُکھیا تھے، ایک کا نام سادھو اور دوسرے کا سہارن تھا، فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ) ابتداے شباب مین بغرض شکار اس علاقہ مین گیا، اور رات ہو جانے کے سبب سے اس مقام پر شب باش ہوا، ان دونون بھائیون نے اس کی بڑی خدمت کی، اس کے صلہ مین بادشاہ دونون کو دہلی ساتھ لایا، اور شراب داری کے عہدہ پر ممتاز کیا، آخر مین یہ دونون بھائیون نے اسلام قبول کرلیا، سہارن کو وجیہ الملک کا خطاب ملا، اسی کا لڑکا مظفر خان ہے،

یہ دہلی میں پیدا ہوا اور امیروں کے لڑکوں کے ساتھ پرورش اور تعلیم پائی، جب فیروز شاہ تغلق کا لڑکا محمد شاہ تغلق ۷۹۳ھ میں مستقل بادشاہ ہوا، تو گجرات کے ناظم نظام مفرح راستی خان کی بدانتظامی اور باغیانہ حالات معلوم کرکے مظفر خان کو وہاں کا ناظم مقرر کیا، اس نے راستی خان کو شکست دے کر ملک کا بہترین انتظام کیا، محمد شاہ تغلق ۷۹۵ھ میں وفات پاگیا، اور اس کا بیٹا سلطان محمود شاہ تخت نشین ہوا،

۸۰۱ھ میں تیمور شاہ نے دہلی فتح کرلی، اور لوٹ مار کر لوٹ گیا، اس ہنگامہ میں محمود شاہ نے بھاگ کر مالوہ میں پناہ لی، اور تیمور کی واپسی پر وہ بھی دہلی واپس آگیا، لیکن اب سلطنت کے تمام صوبہ دار تقریباً خود مختار ہوچکے تھے مرکز میں اتنا دم نہ تھا کہ صوبہ داروں کو قابو میں رکھ سکے، اور اوسکی حکومت "از دہلی تا پالم" رہ گئی تھی، درباری امراء اقتدار کے لئے اس میں رسہ کشی میں مصروف تھے،

سلطان محمد شاہ نے مظفر خان کے لڑکے محمد تاتار خان کو بطور ضمانت کے اپنے ہی پاس رکھ لیا تھا، اور اب اس کا شمار امیروں میں تھا، وہ ملو خان امیر سے شکست کھا کر اپنے باپ کے پاس گجرات چلا آیا، اور دہلی پر فوج کشی کی تحریک کی، مظفر نے صاف انکار کر دیا، اس نے کچھ امیروں کو ملا کر مظفر شاہ کو بھروچ میں نظربند کر دیا اور خود بادشاہ بن کر سکے جاری کئے، اور فوج لے کر دہلی روانہ ہوا، مگر کثرت شراب نوشی سے راہ میں ماہ شعبان ۸۰۶ھ وفات پاگیا،

محمد شاہ اول کے سکے | محمد شاہ اول کے تانبے کے سکے دو قسم کے دستیاب ہوئے ہیں، ایک کا نقش جو خالص تانبہ کا تقریباً ایک تولہ وزن کا ہوگا، یہ ہے،



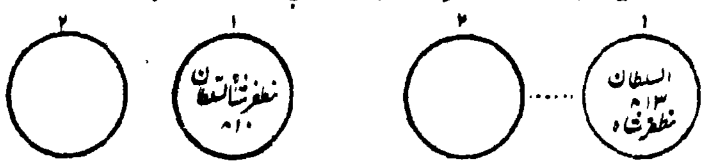


دوسرے کا نقش اس طرح ہے،

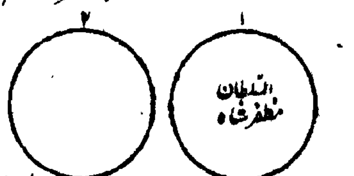
(۱)
الواثق بتائید الرحمٰن،
اتقی الدنیا والدین ابوالمغازی

(۲)
محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان

مظفر شاہ اول سلاطین گجرات کے جس قدر سکے آج تک دریافت ہوئے ہیں، اُن میں سب سے زیادہ نایاب سلطان مظفر اول کا سکہ ہی، غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے اس کی حکومت کی مدت بہت کم رہی، اس کا ایک بہت صاف سکہ ہوڈی والا کے پاس ہے جو مسٹر ٹیلر بی اے علیگ جوناگڈھی نے اُن کے نذر کیا تھا، باقی جسقدر سکے ملے ہیں سب مشکوک ہیں، میرے پاس جو سکے ہیں، وہ بھی سنہ کے اعتبار سے مشکوک ہیں، ایک سکہ جو مجھے ملا، اس کے ایک رُخ پر مظفر شاہ السلطان ہے، اور ۸۱۳ھ جیسا نظر آتا ہے، اور دوسرا رُخ پڑھا نہیں جاتا، غالباً شمس الدنیا والدین ہوگا، اسی طرح دوسرا بھی ہے جس پر ۸۱۰ھ جیسا نظر آتا ہے،



ایک دوسرا سکہ اور ہے جس کے ایک رُخ پر مظفر شاہ السلطان ہے اور دوسرا رُخ غیر ملفوظ ہے، اس میں صرف (۸) پڑھا جاتا ہے، اور چونکہ ۸۰۰ھ کے عدد میں اور کوئی دوسرا مظفر نہیں ہے، اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ سکہ مظفر اول ہی کا ہے،



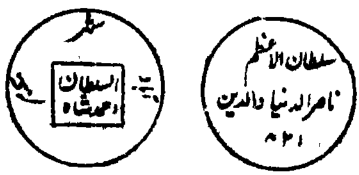
مظفر شاہ ۸۱۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے، اس لئے ۸۱۰ھ سے ۸۱۳ھ تک کوئی عدد ہوگا، باقی دائرہ کا نقش اس قدر گھس گیا ہے کہ شیشہ کی مدد سے بھی پڑھا نہیں جاتا،

سلطان احمد شاہ اول ناصر الدنیا والدین سلطان احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ اول دہلی میں پیدا ہوا، اور ایک عرصہ کے بعد وہ اپنے دادا مظفر شاہ کے پاس پٹن (گجرات) آیا، ۸۱۳ھ میں مظفر شاہ کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا، ۸۴۶ھ میں بمقام احمد آباد وفات پاکر مانک چوک کے مقبرہ میں دفن ہوا،

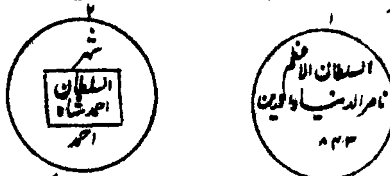
احمد شاہ اول کے سکے اس کثرت سے دستیاب ہوئے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا زمانہ گذر جانے پر بھی کس طرح اتنے سکے محفوظ رہے، ان میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے سکے ہیں، اس میں ایک طرف السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین وغیرہ

طرف احمد شاہ السلطان آمدکنارہ پر شہر ہمایون احمد نگر ہوتا ہے، عموماً اس کے سکے شہر معظم احمد آباد و شہر ہمایون احمد نگر کے مسکوک ہیں، ۸۱۵ھ، ۸۲۰ھ، ۸۳۰ھ، ۸۳۳ھ، ۸۴۱ھ، ۸۴۲ھ، ۸۴۰ھ، ۸۳۹ھ، ۸۴۳ھ، ۸۴۴ھ، ۸۴۵ھ کے سکے موجود ہیں،

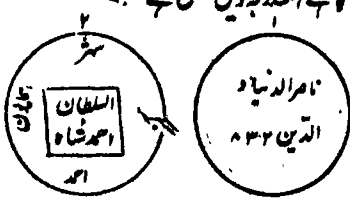
(۱) 

(۲) 

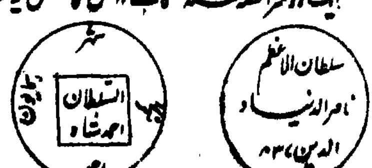
ایک دوسرا سکہ ۸۴۳ھ کا ہے، جس کا نقش مندرجہ ذیل ہے،

(۳) 

دوسرا گوشہ غیر ملفوظ ہونے کے سبب سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ احمد آباد ہے یا احمد نگر، یہ سب سکے تانبے کے ہیں، اس کے ایک سکہ میں جو تانبے کا ہے، مندرجہ ذیل نقش ہے :-

(۴) 

ایک دوسرا سکہ ۸۳۲ھ کا ہے، اس کا نقش یہ ہے :-

(۵) 

بنرہ کے سکے میں نگر کی کتابت بخط عربی ہے،

غیاث الدنیا والدین محمد شاہ ثانی	احمد شاہ کے بعد اس کا لڑکا محمد شاہ ثانی ۸۴۶ھ میں تخت نشین ہوا، اس کے دو قسم کے سکے دستیاب ہوئے ہیں، پہلے میں "غیاث الدین والدین محمد شاہ السلطان" ہے،

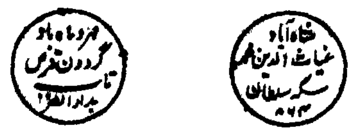
دوسرے میں ایک شعر فارسی کا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، اسلامی حکومت کی ابتدا سے محمد شاہ تک کسی نے فارسی میں اپنا سکہ نہیں رائج کیا، غالباً محمد شاہ ثانی گجرات کا پہلا بادشاہ ہے، جس نے مغلیہ سے پہلے سکہ

میں فارسی زبان استعمال کی، ورنہ عموماً سکہ کی زبان عربی ہوتی تھی، البتہ غزنوی غوری ناتش وغیرہ نے ہندی الفاظ سکہ میں مسکوک کرائے، مثلاً شری سلطان وغیرہ، شعر

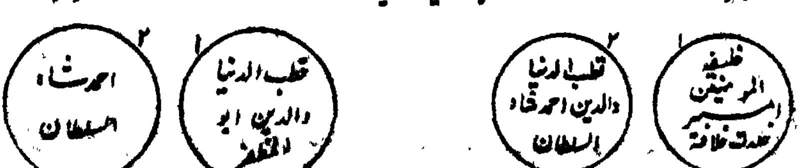
سکۂ سلطان غیاث الدین محمد شاہ باد   تا بدار العزب گردون قرص مہر و ماہ باد



السلطان کا لفظ محمد شاہ کے نیچے دیا گیا ہے، ۸۵۵ھ میں اس نے وفات پائی۔



قطب الدنیا والدین احمد شاہ ثانی | سلطان قطب الدین کا اصلی نام احمد ہے، وہ اپنے خاندان میں دوسرا احمد ہے، اپنے باپ محمد شاہ ثانی بن احمد شاہ اول بن محمد شاہ اول بن مظفر شاہ اول کے انتقال کے بعد ۸۵۵ھ میں تخت پر بیٹھا، اس کے بھی دو قسم کے سکے ملے ہیں، ایک عام قسم کا سکہ جس پر قطب الدنیا والدین ابو المظفر احمد شاہ السلطان ہے، دوسرا سکہ غالباً اس کے اخیر زمانہ کا ہے، جب کہ مصری خلافت کا وفد یہاں آیا تھا اور اسکی جانب سے خلیفہ امیر المومنین کا خطاب اس کو ملا تھا، چنانچہ سکہ میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے، خلیفہ امیر المومنین خلدت خلافتہ ۸۶۱ھ قطب الدنیا والدین احمد شاہ السلطان، اس کا نقش اس طرح ہے



اس کے مختلف سکے ۸۵۶ھ تا ۸۶۲ھ کے ملے ہیں بعض سکوں میں صرف ۸ھ پڑھا جاتا ہے، باقی حروف مٹ گئے ہیں، اور کچھ سکے بغیر سنہ کے بھی ملے ہیں، ۸۶۳ھ میں قطب الدین نے وفات پائی،

سلطان داؤد شاہ | سلطان قطب الدین کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، اس لئے اس کے بعد امیروں نے سلطان

داؤد کو تخت نشین کیا، جو سلطان احمد شاہ اول کا نبیرہ تھا، لیکن اس کے اخلاق وزیروں کو پسند نہ آئے، اس لئے ایک ہفتہ کے بعد معزول کر دیا، اس کا کوئی سکہ میری نظر سے نہیں گذرا،

سلطان محمود شاہ اول عرف بیگڑہ ناصر الدنیا والدین

سلطان محمود شاہ بروز یک شنبہ ۱ شعبان ۸۶۳ھ میں احمد آباد کے تخت پر جلوس فرما ہوا، یہ قطب الدین کا سوتیلا بھائی اور محمد شاہ ثانی بن احمد شاہ اول بانی احمد آباد کا لڑکا ہے، اس کی والدہ سلطان جام سندھ کی شاہزادی تھی، ۱۹۲۱ء میں اس کے اور احمد شاہ اول کے سکے جمعہ بازار میں اس کثرت سے ملتے تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، یہ سکے ہر قسم کے اور ہر سائز کے تھے، روپیہ، پیسہ، دھیلا وغیرہ مگر دوسری جنگ کے بعد سے اب نہیں ملتے، سب کو ڈھال کر تانبہ بنا لیا گیا، جن کی ضرورت میدان جنگ میں اس وقت بہت تھی،

واضح رہے کہ تمام گجراتی سکوں پر خواہ وہ سونے کے ہوں، یا چاندی کے یا تانبے کے ایک قسم کا نقش ہوتا تھا، اس کا افسوس ہے کہ گجراتی بادشاہوں کے سب طلائی سکے نظر سے نہیں گذرے لیکن سلطان محمود اول، اور سلطان مظفر ثانی بن محمود اول کے طلائی سکے کھمبائت اور احمد آباد میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً تمام سلاطین کے مسکوک ایک ہی طرح کے ہیں، چاندی، سونے اور تانبے کے سکے گول وزنی تقریباً ایک تولہ کے ہوتے تھے، محمود اول کے چاندی کے سکے کئی بار وزن کئے، سب ایک تولہ کے نکلے،

سلطان محمود کے طلائی سکے میں تحریر ہے "السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ السلطان"،

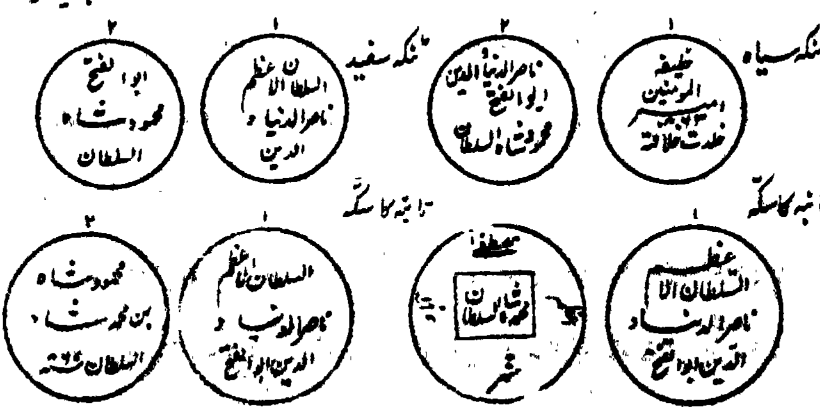
چاندی کے سکے کے نقوش مختلف ہیں، بعض پر مندرجۂ بالا تحریر منقوش ہے، اور بعض پر احمد آباد مصطفیٰ آباد وغیرہ کا اضافہ ہے، ایک تیسرے قسم کا سکہ ہے جس میں چاندی کم اور تانبہ زیادہ ہے، غالباً اسی کو ٹنکہ سیاہ کہتے تھے، یہ بھی دوسرے سکوں کی طرح گول، وزنی تقریباً ایک تولہ کا ہوگا، یہ سکہ غالباً ابتدائی زمانہ کا ہے، جو قطب الدین کے آخر زمانہ میں مسکوک ہوا، اور اس کے بعد وہی سکہ محمود کے نام سے جاری کیا گیا، عبارت یہ ہے:-

"خلیفۃ امیر المومنین خلدت خلافتہ ناصر الدنیا والدین ابو الفتح محمود شاہ السلطان"

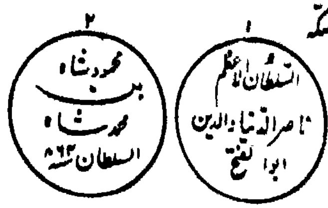
اسی طرح کے سکے تانبے کے بھی ہیں چھوٹے سکوں میں دھیلا، دوکڑہ وغیرہ بھی نظر سے گذرے، پایان بھی ملیں، مگر کسی پر قیمت نہیں لکھی ہے، جس طرح آج ہر بڑے چھوٹے سکہ پر قیمت نقش ہوتی ہے، اس طرح گجراتی سلاطین کے سکوں میں قیمت درج نہیں ہوتی تھی، اور صرف قیاس سے اُن کی قیمتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں،

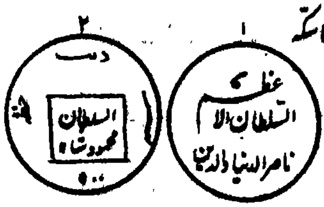
سلطان محمود نے تقریباً پچاس برس حکومت کی، ۹۱۷ھ میں وفات پائی، شیخ احمد کھٹو رحمہ اللہ کے مقبرہ کے پاس تالاب کے کنارہ پر مدفون ہوا، اس کا عرف بیگڑا (بہ واو مجہول ہے) گجراتی میں بیگڑا اس بیل کو کہتے ہیں جس کی سینگیں لمبی ہوکر اس طرح مڑجائیں جس طرح انسان کسی کو آغوش میں لینے کے لئے دونوں ہاتھ بڑھاتا ہے، اس کے مقابلہ میں بھیلو (بہ واو مجہول) کا لفظ ہے جو ایسے بیلوں کو کہتے ہیں جن کی سینگیں چھوٹی ہوں، محمود بیگڑا کی مونچھیں اس قدر لمبی تھیں کہ وہ سینگوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں، کبھی کبھی وہ ان کو کانوں میں لپیٹ لیا کرتا تھا، عربی زبان میں ایسے آدمی کو "ذوالقرنین" کہتے ہیں"

سلطان محمود کی وفات کے بعد صرف ایک ہی لڑکا زندہ رہا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا، محمود اپنے بعض سکوں میں اپنے باپ کا نام بھی تحریر کرتا ہے، السلطان الاعظم ناصر الدنیا والدین ابوالفتح محمود شاہ بن محمد شاہ السلطان ۸۶۳ھ، مندرجۂ ذیل سنوں کے سکے میرے پاس موجود ہیں، ۸۶۳ھ، ۸۶۹ھ، ۸۷۰ھ، ۸۷۶ھ، ۸۸۰ھ، ۸۸۱ھ، ۸۸۲ھ، ۸۸۳ھ، ۸۸۶ھ، ۸۸۸ھ، ۸۸۹ھ، ۸۹۱ھ، ۸۹۳ھ، ۹۰۰ھ، ۹۰۲ھ، ۹۰۳ھ، ۹۰۶ھ، ۹۰۷ھ، ۹۰۸ھ، ۹۰۹ھ، ۹۱۰ھ، ۹۱۱ھ، ۹۱۲ھ، ۹۱۶ھ، ۹۱۷ھ، بعض سکوں کے نقوش مندرجۂ ذیل ہیں:



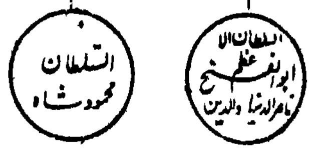
تانبہ کا سکہ ۱ ۲ جزیرہ دیو کا سکہ ۱ ۲





سلطان محمود اول کا ایک چاندی کا سکہ مندرجۂ ذیل ہے،

نقرئی سکہ، ۱ ۲



سلطان مظفر حلیم ثانی سلطان محمود بیگڑہ کے انتقال کے وقت اس کے چار لڑکون مین صرف یہی ایک لڑکا زندہ تھا، اس کا نام مظفر خان تھا، سنہ ۹۱۷ھ مین تخت نشین ہوا، سلاطین گجرات مین اس سے بڑھ کر کوئی عالم نہین ہوا، حافظ قرآن تھا، حدیث مین بھی ماہر تھا، اگر بادشاہ نہ ہوتا، تو گجرات کا بڑا محدث شمار ہوتا، طبیعت کا بڑا حلیم تھا، اسی لئے اس کو سلطان مظفر حلیم کہتے تھے، اس کے اساتذہ مین بڑے بڑے مشہور لوگون کے نام آتے ہین، فن خطاطی مین بھی اس کو کمال تھا، سال مین دو قرآن پاک اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ اور مدینہ (شرفہما) بھیجا کرتا تھا، اس کی بیگم بھی جام سندھ کی شاہزادی تھی، اس کے عہد کے سونے چاندی اور تانبہ ہر طرح کے سکے نظر سے گذرے، پیسہ، دھیلا، دوکڑا، وغیرہ بھی اس کے عہد مین بکثرت مسکوک ہوئے، مختلف سکون پر مختلف عبارتین درج ہین "شمس الدنیا والدین" اس کا خطاب اور ابو النصر کنیت ہے،

سونے کا جو سکہ کھنبایت مین نظر سے گذرا، وہ زمین کھودتے وقت ایک شخص کو دستیاب ہوا تھا، اس کا نقش بالکل چاندی کے سکہ کی طرح ہے، اور اس پر "المؤید بتائید الرحمن شمس الدنیا والدین ابو النصر مظفر شاہ محمود شاہ السلطان سنہ ۹۳۰ھ درج ہے،

چاندی کے سکے مین مختلف عبارتین درج ہین، کسی مین اس کا تنہا نام ہے اور کسی مین اس کے باپ کا بھی نام ملتا ہے، کسی مین مظفر بن محمود ہے، اور کسی مین مظفر محمود ہے، یعنی بن کا لفظ نہین ہے، اس کی شکلین یہ ہین،

طلائی سکہ محمودی چاندی کا سکہ ٹنکہ







یہ تانبہ کا سکہ غالباً دھیلا ہے، دین کے نیچے کا حصہ مٹ گیا ہے غالباً کنیت ابو النصر ہوگی،

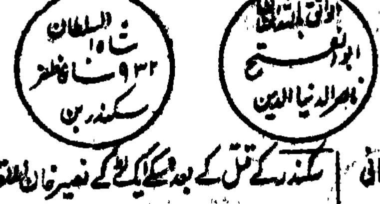
اس کا ایک سکہ اور دستیاب ہوا ہے جس میں نہ سنہ ہے، اور نہ کنیت، اس لئے مجھے وہ مشکوک نظر آیا ممکن ہو کہ وہ مظفر آخری سلطان کا ہو، اس کا نقش یہ ہے:-



اس میں معتصم کا لفظ مشتبہ ہے، کیونکہ مظفر شاہ حلیم کے عہد تک کسی نے ہندوستان میں خلفائے عباسیہ کے القاب اختیار نہیں کئے تھے، سنہ ۹۳۲ھ میں اس کا انتقال ہوا اور سرکھیج میں باپ کی قبر سے متصل دفن کیا گیا،

سلطان سکندر بن مظفر شاہ ثانی ناصر الدنیا والدین	مظفر شاہ حلیم کے انتقال کے بعد اس کا بڑا لڑکا سکندر شاہ سنہ ۹۳۲ھ میں تخت نشین ہوا یہ بڑا خوبصورت نوجوان تھا، چیزوں کی ایجاد کا شوق رکھتا تھا لیکن دو ہی

مہینہ کے اندر قتل کر دیا گیا، اس کا صرف ایک سکہ دستیاب ہوا ہے جو بمبئی میوزیم میں ہے،



محمود شاہ بن مظفر شاہ ثانی برادر سکندر	سکندر کے قتل کے بعد اسکے ایک لڑکے نصیر خان الملقب بہ محمود ثانی کو جس کی عمر چھ سال تھی، امیر الامراء عماد الملک نے تخت نشین کیا، اس کے صرف دو سکے مجھے ملے ہیں مگر

عدد ۳ "کٹ گئے" ہیں بہادر شاہ چانپانیر سے شمس گڑھ محمود آباد میں تخت نشین ہوا تھا، اسی لئے سکہ بھی اسی جگہ مسکوک ہوا،

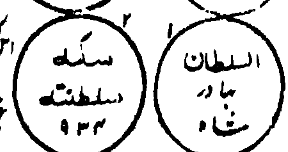


یہ سکہ تانبہ کا ہے اور چھوٹا ہے،

سلطان بہادر شاہ بن مظفر شاہ ثانی

سکندر کی موت کے وقت اس کا چھوٹا بھائی بہادر شاہ دہلی میں تھا، موت کی خبر سن کر گجرات آیا اور ۲۶ رمضان ۹۳۲ھ کو احمد آباد میں تخت نشین ہوا، اور عید بعد چانپانیر پہنچا، اور محمود شاہ ثانی کو قتل کرکے وہاں دوبارہ تخت نشین ہوا، اس کے سکے مختلف قسم کے دستیاب ہوئے ہیں سب تانبہ کے ہیں، چاندی یا سونے کا کوئی سکہ نہیں ملا، ان کے نقش یہ ہیں،





اس کا دوسرا رخ غیر محفوظ ہے



سلطان محمود شاہ ثالث بن لطیف خان

رمضان ۹۴۳ھ میں بہادر شاہ دیو کے پاس سمندر میں غرق ہوگیا، اور گیارہ برس کی عمر میں سلطان محمود بن لطیف خان بن مظفر ثانی یعنی بہادر شاہ کا بھتیجا ۹۴۳ھ میں تخت نشین ہوا،

اس بادشاہ کے سکے بھی بہت ملے ہیں، اور مختلف القاب کے ہیں، ان القاب کے بار بار بدلنے کے اسباب تاریخ میں نہیں ملے، ابتدا میں وہ مختلف وزیروں اور امیروں کے ماتحت نظر بند رہا، اور آخر میں خود مختار ہوا، ممکن ہے ہر امیر نے نئے خطاب سے سکہ مسکوک کرایا لیکن زیادہ تر ناصر الدنیا والدین ہی کا خطاب سکوں میں ملا، اس لئے اصلی اور پہلا خطاب اسی کو سمجھنا چاہئے۔

(۱)



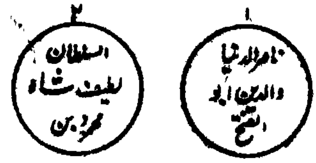
(۲)

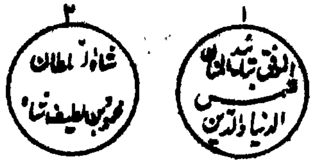


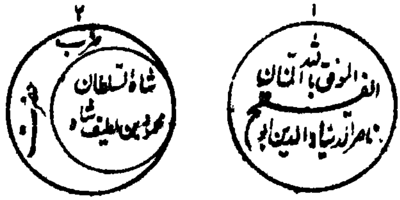
(۳)



نمبر ۲ کے کناروں پر جو کچھ لکھا تھا وہ گھس گیا ہے

۴


۵


۶


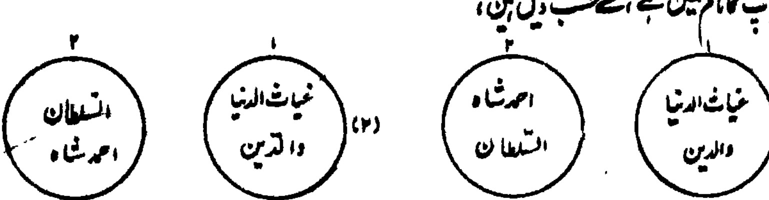
اس کے دوسرے رُخ کے اطراف مین ضرب حضرت صرف ملفوظ ہوا، تیسرے طرف احمدآباد یا محمودآباد ہونا چاہیئے، کیونکہ انہی دو جگہون مین اس کا قیام رہتا تھا"

اس کے ایک طلائی سکہ کا نقش یہ ہے :-

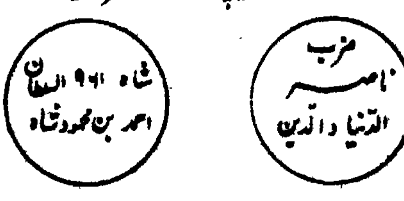
۷


۱۳ ربیع الاول ۹۶۱ھ مین بمقام محمودآباد شہید کردیا گیا، اور محمود بیگڑا کے مقبرہ مین دفن ہوا،

سلطان احمد شاہ سوم | سلاطین گجرات مین احمد شاہ تین ہوئے ہین، اول احمد شاہ بانی احمدآباد، اور دوسرا اسی کا پوتا قطب الدین احمد شاہ بن محمد شاہ بن احمد شاہ بانی احمدآباد، اور تیسرا بہادر شاہ کے بھتیجے محمود شاہ بن لطیف شاہ کے بعد احمد شاہ، اول اپنے سکہ مین "ناصر الدنیا والدین" مسکوک کرتا تھا، دوسرا احمد "قطب الدنیا والدین" تحریر کرتا تھا، اس لئے جن سکون کا آگے ذکر کیا جائے گا وہ قطعاً اسی تیسرے احمد کے ہونگے، جس کے سکہ مین "غیاث الدنیا والدین" ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی دوسرا سلطان احمد گجرات مین نہین ہوا، جو اپنے کو غیاث الدین لکھتا ہو، اُن مین سے دو سکون پر باپ کا نام نہین ہے، سکے حسب ذیل ہین،

(۱) (۲)


پہلے سکہ مین سلطان کا لفظ احمد شاہ کے نیچے ہے، اور دوسرے مین احمد شاہ کے اوپر ہے،

(۳)


(۴) اسی قسم کا ایک اور سکہ ہے :-

۱


۵

۲


ان تینون سکون پر غور کرنے سے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ احمد شاہ ثالث ہی کے ہین، کیونکہ سکون مین سنہ صاف پڑھا جاتا ہے یعنی سنہ ۹۶۲ھ، باقی ایک اور ۲ کا ہندسہ ذرا صاف نہین ہے، اور گجرات کے تخت پر سنہ ۹۶۱ھ سے سنہ ۹۶۸ھ تک کوئی دوسرا شخص، احمد نامی نہین بیٹھا، البتہ تاریخ گجرات مین کوئی ایسا احمد نہین ہے جس کے باپ کا نام محمود شاہ ہو، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح محمود شاہ بن لطیف شاہ ہے، اسی طرح احمد شاہ بن محمود شاہ ہوگا، یعنی لطیف شاہ بادشاہ نہ تھا، بلکہ فقط خاندان شاہی مین سے ایک شاہزادہ تھا، اسی طرح محمود شاہ ہوگا، لیکن مرأۃ سکندری مین اس کا نام "احمد شاہ بن لطیف خان بن نبیرۂ لشکر خان بن سلطان احمد بانی احمد آباد لکھا ہوا ہے، اور ظفر الوالہ مین احمد شاہ بن لطیف خان بن نظام خان بن لشکر خان بن سلطان احمد اول تحریر ہے، اور فرشتہ احمد ثانی یعنی قطب الدین کے اولاد سے بتلاتا ہے، جو صحیح نہین ہے، کیونکہ قطب الدین کے کوئی نرینہ اولاد تھی ہی نہین، ممکن ہے کہ نواسون مین ہو،

اس لئے مندرجۂ بالا امور کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ تاریخون مین احمد شاہ اور لطیف خان کے درمیان محمود خان کا نام غلطی سے رہ گیا ہے، جس کی تصدیق سکون سے ہوتی ہے،

مظفر شاہ رابع عرف ننھو | اس کا اصل نام ننھو ہے، ہندوستان اور گجرات مین ننھا ننھو، چھوٹے بچون کو پیار سے کہتے ہین، اور بعض لوگون کی آخر عمر تک اسی نام سے شہرت رہتی ہے، مرأۃ احمدی مین اس کا نام نتھو (بہ تائے ہندی) مرقوم ہے جو کتابت کی غلطی ہے، کیونکہ طبقاتِ اکبری مین بھی ننھو (ن) سے ہے، شاہانہ لقب سے یہ چوتھا مظفر ہے لیکن سلطان مظفر سوم صرف چند دن بادشاہ رہا، اس لئے عام طور پر اس کو مظفر سوم ہی سمجھا جاتا ہے، یہ ابھی خورد سال تھا کہ سلطان احمد کے انتقال کے بعد سنہ ۹۶۸ھ مین تخت نشین ہوا، اعتماد خان وزیر نے قسم کھا کر کہا تھا کہ "یہ محمود بن لطیف خان کا لڑکا ہے" یہ گجرات کا آخری بادشاہ ہے سنہ ۹۸۰ھ تک

اس کی حکومت رہی، پھر اکبر بادشاہ سلطان مظفر کو آگرہ لیتا گیا، اور عرصہ تک نظر بند رکھا، مگر جب گجرات پر اس کا مکمل تسلط ہوگیا، تو پھر سلطان مظفر کی نگرانی کی جانب زیادہ توجہ نہ کی، اور اس نے موقع پاکر راہ فرار اختیار کی، اور گجرات پہنچکر آکر مدعی سلطنت ہوگیا، اور عرصہ تک کاٹھیاواڑ میں شورش برپا کرتا رہا، آخر سنہ۱۰۰۰ھ میں گرفتار ہوا، مگر راستہ میں اُس نے اُسترہ سے خودکشی کرلی،

اُس کے سکے تین قسم کے ہیں، اول خاص مظفر کے سنہ۹۶۹ھ سے سنہ۹۸۰ھ تک کے، دوسرے اس کے بعد سنہ۱۰۰۰ھ تک، اور تیسرے جام اور پوربندر کے، اس کا اپنا خاص سکہ جو سنہ۹۶۹ھ سے شروع ہوتا ہے، اس کے پہلے رُخ پر "المؤید بتائید الرحمٰن شمس الدنیا والدین" اور دوسرے پر "مظفر شاہ السلطان" باقی اطراف کی تحریر پڑھنے میں نہیں آتی،





میرے پاس مختلف قسم کے سکے ہیں بعض بڑے موٹے اور دبیز، بعض چھوٹے بعض پتلے، چپٹے، اور بڑے بعض چھوٹے، اُن کے سنہ مختلف ہیں، اور سنہ۹۷۹ھ، ۹۶۹، سنہ۹۷۰ھ کے متعدد سکے ہیں بعض کے اعداد صاف نہیں پڑھے جاتے، ایک اور قسم کا سکہ بھی مسکوک ہوا تھا، اس میں تانبے کا پیسہ دھیلا، وغیرہ ہر طرح کے موٹے پتلے اور چھوٹے بڑے سکے ہیں، اُس کے ایک رُخ پر "المؤید بتائید الرحمٰن ابو النصر ناصر الدنیا والدین" اور دوسرے پر "مظفر شاہ بن محمود شاہ السلطان" ہے، میرے پاس اس قسم کے ۵۲ سکے ہیں، ان میں سے ۴ سکے سنہ۹۸۰ھ کے بعد کے ہیں یعنی سنہ۹۸ھ تحریر ہے، ۰ کا عدد کٹ گیا ہے، اور ۴ سکے اسی طرح سنہ۹۷۰ھ کے بعد کے ہیں، ایک سکہ پر البتہ صاف طور پر سنہ۹۷۰ھ درج ہے باقی سکوں کے سنہ صاف طور پر نہیں پڑھے جاتے





ایک سکہ چاندی کا بھی ملا ہے، جس کو مظفری کہتے تھے، اس کا نقش یہ ہے،

اسی نقش کا ایک سکہ طلائی بھی ملا ہے، اور اسی نقش کا تانبہ کا بھی دیکھا،

۲ ۱

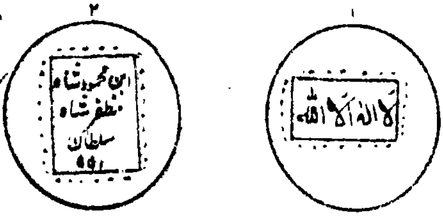


ایک سکہ اور ملا ہے، جو اُس کے آگرہ سے بھاگ آنے کے بعد کا ہے، یہ ایک طرح سے اکبر کے سکہ کی نقل ہے،

یعنی اس کے ایک رُخ پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ اور دوسرے پر "سلطان مظفر شاہ بن محمود شاہ" ہے،

نقطوں کے بعد دونوں رُخ کے حاشیہ میں کچھ لکھا ہے جو کٹ گیا ہے،

۲ ۱



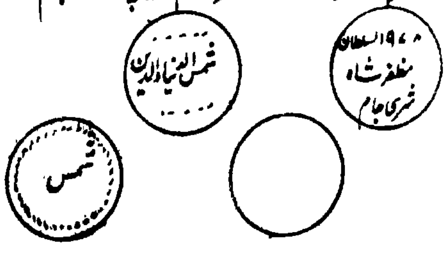
اس کا ایک اور سکہ سنہ ۹۷۸ھ کا ہے، جس پر "شمس الدنیا والدین مظفر شاہ السلطان سنہ ۹۷۸ھ" تحریر ہے، اسی طرح ایک سکہ جو پائی معلوم ہوتی ہے، اس پر سنہ ۹۸۰ھ درج ہے، اسی قسم کا ایک سکہ دھیلا معلوم ہوتا ہے، جو چھوٹا سا گول ہے، اس پر سنہ ۹۷۱ھ منقوش ہے،

سنہ ۹۸۰ھ کا بھی تانبہ کا ایک سکہ ہے، اس کے کنارے پر شاید، احمد آباد تحریر ہے جو کٹ گیا ہے،

مظفری جامی | سنہ ۹۷۸ھ میں سلطان مظفر ثالث نے جام نگر (کاٹھیاواڑ) کے راجہ جام کو سکہ ڈھالنے کی اجازت دی، اس لئے اس نے ہر سکہ پر اسی سنہ کو بطور یادگار قائم رکھا، جو پڑھنے میں سنہ ۹۷۱ھ یا سنہ ۹۷۸ھ نظر آتا ہے، یہ سب تانبے کے ہیں، چاندی یا سونے کا سکہ نظر سے نہیں گذرا،

جام کے زیادہ دبیز، وزنی اور بڑے سکے میرے پاس زیادہ ہیں جن کے ایک رُخ پر "شمس الدنیا والدین" دوسرے پر "مظفر شاہ السلطان (یا السلطان مظفر شاہ) نیچے سری جام" اور اوپر سنہ ۹۷۸ھ نقش ہے،

۱ ۲



شری جام کا لفظ گجراتی خط میں ہے، بعد کے سکوں میں اول رخ پر شمس الدنیا والدین کا لفظ مٹ گیا ہے اور آخر کے سکوں پر فقط شمس رہ گیا، باقی جگہوں میں صرف لکیریں ہیں، اس قسم کے سکے میرے پاس بہت ہیں،

محمودی جامی | یہ عجب بات ہے کہ سلطان محمود بن لطیف کے نام سے بھی جام نے سکے ڈھالے ہیں جس سے اوپر کا نظریہ باطل ہو جاتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جب مغلیہ عہد میں جام کو سکے ڈھالنے کی ممانعت کر دی گئی تو اس نے بجائے . . . مظفری کے محمودی نقش کرانا شروع کر دیا، اس کے ایک رخ پر محمود شاہ لطیف شاہ اور نیچے شری جام گجراتی میں ہے، دوسری جانب شمس الدنیا والدین ہے، اور اس کے نیچے کٹار کی شکل منقوش ہے، یہ سکہ دبیز اور وزنی ہے، سنہ کوئی نہیں ہے، یہ سکے بھی بڑی تعداد میں ملے ہیں، اور سب تانبے کے ہیں،



راناپوربندر کی مظفری | رانا پوربندر (کاٹھیا واڑ) نے بھی مظفری مسکوک کی، اس کے ایک رخ پر مظفر شاہ السلطان اور اس کے نیچے رانا لکھا ہوا ہے، اور دوسری طرف شمس الدنیا والدین ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جام کو دیکھ کر رانا نے بھی سکے مسکوک کرنا شروع کر دیئے تھے، سنہ اس میں بھی نہیں ہے، لیکن جام کی طرح اس کا بھی دوسرا رخ بگڑ گیا ہے جس میں صرف شمس پڑھا جاتا ہے، باقی لکیریں نظر آتی ہیں، و نیز تیکھے چھوٹے بڑے سب قسم کے تانبے کے سکے موجود ہیں۔

34184

خلفائے راشدینؓ

اس میں خلفائے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا مفصل بیان ہے، قیمت:- ۵ر طبع چہارم (مرتبہ مولانا حاجی معین الدین ندوی مرحوم)

"منیجر"

اردو شاعری اور سیاست

از

جناب کلب علی خان صاحب رامپوری

اردو میں سیاسی شاعری کا وجود اکثر ارباب ادب کے نزدیک بیسوین صدی عیسوی سے پایا جاتا ہے، اس سے قبل کہین کہین معمولی سے اشارے ملتے ہین، اس مسئلہ مین آزاد اور حالی کی نظمون کو بنیاد اولین مان لیا گیا ہے، غدر سے قبل کی شاعری صرف گل و بلبل، ہجر و وصال، رقیب و دربان مین اور کنگھی چوٹی مین الجھی ہوئی تھی، اور اگر کسی نے قومی نظریہ پر لکھنا چاہا، تو صرف ہندو اور مسلمانون کے نقطۂ نظر سے لکھا گیا، حالی کی مسدس[۵۱] اسی کی آئینہ دار ہے،

تحریک[۵۲] آزادی | اردو کا سیاسی رجحان ۱۹۱۹ء کے بعد بالعموم ہندوستان کی ہر سیاسی قابل قدر اور ہر دل عزیز تحریک سے متاثر ہوتا رہا ہے، اب مزید مطالعہ کے بعد اس نظریہ مین تبدیلی ہوئی ہے اور ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان[۵۳] مین قومیت کا وہ نظریہ نہین تھا جس کو آج دنیا زندگی سمجھتی ہے، خود یورپ مین قومیت کا جدید تصور اٹھارہوین صدی کے دوسرے نصف سے مانا جاتا ہے، اس سلسلہ مین اردو ادب کی چھان بین کسی نے گہری نظر سے نہین کی، اور ادھر ادھر سے جو نمونے پیش کئے گئے ہین، وہ کسی حد تک بھی قابل اطمینان نہین، اور یہ بطور کلیہ کے مان لیا گیا ہے کہ اردو شاعری کا رجحان زمانہ کے حالات اور تقاضون کے بالکل

---

۵۱ نئے ادبی رجحانات ص ۹۰، از ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب ۵۲ ایضاً ص ۱۲۶

۵۳ فن کار اکتوبر نومبر ۱۹۵۳ء،

خلاف دیا، اور شعرائے اردو کسی اور دنیا کے رہنے والے تھے جو ملک کے حالات سے بے خبر رہے، اور سوائے غزل کے فرسودہ مضامین کے اُن کو نئی شاہراہیں نہ مل سکیں، اس صحبت میں ہم اس غلط خیال کی تردید کے لئے اجمالاً مشاہیر شعرائے اردو کے کلام سے ایسے اشعار پیش کریں گے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیگی" کہ ہمارے شعراء زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر نہیں تھے، اور اُن کی نظر میں سیاست کا خاکہ تھا گو دھندلا ہی سہی شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام کے خلاف جو آوازیں ہمیں تھوڑے دنوں سے سنائی دیتی ہیں، وہ اردو دواوین میں دوسو سال پہلے سے سنائی دے رہی تھیں،

اردو شاعری میں جو سرمایہ فارسی سے منتقل ہوا، وہ غزل کی قدیم روایات تھیں، متقدمین نے انھیں سرآنکھوں پر رکھا، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستانی رسم و رواج، ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا پورا خاکہ بھی اپنے اشعار میں کھینچا، شیر شاہ سوری نے جس اتحاد قومی کی بنیاد ڈالی تھی، اور اکبر نے جس کو پروان چڑھایا تھا، وہ اگرچہ حکومت کے انحطاط کے ساتھ کمزور پڑ گئی لیکن اتحاد قومی کا دامن کبھی بھی پارہ پارہ نہ ہو سکا، اورنگزیب کی موت مغلیہ سلطنت کے لئے پیغام زوال تھی، اس کے جانشین خود اپنی حفاظت ہی نہ کر سکتے تھے تو ملک کی حفاظت کیا کرتے، ملک مختلف سیاسی، قومی اور مذہبی تحریکوں میں بٹ گیا، آصف جاہ اول نے جنوبی ہند کے چھ صوبے دبا لئے، بنگال کا صوبہ دار خود مختار ہو گیا، گجرات اور راجپوتانہ کے علاقے مرکز سے باغی ہو کر الگ ہو گئے، باہمی سازش اور جوڑ توڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں نے صوبہ احمد آباد وغیرہ سے اُبھر کر پورے ہندوستان کو زیر و زبر کر ڈالا، اور بوڑھا بہادر شاہ اول چار برس میں ناکام زندگی گذار کر چل بسا، بیٹے نااہل تھے آپس میں ٹکرا گئے، جہاندار شاہ کامیاب رہا، مگر جو تلوار کی چمک سے گھبرا جائے، وہ ہندوستان کے تخت پر کس طرح رہ سکتا تھا، چنانچہ کچھ دنوں بعد جہاندار شاہ قتل ہوا، اور عنانِ حکومت فرخ سیر نے سنبھالی، اس کو سید برادران نے حکومت بخشی تھی، اور انہی کے ہاتھوں چند سال بعد یہ نام نہاد شاہنشاہ ہندوستان قتل ہوا، مرزا بیدل جو سید برادران کے وظیفہ خوار تھے خاموش نہ رہ سکے اور کہا سادات بوئے نمک حرامی کردند

دہلی مین چند مہینون کے اندر کئی بادشاہ ان بھائیون نے بنا ڈالے، آخر قرعۂ فال محمد شاہ کے نام پڑا، سید بھائی ایرانی تورانی عصبیت کا شکار ہوکر بادشاہ گری کے منصب سے معزول و مقتول ہوئے، محمد شاہ کا آغاز سلطنت ایسا دکھائی دے رہا تھا، کہ یہ ڈوبتی ہوئی کشتی شاید منجدھار سے نکل جائے، لیکن جوانی دیوانی مشہور ہی، محمد شاہ با جیسا عزم کہان سے پیدا کرتا، دہلی کی نام نہاد شاہی پر قناعت کرکے داد عیش و نشاط دینے لگا، امراء ایرانی تورانی گروہ مین بٹ گئے، راجپوتون نے مرکز سے رابطہ چھوڑ دیا، ایسی حالت مین مرہٹون کا عزم تسخیر پھر کیون کا مینا نہ ہوتا، صوبہ دار باغی ہوگیا، دہلی کے متصل صوبے اگرچہ اہل امرار کے ہاتھون مین تھے لیکن مرکز کی کمزوری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک نے اپنی فکر شروع کردی، روہیل کھنڈ مین روہیلہ افغانون نے ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی محمد خان بنگش نے دوسری ریاست فرخ آباد قائم کی، برہان الملک نے اودھ کی حکومت کا ڈھانچہ کھڑا کیا اس انتشار کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرہٹون نے ۱۱۴۹ھ مین دہلی پر پہلا حملہ کرکے مرکزی حکومت کو میدان جنگ مین نیچا دکھا دیا، ۱۱۵۱ھ مین نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کرکے دہلی کو زیر و زبر کر ڈالا جس کا تصور بھی نہین کیا جاسکتا[۱]، یہی زمانہ ہماری اردو شاعری کا زرین دور کہلاتا ہے، متقدمین اردو شاعری کے اولین معمار ہی نہ تھے، بلکہ بعض حیثیتون سے اسکے خاتم بھی تھے چنانچہ سودا اور میر کا ثانی پیدا نہ ہوسکا، اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ ان شعراء نے اپنے عہد کی ترجمانی کس حد تک کی ہے، ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اردو شعراے متقدمین و متوسطین نے اپنے احول کی جو عکاسی کی ہے، اس سے بہتر ممکن ہی نہین ہے، ہندوستان اُس زمانہ مین جس تاریخی دور سے گذر رہا تھا، اُس کا پورا پورا نقشہ ہماری نظرون کے سامنے اردو شعراء نے پیش کردیا ہے،

شعبان ۱۱۴۲ھ مطابق مارچ ۱۷۲۹ء	ہولی کے دنون مین دہلی مین ایک ہندو جوہری کے ہاتھ سے ایک مسلمان جوتہ فروش[۲] مارا گیا، اس کا بڑا ہنگامہ ہوا، یہان تک کہ خطیب (روز جمعہ جامع مسجد دہلی) کو

[۱] اس مین اختلاف ہو کہ اس حملہ مین کتنے آدمی مرے آٹھ ہزار ڈیڑھ لاکھ تک تخمینہ کیا گیا ہو... لوٹ کا تخمینہ کوئی ستر کروڑ کوئی پندرہ کروڑ لکھتا ہے جواہرات علاحدہ رہے، تاریخ ہند ذکاء اللہ ج ۹ ص ۲۰۰، ص ۲۵۹ [۲] روز جمعہ دہم شعبان ۱۱۴۲ھ ہجری

منبر پر سے کھینچ لیا گیا ، روشن الدولہ نے جوہری کو اپنے یہاں پناہ دی تھی، اس لئے اس کی حرمت بھی کی گئی قمر الدین خان وزیر اعظم بھی اس ہنگامے میں ذلیل ہوئے ،..... ان واقعات سے شعرا کا گروہ بھی متاثر ہوا چنانچہ بیتوا نے جوتہ فروش اور جوہری کے سلسلہ میں ایک شہر آشوب لکھ ڈالی ، شہر آشوب میں واقعہ کی تفصیل کے ساتھ ساتھ روشن الدولہ کا بھی مضحکہ اڑایا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعرا بھی شخصی نظام سے تنگ آچکے تھے ،

کتنوں کو مار جی سے قضا نے گرادیا کتنوں کو جی بچا کے بہت ٹھہرادیا

کالندہ پہ بیتوا نے یہ سن کر چڑھادیا گھٹتے ہی ان جوتیوں طرہ گرادیا

تا حشر ہر زبان پہ رہے گا یہ یادگار

قبل ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ مطابق دسمبر ۱۷۳۳ء

شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو گوالیاری ثم الدہلوی ، خان آرزو کے شاگرد بھی تھے ، اور قریبی رشتہ دار بھی عالمگیر کے آخری عہد میں اُن کی ولادت ہوئی[۱] زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ کر ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ کو راہی ملک بقا ہوئے، اُن کی شاعری پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایہام اور رعایت لفظی کی بھول بھلیاں ہے لیکن غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ان خزف ریزوں میں گوہر نایاب بھی ہاتھ آہی جاتے ہیں ، چنانچہ وہ بھی بگڑے ہوئے حالات سے مطمئن نہ تھے ، چنانچہ اقتصادی بدحالی کا نقشہ اس شعر میں نظر آتا ہے ،

اب زمانہ ہے ایسے طرح بگڑا کیا بنے روزگار کی صورت

امرا اور ارکین حکومت عوام کی حالت زار سے جس قدر غافل تھے ، یہ شعر اس کی پوری مصوری کرتا ہے

دلی میں درد دل کا کوئی پوچھتا نہیں مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

اقتصادی بحران عام تھا جس سے عوام اور خواص دونوں متاثر تھے ، صرف چند ارکین سلطنت وا مرا عیش

بقیہ حاشیہ ص ۴۴) ہنگامہ گلفروشان ص ۴۴۵ ، تنقیح الاخبار مخطوطہ رضا لائبریری رامپور صفحہ ۲۲۲ تاریخ مجلد ہشتم مولوی ذکاء اللہ خان ، واقعات محمد شاہی مخطوطہ ص ۱۰ ، ۱۵) شاہ مبارک (نجم الدین) آبرو تخلص ، از اولاد شیخ

دے رہے تھے، کچھ قدیم امرازادے باپ دادا کا اندوختہ اڑا رہے تھے لیکن وہ مخالف حالات کا کب تک مقابلہ کرسکتے تھے جب کہ مرکز ٹوٹ چکا تھا، اور حکومت کی عطا کردہ جاگیروں پر نئے وارث بزور شمشیر قابض تھے جن سے مقابلہ کا اُن میں دم نہ تھا، اس لئے گھر کا سامان بیچ کر گذر بسر کر رہے تھے،

اب کے امیرزادے بیٹھے گھر ہیں دہر میں　　اکثر گنوا دتے ہیں گے کھٹ راگ نیچے سر میں

زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی　　امیر اس جگ کے ہیں سب شیر قالی

امرائے سلطنت کی جاگیریں دہلی کے قریب ہی تھیں، اس لئے وہ اطمینان سے عیش و عشرت میں مشغول تھے، اور مرکز کی اُن کو کوئی فکر نہ تھی، مگر جب مرہٹوں نے صوبہ اکبرآباد (آگرہ) پر حملہ کیا، اس وقت اُمرا میں ہراس پیدا ہوا، امیرالامرا، مرہٹوں کی تنبیہ کو نکلے، مگر جب دیکھا کہ مرہٹوں سے لڑائی اُن کے بس کی بات نہیں، تو صلح کرکے لوٹ آئے، نواب عمدۃ الملک میر خان انجام نے مزاحًا اس واقعہ کی تاریخ لکھی ہے جو آئینہ حال ہے، مصرع

نواب آئے ہمارے بھاگ آئے،

۱۱۴۷ھ
۱۷۳۴ء

۱۱۵۱ھ و ۱۱۵۲ھ | سید محمد شاکر ناجی محمد شاہ کے ہم عصر اور قدیم شعرائے اردو میں ہیں، میر اور قائم نے اُن کو کمسنی میں دیکھا تھا، چابک رو تھے، سپاہی پیشہ اور ہنس مکھ تھے، بات بات میں مزاح کرتے تھے، ہنگامۂ نادری کے بعد انتقال کیا، تیس ہزار شرفائے دہلی کا تہ تیغ ہونا، اور دہلی کا لٹنا، اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہندوستانی فوج کی حالت ناقابل بیان تھی، سپاہ کو نہ تو وقت پر تنخواہ ملتی تھی، نہ سامان جنگ تھا، امرا بڑی بڑی جاگیریں دبائے بیٹھے تھے، فوج کی تنخواہ کہاں سے ادا ہوتی، مصاحبین اور ارباب نشاط پر انعام و عنایات کی بارش تھی، عمدۃ الملک امیر خان انجام جس شان و شوکت سے رہتا تھا وہ شاہ وقت سے کم نہ تھی، اُس کے قتل پر ضبط شدہ سامان کا تخمینہ ساٹھ لاکھ روپیہ کیا گیا، لیکن مرتے وقت ملازموں کی تنخواہیں واجب الادا تھیں، اسعاروں کے بموجب ادا ہوئیں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۸) محمد غوث گوالیاری از مشاہیر ریختہ گویان، ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ تاریخ محمدی ص ۱۰۹،

اس وقت دفن ہونا نصیب ہوا، اس واقعہ سے ہم اُس عہد کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، ان حالات میں عیش پسند امرا نادری فوج کا مقابلہ کس طرح کر سکتے تھے، ناجی نے شہر آشوب میں اس ماحول کی یہی تصویر کھینچی ہے، دو بند ملاحظہ ہوں،

لڑتے ہوئے تو برس بیا اُن کو بیتے تھے — دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے
شراب میں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے — نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں، بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا — کہیں نشان کے ہاتھی اور نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا — لے تھے وہاں جو لشکر تمام بھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و مکان، نہ غلہ و بقال

وفات سنہ ۱۱۶۳ھ | سید عبدالحی تاباں دہلوی، حاتم، سودا، اور محمد علی حشمت کے شاگرد شمار ہوتے ہیں، محمد شاہی دور کے نوجوان شعرا میں تھے، غالباً اُن کی ولادت سنہ ۱۱۳۰ھ ہجری کے لگ بھگ ہوئی، مختلف امرا سے وابستگی رہی خصوصاً نواب عمدة الملک میر خان کی تعریف دیوان میں پائی جاتی ہے، تاباں نے ہوش سنبھالتے ہی ہنگامۂ نادری دیکھا، دلی عروس البلاد تھی، نادر شاہ نے تیس ہزار بے گناہ شہریوں کو تہ تیغ کر کے اپنا رعب قائم کیا، امیر سے بالدار سے انتہائی اذیت کے ساتھ روپیہ حاصل کیا، تخت طاؤس جو نادر روزگار تھا مع تمام مال غنیمت کے ہندوستان سے لے گیا، محمد شاہ کی رگوں میں تیموری خون تھا لیکن روانی نہ تھی، تلوار ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی، اتنی عبرت انگیز تباہی بھی اُس کی آنکھیں نہ کھول سکی، وہ خود محفوظ رہا، اس لئے عوام و خواص کا درد محسوس نہ کر سکا، مگر تاباں کا ہندوستانی خون کھولنے لگا، اُس نے اس شکست کو اپنی شکست اور اس تباہی کو اپنی تباہی سمجھا، تخت طاؤس شاہجہانی اُس کے وقار وطن کا باعث تھا، نادر کا تخت لیجانا ہندوستان کی عزت پر حملہ تھا، اُس نے عوام کے درد کو محسوس کیا، دیکھا، لکھا،

داغ ہی ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ جا بیٹھوں تخت طاؤس

محمد شاہ کی رنگین مزاجی ہندوستان کی تباہی کا باعث بنی، عوام اسے محسوس کر چکے تھے، تاباں نے ہندوستان کے اس عیش پرست بادشاہ پر بھی طنز کیا ہے، کہ اگر اسکندر کی طرح محمد شاہ بھی جرأت کرے، تو ہندوستان کے زیر نگین دنیا ہو سکتی ہے، مگر محمد شاہ کے کانوں تک یہ آواز کون پہنچاتا، ذرا اس حب الوطنی کو دیکھیے، جو ۱۷۴۱ء میں تاباں نے محسوس کی تھی،

طرح اسکندر کے تاباں شاہ ملت اقلیم ہو
گر ٹک اک جرأت کرے یہ خسرو ہندوستان

وہ محمد شاہ کی تباہی کا ذمہ دار عیش دوست امرا کو قرار دیتا ہے،

دیکھ کر ان کے تئیں شاہ بھی مردمی پکڑے
ہو شجاعت کا اگر جزو امیروں کے بیچ

دلی کی بربادی کا نقشہ ان شعروں میں نظر آتا ہے،

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے پائے
اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

گھر کے گھر خاک میں مل گئے ہیں فلک کے ہاتھوں
پر نہیں اس کی خرابی کے کچھ آثار ہنوز

سرمایہ داروں کو تنبیہ کرتا ہے،

وہ کام تو کر جس سے تری گور ہو گلزار
کیا خانہ و دیوار کو کرتا ہے مقرنس

یہ دولت مند اگر شب کو نہیں یار تو پھر کیا ہے
کرتے ہیں یہ چاندنی راتوں کو بھی تماشے کے

زندگی گذارنے کا طریقہ بتاتا ہے،

مرد کہتے ہیں اسی مرد کو سب اہل تمیز
جو کرے زیست کو دنیا میں قلندر کی طرح

اس کے بعد شاہ عبدالصمد جیسے فقراء پر جو عوام و خواص کو دام تزویر میں پھنسا کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹتے تھے، اس طرح طنز کرتا ہے،

یہ جو ہیں اہل ریا آج فقیروں کے بیچ
کل گنیں گے حق تعالیٰ کو پیروں کے بیچ

تاباں اپنے دور کی پریشان حالی کا ذکر کرتا ہے، مگر حالات پر گہری نظر نہ تھی، اس نے لہجہ میں یاس پائی جاتی ہے،

اس زمانے مین تو اب بیت ہوا ہون تنگ　　　تنگیٔ گور بھلی، وسعتِ دوران کے عوض

مساوات کی تعلیم بھی دیتا ہے، جس کو ہم خواہ کمیونزم نہ کہہ سکین، ترقی پسند خیالات ماننے پر مجبور ہین،

ہر شاہ و گدا مین فرق لیکن تاباں　　　آزاد کے نزدیک ہین دونون یکسان

شاکی تو کسی طرح سے دنیا مین نہ ہو　　　دن عمر کے ہر طرح سے کٹ جائینگے یان

ولادت ۱۱۳۰ھ
وفات ۱۱۶۹ھ

انعام اللہ خان یقین مجددی پیرزادے تھے تا نا شاہی امرا مین تھے، مرزا مظہر جانِ جانان سے نسبت شاگردی ہی نہ تھی بلکہ اُن پر اُستاد کی خاص توجہ تھی، اُن کے معاصرین اُن کے مقبول عام کلام سے حسد کرنے لگے، اُن کا تغزل شیرینی و لطافت درد و اثر اور موسیقیت سے معمور ہے، اُن کی ولادت ۱۱۳۰ھ کے لگ بھگ ہوئی، محمد شاہی دور نشاط مین غزل ہی زندگی مین چھائی تھی، مگر اس پردہ مین بھی کہیں کہیں ماحول کی تصویر آ جاتی ہے، رشوت ستانی عام تھی، وزرا و امرا عہدون کے لئے شاہ وقت کو لاکھون اور کرورون روپیے بطور نذرانہ پیشکش کرتے تھے، اور پھر جاگیرات سے لوٹ کھسوٹ کر اس کمی کو پورا کرتے، اس کی تصویر اس شعر مین ملاحظہ ہو،

خدمتون مین بھی تجارت سے ہو زیادہ منفعت　　　رشوتون مین ترقّی لاکھون دی کے لیتے ہین کڑوڑ

شاعر زمانہ کے حالات مین تبدیلی کا خواہش مند ہے، دوست احباب روکتے ہین، کہ اس وادی پر خار مین قدم نہ رکھو، اس کے جواب مین کہتا ہے،

عمر آخر ہے جنون کرون بہاران پھر کہان　　　ہاتھ مت پکڑو مرا یارو گریبان پھر کہان

یقین سے جلتے بجھتے کا سر آشنا بھی نہ ٹھکراو　　　اس آتش سے ارے دامن دراز و کم سمجھ ید کو

بہار آئی ہے کیا حکم ہوا ہی باغبان سچ کہہ　　　چمن مین رہنے پاوے گا ہمارا آشیان سچ کہہ

ان اشعار مین دلی جذبات کی ترجمانی کے ساتھ دنیا کے مسائل پر بھی دھیمے لہجہ مین اشارے ہین، اور غزل کی نرم زبان مین ولولۂ مردانہ ہی۔

ولادت ۱۱۱۱ھ
وفات ۱۱۹۷ھ

ظہور الدین شاہ حاتم ۱۱۱۱ھ مین پیدا ہوئے ۱۱۳۰ھ مین میدان سخن مین قدم رکھا، اور سودا کی استادی سے شہرت پائی، عالمگیری عہد مین پیدا ہوئے، اور شاہ عالم کے عہد کی مرہٹہ گردی دیکھ کر دنیا سے رخصت ہوئے ۱۱۶۹ھ مین دیوان زادہ مرتب کرکے قدیم دیوان کو جدید دیوان مین شامل کر دیا، انھون نے بھی شہر آشوب لکھا، اور اپنے عہد کا صحیح خاکہ کھینچا، مسلسل انقلابون کے اثر سے آخر مین تصوف کے دامن مین پناہ لی، مشاعرون کا شوق آخر عمر تک رہا، جاگیردارانہ نظام کی ٹوٹ پھوٹ اُن کی نظر مین تھی، انوکھی عوامی طاقتین اُبھرنے لگی تھین، دولت محلون سے کھینچ کر عوام مین پہنچنے لگی تھی، متوسط طبقہ جو امرا کا دست نگر تھا، زیادہ پریشان حال تھا، پرانے امرا کی جاگیرین نئے طاقت ور حکمرانون مین بٹ چکی تھین، اس لئے اب شعرا کی پرورش کون کرتا، علما، صلحا، فقرا دست نگرکس کے پاس جاتے، حاتم سپاہی پیشہ تھے، اس لئے ان واقعات پر جھنجلا اٹھتے ہین، دلی مین بادشاہ مین فوج رکھنے کی طاقت ہی نہ تھی، امرا باتون سے کام چلانا چاہتے تھے، غیرت و حمیت اٹھ چکی تھی، دلی پر روزانہ حملے ہوتے رہے، جس مین عوام و خواص فوجون کے ہاتھون تباہ و برباد ہوتے، شہر آشوب مین حاتم نے اس طبقاتی کشمکش کو صحیح طور پر پیش کیا ہے، جن کی روشنی مین بہت سے تاریخی مسائل حل ہوتے ہین، اس کے کچھ بند ملاحظہ ہون،

تو کھول چشم حق، اور دیکھ قدرت حق یار کہ جس نے ارض و سما، اور کیا ہی لیل و نہار
نہ کھو تو عمر کو غفلت مین ٹک تو ہو ہشیار کہ دور بارہ صدی کا ہی سخت بے ہنجار

جہان کے باغ مین یکسان ہی اب خزان و بہار

شہرون کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہین امیرون بیچ سپاہی کی قدردانی نہین
بزرگون بیچ کہین بوے قدردانی نہین تواضع کھانے کو چاہو کہین تو پانی نہین

گویا جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار

یہاں کے قاضی و مفتی ہوتے ہیں رشوت خور — یہاں کے دیکھو تو سب اہلکار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور — یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت و گور
یہاں نہیں ہے مدارا بغیر دار و مدار

امیرزادے ہیں حیران، اپنے حال کے بیچ — تھے آفتاب، پر آ گئے، زوال کے بیچ
پھرے ہیں چرخ سے ہر دن تلاش مال کے بیچ — وہی گھمنڈ امارت کا پر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو، پر اب تو ہے دشوار

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے — جو چور تھے جو سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیردست تھے سو ان دنوں میں زور ہوئے — جنھوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

جہاں میں صاحب خس خانہ گھاس ڈالے ہیں — جنھوں کے محل تھے اُن کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے بھی ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں — سو اب دماغ میں وہ رانی خان کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب کہ ہوئیں دوچار

عجب یہ الٹی بہے ہے گی باد دلی میں — کہ شاہ باز چڑے مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں — جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

کرے ہے چرخ اگر تجھ پہ جفا حاتم — تو سفلے پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم — تو انقلاب زمانہ سے غم نہ کھا حاتم
کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

حاتم نے کتنا سچا نقشہ اپنے عہد کا کھینچا ہے، اُس نے امراے سلطنت سے آگے بڑھکر کھلم کھلا کہہ دیا کہ بادشاہ میں عدالت نہیں اور قاضی و مفتی رشوت خوار اہلکاران حکومت چور ہیں،

ولادت ۱۱۱۵ھ
وفات ۱۱۹۵ھ

مرزا رفیع سودا مشہور عالمگیری امیر اور ادیب نعمت خان عالی کے نواسے[۵] اور مرزا محمد شفیع کے بیٹے تھے، جو اپنے عہد کے نامی تاجر تھے، عالمگیر کے سال وفات میں یہ آفتاب طلوع ہوا۔

بہادر شاہ اور جہاندار شاہ کے عہد حکومت میں تو انھیں اتنا ہوش نہ تھا کہ واقعات میں تمیز کرتے، البتہ فرخ سیر کے زمانہ میں اتنی عمر ہو چکی تھی، کہ انقلاب کی ہواؤں سے متاثر ہوتے، محمد شاہ کے آغاز عہد میں یہ جوان تھے، مرہٹوں کا دلی پر جب پہلا حملہ ۱۱۴۹ھ میں ہوا، اور کالکا کے میلہ کو لوٹا گیا، تو شہر میں ہل چل پڑ گئی، وزیر اعظم قمرالدین خان اور امیرالامرا مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں لے کر دلی سے جا چکے تھے، ایسی حالت میں کچھ منچلے جوان مقابلے کو چلے لیکن وہ درخم کمان تھا جو جنگ جو قوم کے لئے ضروری ہے، یہ لڑائی سودا نے دیکھی تھی، اس سلسلہ میں اُس نے قصیدہ تضحیک روزگار لکھا، جس میں نظام حکومت پر تنقید کی ہے، اور گھوڑے کی ہجو کے پردے میں تاریخی پس منظر صاف جھلک رہا ہے۔

مجھ کے ولیے ہیچ کو نی دن کی بات ہے	ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانہ کے ہاتھ سو	موچی سے نقش پا کو لگاتے ہیں وہ اُدھار

آگے چل کر سوار اور سواری کا ذکر سنیئے،

دلی میں آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ	مجھ سے کہا نصیب نے آکر ہے وقت کار
مدت سے کر رہوں کو اُڑا یا ہے گھر میں مجھو	ہوکر سوار اب کرو میدان میں کارزار
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار	گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خوار

[۵] مرزا محمد رفیع صاحب مرحوم مغفور ولد مرزا محمد شفیع متخلص سودا، پسر دختر نعمت خان عالی، در سخن سنجی زبان ہندی در زمان خویش نظیر سے نداشت۔۔۔۔ تومیت کلامش از تحریر بیرون مجمع الانتخاب، از شاہ کمال،

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو دیکھ — سو ڈرون تھا اپنے پاؤں سے چون طفل نے سوا

جب دیکھا میں کہ جنگ کی اب مین نبدی ہے شکل — لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا وہاں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف — القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

سودا نے شیدی فولاد خان کی ہجو میں جو مثنوی کہی ہے، وہ صرف ذاتی عناد کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس میں پولیس کی نااہلیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس کا لہجہ اگرچہ تمسخرانہ ہے لیکن تنقید سیاسی ہے۔ شیدی فولاد خان دلی کا کوتوال تھا، چوریوں کا زور ہوا، اور اس سے انسداد نہ ہو سکا، تو سودا نے حکومت کو متوجہ کرنے کے لئے مزاحیہ انداز میں یادگار زمانہ ہجو لکھ ڈالی، اس میں کوتوال اور چوروں کا مکالمہ بڑا دلچسپ ہے، سودا نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ امرار کے مکان چوروں کے اڈے ہیں، کوتوال کا بیان قابل غور ہے۔

بولے ہر دو کہ میں بھی ہوں ناچار — گرم ہے چوٹوں کا اب بازار

کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول — میری پگڑی کا میرے سر پہ مول

یارو کچھ چل سکے ہے میرا زور — دیکھ تو ٹک کہاں کہاں ہے چور

ہٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل — ہے امیروں کے گھر میں چور محل

اسی طرح شہر آشوب میں سودا نے بھی دلی کا مرثیہ نہیں لکھا ہے، بلکہ مغل حکومت کے دم توڑنے اور عوام و خواص کی تباہی و بربادی کا نقشہ بھی دکھایا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ شہر آشوب قومی مرثیہ نہیں تو کیا ہے۔

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار — تلاش کرکے ڈھیلتی انھوں نے ہو ناچار

نہ ان قرض میں بنیوں کے وہی سپر تلوار — گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار

بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کشکول

دیا بھی وان نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس — پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس

کروڑ دل پڑا ز اُمید ہو گئے مایوس   گھرون سے یون تجیا کے نکل گئی ناموس

ملی نہ ڈولی انھین جو تھے صاحب چنڈول

عجیب ڈولیون کا ان دنون ہی معمول   وہ برقعہ سر پہ ہو جس کا قدم تلک ہو طول

ہو اُن کی گود مین لڑکا گلاب کا سا پھول   اور اُن کے حسب طلب کا ہر ایک سو اصول

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

غرض مین کیا کہون یار و کہ دیکھ کر یہ قہر   کروڑ مرتبہ خاطر مین گذرے ہے یہ لہر

جو ملک بھی اس دل اپنے کو دیوے گردش دہر   تو بیٹھ کر کہین، یہ رویئے کہ مردم شہر

گھرون سے پانی کو باہر کرین جھکول جھکول

باقی

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

قیمت مجلد للعہ

" غیر مجلد ہے

"منیجر"

تصحیح و استدراک

بسلسلۂ پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں

از

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

(۱) اس مضمون میں شاہ یٰسین کو میں نے حضرت مخدوم شاہ طیب کا فرزند اس بنیاد پر لکھ دیا تھا کہ تذکرہ کی بعض کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے، مثلاً بحر زخار میں ہے۔

"شاہ یٰسین خلف و خلیفہ شاہ طیب .... مناقب العارفین نام کتاب در احوال اولیاء جمع نمودہ"

لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ ان کے پروردہ ضرور تھے، مگر ان کے بیٹے نہیں تھے، ان کے والد کا نام شیخ احمد تھا، اور وہ بندگی شیخ ادھجر صدیقی جونپوری کی اولاد میں سے تھے، سلسلۂ نسب اس طرح پر ہے، شاہ یٰسین بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ عبدالرحیم بن بندگی شیخ ادھجر، شاہ یٰسین کا مزار جھوسی میں شیخ نصیر الدین اسد العارفین کے روضہ کے اندر ہے، ملاحظہ ہو سمات الاخیار ص ۹۶،

(۲) ایک جگہ میں نے شاہ یٰسین کے کٹرہ جانے اور وہاں شیخ جمال اولیاء کی خدمت میں ان کی تحصیل علم کا ذکر کیا ہے، یہاں کٹرہ کے بجائے کوڑہ صحیح ہے، غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ فارسی کی قلمی کتابوں میں کٹرہ اور کوڑہ دونوں کو کرہ لکھا جاتا ہے مگر پہلے کو کرہ پڑھا جاتا ہے اور دوسرے کو کُرہ، ابتداءً مجھ کو تنبہ نہیں ہوا، اور میں نے مناقب العارفین میں لفظ کرہ دیکھ کر اس مضمون میں اس کو کٹرہ لکھ دیا، بعد میں تنبہ ہوا کہ شیخ جمال اولیاء کا وطن

کوڑہ (جہان آباد) تھا، اور وہیں اُن کی جائے اقامت بھی، جیساکہ تقصار (ذکر میر سید محمد کالپوری) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے، اس لئے تصحیح کی ضرورت پیش آئی، کوڑہ کو بحر زخار میں اس شکل سے لکھا ہے کٹرہ، ملاحظہ ہو بحر زخار قلمی نسخہ فرنگی محل ذکر شیخ سالار بدہ کڑدی،

(۳) اسی طرح میں نے شیخ سالار بڈہ کو ساکن کٹرہ لکھا ہے، یا یہ لکھا ہے کہ اُن کا مزار کٹرہ (مانک پور) میں ہے، وہاں کٹرہ کے بجائے کوڑہ (جہان آباد) ہونا چاہیئے، بحر زخار میں ہے کہ شیخ سالار بڈہ کی وفات ۹۲۶ھ میں ہوئی اور کڑہ (کوڑہ) کے چکلہ میں اُن کا مزار ہے، اور مناقب العارفین میں ہے کہ

"بر عوارف شرح خوب نوشتہ"

(۴) مناقب العارفین میں شاہ حسن کے سالِ وفات کا جہاں ذکر ہے، وہاں تسع مائۃ تو بالکل صاف ہے، اس سے پہلے کے الفاظ مشکوک ہیں، اس لئے میں نے اُن کا سالِ وفات ۹۰۰ھ لکھدیا ہے لیکن شیخ فرید کے حال میں شاہ یسینؒ نے لکھا ہے کہ ان کی وفات شاہ حسن کے تھوڑے ہی دن بعد ہوئی ہے، اس لئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ حسن کا واقعۂ شہادت بھی ۹۰۰ھ میں پیش آیا، مناقب العارفین میں اس مقام پر بھی کاتب کے تصرّف سے عبارت محرف ہوگئی ہے، ورنہ بات بالکل صاف ہو جاتی،

تنبیہ: مولانا سید عبد الحیٔ ناظم ندوہ نے نزہۃ الخواطر جلد چہارم میں غالباً گنج رشیدی کے حوالہ سے اور صاحب بحر زخار نے بھی شاہ حسن کا سالِ وفات ۹۹۰ھ لکھا ہے، مگر یہ قطعاً غلط ہے اس لئے کہ دونوں بزرگوں نے شیخ فرید کا سالِ وفات ۹۰۰ھ لکھا ہے اور شاہ یسین نے تصریح کی ہے کہ شاہ حسن کی وفات شیخ فرید کی زندگی میں ہوئی ہے،

استفسار و جواب

قرآن کی جمع و ترتیب کے سلسلہ میں ایک سوال

عبدالرشید صاحب، ڈاکخانہ موسیٰ بنی مائنس
مان بھوم، بہار

حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں مذکور ہے، کہ قرآن کی جمع و ترتیب کے وقت ایک صحابی حضرت خزیمہؓ کے تنہا بیان پر قرآن میں ایک آیت داخل کر لی گئی، اس لئے کہ ان کی تنہا شہادت کو آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شہادت کے برابر قرار دیا تھا، مگر ایک دوسرے موقع پر حضرت عمرؓ نے آیت رجم الشیخ والشیخة اذا زنیا الخ کے بارے میں کہا کہ یہ قرآن کی ایک آیت ہے، تو وہ داخل نہیں کی گئی، کیا حضرت عمرؓ کا درجہ حضرت خزیمہؓ سے کم تھا، کیا آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں یہ نہیں کہا تھا کہ اگر میرے بعد نبوت کسی کو ملتی تو عمر کو، پھر ان کے اکیلے بیان پر آیت رجم قرآن میں کیوں نہیں داخل کی گئی، ان واقعات کو پڑھ کر دل میں ایک خلجان پیدا ہوتا ہے، براہ کرم اس کا کوئی تشفی بخش جواب عنایت فرمائیے،

معارف: آپ کے استفسار کے جواب میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں، امید ہے کہ ان سے آپ کا خلجان دفع ہو جائے گا،

یہ بات کسی روایت میں بھی مذکور نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ہو کہ فلاں آیت کو قرآن میں

داخل کر لیا جائے مگر اس بارے میں ان کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی گئی، اس لئے وہ آیت قرآن میں داخل نہیں کی گئی، آپ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے، اس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اعرابی کا وہ ٹکڑا جسے آپ نے نقل کیا ہے تو اس بارے میں تو یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو آیتِ رجم قرار دیا تھا، اور نہ وہ سرے سے قرآن کا جز تھا ہی، اس لئے اس کے قرآن میں داخل کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا، خواہ اس کے لئے ایک کیا کئی شہادتیں کیوں نہ مل جاتیں، بخلاف حضرت خزیمہ انصاریؓ کی شہادت کے کہ یہ تنہا پیش نہیں تھی کہ ان کی اکیلی شہادت دو کے برابر تھی، اس لئے وہ آیت قرآن میں داخل کر لی گئی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی جمع و ترتیب کے وقت جو آیتیں، سورہ توبہ اور سورہ احزاب کا جزء بنائی گئیں وہ قرآن مجید کا مسلّمہ جز تھیں، سیکڑوں صحابہ کو وہ آیتیں زبانی یاد تھیں، بار بار نمازوں میں پڑھی گئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو خود کاتبین وحی سے لکھوایا تھا، اور ان کے فضائل بیان کئے تھے، اس لئے اُن کے قرآن کا جز ہونے میں کوئی شبہ یا شک نہیں تھا بلکہ زبانی شہادت کے ساتھ صرف اس کی تحریری شہادت کا مرحلہ رہ گیا تھا جس کی تکمیل حضرت خزیمہؓ کی تصدیق کے ذریعہ ہو لی، اس لئے دونوں واقعوں میں بڑا فرق ہے، آیتِ رجم کے سلسلہ میں آپ کو جو خلجان ہے، اس پر معارف کے کسی آیندہ نمبر میں تفصیلی بحث کی جائیگی، البتہ حضرت خزیمہؓ کے جس واقعہ سے قرآن کی جمع و ترتیب کے بارے میں آپ کو جو خلش پیدا ہو گئی ہے، اُس کے بارے میں تھوڑی تفصیل کر دی جاتی ہے جس سے واقعہ کا پورا پس منظر سامنے آجائے گا اور آپ کی خلش دور ہو جائے گی۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام الٰہی کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا، تو آپ کاتبین وحی کو بلا کر ہدایت فرماتے تھے کہ اس حصے یا اس سورہ کو فلاں سورہ میں فلاں آیت یا فلاں سورہ کے بعد لکھا جائے، چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق وہ لکھ لیا جاتا تھا، اس طرح آپ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں پورا قرآن احاطۂ تحریر میں آچکا تھا، مگر اس وقت تک عرب میں کاغذ کا عام رواج نہیں ہوا تھا، اس لئے قرآن کے نازل شدہ حصے کبھی کھجور کے پتوں کبھی درختوں کی چھال، کبھی ہڈیوں کے ٹکڑوں اور پتھر کی سلوں پر لکھ دیئے جاتے تھے، نیز عرب میں اس وقت تک لکھنے پڑھنے کا بھی عام رواج نہیں تھا، اہلِ عرب زیادہ تر اپنے حافظہ سے تحریر کا کام لیتے تھے، صحابہ میں صرف چند آدمی لکھنا پڑھنا

جانتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے چند وہیں افراد کو کلام الٰہی کی کتابت کے لئے مقرر فرمایا تھا، مگر قرآن کا نزول تیئس برس کی مدت میں رفتہ رفتہ ہوا تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ہر کاتب ہر وقت خدمت نبوی میں موجود نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے نزولِ قرآن کے وقت جو کاتبِ وحی موجود ہوتا، آپ نازل شدہ حصہ اس کو لکھوادیا کرتے تھے، اس طرح پورا قرآن تحریر میں آجانے اور سیکڑوں آدمیوں کو زبانی یاد ہونے کے باوجود اس کے اجزا، سورتیں اور آیتیں منتشر اور غیر مرتب شکل میں مختلف افراد کے سینوں اور سفینوں میں تھیں، پورا قرآن ایک صحیفہ کی شکل میں مرتب و مدون نہیں ہوا تھا، اور آپ کی حیاتِ مبارکہ میں یہ کام ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ نزولِ قرآن کا سلسلہ برابر جاری تھا، آپ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ فاروق کے دل میں یہ مبارک خیال پیدا ہوا کہ قرآن کے منتشر اور متفرق اجزاء کو ایک صحیفہ کی شکل میں جمع کر دیا جائے، انھوں نے اپنے اس خیال کا ذکر حضرت صدیقؓ سے کیا، اُن کو اس میں اس وجہ سے تامل ہوا کہ حیاتِ نبویؐ میں یہ کام انجام نہیں پایا تھا، مگر پھر اُن کے ذہن میں بھی جلد ہی اس کی مصلحت آگئی، اور وہ اس کے لئے آمادہ ہوگئے، اور انھوں نے اس کام کے لئے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو کاتب وحی ہونے کے ساتھ پورے قرآن کے حافظ اور نہایت ذہین اور عربی و عبرانی دونوں زبانوں کے واقف کار تھے، مقرر کیا، گو اُن کی مدد کے لئے کچھ اور صحابہ بھی تھے جن میں ایک نام حضرت عمرؓ کا بھی لیا جاتا ہے[1] مگر اس کام کے اصل ذمہ دار یہی بنائے گئے اس کے بعد حضرت فاروقؓ نے عام اعلان کرادیا کہ جن لوگوں کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو خواہ زبانی ہو یا تحریری اسے وہ لاکر پیش کریں[2]، ان مراحل کے طے ہوجانے کے بعد حضرت زیدؓ نے قرآن کے منتشر اجزاء کی تدوین و ترتیب شروع کردی،

حضرت زیدؓ گو خود پورے قرآن کے حافظ تھے، مگر حضرت ابوبکرؓ کے حکم اور شدتِ احتیاط کی بنا پر ہر آیت کے موقع و محل اور اس کے تلفظ و قرأت کے بارے میں زبانی شہادتوں کے ساتھ دو تحریری شہادتیں بھی لیتے جاتے تھے، چنانچہ جب سورۂ توبہ کی آخری دو آیتوں اور سورۂ احزاب کی ایک آیت کے موقع و محل کا ثبوت تلاش کیا جانے لگا، تو اس کی زبانی شہادتیں تو بہت ملیں لیکن تحریری شہادت محض ایک ملی یعنی اول الذکر آیتیں حضرت ابو خزیمہؓ کے پاس، اور

---

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۱۱، [2] ایضاً،

آخر الذکر آیت حضرت خزیمہ انصاریؓ کے پاس لکھی ہوئی ملی، مگر اُن کے سورۂ توبہ اور سورۂ احزاب کا جزء ہونے کا علم اُن کو پہلے سے تھا، اس لئے اُن کے بارہ میں ایک ہی شہادت کافی تھی، اور وہ قرآن کا جزء بنا دی گئیں،

ناچیز کی تحقیق میں اگرچہ یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ آیتیں محض ایک ایک ہی صحابی کے پاس لکھی ہوئی تھیں، تاہم اُن کا جزء قرآن ہونا مسلّم تھا، اور حضرت زید بن ثابتؓ نے کسی معتبر نوشتہ سے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کو سورۂ توبہ اور سورۂ احزاب ہی کا جزء قرار دیا تھا، اور یہ مقصد ایک ہی ایک شہادت کے ذریعہ پورا ہو گیا، اور دو شہادتوں کا ہونا فی نفسہٖ اصل مقصد نہیں بلکہ مقصد کا ذریعہ تھا،

اس سلسلہ میں اب آپ حضرت زیدؓ کا بیان ملاحظہ فرمائیں، وہ فرماتے ہیں، کہ جب اس کام کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی، تو شروع میں میں نے اس کے اٹھانے میں پس و پیش کیا، مگر پھر اس کے لئے کمر ہمت باندھ ہی لی،

فتتبعت القرآن اجمعه من اللخاف	اور قرآن کے اجزاء کھجور کی چھالوں پتھر کی تختیوں
والعسب وصدور الرجال حتی	اور لوگوں کے حافظے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع
وجدت من اٰخر سورة التوبة	کرنے لگا، چنانچہ سورۂ توبہ کی دو آخری آیتیں
اٰيتين مع ابی خزيمة لم اجدها	ابو خزیمہ کے پاس لیں، اُن کے علاوہ میں نے
مع احد غيره[1]	اس کی تحریر کسی کے پاس نہیں پائی،

سورۂ احزاب کی آیت کے بارہ میں اُن کا بیان یہ ہے،

لما نسخنا الصحف فی المصاحف	جب ہم لوگ قرآن کے اجزاء کو صحیفوں میں
فقدت اٰية من سورة الاحزاب	منتقل کرنے لگے، تو سورۂ احزاب کی ایک

---

[1] سورۂ احزاب کی آیت کی شہادت کے واقعہ کو بعض لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا واقعہ قرار دیا ہے، جب مصحف صدیقی کی نقل سارے ممالک اسلامیہ میں بھیجی جا رہی تھی، مگر بہر نوع جو باتیں اس سلسلہ میں کہی گئی ہیں، ان پر اس اختلاف زمانہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا [2] بخاری ج ۲ باب جمع القرآن،

کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ ھا لم اجدھا مع احد الا مع خزیمۃ الانصاری الذی جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شھادتہ شھادۃ رجلین[1]	آیت کی تحریر نہیں ملی حالانکہ میں اس آیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برابر سنا کرتا تھا، تاآنکہ بعد اس کی تحریر حضرت خزیمہ انصاریؓ کے پاس ملی جن کی تنہا شہادت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کے برابر قرار دیا تھا،

ان دونوں بیانوں سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے تمام اجزاء سورتیں اور آیتیں لوگوں کے سینوں اور سفینوں میں موجود و محفوظ تھیں حضرت زیدؓ نے صدیق اکبرؓ کے مشورے سے اتنا کام کیا کہ ان منتشر اجزاء کو انتہائی احتیاط کے ساتھ منشائے نبوی کے مطابق مرتب و مدون کر دیا،

آپ کو غالباً اُن کے دوسرے بیان کے آخری ٹکڑے سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس آیت کا علم کسی دوسرے صحابی کو تھا ہی نہیں، لیکن اگر آپ اُن کا پورا بیان اپنے سامنے رکھیں، تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی، کہ محض ایک صحابی کے کہنے سے کوئی آیت قرآن میں داخل کی گئی، خاص طور سے اُن کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں، فقدت آیۃ اسمع فتحت القرآن یعنی وہ کہتے ہیں کہ وہ آیتیں سورہ توبہ اور سورہ احزاب کا جزء تھیں، اور میں نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا تھا، مگر ان کے نوشتے تلاش کے بعد ملے، اس بارے میں حافظ ابن حجرؒ کا بیان ملاحظہ ہو،

والحق ان المراد بالنفی وجودھا مکتوبۃ لا نفی کونھا محفوظۃ،	حضرت زیدؓ نے آیت کے نہ ملنے کا جو ذکر کیا ہے اس سے اُن کی مراد یہ نہیں ہو کہ وہ آیت اب محفوظ و مامون نہیں تھی، بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ اُن کو اس کی تحریر عام صحابہ کے پاس نہیں بلکہ صرف ایک صحابی کے پاس ملی،

---

[1] بخاری جلد ۲ باب جمع القرآن ص ۷۴۵،

اور تحریری شہادت پر زور اس لئے دیا جا رہا تھا کہ

وکان غرضہم ان لا یکتب	ان حضرات کی غرض یہ تھی کہ قرآن بالکل
الا من عین ما کتب بین یدی	اسی ترتیب اور ان ہی نوشتوں کے مطابق
النبی صلی اللہ علیہ وسلم من	لکھا جائے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
مجرد الحفظ،	قائم کی تھی اور جن کے مطابق آپ نے کاتبین
	وحی کو لکھوایا تھا، محض زبانی یادداشت سے
(فتح الباری ج ۹ ص ۱۰)	نہ لکھا جائے، کیونکہ اس میں غلطی ہو سکتی تھی)

اس موقع پر ایک اور بات ذہن میں رکھنے کی ہے، جو جمع و ترتیب کے سلسلہ میں عموماً الجھاؤ کا سبب بنتی ہے، قرآن کی جمع و ترتیب کی بحث کے ضمن میں دو موقع پر یہ ذکر آتا ہے کہ فلاں فلاں آیتیں فلاں فلاں صحابی کی تحریری شہادت کی بنا پر قرآن میں داخل کی گئیں، ایک سورہ توبہ کی آخری دو آیتیں، دوسری سورۂ احزاب کی آیت من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ، سورۂ توبہ کی آیتوں کی تحریر جن صحابی کے پاس ملی تھی، ان کا نام ابو خزیمہ ہے، اور سورۂ احزاب کی آیت کا نوشتہ جن کے پاس ملا تھا، ان کا نام خزیمہ بن ثابت انصاری ہے، مگر دونوں ناموں میں بڑی حد تک مشابہت ہے، اس لئے عام طور پر محدثین سے اُن کے بارے میں تسامح ہو جاتا ہے جس سے عام قاری کو بڑی پریشانی ہوتی ہے حتی کہ امام بخاری سے بھی مسامحت ہو گئی ہے، چنانچہ انھوں نے سورۂ توبہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسکی آخری آیتیں خزیمہ انصاری کے پاس ملیں، مگر یہی روایت جب وہ باب جمع القرآن میں لائے، تو انھوں نے ان کا نام خزیمہ کے بجائے ابو خزیمہ انصاری لکھا ہے، پھر سورۂ احزاب کی تفسیر میں دوبارہ خزیمہ انصاری کا نام لیا ہے، حالانکہ صحیح یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیتیں جن کے پاس ملیں ان کا نام ابو خزیمہ تھا، اور سورۂ احزاب کی آیت جن کے یہاں دستیاب ہوئی اُن کا نام خزیمہ انصاری ذوالشہادتین ہے،

سلہ فتح الباری ج ۹ ص ۱۲،

آپ کے سامنے بھی یہ دونوں روایتیں نہیں تھیں بلکہ ایک روایت تھی، اس لئے آپ کے ذہن میں بھی یہی آیا، کہ چونکہ حضرت خزیمہؓ کی شہادت دو کے برابر تھی، اس لئے اُن کی شہادت پر قرآن میں ایک آیت داخل کرلی گئی، اور حضرت عمرؓ کی شہادت دو کے برابر نہیں تھی، اس لئے اُن کی شہادت رد کردی گئی، مگر اوپر کی تفصیل سے یہ بات صحیح ہوگئی ہوگی کہ قرآن میں کسی آیت کے شامل کئے جانے کا تعلق شہادت کی تعداد سے نہیں تھا، بلکہ واقعی اُس کے قرآن کا جزو ہونے سے تھا، پھر شہادت اس بات پر تو لی بھی نہیں گئی تھی کہ یہ آیت قرآن کا جزو ہے یا نہیں، کیونکہ یہ تو ایک معلوم و مشہور بات تھی، بلکہ شہادت اس بات پر لی گئی، اور تحقیق اس کی کی گئی تھی کہ ان آیتوں کی ترتیب اور اُن کا موقع و محل عہدِ نبویؐ کے نوشتوں میں کیا ہے؟ (مجیب)

سلسلۂ سیر الصحابہ

سیر الصحابہ جلد ہفتم

یہ جلد سیر الصحابہ کی آخری کڑی ہے، اس جلد پر یہ مقدس سلسلہ تمام ہو جاتا ہے، اس میں ۲۵۰ صحابہ کے حالات ہیں، جو فتحِ مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔ یا اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، مگر شرفِ ہجرت سے محروم رہے یا سنہ ہجرت کے کچھ قبل یا بعد پیدا ہوئے، اور عہدِ رسالت میں کم سن تھے۔

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی) قیمت: ؏

اہلِ کتاب صحابہ و تابعینؒ

اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں جزیرۂ عرب کے یہود و نصاریٰ کی تاریخ، اور اُن کے تمدنی و اخلاقی حالات کی تفصیل کی گئی ہے، اس کے بعد یہودی و نصرانی صحابہ و صحابیات، اور تابعین کے حالات و سوانح ہیں،

(مؤلفہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین)

قیمت ؏

"منیجر"

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیبِ اقبال

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۵۴)

مخدومی مولینا! السلام علیکم

سید راس مسعود اصرار کرتے ہیں کہ لاہور سے ۲۰ اکتوبر کی صبح کو پشاور کی طرف روانہ ہوں، شام کو پشاور پہنچ جائیں گے، رات بھر وہاں ٹھہر کر ۲۱ کی صبح کو روانۂ کابل ہوں گے، آپ ایسا انتظام کریں کہ یا تو ۲۰ کی صبح کو لاہور پہنچ جائیں یا ۱۹ کی شام کو لاہور پہنچ جائیں، امید کہ آپ کو پاسپورٹ اس سے پہلے مل جائے گا، میرا پاسپورٹ کل مل جانے کی توقع ہو، البتہ ملازم کا دو تین روز بعد ملے گا، زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج والا بخیر و عافیت ہوگا،

یہ بھی ممکن ہو کہ آپ ہم ۲۱ کی صبح کو پشاور میں مل جائیں، اگر ہم پہلے پہنچیں گے تو آپ کے لئے آدمی اسٹیشن پر بھجوا دیا جائیگا، اس کارڈ کے جواب میں فوراً خط لکھئے تاکہ آپ کے انتظامات کا حال معلوم ہو جائے،

مخلص محمد اقبال

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۵۵)

جناب مولینا: السلام علیکم

اس سے پہلے ایک کارڈ آپ کی خدمت میں لکھ چکا ہوں، اور ایک ملفوف خط بھی لکھ چکا ہوں۔ پاسپورٹ ۱۹ر اکتوبر سے پہلے ہم سب کو مل جائیں گے، اب فیصلہ یہ ہے کہ ہم ۲۰ر اکتوبر کو لاہور سے صبح کی ٹرین میں پشاور کو روانہ ہوں، اور ۲۱ر کی صبح کو کابل روانہ ہوں، جلدی اس واسطے ہے کہ نومبر میں وہاں سردی ہو جاتی ہے۔ سید راس مسعود ۱۹ر کی شام کو لاہور پہنچ جائیں گے، آپ بھی مہربانی کرکے ۱۹ر کی شام کو لاہور پہنچ جائیے، یا ۲۰ر کی صبح کو ایسے وقت پہنچیے کہ آپ ہمارے ساتھ ۲۰ر کی صبح کو میل ٹرین میں سوار ہو سکیں، قونصل خانہ سے جو آدمی ہمارے ہمراہ جائیگا، وہ بھی لاہور ہی سے ساتھ ہوگا، زیادہ کیا عرض کروں جب ملاقات ہوگی تو مفصل عرض کروں گا، اس انتظام کے لئے قونصل جنرل صاحب کو اطلاع دیدی ہے، والسلام

مخلص محمد اقبال

۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۵۶)

مخدومی: آپ کا پوسٹ کارڈ ابھی ملا ہے، میں اس سے پہلے ایک ملفوف خط ارسال خدمت کر چکا ہوں، آپ ۱۹ر اکتوبر کی شام کو لاہور پہنچ جائیے، یہاں سے ۲۰ر اکتوبر کی صبح پشاور روانہ ہو جائیں گے، سید راس مسعود بھی ۱۹ر کی شام کو لاہور پہنچیں گے، قونصل جنرل صاحب کو بھی آپ تار دیدیں کہ آپ ۱۹ر کی شام کو لاہور پہنچ جائیں گے،

اگر آپ کو پاسپورٹ ۱۸ر کو مل جائے تو مجھے تار دینے کی ضرورت نہیں، قونصل جنرل کو بذریعہ تار اطلاع کریں اور لاہور ۱۹ر کی شام کو پہنچ جائیے، والسلام

محمد اقبال ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۵۷)

جناب مکرم! السلام علیکم

آپ کا تار کل ملا جس سے معلوم ہوا کہ ۱۸ر اکتوبر تک آپ کو پاسپورٹ نہیں مل سکا، ممکن ہے ۱۸ یا ۱۹ اکتوبر تک مل جائے، ہم یعنی سید راس مسعود اور میں ۲۰ر کی صبح کو لاہور سے روانہ ہوں گے، تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، اگر آپ ۲۱ کی صبح تک بھی پشاور پہنچ سکیں، تو خوب ہے، وہیں ہوٹل میں رات بسر ہوگی، یہ ہوٹل پشاور چھاؤنی کے اسٹیشن سے بالکل قریب ہے، آپ وہیں کے پتہ پر ہم کو تار دیدیں، ہم آپ کی گاڑی کا انتظار کریں گے، اور اسٹیشن پر آپ کے لئے آدمی بھیج دیا جائے گا، اگر آپ کل شام یا ۲۰ر کی صبح کو لاہور پہنچ سکیں، تو ٹکٹ صرف لاہور ہی تک کا خرید کریں جیسا کہ میں لکھ دے چکا ہوں، اگر یہ ممکن نہ ہو تو ٹکٹ پشاور چھاؤنی اسٹیشن تک کا خرید کریں، آپ کے تمام مصارف ادا کئے جائیں گے، امید کہ آپ بخیریت ہوں گے، اور آپ کی معیت سے ہم سب مستفیض ہوں گے، والسلام

محمد اقبال لاہور

۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

(۵۸)

لاہور

۱۰ر نومبر ۱۹۳۳ء

مخدومی جناب قبلہ مولانا السلام علیکم

معارف سے معلوم ہوا کہ آپ مع الخیر وطن پہنچ گئے،

یہ عریضہ حضرت محی الدین ابن عربی کے مسئلہ زمان و مکان کی تحقیق کی یاددہانی کے لئے لکھتا ہوں، مجھے چند روز تک اس کی ضرورت پڑے گی، اس واسطے التماس ہے کہ ادھر جلد توجہ فرما کر مجھے ممنون فرمائیے،

شاہ نادر کی شہادت کا قلق ہوا، خدا تعالیٰ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، انشاء اللہ افغانستان میں امن وا

ہے گا، میں نے شاہ ظاہر کو تار دے دیا تھا جس کا جواب پرسوں موصول ہوا، صدر اعظم صاحب کا تار بھی آیا تھا، امید کہ آپ نے بھی اُن کو خیریت کا تار دیا ہوگا، زیادہ کیا عرض کروں،

امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا، والسلام

محمد اقبال

(۵۹)

لاہور

۹ر دسمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی! السلام علیکم

عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا،

مولوی نور الاسلام کا رسالہ فی تحقیق المکان کی نقل رامپور کتب خانہ سے آگئی ہے، اب آپ کے ایفائے وعدہ کا انتظار ہے، امید ہے کہ آپ ادھر جلد توجہ فرما کر مجھے شکر گذاری کا موقع دیں گے، زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا، والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۰)

لاہور

۱۵ر دسمبر ۳۳ء

مخدومی جناب مولانا السلام علیکم

آپ کے نوازش نامہ ابھی ملا ہے تلخیص کے لئے نہایت شکر گذار ہوں، مگر اسے پڑھ کر میرے دل میں ایک خیال

یا سوال پیدا ہوتا ہے جس کا پوچھنا ضروری ہے،

اگر دہر سے مراد حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیئے، یا یوں کہئے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے، کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات ہی میں ملے، مہربانی کرکے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمائیے، اور دیکھئے کہ کیا انھوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے، اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے، اس زحمت کے لئے معافی چاہتا ہوں، اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں،

میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے، اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہیئے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں،

جواب کا انتظار رہے گا، والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۱)

لاہور

۱۵ر جنوری ۱۹۳۳ء

مخدومی السلام علیکم

دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے، جمہوریت فنا ہو رہی ہے، اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے، جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے، سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے، تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے، غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے، ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے، اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے

اور اگر کوئی کتابین ایسی ہون جن کا مطالعہ اس ضمن مین مفید ہو تو اُن کے نامون سے آگاہ فرمائیے، والسلام

محمد اقبال

(۶۲)

لاہور

۲۴ جنوری ۱۹۳۴ء

مخدوم و مکرم السلام علیکم

کچھ روز ہوئے ایک عریضہ لکھا تھا، غالباً آپ کی عدیم الفرصتی جواب سے مانع رہی، اس خط کے جواب کا انتظار رہا،
کل مین آپ کے پرانے خطوط پڑھ رہا تھا، جو میرے پاس محفوظ ہین، اُن مین سے ایک خط مین آپ نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی
ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتون مین فساد کا امکان ہے تو ان اجازتون کو منسوخ
کردے، عارضی طور پر یا مستقل طور پر، بلکہ بعض فرائض کو بھی منسوخ کر سکتا ہے[1]؟ اس وقت آپ کا خط میرے سامنے
نہین ہے، حافظہ سے لکھ رہا ہون کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس کا حوالہ کہان سے ملے گا؟ مہربانی کرکے
اس کتاب کا پتہ دیجئے، جس مین یہ مسئلہ درج ہے،

۲- کیا یہ صحیح ہے کہ متعہ (نکاح موقت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانون مین مروج تھا، اور حضرت عمرؓ نے اسے
منسوخ کر دیا، نیز زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟

سفرنامۂ کابل بہت دلچسپ ہے، ممکن ہے آپ کو ایک دفعہ وہان پھر جانا پڑے،

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا،

مخلص محمد اقبال

---

[1] ڈاکٹر صاحب کے حافظہ نے غلطی کی ہے، ملتوی کی جگہ منسوخ لکھ گئے ہین،

(۶۳)

لاہور

یکم فروری ۱۹۳۴ء

جناب مولنا! السلام علیکم

۱۔ آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے بہت شکر گذار ہون، مین نے آپ کا پہلا خط پھر دیکھا، آپ نے جو کچھ لکھا ہے، درست ہے، مگر مین ان معاملات کی فہرست چاہتا ہون جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے اجرائم مین ایسے جرم مین جن کی تعزیر غالباً قرآن شریف مین مقرر ہے، ان کے متعلق امام کیونکر رائے دیگا

۲۔ آپ فرماتے ہین کہ تواتر عمل کی ایک مثال نماز ہے، مالکیون اور حنفیون اور شیعون مین جو اختلاف نماز مین ہے، وہ کیونکر ہوا؟

۳۔ ایک سوال اور پوچھنے کی جرأت کرتا ہون (۱) احکام منصوصہ مین توسیع اختیارات امام کے امر کیا ہین؟ (۲) اگر امام توسیع کرسکتا ہے، تو اُن کے عمل کو محدود بھی کرسکتا ہے، اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح (۳) زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے مین کیا ہے؟ قاضی مبارک مین شاید اسکے متعلق کوئی فتوی ہے، وہ فتوی کیا ہے؟ اگر کوئی اسلامی ملک روس کی طرح زمین کو حکومت کی ملکیت دے تو کیا یہ بات شرع اسلام کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع معاشرت سے گہرا تعلق ہے، کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی؟ (۴) صدقات کی کتنی قسمین اسلام مین ہین؟ صدقہ اور خیرات مین کیا فرق ہے؟ تکلیف تو آپ کو ان سوالون کے جواب مین ہوگی، مگر مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس زحمت کے لئے معاف فرمائینگے

تعلیمی مشورت کے لئے جو جلسے آپ کے آنے سے پہلے ہوئے، ان کے متعلق کچھ نوٹ سید راس مسعود نے اُن کی خدمت مین ہم دونون کے علاوہ سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور افغانی تعلیمی بورڈ کے ممبر، غالباً ترکی تعلیمی ہیئت بھی تھے، سرور خان نے خطوط بھی آئے تھے، والسلام مخلص محمد اقبال

(۶۴)

لاہور

۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

مخدومی مولانا، السلام علیکم

یہ خط اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھتا ہوں، معلوم نہیں کہ آپ ابھی علی گڈھ ہی میں ہیں، یا وہاں سے واپس آگئے، راغب اصفہانی نے مفردات میں لفظ نبی کی تشریح میں لکھا ہے کہ لفظ نبی کے دو معنی ہیں، خبر دینے والا اور مقام بلند پر کھڑا ہونے والا، اوّل الذکر نبی ہمزہ کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزہ کے، اس ضمن میں راغب نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے یعنی حضور رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزہ کے ہوں، یہ صحاحِ ستہ میں ہے یا نہیں؟[1]

قرآن شریف میں جن انبیاءؑ کا ذکر ہے، ان میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں، اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزہ ہیں؟[2]

۲۔ لفظ نار[3] کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے؟

۳۔ لفظ نجات کا روٹ کیا ہے؟ اور روٹ کے رو سے اس کے معنی کیا ہیں؟ غالباً راغب ہی نے لکھا ہے کہ اس کے معنی بلندی کے ہیں؟

نمبر ایک میں جو سوال میں نے لکھا ہے وہ بڑا اہم ہے، کیونکہ اگر قرآنی انبیاء یا حضور رسالت مآب نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا انگریزی ترجمہ (Prophet) جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں، کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

---

[1] یہ حدیث صحاح میں نہیں، آپ نے اس لئے نبی کہنے سے منع فرمایا کہ لغت کی رو سے منصب دار نبوت کے لئے نبیؐ لفظ ہے نبی نہیں

[2] یقیناً سب کے سب نبیؑ بلا ہمزہ کے ہیں [3] ن د ر معلوم ہوتا ہے، اس روٹ کے اصلی معنی چمک کے معلوم ہوتے ہیں، نور، روشنی، نار آگ، نورہ چونا، نورۃ کلی سب اسی ایک مفہوم کے مظاہر ہیں [4] ن ج و معنی بلندی کے یعنی جو سیلاب کے وقت پناہ کی جگہ بن سکے، اسی سے نجوۃ ہے، اسی سے موجودہ نجات ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہوگا،

آپ کا سفرنامۂ افغانستان خوب ہے لوگوں نے بہت پسند کیا، ہاں ایک ضروری بات یاد آگئی، یہاں ایک صاحب کے پاس شاہ ولی اللہؒ کے تفہیمات الٰہیہ کی دوسری جلد ہے، جو شاہ عاشق حسین (شاگرد شاہ ولی اللہ) کی لکھی ہوئی ہے، کیا ندوہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے، مولوی نواب صدر یار جنگ کے یہاں جو نسخہ ہے، وہ پہلی جلد ہے یا دوسری یا دونوں؟ کیا کسی نے اس کتاب کے اردو ترجمہ کا انتظام کیا ہے؟ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے کہ شاید معارف میں اس کے اردو ترجمہ کا اعلان کیا گیا تھا، والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۵)

بھوپال، شیش محل

۱۹ر جولائی ۱۹۳۵ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولوی صاحب

السلام علیکم: میں گلے کے برقی علاج کے لئے کچھ مدت کے لئے بھوپال میں مقیم ہوں، اس خط کا جواب بھی مذکورۂ بالا پتہ پر عنایت فرمایئے،

۱- کیا فقہ اسلامی کی رو سے توہینِ رسول قابلِ تعزیر جرم[۵۱] ہے، اگر ہے تو اس کی تعزیر کیا ہے[۵۲]؟

۲- اگر کوئی شخص جو اسلام کا مدعی ہے یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو حضور رسالت مآبؐ پر جزوی فضیلت حاصل ہے اس واسطے کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں، تو کیا ایسا شخص توہینِ رسول کے جرم کا مرتکب ہے؟ بالفاظ دیگر اگر توہینِ رسول جرم قابلِ تعزیر ہے، تو عقیدۂ مذکور توہینِ رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں[۵۳]؟

---

[۵۱] بے شبہ [۵۲] تعزیر حسب رائے امام قید سے لیکر قتل تک [۵۳] حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کو جزوی فضیلت حاصل ہونا جائز ہے۔ اور ایسا کہنا نہ کفر ہے نہ توہینِ نبی کا باعث ہے، البتہ مقتضائے محبت کے خلاف ہے اور پھر یہ بھی دیکھنا ہے

۳۔ اگر توہین رسول کی مثالیں کتب فقہ میں مذکور ہوں تو مہربانی فرماکران میں سے چند تحریر فرمائیے

کتاب کا حوالہ بقید صفحہ تحریر فرماکران میں سے چند تحریر فرمائیے

امید کہ اس عریضہ کا جواب جلد ملے گا، زیادہ کیا عرض کروں میری صحت پہلے سے بہتر ہے،

امید ہے اس دفعہ کے علاج سے زیادہ فائدہ ہوگا،

والسلام

مخلص محمد اقبال (لاہور)

حال وارد :۔ بھوپال (باقی)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷) کہ یہ جزوی فضیلت حقیقت میں فضیلت کے شمار میں ہے بھی، مثلاً زیادہ متمدن زمانہ میں ہونا کوئی فضیلت نہیں، کیونکہ خود تمدن نہ کوئی دینی فضیلت ہے نہ اخلاقی نہ عقلی، بلکہ ممکن ہے کہ اس کے بعد اور بھی دنیا زیادہ متمدن ہو جائے، تو اس زمانہ کے آدمی پر بھی اس زمانہ کے آدمی کو فوقیت ہو جائے، اور اگر یہ امر باعث فضیلت ہو تو غلام احمد قادیانی کیا، اقبال سیالکوٹی کو بھی یہ جزوی فضیلت حاصل ہے، بلکہ غلام احمد سے زیادہ، کیونکہ مرزا صاحب نے صرف اس کو دور سے دیکھا ہے، چکھا اور آزمایا نہیں، ملے یہ نقل کفر بمجھ سے نہ ہوگا، آپ السیف المسلول علی شاتم الرسول دیکھ لیجئے

محمد علی

ذاتی ڈائری کے چند ورق

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح وحالات و وقائع زندگی جو صاحب تفسیر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر صدق کے ذاتی مشاہدہ و تجربہ میں آئے، اس میں اُن کی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، محمد علی مرحوم کیا کچھ تھے اسکی صحیح تصویر آپ کو اس کتاب میں نظر آسکتی ہے، اس کا دوسرا حصہ زیر طبع ہے،

قیمت :۔ عہ/ — "منیجر"

ادبیات

آج کل

از جناب سید اختر علی صاحب تلہری

بدلی ہوئی مشیّتِ یزداں ہے آج کل
بے رنگ دہر کا چمنستاں ہے آج کل

ہر برگ پر رقم ہے تباہی کی داستاں
ساماں عبرتوں کا گلستاں ہے آج کل

طوفانِ باد فتنہ و غارت ہے پُرخروش
دنیائے صلح و امن پریشاں ہے آج کل

آدم کی وحشتوں کے ہیں جھونکے تُند باد
شمعِ سکونِ جاں تہِ داماں ہے آج کل

عفریتِ بدخصال ہے خنداں مثالِ گُل
انسانیت کا چاک گریباں ہے آج کل

انساں کی عشرتوں کا یہ پُرنور گُلکدہ
تاریک تر ز کلبۂ احزاں ہے آج کل

چاروں طرف بپا ہیں وہ فتنے کہ الاماں
نوعِ بشر جحیم بداماں ہے آج کل

وہ عزتِ حرم ہو کہ ہو عزتِ وطن
سب کچھ حصولِ جاہ پہ قرباں ہے آج کل

صدق و خلوص رو میں سیاست کی بہ گئے
جنسِ فریب و مکر فراواں ہے آج کل

دل میں ہے زہر اور زبانوں پہ شہدِ ناب
دنیا کی زندگی کا یہ عنواں ہے آج کل

جنگ و جدل میں ڈھونڈھ رہا ہے نجات کو
کس درجہ دورِ عقل سے انساں ہے آج کل

تھا جس پہ ناز ہم کو وہ روحانیت کا ذوق
پامالِ فکرِ فتنہ بداماں ہے آج کل

بدلا ہے رنگ دہر کا ایسا کہ ہر طرف
درد و فغان و آہ کا ساماں ہے آج کل

عزم فلک شگاف ہو یا فکر ارجمند
سب نذر پائے وسعی جانان ہے آج کل

اس انقلاب دہر نے دل ہی بدل دیا
پہلے جو تھا چمن وہ بیابان ہے آج کل

ایسا بھی کوئی ہے جسے انسان کہہ سکیں
ہندو ہے کوئی کوئی مسلمان ہے آج کل

اختر وہ ذوقِ عشرتِ رندانہ کیا ہوا
شام و سحر وظیفۂ قرآن ہے آج کل

غزل

از نواب زادہ سید شمس الحسن خان صاحب

ہر منزلِ خودی سے محبت گذر گئی
مستی بھری کسی کی نظر کام کر گئی

اب سامنے ہے کوئی تو اٹھتی نہیں آنکھ
بیباکیِ نگاہِ محبت کدھر گئی

کیا ہوتا گر وہ رہتی نظروں کے سامنے
اتنی سی دیر میں تو قیامت گذر گئی

عرضِ نگاہِ شوق بھی جس کو نہ کر سکی
وہ کام میری آتشِ خاموش کر گئی

جس آرزو کو سمجھا تھا "سرمایۂ حیات"
وہ آرزو بھی آج نظر سے اتر گئی

اے حسنِ یار تو نے تو دیکھا نہیں اسے
چمکی تھی ایک برق نہ جانے کدھر گئی

ویرانۂ حیات کی اللہ رے وحشتیں
وہ کیا گئے کہ رونقِ دیوار و در گئی

اُن کی تو آن رہ گئی میں مٹ گیا تو کیا
کچھ غم نہیں جو آہ مری بے اثر گئی

وہ کیا ڈرے گا جس کو یقین خدا پہ ہے
طوفان میں بھی کشتیِ دل بے خطر گئی

کیا کیا گھٹائیں اٹھی ہیں دل سے کہ الاماں
اس رخ پہ جب وہ زلفِ معنبر بکھر گئی

دیکھیں حریمِ ناز سے آتا ہے کیا جواب
لیکر پیامِ شوق نسیمِ سحر گئی

اے شمس اپنے حال پہ روتا ہے تو مگر
کس کو خبر کہ حسن پہ خود کیا گذر گئی

غزل

از جناب عارفؔ عباسی

ایک بھولا ہوا انداز کرم یاد آیا — ہائے وہ وقت کہ جب اُن کا ستم یاد آیا
غیر ممکن ہے ملے قیدِ تعین سے نجات — دیر جب یاد نہ آیا تو حرم یاد آیا
رات کیوں نبضِ جہاں رک سی گئی تھی اے دوست — ہاں تری یاد میں مصروف تھے ہم یاد آیا
بڑھ کے لبیک کہا ذوقِ جراحت نے مرے — حسن کو جب کوئی عنوانِ ستم یاد آیا
تذکرہ تھا نگہِ لطف و عنایت کا کہیں — مجھکو اپنا دلِ بربادِ کرم یاد آیا
ایک مرکز پہ کہیں رہتی ہے شوریدہ سری — دل جو گھبرایا مسرت سے تو غم یاد آیا
دامنِ گل پہ نظر آئی جو شبنم عارفؔ — جانے کیوں مجھ کو مرا دیدۂ نم یاد آیا

آئینۂ حیرت

از جناب عبدالمجید حیرتؔ شملوی

جس ترقی کا اس قدر غل ہے، — وہ ترقی نہیں تنزل ہے
ہے تو سینہ میں دل مگر خاموش — شمع محفل میں ہے مگر گل ہے
جب تغافل نہ تھا، توجہ تھی — اب توجہ نہیں، تغافل ہے
حسنِ خود بیں کا اک بڑا فتنہ — وہ بھی ہے جس کا نام کاکل ہے
ہم کو نسبت ہے اُس گلستان سے — جس گلستان کا خار بھی گل ہے
نہ سہی امن و عافیت پیہم — کشمکش میں تو اک تسلسل ہے
ہم نفس کوئی دور تک بھی نہیں — تلخ یوں بھی نوائے بلبل ہے
ان سے کیا بحث کیجئے حیرتؔ — جن کے نزدیک جزو ہی کل ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

فتنۂ پرویز و حقیقتِ حدیث | از جناب ایم عبدالرحمن صاحب صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد سے ریتہ : ایم ثنا اللہ خان نمبر ۲۹ ریگو روڈ لاہور

کلام مجید ایک اصولی کتاب ہے جس میں زیادہ تر بنیادی و اصولی احکام و قوانین ہیں جن کی جزئیات کی تصریح و تفصیل احادیثِ نبوی سے معلوم ہوتی ہے، اس لئے اگر ان کو نہ مانا جائے تو بہت سی دینی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں، اور آیاتِ قرآنی میں بھی من مانی تاویلات کی گنجائش نکل آتی ہے، مگر حدیثوں کے صریح انکار سے اس قسم کے نام نہاد مسلمانوں کا پردہ بالکل فاش ہو جاتا ہے، اور عام مسلمان ان کے فریب میں نہیں آسکتے، اس لئے وہ حدیثوں کی صحت کو مشتبہ قرار دے کر مسلک بالقرآن کے پردہ میں ان کے دینی حجت ہونے سے انکار کرتے ہیں جس سے ان کو بہت سی دینی پابندیوں سے نجات مل جاتی ہے، اس فتنہ کی تردید میں بہت لکھا جا چکا ہے، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک مفید کوشش ہے، اس میں خصوصیت کیساتھ منکرین حدیث کے امام وقت مرزا غلام احمد کے ہم نام غلام احمد پرویز کے ہفوات کی تردید کی گئی ہے، اور ان کی تحریروں سے منکرین حدیث کے اصل مقصود یعنی، دینی پابندیوں سے فرار، قرآن مجید کی معنوی تحریف، اطاعت رسول سے انحراف وغیرہ کو دکھایا گیا ہے اور منکرین حدیث کی جانب سے حدیثوں کی صحت اور ان کے دینی حجت ہونے پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کا جواب دیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں حدیث کی دینی حیثیت، اطاعت رسول کے قرآنی احکام، قرن اول میں حفظ حدیث کی صحت و حفاظت کے اہتمام اس کے ذرائع حفظ، کتابت، اصول روایت و درایت اور تدوین حدیث کی تاریخ

پر روشنی ڈالی گئی ہے، احادیث کی کثرت کے متعلق مبالغہ آمیز بیانات کی تردید کی گئی ہے، اور آخر میں منکرین حدیث کے تقلید سلف سے گریز، دین کی تخریب اور اس کی مخالفت میں اُن کے اور کمیونسٹوں کے خیالات میں مشابہت دکھائی گئی ہے، خالص علمی و تحقیقی حیثیت سے اس موضوع پر اس سے بہتر کتابیں موجود ہیں، مگر یہ کتاب بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے، اور اس میں پرویز کی تحریروں سے انکا تضاد بیان اور دین سے منکرین حدیث کا فرار خصوصیت کے ساتھ بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے، جناب طالوت کا مقدمہ بہت دلچسپ اور ان کے طرز خاص کا اچھا نمونہ ہے،

تذکرہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی و ترجمہ رسالۂ مناقب] از مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحات کاغذ کتابت بہتر قیمت مجلد عہ :- پتہ: ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی،

تاریخ گجرات مصنف کا خاص موضوع ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے گجرات کے بعض اکابر علماء و مشائخ کی علمی یادگاریں اور اُن کے متعلق کتابیں بھی شائع کی ہیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے امام المحدثین فی الہند شیخ محمد طاہر پٹنی کے حالات میں اُن کے پوتے شیخ عبدالوہاب کے ایک فارسی رسالہ رسالۂ مناقب کا ترجمہ کیا ہے، اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جو مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں شیخ کے سوانح، اُن کے نسبی و خاندانی حالات، تعلیم و تحصیل علم، اساتذہ، علمی و روحانی کمالات، درس و تدریس، تالیف و تصنیف، ارشاد و ہدایت، اصلاح و تزکیہ، تصانیف اور اولاد وغیرہ کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ میں گجرات میں اسلامی حکومت کی مختصر تاریخ، شیخ کے عہد کے علماء اور فرقۂ مہدویہ کے حالات وغیرہ اس دور کے متفرق اور مفید اطلاعات بھی آگئے ہیں، شیخ کے نسب کے سلسلہ میں بوہرہ قوم کی اصل و نسل پر محققانہ بحث کی گئی ہے، مقدمہ کے بعد شیخ علاء الدین کے رسالۂ مناقب کا ترجمہ ہے، اور اس میں جو تاریخی غلطیاں ہیں، انکی تصحیح کر دی گئی ہے، یہ کتاب تذکرہ علمائے ہند میں اچھا اضافہ ہے،

کتاب الصلٰوۃ و ما یلزم لہا] مترجمہ جناب شیخ علی جواد صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر مجلد قیمت تحریر نہیں پتہ: [illegible]

آسام پاک کراچی،

نماز کی فضیلت و اہمیت اور اس کی تعلیم و تکمیل کے لوازم و شرائط اور ان سے متعلق احکام و مسائل پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ کتاب الصلوٰۃ و ما یلزم فیہا کے نام سے ہے جو عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، مذکورہ بالا کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے، لائق مترجم نے اس کے شروع میں حضرت امام کے مختصر حالات و سوانح بھی تحریر کر دیئے ہیں، جس سے اس کا فائدہ بڑھ گیا ہے، یہ رسالہ نماز کی تعلیم و تکمیل کے مسائل سے واقفیت کے لئے مفید ہے،

روایات الطیب مرتبہ جناب مولانا محمد طیب صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۔۔ صفحات کاغذ کتابت

طباعت بہتر قیمت مجلد ہے، پتہ: ادارہ تاج المعارف دیوبند،

علماء و اخیار کی زندگی کا کوئی واقعہ بھی فائدے اور سبق سے خالی نہیں ہوتا، دیوبند کے سلسلہ کے اکابر کے ایسے بہت سے واقعات ہیں، جو عام طور سے معلوم و مشہور نہیں ہیں، اور بطور روایت کے سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے آتے ہیں، فاضل مرتب نے افادۂ عام کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ، شاہ عبد العزیز صاحب، مولانا شاہ عبد القادر صاحب، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا شاہ محمد اسحٰق اور حضرت سید احمد بریلوی کے سبق آموز نادر واقعات کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے، اس میں معمولی واقعات بھی ہیں، اور اہم بھی مگر کوئی واقعہ بھی کسی نہ کسی مفید سبق سے خالی نہیں ہے، مرتب نے ان کو شائع کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے،

مینا بازار مرتبہ و مترجمہ جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۱ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے، پتہ: نیو اسٹار کریمی پریس الٰہ آباد،

مینا بازار جو عام طور سے ظہوری کی جانب منسوب ہے، اور جس کے مصنف کی تحقیق کے بارہ میں دو فاضلوں کے بیان معارف میں مباحث چل رہا ہے، وہ قدیم فارسی ادبیات کی مشہور کتاب ہے، اور اس زمانہ میں بھی وہ بعض جگہ نصاب میں داخل ہے، اس لئے ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی نے اس کو تصحیح و تحشیہ، ترجمہ و تشریح اور مقدمہ کے ساتھ اہتمام سے شائع کیا ہے، مقدمہ میں مینا بازار پر مختصر تبصرہ اور اس کے مصنف کی تحقیق کی گئی ہے، اس کے بعد اصل

کتاب ہی، اور آخر میں اس کا ترجمہ، حل لغات اور تشریح ہے، تشریح میں جا بجا اس کے ادبی محاسن کی بھی وضاحت کی گئی ہے، یہ ترجمہ اور تشریح فارسی کے طلبہ کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے،

شیخ نیازی از جناب رشید احمد صاحب صدیقی تقطیع اوسط ضخامت ۱۲۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ: سرسید بک ڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

یہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا پرانا اور نہایت دلچسپ افسانہ ہے جس میں شیخ نیازی کے گھر کے واقعات کو بڑے دلکش پیرایہ میں لکھا گیا ہے جن لوگوں کو شیخ نیازی سے تعارف حاصل ہے، وہ اُن کی خصوصیات سے واقف ہونگے اس افسانہ میں ان کی قلندرانہ شان، معصومیت، بھولے پن، عادات، خصائل، مشاغل وغیرہ بھائی بہنوں سے صلح و جنگ، مرغوبات لباس و وضع قطع وغیرہ کو اپنے خاص انداز میں لکھا ہے، اور شیخ نیازی کے پردہ میں بچپن کی معصوم زندگی کی بڑی دلکش مصوری کی ہے، اس لئے یہ کتاب نہ صرف بچوں بلکہ بوڑھوں کے لئے دلچسپ ہے، اس کے آخر میں دو اور مختصر افسانے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا، ترمیم و اضافہ کے بعد دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، اس اڈیشن میں شیخ صاحب کی تصویر اور زیادہ دلچسپ ہوگئی ہے

آسان ریاضی حصہ سوم | مرتبہ جناب شوکت علی صاحب بی اے، ایل ٹی تقطیع اوسط ضخامت ۱۴۴ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت ۱۲ر پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، ریاست رام پور،

جماعت اسلامی ہند نے مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے مذہبی نصاب کے ساتھ تاریخ جغرافیہ اور ریاضی کا بھی پورا نصاب مرتب کیا ہے جس میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کا ممکن حد تک لحاظ رکھا ہے، مگر ریاضی میں اس کی گنجایش بہت کم ہے تاہم مشق اور مثالوں میں جہاں تک گنجایش نکل سکی ہے اس کتاب میں اسلامی مادّہ

م

مکتبۂ دارالمصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام (حصۂ اول) عہد رسالت و خلافت راشدہ
یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام
کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام (حصۂ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت
کی صد سالہ سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت [illegible]

تاریخ اسلام (جلد سوم) (خلافت عباسیہ) یعنی ابوالعباس
سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ تک دو
صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام (جلد چہارم) (خلافت عباسیہ دوم)
اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ
تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور
آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیوں کے تمدنی کارناموں
پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلی تینوں
سے کہیں زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: [illegible]

نئی کتابیں

تاریخ سندھ سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی و تمدنی
تاریخ: قیمت: [illegible] (چھ روپیے)

اقبال کامل ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ
اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، [illegible]

بزم تیموریہ تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے
علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلاء کے مختصر تذکرہ
کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت [illegible]

امام رازی امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات ان کی
تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل
کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت [illegible]

بزم صوفیہ عہد تیموریہ سے پہلے کے صاحب تصنیفات صوفیۂ کرام
مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء
وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت [illegible]

تاریخ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی
تاریخ کے ساتھ اندلس کی تمدنی تاریخ، قیمت [illegible]

[illegible]

[illegible] کی نئی مطبوعات

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزم تیموریہ کے نام سے [illegible] ہو چکی ہے، اب اس کے پہلے کے سلاطین کی جو خاندان یعنی غلامان، خلجیہ، تغلق اور لودھی کے [illegible] میدان سے متعلق علماء و مشائخ ادباء و شعراء کے حالات بھی ایک سلسلہ [illegible] ہے [illegible] اور شعر و سخن [illegible] ان سلاطین نے میدان جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے اور اپنی تیر و تلوار [illegible] جنگ [illegible] کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی [illegible] اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں [illegible] الدین [illegible] سراج [illegible] سلطان [illegible] شمس [illegible] امیر خسرو، امیر حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے [illegible] [illegible] ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن اور زبان و ادب [illegible] گیا [illegible] مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن [illegible]

مآل و حیثیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی مقصد مآل و حیثیت کی [illegible] یک مختصر مقدمہ [illegible] اس کے بعد [illegible] پوری بحث پر تبصرہ [illegible] صاحب [illegible]

قیمت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جلد ۷۵ نمبر ۲ ... فروری سنہ ۱۹۵۵ء

19 FEB 1955

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیہ سالانہ

مجلس ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی	صدر
(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی،	رکن
(۳) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی،	″
(۴) جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	″
(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی	مرتب
(۶) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے	شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ کی پر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: سے

حکمائے اسلام جلد اول

دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکما کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکما نے فلسفہ سے مذہب کی تخریب و بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)

قیمت: معہ

جلد ۷۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۵۵ء عدد ۲

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۸۲-۸۴

مقالات

اسلام کا ذوق جمال — جناب قطب الدین احمد صاحب حیدرآباد دکن — ۸۵-۱۱۰

حضرت شیخ سماء الدین دہلویؒ — ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی دہلی — ۱۱۱-۱۲۱

اردو شاعری اور سیاست — جناب کلب علی خاں صاحب رامپوری — ۱۲۲-۱۴۱

امام ابوحنیفہؒ کی فقہ — جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی — ۱۴۲-۱۵۲

مکتوب امریکہ — جناب محمد صابر خاں صاحب — ۱۵۳-۱۵۵

ادبیات

سلام بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم — جناب ابو المعانی محمد عمر نعمانی مرحوم شملہ — ۱۵۶

مطبوعات جدیدہ — " م " — ۱۵۷-۱۶۰

شذرات

پنڈت کشن پرشاد کول کی وفات ایک بڑا ادبی اور تہذیبی سانحہ ہے، وہ اردو کے ممتاز ادیب، اس کے شیدائی اور ہماری پرانی تہذیب و شرافت کی ایک اہم یادگار تھے، ان میں خدمت کا جذبہ ابتدا سے تھا، چنانچہ آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر اس زمانہ میں جبکہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان سرکاری عہدوں کی جانب لپکتا تھا، انھوں نے دنیاوی دولت و وجاہت کے مقابلہ میں ملک و قوم کی خدمت کو ترجیح دی، اور سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر ہو گئے، جو اس زمانہ میں سادگی اور قناعت کے ساتھ قومی خدمت کی تربیت گاہ تھی، اور ساری عمر ایک وضع میں گذار دی، وہ لکھنؤ کے پرانے کانگریسی لیڈر بابو گنگا پرشاد ورما کے سیاسی شاگرد اور انکے شریک کار رہے، انکے بعد انکے اخبار ہندوستانی کو سنبھالا اور کئی سال تک اسکو چلاتے رہے، اس کے بعد پنڈت چکبست کے ساتھ مشہور رسالہ صبح امید نکالا، گنگا پرشاد میموریل لائبریری قائم ہونے کے بعد اس کے آنریری سکریٹری ہو گئے اور آخر عمر تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے،

وہ طبعاً سیاسی آدمی نہ تھے، انکا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا، اس لیے ہنگامہ خیز سیاست سے دور رہے اور پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں بسر کی، اردو تہذیب اور اردو زبان سے ان کو عشق تھا، اس فرقہ پرستی کے دور میں جبکہ بڑے بڑے اردو نوازوں کے قدم ڈگمگا گئے، انھوں نے جس جرأت کیساتھ اردو کی حمایت، اس کا حق منوانے کیلیے عملی جد و جہد اور اردو علاقائی زبان کی تحریک کی رہنمائی کی وہ ان ہی کا حصہ ہے، اردو میں ان کے متعدد ناول، افسانے، خطبۂ صدارت اور ادبی و تنقیدی مضامین وغیرہ ان کی یادگار اور انکی ادبی و لسانی مہارت کا ثبوت ہیں، وہ لکھنؤ کے پرانے کشمیری برہمنوں کی طرح ہماری پرانی تہذیب شائستگی اور شرافت و وضعداری کا نمونہ اور بڑے مخلص، شریف الطبع اور مرنجاں مرنج انسان تھے، انکی موت سے ہماری پرانی مشترکہ تہذیب کی ایک ولآویز یادگار مٹ گئی جس کے نمونے نئے ہندوستان میں پیدا

ہونے کی امید نہیں، اس لیے ان کی موت ایک بڑا تہذیبی حادثہ بھی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی وائس چانسلری کے مبارک دور میں مسلم یونیورسٹی میں جو ترقیاں ہوئی ہیں، ان میں ایک اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات کے ادارے کا قیام بھی ہے، اس قسم کے ادارے بہت سی غیر مسلم یونیورسٹیوں میں بھی ہیں، اسلیے محض اس کا قیام کوئی اہمیت نہیں رکھتا اصل چیز اس کے مقصد اور نقطۂ نظر کی صحت ہے، اس قسم کے کام عموماً تحقیق کے نقطۂ نظر کے تابع ہوتے ہیں، اس لیے کبھی کبھی ایک ہی چیز کے متعلق محققین کے نتائج تحقیق مختلف بلکہ بعض اوقات متضاد ہوتے ہیں جس کے عجیب و غریب نمونے مستشرقین کی تحقیقات میں نظر آتے رہتے ہیں،

مسلم یونیورسٹی اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمایندہ ہے، اس لیے اسلامیات کی تحقیقات میں اسکا نقطۂ نظر تاریخی تحقیق کیساتھ اسلامی بھی ہونا چاہیے اور اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو انکی صحیح شکل میں اس طرح پیش کرنا چاہیے جس سے انکی عظمت نمایاں اور دنیا پر ان کے مذہبی، علمی اور تمدنی اثرات ظاہر ہوسکیں، اس بارہ میں ہمکو ہندو فضلا سے سبق لینا چاہیے جن کا ہر فرد اپنے اپنے دائرہ میں دنیا پر ہندو مذہب، ہندو فلسفہ اور ہندو تہذیب کا سکہ بٹھانے میں لگا ہوا ہے، مسلمانوں کے پاس تو علوم و فنون کا پورا خزانہ اور انکے مذہبی علمی اور تمدنی کارناموں کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے، اسلیے اگر یونیورسٹی کا یہ ادارہ اسلامی جذبہ سے اس کام کو انجام دے تو بڑی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے، ہم کو امید ہے کہ یہ مقاصد خود اس کے کارکنوں کے پیش نظر ہوں گے

راقم الحروف اگرچہ بعض مجبوریوں کی بنا پر آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن بمبئی میں شرکت نہ کرسکا مگر اخبارات کی اطلاع اور کنونشن کے شرکا کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کنونشن ہر حیثیت سے بہت کامیاب رہا، اور اسمیں ہر مکتب خیال کے مسلمانوں نے شرکت کی اور ایسا نمایندہ اجتماع مدتوں کے بعد ہوا جسمیں مختلف عقائد و خیالات کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے جو اصل مقصد کی کامیابی کیلیے فال نیک ہے، لائق صدر کا خطبۂ صدارت توقع کے مطابق صحیح اسلامی روح سے معمور تھا، کنونشن میں جو تجویزیں منظور ہوئیں وہ اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں، انکو عمل میں لانے کے لیے ماہرین تعلیم اور صاحب علم و فکر مسلمانوں کا ایک بورڈ بنا دیا گیا ہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کے لیے یہ پہلا تعمیری قدم اٹھایا گیا ہے، مسلمانوں کے موجودہ مسائل میں ابتدائی مذہبی تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے، اگر اسکو انھوں نے حل کرلیا تو یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوگا،

ہندوستان اور پاکستان کے سکہ کے اختلاف اور پاکستان کی تجارتی پالیسی کا اثر ان دونوں ملکوں کے علمی و اشاعتی اداروں پر بہت زیادہ پڑا ہے جن میں دار المصنفین بھی شامل ہے، اسکی کتابوں کی تجارت تو گھٹ گئی ہے، اگر حکومت ہند ساٹھ ہزار سے اسکی مدد نہ کرتی تو اس کا چلنا دشوار ہو جاتا، اس سے وقتی طور پر اسکی حالت ضرور سنبھل گئی، مگر اس قسم کی عارضی امداد اسکی مشکلات کا مستقل حل نہیں ہے، اور جب تک اس کی تجارت اصلی حالت پر نہ آئے گی، اس وقت تک اس کو دشواریاں پیش آتی رہیں گی، ہندوستان کے مصنفین کی جماعت اور علمی و اشاعتی اداروں نے اخبارات کے ذریعہ بارہا اسکی جانب توجہ دلائی، مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، پاکستان اپنے مصالح کے مطابق اپنی تجارتی پالیسی بنانے میں بالکل حق بجانب ہے، مگر عام تجارتی چیزوں میں علم و ادب کو بھی شامل کر لینا اور اس پر پابندی لگانا علم دوستی کے بھی خلاف ہے اور اس سے کوئی خاص فائدہ بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ لاکھ دو لاکھ کتابیں ہندوستان سے پاکستان جاتی ہوں گی، مگر کم و بیش اتنی ہی کی وہاں سے آتی ہوں گی، اور اگر انکی درآمد برآمد میں چند ہزار کا فرق بھی ہو تو اس حقیر رقم سے حکومت کے اقتصادیات پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، مگر اس سے کتنے اداروں کی زندگی ہو جائیگی، اسلئے کم سے کم کتابوں کو تجارتی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہیئے،

یہ دونوں ملکوں کے اداروں کا معاملہ ہے، اس لیے ان کو خود باہمی صلاح و مشورہ سے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں دار المصنفین کی جانب سے ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب پاکستان میں دار المصنفین کی تجارت کی بقا اور اسکی توسیع کے ذرائع کی تلاش اور اس مسئلہ پر وہاں کے تاجروں سے گفتگو کرنے کیلئے عنقریب کراچی اور لاہور جانے والے ہیں، اگر ضرورت ہوئی تو دار المصنفین کا کوئی اور نمایندہ بھی بھیجا جائے گا، ہم کو امید ہے دار المصنفین کے تمام ہوا خواہ اور ہمدرد اس کام میں صباح الدین صاحب کی پوری مدد کریں گے۔

یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ سلیمان نمبر کی طباعت شروع ہو گئی ہے، مگر اس کے متعلق استفسار کا سلسلہ برابر جاری ہے، اس لیے پھر اطلاع دیجاتی ہے کہ اس کی طباعت ہو رہی ہے مگر یہ نمبر چار ساڑھے چار سو صفحوں کی ضخامت کا ہوگا، اس لیے اس کی طباعت میں بھی کچھ وقت لگے گا، کوشش کیجا رہی ہے کہ مارچ کے آخر تک شائع ہو جائے،

مقالات

اسلام کا ذوق جمال

از

جناب قطب الدین احمد صاحب حیدرآباد دکن

إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ (الحدیث مسلم)

اللہ نے حسن و خوبی کو ہر چیز پر واجب گردانا ہے

کائنات کے کسی گوشہ پر بھی نظر ڈالو، تمھین حسن و جمال اور خوبی و کمال کے نگاہ پرور نظارے قلب و نظر کی تسکین کا سامان لئے ہوئے، اپنی ساری رعنائیون کے ساتھ جلوہ فرما نظر آئین گے، صبح کا چہرۂ خندان، شام کا جلوۂ محجوب، پہاڑون کی بلندیان، وادیون کا نشیب، پھولون کی عطر بیزی، پرندون کی نغمہ ریزی، شفق کی لالہ گونی، قوس قزح کی بوقلمونی، فضائے نیلگون کی بزم انجم، مہر و ماہ کی نور افشانیان، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار، اور پھل اور پھول سے لدے ہوئے گلزار، غرض کائنات کا گوشہ گوشہ جمال فطرت سے معمور نظر آئے گا، مگر مردمک دیدہ مین اتنی سمائی کہان کہ ان ساری تجلیون کو اپنی آغوش مین سمیٹ سکے،

دامان نگاہ تنگ و گل حسن تو بسیار   گلچین بہار تو ز دامان گلہ دارد

یا غالب کی زبان مین

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگان اٹھائیے   طاقت کہان کہ دید کا احسان اٹھائیے

موجودات کی ان تمام اشیاء مین آخر یہ حسن و دلربائی کہان سے آگئی، اور دنیا کیون خوب روئی و نظرافروزی کی تماشا گاہ ہو؟ کیا وجود کے لئے حسن وجمال ناگزیر ہے؟ ان سب کا جواب صرف ایک ہے کہ اس پردہ کے پیچھے جو روح کارفرما ہے، وہ خود اپنی ذات سے حسین واقع ہوئی ہے، اس لئے اس سے جس چیز کا بھی صدور ہوتا ہے وہ حسن وجمال ہی ہوتا ہے،

ہرچہ آن خسرو کند شیرین بود

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے، اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ لا یصدر عنہ الا الجمال، ذاتِ الٰہی ہمہ حسن و لطافت ہے، اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے، وہ خوبی و کمال ہی ہوتا ہے، کائنات ایک آئینہ کی مثال ہے جس کا ہر عکس پرتوِ جمالِ الٰہی ہے، یا اُس کی حیثیت ایک جسم کی سی ہے جس مین ذاتِ الٰہی روح کی طرح جاری وساری ہو،

حق جانِ جہان ست، وجہان جملہ بدن ‎ ‎ ‎ اصناف ملائکہ حواسِ این تن

افلاک وعناصر و موالید، اعضا ‎ ‎ ‎ توحید ہمین ست و دگر حیلہ وفن

ایک حدیث قدسی مین جس کو حافظ سخاوی نے مقاصدِ حسنہ مین نقل کیا ہے، مذکور ہے کہ ذاتِ الٰہی کی مثال ایک پوشیدہ خزانہ کی سی تھی، جب اُس نے چاہا کہ خارج مین اس کی تجلیات کا ظہور ہو، تو کائنات کی خلقت عمل مین آئی، تاکہ اس آئینہ مین اپنے جمالِ جہان آرا کا مشاہدہ کرے، کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ،

گہ در اندیشۂ خود، گاہ درآئینۂ ما ‎ ‎ ‎ دیدہ بصورتِ خود دوختہ حیران خودند

یہ وہ طور ہے جہان منعِ دیدار کی گنجایش نہین، ذرہ ذرہ جلوون سے معمور اور گوشہ گوشہ انوار و تجلیات کی فراوانیون سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے، صرف حجاب جو ہے تو اپنی نظرون کا، اور قصور ہے تو اپنی فہم وادراک کی نارسائیون اور کوتاہیون کا،

موسیٰ نہ دید، ورنہ بہ اکرام یک نگاہ ‎ ‎ ‎ صد جلوہ کرد حسن، وحجابے نہ دید کس

ان تجلیات کی کیفیت اہل اللہ سے پوچھو جنہیں حقائق کا عرفان حاصل تھا، حضرت بشیر حافیؒ کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب انھوں نے والارض فرشنٰھا سُنا، تو جوتا پیروں سے نکال پھینکا، اور برہنہ پائی اختیار فرمائی، لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا کہ مہربان آقا نے جب ہم غلاموں کے لئے یہ فرش زمردین بچھادیا ہے، تو ہم کو زیب نہیں دیتا کہ اس کو اپنے جوتوں سے پامال کریں،

پایم بہ پیش از سرِ این کوی نمی رود   یاران خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست

قرآن مجید اور آیاتِ جمال | قرآن مجید نے اپنی متعدد آیات میں عالم انسانیت کو فطرت کے اس حسن و جمال کی طرف توجہ دلائی ہے :-

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍۢ بَھِیْجٍ ۝ تَبْصِرَۃً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ، (ق - ۱)

کیا کبھی ان لوگوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا نہیں کہ کس خوبی کے ساتھ ہم نے یہ فضائے سماوی اور اس کے ستارے بنائے ہیں، اور کس طرح اُس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے اور پھر کس عمدگی کے ساتھ، تمھارے سروں پر یہ شامیانہ تنا ہوا ہے کہ کہیں بھی اس میں شگاف نہیں، اور اسی طرح زمین کو دیکھو، کس طرح ہم نے اسے فرش کی طرح پھیلا دیا ہے، اور اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈالدیئے، اور پھر کس طرح ہر قسم کی نباتات اُگا دی، ہر اس بندے کے لئے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے، اس میں بصیرت و عبرت ہے،

وہ آسمان کی اس خوش منظر فضا کا بار بار اعادہ کرتا ہے، اور ہر محل پر دعوت فکر و نظر دیتا ہے،

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ، (الحجر ۱۶)

اور دیکھو ہم نے آسمان میں ستاروں کی گردش کے لئے برج بنائے، اور اس طرح بنائے کہ دیکھنے والوں کے لئے ان میں خوشنمائی پیدا کر دی

ایک دوسرے مقام پر اس طرح ارشاد ہے،

وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (الملک ۵)

اور دیکھو ہم نے سماء دنیا کو ستاروں کی قندیلوں سے زینت بخش دی،

خوبی و کمال کے ان نمونوں کو وہ صرف دیکھنے ہی کی دعوت نہیں دیتا بلکہ ان پر غور و تفکر کی تعلیم بھی دیتا ہے،

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ

تم رحمن کی بناوٹ میں کبھی کوئی اونچ نیچ نہ پاؤ گے، اچھا نظر اٹھاؤ، اور اس تماشا گاہ صنعت کا مطالعہ کرو) ایک بار نہیں، بار بار دیکھو، کیا تمہیں کوئی دراڑ دکھائی دیتا ہے؟ تم اس طرح یکے بعد دیگرے دیکھتے رہو، تمہاری نگاہ واپس تھک کر لوٹ آئے گی، اور عاجز و درماندہ ہو کر واپس آجائے گی لیکن کوئی کسر نکال نہ سکے گی،

زمین پر اپنی قدرت کے عجائبات آفرینیوں کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے،

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے، کہ اس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا، اور پھر زمین کی روئیدگی کا ایسا انتظام کر دیا کہ) آسمان سے پانی برسا کر

لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ ج
وسخر لکم الانہار ج وسخر لکم الشمس
والقمر دائبین ج وسخر لکم اللیل
والنہار ج وآتاکم من کل ما
سالتموہ ط وان تعدوا نعمت
اللہ لا تحصوہا ط ان الانسان
لظلوم کفار ط

(ابراہیم - ۳۲-۳۴)

اور اس کی تاثیر سے طرح طرح کے پھل تمھاری
غذا کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح
اس نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ سمندر کی
خوفناک موجوں) میں جہاز تمھارے زیر فرمان
رہتے ہیں، اور حکم الٰہی سے چلتے رہتے ہیں،"
اسی طرح دریا تمھاری کاربرآریوں کے لئے
مسخر کر دیے گئے ہیں، اور پھر اتنا ہی نہیں
بلکہ غور کرو تو) سورج اور چاند بھی تمھارے لئے
مسخر کر دیے گئے ہیں، اور رات اور دن
کا اختلاف بھی (تمھارے فائدہ ہی کے لئے)
مسخر ہے، غرض کہ تمھیں جو کچھ مطلوب تھا
وہ سب اس (کے فضل و رحمت) نے عطا کیا
اور اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو وہ
اتنی ہیں کہ تم ہرگز شمار نہ کر سکو گے، بلاشبہ
انسان بڑا ہی ناانصاف اور ناشکرا ہے،

ایک دوسرے مقام پر قدرت کی ان کارفرمائیوں کا منظر اس وجد آفرین پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے،

الم تر ان اللہ انزل من السماء
ماء ج فاخرجنا بہ ثمرات مختلفا الوانہا ط
ومن الجبال جدد بیض وحمر

کیا اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ ہی
نے آسمان سے پانی برسایا، اور اس سے
مختلف رنگتوں کے پھل پیدا کر دیئے،"

مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ — اسی طرح پہاڑ گوناگوں رنگتوں کے ہیں

(فاطر ۲) — کچھ سفید کچھ سرخ، اور کچھ کالے کلوٹے ہیں

چوں بہ خوبی گلستاں نگرد — بوسہ بر دیدۂ مے زند نظرم

عالم حیوانات کی نفع رسانی اور خوشنمائی کو اس طرح پیش کیا گیا ہے

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ۞ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ،

(النحل - ۵)

اور دیکھو یہ اسی کی کارسازی ہے کہ طرح طرح کے چارپائے پیدا کر دیئے جن میں تمہارے لئے بے شمار فوائد ہیں، از انجملہ یہ کہ اُن کی کھال اور اون میں جاڑے کا سامان ہے اور گوشت میں غذا کا، اور پھر دیکھو جب اُن کے غول شام کو چر کر واپس آتے ہیں اور جب چرا گاہ ہوں کے لئے نکلتے ہیں تو ان کے منظر میں کیسی خوشنمائی اور رونق

کائنات کی ہر چیز میں ایک جاذبیت اور دلربائی رکھ دی گئی ہے، ایک رینگنے والے حقیر کیڑے سے لیکر انسان تک، اس کی ہر چیز قدرت کی کرشمہ سازیوں اور حسن آرائیوں کی ایک نمایش گاہ ہے،

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ — اُس نے جو چیز بنائی حسن و زیبائی کے

(السجدہ ۱) — ساتھ بنائی،

انسان جزو بدہ موجودات اور خلاصۂ کائنات ہے، اس کی زیبا رُخی، اور خوبروئی کی تعریف قرآن اس طرح پیش کرتا ہے،

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ — اس نے آسمان و زمین حکمت و مصلحت کے

صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ط (التغابن - ۳) ساتھ پیدا کیا، اور اُس نے تمھاری صورتیں بنائیں، تو کیسی حسین و پسندیدہ بنائیں،

ایک دوسرے مقام پر اس کے کمال تناسب و اعتدال کا اظہار اس طرح پر کیا گیا ہے،

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین - ۴) ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا،

احسنِ تقویم میں تقویم ٹھیک تعدیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس تعدیل خلقت میں حسن ظاہر کے ساتھ سیرت و اخلاق کے تمام اوصاف بھی شامل ہیں، چنانچہ صحابہ و تابعین اور عام مفسرین نے اس سے حسن صورت و حسن سیرت، دونوں معنی مراد لئے ہیں، ایک حدیث میں انسان کی خلقت کا اس طرح بیان ہوا ہے، اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ بعض آثار میں علٰی صورۃ الرحمٰن بھی آیا ہے، یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، یہاں صورت کے معنی شکل کے نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی ذات کے مظہر اتم ہونے کے ہیں، چونکہ ذات وصفات ایزدی کا کامل ظہور انسان ہی کی ذات وصفات سے ہوا ہے اس لئے اس کو تمام دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے گویا اپنی ہی صورت پر پیدا کیا ہے،

ما ز فلک برتریم، وز ملک افزوں تریم
زیں دو چرا نگذریم، منزل ما کبریا ست

انسان بلحاظ حسنِ ظاہری اور بلحاظ حسنِ معنوی تمام مخلوقات میں سب پر فائق ہے، یہ اس ذات کا مظہر ہے جس کے اسمائے حسنیٰ میں ایک صفتِ جمیل بھی ہے، جب تمام عالم اس کے جمالِ جہاں آرا کی ایک ادنیٰ تجلی سے نگارخانۂ حسن وزیبائی بنا ہوا ہے، تو جو ہستی اس کی خلقت کا شہ کار ہو، اُس کے کمالِ حسن کا کیا ٹھکانا،

اسلامی تعلیمات کی حسن پسندی

جس طرح کائنات اپنے ہر پہلو میں حسین و جمیل واقع ہوئی ہے، ایسے ہی اسلام جو دین فطرت ہے اپنی تمام باتوں میں حسن کارا ور جمال آفرین واقع ہوا ہے عقائد، عبادات، اور معاملات کا کوئی جزئیہ ایسا نہیں جس میں بناؤ اور خوبی کا پہلو نمایاں نہ ہو، مگر حسن و جمال آخر ہے کیا چیز ؟ جب اس کا تجزیہ کیا جائے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تناسب و اعتدال اور موزونیت کا نام حسن و جمال ہے، یہی اعتدال و تناسب بناؤ اور خوبی کے ساتھ مظاہر کی اصل ہے جب کسی انسان کے وجود میں یہ اپنا رنگ دکھلاتا ہے، تو یہ کنعان کی صورت میں افق حسن پر طلوع کرتا ہے جب حسن الفاظ کے ساتھ حسن معانی سے ہم آمیز ہوتا ہے، تو قرآن و فرقان بن جاتا ہے، اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا (زمر ۲۳) اور جب کسی عمارت میں جلوہ گر ہوتا ہے، تو تاج محل کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اسلامی تعلیمات پر اگر غور کیا جائے، تو یہی تناسب و اعتدال ہر جگہ کار فرما نظر آئے گا، کوئی چیز حد اعتدال سے بڑھی ہوئی دکھائی نہ دے گی، موقع اور محل کے لحاظ سے جہاں جس چیز کی جتنی ضرورت ہو گی، وہ اتنی ہی موزون و مناسب مقدار میں موجود نظر آئے گی،

حنیفیۃ السمحۃ لیلھا کنھارھا،

ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک، اعتقاد و عمل میں سہل و آسان، اس کی راتیں بھی ایسی ہی منور ہیں جیسے کہ اس کے دن روشن و تابان ہیں،

اسلامی تعلیمات کی اصل اساس جس پر اس کا سارا نظام قائم ہے، وہ عقیدۂ توحید ہے، دائرۂ اسلام میں اس وقت تک کوئی داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ زبان سے کلمۂ طیبہ کا اقرار اور دل سے اس پر یقین نہ کرے، اس کلمہ کے الفاظ و معانی پر غور کیا جائے، وہ مختصر اور سیدھے سادے بول میں توحید کا عطر کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے، اگر ان کی شرح کی جائے تو اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے،

اور اگر ایجاز و اختصار کیا جائے تو ایک شوشہ بھی کم نہیں کیا جاسکتا، نفی و اثبات کی ساری وسعتوں کو چار چھوٹے لفظوں میں سمو کر تیغ لا سے جملہ معبودانِ باطل کا صفایا کر دیا گیا ہے، خواہ وہ انسانوں کے بھیس میں ہوں، یا دولت، جاہ اور خواہشات کے روپ میں حضرت امام جعفر صادق سے یہ قول منسوب کیا جاتا ہے،

مَا شغلک عن الحق فھو صنمک — جو چیز بھی تیری توجہ کو خدا کی طرف سے ہٹا دے وہی تیرا بُت ہے،

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ، (جاثیہ ۲۳) خواہشات کو خدا بنا لینا خود نصِ قرآن سے ثابت ہے،

عشوۂ ابلیس از تلبیس تست — در تو یک یک آرزو ابلیس تست

چون کنی یک آرزوے خود تمام — در تو صد ابلیس زاید والسلام

لا الٰہ کہنے میں تو نہایت آسان ہے اور ہر مسلمان رات اور دن میں سینکڑوں مرتبہ اس کی مالا جپتا ہے، بہت کم ایسے ہیں، جو اس کے مضمرات و تضمنات سے بخوبی واقف ہیں، کتنا بڑا دعویٰ ہے جو کیا جا رہا ہے، اس سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا کس قدر دشوار ہے، کیا اس سے تمام غیر الٰہی طاقتوں اور فرمانروائیوں کی نفی نہیں کی جارہی ہے؟ کتنے ہیں جو رات اور دن اس کا وِرد رکھنے پر بھی بندۂ اقتدار، بندۂ دینار، اور بندۂ ہوا و ہوس بنے ہوئے ہیں؟ ہر تعمیر سے قبل تخریب ضروری ہے، جب کوئی نیا نقش کسی لوح پہ کندہ کیا جائے گا، پہلا کام تمام سابقہ نقوش کو مٹا کر اُن کی آلودگیوں سے پاک کرنا ہوگا، جب تک پرانے نقش نہیں مٹیں گے نیا نقش پوری طرح ابھر نہیں سکتا، حریم اِلّا اللہ تک بار پانے کے لئے پہلے ما سوی اللہ کی نفی ضروری ہے،

تا بہ جاروب لا نروبی راہ — نرسی در سرائے الا اللہ

کیا دنیا کے مذاہب اس ایجاز و بلاغت کے ساتھ اس حسین کلمہ کا مثل پیش کر سکتے ہیں؟ الفاظ گنے چنے معانی و مطالب کا یہ عالم ہے کہ ایک سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے، ما قل و دل کا صحیح مصداق لا الٰہ الا اللہ

سے بہتر کوئی اور کوئی کلمہ نہیں ہو سکتا،

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں بات میں سادہ و آسان معانی میں دقیق

اس کی نزہت و تازگی کا یہ عالم ہے کہ ہر آن اس کی زیبائی و خوبروئی اپنے نئے نئے جلوے دکھلاتی ہے خواہ خوشحالی کا عیش و طرب ہو یا تباہ حالی کا درد و کرب، ہر دو صورتوں میں یہ کلمہ وجہ تسکین قلب ہے کہیں مقام شکر پہ فائز اور کہیں مقام صبر کی طمانیت بخشیوں سے بہرہ ور،

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

یہی کیفیت سورۂ فاتحہ کے حسن و جمال کی ہے، یہ وہ سورت ہے جس کے پڑھے بغیر نماز ہی نہیں ہو سکتی، لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب جس طرح کلمۂ طیبہ اساس الایمان ہے، اسی طرح یہ سورہ بھی اساس القرآن ہے، اس سورہ کے اور بھی مشہور نام سبع المثانی الکافیہ، الکنز اور ام القرآن ہیں جن سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس سورت اور قرآن کی بقیہ سورتوں میں اجمال و تفصیل کا سا تعلق ہے، تمام قرآن میں دینِ حق کے جو مقاصد شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، ان سب کو اس سورۃ میں کمال خوبی کے ساتھ سمیٹ لیا گیا ہے، سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں، کوئی بول چار پانچ لفظوں سے زیادہ نہیں، اور ہر آیت بلحاظ معانی و مطالب اپنی خوبروئی و دلنشینی میں ایک نگینہ ہے، جو اس انگشتری میں جڑ دیا گیا ہے، اس کا دعائیہ اسلوب بتلاتا ہے کہ ہر وہ صداقت شعار انسان جو خدا پرستی کی راہ میں گامزن ہوتا ہے، اس کی صدائے حال کیا ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طالب صادق کی زبان پر خدا پرستی کے فکر و وجدان کا یہ ایک سرجوش ہے، جو کوثر قلب سے ابل ابل کر آتشنۂ نطق کی صورت بہہ رہا ہے، کیا کسی زبان اور کسی مذہب میں اس سورت کی مثال مل سکتی ہے جس میں حمد و ثنا کی بلندیوں کو عجز و نیاز کی پستیوں کے ساتھ اس حسن و لطافت سے بہم آمیز کیا گیا ہو،

صفائے روئے عقیقِ یار را نازم کہ صلح داد بہم آفتاب و شبنم را

نماز جو راس الاعمال اور اساس العبادات ہے اس کے ارکان و آداب پر غور کرو، اس میں اعضاء

وجوارح کی ہر جنبش کس قدر واقعیت پسند اور حسن کا پہلو لئے ہوئے ہے، خالقِ کائنات کے دربار میں دن کے مختلف اوقات میں پانچ وقت حاضری کی پکار ہوتی ہے، جیسے ہی اس کی صدا ئے روح پرور سامعہ نواز ہوئی صفائی اور پاکیزگی موزوں زینت کے ساتھ صلوٰۃ و فلاح کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، ایک عظیم بارگاہ کا تصور کر اور وہاں اپنا معروضہ پیش کرنے کی کیفیت پر غور کرو جس انداز سے نماز ادا کی جاتی ہے، وہ اس صورتِ حال کا کس قدر دلآویز نقشہ پیش کرتی ہے قول و عمل دونوں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی اور اپنی عبدیت و بندگی کا اقرار و اظہار کیا جاتا ہے، اس کے سامنے نظریں نیچی کر کے دست بستہ کھڑے ہو کر، سر جھکا کر، زمین پر سر ٹیک کر، سامنے دو زانو بیٹھ کر اپنی عاجزی و درماندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی ظاہر کی جاتی ہے، زبان سے اس کی حمد و ثنا، اور تسبیح و تقدیس کی جاتی ہے، اس کی ربوبیت و کبریائی، اور رحم و کرم کا اقرار کیا جاتا ہے، اور اپنی عبدیت کا اقرار کر کے اس سے امداد و دستگیری، اور ہدایت و رہنمائی کی درخواست کی جاتی ہے، اور نماز کے مختلف حصوں میں اس کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے،

یہ ہے نماز کی ظاہری اور معنوی شکل جو اگر خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے تو معراج کا حکم رکھتی، اور آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کی سکینت بن جاتی ہے، یہی معنی ہیں "الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب" اور قُرَّۃُ عینی فی الصَّلوٰۃ کے،

اسیر لذتِ تن ماندۂ، وگرنہ ترا   چہ گنجہاست کہ در ملکِ جان میانیت

کیا عبادت کا اس سے بہتر اور حسین طریقہ اور بھی کوئی دوسرا ہو سکتا ہے، سادگی کا یہ عالم کہ کسی مقام کی تخصیص نہیں، ساری روے زمین مسجد کے حکم میں داخل اس کے لئے نہ کسی خاص سر و سامان کی ضرورت ہے، اور نہ کسی عظیم اہتمام کی، پانی نہ ملے تو مٹی سے پاکی حاصل کر لو، خواہ میدانِ جنگ ہو یا نازو نعم کے عشرت کدے، فرشِ خاک پر ہو، یا مسندِ کمخواب پر، حاضری دربار کا جہاں بھی وقت آجائے ہزاروں سجدے جبین نیاز میں تڑپتے دکھائی انفرادی و اجتماعی صورتوں میں اس کی صوری و معنوی خوش منظری اپنی مثال نہیں رکھتی جس کا دامن ان نعمتوں سے مالا مال ہو، کیا وہ تہی دست و خستہ حال کہلایا جا سکتا ہے؟

خدا کی یاد ہے طاقت ہماری — مصلّی ہے ہمارا تختِ شاہی
ہماری فوج ہے اخلاقِ حسنہ — ہمارا حسن ہے ترکِ مناہی
بلند اپنی نظر ہے فضلِ حق سے — کرے گی کیا کسی کی کم نگاہی

ہمیں اپنے مٹنے کا رنج نہیں لیکن قلق اس بات کا ہے کہ دوسروں کی نگاہوں میں ہم اپنے وجود سے اسلام کو بدنام کر رہے ہیں، جس سر نے صرف ایک ہی کے در پر جھک کر سربلندی حاصل کی ہو، اس کو دوسری چوکھٹوں پر جھکا کر ذلیل نہ کیا جائے، خواہ وہ کسی پیر و ولی کا آستانہ ہو یا کسی صاحبِ حکم و اختیار کی دہلیز، اگر اپنی عزتِ نفس کا خیال نہ ہو تو کم سے کم اس در کی تو لاج رکھنی ہے جس کی خاکِ آستان پر یہ سر جبہ سا ہو چکا ہے،

سرم تعظیم نیست لیکن، این سرِ کم بخت را — دوست می دارم کہ زیر پائے او بسیار بود

اب ہم ان تمام تعلیمات کو قرآن و حدیث سے انتخاب کرکے یکجا پیش کرتے ہیں، جن میں حسن کا پہلو نمایاں حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلام کی کوئی تعلیم حسن و خوبی کے عنصر سے خالی نہیں لیکن یہاں ہم صرف ان آیات و آثار پر اکتفا کریں گے جن میں خاص طور پر اس وصف کو ابھارا گیا ہے،

مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے لفظ احسان کی یہ تشریح کی ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اس جذبہ سے کیا جائے کہ کمال حسن و خوبی سے انجام پائے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ قرآن میں جہاں بھی محسنین کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنے اعمال میں حسن پسند واقع ہوئے ہیں یعنی جو ایمان و عمل کے ادنیٰ درجہ پر قناعت نہیں کرتے، بلکہ ان کی انجام دہی میں قلب و نظر کی پوری یکسوئی جسم و جان کی کامل ہم آہنگی اور خوبی و کمال کی ساری دلآویزی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، قرآن میں ایسے ہی لوگوں کو سراہا گیا ہے، اور ان کو ان کے عمل پر بشارت و خوشخبری سنائی گئی ہے، اور ذاتِ خداوندی سے نسبت و اضافت کا عز و اختصاص بخشا گیا ہے، جو تشریف و محبت پر دلالت کرتا ہے،

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ (زمر - ۱۸)

میرے ان بندوں کو خوشخبری پہنچا دو، جو کلام کو توجہ سے سنتے اور اس کی بہترین باتوں کی پیروی کرتے ہیں

غلام خویشتنم خواند لالہ رخسارے   سیاہ روئی من کرد عاقبت کارے

قرآن مجید میں خدا کی صفتوں کا تصور سراسر حُسن و خوبی قرار دیا گیا ہے،

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا، (الاعراف ۱۷۹)	اور دیکھو اللہ کے لئے حسن و خوبی کے نام ہیں اور تم اُن ہی ناموں سے اُسے پکارو،

ایک مقام پر اولادِ آدم کو یہ حکم دیا جاتا ہے،

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۝ (الاعراف ۳۱-۳۰)	اے اولادِ آدم عبادت کے ہر موقع پر اپنے جسم کی زیب و زینت (یعنی حسن ظاہری) سے آراستہ رہا کرو، نیز کھاؤ پیو، مگر حد سے تجاوز نہ کرو، خدا اُن کو پسند نہیں کرتا، جو حد سے گذر جانے والے ہیں، ان لوگوں سے کہو خدا کی زینتیں جو اُس نے اپنے بندوں کے برتنے کے لئے پیدا کی ہیں، اور کھانے پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں،

قرآن کی اس انقلاب انگیز آیت نے عبادت و بندگی کا نقشہ ہی بدل دیا، دوسرے مذاہب کے پیرو روحانی نجات و سعادت کو ترک دنیا میں ڈھونڈتے تھے، اس آیت نے دنیا کو سرتاسر دین بنا دیا، دنیا میں جو کام بھی خدا کے احکام کے مطابق کیا جائے گا، وہ عبادت ہی کے حکم میں ہے، اور روحانی سعادت و سربلندی اسی راہ سے حاصل ہو سکتی ہے، اسلام میں ان جوگیوں، سادھوؤں اور راہبوں کا کوئی مقام نہیں، جو جسم پر چیتھڑے لگائے اور خاک اور بھبوت ملے انسان کے بجائے دوسری مخلوق دکھائی دیتے ہیں، اس آیت میں زینت سے مقصود وہ تمام چیزیں ہیں جو زندگی کی فطری ضروریات سے ہوں، مثلاً اچھا [illegible] انشاء اللہ

تو تعجب جب ہم اس آیت کے ذیل میں بخاری کی اس حدیث پر نظر ڈالتے ہیں، جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

کُلْ مَاشِئْتَ وَالْبَسْ مَاشِئْتَ	جو تیرا جی چاہے کھا، جو تیرا جی چاہے پہن،
مَا اَخْطَأَتْكَ اثْنَتَانِ سَرَفٌ وَ	(سب کچھ جائز ہے) جب تک دو باتیں یعنی
مَخِيلَةٌ،	اسراف اور تکبر تیرے مزاج میں راہ نہ پائے

تو کھلوا اوا شرہوا میں کس قدر وسعت پیدا ہو جاتی ہے،

حسن و جمال کا ایک ضروری عنصر پاکیزگی و نظافت بھی ہے حضورؐ کا ارشاد ہے،

بُنِیَ الاسلامُ علی النَّظافَة	اسلام کی بنا پاکیزگی پر ہے،

موطا میں عطاء بن یسار نے حضورؐ سے روایت کی ہے کہ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آیا جس کے سر اور داڑھی کے بال پریشان تھے، آپ نے دستِ مبارک سے سر اور داڑھی کے بالوں کی اصلاح و درستگی کے لئے اشارہ فرمایا، وہ اُن کو درست کر کے حاضرِ خدمت ہوا، تو آپ نے ارشاد فرمایا، کیا یہ حالت اس ہئیت سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں کا ایک شخص آتا ہے جس کے بالوں کی ژولیدگی ایسی ہوتی ہو گویا وہ بدروئی میں ایک بھوت کے مثل ہو،

ترمذی اور نسائی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ انصار کے پاس ملاقات کی غرض سے تشریف لے گئے، ایک شخص کے سر کے بال ژولیدہ اور پراگندہ تھے، اس کو دیکھ کر ارشاد ہوا کیا اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس سے اپنے بالوں کو سنوار سکے، اسی موقع پر ایک دوسرا شخص میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے دکھائی دیا، اس کو دیکھ کر آپ نے فرمایا کیا یہ ایسی کوئی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے کپڑوں کو دھو کر صاف کر سکے،

نسائی میں ابوالاحوص اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوا کہ میرے جسم پر ادنیٰ اور میلے کچیلے کپڑے تھے حضورؐ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا تمھارے پاس کچھ مال ہے، میں نے عرض کیا جی ہاں، فرمایا کس قسم کا مال ہے، میں نے اس کی تفصیل بتلائی کہ خدا نے مجھے اونٹ گھوڑے،

گائے، بکری، غلام سب کچھ دے رکھا ہے، ارشاد ہوا جب خدا نے تم کو یہ سب کچھ عطا فرمایا ہے، تو چاہیئے کہ اس کی نعمتوں کا اثر تم پر ظاہر ہو،

علامہ بدرالدین عینی نے بخاری کی شرح مین فاروقِ اعظم کا ایک اثر پیش کیا ہے کہ انھون نے دیکھا کہ ایک شخص نے اپنی ڈاڑھی بے ترتیب چھوڑ رکھی ہے، حضرت فاروقؓ نے اُس کی داڑھی پکڑ کر اپنی طرف کھینچی اور قینچی منگا کر ایک شخص کو حکم دیا کہ جتنا حصہ مقدار قبضہ سے زائد ہے، سے تراش دیا جائے، اور اس عمل کی یہ وضاحت فرمائی کہ تم مین سے بعض لوگ اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہین گویا وہ درندون مین سے ایک درندہ ہین، کیا قلب ماہیت ہے کہ آج کل ان ہی بدہیئتون کو تقدس اور پاکبازی کا وصف قرار دیا جا رہا ہے،

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا   کہ غلامون مین بدل جاتا ہے قومون کا ضمیر

ابوداؤد مین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عتبہ کی بیٹی، ابوسفیان کی بیوی، اور معاویہ کی ماں ہندہ نے عرض کیا یا نبی اللہ مجھ سے بیعت لیجئے، آپ نے فرمایا تاوقتیکہ تو اپنے دونون ہاتھ متغیر نہ کرے گی، (یعنی ہاتون کو مہندی نہ لگائے گی) مین تجھ سے بیعت نہ لون گا، تیری دونون ہتھیلیان گویا درندون کی ہتھیلیان ہین،

غیر قومون کے ساتھ تعلقات اور اُن کی ہدایت وارشاد مین بھی قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ ہر معاملہ مین احسان اور حسن وخوبی کو مدنظر رکھا جائے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے،

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ، (عنکبوت - ۴)	اور (مسلمانو!) اہلِ کتاب سے جھگڑا نہ کیا کرو، مگر صرف اس طریقہ سے کہ عمدہ اور شایستہ طریقہ پر ہو،
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ	خوبی اور برائی باہم برابر نہین ہوسکتی، برائی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو کہ وہ (دیکھنے والون کی نظر مین) بہت ہی پسندیدہ ہو،

ضمیمۂ

(حٰمٓ السجدہ ۳۴)	(اگر ایسا کروگے) تو (تم دیکھو گے کہ) تم میں اور کسی شخص میں عداوت ہو تو اب ایک دم گویا وہ تمہارا دلسوز دوست ہے“
اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ط (المؤمنون ۹۵)	اے پیغمبر برائی کو برائی سے نہیں بلکہ ایسے طرزِ عمل کے ذریعہ دور کرو، جو بہتر طرزِ عمل ہو ہم ان باتوں سے بے خبر نہیں، جو یہ تیری نسبت کہتے رہتے ہیں“
اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط (النحل ۱۲۵)	اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو بلاؤ، اس طرح کہ حکمت کی باتیں بیان کرو، اور اچھے طریقے پر پند ونصیحت کرو، اور مخالفوں سے بحث ونزاع کرو، تو (وہ بھی) ایسے طریقہ پر کہ حسن وخوبی کا طریقہ ہو“
وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط (بنی اسرائیل ۵۳)	اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو (یعنی اُن سے جو دعوتِ حق پر ایمان لائے ہیں مخالفوں سے گفتگو کرتے ہوئے) جو بات کہو، ایسی کہو کہ خوبی کی بات ہو“
وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا ط (المزمل ۱۰)	اور (دعوتِ حق کے مخالفوں کے ساتھ) ہجر جمیل اختیار کرو، (یعنی ایسی کنارہ کشی اور علٰحدگی جس میں کسی قسم کا شائبۂ انتقام

اس حسن اخلاق کا کیا ٹھکانا ہو کہ دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ برتاؤ میں بھی خوبی اور بھلائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، انسان جذبۂ انتقام میں کیا کچھ نہیں کر گذرتا، اور پست انسان کا یہ اصول ہو کہ محبت اور جنگ میں ہر چیز روا ہے، مگر جرأت ایسے موقعوں پر بھی اعتدال و توازن کے حسن کو ترک نہیں کرتی، وہ خوبی و کمال کے کس بلند مقام پر فائز ہوگی۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمنان ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود این مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

مصائب و شدائد کی درد ناکیوں اور رنج و الم کی جانکاہیوں میں بھی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس کو پسندیدہ طریقہ پر انگیز کیا جائے، قرآن مجید نے حضرت یوسفؑ کے قصہ میں حضرت یعقوبؑ کی زبان سے اس تعلیم کو پیش کیا ہے، جب برادران یوسف نے حضرت یوسفؑ کو کنوئیں میں جھونک کر یہ اطلاع دی کہ وہ بھیڑیئے کا شکار ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ کی زبان سے بے اختیار یہ کلمہ نکلا۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ

(یوسف - ۱۸)

(باپ نے اُسے دیکھتے ہی کہا) نہیں (میں اسے نہیں مان سکتا) یہ تو ایک بات ہے جو تمہارے نفس نے گڑھ کر تمہیں خوشنما دکھا دی ہے (اور تم سمجھتے ہو چل جائے گی) خیر میرے لئے اب صبر کرنا ہے (اور) صبر بھی ایسا کہ پسندیدہ (ہو)، اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگنی ہے۔

پھر یہی فقرے بنیامین کے مصر میں روک لئے جانے کے وقت بھی حضرت یعقوبؑ کی زبان پر جاری ہوئے تھے، صبر کے معنی شدائد جھیلنے کے ہیں، جمیل کے معنی پسندیدہ بات، پس صبر جمیل وہ صبر ہوا جو بڑے ہی پسندیدہ طریقہ پر اختیار کیا جائے، یعنی زبان پر نہ شدائد کا شکوہ ہو اور نہ درد و الم کی شکایت ہو، فَاصْبِرْ صَبْرًا

جَمِیلاً (المعارج-۵)

لب پر آزاہ و درون پرز خیالِ رُخِ دوست
در نفس دوزخ و در سینہ گلستان دارم

مسلم میں حضورؐ کا ارشاد ہے،

اِنَّ اللہَ جَمِیلٌ وَیُحِبُّ الجمال — بلاشبہ خالق کائنات صاحب جمال ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے!

ترمذی میں حدیث معراج میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میں نے اپنے پروردگار کو شب معراج میں ایک جوان سال حسین مرد کی صورت میں، یا ایک سبزہ آغاز مرغولہ مو لڑکے کی صورت میں دیکھا یعنی حسن و جمال کے لباس میں،

اسلام میں حسن پسندی اور جمال آرائی کی اہمیت اور اس کے دائرہ کی وسعت کا ثبوت صحیح مسلم کی اس مشہور حدیث سے ملتا ہے،

عَنْ شَدَّادِ بنِ اوسٍ عَنْ رسولِ اللہِ صلی اللہُ علیہ وسلم قَالَ اِنَّ اللہَ کَتَبَ الاِحسانَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا القِتْلَۃَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذَّبْحَ وَلْیُحِدَّ اَحَدُکُمْ شَفْرَتَہٗ وَلْیُرِحْ ذَبِیحَتَہٗ،

(الحدیث مسلم)

شداد بن اوس سے روایت ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک اللہ نے حسن و خوبی کو ہر چیز پر واجب کر دیا ہے، تو جب تم کسی کو قتل کرنے لگو، تو اسے بہتر اور عمدہ طریق کے ساتھ قتل کرو، اور جب جانور کو ذبح کرو تو پسندیدہ طریق پر ذبح کرو، یعنی تم میں سے ہر ایک شخص کو اپنی چھری تیز کر لینی اور ذبیحہ کو راحت پہنچانی چاہیے"

اِنَّ اللہَ کَتَبَ الاِحْسَانَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ کے عموم پر غور کرو، ہر کام میں کس شدت کے ساتھ اس کا

وجوب پایا جاتا ہے، اس میں حسن کاری کو بطور ایک سنۃ اللہ کے پیش کیا گیا ہے،

یہاں تک کہ مردے کے ساتھ بھی اس پسندیدہ طریق عمل کی ہدایت کی گئی ہے، ترمذی کی حدیث ہے:

اذا کفن احدکم اخاہ فلیحسن کفنہ	جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن پہنائے تو چاہئے کہ اچھا کفن پہنائے،

کنز العمال میں ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کسی قبر کے قریب سے گذر رہے تھے، اتفاقاً اس میں کچھ رخنہ سا رہ گیا تھا، آپ کے خادم خاص حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ آپ اس رخنہ کو دیکھ نہ سکے، اور حکم دیا کہ اس کو بند کر دیا جائے ایک صحابی نے جنھیں اس وقت شرف معیت حاصل تھا، عرض کیا کہ اس بیچارے مردے کو اس کا کیا نفع پہنچ سکتا ہے، ارشاد ہوا بے شک اس سے اس کو نہ ضرر پہنچتا ہے اور نہ نفع مگر اس سے زندہ کی آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے، کیا ٹھکانا ہے رحمتِ عالمؐ کے لطافتِ مزاج کا، کہ قبور کی شکستہ حالی تک طبع لطیف پر شاق تھی، اور زندوں کی خاطر انھیں بھی سنوارا جاتا تھا،

بہر زمین کہ جلوہ کنی آسمان کنی	می زیبدت کہ ناز بہ کون و مکان کنی

ناموں میں بھی حضورؐ کو وہ نام پسندیدہ ہوتے تھے، جن میں حسن و خوبی پائی جاتی ہو، حضرت عمرؓ کی ایک بیوی کا نام عاصیہ تھا جس کے معنی گنہگار کے ہیں، آپ نے اس کو بدل کر جمیلہ رکھا، حضرت امام حسنؓ کی ولادت کے بعد آپ تشریف لائے، اور حضرت علیؓ سے نام دریافت فرمایا، حضرت علیؓ نے حرب بتلایا، فرمایا حرب نہیں حسن نام رکھو، یہی صورت حضرت امام حسینؓ کی ولادت کے وقت بھی پیش آئی، اور بجائے حرب کے حسین نام رکھا گیا ابو داود میں حضرت ابو دردا سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:-

تدعون یوم القیامۃ باسمائکم واسماء ابائکم فاحسنوا اسماءکم، (الحدیث، ابوداؤد)	لوگو! تم قیامت کے دن اپنے اور اپنے آباء کے نام سے پکارے جاؤ گے، اس لئے تم کو چاہئے کہ اچھے نام رکھا کرو،

خود ذاتِ اقدس کو قرآن پاک نمونہ کمال اور حسن و خوبی قرار دیتا ہے، لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۲۱) رسول کی زندگی میں تمہارے لئے اتباع و پیروی کا ایک اعلیٰ اور پسندیدہ نمونہ ہے بجز اسوۂ حسنہ کے کوئی دوسری مثال ہمارے لئے قابلِ تقلید نہیں،

نہ رُوئے تو گلہائے باغ را چہ کنم
چو آفتاب برآمد چراغ را چہ کنم

تلاوتِ قرآن کے وقت بھی حتی الامکان اپنے لحن و صوت کی تحسین کا حکم دیا گیا ہے تاکہ قاری و سامع دونوں کو روحانی فرحت و تازگی حاصل ہو اگر فصیح سے فصیح کتاب بھونڈے طریقہ پر پڑھی جائے تو اس سے سننے والوں کو توحش ہوگا، اور اس کا حسن و جمال پیدا نہ ہو سکے گا، اسی لئے زینوا اصواتکم بالقرآن کی تاکید کی گئی ہے یعنی اپنی آوازوں کو قرآن کی تلاوت سے زینت دو، سعدی کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب انھوں نے ایک شخص کو مکروہ آواز میں قرآن پڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا،

گر تو قرآن بدین نمط خوانی　　　ببری رونقِ مسلمانی

سلام کے جواب میں بھی قرآن نے حسنِ ادا کو ملحوظ رکھا ہے، اور اس بارہ میں یہ حکم دیا ہے،

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا، (النساء - ۸۶)	جب تم کو سلام کیا جائے تو تم اس کے جواب میں اس سے بہتر اور احسن طریقہ پر سلام کرو، یا کم از کم ویسا ہی جواب ادا کرو،

صحت و تندرستی اور جسمانی حسن تک کو اچھی حالت میں قائم رکھنے کی اسلام نے تاکید کی ہے، حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ایک طاقت ور مسلمان ایک کمزور مسلمان سے بہتر ہے صحت و توانائی کے اظہار میں کوئی برائی نہیں، مخالفین کے سامنے اپنی کسی کمزوری کو ظاہر نہ کیا جائے، ہجرت مدینہ کے بعد جب پہلی دفعہ مسلمان حج کے لئے گئے، تو مدینہ کے موسم بخار نے ان کو کمزور کر دیا تھا، اس لئے ان سے طواف کعبہ کے وقت اضمحلال کے آثار ظاہر ہوتے تھے، اس کمزوری کو

دیکھ کر مخالف طعنہ زن ہوئے، تو حضورؐ نے طواف میں رمل کا حکم دیا جس پر اب تک عمل کیا جاتا ہے۔ خضاب کی اجازت میں بھی یہی مصلحت ہو کہ دشمنوں پر جہاد میں کے ضعف و پیری کے آثار ظاہر ہونے نہ پائیں، اور ہر شخص جوان و توانا نظر آئے ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا بہتر چیز جس سے بڑھاپا بدل دیا جاتا ہے، مہندی اور کتم ہے،

جسمانی طاقت و توانائی اور ظاہری حسن و خوبی کے بارہ میں ہم یہاں امام غزالی کی میزان عمل کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے اس بیان کی مزید وضاحت ہوتی ہے،

"اگر تم پوچھو کہ فضائل جسمی کی کیا حاجت ہے، تو ہم کہیں گے کہ صحت و قوت اور طول عمر کی بے شک ضرورت ہے بعض لوگ خوبروئی کو حقیر سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں فضائل جسمی کے لیے یہی کافی ہے کہ جسم امراض سے محفوظ و سلامت ہو، تاکہ فضائل کے حصول میں رکاوٹ نہ پیدا ہو، لیکن اپنی عمر کی قسم ہے کہ خوبصورتی کی واقعی تھوڑی سی بہت ضرورت ہے، اور یہ بھی ایک سعادت اور خیر ہے، دنیوی لحاظ سے تو ہر شخص اس کو جانتا ہے اور اخروی لحاظ سے دو طریق پر اول یہ کہ بدصورتی مذموم شے ہے، اور طبائع اس سے نفرت کرتے ہیں، حسن ایک طاقت ہے جس سے حسین کی ضروریات جلد پوری کی جاتی ہیں، اس لحاظ سے خوبصورتی بھی مال و دولت کی طرح کامیابی کا ایک ذریعہ ہے، اور جو شے دنیوی حاجتوں کے پورا کرنے میں مددگار ہوگی، وہ آخرت میں بھی معاون ہوگی، کیونکہ آخرت دنیوی اسباب ہی کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے، دوسرے حسن عام طور پر خوبی روح پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ روح کی نورانیت جب کامل ہو جاتی ہے، تو اس کا پرتو بدن پر پڑنا شروع ہوتا ہے، انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے، اسی لئے اصحاب فراست قیافہ سے اخلاق باطن پر استدلال کیا کرتے ہیں، آنکھ اور چہرہ باطن کا آئینہ ہیں، کیونکہ ان میں غصہ اور مسرت کا اثر ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ چہرہ کی حالت دل کے خیالات کا عنوان ہے، اگر زمین کے اندر کوئی شے ہے تو یقین جانو کہ سطح پر اس سے بہتر ہوگی"

ع از کوزہ ہماں بروں تراود کہ درست

ایک دفعہ مامون فوج بھرتی کر رہا تھا کہ ایک کہہ شخص اُس کے سامنے لایا گیا، مامون نے اُس

سے گفتگو کرنی چاہی، تو وہ گونگا نکلا، اس نے اس کا نام کاٹ دیا، اور کہا روح کی بُرائی جب

جسم پر ظاہر ہو جائے، تو یہ باعثِ ذلت ہے، اور یہاں نہ اس کا ظاہر ہے، اور نہ باطن، اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

اطلبوا الحاجۃ عند حسان الوجوہ[1]، خوش رو لوگوں سے اپنی حاجت طلب کیا کرو،

پھر فرمایا:

اذا بعثتم رسولاً فاطلبوا احسن الوجہ وحسن الاسم، جب تم کہیں قاصد روانہ کرو تو ایسے شخص کو انتخاب کرو، جو ذی وجاہت ہو اور جس کا نام بھی عمدہ ہو،

فقہا کا قول ہے کہ جب نمازی درجات و مراتب کے لحاظ سے مساوی ہوں تو امامت کے لئے سب سے زیادہ

خوبصورت شخص اولیٰ ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی جسمانی خوبی کو احسان بیان کرتے ہوئے فرمایا وزادہ

بسطۃ فی العلم والجسم، طالوت علم وجسامت کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر تھے جن لڑکیوں نے

حضرت موسیٰ کو ملازم رکھنے کے لئے اپنے باپ سے سفارش کی تھی، انھوں نے ان کے اوصاف میں جسمانی

طاقت و توانائی ہی کو پیش کیا تھا"

"خوبروئی سے ہماری مراد وہ جمال حسن نہیں جو محرک شہوت ہے، یہ تو نسائیت ہے، بلکہ

مقصد یہ ہے کہ بلند و بالا قد ہو ذی وجاہت ہو، اعضا متناسب ہوں اور چہرہ بارعب و دلآویز

ہو، جو نگاہ پر کسی طرح گراں نہ گذرے"

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است این نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم

یہی وجہ ہے کہ جتنے انبیاء نبوت سے سرفراز کئے گئے، وہ ظاہری حسن و جمال سے بھی آراستہ تھے جس کا اتمام

---

[1] معارف: یہ حدیث صحیح نہیں ہے،

ہ کمال حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ہوا،

نازِ او صد نور ابراہیمؑ سوخت   تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

حضرت ابوہریرہؓ کا یہ بیان ہے :

ما رأیتُ شیئاً احسنَ من رسول   میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،   کوئی خوبرو حسین تر شے نہیں دیکھی،

حضرت جابرؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تلوار کی طرح چمکتا تھا ؟ بولے نہیں ماہ و خورشید کی طرح، انہی کی دوسری روایت یہ ہے کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا، اور بدر کامل پوری طرح ضوفشاں تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا تھا اور کبھی چاند کو، تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے، حضورؐ نے خود اپنی بابت یہ ارشاد فرمایا ہے، انا املح واخی یوسف اصبح، ملاحت و صباحت میں جو فرق ہے، وہ اربابِ نظر اصحابِ ذوق سے پوشیدہ نہیں،

خوبان بسے بچشم درآیند و بگذرند   آن شوخ دیگر اند کہ در سینہ جا کنند

کائنات جس طرح ایک نمایش گاہ حق ہے، اور خالقِ کائنات جس طرح احسن الخالقین ہے، اسی طرح انسان بحیثیت خلیفۃ اللہ کے حسن آفرین و جمال آرا واقع ہوا ہے، اور وہ موجودات میں اپنے حسن کارانہ تصرفات پر نازاں ہے، اور خلق و تصرف کا باہمی موازنہ اس طرح پر کرتا ہے،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم

من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

مگر وہ یہ نہیں سمجھتا کہ بندہ کی خوبی جو کچھ بھی ہے وہ تمام کی تمام اس کے پیدا کرنے والے ہی کی طرف

راجح ہوتی ہے،

"کہ بندہ ، خوبی او خوبی خداوندا ست"

اسلام جس طرح بندۂ مومن کو ایک پیکر حسن و خوبی بنا نا چاہتا ہے، ویسے ہی اس کی تعلیم یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے کو سنوارے، بلکہ اپنے پورے ماحول اور گرد و پیش کو جنت ارضی بنا دے، چنانچہ احادیث میں زمین کی آبادکاری پر بڑا زور دیا گیا ہے، اور مختلف پیرایوں میں اس کام کی ترغیب دلائی گئی ہے، بخاری کی ایک حدیث ہے کہ حضور کا ارشاد ہے جو مسلمان درخت بوتا یا کھیتی کرتا ہے، اور اس سے انسان جانور اور پرند وغیرہ اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں، وہ اس کے حق میں صدقہ بن جاتا ہے یعنی اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے،

علامہ ابوبکر جصاص حنفی نے آیت هُوَ اَنْشَاَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْهَا (هود ۶۱) کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے، یہ آیت بتاتی ہے کہ کھیتی باغبانی اور تعمیر کے ذریعہ زمین کو آباد کرنا واجب ہے، اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے جو کنز العمال میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اگر قیامت قائم ہو جائے، اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو تو اگر اس کے بس میں ہو جب تک اس کو بونے اس وقت تک کھڑا نہ ہو، تو چاہئے کہ اس پودے کو بو دے،

چون دم بدم عنایت توفیق ممکن است   در تنگنائے نزع نہ کوشد کسے چرا

جو مسلمان کسی افتادہ زمین کو آباد کرتا ہے تو اسلام اس کو اسی کی ملک قرار دیتا ہے، اور اگر کوئی مالک زمین تین سال تک اپنی زمین کو بیکار ڈالے رکھے، تو اس کی ملکیت کا حق ساقط ہو جاتا ہے، اور حکومت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے، کہ وہ اس سے چھین کر زمین ان لوگوں کے حوالے کر دے جو آبادکاری کی صلاحیت رکھتے ہوں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ کے ساتھ یہی عمل کیا، انھیں کچھ زمین حضورؐ نے عطا کی تھی جس کو انھوں نے یونہی ڈالے رکھا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے یہ زمین اُن سے لیکر مسلمانوں میں تقسیم فرمادی، (کتاب الخراج)

مسلمانوں نے ان تعلیمات پر جتنا عمل کیا، اور اُس کے جو نتائج نکلے، وہ صفحات تاریخ پر ثبت ہیں، "

جن ممالک پر وہ حکمران رہے ، ان کے تہذیب و تمدن کے آثار زبانِ حال سے اپنی عظمتِ رفتہ کی داستان سنا رہے ہیں، انکے عہدِ حکومت میں جو رونق ان علاقوں کو حاصل ہوئی تاریخ اسے پھر دہرا نہ سکی ، قرطبہ و غرناطہ بغداد و دمشق ، سمرقند و بخارا اور دہلی و آگرہ کے محلات و قصور اب تک فردوسِ نظر بنے ہوئے ہیں ، اندلس کو چمنستان کی صورت میں کس نے بدل دیا تھا ، بغداد کو الف لیلائی شان کس نے عطا کی ، اور ہندوستان کو جنت نشان کس نے بنایا ، مسلمانوں کا قدم جس سرزمین میں بھی پہنچا ، اس کو انھوں نے گل و گلزار بنا دیا ،

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے

انسان جب تَخَلَّقُوْا بِاَخْلاقِ اللّٰہ کی قبا اپنے قامت پر راست کر لیتا ہے ، تو وہ بھی جلیل و جمیل بن جاتا ہے ، قرآن مجید میں صفاتِ الٰہی کا جا بجا ذکر آیا ہے ، جو تعداد میں ننانوے ہیں ، اُن کو قرآن اسمائے حُسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے ، اور ان میں ہر صفت خوبی و کمال کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتی ہے ، جب بندہ احکامِ الٰہی کی پیروی کے ذریعہ جسے حدیث میں قربِ نوافل سے تعبیر کیا گیا ، ان صفات کو اپنے میں سمو لیتا ہے ، تو خدا کہتا ہے کہ . . . . . . میں اُس کا کان آنکھ ہاتھ اور پیر بن جاتا ہوں ، جن سے وہ سنتا ، دیکھتا ، پکڑتا اور چلتا ہے ، اور جس طرح خالقِ کائنات احسن الخالقین ہے اسی طرح بندۂ مومن کا ہر عمل حسن و خوبی کا نمونہ ہوتا ہے ، مردِ مومن کی عظمت و شان کا نقشہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں بڑی خوبی سے دکھلایا ہے ،

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں ، کارکشا و کارساز
خاکی و نوری نہاد ، بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو ، پاک دل و پاکباز

عقل کی منزل ہے وہ ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں ، گرمیٔ محفل ہے وہ

چونکہ یہ معمار حرم ہے، اس لئے تعمیر جہان کا کام اس کے تفویض کیا گیا ہے، اگر یہ اپنی مفاد پرستی اور تن آسانی کے سبب اس فرض منصبی کو بھول جائے گا، تو خدا کسی دوسری قوم کو یہ مقام عطا کر دے گا، جس کا انتباہ خود قرآن میں موجود ہے؛

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ، (المائدہ - ۵۴)	مسلمانو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائیگا (تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دین حق کو کچھ نقصان پہنچے گا) قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ (سچے مومنوں) کا پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا، اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے،

اس لئے اب یہ مسلمانوں کے اختیار میں ہے کہ وہ دوسروں کی غلامی قبول کریں، یا اپنے فرض کو ادا کر کے خود دنیا کی فرمانروائی حاصل کریں،

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن، یا بندۂ زمانہ

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (یوسف، ۳۹)	اے یاران مجلس! (تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ) جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؛

سیر الصحابہ جلد ہفتم

یہ جلد سیر الصحابہ کی آخری کڑی ہے، اس جلد پر یہ مقدس سلسلہ تمام ہو جاتا ہے، اس میں ۲۵۰ صحابہ کے حالات ہیں جو فتح مکہ کے بعد مشرف با سلام ہوئے، یا اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، اگر شرف ہجرت سے محروم رہے، یا سنہ ہجر کے کچھ قبل یا بعد پیدا ہوئے، اور عہد رسالت میں کم سن تھے، قیمت ہے (جدید اڈیشن) "منیجر"

شیخ سماء الدین دہلوی

از

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی، ڈی لٹ

(۲)

وفات اخبار الاخیار میں ہے کہ آخر وقت میں شیخ کی بصارت جاتی رہی تھی مگر خدا نے بغیر دوا کے ان کی آنکھیں روشن کر دیں، شیخ نے طویل عمر پائی، ۹۰۱ھ میں تقریباً سو سال کی عمر میں انتقال فرمایا، انتقال سے پہلے وہ اپنے بڑے لڑکے شیخ عبد اللہ کو دیکھنا چاہتے تھے، جو ایک مدت سے صحرانشین ہو گئے تھے، شیخ جمالی ان کی تلاش میں جانے کو تیار تھے، اور شیخ سماء الدین نے بیٹے کے نام ایک اشتیاق نامہ بھی لکھا تھا جس میں یہ شعر درج تھا،

طاقت صبر مرا نیست برین ہجر طویل

قدم رنجہ بہ بر سر این پیر علیل

مگر دوسرے دن چاشت کے وقت شیخ جمالی کو طلب کر کے فرمایا، معلوم نہیں شیخ عبد اللہ کا دیدار نصیب ہوتا ہے یا نہیں، میری خواہش یہ ہے کہ تم میرے پاس سے الگ نہ ہو، ورنہ ایسا نہ ہو کہ میرے جنازہ میں شریک نہ ہو سکو" اس کے بعد تقریباً ایک ہفتہ استغراق کا عالم طاری رہا، مگر ہر نماز کے لئے تازہ وضو کر کے نماز پڑھتے، پھر محویت طاری ہو جاتی، یہاں تک کہ سترہویں جمادی الاول کو بعد نماز عشاء آنکھ کھولی اور تبسم فرمایا، رحلت کی، شیخ جمالی نے یہ قطعہ نظم کیا،

[illegible]

مرشد انس و ملک شاہ سماء الدین چو رفت — اے جمالی بر سر عرش آمدہ گام او
ہشت خلد آمد بنام او اگر پرسد کسے — سال تاریخش بگو ہشت آمدہ بر نام او

"ہشت" کے ۵۰۰ ہوتے ہیں، اس میں "سماء الدین" کے ۴۰۱ شامل کرنے سے ۹۰۱ھ ہجری ہوجائیگا،

مولف خزینۃ الاصفیا نے یہ قطعہ لکھا ہے[1]:

سماء الدین ولی سہروردی — کہ در ارض و سماحکمش روان شد
چو از حکم قضا رخت سفر بست — قضا تاریخ ترحیلش بیان شد
دگر مہتاب جنت گشت روشن — ہم عارف متقی سالش عیان شد

ان کی تجہیز و تکفین کے وقت دہلی کے اکابر مشائخ و علما[2] موجود تھے، شیخ جمالی نے حضرت حاجی عبد الوہاب، مولانا عبد اللہ الہ داد، شیخ نصیر الدین اور حضرت زبدۃ الانام کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے، ان میں اول الذکر سید جلال بخاری کی اولاد میں تھے، جو حضرت مخدوم جہانیاں کے جد اور سلسلۂ سہروردیہ کے ایک ممتاز رکن تھے۔ حضرت حاجی ملتان سے دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوگئے، مولانا عبد اللہ الہ داد شیخ جمالی کے استاد اور عہد سکندری کے سب سے ممتاز عالم تھے، بہلول لودی کے زمانے میں ملتان سے دہلی آگئے تھے، تیسرے شیخ سماء الدین کے چھوٹے صاحبزادے تھے، اور آخری کی شخصیت کا تعین نہیں ہوسکا ہے،

شیخ سماء الدین کا مقبرہ حوض شمسی پر ہے[3]، ان کے پہلو میں ان کے خاندان کے بعض دوسرے افراد بھی مدفون ہیں، سیر العارفین[4] سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار نے ان کے دفن کا نشان مقرر کیا تھا، شیخ سماء الدین کے خلیفہ شیخ عبد الغفور کو حضرت جمال ہانسوی[5] نے بشارت دی کہ ان کے پیرو مرشد کو حضرت چہار یار رسولؐ کے ساتھ جگہ ملی ہے، شیخ جمالی نے شیخ کے مرثیہ میں اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے[6]:

---

[1] ج ۲ ص ۶، [2] سیر العارفین ورق ۱۲۰ ب [3] ایضاً و اخبار الاخیار ص ۲۱۱ [4] ایضاً [5] ایضاً

نجمسم ترا شمرو بنی دہ چہار یار ... از جان و دل قبول نمودند ہر چہار

ستور شیخ سماء الدین اکابر اولیاء میں تھے، ان کی حیات کا ہر نفس عبادت و طلب رضائے الٰہی میں صرف ہوتا تھا، ان کا باقاعدہ دستور تھا جس میں تبدیلی مشکل سے ہوتی، سیر العارفین میں ہے کہ آدھی رات کو تجدید وضو کرکے نماز شروع کرتے اور تقریباً ایک پہر نوافل میں گزارتے، نصف پہر ورد میں صرف ہوتا، پھر صبح صادق تک مراقبہ میں رہتے، اس کے بعد فجر کی سنت موکدہ ادا کرتے اور نماز فجر باجماعت پڑھتے، نماز چاشت کے بعد کچھ مراقبہ کرتے اور پھر درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے، تفسیر حدیث، اور اصول فقہ کا خاص طور پر درس دیتے جس میں کبھی کبھی علما تک شریک ہوتے، اس کے بعد مریدوں کی تربیت کی طرف متوجہ ہوتے، اور ہر مرید کی اصلاح فرماتے، عصر تک یہ کام جاری رہتا، پھر مغرب تک استغراق کا عالم رہتا، نماز مغرب و اوابین ادا کرکے مراقبہ میں چلے جاتے، نماز عشاء سے فارغ ہوکر مسجد سے گھر آتے، کھانا کھاتے، کچھ دیر استراحت فرماتے مگر ذکر جاری رہتا، اس طرح صبح سے شام تک سوائے عبادت کے دوسرا شغل ہی نہ رہتا تھا،

شیخ سماء الدین اخلاق نبوی کا پیکر تھے، ہر مرید کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے، اس میں امیر غریب اور اپنے پرائے میں فرق نہ کرتے، فاسق سے فاسق پر ایک نظر ڈالتے، تو راہ راست پر آجاتا، ان کی نظر میں عجب تاثیر تھی، ہر وقت نہایت ہی شفقت و ملائمت فرماتے، ایک بار بہلول لودی کے فرمان نویس کا لڑکا شیخ محمد جو فسق و فجور میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، شیخ جمالی جو اس سے بے حد نفرت رکھتے تھے، اس وقت موجود تھے، انھوں نے اسے مجلس سے نکالنا چاہا، مگر شیخ سماء الدین نے یہ بیت پڑھی،

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست ... ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

لہ ورق ۱۲۲ ۔ سلہ ورق ۱۲۰

اس کو سنتے ہی شیخ محمد پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، اس نے توبہ کی اور اہل اللہ میں شامل ہوگیا،

شیخ موصوف معدن علم و حیا تھے، کسی کی خجالت کو برداشت نہ کر سکتے تھے، خود تکلیف اٹھالیتے تھے، نفس پر جبر کر کے خلاف طبیعت چیزوں کا تحمل کرتے تھے، ایک بار باورچی[1] نے کھچڑی نہایت بدمزہ پکائی، حسن اتفاق سے شیخ جمالی بھی آگئے، شیخ نے ان کی تواضع کی مگر یہ بھی کہا:

"در خوردن ایں طعام چیزے ریاض در کار است"

شیخ جمالی نے ایک لقمہ اٹھایا تو اسے نہایت بدمزہ پایا، "طعام چوں طبع طامعان خام و روغن آں مثل روزگار مہجوران تلخ" مگر حضرت شیخ نہایت مزے سے تناول فرما رہے تھے، شیخ جمالی نے باورچی کو ڈانٹا اور برا بھلا کہا، حضرت نے تبسم فرمایا اور کہا:

"میں نے ابتدا ہی میں، ریاضت کی بابت اشارہ کیا تھا، مگر منظور کرنے کے بعد آپ نے باورچی کو ڈانٹا"

ایک موقع پر قاضی بدرالدین[2] حاکم بیانہ نے نماز پڑھائی، مگر نماز میں غیر معمولی جلدی کی کہ قرات میں خلل واقع ہوگیا، شیخ جمالی نماز میں موجود تھے، ان سے رہا نہ گیا، قاضی کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"مخدوم! عجب مردے صف شکن بودہ، سمند سرعت را در میدان قرأت چناں تیز تاختی کہ صلوٰۃ مقتدیان را بہ سیف لسان نیز انداختی"

ان الفاظ کو سنتے ہی شیخ سماء الدین کا چہرہ متغیر ہوگیا، اس وقت تو کچھ نہ کہا، دوسرے دن شیخ جمالی کو تنبیہ کی اور انھوں نے قاضی بدرالدین سے معذرت چاہی۔

شیخ سماء الدین جود و سخا کے مجسمہ تھے، جب دولت ان کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی۔ جو کچھ ملتا تھا فقرا و مستحقین میں تقسیم کر دیتے، ایک بار[3] ملتان میں سخت قحط پڑا، شیخ نے اپنا سارا سامان محتاجوں میں

---

[1] سیر العارفین ورق ۱۲۱ [2] ایضاً ورق ۱۲۲ ب [3] ایضاً ورق ۱۲۰ ب

تقسیم کر دیا، فتوح وغیرہ کے سلسلے سے جو کچھ آتا اس میں سے کچھ اپنے ذاتی مصرف میں نہ لاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ سب کچھ تقسیم کرنے کے بعد محتاجوں کا سلسلہ جاری رہتا اور قرض تک کی نوبت آجاتی۔ سیر العارفین میں اس طرح کے کئی واقعے درج ہیں،

شیخ اخلاص کا پیکر تھے، سچ بات کہنے میں کسی قسم کا باک نہ کرتے، مصلحت بینی کو بڑا عیب جانتے اگر چاہتے تو سلطان حسین شرقی کے نہایت مقرب ہو جاتے[1] احمد جلوانی آتا ہے، دعا کا طالب ہوتا ہے شیخ اس کو جس طرح کا جواب دیتے ہیں اسے خیال کر کے سخت حیرت ہوتی ہے، احمد جلوانی حاکم وقت ہونے کے علاوہ سخت مغلوب الغیظ تھا، مگر شیخ حق بات کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھے حسین شرقی کی چیرہ دستیاں ان کے نزدیک غلط تھیں، اس لیے نہیں کہ انھیں بہلول لودی سے کسی ذاتی نفع کی توقع تھی، بلکہ محض اس وجہ سے کہ ان کے نزدیک وہ حق پر تھا، شیخ جب دہلی آئے تو سلطان کے ساتھ ان کا وہی رویہ رہا، وہ خود کبھی سلطان کے ہاں نہ جاتے بلکہ سلطان خود ان کے پاس حاضر ہوتا، ایک بار اس کے حاضر آستانہ ہونے کے موقع پر شیخ نے جس طرح[2] اس کو نصیحت فرمائی وہ ان ہی کا حصہ ہے، اس کے بعد[3] بھی اس کی قبر پر بغرض فاتحہ خوانی تشریف لے گئے، اس وقت بھی اسی طرح کے جذبات کا اظہار فرمایا، ایسے خلوص کا حامل، اخلاق نبوی کا پیکر ہی ہو سکتا ہے،

اولاد | شیخ سماء الدین کی کم از کم تین اولادوں کا پتہ چلتا ہے، دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی بڑے صاحبزادے شیخ عبداللہ بیابانی تھے[4]، جو تصوف میں بڑا درجہ رکھتے تھے، جب شادی ہونے سے عبادت میں خلل واقع ہوا تو بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی، اپنی ہستی کو اس قدر کھو دیا تھا کہ جو کچھ کہتے صیغۂ غائب میں کہتے، قیام دہلی کے دوران میں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ میں مصروف عبادت رہتے، ہر نماز کے لیے غسل کرتے اور کپڑے دھوتے، ایک بار بادشاہ نے کچھ لوگوں کو قید کیا،

---

[1] سیر العارفین ورق ۱۲۳، [2] ایضاً ورق ۱۲۳-۱۲۴، [3] مخزن افغانی ص ۱۸۲، [4] اخبار الاخیار ص ۲۲۲-۲۲۳

اس میں سادات بھی تھے، شیخ نے ان کی رہائی کی کوشش کی، مگر بادشاہ راضی نہ ہوا، اس لیے شیخ نے وہاں کا قیام ترک کر دیا، اور مندو چلے گئے، وہاں کے سلطان نے کچھ پیشکش کرنا چاہی مگر قبول نہ کیا، صرف ایک گاؤں میں قیام کرنے کی اجازت چاہی، شیخ جمالی کو ان سے بیحد محبت تھی، بظاہر دونوں ہم عمر تھے، شیخ نے لکھا ہے کہ شیخ عبد اللہ علم ظاہری و باطنی میں ممتاز و مستثنیٰ تھے، کسی درویش نے مجاہدہ و ریاضت اور تجرد و توکل میں وہ درجہ نہ پایا جو شیخ کے حصہ میں آیا تھا، ۰ سال سے زیادہ جنگل بیابان میں گذارے، سوائے درخت کے سایہ کے کوئی جائے پناہ نہ تھی، جنگل کے پھل پھول پر گذر اوقات تھی، ہر روز ایک ختم کلام اللہ کرتے، شیخ سماء الدین آخر وقت میں بیٹے کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے، مگر یہ داغ حسرت ساتھ لے گئے، خزینۃ الاصفیا میں انتقال کی تاریخ ۹۳۰ھ دی ہے، اور مؤلف نے "بیابانی ولی خوب" اور "فیض الہٰا" سے تاریخ وفات نکالی ہے، مندو کے کسی قریہ میں مدفون ہیں، شیخ جمالی نے ان کی وفات پر دو پر درد مرثیے لکھے ہیں، ایک بند درج ذیل ہے:۔

یعنی از روے زمیں مطلع انوار برفت	قرۃ العین سماء الحق ازیں دار برفت
در بیابان بلا ہمہ سرگردانیم	پیشوائے دل و دیں قافلہ سالار برفت
دل بر آریم ز جان جان بدر آریم ز تن	دل و جاں را چہ تواں کرد کہ دلدار برفت
جگرم پارہ شد و سینہ پر افگار بماند	سیل خون دمبدم از دیدہ بر خسار برفت
کوہ را طاقت آں نیست کہ ایں بار کشد	انچہ بر جان من خستہ دریں بار برفت
می خلد خار غم اندر جگر و سینہ از انک	گل رعنائے من از عرصۂ گلزار برفت
باز جنید ندانم ز کجا سیل فنا	کہ از و خانۂ دیدار ز دیوار برفت
غم دل با کہ تواں گفت کہ از روے زمیں	بقضائے فلک آں محرم اسرار برفت

۱؎ سیر العارفین ورق ۱۶ ۲؎ جلد ۱ ص ۸۷ ۳؎ اورنٹیل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۳ء ص ۱۵۵

طالبان از غم او جامۂ جاں چاک زدند

خویش راسینہ در آتش زدہ بر خاک زدند

دوسرے صاحبزادے سلطان المحققین شیخ نصیر الدین تھے[۱]، وہ ظاہر و باطن میں ہم عصروں میں ممتاز اور حسن صورت و سیرت سے آراستہ و پیراستہ تھے، سنت رسول اللہ کی پیروی میں بڑا اہتمام اور اسکی تاکید کرتے، والد کی وفات کے وقت موجود تھے، شیخ جمالی نے چند واقعات ان کے حوالے سے بیان کیے ہیں،

تاریخ مخزن افغانی[۲] میں شیخ جمالی کو شیخ سماء الدین کا خالو بتایا گیا ہے، صولت[۳] افغانی میں بھی اسی کی پیروی کی گئی ہے، مگر بعض تذکروں[۴] میں شیخ موصوف کو شیخ جمالی کا خالو قرار دیا گیا ہے، اور چونکہ یہ رشتہ پہلے رشتہ کے منافی نہیں ہے، اس لیے شیخ سماء الدین کی دختر نیک اختر کا شیخ جمالی کے حبالۂ عقد میں ہونا بعید از قیاس نہیں، شیخ جمالی نے صرف "شرف[۵] قرابتی" کا فقرہ درج کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان سے مطلق پردہ نہیں ہوتا تھا، ایک مرتبہ شیخ موصوف نے شیخ جمالی کو "نور[۶] عینی" سے یاد کیا ہے، آخر الذکر کی سیاحت[۷] بلاد اسلامی پر جانے کے بعد شیخ سماء الدین کو جس قدر بے چینی تھی، اس سے بھی شیخ جمالی کا عزیز قریب ہونا بخوبی ظاہر ہے۔

شیخ کی اولاد کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا، چنانچہ اخبار الاخیار[۸] میں ہے کہ ان کی اولاد کے چند افراد ان ہی کے پاس مدفون ہیں،

مرید و شاگرد شیخ کے مریدوں میں حسب ذیل حضرات کا پتہ چلتا ہے:

شیخ عبد الشکور و شیخ عبد الغفور[۹]، یہ دونوں شیخ سماء الدین کے پیر و مرشد شیخ کبیر الدین اسمٰعیل کے

---

[۱] ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۲۶ الف [۲] ص ۱۰۲ [۳] ص ۱۰۵، تاریخ مخزن افغانی کا ترجمہ سمجھنا چاہیے، جس میں چند باب کا اضافہ ہے [۴] ملاحظہ ہو ریاض الشعراء ورق ۸۰ [۵] سیر العارفین ورق ۱۲۱ [۶] ایضاً ورق ۱۲۶ [۷] ایضاً [۸] ص ۲۱۱ [۹] سیر العارفین ورق ۱۱۸، فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۸

صاحبزادے تھے، دونوں بیٹے باپ کو بیحد عزیز تھے، شیخ جمالی نے دونوں کو دیکھا تھا، اور انھیں صاحب حال واہل کمال، حافظ کلام اللہ اور ظاہر و باطن سے آراستہ پایا تھا، دونوں بزرگ حسن صورت و سیرت کے پیکر تھے، گویا جبرئیل و میکائیل نے آدمی کی شکل اختیار کرلی تھی، دونوں شیخ سماء الدین سے سلوک و معرفت کی تعلیم حاصل کرتے تھے،

مولانا عطاء اللہ[1]۔ انھوں نے شیخ جمالی سے اپنے پیر شیخ سماء الدین کے قیام ناگور کا ایک واقعہ بیان کیا تھا،

شیخ لادن[2]۔ ان کا نام شیخ عبد الغفور تھا، شیخ جمالی کے ہم سبق تھے، انھوں نے مولانا عبد اللہ تلنبی سے علوم ظاہری حاصل کیے تھے، اور سلوک کی تعلیم شیخ سماء الدین سے پائی، اور ان دونوں مین غیر معمولی امتیاز حاصل کیا، ان کے شیخ نے انھیں اپنے گھر کا چراغ کہا تھا، مرشد کو بے حد عزیز تھے، اور برابر ان کی خدمت مین حاضر رہتے، شیخ موصوف کے خلیفہ بھی ہوئے، شیخ جمالی نے بہت سے واقعات ان کے حوالے سے قلم بند کیے ہیں۔

شیخ اوحد[3] دہلوی۔ ان کا نام شیخ زین العابدین تھا، مولانا عبد الحق محدث دہلوی کے جد مادری یعنی نانا تھے، عام طور پر "شیخ دانشمند کامل" کے نام سے موسوم تھے، شیخ لادن اور شیخ جمالی کی طرح علوم ظاہری کی تکمیل مولانا عبد اللہ سے کی اور علوم باطنی کی شیخ سماء الدین سے، بڑے پرہیزگار اور خشوع وانکسار میں اپنی آپ نظیر تھے، حضرت محدث کے والد فرماتے تھے کہ میں نے کسی شخص کو ایسا نہیں دیکھا جس کا ظاہر و باطن اس درجہ یکساں ہو، حلیہ نہایت نورانی تھا، اکثر روزہ رکھتے، ابراہیم لودی نے حجاب خاص مقرر کرنا چاہا مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، سنہ ۹۳۴ھ مین انتقال فرمایا، ان کا مقبرہ حوض شمسی کے مغرب میں واقع ہے،

---

[1] سیر العارفین ورق ۱۳۰ ب [2] ایضاً ورق ۱۲۶ و ۱۲۷ وغیرہ [3] اخبار الاخیار ص ۲۲۴ و ۲۲۵

شیخ جمالی۔[1] ان کا نام جلال خان یا حامد بن فضل اللہ تھا، دہلی کے رہنے والے اور خاندان کنبوہ کے ممتاز فرد تھے، مولانا عبداللہ تلنبی کے شاگرد تھے، حضرت شیخ سماء الدین کے قیام رنتھمبور کے دوران میں بیعت ہوئے، اور وفات تک ان کی خدمت میں رہے، لیکن درمیان میں چند سال بلاد اسلامی کی سیاحت میں گذارے، مصر،[2] دمیاط، مغرب، شام، عراق، عرب وعجم اور ایران وغیرہ کی سیاحت کی، ایران میں مازندران، گیلان، تبریز، خراسان، تربت، شیراز، سبزوار، ہرات وغیرہ تمام مشہور مقامات کی سیر کی، سیاحت کے دوران میں اکابر علماء و مشائخ سے بھی ملاقات کی، اور بزرگان دین کے مزارات پر حاضر ہوکر فیوض و برکات حاصل کیے، حج کی سعادت کے بعد جب ہندوستان واپس ہوئے تو سلطان سکندر لودی نے ان کو اپنا خاص مصاحب بنالیا، چنانچہ آخر وقت تک اس کے انیس وجلیس رہے، ابراہیم لودی سے ان کی نہ بن سکی، اس لیے بابر سے منسلک ہوگئے، اور اس کی مدح میں زوردار قصائد نظم کیے، ہمایوں نے بھی شیخ سے وہی طریقہ قائم رکھا، متعدد قصائد کے علاوہ شیخ نے اپنی مشہور تصنیف سیر العارفین بھی اسی کے نام معنون کی، ان کے دو صاحبزادے تھے، ایک حیاتی[3] جو سلیم شاہ کے خاص مقربین میں تھے، انھوں نے بیحد موزون طبیعت پائی تھی، اور شعراء کے بڑے قدردان تھے، ولایت سے آنے والوں کے لیے بڑی جائے پناہ ان کی ذات تھی، ۴۰ سال کی عمر میں ۹۵۹ھ میں دفعۃً انتقال کیا، شیخ جمالی کے بڑے صاحبزادے شیخ گدائی[4] تھے، جن کو اکبر کے عہد میں بڑا عروج حاصل ہوا، یہ سلام و کورنش سے آزاد تھے، اور بڑے بڑے علماء و سادات پر ان کو تفوق حاصل تھا، بیرم خان پر ان کا بیحد اثر تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اس کی بغاوت میں شیخ کا بھی ہاتھ تھا، اکبر کو

---

[1] اخبار الاخیار ص ۲۲۷ - ۲۲۹، میں نے ایک تفصیلی مقالہ اسی عنوان سے لکھا ہے جو اردو ادب میں عنقریب شائع ہوگا۔

[2] ملاحظہ ہو سیر العارفین ورق ۱۴ ب، ۱۵ الف، ۲۷، ۲۸، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۶۶، ۶۷، ۷۰ و اخبار الاخیار ص ۲۲۸

[3] اخبار الاخیار ص ۲۲۸ [4] ایضاً ص ۲۲۹

بعد میں شیخ سے کد ہوگئی، اور ان کے نام بعض فرمان بھی لکھے گئے، ان کی وفات ۹۴۲ھ مین ہوئی،

جمالی صوفی و درویش ہونے کے علاوہ بہت اعلیٰ درجہ کے فارسی کے شاعر بھی تھے، اور غالباً اس لحاظ سے وہ نہ صرف اپنے ہم عصرون مین سب سے ممتاز تھے، بلکہ امیر خسرو کے بعد ہندوستانی شاعرون مین سب سے زیادہ قابل توجہ ہین، ان کا دیوان خود ان کی زندگی ہی مین مدون ہو چکا تھا، خوش قسمتی سے اس کے دو نسخے[1] ہندوستان مین موجود ہین، اس کے علاوہ دو مثنویان بھی ان کی یادگار ہین، اگرچہ جامی سے عمر مین بہت چھوٹے تھے، مگر انھون نے شیخ کی بڑی قدر و منزلت کی، بعض واقعات سے پتہ چل رہا ہے کہ ان کی شاعری ایران مین مقبول ہو چکی تھی، سیر العارفین صوفیہ کا تذکرہ ہے، جو ہم مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے، ۹۴۲ھ میں عہد ہمایونی مین وفات پائی "خسرو ہند بودہ" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شیخ جمالی اپنے پیر شیخ سماء الدین کو بے حد عزیز تھے، انھون نے پیر کی مدح میں متعدد قصائد لکھے ہیں، وفات پر ایک پر درد مرثیہ بھی نظم کیا[2] جس کے چند ابیات درج ذیل ہین:

اے دیدہ خون بریز کہ دلدار غائب است	یعنی جمال آن مہ رخسار غائب است
اے ظلمتِ ستم رخِ آفاق را بپوش	کان آفتابِ عالم انوار غائب است
شیخے کہ سرِ حق ز لبش می شنو دخلق	اکنون میان عالم اسرار غائب است
در غارِ غم رو یدکہ آن یار غار دین	ہمچو نبی کنون بدل غار غائب است
زان جان ہمی کنیم کہ جانان نہفت روے	زان غم ہمی خوریم کہ غمخوار غائب است
انوار آن جمال بہ معنی محیط ماست	گر صورتش ز دیدۂ خونبار غائب است
یارب چہ حالت است کہ امروز در جہان	صبر و قرار از دل ابرار غائب است

[1] ایک رام پور رضا لائبریری میں، دوسرا حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم کے کتاب خانے میں،

[2] اورینٹل کالج میگزین بابت نومبر ۱۹۳۳ء ص ۱۵۰

یعنی سماء دولت و دین زیر خاک شد

زین غم ہزار جامۂ اسلام چاک شد

تصانیف شیخ سماء الدین کی مصنفات میں صرف دو کا پتہ چلا ہے،

(۱) حواشی لمعات شیخ عراقی،

(۲) رسالہ مفتاح الاسرار۔ تصوف پر ایک رسالہ ہے جس کے بعض حصے رسائل شیخ عزیز نسفی سے ماخوذ ہیں۔ اخبار الاخیار (ص ۷۱) میں اس کا کچھ اقتباس درج ہے، ان کے خیالات سے روشناس ہونے کی غرض سے چند سطریں درج ذیل ہیں:

بدانکہ در معنی انتہائے انسان اہل شریعت و اہل حکمت و اہل وحدت اختلاف دارند۔ اہل شریعت میگویند کہ حق ارواح را پیش از اجساد بچندین ہزار سال بیافرید و ہر یکے را مقامے معین گردانید، بازگشت او بدان مقام خواہد بود وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ، یعنی روح ہر کہ در مقام ایمان مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان اول خواہد بود، و روح ہر کہ در مقام عبادت مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان دوم خواہد بود و روح ہر کہ در مقام زہادت مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان سوم خواہد بود و روح ہر کہ در مقام معرفت مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان چہارم خواہد بود و روح ہر کہ در مقام ولایت مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان پنجم خواہد بود و روح ہر کہ در مقام نبوت مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان ششم بود و روح ہر کہ در مقام رسالت مفارقت کند بازگشت او بہ آسمان ہفتم خواہد بود و روح ہر کہ در مقام اولوالعزمی مفارقت کند بازگشت او بکرسی خواہد بود و روح پیغمبرے کہ در مقام خاتمیت مفارقت کردہ است بازگشت او بعرش است، ہر یکے ازان مقام کہ نزول می کند باز بہمان مقام عروج می کند و دائرہ خود تمام می کند ... و اما آنکہ بمقام ایمان نرسد بازگشت او بہ آسمان نخواہد بود، و ہمان گفتہ اند کہ این مراتب خلقی از روئے کسبی و لا تبدیل لخلق خدائے تعالیٰ تبدیل نیست، دین حق و دین قیم این است، اگر این مراتب کسبی بودندے ممکن بودے کہ ہر یکے بکسب از مقام اول خود درگذشتے و بالاتر رفتے۔"

اُردو شاعری اور سیاست

از جناب کلب علی خاں صاحب رامپوری

(۲)

ولادت ۱۱۳۵ھ وفات ۱۲۲۵ھ	میر تخلص، محمد تقی نام، باپ کا نام محمد علی، اور خطاب عطا کردۂ مرشد علی متقی تھا،
عہد ۱۱۵۴ھ تا ۱۱۸۴ھ	عمر کی نوّے بہاریں اس عظیم المرتبت شاعر نے دیکھیں، آگرہ جو قدیمی دار السلطنت

رہ چکا تھا، میر کی پیدائش یہیں ہوئی، میر نسب میں اپنے کو بنی فاطمہ ظاہر کرتے ہیں، باپ پیری مریدی کرتے تھے، اراکین سلطنت بھی ان کے معتقدین میں تھے، اس لیے دس گیارہ سال کی عمر تک نہایت ناز و نعم میں پرورش پائی، باپ کے مرنے پر آگرہ میں جب کوئی روزگار نہ ملا تو کمسنی ہی میں بسلسلہ تلاش معاش دلی کا رخ کیا، (۱۱۴۹ھ) محمد شاہ کی تخت نشینی کو سترہ سال ہو چکے تھے، اور وہ ملک کی تباہی سے بے نیاز ہو کر عیش و عشرت میں مشغول تھا، ابھی تک تخت طاؤس تک دشمنوں کے قدم نہ پہنچے تھے، اور دلی عام تباہی سے محفوظ تھی، امرا، شاہ وقت سے عیش کوشی میں کم نہ تھے، ہر گلی، ہر باغ، ہر قطعۂ زمین دہلی رشک ارم بنا ہوا تھا، اور جنس لطیف کے سوا امردان شیریں ادا بھی محفلوں کی زینت بنے ہوئے تھے، میر نے چل پھر کر سیر کی، امیر الامرا کی بارگاہ سے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر ہو گیا، اور میر بے نیاز ہو کر وطن لوٹ گئے، دلی کی یہ عیش پرستی قدرت کو ناگوار تھی، اس لیے نادر کو مسلط کیا گیا، اور قتل کر کے پورا شہر لوٹا گیا، تخت طاؤس ایران کے نصیب ہوا، امیر الامرا نواب سعادت علی خان بانی و والیِ اودھ کی رفاقت میں نادری فوج سے پانی پت کی جنگ میں ٹکرا کر زخمی ہوئے، اور[1] تین دن بعد رحلت کر گئے، وظیفہ

---

[1] صمصام الدولہ امیر الامرا خان دوران بہادر منصور جنگ ۱۵ ماہ ذیقعدہ ۱۱۵۱ھ در جنگ زخمی شدہ ۱۹ ماہ مہمان زخمہا درگذشت، تاریخ محمدی مخ[illegible]

بند ہوگیا، اب میر پھر دہلی تلاش روزگار میں آگئے، اور خان آرزو کے یہاں جو میر کے علاقی بھائی حافظ محمد حسن کے حقیقی ماموں تھے، قیام کرکے اکتساب علم کیا، شاعری کیطرف طبیعت رجوع ہوئی، تو چند دنوں میں مستند عوام وخواص قرار پائے، اسی زمانہ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا، اور ۱۱۷۰ھ میں دہلی نے دوبارہ تباہی کا منہ دیکھا، یہ واقعہ میر کا چشم دید ہے، سودا اسی ہنگامہ میں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد جاکر مقیم ہوگئے، میر نے استقامت دکھائی، احمد شاہ ابدالی نے ایک ماہ تک شہر کو مصیبت میں مبتلا رکھا، اور کچھ دنوں کے بعد محمد شاہ کی دختر کو نکاح میں لیکر واپس چلا گیا، ۱۱۷۳ھ میں پھر مرہٹوں اور شاہ ابدالی میں آویزش ہوئی، کچھ دنوں دلی مرہٹوں کے قبضہ میں رہی، اور انھوں نے اتنی تباہی مچائی[1] کہ دلی والوں کا امن واطمینان رخصت ہوگیا، ۶ر جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ میں پانی پت میں مرہٹوں نے شکست کھائی، اور شاہ ابدالی نے دہلی کا رخ کیا[2]، اس بار تباہی پہلے سے بھی زیادہ ہوئی، مکانات لوٹے بھی گئے، اور جلائے بھی گئے، عوام اور خواص کو شاہ ابدالی کی فوج نے تین دن میں لوٹا، بدن کے کپڑے تک اتار لیے، مال کی دریافت کے سلسلہ میں جسم داغے گئے، غرض قیامت صغرا برپا تھی[3]، کسی گھر میں نہ کھانے کو رہا، نہ پہننے کو رہا، ہزاروں آدمی اس ہلکامہ میں دلی سے ترک وطن کرگئے، میر اس تباہی سے پہلے ہی کمہیر[4] پہنچ گئے تھے، یہاں وہ دس برس رہے، اور ۱۱۸۱ھ میں دلی لوٹے، ان کے اکثر اشعار دلی کی بربادی کا مرثیہ ہیں، سچ کہتے ہیں،

ل دیوان خاص کی نقرئی چھت کو اتار لیا، اور ٹکسال میں بھیج دیا، قدم شریف اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں جو سامان سونے چاندی کا تھا وہ بھی لے لیا، تاریخ ہندوستان جلد ششم ص ۵۰۳ از مولوی ذکاء اللہ،

۲ قریب یک ماہ بر شہر سخت محاصرہ ماندہ، ذکر میر ص ۷۰، ۳ اسباب پوشش و قوت روزہ در خانہ کسے نماند .... ہزاران خانہ سیاہ و در حین آں آتش ستیز باد اغ دل جلاے وطن کردہ سر بصحرا زدند۔

۴ فرداے عاشورہ قدم کشیدم و بہ کمہیر رسیدم ص ۱۰۱ ذکر میر،

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے — جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

ہند میں ہو گئے برباد ہزاروں اس سال — شامت بخت یہ اے یار خدا کس کی ہے

ایک اور شعر میں دلی کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے ؎

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے — پھیلا تھا اس طرح کا، کاہے کو یاں خرابا

دلی کی اقتصادی بدحالی کا کتنا درد انگیز بیان ہے

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں — تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

احمد شاہی ہنگامے میں جو دوست و احباب مارے گئے، ان کو یاد کرکے کہتے ہیں:

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں — نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

اس بربادی کا اثر ہزاروں باغیرت اصحاب نے زیادہ محسوس کیا، بہت سے اصحاب علم وفن دلی کو خیرباد کہہ گئے، سودا، قائم وغیرہ اسی ہنگامے سے متاثر ہو کر ترک وطن کر گئے، میر کا قلب دوستوں کی جدائی سے بے قرار ہو گیا،

مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں — لوگ وے پل مارتے کیدھر گئے

تھے لب جو پر جو گرم دیدار — سبزے کے سے رنگ مژگان تر گئے

خانوادے ہو گئے کیا کیا خراب — خانہ ساز دین کیسے مر گئے

ایک مخمس میں شاہی لشکر کی تصویر کشی ہے، جس میں امراء، وزراء، اور شاہ وقت بھی تنقید سے نہ بچ سکے، میر کا شخصی کردار اتنا بلند تھا کہ اس نے بادشاہ کو بھی نہ چھوڑا،

جس کسو کو خدا کرے گمراہ — آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ

یاں نہ کوئی وزیر ہے نہ شاہ — جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ

طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس ۔ بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس ۔ جیتھڑا دن بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہے گی سپاہ

دیکھے میں نے مصاحبانِ شہ ۔ نکلے سب بے حقیقت و بے تہ
ٹھہری آخر کو ان سے مت کچھ کہہ ۔ رہ سکے ہے کسی طرح تو رہ
ورنہ لشکر سے جا خدا ہمراہ

قصہ کوتہ کہاں نہ رو گذرا ۔ کون سی شکل میں نہ ہو گذرا
آبرو رفتہ رفتہ کھو گذرا ۔ یا گذرنا تھا ظلم جو گذرا
اس پہ جب کو ہو قصہ بسم اللہ

ایک اور مخمس میں سرکاری عمال کی بدمعاملگی و نظم حکومت پر گہری تنقید ہے جس سے شاہ وقت کی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے جو صرف نام کا شاہ رہ گیا تھا، نہ خزانہ تھا نہ سپاہ، اور جو ملازم تھے وہ تنخواہ سے بے نیاز، مختار سلطنت کی گفتگو قابل ملاحظہ ہے ؎

مخمس در مذمت فرد دستخطی و کسے کہ برائے جاری کردن فرد اصرار داشت

پھر جو اس فرد کا ہوا مذکور ۔ کہنے لاگا کہ تا ئب دستور
جانتا ہے تمھیں کہ ہو مشہور ۔ پر کہے ہے مجھے رکھو معذور
جاری کرنا ہے اس کا امرِ محال

آئے آنے ہیں شاہ پر بھاری ۔ اس سے لوگوں ہی کی ہے لاچاری
آپ ہی تو یہ ہے گرفتاری ۔ فوج ہے گی تو قحط کی ماری

کیونکہ جس جا رہے وہاں تھا کال

عمدہ جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی جو بھوکے مرتے ہیں لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں

ایک تلوار پیچھے ایک ہے ڈھال

بادشہ بھیک مانگت آیا روز روزینہ بند فرمایا
معتمد اپنا مجھ کو ٹھہرایا سو بُرا ہیچ ہیں، ہیں کھلایا

جس کو دیکھو رکھے ہے مجھ سے ملال

اس کے اوپر ہے شہ تماشائی اور چاہے ہے خرچ بالائی
ہر طرف پھیلی ہے یہ رسوائی کل جینا نچ ہمیں نظر آئی

لال خیمے کے گرد دو سے پال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا ہے جو دکو چاہیے زنانا ہے
یا نہیں شہ کے گھر میں دانا ہے کبھو ہوتا ہے سہل کھانا ہے

ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

یہ نقشہ شاہ عالم کے لشکر کا ہے، جو گشتی شاہ تھا جس نے چاہا حسب مطلب آلۂ کار بنا لیا، اور پھر دھتکار دیا، آخر جب نواب نجیب الدولہ امیر الامرا کی علالت بڑھ گئی جو شاہ عالم کے نام پر دہلی میں حکومت کر رہا تھا، تو اس نے شاہ عالم کو لکھا کہ اب حکومت سنبھالیے، مجھ سے جو ہو سکا میں نے وہ کیا اور دہلی کو محفوظ رکھا، آخر شاہ عالم نے الہ آباد سے دہلی کا (مئی ۱۷۷۰ء) رخ کیا، اور فرخ آباد ایسے وقت پہنچا کہ نواب احمد خان میر بخشی ہند کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے بیٹے سے خراج وصول کیا، میر راجہ ناگرمل کے فرستادہ فرخ آباد پہنچے، اور بادشاہ سے عہد و پیمان ہوا لیکن ان ہی دنوں میں

مہاراجہ سندھیا بادشاہ کو اپنے ساتھ دہلی (۲۵ر دسمبر ۱۷۷۱ء) لے آیا، یہاں جو نقشہ لشکر شاہی کا دیکھا، بالا مخمس میں اسی کا بیان کیا ہے، اسی سلسلہ کا ایک اور مخمس ہے جس سے شاہی لشکر کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے،

مخمس دیگر متضمن برہمین معانی گفتہ شد

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش   آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کریاں کی دیکھی طرفہ معاش   ہے لبِ نان پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچہ آش

مرنے کے مرتبہ میں ہیں احباب   جو شناسا ملا سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب بحالِ خراب   جس کی ہے پال تو نہیں ہے طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

زندگانی ہوئی ہے سب تہ وبال   کنجڑے جھینکے ہیں رہتے ہیں بقال
پوچھ کچھ مت سپاہیوں کا حال   ایک تلوار بیچتے ہیں ایک ڈھال
بادشاہ و امیر سب قلاش

لال خیمہ جو ہے سپہر اساس   پالیں ہیں، نڈیوں کی اُنکے پاس
ہے زنا و شراب بے وسواس   رعب کریجے یہیں سے قیاس
قصہ کوتاہ رئیس ہے عیاش

چار لُچّے ہیں مستعدِ کار   دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار   لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار
سو بھی قندِ سیاہ ہے یا ماش

میر نے سراپا درد اور دل کی نشتر چبھوے ہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو

ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم
مل میر اب کے امیروں سے تو

۱۱۶۰ھ تا ۱۱۸۰ھ | شاہ واقف نام تخلص واقف دہلوی تھے، میر حسن کی رائے ان کے کلام کے متعلق یہ ہے کہ کلام میں بہت بلند پروازی پائی جاتی ہے، ہم جیسے بھی ان کے مغز کلام تک نہیں پہنچ سکتے ہیں، طرز کلام ناصر علی اور جلال اسیر سے مشابہ ہے، اودھ میں مقیم ہوگئے تھے، شجاع الدولہ کے عہد (۱۱۶۸ھ تا ۱۱۸۸ھ) میں نقش نویسی کی تہمت میں گرفتار ہوئے، اسی حالت میں ایک غزل کہی جس کا مطلع یادگار ہے ؎

بے خطا بہرے میں اور اہل خطا بہرے میں
دور آیا ہے کہ ہوں شاہ و گدا بہرے میں

پوری غزل اسی رنگ میں کہی ہے، شاعر کی آزادہ روی کا اسی مطلع سے اندازہ ہو سکتا ہے، جس میں شجاع الدولہ کے نظم حکومت پر تنقید ہے۔

ولادت ۱۱۳۷ھ وفات ۱۲۰۸ھ
عہد ۱۱۵۰ھ تا ۱۱۸۰ھ | قائم۔ محمد قائم، قیام الدین نام اور عرفیت، چاند پور وطن تھا، دہلی میں ہوش سنبھالا اور رام پور کی سرزمین میں ۱۲۰۸ھ میں یہ آفتاب سخن غروب ہوا، قائم کی زندگی آزادانہ گذری، شاہی توپخانہ میں داروغہ تھے، میر سوز بھی اسی زمرے میں تھے، درد اور سودا سے فیض سخن پایا، جب دلی کی بربادی پیہم زبرداشت کر سکے تو وطن کی طرف منہ موڑا، اور گوشۂ عافیت میں زندگی گذارنے لگے، طبیعت فقر و تصوف کی طرف مائل ہوئی، آخر عمر تک اسی رنگ میں گذاری، علمی شغف اور دینی ماحول تھا، اس لیے کچھ دنوں قضا کے فرائض بھی انجام دیے، ۱۱۸۳ھ کے لگ بھگ نواب محمد یار خان برادر خورد نواب فیض اللہ خان والی رام پور کو شاعری کا شوق ہوا، تو سودا کو دعوت استادی فرخ آبادی بھیجی، مگر وہ بلند نظر رکھتے تھے، اور اودھ جانے کی فکر میں تھے، اس لیے یہ دعوت منظور نہ کی، اس وقت نظر انتخاب قائم پر پڑی، قائم ٹانڈہ کے نواح آنولہ میں آکر نواب محمد یار خان امیر کے ملازم ہوگئے، کچھ دنوں بعد ان ہی کے توسط سے مصحفی بھی آکر حلقۂ شعرا میں

داخل ہوئے، شاہ عالم اس وقت الہ آباد میں تھے، جب نجیب الدولہ کی علالت کی خبر ملی تو الہ آباد سے روانہ ہوکر ۱۸ رمضان ۱۱۸۵ھ کو دلی پہنچے، اور اپنے کو مرہٹوں کے سپرد کر دیا، حسب ایمائے مہاراجہ مادھوجی سیندھیا وتکوجی ہلکر ۱۰ شوال ۱۱۸۶ھ کو نواب ضابطہ خان امیر الامراء پسر نواب نجیب الدولہ شاہ عالم نے مرہٹوں پر فوج کشی کی، مرہٹوں نے افغانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، سیکڑوں بستیاں لوٹ مار میں تباہ ہوئیں، قائم اسی خطۂ روہیل کھنڈ کے باشندے تھے، جہاں تباہی نازل ہوئی، وہ دلی کی نئے دن کی بربادی سے گھبرا کر وطن میں پناہ گزین ہوئے تھے، اور نواب محمد یار خان کے دامن دولت سے وابستہ ہوکر امن واطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے، اس افراتفری میں نواب محمد یار خان امیر کی محفل ادب برہم ہوگئی، مصحفی، نعیم، پروانہ، حیرت وغیرہ تمام شاعر آوارہ ومنتشر ہوگئے، قائم اس تباہی پر چیخ اٹھے، ان کا گھربار، مال ودولت، عزیز واقربا اس حملہ میں تباہ ہوگئے تھے، قائم نے اس تمام تباہی کا ذمہ دار شاہ عالم کو قرار دیا، اور شہر آشوب میں شاہ عالم اور اس کے پیشرووں پر ایسی سخت سیاسی تنقید کی ہے جس کی امید ہم کسی مورخ سے بھی نہیں کر سکتے تھے، میر نے بھی شاہ عالم پر تنقید کی ہے، مگر پردے میں تیغ لے ساتھ نہیں، قائم نے کھلم کھلا تنقید کی ہے، جس سے شاعر کے کردار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے، اس مخمس کو پڑھ کر شاہ عالم کے اس حملہ سے پیدا شدہ تباہی کا اندازہ کیجئے، گو شاعر کا لہجہ زیادہ درشت گیا ہے، مگر جس نے اپنا گھربار لٹتا دیکھا ہو وہ قابلِ معافی ہے۔

مخمس

کیسا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہے ۔۔۔ ہاتھوں سے اسکے ایک جہاں دادخواہ ہے

یہ ایک آپ ساتھ میں شہری سپاہ ہے ۔۔۔ ناموس خلق سایہ میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظلِ الٰہ ہے

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو ہووے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو
تا زمزمے دہی ہوں سرو دہی غنو سو آسمان نے لا کے مسلّط کیا سو تو

جس کے ستم سے چار طرف آہ آہ ہے

لشکر میں مرہٹہ کے جو کوئی رہے ہیں بند دیکھے ہیں ان کے ظلم کے پست اور بلند
اب نام فوج سن کے وہ از جائیں جوں نژد سچ ہے کہ جس کو مارے پہنچے کبھو گزند

رتی کو جانتا ہے کہ مار سیاہ ہے

سمجھا تو اس قدر بھی اے بھڑوے خبیث خر کس پر ہوا یہ ظلم، تو ناکسوں پہ زر
ہر نیک و بد میں آدمی کرتا ہے یاں نظر تو تو خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر[1]

جس کا خطاب شاہ[2] حماقت پناہ ہے

دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو بر ملا
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلا دوں دوش کس طرح سو میں تیری تئیں بھلا

آخر گدا پن ان کا ترا عذر خواہ ہے

گردش کا آسمان کی جو ہو کوئی سبب اہل زمین پہ آئے ہے ایک رنج یا تعب
ٹوٹے غضب یہ تجھ پہ، نہ اتنا کیں غضب مردوں کی جو کھڑ تک سو پڑ ہونا تا بلب

ایسی نہ باؤلی ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے

قبل سنہ ۱۱۹۰ھ | جمن تخلص جمن لال کایستہ دہلوی، اس کا بڑا بھائی نواب ضابطہ امیر الامرا کی سرکار

---

[1] عالمگیر ثانی (۱۱۶۷ھ تا ۱۱۷۳ھ ربیع الثانی) فقیر کی زیارت کے بہانے مہدی علی خاں کشمیری نے قتل کرایا بے سر دھڑ کے جمنا کے ریت پر پھینک دیا، کئی دن بعد لاش دفن ہوئی ص ۲۰۰۳ تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ۔

[2] جہاندار شاہ (۲۰ محرم ۱۱۲۴ھ ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۲۳ھ) ص ۱۱ تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ

میں منشی گری کی خدمت پر مامور تھا، خواجہ میر درد کا شاگرد اور وارستہ مزاج اور سادہ لوح تھا، ۱۱۹۱ھ میں موجود تھا، ایک قطعہ مختار کی مذمت میں ہے جس سے آزادہ روی کا پتہ چلتا ہے۔

یہاں مختار جو باجاہ آیا — برائے قتل خلق اللہ آیا

نہ تھے کچھ شاہ جی، نے شاہ جی — وہ نادر شاہ تھے یہ شاہ آیا

حسرت ۱۱۹۰ھ تا ۱۲۰۷ھ؟ مرزا جعفر علی نام، حسرت تخلص، دہلوی الاصل اور لکھنوی مسکن و مدفن نے بھی دہلی کی تباہی پر شہر آشوب لکھا ہے، عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد دہلی کس مپرسی کی حالت میں تھی، نجیب الدولہ نے اپنے زور بازو سے حتی المقدور دہلی کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن مخالف قوتیں برابر مرکز پر وار کر رہی تھیں، عماد الملک کا پارٹ اس دور میں بدترین نظر آتا ہے، اس نے اپنی پوری ذہانت دہلی کی بربادی میں صرف کرکے دہلی کو بھی برباد کیا اور خود بھی تباہ ہوگیا، شاہ عالم اسی کے خوف سے قسمت آزمائی کیلئے بنگال کی طرف چلا گیا تھا، مگر نہ دماغ میں صلاحیت تھی نہ بازوؤں میں طاقت، اس لیے نالائق امراء کا دست نگر بننا پڑا، احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں نے دہلی کی رہی سہی رونق کو بھی مٹا دیا، اسی زمانہ میں حسرت کا خاندان بھی دہلی سے ہجرت کرکے اودھ جا بسا، اس ابتری کا اندازہ شہر آشوب سے کیجئے جس میں ہر گوشہ پر گہری نظر ڈالی ہے، اور دل کا خون زبان قلم سے بہایا ہے، فوج، خزانہ، شاہی قلعہ کی ابتری کا بیان ایسا

لہ مرزا جعفر علی صاحب تخلص بحسرت بہ جمیع علوم فضل و کمال داشت خصوصاً در حکمت و فن شاعری چہ قصیدہ و غزل و رباعی و مثنوی و مخمس وغیرہ بادشاہ سخن و در خلق و اخلاق یکتائے روزگار و ہمیشہ بحضور بادشاہ ذی جاہ مانده مرزا نی قبل از وفات چہار سال ترک لباس ہم نمودہ در کنج قناعت نشستہ بود نام بخشیدہ مرشد مقصود دہلی داشتند عرصہ دوازدہ سال می شود کہ از قضائے الٰہی انتقال فرمودہ .... در لکھنؤ متصل نخاس حویلی خود داشت ہموں حویلی مدفن گردیدہ حق تعالیٰ بیامرزد و بہرحال فقیر بسیار اشفاق می فرمود و فقیر ہم کمالی داشت گرد و دیوان تصنیف آں نزد فقیر بود۔ (از مجمع الانتخاب شاہ کمال مخطوط انجمن ترقی اردو)

المناک ہے کہ اس کو پڑھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے، مرثیوں میں منظر نگاری اور مرقع کشی اسی قسم کے شہر آشوب سے حاصل کی گئی ہے، واقعات کی تفصیل ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی مورخ اپنے جادو نگار قلم سے حالات کا آئینہ پیش کر رہا ہے، اس مخمس کے چند بند یہ ہیں:

نہیں ہو مرثیے کم جہان آباد کا حال — اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال
وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہو سخن کی مجال — اگرچہ چرخ ستم گر یہ اس پہ لایا زوال
پر آب رووے ہے رکھ منہ پہ ابر سے رومال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویران — کہ جیسے باد خزاں سے ہو حالت بستان
وہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفان — گذر گیا ستم افغان کے ظلم سے جو وہان
فغان کہ ہو گیا یہ کشت سبز سب پامال

یہ دور آخری کے یارو سب نشانے ہیں — جو رولتے تھے زر و مال خاک چھانے ہیں
جو بخشتے تھے گہر ان کے اب فسانے ہیں — جہاں تھیں بلبلیں چنڈول کے آشیانے ہیں
زقوم ہیں وہاں جس جا تھے سرو و گل کے نہال

رہے نہ آئینہ خانے، نہ دیکھنے والے — پڑے ہیں آبلے سینوں میں پاؤں میں چھالے
نہیں وہ مست، وہ شیشے وہ جام پیمانے — جو دل تھے شیشہ صفت توڑ چرخ نے ڈالے
پڑے ہیں خاک میں نگین جو کیجئے غربال

جو بادشاہ وہاں کا کہ تھا تخت اور تاج — وہ اپنی عورت کو اطفال کی ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا سارا ہند خراج — غنیم آن کے لیے اس سے اس کے شہر سے باج
وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

وہ شہ سپہر کہ انجم نمد تھی جس کی سپاہ — سو اس کی ذریۃ می کئی پیادہ ہیں بحال تباہ

سو مارے فاقوں کے مرتے ہیں چھوٹے تنخواہ کیے ہیں ہم کو ملے کیا خوراک خاص گواہ

سحر کو تب ہو جو پہنچے کڑوڑ یا کتوال

جواہرات جو تھے سو سب لٹا یک سر رہیں سو کس پہ یہ فرقے کے نوکر اور چاکر

رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر جو چھت تھی چاندی کی دیوان خاص میں یرند

سو وہ وزیر نے کی خرچ بیچ کر ٹکسال

جو بخشی آن کے مانگے سپاہیوں کی طلب تو ہے جواب کہ تھا صرف خاص امر میں جب

تو کچھ نظر نہیں پڑتا تھا فوج رکھنے کا ڈھب ہے بادشاہ فقط چتر و مورچھل پر اب

یہ جھاڑو ڈال دیا کس کے کہوں ... وال

کہاں سے دیجئے طلب اب کہاں خزینہ ہے کہ لال قلعہ میں کہہ تو کہاں دفینہ ہے

مرا بھی کہہ تو سہی، تو کہیں مہینہ ہے جو ملک تھا مرا سو سرکشوں نے چھینا ہے

جو لکھ دوں تجھ کو میں پروانہ مانے کب عمال

جو ہو سکے تو بھلا تو ان کا دکھلا دے گذشتہ سال سے برطرفی ان کو دلوا دے

نہ مانے تو، تو مرے دستخطوں سے سمجھا دے جو پھیر رکھنے پڑیں گے سوار اور پیادے

تو ان سے کہیو کہ تم کو کیا ہے حال بحال

ہے میری ڈیوڑھی کے ناظر کو تیسرا فاقہ جو محل دار ہے اس نے دیا ہے استعفا

مچایا ترکنی، کشمیرنی نے اب غوغا رہے بچارے سلاطین ان کا حال سو کیا

کسی کے مرنے کی نوبت کوئی پڑا ہے نڈھال

سنی یہ بخشی نے حضرت کی تم نے اب تقریر اب آگے جو رہے سب اہلکار اور امیر

سو وہ بلا مقصد ہی کو ملتے ہیں تحریر کہ تھی جو ملتے تھے شب کو کتنے فقیر

سو آج خالی ہوا کس طرح سے بیت المال

امیروں کے تئیں یہ سعی اور تلاش رہے ۔۔۔ کہ کون پالکی میانہ و دورباش رہے
کسی طرح سے ملے تو یہ نان و آش لیے ۔۔۔ نہ گو قنات ہو ڈیوڑھی حرم کی فاش رہے

دیوان خانے میں ہو پیکدان اور رومال

سپاہی جو رہے بے چارے انکی یاد فات ۔۔۔ کہ بیچ کر کڑی تختے وہ کھاتے تھے دن رات
ہے چھٹی چوب کی منڈی پہ انکی بھس پہ برات ۔۔۔ سنے ہیں کوچ کے دن وہ سئیس کی سو بات

کہ اس کے ہاتھ میں ہے تو برا بغل میں پال

جو گھر میں بیٹھے ہیں مفلس غریب بے نوکر ۔۔۔ انھوں کا حال تو کیا کہیے کیسے ہیں مضطر
سوائے دانۂ اشک اور انھیں نہ آوے نظر ۔۔۔ اٹھے ہیں گھر سے وہ منہ کو چھپا کے شب کو اگر

پڑے ہے ٹکڑا کوئی منہ میں جا کریں جو سوال

کیا ہے قحط نے تس پر ہر ایک رو زہلاک ۔۔۔ کہ دانہ اشک کا دیکھیں تو چھانتے ہیں خاک
ہوا ہے بسکہ حلال اور حرام سب خوراک ۔۔۔ لگیں گے آدمی کو کھانے آدمی بے باک

پڑے ہے قحط سے کوئی دن میں آدمی کا کال

جو موذی ان سے قوی تر تھے اور تھے لٹھ مرد ۔۔۔ وہ چھین نے لگے ٹکڑے غریبوں کے بے درد
لگا کے ایک سپر تیغ اور تمنچہ کی فرد ۔۔۔ گھروں میں کو ملیں دیں کچھ نہ چھوڑی تھا کہ لو گرد

پڑا انھوں کے ستم کا سبھوں پہ آکے وبال

جہان آباد نہ ہوتا کسی طرح سے تباہ ۔۔۔ جو حسرت ایسے عمل کرتے ہم نہ نامہ سیاہ
برائے مال پہ ناموس پہ رکھے جو نگاہ ۔۔۔ تو ان پہ کیونکہ نہ پہنچے بھلا غضب و اللہ

ہمارے آگے یہ آئے ہمارے ہی اعمال

سنہ ۱۱۷۳ تا ۱۲۰۱ | فدوی شاہ محسن صاحب نام محمود فخر کا بیان ہے کہ لاہوری الاصل تھے، آبرو یا ناجی کے شاگرد تھے، قریباً بیس سال گذرے کہ انتقال کیا، نواب نجیب الدولہ امیر الامراء کے عہد مختاری پر لطیف طنز اس شعر میں کیا ہے ؎

اور سب گردیاں بجوڑی تھیں　　فدوی ایک تھے نجیب گردی ہے

سنہ ۱۱۹۱ | حسن. میر غلام حسن خلف میر غلام حسین ضاحک دہلوی الاصل، اور فیض آباد کے ساکن تھے، انگریزوں کی ریشہ دوانی اودھ کی ریاست میں شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہو گئی تھی، نواب آصف الدولہ کو امور سلطنت سے باپ جیسی دلچسپی نہ تھی، اس لیے شجاع الدولہ کی آنکھ بند ہوتے ہی پہلے فیض آباد سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ بسایا، پھر دادی کی دولت پر نظر گئی، انگریزی حکومت کو اس سودے میں شریک کیا گیا، خواجہ سرا آفریں علی خاں و جواہر علی خاں جو بہو بیگم کے کار مختار تھے معتوب ہوئے، اور انگریزی فوج کی مدد سے فیض آباد سے ۱۱۹۱ء میں گرفتار کر کے لکھنؤ لائے گئے، دونوں خواجہ سرا سودا اور میر حسن کے مربی تھے جب کئی لاکھ روپیہ ان سے وصول کر لیا گیا تب رہائی ملی اس قید اور رہائی پر حسن نے صرف اپنے جذبات ہی کا اظہار نہیں کیا ہے، بلکہ عوام کا نقطۂ نظر بھی واضح کیا ہے

اس قید فرنگ کی پڑی تھی گھائی　　لی تھی ترے غم سے خلق نے کھٹوا ئی

چھوٹا نہیں اس قید سے تو ایک فقط　　گویا کہ خدا نے بند سب کی کاٹی

سنہ ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء | جرأت[1] تخلص، قلندر بخش نام، نواب شجاع الدولہ کا آخری زمانہ دیکھے ہوئے تھے، آصف الدولہ

---

[1] عندلیب طبع گلشن سخن دانی گل سر سبد گلزار معانی، سرخیل گروہ شعراء، مرزا قلندر بخش صاحب المتخلص بجرأت ولد یحییٰ خاں کہ جنوز در شاہ جہاں آباد کوچہ بنام والد بزرگوار یعنی بہ یحییٰ خان مشہور و معروف است احتیاج تکرار نیست غرض باعث نیرنگی زمانہ بعہد نواب شجاع الدولہ مرحوم و مغفور بہ لکھنؤ وارد ہستند و جنوز ہماں جا قیام دارند انچہ فیض و بیاں فن شاعری حاصل شدہ صرف از فیض توجہات مرزا صاحب معزالیہ و بہر حال فقیر ایں چنیں اشفاق و عنایات دوں ورد تذکرہ از تحریر

کی تخت نشینی پر داد و دہش تو زیادہ ہونے لگی لیکن وہ نام جو شجاع الدولہ نے مختلف معرکوں میں بہادری سے حاصل کیا تھا وہ آصف الدولہ کے بس کی بات نہیں تھی، انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے آصف الدولہ کا لطف زیست باقی نہ رہا، وزارت نواب کا مسئلہ بھی انگریز ریزیڈنٹ لکھنؤ میں بیٹھکر طے کرتے تھے، آخر بقول مورخین آصف الدولہ گھٹ گھٹ کر مرگئے، ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا متبنٰی نواب وزیر علی خان تخت نشین ہوا، اس نے امور سلطنت میں دلچسپی لینی اور فوج کی تنظیم شروع کی، انگریزوں نے خطرہ محسوس کیا، چنانچہ رزیڈنٹ نے جو مختار مطلق تھا، نواب سعادت علی خان سے ساز باز کرکے آدھی سلطنت، [illegible] اور زر خطیر حاصل کرکے ریاست نواب سعادت علی خان کو بخشدی، وزیر علی خان معزول ہوکر بنارس میں رہنے کا پابند کیا گیا، نواب سعادت علی خان اس خطرہ کو حدود سلطنت سے دور رکھنا چاہتے تھے، اس لیے کلکتہ بھیجنے کی تحریک کی، چنانچہ انگریزی ایجنٹ مقیم بنارس مسٹر چیری نے نہایت ہی تحکمانہ انداز میں یہ پیام پہنچایا، وزیر علی خان کی غیرت وحمیت نے اس کو برداشت نہیں کیا اور مسٹر چیری کو قتل کرکے انگریزی اقتدار اور نواب سعادت علی خان کے مقابلہ میں آگیا، اور بڑی شجاعت سے مقابلہ کیا، مگر آخر میں دھوکے سے گرفتار کر لیا گیا، جرأت وزیر علی خان کی حریت و آزادی اور شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کو حکومت کا اہل اور نواب سعادت علی خان کو انگریزوں کا غلام سمجھتا تھا، اس لئے وزیر علی خان کا حامی اور سعادت علی خان کا مخالف تھا، جس کا اندازہ مندرجہ رباعی اور قطعہ سے ہوگا۔

رباعی

سمجھیں نہ امیران کو اہل توقیر — انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں — بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۵) بیرون است دار صاف کمالات ذات شریفش چہ شرح دہد، ہر کمال یعنی فن شاعری ملک الشعراء، و در علم موسیقی و نجوم و کبت دوہرہ و پہیلی وغیرہ یکتائے روزگار ہستند حق سبحانہ تعالیٰ سلامت دارد (مجمع الانتخاب شاہ کمال مخطوطہ کتبخانہ انجمن ترقی اردو ہند علیگڈھ)

قطعہ

زمین پر عجب نیرِ خوش دلی — درخشاں تھا رشکِ مہِ آسماں
سو اس کو کیا داخلِ برجِ غم — کہ اس چرخ نے شعبدہ بازیاں
نہ کچھ رہنے پائی بہار اس کی آہ — عجب گل کھلا تھا یہ باغِ جہاں
مقید ہوا وہ بہ قیدِ فرنگ — جو تھا صاحبِ فوجِ اعظم نشاں
شجاعت میں تھا جو کہ یکتائے دہر — سو اب کیا وہ لاچار ہے الاماں
ہوا سارے عالم میں ایک تہلکہ — بہ لغزش زمین آئی اور آسماں
جنھوں نے لیے کی تھی کوشش وہی — اسیری سے اس کے ہوئے شادماں
ہوا بے مکاں جب کہ ایسا امیر — تو غم نے کیا آ کے دل میں مکاں
بہ فانوس زنداں ہوا وہ چراغ — جو تھا روشنی بخشِ ہندوستاں
وہ نواب حاتم وزیر علی — پڑا بس میں بے بس ہو جب ناگہاں
جو جرأت سے پوچھی میں تاریخ قید — کہا یہ ہو شورِ محشر عیاں

۱۲۲۱ھ | کمال[1] تخلص، شاہ کمال الدین عرف شاہ محمد کمال نام، عظیم آباد میں نشو و نما پائی، چودہ سال کی عمر میں باپ کی وفات کے بعد اودھ آئے، اور شاہ عطا کریم سے قصبہ سلون میں بیعت ہوئے، شاعری

---

[1] دیباچہ مجمع الانتخاب...... در ان ایام سن فقیر قریب چہاردہ رسیدہ بود شور رسید حضرت در سر ہجوم آورد و اخیا بچہ برادر کلاں را بکفالت امورات مرجوع گذاشتہ وارد فیض آباد در ابتدائے ایام وزارت نواب آصف الدولہ مرحوم گردیدہ ..... بعد انقضائے چہار سال وارد لکھنؤ گردیدہ ...... [2] تذکرۂ مصحفی: شاہ کمال الدین حسین، کمال تخلص، وطن بزرگانش کڑہ مانکپور از چندے بحلقۂ تلامذہ قلندر بخش جرأت داخل شدہ ...... عمرش از سی متجاوز خواہد بود۔

میں قائم سے مشورۂ سخن کیا اور ان کے رام پور جانے پر ان کی ہدایت سے جرأت کے شاگرد ہوئے، شعروسخن سے وابستگی جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی، تمام شعرا کے دواوین جمع کیے تھے، اور اکثر شعرا کی قصاوید بھی فراہم کی تھیں، جیسے سودا، میر حسن، قائم وغیرہ، آصف الدولہ تک جب ان کے اس ذخیرہ کی اطلاع ہوئی، تو انھوں نے دواوین کی نقل کی خواہش کی، چنانچہ کمال نے ایک سو سے زائد دیوان دیدیئے، جب وہ نقل ہو کر آگئے تو مزید دواوین دیے، مگر اسی کے درمیان میں نواب کا انتقال ہو گیا، اور کمال کا سرمایۂ سخن جو نایاب تھا، ضائع ہو گیا، نواب آصف الدولہ کے مرنے پر یہ بھی انقلاب حکومت سے متاثر ہوئے اور آخر حیدرآباد کی قدر سخن کھینچکر لے گئی، ۱۲۵۵ھ تک زندہ تھے، تذکرہ مجمع الانتخاب اور کلیات قلمی موجود ہیں۔ نواب وزیر علی خاں کی معزولی کو انھوں نے بہت زیادہ محسوس کیا، اور چونکہ ان کی گرفتاری مہاراجہ جے پور کے یہاں عمل میں آئی تھی، اس لیے کمال نے ایک مسدس میں مہاراجہ کے کردار پر بھی سخت تنقید کی ہے کہ پناہ دینے کے بعد حوالگی راجپوتوں کی شان سے بعید تھی، ...... ان کو انگریزی اقتدار سے سخت نفرت تھی، اسی بنا پر وہ حیدرآباد چلے گئے تھے، ایک محب وطن کی حیثیت سے ان کا کردار نہایت بلند نظر آتا ہے، ان کی نگاہیں وہ خطرات دیکھ رہی تھیں، جن کو ہندوستانی نواب اور راجہ محسوس نہیں کر رہے تھے، اپنے دلی جذبات کا اظہار انھوں نے مسدس میں کیا ہے، شاہ عالم کی حیثیت ان کی نظر میں شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، اور مرہٹوں اور سکھوں کے مقامی حملوں کو وہ ملک کے حق میں مضر سمجھتے تھے، ان تمام خیالات کا اندازہ مسدس سے ہوتا ہے جس کے بعض بند یہ ہیں

ہے سیتلا کا تو خر اے جے نگر کے راجہ — تجھ سے تو خوک بہتر اے جے نگر کے راجہ
ہے پاپ تیرے سر پر اے جے نگر کے راجہ — تونے دیا دیا گھر اے جے نگر کے راجہ
لعنت خدا کی تجھ پر اے جے نگر کے راجہ

تھا مردجان کر وہ تجھ پاس آ آیا — نامرد جانتا تو واں جاتا رس کا.....

پربیکسی پہ اس کی تو نے نہ رحم کھایا قید فرنگ میں اور لیکر کے زہر کھایا
لعنت خدا کی تجھ پر اسے بے جگر کے راجہ

شہرآشوب

زبسکہ ہے فلک دوں پرست نا ہنجار رہے ہے نت نجباؤں کے درپئے آزار
ہر ایک شخص ہے ہاتھوں اسکے زار و نزار عجب طرح سے گذرتا ہے آہ لیل و نہار
نہ چین جی کو کسی کے، نہ ایک جا ہے قرار

جو شخص اہل کمال اور ہیں گے اہل ہنر وہ فکر قوت میں رہتے ہیں مضطر و ششدر
کہ تن کو جان کی، نہ جان کو ہے تن کی خبر پھرا تا ہر کس و ناکس کے، ان کو ہے در در
وزیر و شاہ سے ملنا تھا جن کو ننگ و عار

نہ ان کو ملتی ہے طفل صغیر تک بھی خورش نہ سر پہ ٹوپی ہے ثابت، بدن پہ نہ پوشش
جب ان پہ ہووے ہے کچھ کچھ گرسنگی کی خلش تب اٹھ کے گھر سے جو کرتے ہیں رزق کی کوشش
تو کھا کے زک، وہ پھر آتا ہے گھر میں بس ناچار

جو تنگ ہو کسی عمدہ سے جا کرے ہیں سوال تو منہ پھرا کے وہ بیٹھے ہو اور پھلا کر گال
لگے ہے کہنے وہ اپنا ہی تنگیٔ احوال زباں پہ لاتا ہے اور یہ مثل وہیں فی الحال
کروں میں کیا کہ ہے یاں اک انار و صد بیمار

وزیر و شاہ جو ہیں ان کے ملک کا یہ ڈھنگ کہ اپنے بخت سے رہتی ہے ان کو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہیں گرفتار، یاں بقید فرنگ شکوہ و عزت شوکت وہاں کیا ہے شاہ کو ننگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال انکا جز ادبار

جہاں تھے بجتے کے طبل اور بوق کے دستور　　بجے ہے اب وہاں ناقوس اور آہ طنبور
دریغ ایسا ہو برباد خانۂ تیمور　　کہ ریزہ چیں تھے سدا جس کے قیصر و فغفور
بگڑ گیا ہے زمانے کا ہائے کیا اطوار

وہی ہے شہر اور ہے وہی یہ ہندوستاں　　کہ جس کو رشکِ جہاں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہو کے سب ویراں　　نظر پڑے ہے بس اب صورتِ فرنگستان
نہیں سوار رہے یاں، سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبت و شہنائی جھانجھ کی تھی صدا　　فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت کا کیا رتبا　　ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار

نہ ہووے دیکھ کے کیونکر دل اپنا اب مغموم　　ہو جب کہ جائے ہما، آہ آشیانۂ بوم
وہ چھپے تو بس اس ملک میں ہیں سب معلوم　　فرنگیوں کے جو حاکم تھے ہو گئے محکوم
تو ہم غریبوں کی پھر کیا ہے یاں قطار و شمار

رئیس شہر جو ہے اس کی اب ہے یہ اوقات　　رہے ہے شوقِ الٰہی میں محو وہ دن رات
نہ عزم ہے نہ اسیری کی اس کو تشویشات　　خبر نہ ملک کی اس کو، نہ کام کی کچھ بات
رہے ہے اور مزے کی شراب میں سرشار

جو جانشین تھا ہوا بعد آصف الدولہ　　کہ خوش تھے جس سے سب ادنیٰ سے اور تا بہ علا
نمک حراموں کا ہووے خدا کرے کہ بُرا　　دیا تھا قید میں ظالم نے اس کو آہ پھنسا
نکل گیا یہ وہ مردانگی سے بس اک بار

وہ یعنی صفحۂ عالم پہ جس کا ہے گا نام　　لکھا وزیر علی خاں بہادر اس کا نام

رہا تو چند سے یہ کچھ کر گیا ہے ایسا کام کہ یاد رہے گا وہ کام تا بروز قیام
نہیں تجلی کو حق کی ہے یہ ہے کچھ تکرار

<u>۱۲۱۲ھ</u> | وزیر تخلص نواب وزیر علی خان متبنائے نواب آصف الدولہ، ۱۲۱۲ھ؁ میں تخت نشین ہوئے، اور چند ماہ بعد معزول ہو کر بنارس میں نظر بند ہوئے، وہاں سے مسٹر چیری ایجنٹ کو قتل کر کے انگریزوں اور اودھ کی فوجوں سے مقابلہ شروع کیا، اور ایک مدت تک جنگلوں اور پہاڑوں میں لڑتے بھڑتے آگرہ پہنچے، اور شیخ سلیم چشتی کے مزار کی زیارت کر کے جے پور گئے، مہاراجہ جی نے پناہ دینے کی ذمہ داری لی مگر آخر میں انگریزی حکومت کے دباؤ سے مجبور ہو کر وزیر علی خان کو اس وعدہ پر حوالہ کر دیا کہ جان سے نہ مارا جائے، اور پاؤں میں بیڑیاں نہ ڈالی جائیں، اور ۱۸۰۰ء میں نواب کو مقفل پالکی میں کلکتہ بھیجا گیا، اور قلعہ کلکتہ کی ایک تنگ کوٹھری میں قید کر دیا گیا، ۱۷ سال ۳ ماہ ۴ دن قید میں رہنے کے بعد چھتیس سال کی عمر میں ۱۸۱۷ء میں قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے رہائی پائی، یہ غزل اسیری کی یادگار ہے جو مرثیہ بھی ہے اور سیاسی مرقع بھی ؎

جوں سبزہ رندے اگتے ہی پیروں کے تلے ہم اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
روتے ہیں شب و روز اسی فکر سے یارب غنچے کی طرح باغ میں گل ہو نہ کھلے ہم
ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سایے کے تلے ہم
جس گل پہ نظر کرتے ہیں آتا ہے نظر خار گلشن کے چلے جاتے ہیں کانٹوں میں رلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے نرگس کے نہالوں میں تھی آصف کے پلے ہم
افسوس کہ اس دل کا کنول کھلنے نہ پایا کوئی دن کو چلے جاتے ہیں ماٹی کے تلے ہم
اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہیں فریاد کریں کس سے قسمت کے جلے ہم
دکھ اپنا عبث کہتے ہیں بیدرد کے آگے بے بس جو جہاں اگرے ہرگز نہ ٹلے ہم
زندان مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں رہتے تھے وزیری کی جو دن رات سلے ہم

امام ابوحنیفہؒ کی فقہ
ترک حدیث کے الزام کا جواب

از مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی

اس مضمون کی تیاری میں مصر کے مشہور عالم اور محقق استاذ ابوزہرہ کی کتاب "ابوحنیفہ، حیاتہ و عصرہ و آراؤہ و فقہہ" سے کافی مدد لی گئی ہے۔ (ض)

فقہ حنفی حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف جو فقہ یا مسلک و مذہب منسوب ہے، اسے "فقہ حنفی" یا "مذہب حنفی" کہتے ہیں، یہ مذہب مذاہب اربعۂ اسلامیہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) میں سب سے قدیم ہے۔

نشر و اشاعت اس مذہب فقہ کی نشو و نما امام صاحب کے وطن کوفہ ہی میں ہوئی لیکن رفتہ رفتہ وہ عراق کے تمام شہروں میں پھیل گیا، مذہب حنفی کا دائرہ بہت وسیع ہے اور تمام مذاہب میں سب سے زیادہ شہرت و قبولیت اسی مذہب کو حاصل ہے، نواحی بغداد، مصر، روم، بلخ، بخارا، بلاد فارس اور ہندوستان میں کثرت سے اس فقہ کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔[1]

امام صاحب کے بارہ میں تین نقطہائے نظر امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں عام طور پر تین طرح کے خیالات لوگوں میں پائے جاتے ہیں (۱) ایک جماعت کا خیال ہے کہ انھوں نے بالکل جدید فقہ کی بنیاد ڈالی، جو سلف کے معتقدات فقہ کے یکسر خلاف ہے،

---

[1] یہ تفصیلات "معارف" کے ایک ترجمہ مضمون سے ماخوذ ہیں۔

(۲) دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ وہ مقلد محض ہیں اور علمائے کوفہ بالخصوص امام ابراہیم نخعی کے دائرۂ فقہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔

(۳) تیسرے طبقہ کی رائے ہے کہ امام ابوحنیفہؒ عراق کی فقہ کے متبع ہیں، وہ تخریج اور تفریع مسائل کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ پر مجتہد بھی ہیں، ان کا طریقۂ فکر اصولی حیثیت سے ابراہیم نخعی کے طریقۂ فکر و نظر کے موافق ہے، مگر آراء و افکار میں بکثرت اختلافات موجود ہیں۔[۱]

پہلے گروہ کے خیال کو تو صرف اتہام کہا جا سکتا ہے لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی کسی طرح عدالت و دیانت پر مبنی نہیں۔[۲] کیونکہ امام اعظم نے بہت سے مسئلوں میں اہل کوفہ سے اختلاف کر کے علمائے مکہ و مدینہ کے مسالک کو اختیار کیا ہے، تیسرے گروہ کا مسلک اصحابِ اعتدال کا مسلک ہے، جو ہمارے نزدیک بھی درست ہے۔

اہل عراق کو اہل رائے کہنے کا سبب | عام طور پر مشہور ہے کہ اہل عراق کو حدیثیں بہت کم ملیں، اس لیے وہ قیاس زیادہ کرتے ہیں، اور قیاس میں مواظبت و مداومت کی وجہ سے انھیں اس میں بڑی مہارت ہوگئی ہے؛[۳] امام صاحبؒ کی مہارت قیاس میں کسی کو کیا شبہہ ہو سکتا ہے لیکن بعض کوتاہ نظر لوگوں کی جانب سے ان پر "ترک حدیث" اور "حدیث پر قیاس کو ترجیح دینے" کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے اور ہم اس خیال کی تردید آگے چل کر کریں گے، یہاں صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ اہل عراق کو اہل رائے اور اہل حجاز کو اہل حدیث کہنے کا سبب کیا ہے؟

علامہ خضری فرماتے ہیں کہ

"اہل حدیث شریعت میں علل و اسباب کا لحاظ نہیں کرتے اور اہل عراق شریعت میں علل و اسباب کی جستجو کرتے ہیں اور ان کے لیے قواعد و ضوابط کا تقرر کرتے ہیں، اور اس طرح احکام

---

[۱] ابوحنیفہ لابی زہرہ [۲] حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔
[۳] مقدمۂ ابن خلدون

ومسائل کا استخراج و استنباط بھی کرتے ہیں، لیکن حدیث کا انکار نہیں کرتے، بلکہ اہل حدیث ہی کی طرح حدیث اور دیگر نصوص کو مانتے ہیں"[۱]

اس اصول کے لحاظ سے امام ابوحنیفہؒ ہی نہیں، بلکہ ربیعۃ الرائےؒ، امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور ابویوسفؒ سب اہل الرائے کہلائیں گے، حالانکہ یہ سب محدث بھی ہیں[۲]۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اہل رائے کہنے سے تارک حدیث ہونا لازم نہیں آتا، ورنہ ان تمام اساطین حدیث کو بھی تارک حدیث قرار دینا پڑے گا، جو "امیر المومنین فی الحدیث" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، اور خود امام اعظم پر بھی "ترک حدیث" اور "حدیث پر قیاس کی ترجیح" کا الزام لگانا بڑی جسارت اور دیدہ دلیری ہوگی، کیونکہ انھوں نے عطاء بن ابی رباح، سلیمان بن یسار، ہشام بن عروۃ، عمرو بن دینار وغیرہ علمائے مدینہ سے حدیثیں حاصل کی ہیں، اور ان سب سے بڑھ کر حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے مولی نافع سے جن کی وہ روایتیں جو ان کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہیں، موطا امام مالک کی ساری روایتوں پر تفوق رکھتی ہیں، دوسری طرف امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں بھی محدثین کی ایک جماعت ہے، چنانچہ یحییٰ بن سعید، ابن مبارک اور امام بخاری کے استاذ علی بن المدینی وغیرہ، امام ابوحنیفہؒ کے خرمن علم کے خوشہ چین ہیں[۳]۔

علامہ ذہبی جیسے محدث نے جو اپنے تذکروں میں صرف اکابر محدثین کا ذکر کرتے ہیں، امام اعظم کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے[۴]۔

یہ بھی کہنا صحیح نہیں ہے کہ تقلیل روایت اہل عراق کی خصوصیت ہے، اس لیے امام ابوحنیفہؒ اہل رائے ہیں، اور روایتوں کے لحاظ سے ان کا ماخذ کمزور ہے، کیونکہ خلفائے اربعہ سے بھی تو بہت کم روایتیں مروی ہیں، حالانکہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

اس سے بھی امام ابوحنیفہ کے حفظ حدیث پر حرف نہیں لایا جاسکتا کہ ان سے صحاح ستہ میں کوئی روایت

---

[۱] التاریخ التشریع الاسلامی [۲] سیرۃ النعمان [۳] ایضاً [۴] ایضاً

نہیں ہے، اس لیے کہ امام شافعیؒ کی بھی جنھیں "ناصر الحدیث والسنۃ" کہا جاتا ہے کوئی روایت صحاح میں نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین اہل رائے کی روایتیں ہی نہیں کرتے تھے، چنانچہ امام ابو یوسفؒ کے متعلق جنھیں اہل حدیث بھی مانتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ ان سے روایت نہ کرنے کا سبب غلبۂ رائے ہے۔[1]

البتہ امام ابو حنیفہؒ کو فقہ میں جو درک حاصل ہے وہ حدیث میں نہیں، اس لیے ان کی حقیقی منزلت کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی فقاہت سے بحث کی جاتی ہے، امام شافعیؒ کا مشہور مقولہ ہے "الناس عیال فی الفقہ علی ابی حنیفۃ"

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ امام ابو حنیفہؒ کے استنباطات و مسائل قیاس پر مبنی نہیں بلکہ نصوص اور احادیث پر مبنی ہوتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ کا طریقہ استنباط مسائل | ابو زہرہ مصنفہ "ابو حنیفہ، حیاتہ وعصرہ، آراؤہ وفقہہ" نے تین روایتیں امام صاحب کے بیان کے مطابق نقل کی ہیں جن میں سے ایک روایت بہت مشہور ہے، جسے عام طور پر اکثر اصحاب تصنیف و تالیف نقل کرتے ہیں، اور ابو زہرہ نے اسے "تاریخ بغداد" سے نقل کیا ہے:

"میرا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا کی کتاب کو دیکھتا ہوں اور اس سے مسئلہ اخذ کرتا ہوں، اگر اس میں کوئی حکم نہیں ملتا تو رسول اللہ کی سنت کو لیتا ہوں اور اگر اس میں بھی کوئی فیصلہ نہیں پاتا تو آپ کے اصحاب کے قول کو اختیار کرتا ہوں، اور بوقت اختلاف ان میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں لے لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں لیکن صحابی کے قول کے علاوہ کسی کے قول کو نہیں اختیار کرتا، مگر جب معاملہ صحابہ سے اتر کر ابراہیم، شعبی، حسن، ابن سیرین، عطا اور سعید تک پہنچتا ہے تو جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا تھا ویسے ہی میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔"

---

[1] لسان المیزان

باقی دو روایتیں ابن عبد البر کی انتقاء سے ماخوذ ہیں، ان سب روایتوں کا قدر مشترک یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے فقہی دلائل سات چیزوں پر منحصر ہیں،

(۱) کتاب (۲) سنت (۳) اقوال صحابہ (۴) اجماع (۵) قیاس (۶) استحسان (۷) عرف،

ان سات چیزوں کو جو شخص اپنا ماخذ قرار دے اس کے استنباط کی بنیاد کتنی پختہ اور محکم ہوگی، اس سلسلہ میں سب سے پہلے "حدیث" کے متعلق امام صاحب کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی، کہ وہ بھی احادیث کے پابند ہیں اور قیاس کو حدیث پر ترجیح نہیں دیتے،

حدیث | جب ہم امام ابوحنیفہؒ کے بارہ میں یہ سنتے ہیں کہ ان کے مخالفین انتہائی عجز ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ وہ قیاس کو حدیثوں پر ترجیح دیتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے، اس کی تردید کیلئے صرف وہ مکالمہ ہی کافی ہے جو امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کے درمیان ہوا تھا،

امام اوزاعی۔ (امام صاحب سے) آپ لوگ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کیوں نہیں کرتے۔

امام ابوحنیفہؒ۔ اس لیے کہ اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت نہیں،

امام اوزاعی۔ کیوں نہیں۔ مجھ سے زہری نے اور زہری نے سالم سے اور سالم نے اپنے باپ عبداللہ بن عمرؓ سے اور ابن عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نماز شروع کرتے وقت، رکوع کے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے،

امام ابوحنیفہ۔ تو پھر مجھ سے بھی تو حماد نے اور انھوں نے ابراہیم سے اور ابراہیم علقمہ و اسود سے اور علقمہ و اسود نے عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں کو صرف نماز شروع کرتے وقت اٹھاتے تھے،

امام اوزاعی۔ سبحان اللہ! میں تو زہری عن سالم عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت بیان کر رہا ہوں اور

آپ حماد اور ابراہیم کے سلسلہ سے۔

امام ابو حنیفہ۔ حماد زہری سے زیادہ فقیہ اور ابراہیم سالم سے بڑھ کر فقیہ ہیں، اور علقمہ بھی ابن عمرؓ سے کم نہیں، اگرچہ وہ صحابی ہیں، اور عبد اللہ بن مسعود کا تو کہنا ہی کیا؟

امام اوزاعی صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے[1]۔

خود امام ابو حنیفہؒ کی زندگی میں ان کے خلاف اس قسم کی شہرت ہو گئی لیکن امام صاحب کے اس وقت کے بعض ایسے بیانات سے ایسے فاسد خیالات کی پوری تردید ہو جاتی ہے، ایک مرتبہ فرمایا:

"بخدا اس شخص نے ہم پر بہتان لگایا جو یہ کہتا ہے کہ ہم نص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں، کیا نص کے بعد بھی قیاس کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے[2]"

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ارشاد ہوتا ہے:

"جب ہم مجبور ہو جاتے ہیں، اور کتاب و سنت اور صحابہ کے فیصلوں میں کوئی دلیل نہیں پاتے تو اس وقت مسکوت عنہ کو منطوق پر قیاس کرتے ہیں[3]"

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (آپ پر میرے ماں باپ قربان) کے آثار سر آنکھوں پر، ہمیں اس کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ ان کی مخالفت کریں، ہمارا مختار مسلک وہی ہے جو آپ کے اصحاب سے منقول ہوا ہے جو ان کے علاوہ دوسرے لوگوں سے منقول ہے تو وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں[4]"

کیا ان اقوال کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ حدیثوں کے (نعوذ باللہ) منکر ہیں، یا کم از کم قیاس کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔ درحقیقت امام صاحب احادیث کو کبھی ترک نہیں کرتے، البتہ اصولِ شریعت کے معارض یا ناقضِ قرآن حدیثیں پاتے ہیں تو ان کے قبول کرنے میں ضرور تامل فرماتے ہیں،

---

[1] التاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۶۵ ابو حنیفہ لابی زہرہ

لیکن اس کو قیاس کے مقابلہ میں ترک حدیث سے کیا تعلق۔

نفس حدیث کی باعتبار رواۃ تین قسمیں ہیں: (۱) متواتر (۲) مشہور (۳) احاد۔

امام ابو حنیفہؒ اول الذکر دونوں قسموں کو حجت مانتے ہیں، اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ متواتر سے علم یقینی اور مشہور سے علم ظنی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن حجیت میں دونوں ہی کو یکساں سمجھتے ہیں، اسی لیے مشہور سے بھی کتاب اللہ پر زیادتی کو مانتے ہیں، رہیں اخبار احاد تو اسے عام فقہاء کی طرح امام صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ اس زمانہ میں کثرت سے حدیثیں وضع کی گئی تھیں، اس لیے وہ اس قسم کی روایتوں کو کتاب وسنت اور اصول دین پر مستزاد ماننے کے لیے تیار نہیں، اور یہی صحابہ کا بھی عام طریقہ تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے جب کوئی حدیث پیش کی جاتی تو وہ اس پر شہادت طلب کرتے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فاطمہ بنت منذر کی حدیث کو بھی اسی لیے رد کر دیا تھا کہ اس سے کتاب اللہ کا ترک لازم آتا تھا۔

حنفیہ کے مخالفین ایک بے بنیاد اصل قائم کرکے ان پر ترک حدیث کا الزام لگاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ خبرِ واحد پر رائے کو ترجیح دینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ رائے کی گنجائش تو اس وقت نکلتی ہے جب کوئی نص موجود نہ ہو، اور جب نص موجود ہو تو پھر اسے رد کرنے کے کیا معنی؟ اگرچہ وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو، نیز خبر واحد اور قیاس جب دونوں ہی ظنی ہیں، تو پھر اس ظن کو ترجیح دینا چاہیے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، اور یہی آنحضرت صلعم کے اصحاب کا طریقہ تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مزارعت کے باب میں رافع بن خدیجؓ کو پاکر اپنے مسلک سے رجوع کر لیا تھا،

اصل حقیقت | ہمارا خیال ہے کہ اہل حدیث اور امام احمد کے سوا تقریباً تمام فقہاء صحابہ اور تابعین بھی خبر احاد کو بسا اوقات صرف اس لیے رد کر دیتے ہیں کہ ان کے پاس قرآن و سنت اور دوسرے نصوص سے ایک اصول اور ضابطہ متعین ہوتا ہے، حضرت عائشہؓ نے (۱) المیت لیعذب ببکاء اہلہ (حدیث)

کو "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" والی آیت سے رد کر دیا تھا، حضرت امام مالکؒ نے "من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیہ" (حدیث) کو اور شوال کے چھ روزوں کے متعلق صحیح حدیث کو سد ذرائع کا اعتبار کرکے رد کر دیا، اسی طرح امام دار الہجرت اس حدیث کو بھی نہیں تسلیم کرتے جس میں کہا گیا ہے کہ "کتا اگر کسی برتن میں اندر منہ ڈال دے تو اسے سات مرتبہ دھونا چاہیے"۔ ابن عربی کا بیان ہے کہ یہ حدیث دو اصولوں سے معارض ہے۔[1]

یہی حال امام ابوحنیفہؒ کا بھی ہے کہ وہ کبھی نفس قیاس کی وجہ سے حدیث کو نہیں رد کرتے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے کہ نماز میں قہقہہ لگانے سے نماز اور وضو دونوں ٹوٹ جاتے ہیں، حالانکہ خارج صلوٰۃ میں قہقہہ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اسی لیے دوسرے فقہا خارج صلوٰۃ پر داخل صلوٰۃ کو بھی قیاس کرتے ہیں اور ان کے نزدیک صلوٰۃ میں قہقہہ لگانے والے کا وضو نہیں ٹوٹیگا، البتہ نماز ٹوٹ جائیگی، مگر امام صاحب نے خبر واحد اور مرسل روایت کا لحاظ کرکے قیاس کا اعتبار نہیں کیا،

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، حالانکہ از روے قیاس روزہ کو ٹوٹ جانا چاہیے لیکن امام صاحب نے خبر واحد کو قیاس پر مقدم کیا، اور فرمایا لولا الروایت لقلت بالقیاس، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قیاس کی وجہ سے خبر واحد کو رد کر دیتے ہیں مگر یہ اسی وقت جب ان کے نزدیک کتاب وسنت کی روشنی میں کوئی اصل موجود ہوتی ہے، چنانچہ حدیث مصراۃ، حدیث قرعہ اور بیع عرایا وغیرہ کے سلسلہ میں انھوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے،

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ امام صاحب خبر واحد پر قیاس کو صرف ضرورۃً مقدم کرتے ہیں، باقی نفس قیاس سے خبر واحد کے معارضہ کے وقت ان کا یہ قول گذر چکا ہے کہ لولا الحدیث لقلت بالقیاس۔

امام صاحب سے خبر واحد کی جہاں بغیر کسی دلیل یا نص کے مخالفت ثابت ہے، وہاں وہ توجیہات قطعاً صحیح نہیں ہیں، جو احناف بیان کرتے ہیں، ایسے مواقع پر ہم کو یہ کہکر خاموش ہو جانا چاہیے کہ ممکن ہے انھیں حدیث کی خبر نہ پہنچی ہو، اس میں انکی کوئی تنقیص نہیں ہے کہ وفوق کل ذی علم علیم،

---

[1] یہ تفصیلات ابو زہرہ کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

قول صحابی امام صاحب کے استنباط کا تیسرا طریقہ خود ان کے بیان کے مطابق "قول صحابی" ہے اور قیاس اور قول صحابی کے معارضہ کے وقت قول صحابی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن مخالفین نے یہ ٹھکر بڑی دو وقد کی ہے کہ امام صاحب "قول صحابی" پر قیاس کو مقدم سمجھتے ہیں، جیسے امام ابو یوسفؒ اجیر مشترک کو ضامن قرار دیتے ہیں، اور یہی حضرت علیؓ سے بھی مروی ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے قیاس کی وجہ سے اس "اثر صحابی" کو رد کر دیا ہے لیکن اس بارہ میں صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ یا تو انھیں حضرت علیؓ کے فتوے کی خبر ہی نہ رہی ہوگی۔ یا ان کے پاس دوسرے دلائل یا کسی اور صحابی کا فتوی رہا ہوگا، ورنہ اگر ان کا مستقل طریقہ وہی ہوتا تو جو مخالفین بیان کرتے ہیں، تو پھر غلام کے امان کا عہد دے دینے کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ کا فتویٰ معلوم ہو جانے کے بعد وہ اپنے سابق قول سے رجوع کیوں فرماتے۔

اجماع استخراج مسائل کا چوتھا طریقہ ان کے نزدیک اجماع ہے جس پر کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ اجماع کو ایک اصل قرار دیتے ہیں، اور کبھی اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

قیاس یہ امام ابوحنیفہؒ کا وہ طغرائے امتیاز ہے کہ جس میں ان کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں، امام صاحب کی فقاہت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ان کی طرف ساٹھ ہزار مسئلے منسوب ہیں،

امام صاحب مسائل کی جس قدر تخریج اور تفریع کرتے ہیں وہ ایک معروف اور معلوم امر ہے، ابراہیم نخعی وغیرہ فرضی اور تقدیری مسئلوں میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ نے بیشمار فرضی اور امکانی مسئلے پیدا کیے چنانچہ مشہور ہے کہ امام قتادہؒ جب بغداد تشریف لائے تو امام ابوحنیفہؒ نے ان سے ایک فرضی سوال کیا، انھوں نے کہا:

قتادہ۔ ویحلک اوقعت ھذہ المسئلۃ۔ یعنی کیا یہ مسئلہ پیش آیا ہے؟

امام ابوحنیفہؒ۔ نہیں:

قتادہؒ۔ تو کیوں پوچھتے ہو؟

امام ابوحنیفہ۔ ہم نزول مصائب سے پیشتر ہی بچنے کی فکر کرتے ہیں۔[1]

یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کے حلقۂ درس میں "ارأیت لو کان کذا وکذا" کی صدائیں بہت بلند ہو

استحسان | چھٹی چیز استحسان ہے جس پر امام شافعیؒ نے امام اعظم کی سخت مخالفت کی ہے، اور مخالفین کا

ہے کہ اس اصل کے صرف امام ابوحنیفہؒ قائل ہیں، حالانکہ امام مالکؒ کے یہاں استصلاح (مصالح مرسلہ) او

اور خود امام شافعیؒ کے یہاں استدلال بھی تقریباً یہی چیز ہے۔[2]

استحسان میں امام صاحب کو یدطولیٰ حاصل تھا، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب تک امام صاحب

قیاس کرتے ہم لوگ ان سے خوب مباحثہ کرتے۔ لیکن جب وہ کہتے کہ میں استحسان کرتا ہوں تو

لوگ خاموش ہو جاتے۔[3]

استحسان شریعت کے ماورا کوئی چیز نہیں، بلکہ یہ امام ابوحنیفہؒ کے فقیہانہ مرتبہ پر ایک

دلیل ہے، کیونکہ استحسان کی تعریف یہ ہے کہ "موجب قیاس سے اس سے بڑے قیاس کی طرف

اور علامہ کرخی کی تعریف نہایت جامع ہے:۔

"مجتہد کسی مسئلہ میں کسی قوی دلیل کی وجہ سے اس طرح کا فیصلہ کرنے سے باز آجائے جس طرح

کا فیصلہ وہ اس کے نظائر میں کر چکا ہے۔"

اسے مثال سے یوں سمجھیے کہ شکاری پرندوں کا جھوٹا پانی پاک ہے، حالانکہ ان کا گوشت شک

چوپایوں پر قیاس کر کے ناجائز ہے، اس لیے جب شکاری چوپائے کا جھوٹا پانی ناپاک ہے تو قیاس

یہ ہے کہ شکاری پرندوں کا جھوٹا بھی ناپاک ہی ہو، لیکن استحسان اس کی اجازت نہیں دیتا، کیو

درندے جانوروں کے جھوٹے میں لعاب لگا ہوتا ہو مگر شکاری پرندے چونکہ مناقیر (چونچوں) سے

پیتے ہیں اس لیے پانی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، غور فرمایئے، ایک ظاہر بین تو امام صاحب پر ا

۱؎ ابوحنیفہ لابی زہرہ بحوالہ تاریخ بغداد ۲؎ المتاریخ التشریع الاسلامی

کیے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن جب وہ اس استحسان پر غور کرے گا، تو اس کی نگاہ سے حجاب اٹھ جائے گا اور امام صاحب کی غیر معمولی فقاہت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا،

عرف | یہ اصل بھی ایک فقیہ کے ضرور پیش نظر رہنی چاہیے، اسی لیے امام صاحب اس کا بھی لحاظ کرتے ہیں، چنانچہ علامہ سرخسی "مبسوط" میں فرماتے ہیں:

الثابت بالمعرف کالثابت بالنص — عرف سے جو ثابت ہو وہ نص ہی سے ثابت ہونے والے کی طرح ہے۔

اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔

مکتوب امریکہ

یہ مکتوب کئی مہینے ہوئے آیا تھا، مگر کاغذات میں پڑا رہ گیا تھا، اس میں بہت سی مفید باتیں ہیں، اس لیے اب اسکو شائع کیا جاتا ہے،

نیویارک، مورخہ ۵ ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

مکرمی جناب مدیر صاحب، سلام و رحمۃ۔

بہت دنوں سے خواہش تھی کہ آپ کو خط لکھوں، لیکن مکروہات زمانہ اور مصروفیات نے مہلت نہ دی جب میں کلکتے میں تھا تو آپکا مجلہ معارف باقاعدہ اور بلاناغہ پڑھتا تھا اور اس سے مستفید ہوتا تھا جون ۱۹۵۳ء میں کلکتہ چھوڑا، اس کے بعد سے آج تک اسکے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا معلوم نہیں کس حال میں ہے، غلطی یہ ہوئی کہ یہاں آنے سے پہلے معارف کا چندہ اور اپنا پتہ نہ بھجوادیا، نتیجہ یہ ہوا کہ معارف آنا بند ہو گیا،

امریکہ میں بھی مسلمان ہیں، ان کی تعداد معلوم نہیں کتنی ہے، سب سے زیادہ مسلمان ڈٹروئٹ میں ہیں، یہ وہ عرب ہیں جو دوسری جنگ عظیم کے بعد مہاجرین کی حیثیت سے یہاں آکر بس گئے، ویسے مشرق وسطیٰ کے بہت سے سفارت خانے واشنگٹن میں ہیں، ان میں کام کرنے والے بہت سے مسلمان ہیں، شمالی امریکہ کی اکثر ریاستوں میں مسلمان رہتے ہیں، سنا ہے کہ کینیڈا میں کوئی مقام البرٹا ہے، جہاں بہت سے مسلمان آباد ہیں، شیکاگو میں بھی مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے، ان میں ۱۵ امریکی بھی ہیں جو مشرف باسلام ہو گئے ہیں، امریکہ میں شاید سب سے پہلی مسجد البرٹا میں کینیڈا کے مسلمانوں نے بنائی، شیکاگو میں بھی ایک چھوٹی سی مسجد ہے، ڈٹروئٹ میں بھی ایک مسجد بن رہی ہے، واشنگٹن میں جو خوبصورت مسجد بن رہی ہے اس کا حال آپنے ضرور سنا ہوگا، ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی،

دیکھکر روح تازہ ہو جاتی ہے، سنا ہے کہ اس سال عیدین کی نماز اس میں ہوئی، اس مسجد میں امریکہ کے مرکز اسلامی کا دفتر بھی ہے، جس کے نگران ڈاکٹر حبیب اللہ ہیں، نیویارک میں بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو مستقل بس گئے ہیں یا تاجر کی حیثیت سے یہاں رہتے ہیں لیکن مسلمانوں سے زیادہ عیسائی عرب ہیں جو لبنان اور شام کے دوسرے حصوں سے یہاں آکر بس گئے ہیں، مسلمانوں سے ان کے تعلقات بڑے اچھے ہیں اور کئی عربی اخبار اس دوستانہ تعلق کے نتیجہ میں نکلتے ہیں، آئندہ امریکہ کے مسلمانوں کے بارے میں ایک مختصر مضمون قلمبند کرنے کا ارادہ ہے،

یہاں مختلف یونیورسٹیوں میں اسلامی تاریخ پڑھائی جاتی ہے لیکن امریکہ شرق وسطیٰ کی موجودہ تاریخ سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے، اس کی عظمت رفتہ سے اسکی دلچسپی برائے نام ہے، یہاں کی لائبریریوں میں عربی اور فارسی کے مخطوطات بھی ہیں، جو زیادہ تر مصر، جرمنی اور فرانس سے خریدے گئے ہیں، ان مخطوطات میں بھی وہ ایرانی آرٹ اور مصوری سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، میں نے چند لائبریریوں میں کتب فقہ، تصوف اور حدیث کے نادر مخطوطات بھی دیکھے، اور ان میں بعض کے مائکروفلم میرے پاس ہیں، اس خط کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپکے ناظرین میں سے اگر کوئی صاحب ان پر کام کرنا چاہیں تو انھیں آپ میرا پتہ بتادیں، میں انھیں مائکروفلم بھجوادوں گا، میں ناظرین معارف کی توجہ ایک مختصر لیکن نادر قلمی نسخے کی طرف مبذول کراتا ہوں، اس کتاب کا نام ہے "القول التام فی فضل الرمی بالسہام" یہ محمد بن عبد الرحمن الشافعی کا دس ورق کا مختصر رسالہ ہے، اسکی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سماعت کے نوٹ اور ان بزرگوں کے نام بھی ہیں، جنھوں نے مصنف سے یہ کتاب براہ راست سنی یا پڑھی تھی، اور مصنف نے ان کو روایت کرنے کی اجازت دی تھی، اس کا مائکروفلم بھی میرے پاس ہے، میں پہلے خود اس پر کام کرنا چاہتا تھا لیکن مصروفیت اتنی ہے کہ نہ پوچھیے، اگر معارف اسے شائع کردے تو کیا کہنا، اس کا موضوع بھی بہت اہم ہے اور کتاب مختصر ہے، اس لیے معارف میں چھاپنے میں دقت نہ ہوگی، میں آجکل مسلسل سفر میں ہوں، میرے کاغذات اسوقت میرے پاس نہیں ہیں، میں کیمبرج مستشرقین کی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کل روانہ ہو جاؤں گا، اگر کوئی صاحب اس پر کام کرنا چاہیں تو میں اسکی تفصیل بھی لکھ سکتا ہوں، بلکہ مائکروفلم بھیج دینے میں بھی مجھے تامل نہ ہوگا۔

لندن کے دوران قیام میں میں معارف پڑھنا چاہتا ہوں، میں کلکتے لکھ رہا ہوں کہ سالانہ چندہ فوراً بھجوا دیا جائے
لندن میں میرا قیام کافی عرصے تک رہیگا، اسلیے اگر آپ لکھنا چاہیں تو اس پتہ پر لکھ سکتے ہیں:

C/o, MR. M.P JAIN, Education officer
India House, ALDwych - London.

امید کہ مزاج اچھا ہوگا، والسلام

احقر محمد صابر خاں عفی عنہ

سلیمان ہال

کی

تعمیر میں امداد کرکے اردو زبان کی خدمت کیجئے

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ کا وطن دیسنہ ضلع پٹنہ، ریاست بہار میں ہے، یہاں نصف صدی سے اردو کا ایک بیش قیمت کتبخانہ قائم ہے جس میں اردو کی تقریباً تمام مطبوعہ کتابیں اور بہت سے قلمی نوادر موجود ہیں، انکی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہوگی، ان خصوصیات کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی کتبخانہ شاید ہی اسکا مقابلہ کرسکتا ہو، اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اردو کے اصحاب ذوق آتے رہتے ہیں، ریاست بہار کے وزرا اور مشاہیر کے علاوہ ڈاکٹر راجندر پرشاد (صدر جمہوریہ) بھی تشریف لاکر اس کتبخانہ کو رونق بخش چکے ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کو اس کتبخانہ سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اسکی ترقی میں انکا بڑا ہاتھ ہے اس لیے انکے اہل وطن انکی یادگار میں اس کتبخانہ کے متعلق ایک ہال تعمیر کرانا چاہتے ہیں، اسکی تعمیر میں ۱۸ ہزار روپے صرف ہونگے، مولانا مرحوم جیسی جلیل القدر شخصیت کے مقابلہ میں اٹھارہ ہزار کی رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے، اس کو صرف ریاست بہار کے لوگ آسانی سے فراہم کرسکتے ہیں مگر مولانا مرحوم کی شخصیت آل انڈیا تھی، ان کے علم اور قلم کے سرچشمے سے اسکا ہر قطعہ سیراب ہوا، اور ان کے عقیدتمندوں کا دائرہ ہر جگہ اور ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اسلیے ہم کو توقع ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگ خصوصاً اسکا علمی طبقہ اس یادگار کے قیام میں پوری مدد دیگا۔

عطیات :- منی آرڈر بنام پروفیسر سید محمد سعید رضا ارسال فرمایئے: پتہ یہ ہے - مقام دیسنہ، پوسٹ دیسنہ، ضلع پٹنہ (بہار سٹیٹ)

منجانب

عبدالستار صدیقی (سابق صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی) عبدالماجد دریابادی (ایڈیٹر صدق) ... مجلس ... دارالمصنفین اعظم گڑھ) مسعود حسن رضوی (سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی) قاضی عبدالغفار (سکریٹری کل ہند انجمن ترقی اردو) شاہ معین الدین احمد ندوی (ناظم ... دارالمصنفین اعظم گڑھ) عبدالسلام ندوی (مصنف شعرالہند رکن دارالمصنفین اعظم گڑھ) مسعود علی ندوی (ناظم ... دارالمصنفین اعظم گڑھ)
[illegible]

ادبیات

سلام

بحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

از

جناب ابوالمعانی محمد عمر نعمانی مرحوم شملہ

سلام اے سرورِ کونین اے سلطانِ روحانی
ترے دم سے ملی ذرات کو سورج کی تابانی

سلام اے دوجہاں کی بزمِ خلوت کے تماشائی
سلام اے نورِ یزدانی حبیبِ ذاتِ سبحانی

یہ خارستانِ عالم کفر و ظلمت کا تھا کاشانہ
مگر اس میں منور تونے کی شمعِ شبستانی

تو وہ سردارِ عالم ہے تو وہ سرتاجِ آدم ہے
جہاں کے بادشاہ کرتے ہیں تیرے در کی دربانی

عطا تیرے کرم نے کر دیا اپنے غلاموں کو
شکوہ قیصری، جاہِ کئی، اقبال خاقانی

تری شانِ کرم سے آج تک دنیا میں زندہ ہیں
رموزِ علم قرآنی، و ایمانِ مسلمانی

ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ سب زندہ ہیں تجھ سے
نہ تو فانی، نہ تیرے عاشقوں کا نام ہے فانی

بوقتِ جان سپردن اسمِ پاکت بر لبم بادا!
زہے قسمت قبول افتد گر استدعائے نعمانی!

مطبوعات جدیدہ

ہماری بت پرستیاں از نواب ہوش یار جنگ بہادر، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸ صفحات،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸؍، پتہ مصنف خیرت آباد، حیدرآباد دکن

جناب ہوش بلگرامی اردو زبان کے خوش مذاق ادیب ہیں، وہ اگرچہ کم لکھتے ہیں، مگر جب قلم اٹھاتے ہیں تو خوب لکھتے ہیں، ان میں دینی اصلاح کا بھی جذبہ ہے، چنانچہ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے محرم کے مروجہ رسوم و بدعات پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں عزاداری کی تمام بدعتوں، مشرکانہ رسوم اور کھیل تماشوں کی مخالفت کی تھی، اور شہادت حسینی کے اصل مقاصد اور اسوۂ رسول و اسوۂ ائمہ پر عمل کرنے کی تلقین کی تھی، جناب سید اختر علی صاحب تلہری نے، اس مضمون کے بعض خیالات سے اتفاق اور بعض سے اختلاف کیا تھا، اور اور بعض رسوم کو شعائر دین کی حیثیت سے قائم رکھنے کی حمایت کی تھی، ان دونوں مضامین پر جناب سید اولاد حیدر صاحب بلگرامی نے محاکمہ لکھا تھا، انھوں نے بلا استثنا عزاداری کے تمام رسوم کو دینی شعائر کا درجہ دیدیا تھا، اور اس کی سند میں عیسائیوں اور بدھوں وغیرہ کے رسوم پیش کیے تھے، آخر میں ہوش صاحب نے ان دونوں کا مدلل جواب دیکر اس بحث کو ختم کر دیا تھا، اب انھوں نے ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، درحقیقت مسلمانوں کی دینی گمراہی اور ایک حد تک ان کی اخلاقی اور مادی زوال کا سبب بھی وہ بدعتیں ہیں، جو مذہب کے نام سے دین میں داخل ہو گئی ہیں، اور اس میں شیعہ سنی کسی کی بھی تخصیص نہیں، محرم کی بدعتوں میں دونوں برابر کے شریک ہیں، بلکہ محرم کے جلوسوں کی رونق زیادہ تر سنیوں ہی کے دم سے ہے، مگر سنیوں میں ہر زمانہ میں ایسے مصلحین پیدا ہوتے رہے، جو غیر اسلامی رسوم و بدعات کی سختی سے مخالفت اور

اس کی اصلاح کی عملی جد و جہد کرتے رہے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، مگر جہاں تک راقم کے علم میں ہے شیعوں میں اس قسم کی اصلاح کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، زیادہ سے زیادہ کسی محتاط مجتہد نے کسی مشرکانہ رسم کی قباحت ظاہر کر دی، سنیوں کی طرح اس کی اصلاح کے لیے کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھایا گیا، ہندوستان کے شیعوں میں غالباً اصلاح کی یہ پہلی آواز ہے، جو جناب ہوش بلگرامی نے بلند کی ہے، انھوں نے قرآن مجید، احادیث نبوی اور ائمۂ مجتہدین کے اقوال و آثار سے ثابت کیا ہے کہ عزاداری کے تمام مروجہ مراسم سراسر شرک و بدعت اور لہو و لعب ہیں، جن کو دین سے کوئی علاقہ نہیں، اور یہ سب بعد کی پیداوار ہیں، قرن اول میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا، اور اسلام اس قسم کے جاہلی مراسم کو مٹانے کے لیے آیا تھا، نہ کہ قائم کرنے کے لیے، اور وہ عقلاً بھی اس قدر مضحکہ انگیز ہیں کہ دوسری قومیں ان پر طنز کرتی ہیں، اور اس زمانہ میں محرم کی مجالس تک جن سے مفید کام لیا جا سکتا تھا، بزم مشاعرہ بن گئی ہیں، جن سے اثر پذیری اور سبق آموزی کے بجائے، ذاکرین کی شاعرانہ نکتہ آفرینیوں کی داد دی جاتی ہے، ہوش صاحب کے دونوں مضامین خصوصاً جواب الجواب عقل و نقل اور روایت و درایت سے اس قدر مدلل اور اتنا متین سنجیدہ اور موثر و دلنشین ہے کہ اس کی تردید ہو ہی نہیں سکتی، اور اپنے نقطۂ نظر کی صحت اور افادیت کے لحاظ سے نہ صرف شیعوں بلکہ سنیوں کے بھی پڑھنے کے لائق ہے، اس مضمون سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فروع کو چھوڑ کر خالص توحید کے تصور میں جو اسلام کی اساس ہے صحیح العقیدہ شیعوں اور سنیوں میں کس قدر اتحاد ہے، اور اس کے ذریعہ وہ ایک دوسرے کے کتنے قریب آجاتے ہیں، اس لیے اس قسم کی کوششیں نہ صرف مذہبی حیثیت بلکہ مسلمانوں کے قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت محمود و مستحسن ہیں، جناب ہوش نے یہ مضامین شائع کر کے بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں،

مثنوی سرود بیخودی ۔ از جناب ڈاکٹر عشرت حسن صاحب انور، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ، مصنف نمبر ۴ حالی روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مسلم گیٹ،

کبھی کبھی فلسفہ کی انتہا تصوف پر بھی ہوتی ہے، اس لیے کسی فلسفی کا صوفی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، چنانچہ فاضل مصنف فلسفہ کے ڈاکٹر اور مسلم یونیورسٹی میں اس کے استاد بھی ہیں اور صاحب دل صوفی بھی، اس لیے ان پر انا کے بجائے فنا اور خودی کے بجائے بیخودی کا غلبہ ہے، چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر اقبال کی خودی کے رجز کے مقابلہ میں بیخودی کا میٹھا اور سریلا نغمہ سنایا ہے، اور مثنوی سرود بیخودی میں دکھایا ہے کہ خودی انفس سے لیکر آفاق تک کے لیے ہلاکت خیز ہے، اور آج دنیا میں جو باہمی آویزش برپا ہے وہ قوموں کی خود پرستی ہی کا نتیجہ ہے، اور انسانیت کی فلاح اس کی اخلاقی تعمیر اور دنیا کا امن و سکون بیخودی اور اور عالمگیر انسانی اخوت و محبت سے وابستہ ہے جس کا سب سے بڑا معلم و مبلغ اسلام ہے، اور دنیا کے لیے سب سے بڑا درس اخلاق اسوۂ نبوی ہے، اور انسانیت کی فلاح اسلام کی تعلیمات پر منحصر ہے، اس لیے ایک نہ ایک دنیا اس کے ماننے پر مجبور ہوگی، اس میں شبہہ نہیں کہ اخلاق و روحانیت کے اعتبار سے بیخودی کا درس بڑا دلکش ہے لیکن درحقیقت حقیقی خودی اور بیخودی میں کوئی تضاد نہیں ہے، اور ان کی حیثیت بجلی کی منفی اور مثبت لہروں کی ہے جس کے بغیر انسانیت کا چراغ روشن نہیں ہو سکتا، اور یہ دونوں انسانیت کی فلاح و تکمیل کے لیے ضروری ہیں، خودی قوموں کو قوت و توانائی بخشتی ہے، اور بیخودی اس کو قابو میں رکھتی ہے، البتہ ان میں اعتدال و توازن ضروری ہے، ورنہ خودی کا غلبہ انسانوں کو جابر و قاہر بنا دیتا ہے، اور بیخودی مظلوم و مقہور کر دیتی ہے، اور ان دونوں میں ہلاکت ہے، اور اس میں توازن احکام الٰہی کی پابندی سے ہوتا ہے، اسی لیے اقبال نے بھی اس خودی کی تعلیم دی ہے جو احکام الٰہی کی پابند ہو، اور جس سے اس کی مضرت ختم ہو جاتی ہے، اس لیے ان دونوں میں حقیقی تضاد نہیں ہے، وہ دونوں انسانیت کی تکمیل کا ضروری عنصر ہیں، اور ان میں سے کسی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسی قوموں کے لیے جو خودی کے نشہ میں چور ہیں یقیناً بیخودی کا پیغام اخلاقی و روحانی حیثیت سے مفید ہے، مثنوی کے آخر میں چند غزلیں بھی ہیں، ان میں بھی بادۂ عرفان کا کیف و سرور نمایاں ہے، اس زمانہ میں جبکہ فارسی زبان کا مذاق اٹھتا جاتا ہے،

یعنی شیراز ہم ہندیوں کے لیے قند پارسی کی لذت رکھتا ہے"

اپنی موج میں۔ از جناب آوارہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ہے ۔ پتہ: آوارہ فروغ اردو، امین آباد پارک، لکھنؤ۔

اردو زبان کے چٹخاروں کے لذت آشنا جناب آوارہ کے خوانِ ادب سے ناواقف نہیں ہیں، "اپنی موج میں" ان کے ان مضامین اور تقریروں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ہماری قدیم تہذیب کی بعض دلچسپ یادگاروں کے جن کا ذکر اب صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، مزاحیہ انداز میں ایسے دلکش مرقعے دکھائے ہیں کہ مصنف کے لطف زبان اور حسن بیان پر ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، اور اس کے لیے انھوں نے بگڑے رئیس، مصاحب، بٹیرباز، کبوترباز، مرغ باز، بانکے، مشاطہ، ملانی، بھٹیاری، پنڈت جی، لالہ جی، جوتشی وغیرہ جیسے کردار منتخب کیے ہیں، جن سے بہتر ان رخوں کی مصوری نہیں ہو سکتی، اور ان ہی کی زبان، محاورات، روزمرہ اور ان ہی کے آداب و تہذیب میں ان کا ایسا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے، اور اپنے حسن بیان سے ان میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ ان کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آجاتی ہیں، مولانا عبد الماجد صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "زبان کے محاورات پر یہ عبور، ادب کے نوک پلک پر یہ قدرت، ہر فن اور ہر پیشہ کے تلازموں، اصطلاحوں اور استعاروں پر بے تکلف حکومت و صاحبقرانی کی یہ دولت شاید ہی کسی خوش نصیب کے نصیب میں آئی ہو" اس زبان کو لکھنے والے کیا کچھ دنوں میں اس سے لطف اٹھانے والے بھی مشکل سے نظر آئیں گے، مصنف نے اپنے زور قلم سے ان یادگاروں کو جن کا ذکر اب صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، زندہ کر دیا، اردو میں یہ کتاب بڑا قیمتی اضافہ ہے،

گلدستہ طہارت۔ از جناب مولوی غلام مصطفیٰ صاحب عثمانی گیاوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت مجلد عہ، پتہ: مولف لیک روڈ رانچی سے ملے گی۔

اس رسالہ میں طہارت کی اہمیت اور وضو، غسل، تیمم اور پانی کی طہارت کے احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں، یہ مختصر مگر جامع ہے،

"م"

مکتبہ دار المصنفین

متعلقہ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام (حصہ اول) عہد رسالت و خلافت راشدہ
نی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام
مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت ؏
رتیخ اسلام (حصہ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت
صد سالہ سیاسی تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت، ؏
تیخ اسلام (جلد سوم) (خلافت عباسیہ) یعنی ابو العباس
اح ۱۳۲ھ/۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ/۹۴۴ء تک دو
یون کی سیاسی تاریخ، قیمت۔ معہ
یخ اسلام (جلد چہارم) (خلافت عباسیہ دوم)
ین مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ
۔ خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور
ین ایک مستقل باب میں عباسیون کے تمدنی کارنامون
ی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلی جلدون
سے زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: ؏

نئی کتابین

تاریخ سندھ سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی
تاریخ:۔ قیمت: ؏ (چھ روپیے)
اقبال کامل ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ
اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل، ؏
بزم تیموریہ تیموری بادشاہون شاہزادون اور شاہزادیون کے
علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلا کے مختصر تذکرہ
کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت ؏
امام رازی امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات انکی
تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام تفسیر کے اہم مسائل
کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت ؏
بزم صوفیہ عہد تیموریہ سے پہلے کے صاحب تصنیفات صوفیہ کرام
مثلاً شیخ ہجویری خواجہ معین الدین چشتی خواجہ نظام الدین اولیا
وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت ؏
تاریخ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعد کی مفصل سیاسی
تاریخ کیساتھ اندلس کی و تمدنی تاریخ، قیمت معہ
[illegible]

مصنفین کی نئی کتابیں

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزمِ تیموریہ کے نام سے شائع ہوچکی ہے، اب اس سے پہلے کے مسلمان حکمران خاندانوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور اُن کے درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء و شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے، لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی، اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ بدایونی، شمس دبیر، امیر خسرو، اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے ممتاز و سرآمد روزگار شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے، اُن کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اور اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے، قیمت [illegible]

مآل و مشیت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی عنصروں مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انھی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار ... قرونِ [illegible] پیش کیا گیا ہے، [illegible] پوری بحث پر تبصرہ ہے، (از صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالاتِ روسو)

قیمت عہ

([illegible])

جلد ۷۵ ماہ رجب المرجب ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۵۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

قرآن مجید میں آیت رجم	مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین	۱۶۵-۱۸۳
اسد بیگ قزوینی	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ	۱۸۴-۲۰۱
مجمع البحار پر تحقیقی نظر	جناب سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد برہانپوری	۲۰۲-۲۱۱
مسلمانانِ ہند کا نظامِ تعلیم	جناب مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ	۲۱۲-۲۲۶

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب اقبال	بنام مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۲۲۷-۲۳۲

ادبیات

غزل	جناب جاوید انصاری برہانپوری	۲۳۳
"	جناب ندیم مرادآبادی	۲۳۴
مطبوعات جدیدہ	"م"	۲۳۵-۲۴۰

شذرات

اردو کو مٹانے اور ہندی کو بڑھانے کے لیے جن جن تدبیروں سے کام لیا جا رہا ہے اس کا ایک دلچسپ نمونہ گذشتہ مردم شماری کی رپورٹ کے لسانیاتی اعداد و شمار بھی ہیں جن پر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ہماری زبان میں تبصرہ کیا ہے، اردو ہندی کا مسئلہ زیادہ تر اتر پردیش اور اس کے بعد بہار میں ہے، ان دونوں صوبوں میں اردو بولنے والوں کی تعداد اس طرح گھٹائی گئی ہے کہ بہار میں اس غلط بنیاد پر کہ اردو ہندی ہی کی ایک شکل ہے، اس کو مستقل زبان نہیں مانا گیا ہے، اور اردو بولنے والوں کے اعداد ہندی میں شامل کر لیے گئے ہیں، حالانکہ بہار کی مقامی بولیوں تک کے اعداد الگ دیے گئے ہیں، اس سے ایک طرف بہار میں اردو کی مستقل حیثیت ختم ہو گئی، دوسری طرف مقامی بولیوں کے مقابلہ میں ہندی بولنے والوں کی تعداد بڑھ گئی، اتر پردیش میں صرف دو ہی زبانیں ہیں، اردو یا ہندی، اس لیے یہاں اردو کے مقابلہ میں ایک تیسری زبان ہندوستانی کھڑی کی گئی ہے، اس طرح اردو بولنے والوں کی تعداد ہندوستانی میں تقسیم کر کے گھٹائی گئی ہے، حالانکہ یہ کام اس زحمت کے بغیر بھی ہو سکتا تھا، جیسا کہ پورے صوبہ میں کیا گیا ہے۔

اردو بولنے والوں کی تعداد کو اس صوبہ میں جس طرح گھٹایا گیا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وسطی اور مشرقی اضلاع کا ذکر نہیں، سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، بلند شہر، علی گڈھ، آگرہ، بریلی، بجنور، بدایوں، مراد آباد، شاہجہانپور، فرخ آباد، اناؤ، کانپور اور لکھنؤ جیسے اضلاع میں جہاں اردو بولنے والوں کی اکثریت مسلم مانی جاتی ہے، ہندی بولنے والوں کی تعداد پچاس پچپن فیصدی سے لے کر ۹۰ فیصدی تک دکھائی گئی ہے، حد یہ ہے کہ لکھنؤ کے ضلع کی زبان ۶۲ فی صدی ہندی، ۲۰ فی صدی ہندوستانی اور کل ۱۵ فی صدی اردو دکھلائی گئی ہے، تنہا یہ مثال اس ثبوت کے لیے کافی ہے کہ کس طرح اردو کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جب ناسخ و آتش، انیس و دبیر، نسیم و چکبست کی سرزمین میں تینوں زبانوں کے بولنے والوں

جن یہ تھا سب ہوگا تو دوسرے اضلاع کا کیا ذکر، مگر یہ بھی غنیمت ہے کہ کسی درجہ میں سہی اردو کا وجود تو تسلیم کیا گیا ورنہ اگر سمپورنانند جی کی طرح اردو کے وجود ہی سے انکار کر دیا جاتا تو کون منوا سکتا تھا، مگر یہ اعداد و شمار بھی مطلق انکار سے کم مضحکہ انگیز نہیں ہیں۔

اردو کے دو بڑے مرکز تھے، دہلی اور لکھنؤ، لکھنؤ کے صوبہ کی سرکاری زبان کئی سال سے ہندی قرار پا چکی ہے، یہاں کے اسکولوں تک میں اردو کی تعلیم کی گنجایش نہیں، اور حکومت کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ چند سال کے عرصہ میں لکھنؤ کی زبان ۹۰ فیصدی ہندی ہو گئی، اور کل ۱۵ فیصدی اردو رہ گئی، اگر ہندی کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو آیندہ مردم شماری میں اردو کا نام بھی باقی نہ رہ جائے گا، لکھنؤ کا قصہ تو اس طرح ختم ہوا" یادگار بزم غالب ایک دہلی رہ گئی" تھی، اس کی سرکاری زبان بھی ہندی بنانے کی تجویز ایک مرتبہ پیش ہو چکی ہے، مگر گوپی ناتھ امن کی مخالفت کی وجہ سے مسترد ہو گئی تھی، لیکن جناب امن کب تک اردو کی جان کو امان دلا سکتے تھے، اب خود دہلی کی سرکار نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سال سے ریاست دہلی کی زبان ہندی کر دی جائے گی، اور آیندہ سال سے اس کا سارا کاروبار ہندی میں ہوگا، اور جب ان دونوں مرکزوں سے اردو ختم ہو جائیگی، تو پھر اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا،

ع   کر دیا سفاک نے میدان صاف

اترپردیش کی حکومت کا رویہ اب تک وہی ہے، اس نے دکھلانے کے لیے اردو کو جو حقوق دیے بھی ہیں ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے، حافظ ابراہیم صاحب نے بجٹ کی تقریر کے سلسلہ میں اردو کے بارہ میں حکومت کی جو پالیسی ظاہر کی ہے اور اس بنیاد پر کہ اردو بھی اترپردیش میں بولی جاتی ہے" اس غیر سرکاری زبان کی جس قسم کی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ کوئی نیا نہیں ہے، پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں خاص شرائط کے ساتھ اردو تعلیم کی اجازت اور اس کے انتظام کا وعدہ پہلے سے ہے، اور اسکے بارہ میں حکومت کے احکام بھی موجود ہیں، سرکاری دفتروں میں بھی اردو میں درخواست دینے کی اجازت ہے، جس کا اظہار حافظ ابراہیم صاحب نے اپنی تقریر میں بھی کیا، مگر سوال یہ ہے کہ ان پر عمل کہاں تک ہو رہا ہے، ان شعبوں کے عمال حکومت کے احکام کی تعمیل میں جو رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں ان سے حافظ صاحب بے خبر نہ ہوں گے، ویسے انکی تقریر کے بعد بھی اس پر عمل کا سوال باقی رہ جاتا ہے، اگر حقیقۃً حکومت کی پالیسی یہی ہے

جو حافظ صاحب نے ظاہر کی ہے تو اس پر عمل بھی ہونا چاہیے اور جو لوگ اس میں رکاوٹ پیدا کریں ان سے باز پرس ہونی چاہیے، اور اردو کا حق محض تعلیم اور اردو درخواستوں تک محدود نہ ہونا چاہیے بلکہ اس کو وہ تمام سہولتیں ملنی چاہییں جو علاقائی زبان کی حیثیت سے اس کا حق ہیں، ورنہ محض زبانی وعدہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں، تاہم ایک ایک ذمہ دار وزیر کی زبان سے اس تصریح کے ساتھ پہلی مرتبہ اعلان کیا گیا ہے، اس لئے حسن ظن یہی رکھنا چاہیے کہ شاید اس پر عمل بھی ہو۔

اردو کے بارہ میں حافظ صاحب کی تقریر کے بعض فقرے ایسے عبرت انگیز ہیں کہ بے اختیار اکبر الہ آبادی کا یہ قطعہ یاد آگیا:

انہی کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات انکی — انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات انکی

فقط میرا ہاتھ چل رہا ہے انہی کا مطلب نکل رہا ہے — انہی کا مضمون انہی کا کاغذ قلم انہی کی دوات انکی

مگر وہ بھی مجبور ہیں، حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے اس کے سوا وہ اور کیا کہہ سکتے تھے، مگر ہم کو یقین ہے کہ ان فقروں کے بولتے وقت ان کے دل نے ان کی زبان کا ساتھ نہ دیا ہوگا۔

اردو علاقائی زبان کا میمورنڈم صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش ہوئے، ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا ہے مگر ابھی تک اس کا کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا، معلوم نہیں انتظار کی یہ مدت کب تک بڑھے گی، درحقیقت مرکزی حکومت خود اس بارہ میں کشمکش میں مبتلا ہے، ایک طرف ہندوستان کے دستور میں اردو کو بھی ہندوستان کی چودہ زبانوں میں ایک زبان مانا گیا ہے، پنڈت جواہر لال بھی اس کی حمایت میں ہیں، لیکن اکثریت اس کے مخالفین کی ہے، ایسی حالت میں ان کے خلاف فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے، مگر اس انتظار سے تو یہ کہیں بہتر تھا کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جاتا، خواہ وہ خلاف ہی کیوں نہ ہوتا، امید و بیم کی یہ کیفیت تو ختم ہوتی اور اردو کے حامی کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتے۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ اردو زبان کے کہن سال مصنف مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے ۵۰ سال کی عمر میں انتقال کیا، اردو کے پرانے مصنفین میں اسوقت وہ سب سے زیادہ معمر تھے، جب تک ان کے قویٰ کام دیتے رہے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا، مگر ادھر کئی برس سے ضعف پیری کی وجہ سے چھوٹ گیا تھا، وہ معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، جس موضوع پر لکھتے تھے معلومات کا انبار لگا دیتے تھے، متفرق مضامین کے علاوہ حیات جلیل، تاریخ الہ آباد، عرب اور ان کا مستقبل وغیرہ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں، ان کی موت سے ایک پرانی علمی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ مقبول احمد کو آخرت کی مقبولیت سے سرفراز فرمائے۔

مقالات

قرآن مجید میں آیت رجم

از جناب مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

یہ مضمون درحقیقت ایک سوال کا جواب ہے، مگر بحث کی اہمیت کی بنا پر اسکو مقالات میں شائع کرنا مناسب معلوم ہوا،

اسلام نے جرائم کی روک تھام کے لیے جو سخت سزائیں مقرر کی ہیں، ان میں ایک سزا سزائے رجم بھی ہے، یعنی کوئی بالغ شادی شدہ اگر زنا کا ارتکاب کرے، تو اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ شرعی شہادت یا اقرار کے بعد زانی اور زانیہ دونوں کو سنگسار کردے، اور اس سلسلہ میں ان پر کوئی نرمی روا نہ رکھے۔

جہاں تک سزائے رجم کی فرضیت اور اس کے اسلامی حد (سزا) ہونے کا تعلق ہے، وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے ثابت ہے، قرآن مجید میں متعدد ایسی آیتیں ہیں جن میں اجمالاً اور اشارۃً رجم کا ذکر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار شادی شدہ زانیوں کو رجم کی سزا دی ہے، اور آپ کے بعد خلفاے راشدینؓ نے بھی اپنے اپنے عہد میں اس سزا کو عملاً نافذ کیا ہے، اس لیے اس سزا کی فرضیت میں کسی قسم کے شبہہ اور شک کی گنجائش نہیں ہے، لیکن قرآن میں غیر شادی شدہ بالغ زانیوں کی سزا سو کوڑے کا ذکر جس صراحت و وضاحت کے ساتھ ہے، اس صراحت و وضاحت کے ساتھ سزاے رجم کا ذکر نہیں ہے، اس لیے ابتدا ہی سے بعض شک پسند اور کم علم لوگوں کے دلوں میں اس سزا کے حکم الٰہی

ہونے کے بارے میں شبہات پیدا ہونے لگے تھے، بعد میں جن کی نمایندگی اجتماعی طور پر خوارج اور معتزلہ نے کی، اور اس زمانہ میں ان فرقوں کی نمایندگی نئے "اہل اعتزال" کر رہے ہیں،

حدیث کی تمام معتبر کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اس سوال اور اس قسم کے بعض دوسرے سوالات کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو ایک اہم تقریر فرمائی، اس تقریر میں سب سے پہلے جس بات کا ذکر کیا وہ یہ تھی کہ

"لوگو! تم میں کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ قرآن میں رجم کا حکم موجود نہیں ہے، بلکہ اس میں محض جَلد (کوڑے کی سزا) کا ذکر ہے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ رجم کا حکم قرآن میں موجود ہے، اور وہ بھی دوسرے فرائض کی طرح ایک فریضہ ہے جسے خدا نے نازل فرمایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا دی ہے اور ان کے بعد ہم نے بھی اس پر عمل کیا ہے۔"

بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں اس تقریر کے الفاظ بس اسی قدر ہیں، مگر حدیث کی بعض دوسری کتابوں میں حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے یہ بھی منقول ہے کہ سزائے رجم کے سلسلہ میں ایک آیت الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ نازل ہوئی تھی، مگر بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی، اور اس کا حکم باقی رکھا گیا، یعنی حضرت عمرؓ نے اپنی تقریر میں رجم کے جس حکم کے قرآن میں موجود ہونے کا ذکر کیا ہے اس سے ان کی مراد یہی منسوخ التلاوۃ آیت ہے،

یہ روایت جس کو متعدد محدثین اور مفسرین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، ممکن ہے سلسلۂ سند کے اعتبار سے اس کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح ہو، مگر عاجز نے اس بارے میں جو طالب علمانہ تحقیق کی ہے، اس کے لحاظ سے نہ تو اس ٹکڑے کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف صحیح ثابت ہوتی ہے اور نہ اس کا منسوخ یا غیر منسوخ کلام الٰہی ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے، مگر محدثین و مفسرین کی ایک بڑی تعداد اس ٹکڑے کو منسوخ تسلیم کرتی ہے، اس لیے ہم اس کے قرآن کا جزو ہونے یا نہ ہونے پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں گے، تاکہ اہل علم کے سامنے

یہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ آجائے، اور ان کو میری رائے سے اتفاق یا اختلاف کرنے میں آسانی ہو،

زنا، محرکات زنا اور سزائے زنا کے تدریجی احکام

مذکورۂ بالا ٹکڑے پر کلام کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زنا اور اس کی سزا کے سلسلہ میں جو تدریجی احکام نازل ہوئے ہیں، ان پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، تاکہ اصل مسئلہ کے سمجھنے میں سہولت ہو،

مکی دورِ نبوت میں سورہ اسرا کے نزول سے پہلے اس کے بارے میں صراحۃً کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، مگر مجملاً و اشارۃً ہمیشہ ان تمام کاموں سے روکا گیا، جو محرکات زنا ہو سکتے تھے، چنانچہ سورہ نحل میں جہاں بہت سے اوامر و نواہی کا ذکر ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ

وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ (نحل-۱۳) خدا بیحیائی، برائی اور ظلم سے روکتا ہے،

اس کے بعد سورہ انعام میں ذرا اور وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا:-

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (انعام، رکوع ۱۹) فواحش اور بیحیائی کے جتنے طریقے ہیں خواہ وہ پوشیدہ ہوں یا ظاہر ان کے قریب نہ جاؤ۔

ان آیتوں میں فحشا، فواحش اور منکر کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی، مگر لفظ کی عمومیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین و تفسیر سے مسلمانوں نے زنا کی حرمت کو سمجھ لیا تھا، اور اس کے محرکات تک سے بچنے لگے تھے، مکہ میں وہ اس حیثیت میں نہیں تھے کہ اس حکم کو قانوناً پورے معاشرہ پر نافذ کر سکتے، مگر دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں جب بھی اس کا موقع آجاتا تھا، حتی المقدور فواحش اور ان کے محرکات سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے، اور اس میں مسلمانوں ہی کی تخصیص نہیں تھی، بلکہ وہ عام اہل عرب اور کفار قریش سے بھی تعرض کرتے تھے،

اہل مکہ کا دستور تھا کہ وہ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے، چونکہ یہ کھلی ہوئی بیحیائی اور محرک ہوس روش تھی، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے اس پر ناپسندیدگی ظاہر کی، جس کے جواب میں انھوں نے

کہا کہ یہ تو حکم الٰہی ہے اور باپ دادا کے زمانے سے ہوتا آیا ہے، اس سوال و جواب کو قرآن نے نقل کیا ہے،

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً قَالُوْا وَجَدْنَا	جب وہ کوئی فحش کام کرتے ہیں (اور ان کو ٹوکا
عَلَیْھَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا قُلْ	جاتا ہے) تو کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا ایسا ہی
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ	کرتے آئے ہیں اور حکم الٰہی بھی یہی ہے، کہدیجئے کہ
عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ	اللہ تعالیٰ بےحیائی و فحاشی کا حکم نہیں دیتا، بغیر کسی
(اعراف، رکوع ۴)	دلیل کے خدا پر بہتان باندھتے ہو،

سورہ اعراف کے نزول تک قرآن میں اسی عمومی انداز سے زنا اور اس کے محرکات کی برائی کی گئی، صراحۃً زنا کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، ہجرت سے چند ماہ پیشتر سورہ اسرا کا نزول ہوا، تو اس میں جہاں اور بہت سے تمدنی و معاشرتی احکام نازل ہوئے، زنا کے بارے میں بھی واضح طور پر یہ حکم دیا گیا کہ

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً	زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ نہایت ہی بےحیائی
وَسَآءَ سَبِیْلًا (رکوع ۴)	کا کام اور بری راہ ہے،

اس آیت کی تفسیر میں امام احمد بن حنبلؒ نے عہد نبوی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ "ایک نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہم کو زنا کی اجازت دیدیجئے، صحابہ نے اس گستاخی پر اسکو ڈانٹنا چاہا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روکا اور نوجوان کو اپنے پاس بلا کر نہایت نرمی سے فرمایا کہ کیا تم یہ حرکت اپنی ماں، بہن، خالہ اور بیٹی کے ساتھ کرنا پسند کروگے، بولا نہیں یا رسول اللہ میں یہ کیسے پسند کر سکتا ہوں، آپ نے فرمایا، پھر اسی طرح دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ یہ حرکت پسند نہیں کرتے، پھر آپ نے اس کے لیے دعا فرمائی، اس کے بعد اس کا حال یہ ہو گیا کہ وہ عورتوں کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔"

ہجرت سے چند ماہ پہلے جب انصار کا دوسرا قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا

تو آپؐ نے ان سے جن باتوں پر بیعت لی تھی، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ زنا کے قریب نہ جانا۔"

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے زنا سے اجتناب کا صریح حکم آ چکا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مطابق مسلمانوں اور عام اہل مکہ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش اور اس کے ارتکاب پر روک ٹوک بھی کرتے تھے، مگر ابھی یہ فعل فوجداری کا جرم نہیں قرار پایا تھا، اور نہ اس کی سزا مقرر ہوئی تھی، اور اس وقت مسلمان جن حالات میں تھے، ان میں یہ ممکن بھی نہیں تھا، ہجرت کے بعد گو مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہو گیا تھا، اور انھوں نے اسلامی حکومت کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی، پھر بھی دو تین سال تک وہ فوجداری قوانین کے نفاذ پر قادر نہیں ہو سکے تھے، مگر جب ذرا اسلامی حکومت کو استحکام نصیب ہوا اور فوجداری سزاؤں کے نفاذ پر مسلمانوں کو قدرت حاصل ہوئی، تو فوراً یہ فعل فوجداری جرم قرار پایا اور اس کی سزا مقرر ہوئی، اس سلسلہ میں سب سے پہلا حکم سورۂ نساء[1] میں یہ نازل ہوا،

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ	تمھاری عورتوں میں سے جو بھی بےحیائی (زنا)
نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً	کا کام کریں ان کے اس فعل پر تم اپنوں میں سے
مِّنْکُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِکُوْهُنَّ	چار آدمیوں کی گواہی لو، اگر وہ گواہی دیدیں
فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ	تو ان کو اپنے گھروں میں اس وقت تک مقید
یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا وَالَّذٰنِ	رکھو یا تو موت ان کا خاتمہ کر دے یا پھر خدا
یَاْتِیٰنِهَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْهُمَا	ان کے لیے کوئی نئی راہ نکالے یعنی کوئی نیا حکم دے"
(رکوع ۲)	اور جو دو شخص بھی اس فعل کا ارتکاب کریں انکو تکلیف پہنچاؤ

پہلی آیت میں مخصوص طور سے شادی شدہ زانیہ عورتوں کی سزا حبس دوام مقرر ہوئی اور دوسری آیت میں عام زانیوں کے لیے ایذا رسانی کی سزا تجویز کی گئی، مگر اس ایذا رسانی (فآذوھما) کی تعیین و تشریح

---

[1] اس سورہ کو زمانۂ نزول [illegible] کے بعد [illegible] اس کے بعد کا زمانہ اس کا زمانۂ نزول قرار دیا گیا ہے؛

نہیں کی گئی، اس لیے ابتدا میں اس جرم کے عام مرتکبین کو لعنت ملامت اور زد و کوب کرکے چھوڑ دیا جاتا تھا (ابن کثیر)

جس طرح یہ ٹکڑا غیر متعین تھا، اسی طرح پہلی آیت کا آخری جملہ "اَوْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلًا" خدا اس کے لیے کوئی نیا راستہ پیدا کرے گا، مجمل اور غیر متعین تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی نیا حکم دیا جانے والا ہے، چنانچہ مسلم اور دوسری کتب حدیث میں تھوڑے سے اختلاف الفاظ کے ساتھ اس اجمال کی تفسیر میں یہ روایت منقول ہے:

عن عبادۃ بن صامت قال قال	عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ آنحضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خذوا عنی	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے جو نیا حکم زانی
خذوا عنی قد جعل اللہ لھن	عورتوں کی سزا کے بارے میں دیا ہے اسے مجھ سے
سبیلا البکر بالبکر جلد مائۃ	سن لو، یاد کر لو اور دوسروں تک پہنچا دو، وہ
ونفی سنۃ والثیب بالثیب	یہ ہے کہ اگر زانی خواہ مرد ہو یا عورت اگر وہ غیر شادی شدہ
جلد مائۃ والرجم	ہے تو اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی
(مسلم باب حد الزنا)	ہے اور اگر وہ شادی شدہ ہو تو سو کوڑے اور

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں جو بات مجمل اور غیر متعین تھی، اس کو آپ نے منشائے الٰہی کے مطابق واضح فرما دیا، اور اس طرح خدا نے جو راستہ نکالنے کا وعدہ فرمایا تھا، وہ بھی آپ کی زبان سے پورا ہو گیا۔ اس ارشاد نبوی سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں:

۱۔ زانی عورتوں کی سزا "حبس دوام" اور عام زانیوں کی سزا "ایذا رسانی" کی تفریق باقی نہیں رہی، اب یہ تفریق شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے اعتبار سے ہوگی۔

۲۔ اگر زانی بالغ کنوارے ہیں تو خواہ مرد ہوں یا عورت جوان ہوں یا بوڑھے، ان کو سو کوڑے

مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دیا جائے گا،

۲- اگر وہ بالغ شادی شدہ ہیں تو ان کو سو کوڑے مار کر رجم کر دیا جائے گا،

ایک مدت تک ان سزاؤں پر عمل درآمد ہوتا رہا، اس کے بعد سنہ یا اس کے لگ بھگ جب سورہ نور کا نزول ہوا تو ان سزاؤں میں اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی اصلاح کر دی،

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (رکوع ۱) زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

اس حکم میں سو کوڑے کی سزا تو علیٰ حالہ باقی رہی، مگر اس کے ساتھ جلا وطنی کی سزا کو نہ تو ضروری قرار دیا اور نہ اس سے منع ہی کیا گیا، گویا قرآن نے یہ بات اسلامی حکومت کے اختیار پر چھوڑ دی کہ اگر وہ چاہے تو یہ سزا بھی دے سکتی ہے اور نہ چاہے تو اس کا بھی اس کو اختیار ہے، اسی بنا پر اس سزا کے بارے میں صحابہ اور ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دونوں سزائیں ساتھ دی ہیں[1]، حضرت عمرؓ نے بھی کبھی دونوں سزائیں دیں اور کبھی ایک پر اکتفا کیا[2]،

ائمہ میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ عام حالت میں تو جلد (کوڑے کی سزا اور تغریب (جلا وطنی) ایک ساتھ نہ دینا چاہیے، البتہ امام وقت اگر کسی وقت جلا وطنی کی ضرورت محسوس کرے تو اس کو اسکا اختیار ہے، مگر اس کے لیے ایک سال کی قید کی ضرورت نہیں ہے، اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے،

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مرد کو تو جلا وطن کیا جا سکتا ہے، مگر عورت کو یہ سزا نہیں دی جا سکتی، اسلئے کہ اس میں بہت سی اخلاقی خرابیوں کا اندیشہ ہے، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے ہے کہ دونوں سزائیں ساتھ ساتھ دینی چاہئیں،

دوسری سزا کے بارے میں قرآن نے تو کوئی صریح حکم نہیں دیا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] زرقانی شرح موطا کتاب الحدود [2] کنز العمال

نے یہ اصلاح فرمائی کہ سزائے رجم کو تو یوں کا توں باقی رکھا، مگر اس کے ساتھ جَلْدْ کو ضروری قرار نہیں دیا اور اس جرم میں خود آپ نے جو سزائیں دیں، ان میں بھی دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا، مگر چونکہ آپ نے صراحۃً اس کی ممانعت نہیں فرمائی تھی، اس لیے اس بارے میں بھی حضرات صحابہ اور ائمہ میں اختلاف ہوا،

حضرت علیؓ، عمرو بن عاصؓ، حسن بصری، اسحاق بن راہویہ اور امام احمد بن حنبل کی رائے ہے کہ دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ دیا جا سکتا ہے، ان کے علاوہ عام صحابہ اور ائمہ رجم کے ساتھ جلد ضروری نہیں سمجھتے، لیکن اگر امام وقت دونوں سزاؤں کو ایک ساتھ دے تو اس پر کوئی نکیر نہیں کی جا سکتی،

اوپر کتاب و سنت کی روشنی میں زنا اور اس کی سزا کے احکام کی جو تدریجی ترتیب دکھائی گئی ہے، اس سے ایک عام اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ سزائے رجم کے سلسلہ میں یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ قرآن میں آیت رجم کا نزول ہوا تھا جو بعد میں منسوخ التلاوت قرار دی گئی، بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورہ نسار کی جس آیت کی روشنی میں مرضی خداوندی کے مطابق آپ نے رجم کی سزا تجویز فرمائی تھی، وہ اب بھی قرآن کا جز ہے،

ممکن ہے کہ بعض اہل علم کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ تو حدیث نبوی سے آیت کا نسخ ہوا تو اس شبہہ کے ازالہ کے لیے عرض ہے کہ اگر فقہی و قیاسی بحثوں سے علٰحدہ ہو کر اس پر غور کیا جائے تو اس موقع پر حدیث نبوی سے قرآن کے نسخ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اس لیے کہ سورہ نسا کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ سزائے زنا کے سلسلہ میں جلد ہی کوئی نیا حکم دیا جانے والا ہے، چنانچہ یہی وعدۂ الٰہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پورا ہوا، اصطلاحی زبان میں اس کو اس طرح

لہ مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۰۰،

کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ایک محکم حکم کو مفسر یا غیر مبتین و مجمل حکم کو مبتین و مفصل فرما دیا، اس سلسلہ میں ہم چند محدثین کی رائیں نقل کرتے ہیں،

چوتھی صدی کے مشہور محدث ابو سلیمان خطابی مذکورہ آیت و حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

بل هو مبين للحكم الموعود بيانه	آپ نے اس حکم موعود کی تشریح کی ہے جس کا
فى الآية فكانه قال عقوبتهن	ذکر سورہ نساء کی آیت میں ہوا ہے، تو گویا خدا
الحبس الى ان يجعل الله لهن	نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ عورتوں کو حبس دوام
سبيلا فوقع الامر بحبسهن الى	کی سزا اس وقت تک دی جائے جب تک خدا
غاية فلما انتهت مدة الحبس	انکے لیے دوسری راہ نہ نکال دے، چنانچہ جب
وحان وقت مجى السبيل قال	وہ مدت پوری ہو گئی اور نئے حکم کا موقع آگیا
رسول الله صلى الله عليه وسلم خذوا	تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منشائے الٰہی
عنى تفسير السبيل وبيانه ولم	کے مطابق اس نئے راستہ یا اس حکم موعود کی
يكن ذلك ابتداء حكم منه و	تفسیر و تعیین فرما دی، تو خلاصہ یہ کہ آپ کا یہ ارشاد
انما هو بيان امر كان ذكر السبيل	اس سلسلہ کا ابتدائی یا کوئی نیا حکم نہیں تھا بلکہ
منطويا عليه فابان المبهم منه	جو امر ارشاد خداوندی میں پوشیدہ تھا اسے
وفصل المجمل من لفظه	آپ نے ظاہر فرما دیا، تو یہ سمجھو کہ آپ نے ایک مبہم حکم کو مبین
وهذا اصوب القولين ۲	اور مجمل کو مفصل کر دیا ...... اس سلسلہ میں سب سے ۲

۲؍ معالم السنن

امام نوویؒ مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اما قوله عليه السلام قد	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ اللہ تعالیٰ

جعل اللہ لہن سبیلاً فاشارۃ	نے ان کے لیے یہ راہ نکالی ہے" یہ اشارہ ہے
الیٰ قولہ تعالیٰ فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی	خدا تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف فامسکوھن
الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ	فی البیوت حتی یتوفاھن الموت او
اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا	یجعل اللہ لہن سبیلا
بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان	تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واضح فرمادیا
ھذا ھو السبیل	کہ وہ راستہ یہ ہے جو میں بتارہا ہوں،

اس تشریح کے بعد اس حدیث وآیت کے ربط وتعلق کے بارے میں جو رائیں دی گئی ہیں انکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فقیل ھی محکمۃ وھذا الحدیث	کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ سورہ نساء کی آیت
مفسر لھا وقیل منسوخۃ بالآیۃ	محکم ہے اور یہ ارشاد نبوی اس کی تفسیر ہے بعض لوگوں
فی اول سورۃ النور وقیل ان آیۃ	کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت سورہ نور کی ابتدائی
النور فی البکرین وھذہ الآیۃ فی	آیت سے منسوخ ہوگئی اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ
الثیبین	سورہ نور کی آیت بکر (کنوارے) کے متعلق ہے
(شرح نووی باب حد الزنا)	اور سورہ نساء کی آیت ثیبین (شادی شدہ) مرتکبین زنا

امام نووی نے اس بارے میں اہل علم کی جو تین رائیں نقل کی ہیں، ان میں سے پہلی رائے سے پتہ چلتا ہے کہ سورہ نساء کی آیت اور مذکورہ ارشاد نبوی کا تعلق ناسخ ومنسوخ کا نہیں بلکہ محکم ومفسر یا مجمل ومفصل کا ہے، دوسری رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نساء کی آیت سورہ نور کی ابتدائی آیت سے منسوخ ہے اور تیسری رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں آیتوں میں نہ کوئی ناسخ ہے اور نہ منسوخ، بلکہ دونوں کا منشائے نزول اور حکم جدا جدا ہے، سورۂ نساء کی آیت میں رجم کا حکم ہے اور سورہ نور کی آیت میں جلد کا

امام نووی اور امام خطابی دونوں کی رایوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ان آیات و احادیث کے بارے میں ناسخ و منسوخ کی بحث کی ہے ان حضرات ان کی رایوں کو ان دونوں اماموں نے مرجح قرار نہیں دیا ہے۔

پھر ان آیات اور احادیث کے بارے میں ناسخ و منسوخ کی بحث اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر سورہ نساء کی آیت کو سورہ نور سے منسوخ قرار دیا جائے تو اس آیت کے ایک ٹکڑے کو جس میں "حبس" کا تذکرہ ہے منسوخ قرار دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اب یہ حکم باقی نہیں رہا، مگر پوری آیت کو جس میں رجم کا مجمل حکم اور زنا کی چار شہادتوں کا ذکر ہے، منسوخ نہیں قرار دیا جا سکتا، اسلیے اس سلسلہ میں نسخ کی بحث نہ تو صحیح ہے اور نہ مفید،

اوپر کی تفصیلات سے حسب ذیل باتیں مستنبط ہوتی ہیں:

۱- زنا اور اس کے محرکات سے اجتناب کا حکم ہجرت سے پہلے آچکا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں اور عام اہل مکہ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش فرماتے تھے،

۲- زنا کی فوجداری سزا ہجرت کے کئی سال بعد مقرر ہوئی،

۳- ابتدا میں زانی عورتوں اور عام زانیوں کی سزائیں مختلف تھیں، اور ایک مدت تک اسی پر عمل رہا، پھر یہ تقسیم ختم کر دی گئی اور اس کے بجائے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی حیثیت سے سزا مقرر ہوئی،

۴- شادی شدہ کی سزا رجم اور جلد مقرر ہوئی، اور غیر شادی شدہ کی جلد اور تغریب،

۵- پھر پہلی سزا میں یہ اصلاح ہوئی کہ رجم کے ساتھ جلد ضروری نہیں رہا، اور دوسری سزا میں محض جلد ضروری قرار دیا گیا اور تغریب کو اسلامی حکومت کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا گیا،

۶- غیر شادی شدہ یعنی کنوارے زانیوں کی سزا جلد قرآن میں صراحۃً مذکور ہے اور بالغ شادی شدہ زانی کی سزا رجم کا حکم قرآن میں صراحۃً نہیں بلکہ اجمالاً اور اشارۃً ہے جس کی توضیح اور تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منشائے الٰہی کے مطابق فرمائی ہے،

اس تمہید کے بعد اب ہم اس ٹکڑے پر بحث کرتے ہیں جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کی ایک آیت تھی جو بعد میں منسوخ ہوگئی، اس ٹکڑے کے کلام الٰہی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ قرآن میں آیت رجم نازل ہوئی تھی مگر اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی اور اس کا حکم باقی ہے، حالانکہ جب بھی قرآن کا کوئی ٹکڑا نازل ہوتا تھا اسکا علم ہر خاص و عام کو ہو جاتا تھا، اور رجم کے سلسلہ میں کسی صریح آیت کے نزول کا علم تو اور زیادہ زبان زد خاص ہونا چاہیے تھا، اس لیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے عام مجمع میں متعدد بار رجم کی سزا دی ہے، اور ان سزا پانے والوں میں مسلمان ہی نہیں بلکہ یہودی بھی تھے، اس لیے اس کا چرچا تو گھر گھر ہوا ہوگا، ایسی صورت میں اگر رجم کے بارے میں کوئی صریح آیت نازل ہوتی تو بہتوں کو اس کا علم ہوتا اور وہ آیت بہت سے لوگوں کے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو جاتی، اور جب وہ منسوخ قرار دیجاتی تو اس کا علم بھی اسی اعتبار سے بہت سے افراد کو ہونا چاہیے تھا، مگر اس سلسلہ میں محض چار صحابہ کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے مذکورہ ٹکڑے کو آیت رجم بتایا ہے، ان میں سے ہر ایک کا بیان دوسرے سے مختلف اور بعض حیثیتوں سے مضطرب اور متضاد ہے، حالانکہ کسی کلام کو کلام الٰہی کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی روایت متواتر ہو، اور یہ ٹکڑا متواتر کیا مشہور بھی نہیں ہے، ہم ان چاروں روایتوں کو نقل کرکے ہر ایک پر الگ الگ بحث کریں گے۔

پہلی روایت | عن زر بن حبیش قال قال لی	زر بن حبیش سے مروی ہے کہ مجھ سے حضرت
ابی بن کعب وکان یقرأ سورة الاحزاب	ابی بن کعب نے پوچھا کہ سورہ احزاب میں کتنی
قال قلت ثلاثا وثلثین آیة قال	آیتیں ہیں، میں نے کہا کہ ۷۳ آیتیں ہیں، پوچھا
قط؟ قلت قط؟ قال لقد	کہ بس اسی قدر آیتیں ہیں، میں نے کہا ہاں محض
رأیتها انها لتعدل البقرة	۷۳ آیتیں ہیں، انھوں نے کہا میں نے پورا کیا

ولقد قرأنا فيها الشيخ
والشيخة اذا زنيا فارجموهما
البتة نكالا من الله والله
عزيز حكيم[1] ....
....

سورہ رہ گئی تھی، وہ قریب سورہ بقرہ
کے برابر تھی، اس میں جو آیتیں ہم نے پڑھی
تھیں ان ہی میں ایک آیت الشیخ والشیخۃ
اذا زنیا فارجموھما البتۃ نکالا من
اللہ واللہ عزیز حکیم بھی تھی،

دوسری روایت | ابو امامہ بن سہل اپنی خالہ یا پھوپھی سے روایت کرتے ہیں،

قالت لقد اقرأنا رسول الله صلى الله
عليه وسلم آية الرجم الشيخ
والشيخة اذا زنيا فارجموهما
البتة بما قضيا من اللذة[2]

انھوں نے کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے آیت رجم پڑھائی تھی، اور وہ یہ ہے
الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما
البتۃ بما قضیا من اللذۃ

تیسری روایت | کثیر بن الصلت کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص اور حضرت زید بن ثابت مصحف کی کتابت
کر رہے تھے کہ آیت مذکور سامنے آئی، زید بن ثابت نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

يقول الشيخ والشيخة اذا زنيا
فارجموهما البتة فقال عمرو لما
نزلت اتيت النبي صلى الله عليه وسلم
فقلت اكتبنيها فكانه كره ذلك
فقال عمرو الا ترى ان الشيخ

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما
البتۃ کہتے ہوئے سنا ہے، حضرت عمرو بن عاص نے
کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ!
آپ اسے لکھوا دیجئے، تو آپ نے اس پر ناگواری کا

[1] یہ روایت مستدرک حاکم اور سنن بیہقی دونوں میں مندرج ہے، روایت کے الفاظ ہم نے مستدرک سے نقل کیے ہیں، مگر اس کے ابتدائی حصہ کا مفہوم زیادہ واضح نہیں تھا، اسلئے ترجمہ دونوں روایتوں کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے۔ [2] مستدرک ج ۴ ص ۳۵۹

اذا زنی وقد احصن جلد ورجم	انکار فرمایا، پھر ابن عاصؓ نے حضرت زیدؓ سے
واذا لم یحصن جلد وان الثیب	کہا کہ (اس ناگواری کی وجہ اس آیت کی لفظی
اذا زنی وقد احصن رجم۔[1]	و معنوی خامی ہے) آپ اس پر غور کیجئے، اس میں
....	مطلقاً بوڑھے زانیوں کو رجم کی سزا تجویز کی گئی ہے۔

چوتھی روایت | اس سلسلہ کی سب سے اہم روایت حضرت عمرؓ کی ہے جس کو امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ایاکم ان تھلکوا عن آیۃ الرجم	میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ آیت رجم کے بارے
... والذی نفسی بیدہ	میں شک کرکے ہلاکت میں نہ پڑو، خدا کی قسم
لولا ان یقول الناس زاد عمر	اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر نے قرآن میں زیادتی
فی کتاب اللہ لکتبتھا بیدی الشیخ	کر دی تو میں اپنے ہاتھ سے اس آیت
والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ	کو قرآن میں لکھ دیتا،

حضرت عمرؓ کی یہی روایت اب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے جس کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پورے زمانۂ خلافت میں یہ معمول تھا کہ حج کے موقع پر آپ اسلامی مملکت کے تمام صوبوں کے امراء کو مکہ طلب کرتے تھے، اور ان سے ہر ہر صوبہ کے دینی، اخلاقی اور سیاسی حالات دریافت کرتے تھے، جب آپ آخری بار حج کو تشریف لے گئے تو حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کے ذریعہ ان کو یہ علم ہوا کہ یہاں بعض اسلامی مسائل[2] کے بارے میں کچھ لوگوں کے دلوں میں شبہات

---

[1] یہ روایت بعض دوسرے طریقوں سے بھی مروی ہے، بیہقی اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زیدؓ سے یہ گفتگو حضرت عمرو بن عاصؓ سے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ سے ہوئی تھی، اور انہی نے اس کی خامی کی طرف توجہ دلائی تھی۔ [2] ان اسلامی مسائل میں سب سے اہم مسئلے دو تھے، ایک حضرت صدیقؓ کی خلافت، دوسرے سزائے رجم کی فرضیت۔

پیدا ہوگئے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل کے بارے میں مجمع عام میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں مگر حضرت ابن عوفؓ نے حضرت فاروقؓ سے عرض کیا کہ امیرالمومنین یہ عام مجمع ہے، اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں، بہت سے لوگ آپ کی تقریر کے مدعا کو سمجھ نہ سکیں گے، اور واپس جاکر نہ جانے اس کے کیا کیا معانی پیدا کریں اور فتنہ اٹھائیں، اس لیے میری رائے ہے کہ آپ یہ تقریر مدینہ منورہ میں کریں، جہاں خواص اہل علم کا مجمع ہوگا، وہ مغز سخن تک پہنچیں گے اور اس کے موقع و محل کو سمجھیں گے، چنانچہ حضرت عمرؓ اس ارادہ سے باز رہے، اور جب مدینہ منورہ واپس ہوئے تو پہلے ہی جمعہ میں ان مسائل پر تقریر فرمائی، جس کے چند جملے بروایت بخاری یہ ہیں:

اما بعد فانی قائل لکم مقالة	میں ایک ایسی تقریر کروں گا جسکا ذکر کرنا میرے لیے
قد قدر لی ان اقولها لا ادری	انتہائی ضروری ہے، اس لیے کہ میں نہیں جانتا
لعلها بین یدی اجلی فمن عقلها	کہ موت ابھی آجائے، تو جن لوگوں کے اندر
ووعاها فلیحدث بها حیث	اس تقریر کے سمجھنے اور اس کے ذہن نشین
انتهت به راحلته ومن خشی	کر لینے کی صلاحیت ہو وہ اس کو جہاں تک
ان لا یعقلها فلا احل لاحد	پہنچا سکیں پہنچا دیں، مگر جن لوگوں کو یہ
ان یکذب علی	اندیشہ ہو کہ مغز سخن تک ان کی رسائی
. . . .	نہ ہو سکے گی تو میں ایسے کسی شخص کو اس کی
. . . .	اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اوپر

اس تمہید اور تنبیہ کے بعد آپ نے فرمایا کہ

ان الله بعث محمدا صلے الله علیه وسلم	بلاشبہ خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ
بالحق وانزل الکتاب فکان مما	مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی

انزل الله آية الرجم فقرأناها	خدا نے جو کلام آپ پر نازل فرمایا ہے اس میں
وعقلناها ووعيناها ، رجم	آیت رجم بھی ہے، ہم نے اس آیت کو پڑھا، سمجھا
رسول الله صلى الله عليه وسلم	اور اس کو محفوظ رکھا (اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ)
ورجمنا بعده فاخشى ان طال	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس رجم کی
بالناس زمان ان يقول قائل	سزا دی اور آپ کے بعد ہم نے اس پر عمل کیا،
والله ما نجد آية الرجم فى كتب	میں ڈرتا ہوں کہ ممکن ہو کہ کچھ دنوں کے بعد
الله فيضلوا بترك فريضة انزلها	کہنے والے یہ کہنے لگیں کہ ہم تو کتاب اللہ میں
الله والرجم فى كتاب الله حق	آیت رجم (صراحۃً) نہیں پاتے پس اس شبہ
على من زنى اذا احصن من	میں وہ ایک فریضۂ خداوندی کو ترک کر کے
الرجال والنساء اذا قامت	گمراہ ہو جائیں، حالانکہ سزائے رجم کا حکم کتاب اللہ
البينة او كان الحبل او الاعتراف[1]	میں (اشارۃً) موجود ہے، یہ سزا ان لوگوں کے لیے
. . . .	ہے جو شادی شدہ ہوں، خواہ وہ مرد ہوں یا
. . . .	عورت، مگر یہ سزا اس وقت نافذ ہوگی جب
. . . .	اس کا شرعی ثبوت مل جائے یا زانیہ حاملہ ہو جائے
. . . .	یا مجرم خود اعتراف کرلے،

پہلی تینوں روایتوں میں اور حضرت عمرؓ کی جو روایت امام مالک نے نقل کی ہے، اس میں الشیخ والشیخۃ والے ٹکڑے کا ذکر ہے، مگر حضرت عمرؓ کی یہی روایت بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی نقل کی ہے، مگر ان میں سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان محدثین

---

[1] بخاری کتاب المحاربین ج ۲ ص ۱۰۰۵

کے نزدیک حضرت عمرؓ کی طرف اس بات کی نسبت صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے اس ٹکڑے کو کلام الٰہی کہا ہو یا صراحۃً یہ فرمایا ہو کہ کتاب اللہ میں رجم کا ثبوت اسی منسوخ التلاوۃ آیت سے ثابت ہے پھر اس میں اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ جب اس کا حکم باقی ہے تو اس کی تلاوت کیوں منسوخ قرار دی گئی، اب ان روایتوں پر الگ الگ غور کیجئے،

پہلی روایت کے الفاظ پر غور کیجئے، اس میں ذکر ہے کہ یہ ٹکڑا سورہ احزاب کا جزو تھا، اور سورۂ احزاب میں اس وقت محض ۷۳ آیتیں ہیں، مگر اس کی ضخامت سورہ بقرہ کے برابر تھی، روایت میں صراحۃً یہ ذکر تو نہیں ہے کہ یہ حصہ منسوخ ہو گیا مگر بظاہر اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس کا یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ یہ حصہ غائب ہو گیا ہو،

اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سورہ احزاب کا جو حصہ منسوخ یا غائب ہو گیا ہے، وہ قرآن میں موجودہ حصہ سے کئی گنا زیادہ تھا، اس لیے کہ سورہ احزاب میں کل ۷۳ آیتیں ہیں اور سورہ بقرہ میں ۲۸۶ آیتیں، یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید نہ تو کسی حدیث نبویؐ سے ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے صحابی کی روایت سے، ممکن ہے کہ سلسلۂ سند کے اعتبار سے یہ روایت صحیح ہو، اس لیے کہ اس کے سند پر کوئی جرح و تنقید نظر سے نہیں گذری، مگر بہر نوع اصول درایت کے اعتبار سے کسی طرح اس روایت کو صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا، قرآن واضح طور پر اپنے محفوظ اور مکمل ہونے کا اعلان کرتا ہے، اور اس سے اس کا غیر محفوظ ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس لیے ایک روایت کی بنا پر قرآن مجید کو کیسے ناقص قرار دیا جا سکتا ہے،

حضرت ابی بنؓ کعب جن سے یہ روایت منقول ہے، ان کے نیچے کے راوی زر بن حبیش ہیں؛ ان کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ وہ علوی تھے، ممکن ہے کہ ان کی علویت سے فائدہ اٹھا کر کسی شیعی راوی نے ان کی طرف یہ روایت منسوب کر دی ہو، اور چونکہ حضرت ابی بنؓ کعب کے معروف شاگرد تھے

اس لیے روایت کی نسبت ان کی طرف کردی گئی ہو، یہ قیاس اس لیے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بارے میں بعض شیعوں کا جو تصور ہے۔ اس میں اور اس روایت میں ہم آہنگی ہے، واللہ اعلم

پھر حضرت ابی بن کعب کی اس روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ رجم کو قرآنی حکم اسی منسوخ التلاوۃ آیت کی وجہ سے تسلیم کرتے تھے، مگر کنز العمال کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو سنت نبوی سمجھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں تو صحیح نہیں ہوسکتیں، اس لیے لامحالہ ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑے گی، میرے خیال میں دوسری بات اس لیے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس رائے میں ان کے ساتھ بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ بھی شریک ہیں، مگر دوسری میں یہ تنہا ہیں،

دوسری روایت ابو امامہ یا ابو اسامہ[۱] نے اپنی صحابیہ خالہ یا پھوپھی سے کی ہے، رجال اور طبقات کی کتابوں میں نہ تو ابو امامہ بن سہیل کے حالات ملتے ہیں اور نہ ان کی پھوپھی اور خالہ کا ذکر ملتا ہے کہ ان کے نام ونسب اور روایت حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکے، اس لیے اصول درایت سے قطع نظر یہ "جہالت رواۃ" اس روایت کے ناقابل اعتبار ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے،

تیسری روایت حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے، اس روایت کے آخری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس ٹکڑے کا ذکر آیا تو آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا، فکانہ کرہ ذالک

ایک طرف تو کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کلام الٰہی کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا تو آپ خود بھی اسے مستحضر کرلیتے تھے، اور فوراً کاتبین وحی کو بلاکر اس کا املا کرادیتے، اور حاضرین کو سناکر یا نمازوں میں پڑھ کر اس کا عام چرچا فرمادیتے تھے، اسطرح وہ نازل ہوتے ہی سینکڑوں سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہوجاتا تھا، مگر اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ کلام الٰہی کا کوئی حصہ ایسا بھی تھا کہ آپ نے نہ اسے کسی کو سنایا اور نہ املا کرایا، بلکہ جب آپ سے اس کے لکھوانے کی فرمایش کی گئی تو آپ نے

---

[۱] مستدرک میں ان کا نام ابو امامہ درج ہے، اور فتح الباری میں ابو اسامہ بن سہیل۔

ناگواری ظاہر کی، حالانکہ اس میں ناگواری کی کوئی بات نہیں تھی، آپ یہ فرما سکتے تھے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے،

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جوں ہی اس کا نزول ہوا، حضرت ابن عاصؓ یا حضرت عمرؓ آپ کی خدمت میں گئے (لما نزلت اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے لکھنے کی فرمائش کی، مگر آپ نے اس سے انکار فرمایا، آخر کار ایسی آیت کے نزول سے فائدہ ہی کیا تھا جس کی نہ تو ایک دن تلاوت ہی ہوئی اور نہ اس پر ایک دن عمل ہوا؟

اس روایت کا وہ حصہ اور زیادہ قابل غور ہے جس میں اس ٹکڑے کے معنوی نقص پر روشنی ڈالی گئی ہے، حضرت ابنؓ عاص یا حضرت عمرؓ نے زیدؓ بن ثابت کو مخاطب کرکے فرمایا، آپ ذرا اس کے مفہوم پر غور کریں، اس میں مطلقاً بوڑھوں کے مرتکب زنا ہونے کی سزا رجم قرار دی گئی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں، مگر عمل اس کے خلاف ہے عمل تو یہ ہے کہ اگر بوڑھا شادی شدہ ہوا تو اس کو رجم کیا جائے گا، اور اگر اس نے شادی نہیں کی ہو اور بڑھاپے میں اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا تو اس کو محض سو کوڑے کی سزا دی جائیگی، اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محض بوڑھے زانیوں ہی کو رجم کیا جائیگا، لیکن عملاً یہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان شادی شدہ ہو اور وہ زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو بھی رجم کیا جائیگا، مقصد یہ ہے کہ یہ آیت اس لئے منسوخ قرار دی گئی کہ اس میں معنوی نقص بھی ہے اور تعامل کے خلاف بھی، اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوئیں،

ایک یہ کہ جن صحابی نے اس پر یہ عقلی اعتراض کیا ہے، ان کے نزدیک کلام الٰہی کے مقابلہ میں تعامل زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور کلام الٰہی کے منسوخ ہونے کے لیے خلاف تعامل ہونا کافی ہے،

دوسری یہ کہ کلام الٰہی کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو محض اپنے معنوی نقص کی وجہ سے منسوخ ہوا اور یہ معنوی نقص خدا اور اس کے رسول نے نہیں، بلکہ ایک صحابی نے بتایا، غور کیجئے کہ اس روایت کو تسلیم کرلینے کے بعد ہمیں دین کی کتنی بنیادی باتوں سے دست بردار ہونا اور ان پر تیشہ چلانا پڑے گا، (باقی)

اسد بیگ قزوینی

(از جناب نذیر احمد صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی ڈی لٹ)

اسد بیگ قزوینی اکبر کے آخری عہد کی ایک مشہور شخصیت گزری ہے، چنانچہ اس نے عہد اکبری کے آخری تین سالوں کے جو سیاسی اور معاشرتی حالات "وقائع اسد بیگ" میں جمع کر دیے ہیں، وہ تاریخ کے ایک بڑے خلا کو پورا کرتے ہیں، اس کی اہمیت کے پیش نظر گذشتہ چند سالوں میں کتاب مذکور پر بعض فضلا[1] نے مضامین بھی لکھے، مگر ان میں سے کسی ایک مضمون میں بھی اسد بیگ کی فضیلت پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکی ہے، زیر نظر مضمون کو ان مضامین کا تکملہ سمجھنا چاہیے،

اسد بیگ قزوین[2] کا رہنے والا تھا، چنانچہ خود اس نے "وقائع اسد بیگ" میں اپنے باپ کا نام محمد مراد[3] لکھا ہے لیکن ڈاکٹر محمد عزیز احمد نے اسی کتاب کے حوالے سے اس کے باپ کا پورا نام محمد مراد[4] بیگ آقا ملاتی تجویز کیا ہے، ریو[5] نے محمد مراد کے بجائے خواجہ مراد لکھا ہے، اور بظاہر اس کا ماخذ مراۃ جہاں نما ہے،

۹۸۰-۹۶۹

[1] ایلیٹ و ڈاؤسن، (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ج ۶ ص ۱۵۰-۱۷۴) ریو: فہرست مخطوطات فارسی موزۂ برطانیہ ج ۳ ص ڈاکٹر محمد عزیز احمد: انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن ج ۱، ص ۸۰-۹۰ ڈاکٹر پی ایم جوشی: پوتہ دار کمومویشن ص ۱۸-۱۹۶

[2] خوشگو نے اس کے حسب و نسب کے بارے میں حسب ذیل اطلاع بہم پہنچائی ہے:

قزانی الاصل و از قدیمان سلسلۂ علیہ تیموریہ بودہ (حواشی میخانہ ص ۴۱) غالباً ایتھے کو اسی وجہ سے مغالطہ ہوا، اور انھوں نے اس کو آل تیمور سے متعلق بتایا ہے (فہرست یادلی عمود ۴۲۳ نمبر ۲۸) [3] ایلیٹ: ص ۱۵۰، ریکارڈس ص ۸۰ (Mulaki [4]

[5] ریو: ص ۹۱، و شہ ص ۴۵۵

تذکرۂ میخانہ میں بھی خواجہ مراد ہی ملتا ہے. میخانہ سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسد بیگ نے اپنے وطن ہی میں رشد و تمیز حاصل کی اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل بھی قزوین ہی میں ہوئی، ابھی نوجوان ہی تھا کہ شوق سفر خراسان کی طرف لے گیا، ہرات پہنچ کر خواجہ افضل[1] وزیر کا دوات دار مقرر ہو گیا، ہرات اس زمانے میں بھی علم و فضل کا بڑا مرکز تھا، چنانچہ یہاں کے فضلا کی صحبت میں اس کو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کا خوب موقع ملا، اور یہیں اس نے مشق سخن بھی جاری کی میخانہ کے الفاظ یہ ہیں:

در آں جا (ہرات) با مردم اہل صحبت[2] داشتہ و از صحبت یاراں در مقام انتظام نظم شدہ"۔

ہرات میں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد ہندوستان کی سیاحت کا شوق غالب ہوا، اور بہت جلد وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوا، اور وہ اکبر کے دربار میں پہنچ کر شیخ ابوالفضل سے متعلق ہو گیا، اسد بیگ اور ابوالفضل "وقائع اسد بیگ"[3] سے پتہ چلتا ہے کہ ابوالفضل کے قتل کے وقت اس کی صحبت میں ۱۰ سال گزر چکے تھے. چونکہ قتل کا واقعہ ۱۰۱۱ھ کا ہے، اس لیے اسد بیگ کے ورود ہند کا زمانہ ۹۹۲ھ[4] کے قریب کا ہوگا، اور اگرچہ عہد اکبری کی کسی معتبر تاریخ میں اسد بیگ کا ذکر نہیں ملتا، لیکن چونکہ وہ براہ راست ابوالفضل کا ملازم تھا، اور شاہی دربار سے اس کو کوئی بڑا منصب نہیں ملا تھا،

---

[1] ریو (ص ۹۹۰) سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، بظاہر مولف مراۃ جہان نما کے سامنے تذکرۂ میخانہ تھا، وزیر مذکور کی شخصیت کا باقاعدہ تعین نہیں ہو سکا ہے [2] ہفت اقلیم میں بھی ہے: اسد بیگ لطف طبع و شگفتگی خاطر دگرمی ہنگامہ موصوف بود، ہموارہ خیال مجالست اہل طبع و اصحاب فہم بر لوح خاطری نگارد و روزگار بہ شادمانی و ابتہاج می گزارند، تمام مراد وش آنکہ با یارے بہ صحبت نشیند و پیوستہ فکر خاطرش اینکہ با دوستے الفت گزیند، (بحوالہ میخانہ ص ۵۵۴ ح) آتشکدہ میں ہے: گویند بسیار اہل صحبت فضحا و باعث جمعیت احبا بودہ (ایضاً) [3] ملاحظہ ہو ایلیٹ ص ۱۵۰، ریو ص ۹۹۰، رکارڈس ص ۸۰، جوشی ص ۸۳، [4] احمد علی نے مخزن الغرائب میں اسد کا ورود ہند عہد جہانگیر بتایا ہے جو بالکل غلط ہے، ملاحظہ ہو سفینۂ خوشگو و بہار ہمیشہ بہار ہنر گر ص ۱۸۰) پروفیسر محمد شفیع نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ریو کے حوالے سے ورود کا سنہ ۱۰۱۱ ہجری بتایا ہے (میخانہ ص ۵۵۴)۔ اصل میں یہ ابوالفضل کے قتل کا سنہ ہے جیسا کہ ریو نے بھی لکھا ہے، (ص ۹۹۰)

اس لیے اس کا ذکر نہ ہونا زیادہ تعجب خیز نہیں، لیکن ابوالفضل کے اکبرنامہ اور آئین اکبری میں اسد بیگ کو جگہ نہ ملنا ضرور موجب حیرت ہے، ایک بات یہ ضرور ہے کہ چونکہ اسد فارسی کا اچھا خاصہ شاعر تھا، اور فارسی شعرا کے تذکرے میں اس کا برابر ذکر ملتا ہے، اس لیے بدایونی اور طبقات اکبری کے شعرا کی فہرست میں اس کو جگہ ملنا چاہیے[1]، جبکہ ان دونوں کے بہت ہی قریب العہد تصنیف تذکرہ ہفت اقلیم (۱۰۰۲) میں اسد کی شاعری کی خاصی[2] تعریف و توصیف ملتی ہے، لیکن اس میں بھی اسد کے ہندوستان آنے کا ذکر نہیں پایا جاتا، لیکن چونکہ خود اسد کا اپنا بیان موجود ہے، اس لئے ان تاریخوں کے مکمل ہونے کے قبل اسد کا ہندوستان آنا بہرحال مسلم سمجھا جائے گا،

سنہ ۱۰۰۶ھ[3] میں اکبر نے ابوالفضل کو دکن کی مہم پر بھیجا، اسد بیگ بھی اپنے آقا[4] کے ہمراہ دکن گیا، اور وہاں ابوالفضل کے دوش بدوش دکن کے حالات کے سدھارنے میں مصروف رہا، سنہ ۱۰۱۱ھ[5] میں ابوالفضل کو دربار میں حاضری کا حکم ہوا، تو اسد بھی اس کے ہمرکاب آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا، لیکن سرونج[6] تک وہ اپنے آقا کے ہمراہ آیا تھا کہ ابوالفضل نے اس کو اندرجیت بندیلہ سے جنگ کرنے کے لیے چھوڑ دیا، اور خود گوپال داس کے ساتھ دربار کی طرف روانہ ہوگیا، اگرچہ اسد بیگ بذات خود اس بات پر اصرار کرتا رہا کہ کم از کم گوالیار تک وہ ابوالفضل کے ساتھ جائے، مگر آخرالذکر کسی طرح راضی نہ ہوا اور اسے خلعت وغیرہ دے کر سرونج ہی میں قیام کرنے کی تاکید کی، شیخ ابوالفضل آگے بڑھا اور سرائے برار[7] پہنچا، وہاں خیمہ زن ہوا، تو ایک جوگی نے نرسنگھ بندیلہ کی آمد کی خبر دی، اور یہ بتایا کہ اسکی نیت خراب ہے،

[1] بدایونی ۱۰۰۴ھ کی تالیف ہے، طبقات اکبری ۱۰۰۲ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے اور ہفت اقلیم بھی ۱۰۰۲ھ میں مکمل ہوئی، تصنیف امین احمد رازی سے تاریخ نکلتی ہے، [2] ملاحظہ ہو نسخہ خطی (لکھنؤ یونیورسٹی) ورق ۹۳ الف [3] اس کا خاص کام شہزادہ مراد کو آگرہ لانے کا تھا، تاکہ اسے سمجھا بجھا کر پھر دکن بھیجا جائے (اکبرنامہ ج ۳ ص ۷۴۲) [4] اگرچہ تاریخوں میں اسد کے جانے کا ذکر نہیں، مگر واپسی کا حال خود وقائع اسد بیگ میں موجود ہے [5] تکملہ اکبرنامہ ج ۳ ص ۸۱۱ [6] وقائع اسد بیگ بحوالہ ڈاؤسن ص ۸۸ [7] سرونج سے دو تین میل پر ہے، مگر تکملہ اکبرنامہ کے حوالہ کی ایلیٹ نے سرائے بنگر جو گوالیار سے چھ منزل پر ہے لکھا ہے (ج ۶ ص ۱۰۷) جبکہ اصل نسخہ میں سرائے بریر ہے (ج ۳ ص ۸۱۱)

دوسرے دن جمعہ تھا، چنانچہ نرسنگھ[1] کے آدمی ابوالفضل کے خیمہ پر حملہ آور ہوئے، شیخ کے ہمراہی سخت پریشان تھے، ابوالفضل ساتھیوں کے مشورہ سے بھاگنے پر راضی ہوگیا، مگر اتنے میں خود بندیلہ پانچ سواروں کے ساتھ آپہنچا، لڑائی شروع ہوگئی، شیخ کے ساتھیوں نے جن میں گدائی خاں اور اسکا لڑکا، جلال خاں، سلیم خاں، شیر خاں، منصور چابک، محمد خاں بیگ وغیرہ تھے داد مردانگی دی اور اپنے آقا پر نثار ہوگئے، ایک راجپوت کے ہاتھ سے ابوالفضل بھی سخت زخمی ہوا، مگر راجپوت جبار نما خاں خیل کے ہاتھوں قتل ہوگیا، گو جبار خاں بھی فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، نرسنگھ ابوالفضل کے پاس آیا، ابھی اس میں جان باقی تھی، بندیلہ نے اپنے دامن سے اس کا منہ پونچھا، کچھ باتیں بھی کرنا چاہیں مگر شیخ نے ان کا جواب نہایت حقارت سے دیا، اس کے بعد فوراً اس نے اپنی تلوار سے شیخ کا سر کاٹ لیا[2]

اسد نے چار روز بعد سرونج میں شیخ کے قتل کی خبر سنی، وہ نرسنگھ کے بھائی اندرجیت سے لڑائی کرنے کی تیاری میں مصروف تھا کہ شاہی فرمان اس کی طلبی کے لیے آگیا اور اسے آگرہ جانا پڑا[3]،

ابوالفضل کے دربار سے غیر معمولی وابستگی کے نتیجہ میں لوگ اسے شیخ ابوالفضل کہا کرتے تھے۔

---

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۱۰۴ پر اسکا نام برسنگھ دیو ملتا ہے[2] اکبر نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرائے بیرا اور انتری کے درمیان مارا گیا، ان میں تین کوس کا فاصلہ ہے (ج ۳ ص ۱۱۰۴)۔ ابوالفضل کی تاریخ قتل، مقام قتل وغیرہ کے بارے میں کافی اختلاف ہے، مترجم اکبر نامہ نے قتل کی تاریخ ۴ ربیع الاول سنہ ۱۰۱۱ھ دی ہے، اور مقام قتل سرائے بیرا (Bar) سے ایک میل آگے ہے۔ ٹی فین تھلر (Tiefenthaler) قتل کی جگہ کا نام دوم گھاٹ دیا ہے جو ہالسے ایک مغرب میں ہے، اور یہ آخری مقام دیتے سے ایک مغرب میں واقع ہے، اقبال نامہ میں تاریخ ابتداء ربیع الاول اور قتل کا سرائے بر اور انتری کے درمیان تجویز ہوئی ہے، وقائع اسد بیگ میں قتل کی تاریخ ربیع الاول بروز جمعہ دی ہے، مترجم اکبر نامہ کا خیال ہے کہ ہنری ایلیٹ کے اصل فارسی نسخہ میں لفظ برسنگھ ہی ہے، چیت مین نے ترجمہ میں نرسنگھ لکھ دیا، اس لیے قاتل کا نام برسنگھ دیو ہی صحیح سمجھنا چاہیے، (ترجمہ اکبر نامہ ص ۱۲۲۰ ج ۳) اسکے برخلاف ایلیٹ میں برسنگھ کو غلط بتایا ہے، ص ۱۵۶ ج ۶) [2] ملاحظہ ہو ایلیٹ ج ۶ ص ۱۵۵ [3] مترجم اکبر نامہ کو صحیح طور پر اعتراض ہے کہ اسد کو جب قتل کی اطلاع ملی تو اسے قاتلوں کو سزا دینے کی طرف توجہ کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس اس کا سرونج جاکر اندرجیت سے لڑنے کی تیاری کرنا اسکے خلوص کے منافی معلوم ہوتا ہے (ترجمہ اکبر نامہ ص ۱۲۲۰ ج ۳)

اسد بیگ اور اکبر

شیخ ابو الفضل[۵] کے قتل کی خبر سے اکبر کو جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے، نہ اس نے حجامت بنوائی اور نہ افیون ہی کھائی، برابر نالہ و شیون کرتا رہا، اس وقت دفعۃً اسے اسد بیگ کا خیال آیا، اور حاضرین سے اسد بیگ کے بارے میں دریافت حال کیا، اسی اثناء میں مرزا جعفر بیگ آصف خاں بھی آگیا، اس سے پوچھا کہ اسد علامی کے ساتھ تھا یا نہیں، اس نے جواب دیا کہ وہ سرونج تک مرحوم کے ساتھ تھا لیکن شیخ نے اسے مالوہ کے مفتوحہ علاقے کی نگرانی کے لیے دکن کی فوج کے ہمراہ وہیں چھوڑ دیا اور خود نئے آدمیوں کے ساتھ جو مالوہ میں بھرتی ہوئے تھے، گوپال داس نکھا کے ہم رکاب روانہ ہوگیا، اسد علامی کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ تھا، مگر خود شیخ علامی نے اس کو وہیں ٹھہرنے پر مجبور کردیا، بادشاہ نے آصف خاں کو ایک فرمان لکھنے کا حکم دیا کہ اسد بیگ سارا سامان چھوڑ کر اپنے آدمیوں کے ہمراہ فوراً دربار آجائے، اسد اس فرمان پر دربار کی طرف روانہ ہوا، یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ[۱] بادشاہ غلط فہمی کا شکار ہے، اس کا خیال ہے کہ اسد نے اپنے آقا کی حفاظت میں ضروری احتیاط نہیں کی، چنانچہ خود اس نے اپنے کان سے یہ حکم سنا کہ

"اسے حمام میں لے آؤ، میں اپنے ہاتھ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں گا۔"

مگر اسد نے راجہ رام[۲] کے توسط سے جو حالات بیان کیے اس سے بادشاہ کو پورا یقین ہوگیا کہ اسد بے قصور ہے،[۳] اور اس کو خلعت عطا کیا، پھر اسد نے ابو الفضل کے جواہرات کا وہ بکس پیش کیا جو مرحوم[۴] کے ایک وفادار ملازم نے بڑی مشکلوں سے بچا لیا تھا، بادشاہ نے اسد کو یورباشی کے عہدے پر فائز کیا، اور محافظ خاصہ[۵] کا افسر بھی مقرر کیا، اور ایک بڑی جاگیر[۶] بھی عنایت کی،[۷]

۱؎ ایلیٹ ص ۱۵۱ ۲؎ ریکارڈس ص ۸۸ جہاں دونوں کی پوری گفتگو درج ہے ۳؎ ایلیٹ ص ۱۵۱ ۴؎ ریکارڈس ص ۹۸ ۱

۵؎ ایلیٹ ص ۱۵۱ ۶؎ ایضاً جو شاہ قلی خاں سے ضبط کرلی گئی تھی جس سے اسد کو پہلے سال ستر ہزار، دوسرے سال بیس ہزار اور تیسرے سال تیس ہزار کی آمدنی ہوئی، ۷؎ ایلیٹ ج ۶ ص ۱۵۵ (قتل کا سنہ ایلیٹ میں غلطی سے ۱۰۱۱ھ درج ہوگیا ہے)

اسی درمیان میں راے رایان کی سرکردگی میں ایک فوج نرسنگھ کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوئی[۱]، اس فوج نے اسے ایک قلعہ میں گھیر لیا لیکن وہ نہایت ہوشیاری سے رات کی تنہائی میں نکل بھاگا[۲]، اس کی اطلاع جب دربار میں پہنچی تو بادشاہ بہت خفا ہوا، اور اس نے اسد بیگ کو حالات کی تفتیش کیلئے بھیجا، اسد بیگ نے بڑی ہوشیاری سے تفتیش کا کام کیا، اور یہ معلوم ہوا کہ اس میں تمام افسر قصوروار ہیں، اس کے بھاگ جانے کی ذمہ داری کسی ایک شخص پر عائد نہیں ہو سکتی[۳]، اس تحقیقات کے بعد اسد بیگ اور بادشاہ سے گفتگو ہوئی، اس سے اس کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے، بادشاہ نے پوچھا، اس میں کس کا[۴] قصور تھا، اسد نے واقعات کی تفصیل عرض کرنا چاہی، مگر بادشاہ حالات معلوم کرنے کے لیے اس درجہ بیقرار تھا کہ اس نے پھر وہی پہلا سوال کیا، اسد نے جواب میں عرض کیا کہ اس کے خیال میں کسی سے جان بوجھ کر غلطی نہیں ہوئی، یہ ایک بڑی چوک کا نتیجہ ہے جس میں سب شامل ہیں، شیخ فرید نے کہا کہ چوک بھی تو قصور ہے، اسد نے جواب دیا، قصور اور خطا، میں نیت کو دخل ہوتا ہے، مگر جو غلطی غفلت کی وجہ سے ہو جائے اسے چوک کے علاوہ اور کچھ نہ کہیں گے، گفتگو کا سلسلہ اور بڑھتا مگر بادشاہ نے اسکو ختم کرتے ہوئے کہا کہ اسد کا خیال بالکل صحیح ہے، جس انداز میں اس نے یہ کہا، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ اسد کی باتیں اور اس کا طرز استدلال بادشاہ کو بہت پسند تھا، اور اس نے اسد کے درجات میں مزید اضافہ کیا[۵]۔

اسد کی بیجاپور روانگی اکبری دربار میں اسد کا درجہ روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اسے دکن کی سفارت پر مامور کیا گیا، ۱۰۱۱ھ میں ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے اپنی لڑکی بیگم سلطان[۶] کو شہزادہ دانیال

[۱] ریکارڈس ص ۵۹ [۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایلیٹ ص ۱۶۰ [۳] ایضاً، اسد کے ہمراہ اس کا ایک عزیز محمد خان تاتار بھی تھا [۴] ایضاً ص ۱۶۴ [۵] ایلیٹ (ص ۱۵۲) نے لکھا ہے کہ اس کام کو خوش اسلوبی سے پورا کرنے کے صلہ میں اس کو Treasurer of Offerings کے عہدہ پر فائز کیا تھا [۶] اسکا نام سلطان بیگم بھی دیا ہے (فرشتہ ج ۲ ص ۲۷۷ بساتین ص ۲۵۵)

کے نکاح میں دینے[1] کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس لیے اکبر نے میر جمال الدین[2] حسین انجوے شیرازی کو اس کام کی تکمیل کیلئے بیجا پور بھیجا، مگر اس میں غیر معمولی تاخیر ہوتی گئی، جو چند وجوہ سے بہت مضر[3] تھی، بادشاہ کو میر صاحب کی غیر معمولی تاخیر سے بڑی بدگمانی تھی، اسد بیگ کو بیجا پور روانہ کرنے کا مقصد اوّل یہی تھا کہ وہ میر کے کام کو پورا کر کے جلد سے جلد دربار واپس ہو جائے، اسلیے بہت جلد سامان سفر تیار ہو گیا، شاہی وزیر مرزا غیاث بیگ[4] نے مصارف سفر کے لئے بیس ہزار روپے منظور کئے، اور اسد ۱۰۱۲ھ میں اپنے سفر پر روانہ ہوا، اجین میں مرزا شاہ رخ[5] سے ملا، وہاں سے برہان پور گیا، پھر بیجاپور کیطرف رخ کیا، منگلبیرہ[6] کے قریب پہنچا تھا کہ میر جمال الدین اور بیجا پور کے چند افسروں نے جن میں مصطفٰی خاں، ہیبت خاں اور رومی خاں قابل ذکر ہیں، استقبال کیا، اور شام کو وہ منگلبیرہ پہنچ گیا، اور میر جمال الدین کے ساتھ چند دن قیام کیا، ایک روز ابراہیم عادل شاہ کی لڑکی[7] نے اسد بیگ اور میر مذکور کو آخر الذکر کے حکم سے مدعو کیا، دعوت میں بڑی خاطر مدارات ہوئی، واپسی پر طرح طرح کے تحائف ملے، جن میں قیمتی جواہرات کے علاوہ ایک بیش قیمت ہاتھی اور دو نہایت عمدہ عربی گھوڑے بھی تھے، عادل شاہی امراء نے بھی تحائف کی پیش کش کی، ابراہیم عادل شاہ کی خواہش[8] یہ تھی کہ اسد ابھی عجلت نہ کرے، اس کے لیے اس نے طرح طرح کی شکلیں اختیار کیں، مگر اسد نے ایک نہ سنی، بالآخر عادل شاہ نے اسد کو بیجا پور آنے کی دعوت دی، وہ دوسری شعبان[9] ۱۰۱۳ھ کو شہر کے قریب پہنچ گیا،

---

[1] اکبر نامہ (ج ۳ ص ۵۸۰، ۸۲۳، ۸۲۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ابراہیم عادل شاہ کیطرف سے پیغام بھیجا گیا تھا، مگر فرشتہ اور بساتین سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر بادشاہ کی ذاتی تجویز تھی (فرشتہ ج ۲ ص ۸۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا پہلا لڑکا ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوا تھا، اس لحاظ سے اگر بیگم سلطان اسکی سب سے بڑی لڑکی ہوگی تو بھی اسکی عمر ۹ سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ [2] ایلیٹ ج ۶ ص ۱۶۲ جوشی ص ۱۸۵، آئین ج ۱ ص ۴۵۰ فرشتہ ج ۱ ص ۲۶۷ اکبر نامہ ص ۸۰۰، وغیرہ۔ میر جمال الدین فرہنگ جہانگیری کا مولف ہے، اکبر کے عہد میں بڑے بڑے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہا، اسکے حالات کے لیے ملاحظہ ہو، آئین اکبری ج ۱، ماثر الامراء ۱، وغیرہ [3] اکبر کی بھیجی سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً شادی کی تجویز اسی کیطرف سے ہوئی ہوگی [4] جوشی ص ۱۸۰، [5] رکارڈس ص ۹۸ [6] جوشی ص ۱۸۰ [7] جوشی ص ۱۸۰-۱۸۱، اس وقت بھی لڑکی کی عمر ۱۲ سال سے کم ہی ہوگی، اس کا اپنے شہر بیجا پور سے باہر منگلبیرہ میں میر جمال الدین کی نگرانی میں مقیم رہنا کچھ حیرت خیز معلوم ہوتا ہے [8] ایضاً [9] ایضاً ص ۱۸۹

مگر احباب کے مشورے سے ۱۳ دن قیام کرکے شب برات کے بعد بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونا مناسب خیال کیا، اس قیام کے دوران میں دو عادل شاہی رکن سلطنت روزانہ اسد بیگ کی خدمت میں آتے، ان کے علاوہ مولانا ملک قمی[1]، مولانا ظہوری[2] اور میر کمال الدین بھی پابندی سے آتے جن کی صحبت میں اسد بے حد مسرور و محظوظ ہوتا، ۱۰ شعبان[3] کو سلطان سے ملاقات کی تاریخ مقرر ہوئی، اسد کو جھیل کے کنارے ایک پرفضا محل میں اتارا گیا، اس نے ابراہیم عادل شاہ کو اکبر کا فرمان دیا، سلطان نے ضروری تنظیم و تکریم کے ساتھ اسے لیا اور شاہنواز خاں نے اسے پڑھا، جس کا آخری[4] حصہ یہ تھا کہ "جو کچھ اسد بیگ سلطان کی خدمت میں زبانی عرض کرے، اس پر فرمان سمجھ کر عمل ہونا چاہیے، اور جو کچھ والی بیجاپور کو کہنا ہو اسے بھی اسد سے کہدیا جائے، اس پر عمل ہوگا، اس سے ہر بات پوست کندہ کہی جانی چاہیے، اور میر جمال الدین کو واپس کرنے میں کسی قسم کا توقف نہ ہونا چاہیے، تاکہ وہ اسد کے ساتھ دربار میں حاضر ہو سکے"۔

ابراہیم عادل شاہ کی خواہش تھی کہ اسد بیگ کچھ دن اور بیجاپور میں قیام کرے، وہ صرف[5] اس شرط پر راضی ہوا کہ سلطان اپنا محبوب ہاتھی چنچل[6] طلائی زیور سے آراستہ کرکے دربار اکبری میں پیش کش کرے، وہ اس کے لیے آمادہ ہو گیا، چند دنوں میں تقریباً دس من سونے کا زیور تیار ہوا اور اسد بیگ کی روانگی کا وقت آگیا، بادشاہ نے ایک سیاہ عربی گھوڑا جس کی قیمت تین ہزار ہن تھی، مزید پیش کش کیا، ۲۰ شعبان کو اسد بیگ شاہی[7] محل میں مدعو کیا گیا، محفل رقص و سرود بھی گرم ہوئی،

---

[1] ظہوری کا خسر تھا [2] ظہوری صاحب سہ نثر ظہوری [3] جوشی ص ۱۹۰ [4] ایضاً ص ۱۹۱، نیز ملاحظہ ہو الیٹ ص ۱۶۳ [5] جوشی ص ۱۹۲ [6] اسد بیگ نے چنچل اور گرانبار کی لڑائی کا ذکر وقائع میں کیا ہے، اس لڑائی میں کوئی بات ایسی ہوگئی جو اکبر کو ناپسند تھی، اس کے چند ہی دنوں بعد اکبر کا سانحہ ارتحال بھی ہوا (الیٹ ۶، ص ۱۷۰) جہاں گیر نے بھی ایک ہاتھی کو جو ابراہیم نے دیا تھا اس کی خدمت میں پیش کیا، اس ہاتھی کا پہلا نام بخت بلند تھا (تزک ج ۱ ص ۱۹۹) [7] جوشی ص ۱۹۲

اس میں بادشاہ اس درجہ محو تھا کہ اسد کے سوالات کے جواب بھی نہیں دیتا تھا، اسی اثنا میں سلطان کی نظر اسد بیگ کی شصت[1] مریدی پر پڑی، وہ اسد کو گرو بھائی کہتا تھا چنانچہ شصت مریدی کا اسد سے لیکر خود اپنے کو بادشاہ کا مرید کہنے لگا، اسد اس کو کسی حال میں الگ نہیں کرنا چاہتا تھا، ابراہیم نے اسے اس شرط پر واپس کیا کہ وہ اس کے لیے جلد سے جلد ایک دوسری شصت مریدی بھیجے گا۔

اسد بیجاپور سے ۲ رمضان کو منگلبیرہ روانہ ہوا، اور یہاں مختصر قیام کے بعد شہزادی، میر جمال الدین حسین اور دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ احمد نگر پہنچا، مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ بھی شہزادی کے ہمرکاب تھا، جب یہ لوگ احمد نگر پہنچے تو شہزادہ دانیال نے اسد بیگ کی کامیابی پر مبارکباد پیش کی، باغ فرح بخش میں ایک شاہانہ جشن[2] ترتیب دیا گیا، جس میں شہزادے نے اسد بیگ کو خلعت، عراقی گھوڑا اور دوسرے تحائف عطا کیے، اس کے بعد اسد بیگ آگرہ روانہ ہوا،

ان ہی ایام میں مریم مکانی[3] کی وفات کی وجہ سے بادشاہ اور تمام ارکان دولت نے بال منڈوا دیے تھے[4]

---

[1] یہ نشان اخوت تھا جو دین الٰہی کے تمام پیرو پہنتے تھے، اس پر "اللہ اکبر" کا فقرہ کندہ تھا، آئین اکبری میں ہے، "شصت خاصہ کہ بر و اسم اعظم و طلسم اقدس "اللہ اکبر" نقش کردہ اند بدو (به مرید) سپارند و این معنی تلقین یابد: شصت پاک و نظر پاک خطائے نکند" مزید ملاحظہ ہو تزک جہانگیری ج ۱ ص ۶۰-۶۱، رائے چند چودھری، دین الٰہی ص ۲۰۸ [2] گرابھی باقاعدہ شادی کے رسوم پورے نہیں ہوئے تھے، اور اس جشن کا تعلق جشن شادی سے نہ تھا، باقاعدہ شادی صفر ۱۰۱۳ھ میں گوداوری کے کنارے عمل میں آئی، اس وقت بادشاہ نے ایک سکہ جاری کیا جس کے ایک رخ پر رام اور سیتا ناگری حرفوں میں لکھا ہے اور دوسری طرف ایک شہزادہ معہ تیر و کمان کے ایک برقع پوش خاتون کے ہمراہ نظر آرہا ہے، ملاحظہ ہو جوشی ص ۱۹۵ متن و حاشیہ [3] ملاحظہ ہو اکبرنامہ ج ۳ ص ۸۳۰-۸۳۱، مریم مکانی کا انتقال ۱۹ شہریور مطابق ۲۹ اگست ۱۶۰۴ء کو ہوا (یعنی جلوس اکبری کے ۴۹ ویں سال جو ۱۰ شوال ۱۰۱۲ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۶۰۴ء سے شروع ہوا تھا گویا شروع ہونے کے ۵ ماہ ۱۸ دن بعد) اس لیے اس واقعہ کی تاریخ ربیع الاول ۱۰۱۳ھ ہوئی، اس لحاظ سے زبدۃ التواریخ کی تحریر کردہ تاریخ یعنی ۱۰۱۲ھ غلط ہے، نیز ملاحظہ ہو ترجمہ اکبرنامہ ص ۱۲۴۴ ج ۳ [4] اس رسم کو بھدرا کہتے ہیں، ملاحظہ ہو رکارڈس ص ۹۸ متن و حاشیہ

اس لیے اسد نے بھی اس پر عمل کیا اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اکبر کو دکن کے تحائف بے حد پسند آئے، ان تحائف میں تمباکو[1] بھی تھا، بادشاہ نے شاہی معالج کی مرضی کے خلاف اس کو پیا، اس وقت خان اعظم[2] بھی موجود تھا، حکیم موصوف تمباکو کی برائی کیا کرتا تھا، مگر اسد بیگ نے اس طرح اس کی توصیف کی کہ خود بادشاہ کو اسد بیگ کا طرز استدلال بہت پسند آیا اور چند روز میں تمباکو کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی، مگر بادشاہ نے اس کو اپنے معمولات[3] شامل نہیں کیا،

اسد بیگ کی سفارت دکن بار دوم

اس کے بعد اکبر نے اسد بیگ کو بیجاپور[4]، گولکنڈہ، بیدر اور کرناٹک کی سفارت کے لیے نامزد کیا، اور اس سے کہا کہ جب وہ پہلی مرتبہ میر جمال الدین کو لینے گیا تھا تو بہت عجلت تھی، اس لیے وہاں قیام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اب کی بار اطمینان سے اور جتنا اس کا جی چاہے قیام کر سکتا ہے، بادشاہ کی خواہش صرف یہ ہے کہ وہاں جتنے قیمتی جواہرات اور بیش قیمت ہاتھی دستیاب ہو سکیں ان کو جمع کر لیا جائے، خود اس کی خواہش کا یہ حال تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جب تک دکن میں ایک عمدہ ہاتھی اور کوئی قیمتی جواہر باقی ہے، اس وقت تک اسے اپنے کام سے باز نہ آنا چاہیے، اس کے بعد اسد بیگ نے سفر کی تیاری شروع کی، اگرچہ وہ دو[5] سو سواروں کا افسر تھا، مگر اس نے چھ سو عراقی، خراسانی اور ترکستانی سواروں کا دستہ اپنے ساتھ لیا، اور ہر سوار کو ایک عمدہ گھوڑا دیا، اور تین چار مہینے کی پیشگی تنخواہ بھی دیدی شاہ علی اصفہانی کو بخشی مقرر کیا، اور چند دوسرے محافظ اور تیر اندازوں کے ساتھ دکن روانہ ہوگیا، راستے میں اس کو راجہ بھوج[6] کے آدمیوں سے لڑنا پڑا، اور اس میں کامیابی کے بعد اپنا سفر جاری رکھا، اجین پہنچ کر شاہ رخ کے ساتھ چار دن قیام کیا، اسی درمیان میں بادشاہ کے انتقال کی خبر آگئی، مگر اس نے سفر جاری رکھا،

---

[1] دکار، ص ۸ و ۹ [2] ایلیٹ ص ۱۶۵-۱۶۷ [3] بزم تیموریہ میں ہے کہ بیجاپور سے واپسی کے بعد اسکو شاہی حاجب مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی منصب اور ستر ہزار روپیہ کا وظیفہ بھی مقرر ہوا (ص ۲۳۲) [4] ایلیٹ ص ۱۶۵-۱۷۰ [5] ص ۱۶۹ [6] دکار، ص ۹۰

راستے میں شاہ علی بخشی نے اس کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں، مگر بالآخر شاہ رخ کی حمایت سے وہ برہان پور پہنچ گیا، وہاں کے حاکم خواجہ ابوالحسن نے بڑی عزت و تکریم کی، اسی اثنا میں جہانگیر کی تخت نشینی کی خبر ملی، جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے چند ہی دن بعد اسد بیگ کو واپس بلاکر اس کو عہدے سے معزول کر دیا،

اسد بیگ اور جہانگیر | اسد بیگ شاہی فرمان کے مطابق واپس آیا تو بادشاہ کو بے حد خفا پایا، اس نے اعلان کر دیا کہ اسد بیگ کو کسی عہدہ پر مامور نہیں کیا جا سکتا، اس کا جی جہاں چاہے چلا جائے، مگر ملا اکبر عزیز[1] کا بیان ہے کہ

"اسد بیگ کو جہانگیر کے دربار میں حاضری کا حکم صادر ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بجو اور دوسرے امراء جو ابراہیم عادل شاہ کے حالات دریافت کرنے کے لیے بیجاپور بھیجے گئے تھے، وہ اکبر کے سانحۂ ارتحال اور جہانگیر کی تخت نشینی کی اطلاع پاکر آگے نہیں بڑھے اور آگرہ واپس ہو گئے، لیکن اسد اطلاع پانے پر بھی برہان پور چلا گیا، بہر حال اسد جہانگیر کے سامنے حاضر ہوا، اور امیرالامراء شریف خاں کی سفارش پر اسے معاف کر دیا گیا۔"

لیکن باوجود معزولی کے اسد بیگ کی اطاعت[2] فرماں برداری میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر بادشاہ کی ناخوشی ختم ہوئی، اور اسے دربار میں اعزاز حاصل ہو گیا، اور پیش[3] دو خان کے معزز لقب سے سرفراز ہوا، مگر ملا اکبر عزیز نے وقائع ہی کے حوالے سے اس کا خطاب مشرف خاں[4] لکھا ہے،

---

[1] ایلیٹ ص ۱۷۰، [2] رکارڈس ص ۹۰ [3] اسد بیگ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر نے اسے یہ خطاب عطا کیا تھا (ایلیٹ ص ۱۷۱) [4] ایلیٹ ص ۱۵۰، ریو ص ۹۷۹، جوشی ص ۲۸۱، نشتر عشق بحوالہ حواشی میخانہ ص ۹۷. ان سب بیانات کے مطابق آخری زمانے کا یہ خطاب تھا، مگر اکبر کے زمانے میں دکن میں ایک پیش رو خان کا خطاب یافتہ تھا، جس کو مترجم اکبرنامہ نے اسد بیگ ہی خیال کیا ہے (ملاحظہ ہو اکبرنامہ ج ۳ ص ۸۷، و ترجمہ ص ۱۱۵۰ حاشیہ ۱۷) [5] رکارڈس ص ۹۸

تذکرہ میخانہ میں دربار جہانگیری سے معزولی کا ذکر بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس کا بیان ہے کہ اکبر[۱] کی وفات کے بعد جہانگیر نے اسے اپنے بندگان میں داخل کر لیا تھا، مگر اسد کے ذاتی بیان کے مقابلے میں مولف میخانہ کا بیان قابل قبول نہیں ہو سکتا،

میخانہ میں[۲] ہے کہ اس کا مولف (ملا عبد النبی قزوینی فخر الزمانی) ۱۰۲۲ھ میں اسد بیگ سے جو اس کا ہم وطن تھا، سندور میں ملا تھا، اور اسی سال جہانگیر نے اسے زمانہ بیگ مہابت خان[۳] کے پاس بنگش بھیج دیا تھا، مگر صحف ابراہیم[۴] سے پتہ چلتا ہے کہ عہد جہانگیری میں مرزا جعفر بیگ آصف خاں کے وسیلے سے وہ کابل کا وزیر بخشی مقرر ہو گیا تھا، چونکہ آصف خاں اسد بیگ کا عزیز[۵] اور ہم وطن تھا اور اس نے مختلف موقعوں پر اسد کی حمایت کی تھی خصوصاً ابو الفضل کے قتل کے بعد دربار میں حاضری کے لیے فرمان بھیجنے کے موقع پر، اس لیے اس کے توسط سے اسد کا کابل کا بخشی مقرر ہو جانا قرین قیاس ہے، جب کہ خود میخانہ کے بیان سے اس کا اطراف کابل (بنگش) جانا ثابت ہے۔

اسد بیگ کی وفات | ایلیٹ[۶] نے اسد بیگ کی وفات کا زمانہ ۱۰۴۱ھ یعنی ابتدائے عہد شاہجہانی بتایا ہے، اور ریو[۷] وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی ہے، سفینۂ خوشگو[۸] میں اوائل زمانہ شاہجہاں (بلا قید تاریخ) بتلایا گیا ہے، اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ توران میں اس کی وفات ہوئی تھی،[۹] ریو[۱۰] نے مراۃ جہاں نما کے حوالے سے سنہ وفات ۱۰۳۱ھ دیا ہے، جس کی تغلیط یا تصحیح کا کوئی قرینہ ہمارے پاس نہیں ہے، البتہ مولف میخانہ سے اسد بیگ کی ملاقات ۱۰۲۲ھ[۱۱] میں ہوئی ہے اور اسی کے یہاں سے ۱۰۲۸ھ تک اس کا بقید حیات ہونا واضح ہے

اسد کی تالیفات | تذکرہ میخانہ[۱۲] نے اس کی حسب ذیل تصنیفات کا پتہ دیا ہے:-

---

۱؎ ص ۵۵۵ ۲؎ ایضاً ۳؎ عہد جہانگیری کا ایک نہایت ممتاز امیر اور شعرا و فضلا کا نہایت قدر دان تھا، اس کی قدر دانی کیلیے ملاحظہ ہو میخانہ ص ۱۹۴، ۱۵۵، ۳۱۵، ۲۳۶، ۲۹۶، ۳۶۹، ۴۱۲، ۴۳۱، ۵۰۳، ۵۱۱، ۵۵۵، ۵۶۲۔ اس کا لڑکا مرزا امان اللہ بھی شعرا کا بڑا قدر دان تھا ۴؎ نسخۂ نادر آغا ص ۳۴ ۵؎ جوشی ص ۱۰۸، حاشیہ ۳۰ اس کے حالات آئین اکبری اور مآثر الامرا وغیرہ میں درج ہیں ۶؎ ص ۱۵۴ ۷؎ ص ۹۰۱، ۸؎ جوشی ص ۴۴، ۹؎ میخانہ ص ۵۵۴ ۱۰؎ ص ۹۷۹ ۱۱؎ میخانہ ص ۵۵۵ ۱۲؎ ایضاً

(۱) دیوان مشتمل بر ۲۰ ہزار ابیات (۲) مثنوی در بحر مخزن و خسرو شیریں،

ریئیو[1] مراۃ جہاں نما کے حوالے سے دیوان کے اشعار کی تعداد بھی لکھی ہے، اور اس کو چند مثنویوں کا مصنف بھی بتایا ہے، مگر ان کے نام نہیں لکھے ہیں، اس کے مقابلہ میں صحف ابراہیم[2] میں اس کے اشعار کی تعداد ۲ ہزار بتائی گئی ہے، ہفت اقلیم[3] میں اسد بیگ کی غزلیات و رباعیات کے چند اشعار لکھے ہیں جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس کا کلام ایک ہزار دو ۱۰۰۲ ہجری کے قبل مدون ہو چکا تھا،

(۳) وقائع اسد بیگ۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی دریافت نے اسد بیگ کی شخصیت کو کسی قدر نمایاں کیا ہے، چنانچہ اس مضمون میں کئی جگہ اس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کے چند نسخے مختلف کتابخانوں میں وقائع اسد بیگ، احوال اسد بیگ، حالات اسد بیگ اور تاریخ مغل کے نام سے پائے جاتے ہیں، یہ عہد اکبری کے آخری تین سال کے واقعات کی ڈائری ہے، اس کے خاص موضوع یہ ہیں:

(۱) قتل ابوالفضل

(۲) تفتیش حالات عاملاں برائے گرفتاری و سزارسانی نرسنگھ بندیلہ۔

(۳) سفارت بیجاپور (حالات بیجاپور و ابراہیم عادل شاہ وغیرہ،

(۴) واپسی اسد بیگ بدربار اکبری،

(۵) روانگی اسد بیگ بسفارت حکومت ہائے دکن۔

(۶) وفات اکبر اعظم،

(۷) تخت نشینی جہانگیر،

ان تمام موضوعات پر اسد بیگ نے جو تفصیلات درج کی ہیں وہ بے حد دلچسپ اور معتبر ہیں، اور غالباً ان میں سے اکثر موضوع پر یہ سب سے اچھا ماخذ بھی ہے، چنانچہ الیٹ نے بھی اس کو تاریخ کا ایک

---

[1] ص ۹۹، [2] ص ۳۴ [3] نسخہ لکھنؤ یونی ورسٹی ص ۳۹۴

اہم ماخذ تصور کیا ہے، اور بنگال سول سروس کے بی ڈبلو چیپ مین سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی کرایا تھا،

وقائع اسد بیگ کے حسب ذیل نسخوں کا پتہ چلا ہے،

(۱) نسخۂ الیٹ

(۲) نسخۂ کتاب خانہ موزۂ برطانیہ (بعنوان احوال اسد بیگ)

(۳) نسخۂ کتاب خانہ سرکاری (رضا لائبریری) رام پور، جس سے سر جادو ناتھ سرکار نے ایک نقل کرائی ہے،

(۴) نسخۂ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، بعنوان تاریخ مغل، کاتب محمد نذیر الدین (منقول عنہ نسخہ ملکیت تلسی داس ترقیمہ ۱۱۹۹ھ) تاریخ کتابت ۱۸ رمئی ۱۹۰۱ء برائے نواب عبد السلام خان خط نستعلیق، سائز ۶×۱۰، ۱۴ سطری،

اسد بیگ کی شاعری | اسد بیگ بظاہر ایک پختہ مشق شاعر معلوم ہوتا ہے جس کا دیوان خود اس کی زندگی کے وسط میں مدون ہو چکا تھا، اسد[۱] اس کا تخلص تھا، اور ابھی جوان ہی تھا کہ وہ شاعری کے میدان میں گامزن ہو گیا، تذکرہ ہفت اقلیم جو اس کی وفات سے ۴۳ سال قبل مکمل ہوا ہے، اس میں اسد کی شاعری کے بارے میں یہ اظہار[۲] خیال کیا گیا ہے،

اگرچہ صدفہائے بحر اندیشہ اش بے غث و ثمین و درختان بوستان خاطرش خالی از رطب و یابس نیستند اما آنچہ یکبار گفتہ[۵] باذوق تر از خوبان است و بہنگام معانقہ با شوق تر از لفظ محبوبان در وقت مضاجعہ۔

مگر مبتلا[۳] کا قول یہ ہے "کلامش سراپا درد و سوز است"۔ احمد علی سندیلوی[۴] اور ابراہیم خلیل[۵] دونوں نے "شاعر خوش بیان" قرار دیا ہے لیکن فخر الزمانی کا بیان اس بارہ میں مولف ہفت اقلیم کے خیال کسی قدر مشابہ ہے، مگر یہ بھی خیال میں رکھنا چاہیے کہ فخر الزمانی کا تذکرہ ہفت اقلیم سے ۲۴ سال بعد

---

[۱] مثلاً ملاحظہ ہو صحف ابراہیم ص ۴۳ [۲] ہفت اقلیم ورق ۶۳۹ [۳] بحوالہ میخانہ ج، ص ۵۰۰ [۴] مخزن الغرائب [۵] صحف ابراہیم ص ۴۳

مرتب ہوا ہے، اس کا بیان[1] یہ ہے:

مسودۂ ایں اوراق بہ او در سنہ دو سن است عشرین در الف ملاقات واقع شد و دیوانش را ملاحظہ نمودہ قریب ہشت ہزار بیت باشد۔ بارہ مثنوی در بحر مخزن و خسرو شیریں گفتہ ولیکن چند ے در آں منظومات کارے ساختہ است۔"

بظاہر آخری جملہ جس میں اسد کی شاعری کے متعلق اظہار خیال ہوا ہے، صرف اس کی مثنویوں کے بارے میں ہوگا۔ اس قیاس کی تائید مزید اس بات سے ہوتی ہے کہ میخانہ کے دوسرے نسخے[2] میں منظومات کے بجائے لفظ نظم آیا ہے، اس لحاظ سے میخانہ کے مؤلف کی ناپسندیدگی کا تعلق اس کی غزلوں سے نہیں ہے،

چونکہ اس کے کلام کا نمونہ پوری طرح ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لیے ہم تذکرہ نویسوں کے قول کی تائید یا مخالفت میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتے، البتہ چند اشعار جو تذکروں میں منقول ہیں، ان سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ یقیناً ایک خوش فکر شاعر تھا، ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں،

دوست کی محبت جب عاشق کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے، تو اس کی یاد سے عاشق کا دل حسن و شیفتگی کا سرچشمہ (یوسفستان) ہو جاتا ہے،

مہر تو جائے کند چوں برگ و ریشۂ ما[3]   یوسفستان شود از یاد تو اندیشۂ ما

عاشق کے نزدیک اس کا خون کوئی قیمت نہیں رکھتا، اور اس پر دوست کو ہر طرح کا اختیار حاصل ہوتا ہے، لیکن عاشق کو اپنی خونریزی کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی کہ دوست کی شرمندگی جس کی تاب لانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا،

خون[4] مرا مریز کہ ترسم خجل شوی   چوں ساقی کہ ریختہ باشد شراب را

---

[1] میخانہ ص ۵۵۵ [2] ایضاً ص ۵۵۵ نمبر ۲ [3] صحف ابراہیم ص ۴۳ و ریاض الشعراء ورق ۲۹ ب

[4] صحف و ہفت اقلیم ورق ۳۹۴ الف

مرحلۂ عشق کی دشواریاں ملاحظہ ہوں،

در مرحلۂ عشق کہ خاکش ہمہ خون است [1] صد قافلہ گم گشت و صداے جرسے نیست

عاشق نالہ کرتا ہے، مگر اس نالہ وشیون میں بھی وہ اخفاے راز میں کامیاب ہو جاتا ہے،

نالم و خلقے در آزار اند از نالیدنم [2] لیک شادم چوں نمی دانند کز آزار کیست

حافظ کو اپنے اس سفر میں جو بیوفائی کا شائبہ نظر آرہا تھا، اسے اسد نے تین صدی سے زیادہ کے بعد رفع کیا،

عیب پیراہن دریدن می کنندم دوستان [3] بے وفا یارم کہ پیراہن ہمی دارم نہ پوست (حافظ)

چاک ہاے سینہ تا دامن رساند کار من [4] سینہ کا وید ن مگر سوراخ کردہ کار کیست

اس شعر میں اسد نے اپنے خون کے مقابلہ میں شراب کو کس خوبی سے ترجیح دی،

خون مرا بریز و شراب مرا مریز [5] یک قطرہ زیں شراب بصد خوں برابرست

عاشق کی ہر لحظہ کی جانکاہی ملاحظہ ہو

بیمار محبت ہمہ دم در سکرات است [6] او را نفس پیش رو دم باز پسے نیست

عاشق محبوب کی دشمنی کی کتنی لطیف توجیہ کرتا ہے،

دوست می دارم من او را گرچہ با من دشمن است [7] دشمن است اما نہ بر آئین دشمن دشمن است

عاشق کو صرف ایسے دیار سے تعلق خاطر ہو سکتا ہے، جہاں سینہ مجروح و نیشتر کی گفتگو ہوتی ہے،

بداں دیار دل ما بہ سیم وزر نہ رود [8] کہ حرف سینہ مجروح و نیشتر نہ رود

محبوب کو عاشق کی دل آزاری سے بچنے کی شاعرانہ توجیہ یہ بیان کرتا ہے،

دلم کاہستہ شد راحت ہم مشکن پر و بال ش [9] نہند و سخت صیدے را کہ صیاد ش زبوں گیرد

---

[1] صحت ریاض [2] ایضاً [3] در اصل ان دو نوں شعروں میں موازنہ مقصود نہیں، حافظ کا شعر اسد کے شعر سے بدرجہا بلند ہے [4] ریاض الشعراء [5] ایضاً [6] ہفت اقلیم [7] ایضاً [8] ایضاً

شراب کی تری سے نگاہوں میں وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس سے ساغر بھر سکتے ہیں،

سرمہ در چشمش نمی گنجد ز بس کز مے تر است [1] ساغرے از نگاہش می تواں لبریز کرد

خیال میں اصل کی کیفیت حاصل کر لینا صرف عاشق کا کام ہے۔

ہر گہ خیال آں گل خود روے می کنم [2] دل می کند خیال کہ گل بوے می کنم

عاشق کے لیے اس کی مرضی کوئی چیز نہیں، وہ دوست میں گم ہو جانا عشق کا کمال سمجھتا ہے،

گر دوست بیوفا است مرا با وفا چہ کار [3] طورے کہ خوے اوست بداں خوے می کنم

آشنائی بیگانہ میں جو لطف ہے وہ آشنا سے بھی بیان کرنے کے لائق نہیں،

با ہیچ آشنا نتواں درمیاں نہاد [4] ذوقے کز آشنائی بیگانہ بردہ ایم

نامرادی میں شادمانی کی کیفیت حاصل کرنا کمالِ عشق کی دلیل ہے،

ہزار بند شکستیم و باز دربندیم [5] بیک مراد نہ پیوستہ ایم و خرسندیم

سیحا: عشق میں مرنے کی تلقین

بیا بہ میکدۂ عشق دیدہ را وا کن [6] بداں چہ مردہ ای اندر عشق تماشہ کن

اپنی خونریزی کی حسنِ تعلیل

بحشر نام شہیداں دوستی بالاست [7] بریز خونم و نامم بحشر بالا کن

ایک نادر تشبیہ

مریز گل بکنارم کہ یاد آں دہدے [8] کہ پارہ ہاے جگر در کنار داشتمے

اخلاقی تعلیم ملاحظہ ہو

---

[1] صحف ابراہیم و ریاض الشعراء [2] ایضاً [3] ایضاً [4] صحف ابراہیم [5] ہفت اقلیم [6] ایضاً
[7] صحف ابراہیم و ہفت اقلیم [8] ہفت اقلیم

در جہاں ہرچہ گوئی باید ہست[1] — سخن ست ایں کہ چنیں بایستے
در نہم پاے فضولی بہ میاں — ہمہ عالم بہ ازیں بایستے

رباعیوں کا نمونہ حسب ذیل ہے،

طبع ست[2] ترا کز زوارم می جوشد — دستے است ترا کز دو درم می جوشد
زاں کف چو آفتابے کردم — کز گرمی بخشش و کرم می جوشد

خواہم عدمے کہ پیش ازیں داشت وجود[3] — کیں ہستی ہیچ را در رہ نبود
ورنہ عدمے کہ بعد ازیں تن خواہد بود — مستوجب صد ہزار گفت؟ است بود

غم رونق[4] بوستاں داغ دل ماست — ہم آتش و ہم پنبہ داغ دل ماست
ہر خانہ چراغ و آفتابے دارد — با ہم وہیں غم کہ چراغ دل ماست

اے لطف[5] تو داوہ طبع شادی غم را — ذوق دگر است از تو دل خرم را
عالم ہمہ محتاج مرادو روز و شب است — در کار ترا از روز و شبے عالم را

نزد تو[6] بجز وہشی زباں افگندم — خود را بزباں ایں وآں افگندم
وز خواہش من ترا ز مانے نرسید — بل خواہش خویش را زبان افگندم

---

[1] ہفت اقلیم [2] صحف ابراہیم و ہفت اقلیم [3] صحف ابراہیم [4] ہفت اقلیم [5] ایضاً [6] ایضاً

نوائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، وہ دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم کا ایک مبصرانہ مقدمہ ہے۔ قیمت: للعہ غیر مجلد ہے

"منیجر"

مجمع البحار پر تحقیقی نظر

از جناب سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری

"مجمع بحار الانوار کے نام کی تحقیق کوئی نیا انکشاف نہیں ہے، ہر زمانہ کے اہل علم اس سے واقف رہے ہیں، اکابر علما اور پرانی کتابوں کا کیا ذکر اس زمانہ کی اردو کتابوں تک میں پورا نام ملتا ہے، جن لوگوں نے مجمع بحار الانوار کے بجائے مجمع البحار لکھا ہے وہ نادواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ اختصار اور عرف کی بنا پر جس کی بکثرت مثالیں کتابوں کے ناموں میں ملتی ہیں، اسی طریقہ سے علامہ محمد بن طاہر کے نام کی تحقیق بھی نئی نہیں ہے، تاہم اس سلسلے میں مضمون نگار نے کافی معلومات جمع کر دیئے ہیں اور ایک قدیم تفسیر مجمع البحار کا تعارف کرایا ہے، اسلئے یہ مضمون شائع کیا جاتا ہے" "م"

اس کتاب کے متعلق مختلف تذکروں میں ایسے بیانات ملتے ہیں جن کے مطالعہ سے گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں، مثلاً شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ علامہ محمد طاہر پٹنیؒ کے ذکر میں تحریر فرماتے ہیں:

۱- ”در علم حدیث تو الیف مفیدہ جمع کرد از انجملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح است مسمّٰی بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ“ (اخبار الاخیار صفحہ ۲۸۰ سنہ ۹۹۹ھ)

خلاصہ: مجمع البحار صحاح ستہ کی شرح ہے، اور اس کے مصنف ہیں محمد طاہر رحمۃ اللہ علیہ،

۲- مولانا غوثی حسن گلزار ابرار میں حضرت شیخ طاہر سندھی کے ذکر میں لکھتے ہیں:

”بہت سی تصانیف صفحۂ روزگار پر یادگار چھوڑ کر ملک تقدس کو روانہ ہوئے منجملہ تصانیف مذکورہ کے ایک تفسیر مجمع البحار ہے، جو بالکل لطائف قشیری کے اسلوب پر طائفہ صوفیہ قدس سرہم کے نکات اور اشارات کو حاوی ہے“ (صفحہ ۲۲۴)

ایک روز اس تفسیر کے اجزا و دریائے کشف و شہود کے مستغرق شیخ لشکر محمد عارف شطاری قدس سرہٗ

کی نظر سے گذرے تو بہت خوش ہوئے، فرمایا اس رنگین کتاب کا مصنف اپنی حسنات کی جزا کا اندازہ شاید قیامت کے روز ہی کرسکے گا، کیونکہ یہ اندازہ آج کے روز ان حسنات کی کیفیت بیان کرنے سے نہیں ہوسکتا۔ (ص ۳۳۴ اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار)

خلاصہ: مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ اس کو حضرت شیخ لشکر عارف باللہ نے مطالعہ فرماکر بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھیؒ ہیں،

۳۔ یہی مولانا غوثی اسی کتاب میں حضرت شیخ محمد بن طاہر نہر والہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

حدیث میں شیخ علی متقی کے شاگرد ہیں، اس فن میں ایک بے نظیر کمال حاصل کیا تھا، مجمع البحار نام ایک مشکل کشا شرح احادیث کی صحاح ستہ پر جو ہے، وہ آپ کے قلم تالیف کی لکھی ہوئی ہے۔ (اذکار ابرار ص ۳۴۲)

خلاصہ: مجمع البحار احادیث صحاح ستہ کی مشکل کشا شرح ہے، اور اس کے مصنف شیخ محمد ہیں جو شیخ طاہر نہر والہ کے فرزند تھے،

۴۔ مورخ سندھ علی شیر قانع تتوی تحفۃ الکرام میں مجد الدین مولانا طاہر قدس سرہ کے ذکر میں رقمطراز ہیں:

ودر علم حدیث تالیف مفید جمع کرد از انجملہ کتابے است کہ مشکل شرح صحاح ستہ مسمی بہ مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ (تحفۃ الکرام ص ۸۶ ج اول)

خلاصہ: یہ عبارت اخبار الاخیار کی لفظ بلفظ نقل ہے، البتہ عنوان میں مجمع البحار کے مصنف کا نام مجد الدین مولانا طاہر لکھا ہے،

۵۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی مآثر الکرام میں شیخ محمد بن طاہر الفتنی قدس سرہ کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں،

توالیف مفیدہ دارد مثل مجمع البحار در غریب الحدیث الخ (مآثر الکرام ص ۱۹۴)

خلاصہ: مجمع البحار کا نفس مضمون غریب الحدیث ہے، اور اسکے مصنف شیخ محمد بن طاہر الفتنی (مینی) ہیں،

۶۔ مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں تحریر فرماتے ہیں (تذکرہ شیخ محمد طاہر گجراتی قدس سرہ)

در علم حدیث تو الیف مفید جمع کرد، از انجملہ کتابے است کہ متکفل صحاح است مسمی بہ

مجمع البحار و رسالہ دیگر الخ (خزینۃ الاصفیا، جلد اول ص ۴۳۶)

خلاصہ: یہ بھی اخبار الاخیار کی نقل ہے، مفہوم یہی ہے کہ مجمع البحار صحاح ستہ حدیث شریف کی شرح ہے، اور مصنف شیخ محمد طاہر گجراتی ہیں۔

۷۔ تاریخ الاولیا، اردو میں دو جگہ تھوڑے تغیر کے ساتھ شیخ محمد طاہر گجراتی قدس سرہ اور علامہ محمد طاہر پٹنی محدث رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں یہ عبارتیں ملتی ہیں:

محدث بے بدل، مفسر بے عدیل، فقیہ لاثانی تھے، اور مکہ میں شیخ علی متقی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا، اور پھر اپنے وطن کی جانب آکر تمام بدعات ملک گجرات سے دور کیا، تصانیف آپ کی متکفل شرح صحابہ مسمی مجمع البحار الخ (تاریخ الاولیا، ص ۲۴۴ ج ۳)

۸۔ شیخ محمد طاہر پٹنی محدث رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں:

شیخ برخوردار سندی و شیخ اجل علی ابن حسام الدین متقی سے فیض کثیرہ حاصل کیا، بڑے متقی پرہیزگار صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، چنانچہ مجمع البحار، تذکرہ موضوعات وغیرہ۔ (تاریخ الاولیا، ص ۲۰، ج ۴)

خلاصہ: پہلی عبارت شرح صحابہ سہو کاتب معلوم ہوتا ہے، شرح صحاح ہونا چاہیے، دوسری عبارت میں مصنف تو ملا محمد طاہر پٹنی محدثؒ کو بتایا گیا ہے لیکن تصنیف کے موضوع کا ذکر نہیں کیا گیا۔

۹۔ حضرت مولوی خلیل الرحمٰن برہان پوری نے تاریخ برہانپور میں حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفائے کے سلسلہ میں منجملہ دیگر ناموں کے شیخ محمد طاہر پٹنی مصنف کتاب مجمع البحار (صفحہ ۱۵۰) کا ذکر کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجمع البحار کے مصنف حضرت شیخ محمد طاہر پٹنی ہیں، مجمع البحار کس موضوع پر ہے یہ نہیں لکھا۔

اسی کتاب میں حضرت مولانا شیخ قاسم (سندھی) رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں تاریخ الاولیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ

وہ (شیخ قاسم) فرزند مولانا سندھی برہانپوری کے اور بھائی شیخ محمد طاہر پٹنی صاحب مجمع البحار کے تھے، حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ خلف الصدق حضرت شیخ محمد قاسم کے ہیں (تاریخ برہانپور ص ۱۹۷ طبع ثانی مطبوعہ کوثر پریس، برہان پور)

اس عبارت میں یا کاتب کی فروگذاشت ہے یا مصنف کا سہو نظر۔ مسیح الاولیاء کے چچا شیخ طاہر سندھی تھے، یہاں پٹنی کے بجائے سندھی ہونا چاہیے۔

مذکورۂ بالا اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

مجمع البحار نام کی دو کتابیں ہیں، ایک قرآن مجید کی تفسیر، دوسری شرح صحاح ستہ۔ اول الذکر تفسیر مجمع البحار کے مصنف شیخ طاہر سندھی ہیں، اور دوسری مجمع البحار شرح صحاح کے مصنف شیخ محمد طاہر پٹنی یا شیخ محمد طاہر گجراتی یا ملا محمد طاہر پٹنی اور بقول بعض شیخ محمد بن طاہر نہروالہ یا شیخ محمد بن طاہر الفتنی (پٹنی)،

اب ہر ایک مجمع البحار کے متعلق مذکورۂ بالا تذکروں سے مزید صراحت پیش کیجاتی ہے،

تفسیر مجمع البحار کا ذکر صرف مولانا غوثی حسن نے ہی اپنی کتاب گلزار ابرار میں کیا ہے۔ ان کے سوا مذکورہ تذکرہ نگاروں میں کسی نے بھی نہ تفسیر مجمع البحار کا ذکر کیا ہے، اور نہ اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر محدث سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا۔

مولانا غوثی نے تفسیر کو دیکھا ہے، اس کا مختصر نمونہ بھی گلزار میں نقل کیا ہے، مصنفؒ کی خدمت میں انھیں نیاز بھی حاصل تھا، اور وہ آپ کی فیض رساں مجلسوں میں باریابی کا شرف بھی اکثر و بیشتر حاصل کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے تفسیر مجمع البحار کے متعلق خاص بات یہ لکھی ہے کہ اگر اس کی علمی اہمیت کے پیش نظر عادلشاہ فاروقی (راجہ علی خاں) نے بڑی منت اور معقول سفارشوں کے ذریعہ خواہش کی تھی کہ اس وقیع تصنیف کے کسی گوشہ میں میرا نام درج ہو جائے تو میرے لیے باعث عظمت دارین ہوگا، آپ نے یہ استدعا قبول کی اور ایک مزید خطبہ کا اضافہ فرمادیا، کیونکہ یہ تصنیف برہان پور میں شروع ہو چکی تھی، اور حضرت

محدث اپنے میزبان قتلغ خاں کے نام ایک خطبہ ابتداء کتاب میں لکھ چکے تھے، اس لیے یہ دوسرا خطبہ شاہ فاروقی کی استدعا پر منسلک فرمایا، علامہ غوثی نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

فرمانروائے صوبہ (خاندیس) علی عادل شاہ فاروقی نے مولانا حسین شیرازی کو جو حکمت کے فنون اور عقلی علوم میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اور ندیم خاص جلال خاں براری کو جن کو رسمی علوم میں دستگاہ تھی، مصنف (شیخ طاہر سندھیؒ) کی خدمت میں بھیجا تھا، اور التماس کی تھی کہ اگر اس پاسبان خلائق کا عہد اس کتاب میں درج کر دیا جائے تو غایت درجہ عنایت ہوگی، آپ نے یہ التماس قبول فرمائی اس وجہ سے کتاب ہذا کا خطبہ دو طرح پر واقع ہوا ہے، (اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۳۴)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تفسیر کا نمونہ یہاں نقل کر دیا جائے، اگرچہ علامہ غوثی نے کتاب میں تطویل سے بچنے اور اختصار ملحوظ رکھنے کا جگہ جگہ اظہار کیا ہے، پھر بھی صرف ایک آیت کی تفسیر قریباً ۵ صفحات کے نصف کالم میں لکھی ہے:

فی تفسیر قوله تعالیٰ۔ فی قلوبهم مرض الخ۔ المرض حقیقة فی مایعرض للبدن فیخرجه عن الاعتدال الخاص۔ ویوجب الخلل فی افعاله ومجاز فی الاعراض النفسانیة التی تخل بکمالها کالجهل وسوء العقیدة والزینة وحب المعاصی لانها مانعة عن نیل الفضائل المودیة الی زوال الحیوٰة الحقیقیة الابدیة والآیة تحتملهما فان قلوبهم کانت متالمة تحزنا علی مافات عنهم من الریاسة وحسداً علی مایرون من اثبات امر الرسول واستعلاء شانه یوماً فیوماً فزاد الله عنهم بما زاد فی اعلاء امره واسادة ذکره ونفوسهم کانت ماؤفة بالکفر وسوء اعتقاد ومعاداة النبی صلی الله علیه وسلم ونحوها فزاد الله ذالک بالطبع او بازدیاد التکالیف وتکریر الوحی وتضاعیف النصر

وفی الروحانی۔ فی قلوبھم مرض۔ ھو تفریطھم فی القوۃ الحکمیۃ وافراطھم فی الشھویۃ۔

فی الاحیاء اعلم ان جندی الغضب والشھوۃ قد ینقادان للقلب انقیاداً تاماً فیعینانہ علی طریقۃ الذی یسلکہ وقد یستعصیان علیہ استعصاء بغی وتمرد حتی یملکاہ ویستعبداہ وفیہ ھلاکہ وانقطاعہ عن سفرہ الذی بہ وصولہ الی سعادۃ الابد وللقلب جند اٰخر وھو العلم والحکمۃ والتفکر وحقہ ان یستعین بھذا الجند فانہ حزب اللہ تعالیٰ علی الجندین الآخرین فانھما قد یلحقان بحزب الشیطان فان من ترک الاستعانۃ وتسلط علی نفسہ جندی الغضب والشھوۃ ھلک۔ ھلاکاً یقینا وخسر خسرانا مبیناً وذالک حال اکثر الخلق فان عقولھم صارت مسخرۃ لشھواتھم فی استنباط الحیل لقضاء الشھوۃ وکان ینبغی ان یکون الشھوۃ مسخرۃ لعقولھم۔

اس بلند پایہ اور اہم تفسیر کی جانب سے تذکرہ نگاروں کی بے اعتنائی یا عدم دسترس پر حیرت ہے، اگر علامہ غوثی نے اس معرکۃ الآرا تصنیف اور اس کے مصنف سے دلچسپی نہ لی ہوتی تو آج تفسیر کا نمونہ تو کیا نام بھی کسی کو نہ معلوم ہوتا، اور سندھ کے ایک فاضل اجل کا یہ کارنامہ نسیاً منسیاً ہوکر رہ جاتا، حضرت شیخ الاولیا نے جو شیخ طاہر محدثؒ کے بھتیجے ہیں، اپنی عربی تفسیر انوار الاسرار میں جگہ جگہ تفسیر مجمع البحار کا حوالہ دیا ہے، اس سے بھی ثابت ہے کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھیؒ ہیں، اس تفسیر کی تاریخ تصنیف کا حکم نہ ہوسکا لیکن یہ یقینی ہے کہ دسویں ہجری کے آخری عشرہ میں بمقام برہانپور تکمیل کو پہنچی،

مذکورۂ بالا مباحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ مجمع البحار قرآن مجید کی تفسیر ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر سندھی ہیں۔

اب مجمع البحار شرح صحاح ستہ[1] اور اس کے مصنف کی جانب توجہ مبذول فرمایئے، مصنف کے نام میں تذکرہ نگاروں کا اختلاف قابل غور ہے، مذکورہ تذکروں میں اخبار الاخیار ۹۹۹ھ سب سے مقدم کتاب ہے، اس کے مصنف حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مصنف مجمع البحار کے ہمعصر ہیں، انھوں نے کتاب کا مجمع البحار اور مصنف کا نام شیخ محمد طاہر لکھا ہے، اخبار الاخیار اس قدر مقبول رہی ہے کہ عہد طباعت سے قبل اس کی بیشمار نقلیں تیار ہونے کی شہادتیں ملتی ہیں، اور طباعت عام ہوتے ہی اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، زیر نظر نسخہ مطبع مجتبائی دہلی کا مطبوعہ ہے، جو ۱۳۳۲ھ میں طبع ہوا ہے، ترقیمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب مختلف مطابع میں کئی بار چھاپی گئی تھی، اس لیے اس میں بکثرت اغلاط ہیں، مطبع مجتبائی کے علم دوست کارپردازوں نے کئی نسخے مطبوعہ قدیم و جدید بہم پہنچا کر ان کی مدد سے دو سال کی محنت میں تصحیح کرکے اس نسخہ کو طبع کیا، اصل عبارت یہ ہے:

الحمد للہ والمنۃ کہ دریں ایام سعادت فرجام کتاب اخبار الاخیار مصنفہ عالم و فاضل یگانہ مولانا عبدالحق محدث قدس سرہ کہ در تحقیق روایات و تدقیق معانی و مبانی بے نظیر و عدیم المثال است و بارہا در مطابع مختلفہ مطبوع شدہ بدیدۂ ناظرین اولی الابصار گردیدہ اما از ہمہ کثرت اغلاط ہیچگاہ طبع شائقین نمی آسود درینولا بفرمایش بعض احباب حسب الحکم جناب والد ماجد مدظلہم العالی مصححین ماہرین علم و فن چندیں نسخ مطبوعہ قدیم و جدید جمع فرمودہ بہ تصحیح اغلاطش پرداختند و در صرف وقت و محنت دو سال ازیں عہدہ برآمدند بحمد اللہ کہ اکنوں بہ تصحیح تام در مطبع مجتبائی زیور حسن اتمام در برکشید الخ (ص ۲۹۲)

---

[1] معارف: مجمع بحار الانوار صحاح کی شرح نہیں ہے، بلکہ اس کے لغات کی شرح ہے۔

میں نے یہ عبارت اس لیے نقل کر دی ہے کہ اس سے مطبوعہ نسخوں کے غلط ہونے کی شہادت ملتی ہے، اور اس مصحح نسخہ میں بھی بعض غلطیاں ہیں،

یہ شبہہ میں نے اس لیے ظاہر کیا ہے کہ علامہ غوثی بھی مصنف مجمع البحار شارح صحاح کے ہمعصر ہیں، ان کی کتاب گلزار ابرار میں اسماء الرجال کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے منسلک ہے، طا کے باب میں صرف شیخ طاہر سندھی کا نام درج ہے، شیخ طاہر پٹنی کا نام نہیں ہے، بلکہ م کے باب میں شیخ محمد بن طاہر موجود ہے، اس صورت میں سہو کتابت کا گمان نہیں کیا جا سکتا، اور قرین قیاس یہی ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہوگا، ایک اور دلیل:

علامہ آزاد بلگرامی نے بھی مصنف کا نام محمد بن طاہر لکھا ہے، ان کی عبارت اخبار الاخیار ہی کا اقتباس معلوم ہوتی ہے، یا پھر ان کی نگاہ سے گلزار ابرار کا فارسی نسخہ گذرا ہوگا، علامہ آزاد کا ماخذ کوئی بھی نسخہ رہا ہو، یہ دوسری شہادت ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر تذکرہ میں محمد طاہر یا شیخ محمد طاہر درج ہے، طاہر تنہا یا شیخ طاہر کسی نے نہیں لکھا، کسی بھی نام کے ساتھ برکت یا محض زینت کے لیے لفظ محمد کا اضافہ ہمارے زمانہ میں شروع ہوا ہے، دسویں صدی ہجری تک اس قسم کی کوئی مثال میری نگاہ سے نہیں گذری، اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ مصنف کا نام محمد بن طاہر ہونا چاہیے،

آخر میں زیر بحث کتاب مجمع البحار شرح صحاح کے نام پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے، جس کا نام تمام تذکرہ نگاروں نے مجمع البحار لکھا ہے، لیکن اس کتاب کا نام مجمع البحار نہیں، بلکہ مجمع بحار الانوار ہے، یہ کتاب چھپ تو گئی ہے، لیکن جہاں تک مجھے علم ہو سکا، ایک ہی بار چھپی، دوسرے ایڈیشن کی نوبت نہیں آئی، پیش نظر نسخہ منشی نولکشور کے مطبع کا چھپا ہوا ہے، اس کی لوح [illegible] کی عبارت یہ ہے:-

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ

ھذا کتاب مبارک جامع لکشف مطالب الآیات وایضاح معانی

کتاب اللہ واحادیث رسولہ المختار

مجمع بحار الانوار

فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار۔ تالیف الفاضل الورع الماھر

شمس المفاخر مولانا الشیخ محمد طاہر افاض اللہ علینا من برکاتہ

طبع فی المطبع العالی منشی نولکشور ذی المعالی

کتاب عربی زبان میں ہے، اور پاکیزہ خط نسخ میں تحریر ہے، ٹائیٹل کی عبارت بھی نسخ میں ہے اور کتاب کا نام دیدہ زیب طغرا میں تحریر ہے، جو صاف اور بلا اشتباہ مجمع بحار الانوار پڑھا جاتا ہے۔

خاتمہ یا ترقیمہ میں بھی اسی نام کا اعادہ کیا گیا ہے جس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

تم بحمد اللہ وحسن توفیقہ الثلث الاول من مجمع البحار الانوار

فی غرایب التنزیل ولطایف الاخبار۔ فی العشرین من شھر المبارک رمضان

ضاعف اللہ قدرہ وضاعف اجر من عظمہ فی البلد المسمی بالفتن

صانھا اللہ عن الفتن۔

ان فقروں سے ظاہر ہے کہ کتاب کا نام مجمع بحار الانوار ہے، رہا یہ کہ تمام تذکرہ نگاروں نے مجمع البحار کیوں لکھا، اس کی مختلف تاویلیں کی جا سکتی ہیں، سب سے پہلا تذکرہ جس میں اس کتاب اور مصنف کا ذکر ملتا ہے، اخبار الاخیار ہے، اس کا قلمی نسخہ میری نگاہ سے نہیں گذرا، یہ کتاب عرصۂ دراز سے چھپ رہی ہے، اور کئی اشاعتیں چھپ چکی ہیں، جن میں مرور ایام اور متواتر کاتبوں کی لاپروائی سے بڑی غلطیاں ہیں، ممکن ہے زیر بحث کتاب کے نام میں بھی اسی سلسلہ میں سہو ہو گیا ہو جو بعد میں متداول ہو گیا ہو۔

یا پہلی اشاعت جس قلمی نسخہ سے کی گئی ہے، اس میں سہو کتابت سے مجمع بحار الانوار کے بجائے مجمع البحار درج ہوگیا ہو، اور بعد میں یہی غلط نام رائج ہوگیا ہو،

گلزار ابرار کے ترجمہ اذکار ابرار میں بھی شرح صحاح ستہ کا نام مجمع البحار ہی لکھا ہے، مگر گلزار ابرار کا فارسی قلمی نسخہ کمیاب بلکہ نایاب ہے، اس کا اردو ترجمہ ہی متعارف و متداول ہے، یہیں اشتباہ یہاں بھی ہوتا ہے، کہ مترجم یا کاتب نے سہواً نام میں تبدیلی کردی ہوگی،

اندازہ ہوتا ہے کہ شرح صحاح کا ذکر کرنے والوں میں سے کسی نے بھی اصل کتاب کو نہیں دیکھا ہے، اس کی تعارفی شہرت کی بنا پر اس کا مختصراً ذکر درج کتاب کر دیا، کیونکہ اخبار الاخیار اور گلزار ابرار میں اس کی کسی عبارت کی نقل یا اقتباس درج نہیں ہے اور نہ کسی نے اس کو بچشم خود دیکھنے کے متعلق اشارہ کیا ہے،

میں ان تحریروں کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دونوں کتابیں ہمنام نہیں، بلکہ دونوں کے جدا جدا دو نام ہیں۔ (۱) مجمع البحار تفسیر۔ (۲) مجمع بحار الانوار شرح صحاح ستہ۔

مجمع البحار قرآن مجید کی عربی زبان میں صوفیانہ و عارفانہ تفسیر ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ طاہر محدثؒ سندھی ہیں۔

مجمع بحار الانوار۔ عربی زبان میں صحاح ستہ کی شرح ہے، اور اس کے مصنف حضرت شیخ محمد طاہر یا محمد بن طاہرؒ پٹنی ہیں، بلکہ محمد بن طاہر ہی زیادہ قرین قیاس ہے،

مسلمانان ہند کا نظام تعلیم

از

جناب مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا محمد اسحاق صاحب نے مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر غور و فکر بھی کیا ہے اور دینی تعلیم کا انھیں عملی تجربہ بھی ہے، اس مضمون میں انھوں نے ان کی دینی و دنیوی ضروریات کے پیش نظر ان دونوں تعلیموں کے نظام کے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں مسئلہ کی اہمیت کے لحاظ سے اگر کوئی اور صاحب علم اس موضوع پر لکھنا چاہیں تو ان کا مضمون بھی شکریہ کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔ (م)

قوموں کے عروج و زوال بلکہ ان کی زندگی و موت میں ان کے نظام تعلیم کو جس قدر دخل ہے، وہ بیان و استدلال سے مستغنی ہے، غیر ضروری طوالت سے بچنے کے لیے میں بغیر کسی تمہید کے اس مسئلہ کو پیش کرتا ہوں کہ موجودہ دور اور حالات حاضرہ میں ہمیں مسلمانان ہند کے تعلیمی مسئلہ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں،

مروجہ نظام تعلیم کی ہلاکت خیزی ہمیں اس حقیقت کو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ ہم ۱۹۵۵ء میں سوچ رہے ہیں، اور ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ہمارے ماضی و حال میں مشرق و مغرب کا فرق پیدا کر دیا ہے، تحریروں میں ہماری حیثیت جو کچھ ہو لیکن تعامل کے متلاطم دریا میں یہ کاغذی کشتی کب کی غرق ہو چکی ہے، اور اس واقعہ کا انکار خود فریبی یا فریب کاری ہے کہ ہمارا حال ماضی سے بدرجہا بدتر اور تکلیف دہ ہے،

میں دور نہیں جانا چاہتا، مجھے یاد ہے کہ یہاں مجھے صرف تعلیمی مسئلہ پر گفتگو کرنی ہے، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ان بدلے ہوئے حالات نے نظام تعلیم میں بھی ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے، اور ہندوستان کا موجودہ

نظام تعلیم ہمارے قومی مزاج کے اسقدر مخالف ہے کہ اگر ہم نے اپنی حفاظت کے لیے انتہائی شدید جد وجہد نہ کی اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہمارے شامل حال نہ ہوئی تو ہمارے نونہال اور نوجوان سب کچھ باقی رہ سکیں گے مگر مسلمان نہیں رہ سکیں گے۔

برطانوی دور میں نظام تعلیم کی پشت پناہی حکومت کی مشینری کے لیے پرزے ڈھالنے کا جذبہ کر رہا تھا، ہم نے سخت غلطی کی کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے تیار ہو گئے، اگرچہ اس سے ہم کو انفرادی فوائد حاصل ہوئے، لیکن اجتماعی و دینی حیثیت سے سخت نقصان اٹھایا، مگر موجودہ نظام تعلیم اس سے بھی زیادہ مسلمانوں کے لیے مہلک ہے، اس کے ذریعہ وہ اکثریت میں جذب ہو جائیں گے، اگر ہم نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو اس کے معنی اجتماعی اور قومی خودکشی کے ہوں گے، برطانوی دور میں ہم نے ایک غلطی کی، مگر اس کی تلافی کا امکان تھا، لیکن یہ غلطی وہ خطاء عظیم ہو گی جس کی تلافی قیامت تک نہ ہو سکے گی،

ماضی کے ذہن سے حال میں سوچنا کس قدر مضحکہ خیز ہے؟ اگر آج بھی آپ اپنی اولاد کو کلرک یا آفیسر بنانے کے لیے تعلیم دینا مقصود ہے تو دفتروں اور ملازمتوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں، اگر دینی تعلیم کا محصل حنفی شافعی اختلافات پر عبور ہے تو اب ان مباحث کی افادیت بہت کم ہو چکی ہے، اور اسی دائرے میں محدود رہ کر ہم دین کی کوئی معتد بہ خدمت نہیں انجام دے سکتے۔

نظام تعلیم کا اجتماعی تصور سارے عالم میں مسلمانوں کی تعداد کروروں سے گنی جا سکتی ہے، باوجود اس کے ان کی پستی، ان کی مقہوریت و مظلومیت کس چیز کا نتیجہ ہے، اجتماعیت کا فقدان اور انفرادیت کا غلبہ ؛ مہلک مرض ہے جس نے پوری قوم کی قوتوں کو مضمحل کر دیا ہے، ہم میں انفرادی تقوی تو کسی حد تک ہے مگر اجتماعی تقوی سرے سے مفقود ہے، یہی ہلاکت آفریں مرض ہماری علمی زندگی میں بھی کارفرما ہے، ہم میں ہر شخص اپنی، اپنی اولاد، یا اپنے عزیزوں کی تعلیم کے متعلق محض انفرادی حیثیت سے سوچتا ہے، گویا وہ قوم سے بے تعلق ہے، اور اس سے الگ ہو کر بھی اپنے وجود کو باقی رکھ سکتا ہے، بحالات موجودہ اس

مہلک غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہمیں اب نظام تعلیم کے مسئلہ پر اجتماعی نقطۂ نظر سے غور کرنا ضروری ہے، دین و دنیا کے غلط تفرقہ کو ختم کیجیے، تعلیم دینی ہو یا دنیاوی اس کا نظام صرف ایک ہی نصب العین کے ماتحت ہوگا، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ نظام ہمارے دینی و قومی مزاج سے کس قدر مناسبت رکھتا ہے، اور اس کی صحت و قوت میں کس قدر معاون ہے، یاد رکھیے کہ اجتماعی و قومی مزاج کا فساد ہلاکت و فنا کے مرادف ہے، جو قومیں اپنے مخصوص مزاج کو باقی نہیں رکھ سکتیں، کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے مستقل وجود سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں، اور دوسری قوموں میں جذب ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، ہمارے اجتماعی مزاج میں عرصۂ دراز سے فساد پیدا ہو گیا ہے، اب ماحول ایسا ہے جو اس فساد کو بہت سرعت کے ساتھ ترقی دے گا، اگر ہم نے اب بھی غفلت سے کام لیا تو وہ دن دور نہیں کہ ہم اکثریت میں جذب ہو کر فنا ہو جائیں، ایک صحیح اور صحت بخش نظام تعلیم کے ذریعہ سے ہمیں اس فساد کو دور کرنا ہے، ہمیں وہ سب کچھ حاصل کرنا ہے، جو ہم کھو چکے ہیں اور وہ بھی حاصل کرنا ہے جو بحیثیت مسلمان حاصل کرنا چاہیے۔

اقسام تعلیم ایک مسلمان کے لیے تعلیم کو دینی دنیاوی دو حصوں میں تقسیم کرنا بہت دشوار ہے، مسلمان صرف ایک ہی چیز کو جانتا ہے، اور وہ دین و آخرت ہے، ملعون ہے وہ شے جس سے آخرت کا کوئی فائدہ نہ حاصل ہو سکے، ملعون تر ہے وہ چیز جو آخرت کے لیے مضر ہو، ہمارے نظام تعلیم کا محور دین ہی ہو سکتا ہے، خواہ وہ کتاب الٰہی اور احادیث نبویہ کی تعلیم ہو یا طبعیات و ریاضیات کی، فقہ کی ہو یا تعزیرات ہند کی، عربی کی ہو یا انگریزی کی، ہر جائز علم کو آخرت کے لیے بنا لینا اور اسلامی مقاصد و اصول کے ماتحت حاصل کرنا ہماری خصوصیت امتیازی اور ہمارا قومی مزاج ہے، اسے ضائع کر کے ہم باقی نہیں رہ سکتے۔

نفس دین کی تعلیم اور دین کے لیے دنیا کی تعلیم، صحیح کہی جا سکتی ہے، قرآن، حدیث، فقہ کی تعلیم کو ہم دینی تعلیم کہتے ہیں، اور طبعیات، ریاضیات، انگریزی وغیرہ علوم و فنون کی تعلیم کو ہم دنیاوی تعلیم سے موسوم کرتے ہیں۔

دینی تعلیم | سیاسی و معاشی زوال اور تاریک ماحول کے باوجود کئی صدیاں گذرنے پر بھی آج ہمیں اپنے اسلام پر فخر ہے، یہ کس چیز کا ثمرہ ہے؟ اس روشن حقیقت کا انکار کرنا ممکن ہے کہ اس پردہ ظلمات میں ہماری زندگی کے ضامن آبحیات کے وہ چشمے رہے ہیں، جنھیں دنیا عربی مدارس کے نام سے جانتی ہے، شکستہ بوریوں پر بیٹھکر پڑھانے اور پڑھنے والے وہ جانشینان نبی فداہ ابی و امی جنھیں بےخبر ملانوں کے نام سے یاد کرتے ہیں، قوم کی شمع حیات کو آج تک جلاتے رہے، اور بلاشبہ ہماری دینی، قومی، اجتماعی زندگی ان ہی کی مسیحا نفسی کی مرہون منت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ کا ذکر ضروری ہے کہ ہماری دینی تعلیم کا رخ اور رجحان بالکل صحیح اور ہماری دینی و قومی مزاج کے مناسب رہا ہے اور آج تک ہے، دارالعلوم دیوبند، سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدرسہ فرقانیہ اور اسی قسم کے دوسرے دینی اداروں کا نصب العین شروع سے آج تک یہی رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خادم پیدا کیے جائیں، اور دل و دماغ کو دین کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ منور کیا جائے،

لیکن نصب العین ایک رہنے کے باوجود حالات و ضروریات کی بنا پر تدابیر میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے، موجودہ دور میں حالات بدل جانے کی وجہ سے ان مدارس کے نظام میں کچھ اہم تبدیلیاں اشد ضروری ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارے ان دینی حلقوں پر بھی دشمنان دین کا قبضہ نہ ہو جائے، اور ہماری یہ دینی فوج نئے سامان جنگ سے محروم ہونے کی وجہ سے عاجز ہو کر ہتھیار ڈالنے اور بے سود مدافعت پر مجبور نہ ہو جائے، راقم السطور کی نظر میں ہمارے ان علمی مرکزوں میں مندرجہ ذیل تغیرات بہت ضروری ہیں،

(۱) تحریک موجودہ عصر کی روح ہے، جو باطل نظریہ پھیلنا چاہتا ہو وہ تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ہمارے دینی مدارس کے نصاب میں [illegible] ضرورت [illegible] طالب علم

(الف) موجودہ باطل تحریکات و نظریات کے بارے میں تاجرانہ بصیرت حاصل کرکے ان کا مقابلہ کرسکے۔

(ب) اس کو ان تدابیر سے واقفیت ہو جو اہلِ باطل حق کی مخالفت میں استعمال کرتے ہیں، اور ان کا جواب دے سکے۔

(ج) وقت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے، علوم غیر مقصودہ کی تعلیم میں ہمیں ضروری اور غیر ضروری کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا پڑے گا، اس طرح ہم وقت کی بچت اور جدید ضروری علوم کے لیے گنجائش کے دوگونہ مقاصد حاصل کرسکتے ہیں۔

(د) قرآن مجید اور سیرت نبوی دونوں ہمارے دائمی رہنما ہیں، طالبانِ علوم دینیہ کا ان دونوں سے زیادہ سے زیادہ تعلق پیدا کرایا جائے، اور موجودہ اسلامی مسائل کا حل ان کی روشنی میں تلاش کرنے کی عادت ڈالی جائے۔

۲۔ زمانہ کے تغیرات نے خانقاہوں کا بار بھی مدارس کے سر ڈال دیا ہے، اس لیے تعلیم کے ساتھ تربیت اخلاق و اعمال پر خصوصی توجہ مدارس کا اہم ترین فریضہ ہونا چاہیے۔

۳۔ ان مدارس کے طلبہ کو مسلمانوں کا قائد بننا ہے، ایک قائد کے لیے علاوہ علم کے کچھ دوسرے صفات کی بھی احتیاج ہوتی ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مدارس کے طلبہ میں قوم کی دینی قیادت کی صلاحیت پیدا کریں، اور ان کی تعلیم و تربیت ایسے عنوان سے کریں کہ وہ عام مسلمانوں کے سامنے ایک نمونہ کی زندگی پیش کرسکیں، ان میں دعوتی روح ہو، اور وہ کتاب و سنت کی جانب دعوت مجسم بن کر نکلیں۔

۴۔ مدارس عربیہ کا ایک وفاق ایسی شکل میں قائم کیا جائے جس سے ایک دوسرے کے مشوروں سے فائدہ اٹھا سکیں اور دین کے مختلف شعبوں کے لیے خدام تیار کرنے کے لیے تقسیم کار اور تعاون کرسکیں۔

۵۔ مدارس کا ربط عوام کے ساتھ بڑھایا جائے اور طلبہ کو عوام الناس میں دینی شعور بیدار

کرلے، دینی رجحان پیدا کرنے اور اسلامی زندگی کو رواج دینے کی مشق کرائی جائے،

۶۔ ایسی صورتیں اختیار کی جائیں کہ معاشی اعتبار سے دینی مدارس خود کفیل ہوجائیں، محض چندوں پر ان کا دارومدار نہ رہے، ملک کے عام معاشی تغیرات اور مسلمانوں کے معاشی انحطاط کے پیشِ نظر چندے کا ذریعہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے،

۷۔ سیلاب ارتداد سے بچانے اور دینی شعور پیدا کرنے میں بنیادی دینی تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ دینی مدارس کو اس مہم کے سر کرنے میں پیش پیش ہونا چاہیے، مکاتب قائم کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ان کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کا کام بھی دین کی ان چھاؤنیوں کو اپنے ذمہ لینا چاہیے، فارغ طابہ مشکوٰۃ و بیضاوی پڑھانے کی صلاحیت رکھنے کے ساتھ بچوں کو کلمہ طیبہ اور نماز کی تعلیم آسانی سے دینے کے قابل بھی ہوں،

دنیاوی تعلیم | دینی تعلیم کے متعلق میں عرض کرچکا ہوں، اس کے نصاب تعلیم یا طریق تعلیم کے متعلق اختلاف و اعتراض ہو سکتا ہے لیکن یہ واقعہ قابل مسرت ہے کہ اس کا رخ ہمیشہ درست رہا ہے، لیکن اسی قدر افسوس کے قابل یہ حقیقت ہے کہ ہماری دنیاوی تعلیم کا رخ ابتدا ہی سے بالکل غلط تھا، خشتِ اول کی اس کجی نے پورے نظامِ تعلیم کی عمارت ٹیڑھی کردی۔

اس مسئلہ میں ایک بنیادی غلطی کی تشریح اوپر کیجا چکی ہے، یعنی تعلیم کا انفرادی تصور، اب اس سے زیادہ خطرناک اصولی غلطی کی وضاحت کی جاتی ہے،

تعلیم کے معاملہ میں معلومات کی فراہمی سے زیادہ اہمیت اس ذہنی رجحان کو ہے جو تعلیم اور درسگاہ کا ماحول پیدا کرتا ہے، اگر یہ رجحان غلط ہے تو کبھی علم مفید و نافع نہیں ہو سکتا، ہماری بدنصیبی یہ رہی ہے کہ ہمارے کالجوں اور اسکولوں میں اس حقیقت سے غفلت برتی جاتی ہے، مسلم نوجوان تعلیم کا منشا پیٹ کو سمجھتا ہے، ملازمت کو معراج کمال سمجھکر حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے،

اس کو دین سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، یہ غلط رجحان اجتماعی و قومی حیثیت سے بہت مضر بلکہ مہلک ہے، وقت کا نازک مزاج اس بے راہروی کو اب برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، اور نہ قوم کی نازک حالت اس غفلت شعاری اور ستم کیشی کی روادار ہے،

حقیقت پسندی اور سلامت فہم کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اب اپنے اس جرم عظیم سے باز آجائیں، اور ہمارے بنیادی تعلیم کے ادارے بھی اس حیثیت سے دینی بن جائیں کہ طلبہ اور اساتذہ یہ محسوس کریں کہ ہمارے علمی سفر کی منزل مقصود اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ہے، ہم قوم کی کشتی کے ملاح ہیں اور یہاں صرف اس لیے آئے ہیں کہ اپنے دست و بازو میں اسے ساحل مراد تک پہنچانے کی قوت پیدا کریں، پیٹ پالنا ایک ثانوی چیز ہے نہ کہ اولین مقصد، اولین مقصد دین ہے، کل علوم کتاب و سنت کے خادم ہیں، اور ہماری معراج یہ ہے کہ ہم اپنی علمی و عملی زندگی کو اعلاء کلمۃ اللہ اور خدمت دین کے لیے وقف کردیں، اس رجحان کو ہمارے نظام تعلیم کی روح ہونا چاہیے، لیکن کیا ہمارے تعلیمی اداروں کی موجودہ جسمانی ساخت اس روح سے مناسبت رکھتی ہے، مشاہدہ نفی میں جواب دیتا ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے ڈھانچوں میں اہم اور انقلاب انگیز تبدیلیاں کریں، اور انھیں اس روح کے لیے سازگار بنائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اس اصول اور نصب العین کے پیش نظر نئے ادارے قائم کریں،

مندرجۂ بالا مقاصد اور حالات کے پیش نظر جس طرز کے علمی اداروں کی ہمیں ضرورت ہے ان کا ایک اجمالی خاکہ درج ذیل ہے،

سب سے پہلی اور بنیادی چیز تو یہ ہے کہ ہماری نئی نسلوں کی تعلیم ایک منصوبہ (Plan) کے ماتحت ہونی چاہیے، جو اب تک بالکل مفقود ہے، طلبہ کا جم غفیر تعلیمی اداروں کی طرف اس طرح چلتا ہے جیسے کوئی سیلاب میں بہتا ہے، نہ ان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے، نہ قومی ضروریات کا

کوئی نقشہ اداروں اور سرپرستوں کے سامنے کوئی اچھی چیز ہوتی ہے، وہ صرف اتنا جانتے ہیں کہ پڑھنا اور پڑھانا چاہیے کس لیے؟ اور کیوں؟ اس کی طرف انھیں کبھی توجہ نہیں ہوتی، ایک سمجھدار آدمی اپنی ماہانہ آمدنی کو بھی ایک منصوبہ کے ماتحت صرف کرتا ہے، لیکن کس قدر قابل افسوس بات ہے کہ ہم ذہانت و عمر کے اس بے بہا قومی سرمایہ کو بغیر سوچے سمجھے ہوئے بغیر کسی منصوبہ و مقصد کے صرف کر ڈالتے ہیں،

اس لیے اداروں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اندازہ لگائیں کہ ہمیں دینی و قومی حیثیت سے کس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے؟ ہمیں قائدین کی بھی ضرورت ہے، سائنس دانوں کی بھی حاجت ہے، سیاست دانوں کی بھی احتیاج ہے، غرض ہر شعبۂ حیات کے لیے ہمیں بہترین آدمی درکار ہیں، جو صلاحیت کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے ہوں، اور جن کا مقصد وحید دین کی ترقی، کلمۃ اللہ کی بلندی، قوم کی سربلندی اور ملت کی رفعت ہو، اس اندازے کے بعد طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں اور فطری مناسبتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ضرورت کے تناسب سے ہر شعبۂ تعلیم میں طلبہ کی مناسب تعداد کو رکھا جائے، اور ان پر پوری محنت و کوشش صرف کیجائے،

یہ ایک اصولی اور عمومی بات ہے، حالات کے لحاظ سے راقم الحروف کے خیال میں اسوقت اسلام اور مسلمانوں کی صحیح خدمت انجام دینے کے لیے اقسامِ ذیل کے تعلیم یافتہ افراد کی شدید ضرورت ہے، جن کی تیاری ہمارے تعلیمی اداروں کا فرض ہے،

۱۔ قوم کی موجودہ زبوں حالی میں میرے نزدیک خود قوم سے زیادہ قصور اس کی قیادت کا ہے، مسلمانوں کی آیندہ قیادت کے لیے یہ چیز ہوا اور پانی سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان کی قیادت ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو دین و دنیا کے جامع ہوں، لیکن ایسے اشخاص نادر ہیں اور عرصہ تک نادر ہی رہیں گے، اس کمی کی تلافی اس صورت سے ہو سکتی ہے کہ ہمارے دینی مدارس

دینی قائد اور دنیاوی مدارس ایسے قائد پیدا کریں جو دینی قائدین کے مشورے سے مسلمانوں کی دنیاوی قیادت کر سکیں یعنی انھیں ایسے راستہ پر لگا سکیں جو دنیاوی و مادی قوتوں کو دینی و ملی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مفید و پرمنفعت بنائیں، ایسے ہی اشخاص ملت کی کشتی کو موجودہ بلاخیز طوفان سے بچاکر ساحل مراد تک صحیح سلامت پہنچا سکتے ہیں،

۲۔ ایسے عوام کی بھی ضرورت ہے جو صحیح قائد کا انتخاب کر سکیں، اور تعمیر ملی میں اس کا ہاتھ بٹا سکیں جن میں دینی و ملی خدمت کا جذبہ موجود ہو، اور اتنی فہم ہو کہ اپنے قائدین کی بات کو سمجھیں،

۳۔ جو تعلیم صرف ملازمتوں کے لیے دی جائے گی وہ سم قاتل ہے، خصوصاً موجودہ حالات میں جبکہ ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں کے لیے بند ہو چکے ہیں، صنعتی تعلیم کی ضرورت تو پہلے بھی تھی، مگر اب اور شدید ہو گئی ہے، صنعت و حرفت کی تعلیم ہمارے ہر ادارے میں لازمی ہونی چاہیے، اس طرح ہمارا معاشی مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا، اور خود ان اداروں کا معاشی مسئلہ بھی لاینحل نہ رہیگا،

۴۔ سائنس کے مفید شعبے مثلاً طبیعیات، کیمیا، ریاضی، انجنیری، طب جدید، نباتات وغیرہ کی تعلیم اس وقت نہ صرف مسلمانان ہند کے لیے، بلکہ مسلمانان عالم کے لیے بہت ہی ضروری اور بہت ہی مفید ہے، مسلمانوں کے سیاسی و معاشی زوال کے مادی اسباب کا اگر جائزہ لیا جائے تو سائنس سے ان کی بے رخی کو غالباً سرفہرست درج کرنا ہوگا، ملٹن اور شیکسپیر پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اگر مسلمان سائنس کے مفید شعبوں میں اپنی ذہانت و ذکاوت صرف کریں تو اس سے علمی ترقی کا راستہ بہت مختصر ہو جاتا ہے، سائنس کی تعلیم کے متعلق مجھے دو باتیں خصوصیت سے کہنی ہیں، پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہر وہ علم جس پر سائنس کا لیبل لگا دیا جائے مفید ہی نہیں ہوتا، اس کے بعض شعبے ایسے بھی ہیں جن میں کوئی افادیت نہیں ہے، اور کسی قوم کے ملی و دینی عروج و زوال پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا، ان میں وقت صرف کرنا اضاعت عمر و قوت ہے، اس لیے دیکھنا یہ چاہیے کہ کس علم کی تحصیل

دینی و ملی اعتبار سے ہمارے لیے مفید اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہمیں سر بلند کرنے والی ہیں، کاش ہمارے تعلیمی ادارے، ہمارے نوجوان، اور ان کے سرپرست دیرینہ غفلت سے بیدار ہوں، اور مفید و غیر مفید علوم میں امتیاز کریں، معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم سے اللہ کی پناہ مانگی ہے، جو مفید نہ ہو، یہ حقیقت بھی سامنے رکھیے کہ جو چیز آخرت میں مفید نہیں ہے (خواہ وہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ) ایک مسلمان کی نگاہ میں اس کوئی قیمت نہیں ہے،

دوسری ضروری بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ سائنس کی تعلیم صرف علمی و نظری یعنی مسائل کی تفہیم تک محدود نہ ہو، بلکہ پوری کوشش اس پر صرف کیجائے کہ طلبہ میں اجتہاد و اختراع کا مادہ پیدا ہو، اور وہ صرف یورپ کی گاڑی کے قلی نہ بنیں بلکہ خود اپنی گاڑی تیار کر سکیں،

۵ - طلبہ کی اخلاقی و دینی تربیت کی طرف خاص طریقہ سے توجہ کی ضرورت ہے، مسلمانوں کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ انھیں دوسری قوموں پر جب کبھی فوقیت حاصل ہوئی ہے تو محض دینی و اخلاقی امتیاز و برتری کی وجہ سے۔ اور ان کا انحطاط و زوال بھی دین سے ان کے تعلق کے کمزور ہونے سے وابستہ رہا ہے، ان کے دور حکمرانی میں اقتدار کی قوت نے انکی موت کی رفتار کو قدرے سست کر دیا تھا، برطانوی عہد میں مغلوبیت سیاسی تھی مذہبی نہ تھی، ترک اسلام کی کوئی دعوت بھی نہ تھی، ان چیزوں نے جینے کی کچھ مہلت دیدی، لیکن اب ایک ایسی قوم کے ساتھ بسر کرنا ہے جسے ہم پر سیاسی و معاشی غلبہ حاصل ہے، تعداد کے لحاظ سے بھی اس کی اکثریت ہے، وہ اپنے کلچر کی دعوت دے رہی ہے، ان حالات میں اگر ہماری دینی حالت میں ترقی نہ ہوئی، تو وہ وقت دور نہیں جب علماء، صوفیہ، صلحاء و اتقیا کی اس سرزمین میں اسلام کا نام بھی باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، الحاد، دہریت، بد اخلاقی، فسق، بے حیائی، شرک وغیرہ کے طوفان جس شدت و قوت کے ساتھ حملہ آور ہیں، ان کا مقابلہ صرف اسلامی ناموں سے نہیں، بلکہ اسلامی کاموں، اسلامی سیرتوں، اسلامی دلوں

اداروں سے ہو سکتا ہے، ہمارے انگریزی اسکول اور کالج، ان بداعمالیوں اور اللہ تعالیٰ سے باغی بنانے والی تحریکوں کے مخزن بنے ہوئے ہیں، کیا وہ اسلام کے نافرمانوں اور اللہ کو بھولنے والوں کو تعلیم دے کر دین یا قوم کی کوئی خدمت انجام دے رہے ہیں؟ جس ادارے سے عبد الرحمن و عبد اللہ عبد الدنیا اور عبد البطن بنکر نکلیں، کیا اسے کسی معنی میں بھی اسلامی یا مسلم ادارہ کہا جا سکتا ہے؟ قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمیں ایسے آدمی درکار ہیں، جن کی روح اسلامی ہو اجذبات و میلانات اسلامی ہوں اور اس کے ساتھ وہ دنیاوی علوم و فنون سے آراستہ ہوں،

۶۔ ہمارے تعلیمی اداروں کا طرزِ عمل بہت مسرفانہ ہے، قوم کی موجودہ معاشی حالت کسی طرح اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، مسلمانوں کے لیے ادنیٰ و اعلیٰ ہر قسم کی تعلیم ارزاں سے ارزاں ہونی چاہیے، اگر اداروں کا معیارِ زندگی پست کر دیا جائے اور ان کی مناسب تنظیم ہو جائے تو تعلیم کی ارزانی کچھ مشکل نہیں ہے۔ جفاکش، محنتی اور باہمت ناخدا ہی اب قوم کی کشتی کو پار لگا سکتے ہیں، اور ایسے ہی افراد کا تیار کرنا ان اداروں کا فریضہ ہونا چاہیے،

ایک طرف صاحب علم و فہم، متقی، نیک سیرت علمائے دین ہماری دینی رہبری و قیادت کریں، دوسری طرف دیندار، بلند کردار، جفاکش، اسلامی روح رکھنے والے نئے تعلیم یافتہ اشخاص ہماری دنیاوی رہبری کے لیے موجود و مستعد ہوں تو کون ہمیں مٹانے کی ہمت کر سکتا ہے۔

اسی قسم کے اشخاص پیدا کرنے اور انھیں دینی و قومی خدمت پر لگانے کے لیے ہمیں نصابِ تعلیم اور طریقِ تعلیم پر بھی نظرِ ثانی کرنا پڑے گی، سطورِ ذیل میں اس مسئلہ کے متعلق بھی چند اصولی اشارات کیے جاتے ہیں،

ابتدائی تعلیم ابتدائی تعلیم سے متوسط اور متوسط سے اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں کی تعداد گھٹتی رہتی ہے، اکثریت کی تعلیمی جد و جہد ابتدائی تعلیم تک محدود رہتی ہے، یہ محدود تعلیم و تربیت

قیادت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ناکافی ہے، لیکن اس درجہ کے طالب علم کو ایک سمجھدار اور زمانہ شناس، عامی مسلمان بنا دینا آسان ہے، ابتدائی درجات میں ہمارا نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے، جسے پڑھکر طالب علم اسلام کے اتنے احکام و عقائد پختگی کے ساتھ معلوم کر لے جن کا علم ہر عامی مسلمان کے لیے ضروری ہے، عربی زبان سے بھی معمولی واقفیت پیدا ہو جائے اور قرآن مجید کے ایک مختصر حصے کا ترجمہ اور کچھ احادیث سے بھی اسے واقف ہو جانا چاہیے، تاکہ اسلامی و قرآنی دعوت کو سمجھ سکے، اس کے ساتھ علوم و السنۂ عصریہ خصوصاً سائنس و ریاضی و انگریزی وغیرہ سے اسے معیاری واقفیت ہو جائے، صنعتی تعلیم بھی ان درجات میں لازم ہونا ضروری ہے، اسلامی روح، دینداری اور خدمت اسلام و مسلمین کا جذبہ پیدا کرنا نصاب سے زائد طریق تعلیم و تربیت پر منحصر ہے، اسے بھی مقصد کے مناسب ہونا چاہیے،

اس مرحلے پر یہ مقصد ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ ہم ایسا مواد خام تیار کرتے رہیں جو دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے اداروں میں کارآمد ہو سکے، تعلیم کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد طالب علم اگر چاہے تو کسی دینی درسگاہ کا راستہ لے اور ایسا عالم دین بننے کی کوشش کرے جو دنیا سے بھی ناواقف نہیں ہے، اور زمانہ کا رخ پہچاننے کی استعداد رکھتا ہے، اور اگر چاہے تو اپنا راستہ بدستور طے کرتا رہے اور علوم عصریہ کا ایسا فاضل بننے کی کوشش کرے جو دین سے بھی آشنا و واقف ہو کر علمائے دین کی رہنمائی میں اپنی اور دوسروں کی دنیا کو دین کے لیے مفید بنا سکے، اور دنیاوی تدابیر کا بہترین استعمال کر سکے،

ثانوی تعلیم | ثانوی یا متوسط درجات میں ہماری کوشش اوسط درجہ کے قائد بنانے کی ہونی چاہیے، اس سے مراد سیاسی قائد ہی نہیں ہیں، بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ایسے اشخاص تیار کیے جائیں جو زندگی کے خاص خاص شعبوں میں اپنی قابلیت و صلاحیت کے لحاظ سے دنیاوی تدابیر کے بارے میں قوم کی

رہنمائی کرسکیں، مثلاً ایک صناع صنعت وحرفت کے بارے میں رہنما بن سکے سائنسٹ صناعوں اور اہل حرفہ کو مزید ترقی کی تدابیر سے روشناس کرسکے، وعلیٰ ہذا۔ ان سب میں مشترک شے یہ ہونی چاہیے کہ بڑے درجہ کے قائدین دینی وقومی مفاد کے لیے جو مشورے دیں انھیں سمجھکر اپنے حلقۂ اثر میں عملی شکل میں لانے کی کوشش کرسکے، اور قوم میں دینی جذبات ورجحانات پیدا کرسکے،

نصب العین کی مناسبت سے نصاب تعلیم میں امور ذیل کا لحاظ کرنا چاہیے۔

(الف) دینی تعلیم لازم ہو اور اس کا معیار ابتدائی درجات سے نسبتۃً بلند ہو، عربی زبان اور ترجمۂ قرآن مجید کی مقدار میں کچھ مزید اضافہ اور سیرت نبوی وسیرت صحابہ سے روشناس کیا جائے، اس کے ساتھ جس شعبۂ تعلیم کو طالبعلم نے اختیار کیا ہے، اس کے متعلق احکام شرعیہ مناسب تفصیل سے بتادیے جائیں، مثلاً صنعت وحرفت کے متعلم کو احکام شرعیہ متعلقہ صنعت وحرفت سے واقف ہونا چاہیے، وعلیٰ ہذا۔

(ب) سائنس وصنعت کی تعلیم کی ہمت افزائی کرنی چاہیے اس وقت اجتماعی حیثیت سے ہمیں اس کی ضرورت ہے، فنون (آرٹس) کی افادیت ہمارے لیے نسبتۃً کم ہوگئی ہے، خصوصاً ادبیات وتاریخ وغیرہ کی۔ فنون میں ان چیزوں کو ترجیح دیجائے جن میں افادیت زائد ہو، غیر مفید چیزوں میں اضاعت وقت اب خودکشی کے مرادف ہے۔

(ج) علوم وفنون کا کوئی حصہ اگر اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوتا ہو، تو اس کی حد تک اسلامی نقطۂ نظر اور اس کی وضاحت متعلم کے سامنے کرنا ضروری ہے،

اعلیٰ تعلیم | اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور اشخاص قیادت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہونے کے لیے موزوں ہوں گے، ان کی تعلیم وتربیت بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہونی چاہیے، اس تعلیم کے ذمہ داروں کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ تعلیم وقابلیت کا معیار بلند سے بلند تر ہو، خصوصاً سائنس کی تعلیم کا بہترین انتظام

ہونا چاہیے، مضامین میں اجتماعی اعتبار سے مفید و غیر مفید یا کم مفید کے درمیان خط امتیاز کھینچا جانا بھی لازم ہے،

سیرت و کردار کی اہمیت اصل تعلیم ہیں اور بڑھائی جائے، یہ قائدین قوم اگر اسلامی کردار کے حامل، نیک سیرت اور مخلص نہ ہوئے تو قوم کی تباہی کے لیے کسی دوسرے سبب کی ضرورت نہیں ہے،

جہانتک دینی تعلیم کا تعلق ہے، اس کی ضرورت بدستور باقی رہتی ہے، پورے قرآن مجید سے انھیں بہرہ ور ہونا چاہیے، سیرت نبوی تفصیل سے پڑھنی چاہیے، زیادہ زور کلامی تعلیم پر ہونا چاہیے، عمومی مسائل کے علاوہ کسی مخصوص علم کے جو مسائل اس کے طالب کے سامنے آئیں اور اسلام سے متصادم محسوس ہوں تو اسلامی نقطۂ نظر کی ترجیح و وجہ ترجیح سے متعلم کو پوری طرح واقف بنانا چاہیے، اگر وہ سیاسیات کا طالب علم ہے تو غیر اسلامی سیاسی نظریات کے ساتھ اسے اسلامی نظریۂ سیاست بھی جاننا چاہیے اور اس کی فوقیت سے واقف ہونا چاہیے، اگر وہ فلسفہ پڑھتا ہے تو اسلامی عقائد کا مدلل علم اسے ہونا چاہیے، غیر اسلامی اخلاقیات کے مقابلہ میں اسلامی اخلاقیات کا علم بھی لابدی ہونا چاہیے، اس مرحلے پر متعلم کو دو حقیقتوں سے پوری طرح واقف بنانا اداروں کا فرض ہے،

اول یہ کہ علوم و فنون کے کتنے مسائل ہیں جو اسلام سے متصادم ہوتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایسے مسائل کی تعداد بہت کم ہے، لیکن اس زہر کا تریاق مہیا نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اثرات شدید اور متعدی ہو رہے ہیں،

دوسرے یہ کہ علوم و فنون کو دین و آخرت کے لیے کس طرح مفید بنایا جا سکتا ہے، اور انھیں اسلام کا خادم بنانے کے علاوہ مہارت و قابلیت کے کس چیز کی احتیاج ہے، لیکن یہ بات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک طالب علم کے جذبات دینی نہ ہوں، جس دل میں اللہ کا خوف نہ ہو وہ نظری بحثوں اور کلامی دلائل سے شاذونادر ہی فائدہ اٹھاتا ہے،

اس سلسلہ میں آخری اصولی بات یہ عرض کرنا ہے کہ دنیاوی و دینی تعلیم کے اختلافات کو مٹانے اور اسکو قابل مفید بنانے

کے لیے یہ ضروری چیز ہے کہ ہم اس خلیج کو بالکل پاٹ دیں جو ابتک دینی و دنیاوی تعلیمی اداروں میں حائل رہی ہے، دونوں قسم کے مدارس میں ایک رابطہ قائم ہونا چاہیے، اور دنیاوی اداروں کو علماے دین سے دینی رہنمائی حاصل کرنا چاہیے، اسی طریقہ سے دنیاوی مدارس کے بارے میں دینی اداروں کو دنیاوی اداروں کے فضلاء سے مستفید ہونا چاہیے، مقصد میں وحدت باہمی تعاون کی مستقل دعوت ہے،

نظامِ تعلیم کا مسئلہ قوم کی موت وزیست کا مسئلہ ہے، کاش ہمارے تعلیمی ادارے اور اکابر قوم ادھر توجہ کریں، اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم دیدہ ودانستہ اپنی موت کو دعوت دے رہے ہیں، حکومت کی امداد کا مسئلہ اس راہ میں حائل ہو سکتا ہے لیکن اگر ہم اس مشکل کو حل کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو وہ کوئی بڑی مشکل نہیں ہے، معیارِ زندگی پست کرکے، اخراجات گھٹا کر، اداروں کو خود کفیل بنا کر، غرض کسی نہ کسی طرح ہم اس دیوار کو پار کر سکتے ہیں، کیا اکابرِ قوم اپنی ذمہ داری کا احساس فرمائیں گے،

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی)

قیمت: چھ روپیے   "منیجر"

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب اقبال

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(۶۱)

بھوپال، شیش محل
یکم اگست ۱۹۳۵ء

مخدوم مکرم جناب مولانا صاحب، السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں،

چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں، اُن کے جواب[1] سے بھی ممنون فرمایئے۔

۱۔ تکملۂ مجمع البحار صفحہ ۸۵ میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے یعنی یہ کہ حضور رسالت مآبؐ کو خاتم النبیین کہو، لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہ ہوگا[2]۔

[1] اس وقت وہ ردّ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے۔ [2] جی ہاں! اس کتاب میں یہ روایت ہے جو مصنف ابن شیبہ سے لی گئی ہے، لیکن اس کی سند مذکور نہیں اور روایت کی صحت و ضعف کا پتہ لگایا جائے، اگر صحیح ہو بھی تو یہ

ا ق، عا[illegible] ھو،

مہربانی کر کے کتاب دیکھ کر یہ فرمایئے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں، اور اگر ہیں تو آپ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے؟ ایسا ہی قول درمنثور جلد پنجم صفحہ ۲۰۴ میں ہے، اسکی تصدیق کی بھی ضرورت ہے[1]، میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں، افسوس ابتک نہیں ملیں،

حجج الکرامہ صفحہ ۴۲۴۔ ۴۳۱ حضرت مسیح کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے:۔

"من قال بسلب نبوته کفر حقا۔" اس قول کی آپکے نزدیک کیا حقیقت ہے[2]؟

۳۔ "لو عاش ابراهيم لكان نبيا" اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے، نووی اسے معتبر نہیں جانتا، ملا علی قاری کے نزدیک معتبر ہے، کیا اس کے اسناد درست ہیں[3]؟ بخاری کی حدیث

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۷) حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار خود فرمایا ہے لا نبی بعدی، میرے بعد کوئی نبی نہیں، حضرت عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں، بہرحال یہ ان کا خیال ہے، جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو،

[1] جی ہاں وہی، روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے، اور اسکی نسبت پہلے لکھ چکا ہوں،

[2] حجج الکرامہ فی آثار القیامہ نواب صدیق حسن خان کی کتاب ہے، حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی بصفت نبوت ہوگی، یا بلا صفت نبوت، اس باب میں علماء کا اختلاف ہے، نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفت نبوت ہوگی، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ انکے آمد ثانی میں ان کی صفت نبوت کا انکار کرتے ہیں، وہ مرتکب کلمۂ کفر ہیں، بہرحال یہ رائے ہے [3] یہ ابن ماجہ کی روایت ہے، اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضاً ہے، واقعۃً نہیں، کیونکہ لو فرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، اس لیے ابراہیم بن محمد کو بچپن ہی میں اٹھا لیا گیا، چنانچہ دوسری روایتوں میں یہ مذکور ہے، چنانچہ خود ابن ماجہ میں اور بخاری میں ہے، ولو قضی ان یکون بعد محمد نبی لعاش ابنہ

(باقی صفحہ ۲۲۹ پر)

وامامکم منکم میں واؤ حالیہ ہے کیا؟[1] اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں، کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا،

۵۔ ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے،

زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا،   والسلام

مخلص محمد اقبال

(۹۶)

بھوپال

۲۰ اگست ۱۹۳۵ء

مخدومی   السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں،

میں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا، الحمد للہ کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۰) ولکن لا نبی بعدی (ابن ماجہ جنائز۔ بخاری ابنیاء) یعنی یہ کہ اگر فیصلۂ الٰہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کے صاحبزادہ زندہ رہتے لیکن یہ فیصلۂ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے، اس کو معتبر نہیں کہا ہے، ضعیف کہا ہے، اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہی بلکہ اسکو متروک الحدیث منکر الحدیث، باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے، اس کے بعد بشرط صحت ملا نے اسکی تاویل کی ہے، بہرحال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے۔ لوکان بعدی نبیا لکان عمر (مسند احمد و ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمرؓ بن خطاب نبی ہوتے لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ اور نہ کوئی اور نبی ہو سکتا ہے،

[1] صحیح یہی ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے مسلمانوں کا امام الگ ہوگا، حضرت عیسٰیؑ نہ ہوں گے،

بہت سی باتیں مل گئیں، اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا، اور آپ کے خطوط نے اور بھی راہیں کھول دیں،

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا، اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں، اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب سمجھتا ہوں، فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں، جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے، ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست
کہ برمن تہمت شعر و سخن بست (زبور عجم)

مخلص محمد اقبال

(۶۸)

بھوپال
۲۳ اگست سنہ ۱۹۳۳ء

مخدوم مکرم جناب مولانا، السلام علیکم

ایک عریضہ لکھ چکا ہوں، امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گذرا ہوگا،

ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی، جواب عرض کرتا ہوں،

کیا علماے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں جو حیات و نزول مسیح بن مریم کے منکر ہوں؟[1] یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے؟

---

[1] مجھے جہاں تک علم ہے نزول مسیح کا انکار کسی نے نہیں کیا، معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو، البتہ ابن حزم وفات مسیح کے قائل تھے ساتھ ہی نزول کے بھی،

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا، میں ۲۰ راگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا، علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا، اس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمایئے۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

(۶۹)

لاہور

۲ر اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی مولانا۔ السّلام علیکم

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے آپ کو صحت عطا فرمائی، آپ کا وجود ہندکے مسلمانوں کے لیے ازبس ضروری ہے، اور مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا ہے تاکہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مستفیض ہوتے رہیں،

میں نے سنا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب بدور البازغہ چھپ گئی ہے، مہربانی کرکے اس کا ایک نسخہ وی پی مجھے ارسال فرمایئے، اگر آپ کے ہاں نہیں ہے تو جہاں دستیاب ہوسکتی ہے، وہاں سے منگوا دیجئے، یا ان کو لکھ دیجئے کہ ایک نسخہ میرے لیے وی کر دیا جائے، مجھے معلوم نہیں چھپی ہے، اور کہاں سے دستیاب ہوسکتی ہے، اس لیے آپ تکلیف دی گئی ہے،

موسیٰ جار اللہ کو آپ جانتے ہوں گے، انھوں نے حال میں ایک کتاب عقائد پر شائع کی ہے، اس میں بعض لطائف ہیں جو بہت جاذب توجہ ہیں۔ ۱-

والسّلام

مخلص محمد اقبال

(۷۰)

لاہور

۷ر اگست ۱۹۳۶ء

مخدومی، السلام علیکم۔ والا نامہ ابھی ملا ہے۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔ میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے، گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا، جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے، اس میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے، بدر البازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں، مہربانی کرکے انکے ناموں سے مجھے آگاہ فرمایئے، اور یہ بھی فرمایئے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی،

الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے، اگر آپ کی صحت اجازت دیدے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و نافع بیان شائع فرمایئے، میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا، اس کا موضوع ہوگا بروز، لفظ بروز[1] کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو، یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس کی بحث ہو تو اس کا پتہ دیجئے، نہایت شکر گذار ہوں گا۔

موسیٰ جار اللہ[2] صاحب کی کتاب نہایت عمدہ ہے ملنے کا پتہ کتاب پر یہ لکھا ہے،

مکتبۃ الخانجی، شارع عبدالعزیز، مصر

امید کہ مزاج والا بخیر و عافیت ہوگا۔ والسلام

مخلص محمد اقبال

---

[1] لفظ بروز کے معنی تو ظہور ہیں، مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں۔ [2] موسیٰ جار اللہ مشہور روسی عالم مفکر ہیں، ہندوستان کئی بار آچکے ہیں، مجھ سے مکہ معظمہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، یہ ترکی میں بہت سی اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں۔

ادبیات

غزل

از

جناب جاوید انصاری برہانپوری

تذکرے حسن کے اب کون و مکاں تک پہنچے
دیکھئے سلسلۂ عشق کہاں تک پہنچے

خوگرِ ظلم و ستم دل کو بنایا برسوں
تب کہیں مرحلۂ ضبطِ فغاں تک پہنچے

عصمتِ حسن کا معصوم تقاضا ہے یہی
رازِ الفت نہ کہیں دل سے زباں تک پہنچے

لامکاں تک ترے جلوے سے منور پایا
کیا کہیں تیرے تصور میں کہاں تک پہنچے

اس قدر جذبِ محبت میں اثر پیدا کر
آستاں خود ترے سجدوں کے نشاں تک پہنچے

پیچ و خم راہِ طلب کے کوئی ان سے پوچھے
جو ترے عشق کے اسرارِ نہاں تک پہنچے

کیجیے منزلِ ہستی کا تعین کیونکر
کیا خبر قافلۂ عمر کہاں تک پہنچے

حسن محتاط کو اندیشۂ رسوائی ہے
سترِ دلبر نہ حدیثِ دگراں تک پہنچے

دل ہے ناکام تمنا تو نگاہیں بدنام
سعیِ تکمیلِ محبت میں یہاں تک پہنچے

کب تھے رنگینیِ اردو کے یہ چرچے جاوید
رفتہ رفتہ ترے اندازِ بیاں تک پہنچے

غزل

از

جناب ندیم مراد آبادی

بیخودی تو نہیں خودی کے قریب — تیرا جلوہ ہے زندگی کے قریب
حسن ہے چشم آگہی کے قریب — آ گیا عشق زندگی کے قریب
اللہ اللہ مقام دیدہ و دل — آ گئے منزلِ خودی کے قریب
زندگی نغمہ و فغاں تو نہیں — ڈھونڈھیے کیوں غم و خوشی کے قریب
موت سے مل سکا ہے کس کو مفر — موت تو خود ہے زندگی کے قریب
آئینہ ڈھونڈھتی ہے رعنائی — محوِ حیرت ہوں میں کسی کے قریب
آج تک وہ سمجھ سکے نہ ہمیں — اک اندھیرا ہے روشنی کے قریب
دیکھنے والے خوابِ عشرت کے — غم بھی موجود ہے خوشی کے قریب

کوئی حرمان و غم ندیم نہ تھا
یعنی جب ہم تھے زندگی کے قریب

اطلاع

پاکستان کے خریداران معارف سے گذارش ہے کہ وہ معارف کی سالانہ قیمت مکتبۃ الشرق، آرام باغ، کراچی کے پتہ سے بھیجدیں۔

منیجر

مطبوعات جدیدہ

میر تقی میر ۔ از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۴۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ۱۲ ۔ پتہ: انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ،

اردو میں میر کے حالات اور ان کی شاعری پر مضامین کی شکل میں تو بہت لکھا گیا ہے لیکن ان کے مرتبۂ شاعری کے لحاظ سے ان پر کوئی مستقل اور مفصل کتاب نہیں تھی، لائق مصنف نے میر تقی میر لکھکر اس کمی کو پورا کیا ہے، یہ کتاب نہ صرف میر کے سوانح کی حیثیت سے بلکہ علمی و ادبی حیثیت، معلومات کے تنوع و کثرت اور تحقیق و تنقید کے لحاظ سے اردو ادب میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، مصنف نے اس کی تالیف میں ہر ممکن الحصول ماخذ سے فائدہ اٹھایا ہے اور تلاش و تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے، یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں میر کے خاندانی حالات، پیدائش سے لیکر وفات تک کے سوانح اور ان کی شاعری کے عوامل و موثرات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، میر کا زمانہ تیموری حکومت کے زوال، اور سیاسی شورش و انقلاب کا دور تھا، نادر شاہ کے حملہ سے لیکر غلام قادر روہیلہ کے ہنگامہ تک مغلوں کے زوال کے سارے مراحل اور دہلی کی تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، بلکہ خود بھی اس میں مبتلا ہوئے، جس کا اثر ان کے دل و دماغ اور شاعری پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لیے میر کے سوانح کے سلسلہ میں اس پورے پس منظر کی مختصر سرگذشت تحریر کی گئی ہے، اس کے بعد میر کی وفات تک ان کے قیام لکھنؤ کے حالات ہیں، دوسرے باب میں میر کی سیرت، اس پر ان کے حالات کے اثرات، اور ان کے بعض بنیادی تصورات کا مختصر ذکر ہے، تیسرے باب میں میر کے کلام، ان کی غزلیات، قصائد، مثنویوں، ساقی ناموں، مراثی، واسوخت، ہجویات،

اور فارسی کلام وغیرہ جملہ اصناف سخن پر نقد و تبصرہ ہے، اس سلسلہ میں اردو شاعری میں میر کی اصلاحات، زبان کے متعلق ان کی خدمات اور اردو اور فارسی شعراء پر ان کے اثرات کا اجمالی ذکر بھی ہے، یہ باب مصنف کے ادبی و شعری مذاق پر تنقیدی بصیرت اور سخن فہمی و نکتہ سنجی کا نمونہ ہے، اس میں انھوں نے میر کے کلام کی خصوصیات اور ان کے گوناگون پہلوؤں کا اس تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور اس کے ظاہری و معنوی محاسن اس خوبی سے دکھائے ہیں کہ اس کا ہر رخ اور ہر پہلو نگاہ کے سامنے آجاتا ہے، اور اس کی عظمت پوری طرح نمایاں ہوجاتی ہے، اس بحث میں میر کے معائب پر بھی سرسری نگاہ ڈالی گئی ہے، چوتھے باب میں میر کی نثر کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اور اس کے بعض مفید اور دلچسپ اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، پانچویں باب میں قدیم تذکرہ نگاروں کے بیانات کی روشنی میں میر کا درجہ متعین کیا گیا ہے، اور آخر میں ضمیمہ میں میر کے متعلق بعض قدیم تذکروں کے بیانات اور بعض دوسری تحریریں نقل کی گئی ہیں، اس طرح یہ کتاب میر کے حالات اور ان کی شاعری کی انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت دلکش و ادیبانہ اور متین و سنجیدہ ہے، غرض یہ کتاب ہر حیثیت سے اردو ادب میں ایک اہم درجہ رکھتی ہے، غالب کا قرض تو حالی، غلام رسول مہر، محمد اکرام وغیرہ بہت سے اصحاب قلم ادا کر چکے تھے، میر کا قرض باقی رہ گیا تھا، اس کو خواجہ احمد فاروقی نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا یہ ادبی کارنامہ ان ترقی پسند ادیبوں کے لیے باعث تقلید ہے جنھوں نے ادب کی خدمت کا دائرہ محض تنقید اور کمیونزم کے پروپیگنڈے میں محدود کر دیا ہے، اور اس تنقید میں بھی محض دوسروں کی نقالی اور رمز و معنی کے مقابلہ میں الفاظ کا طلسم زیادہ ہوتا ہے، کاش ان کو بھی اس قسم کی ٹھوس اور سنجیدہ خدمت کی توفیق ہوتی۔

مآل بصیرت - از جناب عطاء اللہ پالوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد: عہ، پتہ: سنگم کتاب گھر، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی،

یہ مصنف کے دس مضامین کا مجموعہ ہے، فدیہ، حکمت، امی، تزکیہ، مقابلہ، مسلمان، آدم، عید، مشرک،

اور اجنبی، ان مضامین میں جمہور امت کے خلاف آیات و احکام قرآنی کی بیشتر غلط اور مادی تاویلیں کی گئی ہیں، مثلاً "فدیناہ بذبح عظیم" میں فدیہ سے مینڈھے کی قربانی نہیں بلکہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش مراد ہے "یعلمہم الکتاب والحکمۃ" میں حکمت سے مراد حدیث نبوی اور اخلاقی تعلیمات نہیں بلکہ دنیاوی علوم و فنون ہیں، اُمّی کے معنی اَن پڑھ کے نہیں بلکہ مکہ کے باشندے کے ہیں، "یتلوا علیہم آیاتنا ویزکیہم" میں تزکیہ سے نفس کا روحانی اور اخلاقی تزکیہ یا زکوٰۃ مراد نہیں بلکہ دنیاوی ترقی کی استعداد و صلاحیت پیدا کرنا ہے" مقابلہ میں امریکہ اور مکہ کا موازنہ کرکے دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا مرکز کتنی پستی میں مبتلا ہے اور مادہ پرستوں کا مرکز کس قدر ترقی کر رہا ہے" مسلمان" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محض عربی نام رکھ لینے، چند عقائد اور عبادت کے ظاہری رسوم ادا کرنے یا خاص قسم کی وضع قطع کا نام اسلام اور مسلمان نہیں ہے، بلکہ اسلام نام ہے سراسر ایثار و قربانی کا، اور مسلمان وہ ہے جس کا نصب العین اسلام ہو، آدم نبی نہیں تھے، نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں، استخلاف فی الارض سے مراد اخلاقی و روحانی خلافت نہیں، بلکہ دنیاوی حکومت ہے، عید روزے کے اختتام کا جشن نہیں بلکہ فتح بدر کا جشن ہے، مشرک وہ نہیں ہے جو خدا کی ذات و صفات میں شریک ٹھہرائے، بلکہ مشرک وہ ہے جو مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے، اجنبی میں ثابت کیا گیا ہے کہ "ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر" اور اس مفہوم کی دوسری آیات میں امت سے مراد علماء و مبلغین کی جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پرامن تبلیغ نہیں بلکہ صاحب حکومت و اقتدار جماعت مراد ہے، جو جبر و قوت سے اس کو منوا سکے مصنف اہل قرآن کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے پرویز اور برق وغیرہ کی طرح، اسلام اور اس کی تعلیمات کے مقاصد، اور مسلمانوں کی فوز و فلاح کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر بھی خالص دنیاوی یعنی مادی ترقی اور حاکمانہ غلبہ و اقتدار ہے، اس لیے مذکورۂ بالا مضامین میں اسی نقطۂ نظر سے اسلامی احکام اور قرآنی آیات کی تشریحیں کی گئی ہیں، بعض مضامین خالص علمی بھی ہیں، اور [redacted] بھی صحیح ہیں،

مگر ان کو اس بے ڈھنگے طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ ان سے مفید نتیجہ نکلنے کے بجائے اس کا مضر اثر مترتب ہوتا ہے، ان مضامین میں علمی بحث و تحقیق سے بہت کم زیادہ تر ملاؤں پر طعن و طنز سے کام لیا گیا ہے، اقبال کے اشعار کی مٹی بھی پلید کی گئی ہے، افسوس ہے کہ اس مختصر تبصرہ میں مضامین پر تفصیلی نگاہ ڈالنے کی گنجایش نہیں ہے، ورنہ مصنف کی تحقیقات عالیہ کے کچھ نمونے دکھائے جاتے، مگر یقین ہے کہ صاحب علم ناظرین کو موضوع بحث اور مصنف کے نقطۂ نظر سے خود اس کا کسی قدر اندازہ ہوجائیگا،

طب العرب۔ مترجم جناب حکیم سید علی احمد صاحب نیر واسطی تقطیع بڑی، ضخامت ۴۸۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور،

عربوں نے دوسری قوموں کے جن علوم کو اپنا کر ترقی دی ہے، ان میں ایک طب بھی ہے، انھوں نے اس کو مصر و یونان اور ایران و ہندوستان سے لیا اور اپنی تحقیقات و تجربات کے ذریعہ اس کی ہر شاخ اور ہر شعبہ کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا، اور ان ہی کے ذریعہ فن طب یورپ پہنچا اور مسلمان مصنفین کی طبی کتابوں کے لاطینی ترجمے صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، اس طرح طب جدید کی بنیاد درحقیقت مسلمانوں ہی کی طب ہے، پروفیسر اڈورڈ براؤن جن کو اسلامی علوم و فنون سے خاص دلچسپی ہے، لندن کے رائل کالج آف فزیشینز کی دعوت پر عربی طب پر چار لکچر دیے تھے، جو بعد میں "عربین میڈیسن" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیے گئے، طب العرب اسی کا اردو ترجمہ ہے، اس میں عربی طب کی مختصر تاریخ، طب کے پرانے اسکولوں، ان سے عربوں کے استفادہ، طب میں ان کی تحقیقات و تجربات اور اس کی مختلف شاخوں میں ان کی ترقیوں، مسلمان اطبا، ان کے کارناموں، انکی تصانیف اور ان کے لاطینی تراجم سے یورپ کے استفادہ وغیرہ، مختلف پہلوؤں سے عربوں کے طبی کارناموں پر تحقیقی نگاہ ڈالی گئی ہے جس سے اس فن میں مسلمانوں کی ترقی کا اجمالی اندازہ ہوجاتا ہے، لائق مترجم نے مصنف کے اجمالی بیانات کی تشریح اور ان کے بعض خیالات کی تنقید و تردید میں جو فاضلانہ حواشی

لکھے ہیں، وہ بجائے خود مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان سے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اور زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، ترجمہ نہایت سلیس شگفتہ بلکہ انشا پردازانہ ہے، یہ کتاب اپنے موضوع اور مباحث کے لحاظ سے نہ صرف اطبا بلکہ عام اصحاب علم کے بھی مطالعہ کے لائق ہے، اور اس سے اردو کے سچیدہ اور علمی لٹریچر میں مفید اضافہ ہوا،

خطوط غالب حصہ اول و دوم مرتبہ جناب غلام رسول صاحب مہر تقطیع بڑی ضخامت علی الترتیب ۴۰۸، ۴۹۳ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ہر دو جلد سعہ پتہ: کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور،

مرزا غالب کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مگر ان میں کوئی بھی جامع و مکمل نہیں ہے، اور وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ناقص ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع مجموعہ مولوی مہیش پرشاد کا مرتب کردہ تھا، مگر اس کی ایک ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ خود مرتب کا وقت آخر ہو گیا معلوم نہیں بقیہ جلدوں کا انجام کیا ہوا، غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت کے لحاظ سے انکے ایک مکمل مجموعہ کی ضرورت تھی، مقام مسرت ہے کہ یہ اہم کام علامہ رسول مہر مصنف غالب کے ہاتھوں انجام پایا، جو اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور مستحق تھے، یہ مجموعہ انھوں نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ (۱) اس میں دو مجموعوں مکاتیب غالب اور نادرات غالب کے علاوہ باقی تمام مجموعوں کے خطوط اور وہ مکاتیب بھی شامل ہیں جو مرتب کو مل سکے (۲) خطوط کی ترتیب تاریخ وار ہے، جن خطوط میں تاریخ درج نہیں تھی، ان کے اندرونی شواہد سے تاریخ کی تخمینی تعیین کی کوشش کی گئی ہے (۳) ہر مکتوب الیہ کے خطوط کے شروع میں اس کے مختصر حالات تحریر کر دیے گئے ہیں، اور حواشی میں مضمون خط کے اشارات و تلمیحات کی تشریح کر دی گئی ہے، کتاب کے شروع میں غالب کے مختصر حالات اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے، اور شعر و ادب میں ان کا درجہ واضح کیا گیا ہے، اور ان کی نثر و مکاتیب کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اس طرح یہ مجموعہ ان تمام مجموعوں سے جو اب تک شائع ہو چکے ہیں، ہر حیثیت سے مکمل ہے۔

وجیہ الدین وجدی - مؤلفہ جناب محمد بن عمر ایم اے لیکچرار جامعہ عثمانیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت ۶ روپے پتہ: کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد۔

وجیہ الدین وجدی بارہویں صدی ہجری کا دکھنی زبان کا بڑا ممتاز اور قادر الکلام شاعر ہے جس کا ثبوت اسکی مثنویاں ہیں، مگر اس نامور شاعر کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور قدیم تذکروں میں بھی نہیں ملتے، اس لیے مصنف نے اپنے ایم اے کے امتحان کے مقالہ کے لیے وجدی کا انتخاب کیا تھا، اور بڑی تلاش وجستجو سے اس کے حالات لکھے تھے، اب انھوں نے اس مقالہ کو مزید ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کردیا ہے، اس میں وجدی کے حالات و سوانح کے ساتھ اسکی تینوں مثنویوں پنچھی باچھا، تحفۂ عاشقان اور مخزن عشق اور اس کے کلام کی خصوصیات پر مفصل نقد و تبصرہ ہے، وجدی کے کلام کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس کے ادبی و تاریخی پس منظر اور اس کے معاصرین کا بھی اجمالی ذکر کردیا گیا ہے جس سے اس کی حیثیت اور اہمیت پوری طرح نمایاں ہوجاتی ہے، یہ کتاب اردو شعر وادب کی تاریخ میں مفید اضافہ ہے،

تمرین الصرف - از جناب مولوی معین اللہ صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۹ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

صرف ونحو کی پرانی کتابوں اور ان کے طریقۂ تعلیم میں یہ بڑا نقص ہے کہ وہ محض قواعد کی علمی و نظری تعلیم تک محدود ہیں، اور انکے مطابق عربی فقرے اور عبارتیں بنانے کی مشق نہیں کرائی جاتی، اس لیے طلبہ قواعد سے تو واقف ہوجاتے ہیں لیکن ان میں عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد پیدا نہیں ہوتی، اس لیے دار العلوم ندوۃ العلما کے اساتذہ نے جدید طرز پر صرف ونحو کی ریڈریں تیار کی ہیں جن میں قواعد کے ساتھ انکی عملی مشقیں بھی ہیں جس سے قواعد بھی پوری طرح ذہن نشین ہوجاتے ہیں اور عربی لکھنے اور بولنے کی استعداد بھی پیدا ہوجاتی ہے، اس سلسلہ کی پہلی کتاب تمرین النحو اس سے پہلے شائع ہوچکی ہے، اب اسی اصول پر تمرین الصرف مرتب کی گئی ہے، یہ کتاب اپنے تعلیمی فوائد کے لحاظ سے عربی درسگاہوں کے نصاب میں شامل کرنے کے لائق ہے،

"م"

۱۹۵۵ء کی نئی کتاب

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزمِ تیموریہ کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے، اب اسی سلسلہ کے مسلمان حکمران خانوادوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور ان کے درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی تیغ آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صنعانی، صدر الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ بدایونی، شامی، شمس دبیر، امیر خسرو، اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے ممتاز سر آمد روزگار شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظر عام پر لایا گیا ہے، اُن کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادرالکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے قیمت

مآل و مشیت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی عنصروں مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انھی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں [illegible] پوری بحث پر تبصرہ ہے، (صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالاتِ ...)

قیمت عہ

(طابع و ناشر ...)

اپریل

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۷۵ ماہ شعبان المعظم ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۵ء عدد ۴

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

قرآن مجید میں آیت رجم — مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین — ۲۴۵-۲۵۹

"مینا بازار" — جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی — ۲۵۹-۲۸۴

شیخ علی بخش بیمار — جناب کلب علی خانصاحب رامپوری — ۲۸۵-۲۹۶

خواجہ عطار اور وحدۃ الوجود — جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی لکچرار شعبہ عربی الہ آباد یونیورسٹی — ۲۹۷-۳۰۸

آثار علمیہ وتاریخیہ

مکتوب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ — ۳۰۹-۳۱۱

ادبیات

مقام مسلم — جناب مولوی محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری — ۳۱۲-۳۱۳

مطبوعات جدیدہ — "م" — ۳۱۴-۳۲۰

شذرات

حافظ ابراہیم صاحب نے بجٹ کی تقریر میں بعض وقتی مصالح کی بنا پر اردو کے بارہ میں بھی چند فقرے کہہ دیئے تھے، گو ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی، بلکہ وہی پرانے بے معنی الفاظ دہرائے گئے تھے، جو دوسرے وزراء کہتے چلے آئے ہیں، مگر معلوم نہیں کیوں اس سے ہندی والوں کو غلط فہمی اور شاید بعض اردو کے حامیوں کو بھی خوش فہمی پیدا ہوئی اور غالباً خود وزیر اعظم کے دل میں بھی کچھ شبہہ پیدا ہوا، اس لیے انھیں خود اس کی وضاحت میں لب کشائی کرنا پڑی اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ کہہ دیا کہ "وزیر مالیات کی تقریر میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے، اس میں نہ تو ہندی کی جگہ کسی دوسری زبان کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا ہے اور نہ کسی زبان کو علاقائی زبان تسلیم کیا گیا ہے، اس میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اردو میں بھی درخواست دے سکتا ہے اگر حکومت کا سارا کام ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں ہوگا" اردو کی تعلیم کے بارہ میں بھی پوری وضاحت کر دی ہے، جس کے بعد کسی غلط فہمی کا امکان باقی نہیں رہ جاتا،

حافظ ابراہیم صاحب نے بڑی مسرت کے ساتھ اردو کی درخواستوں کے بارہ میں وزیر اعظم کی فیاضی کا حوالہ دیا تھا، انھوں نے اس کی حیثیت بھی واضح کر دی کہ یہ سہولت اس لیے دی گئی ہے کہ یوپی کے بعض حصوں میں مسلمان اور کچھ ہندو بھی صرف اردو جانتے ہیں اور ہمارے صوبہ میں جو پناہ گزیں آئے ہیں وہ بھی اردو جانتے ہیں، اس لیے انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ حصول انصاف کیلئے اردو کی درخواستوں کو نہ روکا جائے"، یعنی یہ اجازت اردو کے کسی حق کی بنا پر نہیں، بلکہ مجبوری کی بنا پر دی گئی ہے، معلوم نہیں حافظ صاحب کو ان کے متن کی اس شرح سے کہاں تک اتفاق ہے۔

وزیر اعظم پیچ تو پرانے ہیں جن کا کام ہی اجمال کی تفصیل اور ابہام کی تشریح ہے، غالباً وکیل بھی ہوں گے، یا کم از کم وزارت کے کاروبار نے قانونی موشگافیوں کا ماہر بنا دیا ہے اور انکی نگاہ ہر گوشہ اور ہر شوشہ پر رہتی ہے، اسلیے انھوں نے اردو میں درخواست کی اجازت کو ہر پہلو سے ایسا جکڑ دیا ہے کہ کہیں سے اردو کو سہارا ملنے کی گنجایش نہ رہے، تاہم اس عدل نوشیروانی کی داد دینا چاہیے کہ اس کے طفیل میں پھو رنانند جی نے کسی درجہ میں سہی

اس صوبہ میں اردو کے وجود کا اقرار تو کیا، ورنہ وہ تو اردو نامی زبان کے وجود ہی کے سرے سے منکر تھے۔

اس کو ہندی والوں کے وہم کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کو سمپورنانند جی جیسے اردو نواز وزیر اعظم کے عہد میمنت عہد میں بھی اردو کا خطرہ نظر آتا ہے، ان کے زیر سایہ اردو کے پنپنے کا بھلا کیا امکان ہے، اگر کسی وزیر باتدبیر نے کسی وقتی مصلحت یا اردو والوں کو بہلانے کے لیے اردو کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کہہ بھی دیا تو اسکو حقیقت پر محمول کرنا خود سمجھنے والوں کی خوش فہمی ہے، اور اگر بالفرض اردو کے کسی حق کیلئے کوئی سرکلر بھی جاری کر دیا گیا تو حکومت فرانج شناس عمال کہاں کے ایسے گئے گذرے اور کند ذہن ہیں کہ وہ اس کی تعمیل بھی کر دیں گے، جس کا تجربہ مدتوں سے ہو رہا ہے، ایسی حالت میں ہندی کو اردو سے کیا اندیشہ ہو سکتا ہے،

اسی کے ساتھ اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ایسے حق پرست ہندو اب بھی موجود ہیں جو اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں، اور اسکی حمایت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، چنانچہ اردو کے ساتھ دہلی کی ریاست اور اسکی میونسپلٹی کے معاندانہ رویہ کی مخالفت، اردو کی حمایت اور اسکو دہلی کی علاقائی زبان بنانے کی تحریک میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں، اس سلسلہ میں جناب گوپی ناتھ امن کا وہ خطبۂ صدارت جو انھوں نے جامعہ اردو علی گڈہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں پڑھا تھا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، اس میں انھوں نے جس جرأت، دلیری اور معقول دلائل کے ساتھ اردو کی وکالت کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے، اور اس سے یقین ہوتا ہے کہ پنڈت کشن پرشاد کول کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ خالی نہ رہے گی اور اس کے سب سے زیادہ مستحق امن ہی صاحب ہیں جب تک ایسے حق پرست اور منصف مزاج ہندو موجود ہیں، اس وقت تک اردو کو تنہا مسلمانوں کے سر نہیں منڈھا جا سکتا،

ابھی اسی مہینہ میں پارلیمنٹ اور اتر پردیش کی اسمبلی میں قریب قریب ایک ساتھ گاؤکشی کے قانونی انسداد کیلئے بل پیش ہوئے، پارلیمنٹ میں مہا سبھائی ممبر سیٹھ گووند داس نے بل پیش کیا تھا، اور اتر پردیش میں خود حکومت کی جانب سے پیش کیا گیا ہے، سیٹھ گووند داس کے بل کی مخالفت میں پنڈت جواہر لال نے بڑی سخت تقریر کی اور یہاں تک کہدیا کہ "اس بل کے منظور کرنے کے مقابلہ میں میں اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پسند کرونگا" اور اس بارہ میں اتر پردیش کی حکومت پر بھی سخت نکتہ چینی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رائے شماری میں بڑی کثرت سے یہ بل مسترد کر دیا گیا، مگر اس سے ہمارے صوبہ کے وزیر اعظم کے تیور میں کوئی فرق نہیں آیا، اور جیسا کہ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے وہ اپنے عزم پر پہلے کی طرح قائم ہیں،

اس واقعہ سے مرکز اور صوبوں کی پالیسی میں تضاد کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، درحقیقت بہت سے مسائل میں ان دونوں کے تصور میں اتنا بنیادی اختلاف ہے کہ وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے، پنڈت جی کا نقطۂ نظر خالص سیکولر ہے، وہ ساری دنیا کی نظروں میں ہندوستان کو سربلند کرنا چاہتے ہیں، اور صوبائی حکومتوں خصوصاً ہمارے صوبہ کی حکومت کا مقصد ہر چیز کو ہندویت کے رنگ میں رنگنا ہے، جس کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے، تاہم اس ذہنیت میں بہت سے نقصانات کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے خود اس کے ہاتھوں نام نہاد سیکولرزم کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور دنیا کو اس کا اصلی چہرہ نظر آجاتا ہے،

ناظرین کو یہ سنکر مسرت ہوگی کہ ادھر چند سال کے اندر ہندوستان میں اردو کی جسقدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں دار المصنفین کی کتاب آل وشیت سب سے بہتر قرار پائی، اور مرکزی حکومت نے پانچ ہزار کے گرانقدر انعام سے اس کے فاضل مصنف جناب ظفر حسن خانصاحب کی قدر افزائی کی، موصوف کو دار المصنفین سے بہت پرانا تعلق ہے، اسکے ابتدائی دور میں انکی ایک کتاب مقالات روسو دار المصنفین سے شائع ہو چکی ہے، آل وشیت بھی دار المصنفین ہی کے سلسلہ کی کتاب ہے، اسلیے اس اعزاز میں دار المصنفین بھی شریک ہے، اور یہ اس کا ثبوت ہے کہ آج بھی دار المصنفین کی کتابوں کا معیار کتنا بلند ہے، اور اہل نظر کی نگاہ میں ان کا کیا درجہ ہے،

سلیمان نمبر قریب قریب چھپکر تیار ہو گیا ہے، رمضان المبارک کا پرچہ انشاء اللہ سلیمان نمبر ہوگا، یہ نمبر تقریباً چار سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے، اور اس میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، علمی کمالات، علمی و دینی اور قومی و ملی کارناموں کا پورا مرقع آگیا ہے، مضمون نگاروں میں دار المصنفین کے رفقاء و مصنفین کے علاوہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، مولانا عبد الباری صاحب ندوی، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، مولانا مسعود عالم مرحوم، پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی، ڈاکٹر ذبیر صدیقی، پروفیسر عبد المنان بیدل، مالک رام صاحب ایم اے، اور بہت سے اصحاب علم و قلم کے مضامین ہیں، منظومات، قطعات تاریخ، اہم تاریخی مکاتیب وغیرہ متفرقات اس کے علاوہ ہیں، اس طرح اس نمبر میں سیرت سلیمانی کا پورا خاکہ آگیا ہے، یہ نمبر معارف کے خریداروں کو دو روپے اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک چار روپے میں دیا جائیگا، جن اصحاب کو خریداری منظور ہو وہ پہلے سے مطلع فرمادیں تو تعمیل میں سہولت ہوگی،

مقالات

قرآن میں آیت رجم

از جناب حافظ مولوی محمد ایشع صاحب ندوی

(۳)

ان معنوی خرابیوں کے علاوہ ان روایتوں میں اس جملے کے جو الفاظ منقول ہیں ان میں بھی کافی اضطراب اور کمی و زیادتی ہے،

حضرت ابی بن کعب نے اس جملہ کو فارجموھما البتۃ تک روایت کیا ہے، ابو امامہ نے اس میں بما قضینا من اللذۃ کا اضافہ کیا ہے، اور حضرت زیدؓ کی روایت میں نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم کا مزید اضافہ ہے،

ان تفصیلات سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس جملے کو جن لوگوں نے منسوخ کلام الٰہی قرار دیا ہے ان کے بیانات میں اصول درایت و روایت کے اعتبار سے اتنا نقص، اور لفظی و معنوی لحاظ سے اتنا تضاد و اختلاف ہے کہ اس کو کلام الٰہی کہنا، خواہ وہ منسوخ ہی کیوں نہ ہو، کلام الٰہی کی توہین ہے،

اب اس سلسلہ کی آخری روایت پر جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے، غور کیجئے،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ کی جو تقریر امام مالک سے مروی ہے، اس میں تو الشیخ والشیخۃ والے ٹکڑے کا ذکر ہے، مگر صحاح کی دوسری کتابوں میں نہ تو اس ٹکڑے کا کوئی ذکر ہے، اور نہ آیت رجم

کے نزول و منسوخ ہونے کا تذکرہ ہے، ظاہر ہے کہ اگر اصحاب صحاح اس کو منسوخ آیت رجم سمجھتے اور انکو یقین ہوتا کہ حضرت عمرؓ نے یہ فرمایا ہے تو اس کو ضرور نقل کرتے خصوصیت سے امام بخاری کو جنھوں نے حضرت عمرؓ کی اس تقریر کی سب سے زیادہ مفصل روایت کی ہے، یہ ٹکڑا ضرور ہی نقل کرنا چاہیے تھا، مگر انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا، اس بارے میں حافظ ابن حجر بخاری کی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولعل البخاری هو الذی حذف ذلك	امام بخاری نے اس ٹکڑے کو قصداً حذف
عمداً فقد اخرجه النسائی عن	کر دیا ہے، نسائی نے محمد بن منصور سے
محمد بن منصور... ثم قال لا	روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ میں نہیں
اعلم احدا ذکر فی هذا الحدیث	جانتا کہ سفیان ثوری کے علاوہ کسی نے الشیخ
الشیخ والشیخة غیر سفیان و	والشیخة والے ٹکڑے کا ذکر کیا ہو، یہ ان کا
ینبغی ان یکون وهم فی ذالك	وہم معلوم ہوتا ہے،

اس کے بعد حافظ ابن حجر اپنی رائے دیتے ہیں،

قلت وقد اخرج الائمة هذا الحدیث	اس روایت کو بہت سے ائمۂ حدیث مثلاً امام
من روایة مالك ویونس ومعمر	مالک، یونس، معمر، صالح بن کیسان اور عقیل وغیرہ
وصالح بن کیسان وعقیل وغیرهم	نے امام زہری کے واسطے سے نقل کیا ہے، مگر ان میں
من الحفاظ عن الزهری فلم یذکروها	سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا، اس روایت میں
وقد وقعت هذه الزیادة فی هذا الحدیث	اس ٹکڑے کی زیادتی موطا کے اس روایت کے ذریعہ سے ہوئی
من روایة الموطا عن یحیی بن سعید	ہے جو ان کے شاگرد یحییٰ نے سعید بن مسیب کے
عن سعید بن المسیب	ذریعہ مروی ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ٹکڑا جن راویوں نے نقل کیا ہے وہ ان کا وہم ہے، اس لیے کہ امام زہری کے

واسطہ سے جن ائمہ حدیث نے یہ روایت کی ہے، ان میں سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ امام مالکؒ نے بھی امام زہری کے واسطہ سے اس تقریر کی جو روایت کی ہے، اس میں بھی اس ٹکڑے کا کوئی ذکر نہیں ہے، محض ان کے ایک شاگرد یحییٰ بن سعید نے یہ ٹکڑا روایت کیا ہے۔

مگر اس وضاحت کے بعد بھی حضرت عمرؓ کی طرف اس ٹکڑے کی نسبت صحیح نہیں ہو، یہ سوال تشنہ تحقیق رہ جاتا ہے، کہ امام بخاری اور دوسرے اصحاب صحاح نے گو وہ ٹکڑا نقل نہیں کیا ہے، پھر بھی ان سب نے آیت رجم کے نزول کا ذکر کیا ہے، آخر اس سے کیا مراد ہے۔ اس بارہ میں بخاری کے الفاظ ملاحظہ ہوں،

فکان مما انزل اللہ آیۃ الرجم — اللہ تعالیٰ نے جو کلام نازل فرمایا ہے اس میں آیت رجم بھی ہے

اس بارے میں آیندہ صفحات میں ہم تفصیل سے بحث کریں گے کہ "آیت رجم" سے حضرت عمرؓ کی کیا مراد ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں،

امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ کی مذکورہ تقریر کے مختلف ٹکڑے کتاب میں متعدد جگہ نقل کیے ہیں، مگر کتاب المحاربین میں اس کی مفصل روایت کی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے،

یہ روایت انھوں نے اپنے دو شیوخ علی بن عبد اللہ اور عبد العزیز بن عبد اللہ سے بیان کی ہے، اور دونوں شیوخ کی روایتوں کے متن اور سند میں قدرے اختلاف ہے، عبد العزیز بن عبد اللہ کی مفصل روایت اوپر گذر چکی ہے جس میں آیت رجم کے نزول کا ذکر ہے، مگر علی بن عبد اللہ کی روایت میں "آیت رجم" کا لفظ مذکور نہیں ہے، بلکہ اس میں "انزال فریضۃ" اور "الرجم حق" وغیرہ الفاظ ہیں، وہ روایت یہ ہے:

قال عمر لقد خشیت ان یطول	حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں
بالناس زمان حتی یقول قائل	کہ کچھ زمانہ گذر جانے کے بعد لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ ہم
لا نجد الرجم فی کتاب اللہ	کتاب اللہ میں رجم کا ذکر نہیں پاتے، اس طرح وہ ایک

فیضلوا بترك فریضة انزلها الله الا وان الرجم حق علی من زنی وقد احصن[1]

فریضۂ خداوندی کو ترک کر کے گمراہ ہوں، خبردار سن لو کہ محصن زانی کی سزا رجم حق ہے،

حضرت عمرؓ کے اس بیان میں نہ تو آیت رجم کے نزول کا ذکر ہے، اور نہ اس کے منسوخ ہونے کا بلکہ اس میں جس بات پر وہ زور دینا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ سزائے رجم ایک فریضۂ خداوندی ہے، اور کتاب اللہ سے اس کے ثابت ہونے میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ بیان، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، اور ابن ماجہ میں مختلف واسطوں سے منقول ہے، اور ان میں سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ

الا وان الرجم حق

خبردار کہ رجم کی سزا حق ہے،

اگر ان میں سے کسی نے "آیت رجم" کا ذکر کیا بھی ہے تو اس سے مراد منسوخ التلاوت آیت مراد نہیں لی ہے، اگرچہ عام شارحین حدیث اس سے وہی منسوخ التلاوت آیت مراد لیتے ہیں، اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت عمرؓ اس بات کے قائل تھے کہ آیت رجم کا نزول ہوا تھا، مگر وہ منسوخ ہو گئی تو پھر ان کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہوگا کہ رجم کتاب اللہ میں اب بھی موجود ہے، اور اگر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا صحیح ہو اور یقیناً صحیح ہے، کہ رجم کا ذکر قرآن میں اب بھی موجود ہے، تو پھر آیت کے منسوخ ہونے کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ دونوں میں کھلا ہوا تضاد ہے،

پھر اس حیثیت سے بھی غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ جس خدشہ کی بنا پر یہ ثابت کر رہے تھے کہ رجم کا ثبوت قرآن میں موجود ہے، ایسی حالت میں اگر اس ثبوت کے الفاظ منسوخ قرار دیے جائیں تو وہ خدشہ اپنی جگہ پر باقی ہی رہ جاتا ہے، اس لیے کہ کوئی حکم بھی ہو اس کا علم دوسروں کو تو الفاظ ہی کے ذریعہ سے ہوگا،

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۸

لفاظ کا جامہ اس حکم سے اتار لیا جائے تو پھر اعتراض کرنے والوں کو وہ حکم الٰہی کس طرح دکھا کر خاموش جا سکتا ہے، اور ان کو کیسے تسکین ہو سکتی ہے، اور کیا کوئی حکم الفاظ کے بغیر بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، بنا پر حضرت عمرؓ کے مذکورہ ارشاد کا کوئی ایسا مطلب لینا چاہیے جس سے قرآن سے رجم کا ثبوت مع الفاظ بھی مل جائے، اور آیندہ اس کے اسلامی حد ہونے میں کسی کو کوئی شبہہ بھی باقی نہ رہ جائے جیسا حضرت فاروقؓ کا منشا معلوم ہوتا ہے،

حضرت عمرؓ کا منشا سمجھنے کے لیے ہمیں اسی سلسلہ میں بعض دوسرے صحابہ کی روایتوں اور رایوں پر نظر ڈالنی ہوگی،

حضرت عمرؓ کی جو روایت اوپر گذری ہے اس کے راوی اول حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں ظاہر ہے حضرت عمرؓ کے منشا کو ان سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے، اگر حضرت ابن عباسؓ ان کے ارشاد کا مطلب وہی سمجھتے جو امام مالک اور عام طور پر دوسرے محدثین و مفسرین سمجھتے ہیں، تو پھر وہ یہ ارشاد نہ فرماتے،

من كفر بالرجم فقد كفر بالقرآن	جس نے رجم کا انکار کیا اس نے پورے قرآن کا
من حيث لا يحتسب قوله عزوجل	انکار کیا، اس لیے کہ اس نے خدا کے اس ارشاد کو سمجھا ہی
يااهل الكتاب قد جاءكم رسولنا	نہیں کہ اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول
يبين لكم كثيرا مما كنتم تخفون	آگیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سے ایسے احکام الٰہی
من الكتاب فكان الرجم مما اخفوه[1]	کی وضاحت کرتا ہے جن کو تم چھپا رہے تھے، ابن عباسؓ
	نے کہا کہ یہ لوگ جن احکام کو چھپا رہے تھے ان ہی میں ایک رجم بھی تھا

(مستدرک حاکم)

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں اس روایت کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے، اس سے اس مسئلہ کی

حاکم نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه، امام ذہبی نے تلخیص میں اس کی صحت کی تصدیق کی ہے (ج ۴ ص ۳۵۹)

اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے، جو یہ ہے:

قال ابن عباس الرجم فی کتاب اللہ	ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حکم رجم کتاب اللہ میں موجود ہے،
لا یغوص علیہ الا غواص و ھو قولہ تعالیٰ	مگر یہ قرآن کے بحر زخار میں پوشیدہ ہے، اسکو وہی نکال سکتے
یا اھل الکتاب قد جاء کم رسولنا	ہیں جن میں اس بحر بیکراں میں غوطہ زن ہونے کی صلاحیت ہو،
یبین لکم کثیرا مما کنتم تخفون	اور وہ حکم یہ ہے کہ اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس
من الکتاب	آچکا ہے، وہ تمہارے سامنے بہت سے ایسے احکام کو
(ج ۴ ص ۴۰۸)	بیان کرتا ہے جنکو تم اس سے پہلے چھپا رہے تھے،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس ارشاد سے حسب ذیل باتیں ثابت و مستنبط ہوتی ہیں:

۱۔ سزائے رجم قرآنی حکم ہے، اس لیے اس کا انکار پورے قرآن کے انکار کے مرادف ہے۔

۲۔ مگر رجم کا ذکر قرآن میں صراحۃً نہیں بلکہ اشارۃً و اجمالاً ہے، اس لیے اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، بلکہ صرف اصحاب علم و بصیرت ہی معلوم کر سکتے ہیں،

۳۔ وہ آیت رجم کے نزول اور منسوخ التلاوت ہونے کے قائل نہیں تھے، بلکہ انھوں نے رجم کا ثبوت ایسی آیت سے دیا ہے جو اب بھی قرآن کا جزء ہے،

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو، یہ روایت بیہقی نے حد زنا کے سلسلہ میں نقل کی ہے،

آپ نے سورہ نساء کی آیت واللتی یاتین الفاحشۃ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتدائے اسلام میں جب عورت زنا کی مرتکب ہوتی تھی تو اس کو گھر میں حبس دوام کی سزا دیجاتی تھی، اسی طرح آیت کے اس ٹکڑے فاذوھما کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت زانی مردوں کو لعنت ملامت کے ساتھ زدوکوب بھی کیا جاتا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے غیر شادی شدہ بالغوں کی سزا خواہ وہ مرد ہو یا عورت

فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو،

مقرر کی، اور اگر وہ شادی شدہ ہوتے تو پھر اسوۂ نبوی کے مطابق ان کو رجم کی سزا دیجاتی تھی،

وھذا سبیلھما الذی جعل اور یہی وہ راستہ ہو جسے اللہ تعالیٰ نے ان

اللہ لھما[1] کے لیے مقرر فرمایا ہے۔

یہاں بھی انھوں نے اپنے استدلال کی بنیاد پر کسی منسوخ التلاوت آیت پر نہیں بلکہ اس اسوۂ نبوی پر رکھی ہے، جو وعدۂ الٰہی او یجعل اللہ لھن سبیلاً کی عملی تفسیر ہو جسکا ذکر اوپر بار بار آچکا ہے،

اب حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا تقریر کو حضرت ابن عباسؓ کے ان ارشادات کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ حضرت عمرؓ کی طرف اس ٹکڑے کی نسبت صحیح نہیں ہے، جس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ التلاوۃ آیتِ رجم ہے، اور انھوں نے "آیت رجم کے نزول" اور "فریضۂ خداوندی" کا جو تذکرہ کیا ہے، اس سے ان کی مراد وہی ہے جو ابن عباسؓ نے بیان فرمائی ہے، اس لیے کہ ابن عباسؓ ہی حضرت عمرؓ کی اس تقریر کے بھی راوی ہیں، اگر ان کے نزدیک حضرت عمرؓ کی طرف اس بات کی نسبت صحیح ہوتی تو رجم کے ثبوت کے لیے وہ بھی وہی رائے دیتے، سورۂ مائدہ اور سورۂ نساء کی آیتوں سے اس کا ثبوت فراہم نہ کرتے،

یہ بات اسی لیے اہم نہیں ہے کہ ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کی مذکورہ تقریر کے راوی ہیں، بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ قرآنی علوم، قرآن سے اجتہاد و استنباط اور اس میں دقیقہ سنجی کے اعتبار سے وہ جماعت صحابہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں، اسی امتیاز کی وجہ سے ان کا لقب "ترجمان القرآن" پڑ گیا تھا، اور اسی بنا پر کمسنی کے باوجود حضرت عمرؓ قرآن کے رموز و دقائق کے بارے میں انکی رائے

---

[1] سنن بیہقی ج ۸ ص ۲۱۱ صاحب جوہر النقی امام بیہقی کی غلطیوں پر بڑی سخت تنقید کرتے ہیں، مگر اس روایت کے بارے میں انھوں نے کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان وجوہ کے پیش نظر ان کی یہ رائے بڑا وزن اور حضرت عمرؓ کے منشا کو سمجھنے میں قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے،

اس سلسلہ میں چند محدثین و مفسرین کی رائیں نقل کی جاتی ہیں، جن سے عاجز کے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

علامہ قسطلانی بخاری کی شرح میں حضرت عمرؓ کے اس قول الرجم فی کتاب اللہ حق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فی قولہ تعالیٰ او یجعل اللہ لھن	یعنی حضرت عمرؓ کے ارشاد کہ رجم کتاب اللہ میں ہے،
سبیلاً بین النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مقصود سورۂ نساء کی آیت او یجعل اللہ لھن سبیلاً ہے
ان المراد بہ رجم الثیب	جس کے اجمال کی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کی کہ
وجلد البکر[1]	ثیب کو رجم کیا جائے اور بکر کو کوڑے مارے جائیں۔

علامہ قسطلانی نے غالباً یہ اپنی ذاتی رائے نہیں دی ہے، بلکہ خود امام بخاری نے سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہی لکھا ہے یعنی الرجم للثیب والجلد للبکر۔

حضرت ابن عباسؓ نے سورہ مائدہ کی جس آیت سے رجم کا ثبوت دیا ہے، اسکو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن قیم لکھتے ہیں،

واستنبط غیرہ من قولہ انا انزلنا	ابن عباسؓ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے سورہ مائدہ کی
التوراۃ فیھا ھدی ونور یحکم	اس آیت سے رجم کا ثبوت مستنبط کیا جسکو ہم نے توراۃ نازل کیا
بھا النبیون الذین اسلموا للذین	جس میں ہدایت اور روشنی ہے جس کے ذریعہ انبیائے کرام
ھادوا.......... قال الزھری	یہودیوں کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، امام زہریؒ نے فرمایا کہ

---

[1] ج ۱۰ ص ۴۴

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم منھم — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی انبیاء میں تھے جنھوں نے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔

امام زہری کا مقصود یہ ہے کہ توراۃ میں جو احکام نازل ہوئے تھے، ان میں ایک حکم رجم بھی تھا، اور اس کے نزول کے بعد سے تمام انبیاے بنی اسرائیل اپنے اپنے زمانہ میں اس حکم کو نافذ کرتے رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہودیوں کو جو سزا دی[1] تھی، وہ آپ کا ذاتی اجتہاد نہیں بلکہ اس سابق حکم الٰہی کا نفاذ تھا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ حکم سابق اب بھی منسوخ نہیں ہوا ہے، اور شریعتِ سابقہ کا جو حکم منسوخ نہ ہو بلکہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہو، وہ بمنزلۂ مستقل اور نئے حکم کے ہے،

امام زہری کی یہ رائے بھی اس سلسلہ میں اہمیت رکھتی ہے، اس لیے کہ حضرت عمرؓ کی مذکورہ تقریر کے تمام سلسلۂ اسناد انہی پر ختم ہوتے ہیں، تمام کتب حدیث میں عہد نبوی کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک کنوارے اجیر نے اپنے مستاجر کی بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا، جب مستاجر کو اس کا علم ہوا تو وہ برافروختہ ہوا، اجیر کا باپ زندہ تھا، اس کو جب علم ہوا تو اس نے اپنے لڑکے کی طرف سے کچھ بکریاں وغیرہ مستاجر کو بطور تاوان ادا کیں، اور اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا، مگر اجیر کے باپ کو اب بھی تسکین نہیں ہوئی اور اس نے اہل علم سے دریافت کیا کہ اس جرم کی شرعی سزا کیا ہے؟ اسے بتایا گیا کہ زانی کو سو کوڑے اور ایک سال جلا وطنی کی اور زانیہ کو رجم کی سزا دینی چاہیے، فریقین کو جب اس کا علم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ

فاقض بیننا بکتاب اللّٰہ — آپ ہمارے معاملہ میں کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجیے،

آپؐ نے سارا قصہ سننے کے بعد فرمایا کہ

والذی نفسی بیدہ لاقضین — اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں تم

---

[1] اس کی تفصیل مذکورہ آیت کی تفسیر اور کتب حدیث میں ملے گی۔

بینکما بکتاب اللہ عزوجل — دونوں کے معاملہ میں اللہ عزوجل کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

چنانچہ آپ نے دونوں کو رجم و عابد کی سزا دلوائی اور تاوان میں جو چیزیں دی گئی تھیں واپس کرادیں۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے "لاقضین بینکما بکتاب اللہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں رجم کا حکم موجود ہے، ورنہ آپ کتاب اللہ کا لفظ استعمال نہ فرماتے بلکہ کوئی دوسرا لفظ استعمال فرماتے،

لیکن قرآن میں رجم کا حکم صراحۃً مذکور نہیں ہے، اس لیے آپ کے ارشاد "بکتاب اللہ" کی تفسیر میں ائمہ حدیث نے مختلف باتیں کہی ہیں،

بعض لوگوں نے کتاب اللہ کا مصداق اسی منسوخ التلاوۃ آیت کو قرار دیا اور بعض اہل علم نے اس کے معنی فرض و اجب کے لیے ہیں یعنی آپ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ خدا نے جو حکم یا فرض قرار دیا ہے اسکے مطابق فیصلہ کروں گا، ان حضرات نے قرآن کی بعض آیات سے استدلال بھی کیا ہے، مگر حدیث کے الفاظ ان دونوں معنوں سے ابا کرتے ہیں،

منسوخ التلاوۃ آیت کو اس کا مصداق بنانا تو بہرحال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اوپر کی تفصیلات سے اس کے کلام الٰہی ہونے کی پوری تردید ہو چکی ہے،

اب رہا اس کو فرض کے معنی میں لینے والی رائے تو اس سلسلہ میں یہ تو صحیح ہے کہ قرآن میں کتاب، کُتِبَ، کَتَبَ وغیرہ کا استعمال فرض و واجب کے معنی میں ہوا ہے، مگر ایسا اس موقع پر ہے جہاں خدائے تعالیٰ کوئی بات حکم کے انداز میں کہنا چاہتا ہے، اور اس کے ساتھ علیکم کا صلہ بھی استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں اس کی متعدد مثالیں بھی کتب علیکم الصیام، کتب علیکم القتال کتاب اللہ علیکم وغیرہ موجود ہیں، مگر جہاں قرآن نے مطلق کتاب یا کتاب اللہ کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں اس کے معنی کلام الٰہی، پیغام الٰہی یا مطلق پیغام کے ہیں، اس کی سیکڑوں مثالیں

قرآن میں مل جائیں گی،

پھر حدیث نبوی میں متعدد ایسی مثالیں ملیں گی جن میں آپ نے کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے کہا گیا ہے، اور ان میں سے کہیں بھی فرض وواجب کے معنی نہیں لیے گئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی دو آدمیوں کے درمیان گفتگو کے موقع پر کتاب اللہ کا لفظ استعمال کیا جائے گا تو وہاں اس سے کلام الٰہی مراد ہوگا، تفصیل کا موقع نہیں ہے ورنہ قرآن وحدیث سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، اس لیے ارشاد نبوی کا صحیح اور صاف مطلب اور اس کا صحیح مصداق قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں اجمالاً واشارۃً رجم کا ذکر ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، امام خطابی اس ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں،

ان ذکر الرجم وان لم یکن منصوصا علیه باسمه الخاص فانه مذکور فی الکتاب علی سبیل الاجمال والابهام ولفظ التلاوة منطوٍ علیه وهو قوله واللذان یاتیانها منکم فآذوهما والاذی یتسع فی معناه للرجم ولغیره وفیه قول آخر وهو ان الاصل فی ذالک قوله او یجعل الله لهن سبیلا[1]

قرآن میں رجم کا ذکر اگرچہ صراحۃً اس لفظ کے ساتھ نہیں ہے مگر مجمل اور مبہم طور سے اس کا ذکر ہے، اور قرآن کے الفاظ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور وہ ہے خدا کا ارشاد واللذان یاتیانها منکم فآذوهما لفظ "اذی" کی وسعت میں رجم اور زنا کی دوسری سزائیں آجاتی ہیں، اس کے علاوہ ایک گروہ کی رائے ہے کہ رجم کی بنیادی حکم خدا تعالیٰ کا ارشاد او یجعل الله لهن سبیلا ہے،

---

[1] معالم السنن ج ۳ ص ۳۲۳

حافظ ابن حجر اس ارشاد نبوی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے دو معنی و مصداق بتائے گئے ہیں

والمراد بکتاب اللہ ما حکم بہ	ایک یہ کہ کتاب اللہ سے مراد وہ ہے جو خدا نے اپنے
وکتب علی عبادہ وقیل المراد	بندوں پر فرض کر دیا ہے اور جو حکم دیا ہے، دوسرے
القرآن وھو المتبادر	یہ کہ اس سے مراد قرآن ہے اور یہی مفہوم زیادہ واضح ہے،

مشہور محدث حافظ ابن دقیق العید نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، اس پر حافظ ابن حجر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

فیما قال نظر لاحتمال ان یکون المراد ما تضمنہ	انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ محل نظر ہے، اسلئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے
قولہ تعالیٰ او یجعل اللہ لہن سبیلا	مراد خدا کا یہ قول او یجعل اللہ لہن سبیلا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے ارشاد میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کا جو ذکر آیا ہے اس سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جن میں اجمالاً سزائے رجم کا ذکر آیا ہے،

مفسرین میں امام طبری کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، انھوں نے سورہ نساء کی آیت او یجعل اللہ لہن سبیلا اور زنا سے متعلق دوسری آیات کی تفسیر میں تمام اہم صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کیے ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک صحابی یا تابعی کی رائے سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ رجم کے سلسلہ میں قرآن میں کوئی ایسی آیت بھی نازل ہوئی تھی جس کے الفاظ بعد میں منسوخ قرار دے دیے گئے ہوں، صحابہ و تابعین کے اقوال نقل کرنے کے بعد امام طبری حسب دستور محاکمہ کرتے ہیں اور اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں:

واولی الاقوال بالصحۃ فی تاویل	ان اقوال میں سب سے زیادہ بہتر اور صحیح قول
قولہ او یجعل اللہ لہن سبیلا	وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آنحضرت
قول من قال السبیل التی جعلہا	صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شادی شدہ زانیوں

اللہ جل ثناءہ للثیبین المحصنین	کو رجم کی اور غیر شادی شدہ زانیوں کو
الرجم بالحجارۃ وللبکرین جلد	جلد اور نفی کی سزا دی ہے۔
مائۃ ونفی سنۃ لصحۃ الخبر	
من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	

صاحب روح المعانی اور صاحب تفسیر خازن نے بھی اس آیت کی تشریح میں مذکورہ ٹکڑے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ ان دونوں نے امام خطابی کی وہ رائے نقل کر دی ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رائے بھی یہی ہے،

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ

۱۔ مذکورۂ بالا ٹکڑے کو منسوخ آیت رجم یا کلام الٰہی نہ کہنا صحیح نہیں ہے،

۲۔ قرآن میں متعدد ایسی آیتیں ہیں جن سے اشارۃً و اجمالاً سزائے رجم کا حکم معلوم ہوتا ہے جنکی تفصیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے کر دی ہے، ان میں دو آیتیں سورہ نساء میں ہیں اور دو آیتیں سورہ مائدہ میں،

۳۔ حضرت عمرؓ نے جس تقریر میں آیت رجم کا ذکر کیا ہے، اس سے ان کی مراد یہی مذکورۂ بالا آیتیں ہیں جو قرآن مجید میں موجود ہیں،

آخر میں لغوی حیثیت سے بھی اس ٹکڑے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے،

اس ٹکڑے میں الشیخ کا لفظ بوڑھے مرد کے معنی میں اور الشیخۃ کا لفظ بوڑھی عورت کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اگرچہ شیخ کا استعمال بوڑھے کے معنی میں قدیم عربی ادب میں بہت کم ہوا ہے، مگر چونکہ قرآن میں یہ لفظ تین موقع پر[1] واحد اور ایک موقع پر[2] جمع استعمال ہوا ہے، اس لیے اس کی صاحت میں کسی شبہے کی گنجائش باقی

---

[1] قصص رکوع ۳ ہود رکوع ۷ اور یوسف رکوع ۸ [2] مومن رکوع ۷

نہیں رہ جاتی، مگر "الشیخۃ" کا استعمال بوڑھی (عجوز) کے معنی میں ادب ولغت کے ذخیرہ میں بھی عاجز کی نظر سے نہیں گذرا اور نہ قرآن ہی نے اس کو استعمال کیا ہے، سورہ ہود میں ایک موقع پر بوڑھے اور بوڑھی کا لفظ ساتھ ساتھ استعمال ہوا ہے، مگر وہاں بھی قرآن نے بوڑھے کے لیے تو شیخ کا لفظ اختیار کیا ہے مگر بوڑھی کے لیے الشیخۃ نہیں بلکہ عجوز کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ یہ موقع ایسا تھا کہ الشیخۃ کا لفظ مقابلۃً مستعمل ہو سکتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ کلام الٰہی میں کوئی غیر فصیح لفظ نہیں آسکتا تھا، وہ آیت یہ ہے

قالت یا ویلتیٰ ءالد وانا عجوز	اس نے تعجب سے کہا کہ کیا میں جنوں گی حالانکہ
وھذا بعلی شیخا	میں بوڑھی ہوں اور یہ میرا شوہر بوڑھا ہے۔

شاید ان ہی اعتراضات سے بچنے کے لیے اس ٹکڑے کے راویوں میں بعض نے اس کی تفسیر الشیب و الشیبۃ اور بعض نے المحصن والمحصنۃ سے کی ہے، مگر یہ تفسیر بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ لغت کے اصل معنی سے گریز اور عدول اس وقت کیا جا سکتا ہے جب اس کے لیے کوئی لغوی قرینہ موجود ہو، یہاں سرے سے اصل اور ترجمہ و تفسیر میں کوئی قرینۂ عدول موجود نہیں ہے، یہی نہیں بلکہ اس ٹکڑے کے ایک لفظ کا قدیم کلام عرب میں وجود ہی نہیں ہے،

ان وجوہ کی بنا پر عاجز نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس ٹکڑے کو کلام الٰہی کہنا خواہ وہ منسوخ ہی کیوں نہ ہو قرآن کے آئینۂ فصاحت و بلاغت کو داغدار کرنا ہے، واللہ اعلم بالصواب، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

اہل کتاب صحابہ و تابعین

اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں جزیرۂ عرب کے یہود و نصاریٰ کی تاریخ اور ان کے تمدنی و اخلاقی حالات کی تفصیل کی گئی ہے، اس کے بعد یہودی و نصرانی صحابہ و صحابیات اور تابعین کے حالات و سوانح ہیں،

(مؤلفہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی، رفیق دارالمصنفین) قیمت للعہ

منیجر

مینا بازار

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

مینا بازار ایک کتاب ہے جس میں ایک زنانہ بازار کی حسب ذیل نو دکانوں کا حال اس ترتیب سے بیان ہوا ہے:

وصف دکان جوہری، وصف دکان بزاز، وصف دکان گلفروش، وصف دکان حلوائی، وصف دکان عطار، وصف دکان میوہ فروش، وصف دکان تنباکو فروش، وصف دکان تنبولی، وصف دکان سبزی فروش،

مگر مصنف نے اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا تھا، بعد کے لوگوں نے کتاب کے نام کو مینا بازار کے نام سے مشہور کر دیا، اگرچہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اسے زنانہ بازار کے نام سے موسوم کرتے تھے، چوں کہ اس کا موضوع زنانہ بازار ہے اور یہ فقرہ خود کتاب مذکور میں موجود ہے، اس لحاظ سے لوگوں نے اس کا یہی نام قرار دیدیا، مگر مینا بازار کے نام سے موسوم کہنے کی وجہ حاشیہ نویس[1] نے یہ بتائی ہے کہ اس کی پہلی دکان جوہری کی تھی جس میں طرح طرح کے قیمتی پتھر فروخت ہوتے تھے، اور "مینا" رنگ برنگ کے شیشے اور یاقوت و زمرد وغیرہ جواہرات کے ٹکڑے کو کہتے ہیں، اس لیے اس کا نام مینا بازار (بہ اضافت مقلوب) تجویز ہوا،

مغل بادشاہوں کو جدت و اختراع سے بڑا شوق تھا، چنانچہ انھوں نے طرح طرح کے جشن

---

[1] مینا بازار (مصطفائی) ص ۲ حاشیہ نمبر ا

کے طریقے نکالے، ہمایوں نے ایک بڑے جشن کی بنیاد ڈالی، دریاے جمنا کے کنارے کشتیوں پر ایک ہشت منزلہ[1] عمارت تیار کی اور اس میں جشن خانہ قائم ہوا، اس میں ایک حصہ زنانہ بازار کے لیے وقف ہوا، جہاں دکانیں اوپری منزل میں لگائی گئی تھیں، ایک باغ بھی تیار ہوا، جس میں طرح طرح کے خوشنما پھول لگائے گئے تھے، دکانوں پر بڑی بڑی بیگمیں متعین ہوئیں، بادشاہ ان سے سودا[2] خریدتا پھرتا تھا، گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں[3] ۹۴۰ھ کے واقعات کے ذیل بیان کیا ہے،

دشرح توی خانہ کہ درلب دریا راست کردہ بودند و نام آں را طلسم نہادہ بودند...

...... درلب حوض تالارے بود و در تالار دریچہ ہا ابرک[4] گرفتہ بودند کہ جوانان درون تالار نشستند و بازی گراں بازی می کردند۔ بازار زنانہ نیز کردہ بودند کشتی[5] ہا را آئین بستہ بودند۔ دریک کشتی مثل شش کسی و شش کنج بستہ بودند و درکشتی بالاخانہ ساختہ بودند و پایان باغچہ ساختہ بودند از قسم تلفہ[6] و تاج خروس و نافرمان و لالہ کاشتہ بودند و دریک جا ہشت کشتی کردہ بودند کہ ہشت پرچہ[7] می شد۔ غرض کہ خداے تعالیٰ ازیں قسم اختراعات در دل مبارک ایشان عطا کردہ بود۔ ہر کہ می دید متحیر و منحصر می ماند۔" (ص ۳۵)

اکبر نے متعدد آئین ایجاد کیے، ان میں جشن نوروز اور خوش روز کی اہمیت مینا بازار کے سلسلے میں بہت زیادہ ہے، نوروز ایرانیوں کے سال کا پہلا دن یعنی ماہ فروردین کی پہلی تاریخ ہے، جب آفتاب برج حمل کے پہلے نقطہ میں پہنچتا ہے، اس تاریخ کو نہ صرف ایرانیوں میں بڑی خصوصیت حاصل تھی بلکہ دنیا کے بیشتر حصوں میں اس روز بڑا جشن ہوتا تھا۔ اکبر نے نوروز کو باقاعدہ تہوار قرار دیا، ابوالفضل

---

[1] ملاحظہ کنور محمد اشرف: زندگی و حالات مردمان ہندوستان بنگال رائل ایشیاٹک سائٹی جرنل ۱۹۳۵ء ج ۱ ص ۲۹۳-۲۹۴

[2] طبع لندن ۱۹۰۲ ص ۳۵ [3] اسکا ترجمہ یہ دیا ہے filled with Tale windows (ص ۱۲۶)

[4] اصل نسخہ کشتی [5] یہ چار قسم کے پھول تھے [6] غالباً ہشت گانہ کے معنی میں (ترجمہ ص ۱۲۶)

کا بیان ہے کہ چونکہ بادشاہ آفتاب پرستی کی طرف مائل تھا، لہٰذا اس نے نوروز جلالی کو ایک مقدس تہوار قرار دیا، اور اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر جشن ہونے لگے، آئین اکبری[1] میں لکھتا ہے کہ

شہریار قدرداں نخست گزیدہ روشہائے پیشینیاں پژوہد و در روائی آن کوشش فراواں رود و بخداوند آں نگرویدہ شایستہ را نگراں ارزش برگیرد، دوم در پرورش گوناگوں مردم توجہ برگمارد، و بخشش را بہانہ برجوید، بنابریں چوں سورہائے جشنید کی و عیدہائے موبدی بسمع ہمایوں رسید پذیرش یافت و اسباب دہش آمادہ شد، نخستین جشن نوروزی۔ چوں خورشید تاباں بحمل پرتو خاص بخشد تا نوزدہ روز ہنگامہ عشرت فراہم آید، درآں میان دو روز بزرگ عید شود و فراواں خواستہ و گوناگوں کالا دادہ آید، غرۂ فروردین ماہ نوزدہم ہنگام شرف، روزے کہ بماہ ہمنام بودہ باستانیاں بارگاہ بساط فراخ زدے و سور آراستے و کشور خدا نیز بداں پردازد، نوزدہم فروردیں، سوم اردی بہشت[۲]، ششم خورداد[۳]، سیزدہم تیر[۴]، ہفتم امرداد[۵]، چہارم شہریور[۶]، شانزدہم مہر[۷]، دہم آبان[۸]، نہم آذر[۹]، ہشتم[۱۰] و پانزدہم[۱۱] و بست و سوم[۱۲] دے، دوم بہمن[۱۳]، پنجم اسفندارمذ[۱۴]۔

یعنی سال میں ۱۴ بار جشن ہوتا تھا، مگر ہر مہینے میں صرف ایک بار ہوتا تھا، البتہ دے میں تین روز بڑے پیمانے پر جشن منایا جاتا، پہلی فروردین کو جو بڑا تیوہار ہوتا وہ اس میں شامل نہ تھا،

یوں اکبر نے تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد ہی نوروز منانا شروع کر دیا تھا، لیکن سب سے پہلے ۹۹۰ھ میں بڑی شان و شکوہ کے ساتھ یہ تیوہار منایا گیا، طبقات اکبری[2] میں ہے:

"اس سال کی ابتدا سہ شنبہ، ۴ ربیع صفر ۹۹۱ھ[3] سے ہوئی، اس سال کے نوروز میں محلوں کے دیوار و سقف[4]

---

[1] آئین اکبری ج ۱ ص ۲۰۰ و ترجمہ انگریزی آئین ص ۲۷۶ [2] طبقات اکبری ج ۲ ص ۳۴۹ – ۳۵۰ [3] بدایونی نے ۹۹۰ھ لکھا ہی منتخب التواریخ طبع نولکشور ص ۳۲۳ و طبع کلکتہ ج ۲ ص ۳۰۱ مگر مآثر رحیمی ج ۲ ص ۲۰۸ میں یہی تاریخ ہو[4] مآثر رحیمی اور منتخب التواریخ دونوں میں دیا ہوا ہو تینوں تاریخوں میں جلوس کا ۲۸ واں سال ہو طبقات اکبری میں اکبر کے جلوس تخت نشینی کا ۲ ربیع الآخر ۹۶۳ھ ہے (ج ۲ ص ۱۲۹)
(باقی ص ۲۶۳)

اور دولتخانہ (دیوان) عام و خاص کو مصور پردوں سے اس طرح اراستہ کیا گیا کہ دیکھنے والے متحیر ہو گئے۔ دولتخانہ کے صحن کو زردوزی و زربفت کے شامیانے سے آراستہ کرکے سونے اور جواہرات سے مرصع تخت درمیان میں بچھایا گیا، اس طرح رشک فردوس آرائش ہوئی، اٹھارہ[۱] روز تک یہ محل اسی طرح آراستہ ہوتے رہے، رات کو جھاڑ، فانوس اپنا سماں دکھاتے، شہنشاہ ہر روز ایک بار یا دو بار تشریف لاتے مجلس آراستہ ہوتی، ایرانی اور ہندوستانی گویے موسیقی سے تواضع کرتے، ہر ایک امیر و خادم عنایت خسروانہ سے بلند ہوتا، شہر فتح پور اور آگرہ کے بازار کی آئین بندی ہوتی، اطراف و جوانب سے بے شمار خلائق اس جشن عالی میں شرکت کی غرض سے آتی جس کی نظیر نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی، ہفتہ میں ایک روز عام تھا، بقیہ چھ روز خواص و امرا کے لیے وقف تھے حضرت نوروز کے دن تخت سلطنت پر جلوس فرماتے، امرا و ارباب دولت مرتبہ بہ مرتبہ کھڑے رہتے، ایام نوروز کا آخری دن "شرف"[۲] تھا، اس روز مجلس عالی ترتیب پاتی، اور جمیع امرا خطاب و نوازش سے سرفراز ہوتے۔" (ملخصاً)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۱) اس حساب سے ۲۸ واں سال ۹۹۱ھ میں ہوگا، مگر پھر ۲۹ واں سال ۹۹۱ھ دیا ہے (ج ۲ ص ۳۶) اس کو ۹۹۲ھ ہونا چاہیے اور اس کے بعد کے سنہ صحیح ہیں، منتخب التواریخ میں ہر سال کی تاریخ جلوس طبقات سے ایک سال پیچھے ہے، طبقات میں ۲۸ ویں جلوس کی جو تاریخ ہے وہی منتخب میں ۲۹ ویں جلوس کی ہے، مآثر میں ۹۹۰ھ درج ہے، مگر مہینہ کی تاریخ طبقات کی طرح، ۲ صفر ہے، لیکن یہ ممکن نہیں ہے، ۲ صفر کے ۹۹۱ھ اور ۵ صفر کے ساتھ ۹۹۰ھ چاہیے۔

[۱] مآثر (ج ۲ ص ۳۳۸) اور منتخب التواریخ (ج ۲ ص ۳۰۱) میں بھی ۱۸ دن دیے ہیں، مگر یہ غلط ہے، ۱۹ ہونا چاہیے، ابوالفضل نے یہی دیا ہے، مزید توزک وغیرہ میں بھی جشن کی تاریخ ۱۹ فروردین لکھی ہے [۲] ظہوری لکھتا ہے: "آفتاب جہانتاب، محاذات دولت خانہ بادشاہی را بیت الشرف خویش می داند" اس میں بیت الشرف شمس سے مراد برج حمل ہے (سہ نثر ص ۴۴)

اسی جشن و ہنگامے کے درمیان بازار بھی لگتے جن میں ایک زنانہ بازار اور ایک مردانہ بازار کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی اور اکبر نے اس کا نام آئین خوش روز رکھا، ابوالفضل کے الفاظ میں اس آئین کا حال سنیئے:

گیتی خداوند به پژوہش آگہی و شناسا آمدن شگرف کارئی روزگار سومین روز جشن ہر ماہ والا انجمنے آراید، سوداگر زمان بر فراز گرم بازاری نشینند دکالائے ہر کشور بدکان پیدائی درآید، پرستاران مشکوئے اقبال فراہم آیند و پردگیان گوناگون مردم راہ یابند، خرید و فروخت را ہنگامہ شود، گروہا گروہ کامیاب خواہش گردند، شہریار دراین نزہتگہ برگزیدن کالا و بر نہادن نرخ تازہ و نقابے برسازد و بدین روش شناسائی اندوزد، نہفتگی ملک و چگونگی مردم زاد بد و نیک ہر کار خانہ دریابد، و این روز را بدین نام خواند و فرید خوش دلی بخشد، سپس بازار مردان انتظام یابد، بازرگان ہر بوم را کام دل برآید، خدیو عالم داد و ستد را عیار برگیرد، و بار یافتگان عشرت خریداری نمایند و ہر گروہے بے دورباش چاؤشان در دل برخواند و متاع آرائی را دست مایۂ گزارش حال گردند، نیکان را روز مراد بردمد و بدان را بادافراہ سامان یابد و از فراغ دیدہ وری بدین کارگنجورے و مشرفے جداگانہ باشد، بہان زمان بے رنج انتظار زر یابند و فراوان سود بر دارند۔"

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(۱) ۲۱ر فروردین، ۵ر اردی بہشت، ۸ر خورداد، ۱۵ر تیر، ۹ر امرداد، ۸ر شہریور، ۱۸ر مہر، ۱۳ر ابان، ۱۱ر آذر، ۱۰ر دے، ۲۵ر دے، ۱۴ر بہمن، ۷ر اسفندارمذ کو یعنی سال میں ۱۴ روز یہ بازار لگتے تھے،

لہ تلاش ٢ہ عجائب ٣ہ رخت، سامان ٤ہ بت خانہ، مجازاً بادشاہوں کی حرم سرا ٥ہ عورتیں ٦ہ گناہ کی جزا برائی کا بدلہ ٧ہ خزانہ دار ٨ہ لکھنے والے کا افسر

(۲) زنانہ بازار محض تفریح کے لیے نہ تھا، بلکہ اس سے دور رس نتیجے وابستہ تھے،

(۳) زنانہ بازار کے بعد مردوں کا بازار لگتا جس میں ہر ملک کے تاجر آتے اور بادشاہ سے آزادی سے ملتے

(۴) اس بازار کے خزانچی اور مشرف الگ مقرر تھے،

بدایونی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جشن نوروزی کے موقع پر زنانہ بازار آراستہ ہوتا تھا اور اس کی ابتدا انتیسویں سال[1] جلوس سے ہوئی، اور بدایونی اس کو دین کے ناموس پر ضرب کاری سمجھتے تھے، اس بیان سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سال میں صرف اسی جشن کے موقع پر کبھی کبھی زنانہ بازار ہوتا تھا، مگر جیسا ہم اوپر لکھ چکے، ابوالفضل کے بیان سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ سال میں ۱۴ مرتبہ جشن ہوتا تھا، اور ہر جشن کے تیسرے دن کا بازار آئین خوش روز میں شامل تھا، بدایونی نے اس بازار کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے[2]،

> از برائے شکستن دکان ناموس دین حکم فرمودند کہ دکانہائے نوروزی را گاہگاہے برائے تماشائے بیگمان واہل حرم وعفائف مخدرات خاص وعام خالی سازند و آنجا زری بخشیدند وہم سازی بیرونیاں ونسبت مناکحت ومواصلت ابنا وبنات در ان مجلس قرار یافت ۔

جہانگیر کے عہد میں نوروز بالکل اکبر کے زمانے کی طرح منایا جاتا تھا، جشن کا زمانہ یکم فروردین سے ۱۹ فروردین[3] تک ہوتا تھا، پہلے دن بادشاہ زمردیں لباس پہن کر تحویل آفتاب کے وقت دربار عام

---

[1] منتخب التواریخ کے اعتبار سے اس کی ابتدا ۱۰ ربیع الاول ۹۹۲ھ ہوئی (ج ۲ ص ۳۳۹) مگر طبقات میں یہی تاریخ ۲۹ ویں جلوس کی ہے، تیسویں کی ۱۹ ربیع الاول ۹۹۳ھ ہے (ص ۳۶۰، ۳۶۱ بالترتیب)
[2] ج ۲ ص ۳۳۹ [3] ملاحظہ ہو نگار بابت اگست ۱۹۳۴ء ص ۱۴

کرتا تھا، اور انیس روز تک امرا میں سے ایک نہ ایک کی بڑے دھوم دھام سے بادشاہ کی دعوت کرتا اور تحفے و نذرانے پیش کرتا۔ بادشاہ بھی ضیافتیں کرتا، انعام و اکرام تقسیم کرتا اور منصبوں میں ترقی دیتا، شاہی محل اور بازار سجائے جاتے تھے، ان دنوں زنانہ بازار بھی لگتا تھا، اگر بادشاہ دورے پر ہوتا تب بھی جشن کے موقع پر یہ بازار آراستہ ہوتا، ایک یورپی سیاح تھیوے ناٹ[1] نے اجمیر کے جشن نوروزی کے موقع پر جو زنانہ بازار ہوا تھا، اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے[2]،

> نوروز کا تہوار حرم میں شروع ہوا، اور وہاں ایک بازار بھی قائم ہوا، بڑے بڑے امرا بیویاں اور لڑکیاں اس میں شامل ہوئیں، ہر درجے کی خواتین دکاندار مقرر ہوئیں جنھوں نے عجیب غریب چیزوں سے جو اپنے ہمراہ لائی تھیں، اپنی دکان سجائی، ان کے علاوہ امرا اور راجاؤں کی عورتوں نے بھی اپنی الگ دکانیں نہایت قیمتی سامان سے آراستہ کیں، اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ جو چیزیں بادشاہ اور اس کی بیگمات کو پسند ہوئیں وہی دکانوں میں رکھی جائیں، عموماً دکانداروں کو دگنی قیمت ملتی، ان میں جو زیادہ عقلمند، بذلہ سنج اور خوبصورت ہوتی اس کو سب سے زیادہ نفع حاصل ہوتا تھا، بازار ختم ہونے کے بعد محل کے اندر ان کی ضیافت ہوتی جہاں کنچنیں رقص و سرود کی محفلیں گرم کرتیں، اس طرح یہ میلہ پانچ دن رہتا،

عہد جہانگیر کے ایک دوسرے سیاح ٹامس کوریٹ[3] نے زنانہ بازار کا بیان اس طرح کیا ہے:

> بادشاہ کی بیگمات کی دلچسپی کے لیے سال میں ایک دن تمام سوداگروں کی بیویاں محل میں جاتیں، جن کے پاس کچھ چیزیں فروخت کے لیے ہوتیں، اس طرح ایک قسم کا میلہ (یا بازار) لگتا۔

---

[1] یہ سیاح عہد عالمگیر کے نویں سال یعنی ۱۶۶۶ء میں ہندوستان آیا تھا، تقریباً ایک سال تک یہاں قیام کیا [2] سیاحت تھیوناٹ (انگریزی)، ج ۳ ص ۲۰۰-۱، (ملخصاً) مگر یہ ہم عصر شہادت نہیں ہے [3] یہ سیاح ۱۶۱۲ء سے ۱۶۱۷ء تک ہندوستان رہا، ملاحظہ ہو "ارلی ٹریولیز ان انڈیا" مرتبۂ ولیم فاسٹر ص ۲۷۸

بادشاہ اپنی بیگمات کی طرف سے دلال ہوتا، اور وہاں سوائے اس کے جو بادشاہ کا خاصہ تیار کرتا کوئی دوسرا (مرد) نہ ہوتا"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہانگیر کا بھی مقصد صرف تفریح ہی تھا، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکبر کے عہد کا ماہانہ بازار سالانہ ہوگیا، جو پانچ روز تک رہتا یا صرف ایک روز۔

شاہ جہاں کے عہد میں بھی یہ بازار اسی شان و شوکت کے ساتھ آراستہ ہوتا رہا، مگر یورپی سیاحوں نے اس بادشاہ کو بدنام کرنے کے لیے طرح طرح کی افترا پردازیاں کی ہیں، ان میں "برنیر"[1] اور منوچی[2] نے خصوصیت سے حصہ لیا ہے، ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زنانہ بازار آٹھ روز تک سجائے جاتے تھے، ان میں امرا اور منصب داروں کی عورتیں دکانیں لگاتیں، بادشاہ اور شاہی محل کی بیگمات سامان کی خریداری میں بے شمار روپیہ صرف کرتیں، ان سامانوں میں نفیس قسم کا دیبا، زردوزی کی عمدہ چیزیں، صافے جن پر بہترین طلائی کام ہوتا، نفیس پرنیاں جو بڑے درجے کی عورتیں استعمال کرتی تھیں، قابل ذکر ہیں، اس موقع پر کنچنیاں بھی محل میں داخل ہوتیں، اور آٹھ دن ناچنے گانے اور دوسری تفریحات میں ختم ہوتے،

---

[1] برنیر شاہ جہاں کے آخری عہد میں آیا اور اورنگ زیب کے آٹھویں سال تک رہا، اس نے شاہجہاں کی عیش پسندی ظاہر کرکے اس کو بہت برا ثابت کرنا چاہتا ہے، زنانہ بازار کو وہ محض نفس پروری کی ایک شکل قرار دیتا ہے، خصوصاً محل میں کنچنی کے داخلے پر بہت زیادہ ہی طعن کرتا ہے، اور اس رسم بد کا ذمہ دار شاہجہاں کو ٹھہراتا ہے، مگر خود اسی جگہ جہانگیر کے عہد کا ایک واقعہ درج کرتا ہے، جس میں ایک انگریز ڈاکٹر مسمی برناڈ کی نفس پرستی کی داستان بڑے لطف کے ساتھ بیان کی ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ٹراولیز ان دی مغل امپائر ص ۲۷۲-۲۷۵) [2] منوچی برنیر سے بھی کئی قدم آگے ہے، اس نے ایسے من گھڑت واقعات بیان کیے ہیں جو عقل سلیم پر بار ہیں، شاہجہاں کے آخری عہد میں یعنی ۱۶۵۳ء میں آیا ہے، (ملاحظہ ہو، موچی ہسٹری انڈیا۔ ترجمہ ولیم اردن ج ۱ ص ۱۹۴-۱۹۵

بہرحال اس بیان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سال میں ایک بار صرف نوروز کے موقع پر یہ بازار لگتا تھا، اور آٹھ روز تک بڑی چہل پہل رہتی، برنیر نے[1] مزید لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ناچنے والی عورتیں محل میں جانے نہ پاتی تھیں، اور دور سے بادشاہ کو سلام کرکے واپس چلی جاتی تھیں، آپ نے ملاحظہ کیا کہ اورنگ زیب جیسا شخص بھی اس کے قلم سے نہ بچ سکا،

شمالی ہندوستان کے بازاروں کے علاوہ دکن کے بازاروں میں عورتوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے لیکن ان دکھنی بازاروں میں مرد بھی آزادی کے ساتھ شامل ہوتے تھے، سودافروشی کا کام عورتوں کے سپرد تھا، ظہوری نے برہان نظام شاہ کے نئے شہر کے بازار کا جو نقشہ کھینچا ہے[2]، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس بازار میں عورتوں کی وجہ سے بڑی رونق تھی لیکن احمدنگر کے بازار میں عورتوں کے بازار کا ثبوت نہیں ملتا،

برہان نظام کے اس بازار کا بیان ظہوری نے ساقی نامہ میں کیا ہے، جو ۱۰۰۲ھ کے قبل نظم ہوا تھا، اس کے تقریباً ۶ سال بعد ابراہیم عادل شاہ نے نورسپور شہر آباد کیا، ظہوری نے اس نئے شہر کے بازار کا ذکر دیباچہ خوانِ خلیل میں کیا ہے، جو ۱۰۱۴ھ کے قریب مکمل ہوا، اس کے ضمن میں مولف نے ساقی نامے کے ان شعروں میں سے چند شعر درج کیے ہیں[3]، جو برہان نظام کے نوآباد بازار کی تعریف میں لکھے گئے تھے، ان شعروں سے بھی بازار میں عورتوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی بھی دکانیں ہوتی تھیں، لیکن شمالی ہندوستان کے زنانہ بازار کی طرح صرف عورتوں کا بازار نہیں تھا،

شمالی ہندوستان میں اس بازار کا رواج مغلیہ حکومت کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہا، چنانچہ

---

[1] ٹراولیز ان دی مغل امپائر، ص ۲۷۵ [2] ساقی نامہ (کشوری طبع ۱۸۹۰ء) ص ۱۲۱ - ۱۲۸

[3] سہ نثر ظہوری (مطبوعہ ۱۲۷۲ھ) ص ۶۷، ۱۱ شعر درج ہیں،

کہا جاتا ہے کہ رام پور اور لکھنؤ میں بھی زنانہ بازار لگتے تھے۔

لیکن تاریخی کتابوں میں لفظ مینا بازار مجھے نہ مل سکا، سب سے پہلی بار یہ لفظ بہار عجم میں ملا جو ۱۱۶۲ھ کی تالیف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے بازار زنانہ بازار کے بجائے عموماً مینا بازار کے نام سے موسوم ہوئے، اور اس کے نتیجے میں اس کتاب کو بھی مینا بازار کہنے لگے۔

سطور بالا سے پوری طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ زنانہ بازار صرف اکبر کے عہد سے تعلق نہیں رکھتا یہ ضرور ہے کہ اس نے اس بازار کو آئین میں داخل کر کے اسے بڑی اہمیت دیدی تھی، اور ایک لحاظ سے گویا وہ اس کا بانی بھی ہے، اس لیے کتاب زنانہ بازار کو عموماً عہد اکبری سے متعلق سمجھا گیا، حالانکہ کوئی ایک بھی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے اس کی تصنیف اس کے عہد کی قرار دی جا سکے، ذیل کے اوراق میں ہم مینا بازار کے زمانے اور اس کے مصنفوں کی شخصیت کی تعین کی کوشش کیجائیگی

مینا بازار کا سنہ تصنیف | جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ زیر نظر کتاب کی بیشتر چیزیں دیدہ ودانستہ پردۂ خفا میں رکھی گئی ہیں، نہ مصنف نے اپنا نام بتایا ہے، نہ یہ بتایا ہے کہ وہ کس جگہ کے بازار کا حال قلم بند کر رہا ہے، اور نہ کوئی ایسا قرینہ ہے جس سے مصنف کے نام وغیرہ کے ساتھ یہ معلوم ہو جاتا کہ کب کی تصنیف ہے، اس لیے ان ساری چیزوں کی بنیاد قیاس ہی پر ہو سکے گی،

مینا بازار میں ظہوری کے ساقی نامے کا ایک شعر درج ہے،[۱] اس سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ کتاب ساقی نامۂ ظہوری سے موخر ہے، ساقی نامہ برہان نظام شاہ والیِ احمد نگر کے نام پر لکھا گیا جس نے ۹۹۹ھ سے ۱۰۰۳ھ تک حکومت کی، اس لحاظ سے مینا بازار کا سنہ تصنیف ۱۰۰۳ھ کے قبل قرار نہیں پا سکتا،

مینا بازار میں تمباکو فروش کا بھی ذکر ہے، مآثر رحیمی[۲] سے پتہ چلتا ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا،

---

[۱] ج ۲ ص ۵۸۴، [۲] مینا بازار ص ۳۹ جو پان کی تعریف میں پہلا شعر ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۵۰، [۳] ملاحظہ ہو مینا بازار، حاشیہ نمبر ۱۰ ص ۳۱

اور وہاں سے اواخر عہد اکبری میں شمالی ہندوستان لایا گیا، صاحب دارا شکوہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۱۰۱۹ھ (تصحیح ۱۰۱۳ھ) یعنی عہد اکبری کے آخر میں فرنگ سے شمالی ہندوستان میں آیا، اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم بیان اسد بیگ قزوینی کا ہے، جو بیجا پور کی سفارت سے واپسی ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۴ء میں اپنے ساتھ من جملہ اور تحائف کے تمباکو بھی لایا تھا، یہ دلچسپ[1] بیان حسب ذیل ہے:

بیجا پور میں مجھے تمباکو ملا، ہندوستان (شمالی) میں اس طرح کی چیز میں نے نہیں دیکھی تھی، اس لیے میں اپنے ہمراہ اسے لایا، اور ایک خوبصورت حقہ (پائپ) تیار کیا، جس پر جواہرات کا کام تھا، اس کی عمدہ نلی اجمین میں ملتی تھی، میری نلی تقریباً پانچ فٹ[2] لمبی تھی، جو پوری طرح خشک کی ہوئی اور عمدہ رنگی ہوئی تھی، اس کے دو کناروں پر جواہرات اور مینا کا کام تھا، مجھے ایک عمدہ خوبصورت منہ نال بھی مل گئی، یہ بیضاوی شکل کے عقیق کی بنی ہوئی تھی، اس کو میں نے نلی میں پیوست کر دیا، ایک سونے کی چلم (لمپ) روشن کرنے کے لیے مل گئی، جو حقہ کا ضروری جز تھی، عادل خاں (شاہ) نے مجھے ایک پاندان (پان کا ڈبہ) دیا جو بہت عمدہ کاری گری کا نمونہ تھا، اس میں میں نے ایسے عمدہ تمباکو سے بھرا کہ اگر اس کی ایک پتی جلائی جائے تو مہک اٹھے، ان سب کو ایک چاندی کی کشتی میں دلکش انداز میں ترتیب دیا، میرے پاس ایک چاندی کا ٹیوب تھا، جس کے ذریعہ نلی منہ نال سے پیوست کی گئی اور وہ گلابی رنگ کے مخمل سے ڈھکی ہوئی تھی۔

بادشاہ میرے تحائف کو معائنہ فرما رہے تھے کہ دفعتاً ان کی نظر اس کشتی، حقے اور اس کے سامان و ساز پر پڑی، اس کو بڑا تعجب ہوا، اور تمباکو بڑے غور سے ملاحظہ کر کے اس کی ماہیت اور اس کے متعلق سوال کیا، نواب خان اعظم (مرزا عزیز کوکلتاش) نے جواب دیا کہ یہ تمباکو ہے جو مکہ (معظمہ) اور مدینہ (منورہ) میں عام طور پر دستیاب ہوتا ہے، اور یہ ڈاکٹر (غالباً اسد بیگ کی طرف اشارہ مقصود تھا) آپ کی دوا کی غرض سے لایا ہے، بادشاہ نے اس کو دیکھا، اور حقہ تیار کرا کے تمباکو

---

[1] تاریخ ہند، ایلیٹ ج ۶ ص ۱۶۵ [2] انگریزی میں تین "کیوبٹ" ہے، ایک کیوبٹ ۱۸ انچ سے ۲۲ انچ کا ایک پیمانہ ہوتا ہے۔

پینے لگا، لیکن شاہی حکیم نے پینے سے روکا، مگر بادشاہ کو اتنا پسند آرہا تھا کہ اس نے دو تین بار پورا کش لیا، حکیم کو بڑی الجھن تھی، وہ نہیں چاہتا تھا کہ بادشاہ اسے اور پیئے، چنانچہ اس نے حقہ لے کر خان اعظم کی طرف بڑھا دیا، خان نے بھی دو تین کش لیے، اور اس نے (غالباً بادشاہ نے) شاہی عطار کو بلا کر اس سے تمباکو کے خواص پوچھے، اس نے جواب دیا کہ ہماری کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، یہ نئی ایجاد ہے، اور اہل یورپ اس کے بڑے مداح ہیں، ہم حضور سے ایسی ناواقف چیز کا بیان کیونکر کریں، حضور کے لیے مناسب نہیں کہ اسے پئیں، اس پر اسد بیگ نے شاہی حکیم سے کہا، یورپ کے لوگ اتنے بیوقوف نہیں کہ اس کے خواص سے ناواقف ہوں، ان میں ایسے بھی عقلمند ہیں جن سے غلطی کم سرزد ہوتی ہے، جو چیز آپ کی آزمودہ نہ ہو اور اس کے خواص سے آپ واقف نہ ہوں اس کے (اچھے یا برے ہونے کے) متعلق آپ کیونکر فیصلہ کر سکتے ہیں، اور وہ فیصلہ ایسا ہو جس پر اطبا، سلاطین، امرا و ارکین سب عامل ہوں، کسی چیز کی اچھی بری خاصیت معلوم ہونے کے بعد اس کے متعلق حکم لگانا چاہیے، حکیم نے کہا، ہم کو اہل یورپ کی تقلید نہ کرنا چاہیے اور ایک ایسی رسم کو نہ اپنانا چاہیے، جو ہمارے اگلوں کے معمولات میں نہ رہی ہو، اسد نے کہا یہ عجیب بات ہے، ہر رسم ابتدا میں نئی ہوتی ہے، ایجاد ہونے کے بعد رفتہ رفتہ لوگ اس کے عادی ہو جاتے ہیں، اور وہ عام ہوتی ہے، اس لیے حکما و عقلا کو اس کی اچھائی برائی دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، کیونکہ اسکا بھی امکان ہے کہ کسی چیز کی خوبی یک بیک ظاہر نہ ہو...

بادشاہ میرے اس استدلال اور بحث کو سنکر بہت خوش ہوا، اور مجھے دعا دی، اور خان اعظم سے کہا، دیکھو اسد بیگ کا استدلال کتنا دل پسند ہے، سچ ہے کہ ہمیں کسی چیز کو جسے دوسری قوموں نے آزمایا بھی ہو محض اس بنا پر کہ ہماری کتابوں میں اس کا ذکر نہیں، نہ ترک کرنا چاہیے، حکیم کچھ اور کہنا چاہتا تھا، کہ بادشاہ نے روک دیا، اور پادری کو بلایا، اس نے تمباکے خواص بتائے لیکن

حکیم قائل نہ ہوا، بہرحال وہ بڑا طبیب تھا،

میرے پاس تمباکو اور حقے کا کافی ذخیرہ تھا، اس لیے میں نے اکثر امرا کے پاس اس کو بطور ہدیہ بھیجا، بعض نے خود منگوا بھیجا، اور تمام امرا بغیر کسی استثنا کے اس کے شایق ہوگئے، اور چند دنوں میں اس کا رواج ہوگیا، اور سوداگروں نے بیچنا شروع کر دیا، اس طرح تیزی سے تمباکو نوشی کا رواج پھیل گیا، لیکن بادشاہ نے اس کو اپنے معمولات میں شامل نہیں کیا"۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شمالی ہند کے بازاروں میں تمباکو نوشی کا رواج ۱۶۰۴ء کے بعد ہوا[1]، مگر چونکہ اکبر کی وفات اس کے ایک ہی سال بعد ہوگئی[2]، اس لیے اس کے زمانے میں تمباکو پینے، کھانے اور سونگھنے وغیرہ کا عام استعمال مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے، اور یہ مسلم ہے کہ کتاب مینا بازار اس سنہ کے بعد لکھی گئی ہوگی، کیونکہ قلعہ کے زنانہ بازار میں جگہ ملنے اور مختلف قسم کے حقے، پینے اور کھانے کے طریقے ایجاد ہونے کے بعد ہی مصنف نے اس کے لکھنے کا خیال کیا ہوگا،

---

[1] اسد بیگ کی واپسی مریم مکانی کی وفات کے چند دن بعد ہوئی، تکملہ اکبر نامہ میں انکی وفات کی تاریخ ۹ر شہریور ۱۰۱۳ھ (مطابق ۲۹ر اگست ۱۶۰۴ء) دی ہے لیکن زبدۃ التواریخ میں ۱۰ شہریور ۱۰۱۳ھ درج ہے، اور اسی کی بنیاد پر بیل نے ۱۶۰۳ء قرار دی ہے، مگر یہ غلط ہے، تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو ترجمہ (انگریزی) اکبرنامہ ص ۱۲۳۵ متن وحاشیہ و اکبرنامہ ج ۳ ص ۸۳۱

[2] اکبر کی وفات کی تاریخ میں اختلاف ہے، تکملہ اکبرنامہ میں چہارشنبہ ۴ر آبان ۱۰۱۴ھ (۱۵ر اکتوبر ۱۶۰۵ء) ایلیٹ ج ۶ ص ۲۶۰ پر ۱۲ر آبان مطابق ۲۰ر جمادی الاول ۱۰۱۴ھ (۲۳ر ستمبر ۱۶۰۵ء) اقبال نامہ میں ہے کہ ۱۲ر آبان کو بیمار ہوا اور سہ شنبہ ۱۲ر جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ میں مرا، بظاہر ۱۲ر آبان غلط ہے، مہر ہونا چاہیے، فرشتہ میں ۱۳ر جمادی الآخری ہے، بہرحال متحقق ہے کہ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ (۱۵ر اکتوبر ۱۶۰۵ء) اس حساب سے اسد کی واپسی ۱۳ ماہ پہلے ہوئی ہوگی، (ملاحظہ ہو ترجمہ اکبرنامہ ص ۱۲۶۰ — ۱۲۶۱)

اس واقعہ سے ان تمام لوگوں کے خیالات کی تردید ہو جاتی ہے جو اس تصنیف کا سہرا عہد اکبری کے سر باندھنے کی کوشش میں دور از کار توجیہات اور بعید از قیاس تاویلات میں مصروف نظر آتے ہیں، لیکن اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ مینا بازار عہد اکبری کے فوراً بعد لکھی گئی، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ عہد اکبری کے بعد کسی زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی ہوگی خواہ وہ زمانہ جہانگیر شاہجہاں یا اورنگ زیب کسی اور بادشاہ کی حکومت کا ہو، مگر اس کے قبل کا نا ممکن ہے،

مینا بازار کا مصنف جیسا کہ ارشاد ہو چکا ہے، مینا بازار کے مصنف کے بارے میں بڑا اختلاف ہے[1]، بعض بیانات سے اس کا مصنف ارادت خاں واضح اور بعض سے ظہوری معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ اختلاف نیا نہیں ہے، پرانے فضلا میں بھی اس طرح کا اختلاف تھا، مرزا قتیل نے چار شربت[2] میں اس اختلاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے،

از مترشحات کلک غرائب سلک آنچہ مشہور و متداول است چار نسخہ است، سہ نثر کہ آں ہر سہ بنثر ار یکے ست ہر چند باعتبار حمد و نعت از قید وحدت برآمدہ، وحسن و عشق، و بازار زنانہ[3] و پنج رقعہ، سہ نثر را باتفاق صغیر و کبیر از وست، و در سہ چیز دیگر اختلاف واقع شدہ، بعضے آنہا را منسوب باو کنند و مذہب خان آرزو ہمیں است، و بعضے سوائے سہ نثر از و ندانند، شمس الدین فقیر عباسی دہلوی ہمیں اعتقاد داشتہ۔ و دریں اعتقاد پیروی محققان سابق نمودہ ہر سہ نثر باقی را بگردن ارادت خاں کشمیری متخلص بہ واضح شاگرد مرزا عبد القادر بیدل بستہ اند، گویند کہ منشی موصوف الیہ برائے ترویج سرمایۂ خود را بہ ملا ظہوری حوالہ نمودہ، و در مسودہ بنا بر ادائے دقیق معاصران رعایت عصر ملحوظ داشتہ حکیم بلند و قار شاعر خاقانی اقتدار خیمی نجانی دا

---

[1] اس سلسلے میں معارف مئی، جولائی، اگست، ستمبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارے ملاحظہ ہوں۔ [2] مطبوعہ ۱۲۶۱ھ ص ۹۶

[3] بعض لوگ اس کو پنج رقعہ میں شامل سمجھتے ہیں، مگر ملاحظہ ہو میری کتاب ظہوری ص ۳۳۸ - ۳۳۹

مخاطب ساختہ، واللہ اعلم بالامور"

اس بیان کے پہلے حصے میں بتایا گیا ہے کہ خان آرزو سہ نثر کے علاوہ اور چیزوں کو ظہوری کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور شمس الدین فقیر صرف سہ نثر کو ظہوری کی بتاتے ہیں، اور بقیہ دوسرے نثر پاروں کو واضح کی ملک قرار دیتے ہیں، انھوں نے اس میں محققین سابق کے خیال کا اتباع کیا ہے، مگر اس بیان کا دوسرا حصہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ واضح نے ترویج کے لیے اپنا تمام سرمایہ ظہوری کے حوالے کر دیا تھا، اور اپنے معاصرین کو یقین دلانے کے لیے فیضی فیاضی کو مخاطب کیا، دلچسپ تو ضرور ہے، مگر بالکل خلاف قیاس ہے، اس وجہ یہ ہے کہ ظہوری واضح سے ایک صدی[1] متقدم ہے اور فیضی فیاضی نے واضح سے تقریباً سوا سو سال قبل وفات[2] پائی،

مرزا قتیل نے واضح کو کشمیری اور مرزا بیدل کا شاگرد بتا کر یہ بات مشتبہ و مشکوک کر دی ہے کہ یہ واضح وہی ہے جس کا نام مبارک اللہ[3] تھا، اور جو اورنگ زیب کے عہد میں مختلف عہدوں پر فائض رہا، اور عہد فرخ سیر میں ۱۱۲۸ھ میں وفات پائی، یا کوئی دوسرا شخص ہے لیکن سردست مجھے اس سے بحث نہیں ہے،

(۱) سراج الدین علی خاں آرزو نے اپنا اہم تذکرہ مجمع النفائس ۱۱۶۴ھ میں مرتب کیا لیکن اس میں نہ ظہوری کے ذیل میں اس جھگڑے کا ذکر ہے، اور نہ واضح کے ذیل میں، ملک قمی جو ظہوری کا خسر تھا، اور دونوں کے حالات بڑی حد تک یکساں ہیں، اس کے ضمن میں بھی اس اختلاف کا نام نہیں، اب ہم تینوں جگہ سے کچھ ضروری عبارتیں نقل کرتے ہیں،

کمالات ظہوری نظماً و نثراً از آں مشہور تر ست کہ زبان خامہ قاصر اللسان از عہدہ[4]

[1] ظہوری کی وفات ۱۰۲۵ھ میں اور واضح کی ۱۱۲۸ھ میں ہوئی، ملاحظہ ہو ظہوری ص ۴۰ [2] فیضی کی وفات ۱۰۰۴ھ میں ہوئی،

[3] ملاحظہ ہو ماثر الامراء ج ۳ ص ۲۰۴-۲۰۵ مجمع النفائس ورق ۵۱۹ بعد ایلیٹ و تاریخ ہند ج ۷ ص ۵۳۴ وغیرہ۔

[4] قلمی نسخہ (بانکی پور) ورق ۲۹۰ بعد، ذیل حالات ظہوری

توصیف آن بر آید، با این ہمہ خط ہم خوب می نوشت. کتاب دفتر الصفا و اکبر نوشتہ و مردم بجان و دل خریدار آن بودند و شیخ فیضی را کہ ملک الشعراے اکبری است کمال دوستی و تعلق خاطر با و متحقق است و در شعر طرز خاصے دارد کہ تا الیوم ہیچکس را دست نہ دادہ غرض کہ او درین فن یگانہ ایست علی الخصوص در نثر رنگین و مثنوی کہ ہر کہ بعد او آمدہ تتبع وپیرو اوست کلیات نظم و نثر او بسیار ضخیم است (واضح) کلیات[1] دارد ضخیم مشتمل بر غزلہا و قصائد و رباعیات و مثنویات اراده داشت کہ جواب خمسہ گوید، چند مثنوی شروع کردہ الا بسرش نیامد لیکن مثنوی آئینہ راز در بحر یوسف زلیخا باتمام رسانیدہ و در خیلے بقدرت گفتہ . . قصیدۂ جواب قصیدۂ مرزا معز موسوی . . . . . خیلے بزور گفتہ و نیز کتابے از دسمی بہ کلمات طیبات بسیار دقیق و مملو از فوائد و از انجا دریافت شود کہ عقائد مذہب است دیباچے بر کس نمی دہد، بہرحال در اہل کمال بودن او شکے نیست، این قدر ہست کہ در ترکیبات فارسیہ تصرفات نمایاں داشت و دعویش این بود کہ ما اہل زبانیم و قادر سخن، ہر چہ ما می گوئیم برائے دیگراں سند است نہ قول دیگراں برائے ما و در بلند خیالی بمرتبہ رسیدہ کہ بسیار اشعارش فہمیدہ نمی شود . . . . . مخفی نماند کہ ارادت خاں واضح ہر چند رباعیات بسیار دارد و اکثر مطالب تصوف دراں مندرج است و نثرے نوشتہ کہ شرح رباعیات مذکور است فقیر از زورا ایں دو رباعی از اں جملہ بسیار خوشش آمدہ

استاد ملک قمی شاعر زبردست صاحب قدرت است و مثل نور الدین ظہوری چند جا مدح[2] او نمودہ و ایں دلالت دارد بر کمال بزرگی و تمامی سخنوری او، ملا ظہوری بشرف دامادی او مشرف گشتہ . . . . و در اکثر جاہا توصیف و تعریف نمودہ حتی کہ ہر دو شاعر مذکور کتابے تصنیف نمودہ اند

---

[1] ورق ۲۲۰ ۔ ۲۲۲ ب [2] ورق ۵۵۴۔ نورس قزوینی (ورق ۴۹۶) کے ذیل میں رسالہ نورس کا ذکر اس طرح کرتا ہے ظہوری رسالہ دارد کہ در مدح بادشاہ مذکور کردہ کہ مسمی است بہ نورس ۔

باشتراک ودایں قسم ہیچ جا اتفاق نیفتادہ" (ورق ۵۵ ب)

ان اقتباسات سے یہ مقصود نہیں کہ مرزا قتیل کی اس رائے کا انکار کر دیا جائے کہ خان آرزو مینا بازار وغیرہ تمام نثر پاروں کو ظہوری کی ملکیت قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس کا امکان ابھی باقی ہے کہ اس تذکرہ میں کہیں اور اس اختلاف کا ذکر ہو، مگر یہ امکان بہت ضعیف ہے، اس لیے کہ اس کے ذکر کے مواقع یہی تھے، معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو نے اپنی کسی دوسری تصنیف میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہوگا، زیادہ قیاس یہ ہے کہ سراج اللغت میں حوالے کے سلسلے میں زیر بحث نثر پاروں کو ظہوری کے نام کے ساتھ درج کر دیا ہو سراج اللغت کا خصوصی ذکر محض اس بنا پر کیا گیا کہ بعض لغت نویسوں نے جن میں ٹیک چند بہار اور غیاث الدین شامل ہیں، مینا بازار کو ظہوری ہی کی طرف منسوب کیا ہے، اور ان کے ماخذوں میں اس کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے،

(۲) بارھویں صدی کے دوسرے مصنف جس نے خان آرزو کے خیال کی تائید کی ہے وہ ٹیک چند بہار مولف بہار عجم ہے، اس نے لفظ "گل" کی تشریح میں لکھا ہے:

"(گل) بہ اصطلاح قماربازان نورالدین ظہوری در مینا بازار در تعریف بزاز نوشتہ چوں سرمایہ داران نقد خرد دست بکیسۂ شکیب می افشانند بر تختہ اوکہ از مشکباری زلف عروس قماری است گل می خوانند" (ج ۲ ص ۴۵۳ کالم نمبر ۳)

بہار عجم کی تالیف کا سنہ "یاد فقیر حقیر بہار یادہ سال" کے فقرے سے (۱۰۵۲+۱۰) سنہ ۱۰۶۲ھ[1] نکلتا ہے، لیکن اس پر نظر ثانی آخر حیات[2] تک ہوتی رہی، کیونکہ مصطلحات الشعراء وارستہ کو اس کے

[1] برٹش میوزیم کے نسخہ میں (فہرست ج ۲ ص ۵۰۲) اور باڈلے (فہرست ج ۱ ص ۱۰۱۸) کے نسخے میں یہی دیا ہے، مگر نولکشوری (مطبوعہ ۱۳۱۶ھ) میں دس سال کے اضافے کا ذکر نہیں ہے [2] ملاحظہ ہو برٹش میوزیم (فہرست ج ۲ ص ۵۰۳) بحوالہ بلاخمن (Blochmann) ایل بی ص ۲۰۰۔ اسی نسخے میں دو دیباچے ہیں اور اندراس کی تلخیص کا بھی ذکر ہے جو ۱۱۸۰ھ میں عمل میں آئی،

بجائے رسانیدہ کہ امروز خیال بندان روزگار ہمیشہ معتقد اوند

(۳) کشن چند اخلاص نے ہمیشہ بہار (۱۱۳۶ھ) میں اس کی نثری تصنیف کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:[1]

دیباچۂ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم از نتائج افکار در رگفتار اوست

(۴) نقش علی نے باغ معنی (۱۱۷۵ھ) میں لکھا ہے:[2]

در نثر طرز خاص دارد۔ دیباچۂ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم خیلے بہ لطافت نوشتہ ہر فقرہ مسجع است و معنی تازہ دارد۔

(۵) شاہ نواز خاں نے بہارستان سخن (۱۱۹۴ھ) میں صرف سہ نثر کو ظہوری کی نثری تصنیف قرار دیا ہے، عبد الجبار خاں نے تذکرہ محبوب الزمن میں اس کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:[3]

بہارستان کے مولف نے لکھا ہے کہ ظہوری نے ابراہیم عادل شاہ کے نام پر خوانِ خلیل، گلزار ابراہیم اور کتاب نورس مولفہ عادل شاہ کا خطبہ لکھا؛ اور عبارت نثر و نظم کو نادر تشبیہات و استعارات، مبالغہ و اغراقات کے ساتھ ایسا آراستہ کیا کہ شعرائے نازک خیال اس کی بے نظیری و عدیم المثالی کو مانتے ہیں" اس کا ہر ایک فقرہ مسجع و مقفی اور جامع معنی تازہ و شگفتہ ہے۔

(۶) چار شربت[4] (تالیف ۱۲۱۰ھ) میں مرزا قتیل نے شمس الدین فقیر عباسی دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ صرف سہ نثر کو ظہوری کی ملک بتاتے تھے، اور پنج رقعہ، مینا بازار اور حسن و عشق کو ارادت خاں کی تصنیف قرار دیتے اور اپنے اس قول میں پرانے محققین کی پیروی کی ہے، غالباً شمس الدین فقیر پہلا شخص ہے جو اس اختلاف کے ضمن میں واضح کا نام لایا ہے،

شمس الدین اور صاحب حدیقۃ البلاغہ بظاہر ایک ہی شخص ہیں، کیونکہ آخر الذکر کا بھی نام شمس الدین

---

[1] ورق ۷۵ ب [2] ص ۴۱ [3] ج ۲ ص ۱۷۱ [4] ص ۷۷

اور تخلص فقیر تھا، اور وہ خان آرزو کا معاصر تھا، حدیقۃ البلاغہ ۱۱۶۲ھ میں یعنی مجمع النفائس سے چار سال بعد تصنیف ہوئی، چنانچہ اس کی تاریخ[۵] خود مصنف[۱] نے خاتمہ کتاب میں درج کی ہے جس سے یہی سنہ نکلتا ہے، جس طرح مجمع النفائس میں خان آرزو نے اس اختلاف کا ذکر نہیں کیا ہے، اسی طرح حدیقہ بھی اس اختلاف سے خالی ہے، (حدیقہ چونکہ فن بلاغت کی کتاب ہے اس لیے اس میں موقع بھی کم تھا) اور جیسا ہم قیاس کر چکے ہیں، خان آرزو نے اپنی قبل کی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہوگا، اسی طرح شمس الدین فقیر نے بھی کسی اور جگہ ظہوری کی نثری تصنیف کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کر کے اور نثر بارون کو ارادت خاں کی طرف منسوب کیا ہوگا،

(۷) اگرچہ مرزا قتیل کی رائے (جو چار شربت میں ظاہر ہوئی ہے) کا کچھ حصہ نقل ہو چکا ہے، اس حصہ میں انھوں نے زنانہ بازار وغیرہ کے مصنف کے بارے میں اختلاف رائے کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا، مگر اسکے بعد کے حصے میں انھوں نے صراحۃً لکھا ہے کہ سہ نثر کے علاوہ جتنی نثریں ہیں وہ ظہوری کی نہیں ہیں، کیونکہ دونوں کا طرز جداگانہ ہے، اور دونوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، اور انکی تشریح بھی کر دی ہے، اب ہم ذیل[۲] میں ان کی رائے پیش کرتے ہیں:

> سہ نثر کے مرتبے کی بلندی ان تمام چیزوں (نثروں) پر جو اس کے مشابہ ہیں، بدیہی ہے، اور یہ طرز خاص ظہوری کا مخترع ہے، اور بمصداق کل جدید لذیذ کے اس نے بلاغت کا سکہ الفاظ کے درہموں پر نقش کیا، ایران کے مسلم الثبوت انشا پرداز اس کے فقروں کو رشتۂ جواہر آبدار خیال کرتے ہیں لیکن چونکہ اس کو اس بارے میں اساتذۂ قدیم سے اختلاف ہے اور اپنے ساز کو نئے قانون (اصول، انداز) سے بجاتا ہے، اس لیے اس کی پیروی اختیار نہیں کرتے لیکن اس سے بڑی وجہ یہ ہو کہ اس کا تتبع نہایت مشکل ہے، اس کا ہر فقرہ سوا اس فقرے کے جو اس کے مقابل آیا ہے، جواب نہیں رکھتا،

---

[۱] بساتین مستفیدان، خزانۂ تکمیل، تقویم دانشوران، زینت گفتار، مخزن نکات [۲] ص ۷۷-۷۸

بہرحال اس طرز کا ایران میں رائج نہ ہونا زیادہ درخور اعتنا نہیں، اور جس حسن (خوبی) کا ذکر ہو رہا ہے وہ صرف (دیباچہ) نورس و گلزار ابراہیم و خوان خلیل میں پایا جاتا ہے، دوسرے نثر پارے جو اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اس حسن سے عاری ہیں، اگرچہ بعض لوگ (حسود) اپنے زعم میں ایک دوسرے کے التباس (اشتراک) سے دونوں طرز کو ایک جانتے ہیں، مگر ظہوری کا طرز کلام کو لغت سے پاک کرنا اور دلچسپ تشبیہ اور دلپذیر کنایہ و استعارہ و تبلیغ و اغراق و غلو و مراعات النظیر سے آراستہ و مزین کرنا ہے، وہ نزاکت معنی کو اس حد تک الفاظ کا جزو لاینفک قرار دیتا ہے کہ کند ذہن اس کے کلام کے حسن کی دریافت سے قاصر رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کی نزاکت فکر ہمیشہ نئے نئے مضامین (معنی بکر) کی متلاشی (صیاد) رہتی ہے، مثال

"اگر جودش دست عنایت بہ راز بر سر یکساں نگزاشتے صدف بر قطرۂ ابر نیسانی
شفقت مادری روا نداشتے، مرغے کہ اسیر حلقہ دام ملک شکارش گردیدہ بہ تیغ
تیز شہپر رشتہ الفت با طائران طوبی بریدہ"

ظہوری کا یہی طرز ہے لیکن چونکہ پنج رقعہ بھی اسی کے نام سے مشہور رہے، لہذا پنج رقعہ[1] کے طرز پر تبصرہ کیا جاتا ہے، جس سے حقیقت حال واضح ہو جائے گی،

(الف) ایک مفرد یا مرکب لفظ کو دو لفظ کے ساتھ ذکر کرتا ہے، پھر ایک دوسرا لفظ بطور صفت کے پھر ایک لفظ اس مجموعہ صفت و موصوف کی صفت کے طور پر لاتا ہے، یہ ایک فقرہ ہوا، دوسرا فقرہ اس کے مقابل اسی طریقہ سے لاتا ہے، مثلاً

سرو زیبا قامت خوش رفتار
موصوف (لفظ مفرد) صفت (لفظ مرکب)
موصوف — صفت (لفظ مرکب)

یا

مہ پارۂ حوار طلعت پری نژاد
موصوف (لفظ مرکب) صفت (لفظ مرکب)
موصوف — صفت (لفظ مرکب)

---

[1] اگرچہ فی الحال ہم پنج رقعہ سے بحث نہیں کر رہے ہیں، مگر اس کی نسبت بھی (ظہوری کی طرف) غلط ہے، وجوہ تقریباً یکساں ہیں۔

(ب) ایک لفظ موصوف اور اس کی صفت ایک پورا فقرہ، پھر ایک لفظ اس مجموعے کی صفت۔ پھر یہ سب ایک لفظ کی طرف مضاف اور وہ لفظ (مضاف الیہ) دوسرے لفظ کی طرف مضاف۔

شہید گلو بریدہ در خون طپیدۂ معرکۂ الفت

موصوف صفت

موصوف   صفت (پورا فقرہ)   مضاف   مضاف الیہ

مضاف   مضاف الیہ

(ج) ایک لفظ موصوف اور اس کی صفت ایک طویل عبارت پھر یہ مجموعہ ایک لفظ کی طرف مضاف اور وہ مضاف الیہ ایک لفظ کی طرف مضاف ہو یا دو لفظ کی طرف جو واو عاطفہ سے ملحق ہوں اور معطوف ایک صفت کا موصوف ہو

قتیلِ ہزار زخم کاری شمشیر آبدار جو زدۂ معرکۂ محبت و اتحاد روز افزون

موصوف   صفت   مضاف   معطوف علیہ   حرف عطف   موصوف   صفت

معطوف

مضاف الیہ

مضاف الیہ

(د) ایک لفظ ایک بڑی عبارت کا موصوف ہو یہ صفت معطوف علیہ ہو اور اس کے مقابل ایک ایک بڑا فقرہ معطوف اور یہ سب ایک لفظ کی طرف مضاف ہوں جو ایک بڑی عبارت کا موصوف بھی ہو

صید دہ آشیان آسائش ہزار آرزو پر و بال کشادہ بامیدانہ منقصود بعمر آنا پیدا کنار طلب از جرہ بازوں در افتادہ دام باج ستان از طرۂ مہوشان مہر وشان ...

موصوف   صفت و معطوف علیہ   حرف عطف   صفت و معطوف   موصوف   صفت

مضاف   مضاف الیہ

(۸) احمد علی سندیلوی نے اپنے تذکرۂ مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ) میں ارادت خاں واضح کے ذیل میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے:

مرزا مبارک اللہ واضح تخلص مخاطب بہ ارادت خاں از امیرزادگان قدیم ہندوستان است

> جدش نیز ارادت خان خطاب داشت، از امرائے کلاں جہانگیری بودہ، وواضح صبیہ زادۂ جعفر
> قزوینی ملقب بہ آصف خاں ست عمر دراز یافت، در عہد فرخ سیر برحمت حق پیوستہ، در انشا کمال تمام
> داشت، مینا بازار ظہوری کہ دریں زماں نہایت شہرت دارد گویند از انشائے واضح است۔" (ورق ۱۹۹)

بعض لوگوں نے آخری جملے سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ احمد علی کے نزدیک مینا بازار کا مصنف ظہوری ہی تھا، لیکن میرے خیال میں یہ توجیہ غلط ہے، کیونکہ احمد علی بھی حقیقتاً اس کتاب کو ظہوری کی ملک سمجھتے تو اسے ظہوری کے ذیل میں بیان کرتے، چونکہ انھوں نے واضح کے ذیل میں اس کو درج کیا ہے، اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگرچہ مینا بازار عام طور پر ظہوری کی مشہور ہے، لیکن بعض لوگ اسے واضح کی بھی بتاتے ہیں، اور مصنف بھی آخر الذکر گروہ کا ہم خیال ہے، اس لیے واضح کی انشا پردازی کی تعریف کے بعد مینا بازار کا ذکر اسی قیاس کا مؤید ہے، میرا خیال یہ ہے کہ احمد علی نے مرزا قتیل کی چار شربت سے پوری طرح استفادہ کیا ہے، قتیل نے بھی لکھا ہے کہ اگرچہ مینا بازار وغیرہ ظہوری کی طرف عام طور پر منسوب ہیں لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:۔ (ص ۶۷)

> از مترشحات کلک عزائب انچہ مشہور و متداول است چہار نسخہ است، سہ نثر و حسن و عشق و بازار زنانہ و پنج رقعہ ...... لیکن افزونی رتبہ سہ نثر از چیزہائے دگر ..... بدیہی۔ و ایں حسن منحصر است در نورس و گلزار ابراہیم و خوان خلیل و در نثرہائے دیگر کرا با و نسبت دہند۔

آپ نے ملاحظہ کیا، مشہور تو ظہوری کی ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔

(۹) ابراہیم زبیری نے بساتین السلاطین (۱۲۴۰ھ) میں ظہوری کی نثری تصنیف[1] میں صرف اسکے تینوں دیباچوں یعنی سہ نثر کا ذکر کیا ہے، ابراہیم زبیری بیجاپور کا اہم مصنف ہے، اور گو اس کے بعض بیان میں غلطیاں پائی جاتی ہیں، مگر ظہوری کے بارے میں اس کا بیان بہت زیادہ قابل توجہ ہے، کیونکہ

---
[1] ورق ۱۲۵

یہی وہ مورخ ہے جس کے پیش نظر ظہوری کے لڑکے ملا ظہور کا محمد نامہ تھا، اور جس نے ظہوری کی وطنی نسبت قائنی لکھی ہے، جو یقینی ہے، اس لیے کہ خود ظہوری نے دو مختلف ابیات میں "قائن" کو اپنا مولد بتایا ہے، غرض ابراہیم زبیری کا صرف سہ نثر کا ذکر کرنا اور مینا بازار وغیرہ کے بارے میں سکوت اختیار کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے،

(۱۰) اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے بڑے شد و مد کے ساتھ مینا بازار و پنجرقعہ کو واضح کی طرف منسوب کیا ہے، مولوی محمد مظہر الحق نے ایک ہزار چھ شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا تھا، اس کی تقریظ کے سلسلے میں غالب نے لکھا ہے کہ مولوی مذکور اپنے پدر بزرگوار مولانا محمد ظہور علی کے فیض یافتہ ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں:

آں ویریں آموز یگانہ روزگار سخن را دبدبے ناز ومعنی را از وے شرف جناب قدسی القاب مولانا محمد ظہور علی صاحب زاد مجدہٗ آنکہ بر نثر ہائے پیشینیان چناں حاشیہ ہائے خرد افزا نوشت کہ ہر ماتن در کنج لحد آفریں گوے اوست، شرح نگاری ریں جنیں ہمہ واں را سزد، نہ آں خیار از جہاں ناشناساں راکہ چوں خواہند در شرح کلام سلف کوس شہرت زنند پنج رقعہ و زنانہ بازار از آن خان واضح را تراو یدہ رگ پیرویں نگارد و پہن بار مولانا نور الدین ظہوری وانمایند، ہاں وہاں غالب لاابالی شیوہ از دشمن بہ دست ردے آرد دعاے گوہر درج سعادت کہ عقیق لب شاہد معنی بدیں سجع نگیں مہر اوست ؎ مرحبا مظہر ظہور علی ور دزبان کن الخ (کلیات نثر غالب ص ۹۳-۹۶)

ظاہر ہے کہ اس میں مولانا صہبائی پر چوٹ کی ہے، کیونکہ انھوں نے شرح نویسی کے ضمن میں مینا بازار اور پنجرقعہ کو ظہوری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اور غالب اس کے سخت مخالف تھے، یادگار غالب میں مولانا حالی نے ایک لطیفہ بھی لکھا ہے جو اشاعت اول میں موجود ہے، لیکن بعد کی اشاعت میں نظر انداز ہو گیا ہے،[1]

صہبائی کی رائے پنجرقعہ اور مینا بازار کی نسبت یہ تھی کہ یہ دونوں...... ظہوری کی ہیں، مگر مرزا

---

[1] مگر مولانا حالی نے اس کے خارج کرنے کی کوئی وجہ نہیں لکھی (اس حصہ کو میرے کرم فرما قاضی عبدالودود نے لکھ کر بھیجا ہے)

اس کے خلاف تھے، ایک جلسے میں دونوں موجود تھے، اتفاق سے یہ ذکر چھڑ گیا، مرزا نے کہا "قطع نظر اس کے کہ سہ نثر اور پنج رقعہ و مینا بازار کی طرز میں بون بعید ہے، ظہوری کی شان سے نہیں کہ وہ نثر کے ساتھ نظم نہ لکھے، تمام سہ نثر میں ایسا ایک صفحہ مشکل سے ملے گا جس میں نثر ہو اور نظم نہ ہو، برخلاف اس کے پنج رقعہ و مینا بازار میں ایک شعر[1] کے سوا کہ وہ بھی ظہوری کا نہیں نظم کا کہیں پتہ نہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص نظم و نثر دونوں .... پر برابر قدرت رکھتا ہو اس کی نثر میں کہیں نظم نہ پائی جائے" صہبائی نے کہا "ایسے اتفاقات اکثر ہو جاتے ہیں، یہ محض اتفاق کی بات ہے" مرزا نے کہا "بیشک: مگر یہ ایسا اتفاق ہوگا کہ ایک شخص ہر لحاظ سے نہایت سنجیدہ، شائستہ اور معقول اگلے[2] کا آدمی ہے مگر اتفاق سے کاٹے کھاتا ہے" یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے اور صہبائی مسکرا کر خاموش ہو رہے،

(یادگار غالب طبع اول ص ۶۷)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ غالب نے دو وجوہ بیان کیے ہیں جن کی بنا پر وہ مینا بازار وغیرہ کو ظہوری کی تصنیف شمار نہیں کرتے تھے (۱) مینا بازار وغیرہ کے طرز میں اور سہ نثر کے طرز میں بڑا فرق ہے، (۲) ظہوری کی نثر نظم آمیز ہوتی ہے اور مینا بازار وغیرہ نظم سے یکسر خالی ہیں، ان دونوں باتوں میں بڑا وزن ہے، صہبائی نے محض اتفاق کا سہارا لے کر اپنی بات غیر مدلل کر دی،

(۱) مولف جام جہاں نما (تیرہویں صدی) نے ظہوری کی بابت یہ اطلاع[3] بہم پہنچائی ہے،

"در نظم و نثر ید بیضا داشتہ، صاحب طرز بودہ۔ اشعار دیوانش پیچیدار و استعارات بلیغ دارد، خطبۂ نورس و خوان خلیل و گلزار ابراہیم بنام ابراہیم عادل شاہ خوب نوشتہ"

اس مولف نے بھی نثری تصنیف میں صرف ان ہی تین دیباچوں کا ذکر کر کے اس قیاس کی تائید کی ہے کہ مینا بازار وغیرہ ظہوری کی تصنیف نہیں۔ (باقی)

---

[1] مگر یہ صحیح نہیں، پنج رقعہ میں ۵ شعر ہیں جن میں ایک نظیری کا ہے، اور مینا بازار میں دو شعر ہیں جن میں ایک ظہوری کے ساقی نامے کا ہے۔
[2] یہ الفاظ غلط نامے سے بڑھائے گئے ہیں [3] جلد ۲ ورق ۱

شیخ علی بخش بیمار

از جناب کاظم علی خاں صاحب رامپوری

ان کے والد کا نام شیخ غلام علی اور وطن شہر بانس بریلی تھا، جس قدر ان کے کلام کو شہرت حاصل ہوئی، اتنے ہی انھیں گمنامی ملی، بریلی میں کہاں رہتے تھے، کس سے تعلیم پائی اور کب وطن سے نکلے، یہ تمام امور پردۂ راز میں ہیں، تذکروں میں جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے، وہ یہ ہے[1]:

شاگرد میاں مصحفی، مرد خوش فکر و خوش مذاق، حسن کلام سے مشہور آفاق تھے، جب اس دار الریاست میں آکر سرکار کے ملازموں میں داخل ہوئے، یہاں احمد غفلت کا دور دورہ تھا، مصلحتاً ان کے شاگردوں میں شامل ہوئے، سر سٹھ برس کی عمر ہوئی، چوبیسویں ربیع الاول ۱۲۷۱ھ میں رحلت کی، کلام تلف ہو گیا۔"

صاحب گلستان سخن[2] کا بیان ہے:

بیمار تخلص ہے، شیخ علی بخش ساکن سنبھل، فارسی میں استعداد کامل ہے اور ریختہ گوئی میں مہارت تام، الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے خارج ہے، سرکار محمد سعید خاں والی رامپور میں ناخن بندی وسیلۂ تحصیل معاش ہے اور رئیس مذکور کی فرمائش سے کوئی جلد بوستان خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب، اردو میں نظم کرتا تھا، معلوم نہیں اختتام کو پہنچایا نہیں۔"

---

[1] انتخاب یادگار، مؤلفہ امیر احمد امیر مینائی ص ۸۱ و ۸۲ (تاج المطابع رامپور ۱۲۹۷ھ) [2] گلستان سخن ۱۲۷۱ھ مؤلفہ مرزا قادر بخش صابر، مطبع مرتضوی دہلی ص ۱۶۳۔

کی شاگردی پر آتیر بھی طنز کرتے ہیں، اور نورالحسن خاں بھی اگر واقعی غفلت اُن کی استادی کے سزاوار نہ تھے تو نواب محمد سعید خاں کے اصرار پر بھی بیمار کو ان کا تلمذ اختیار نہ کرنا چاہیے تھا، شاگردی کی یہ پہلی عجیب و غریب نوعیت بیان کی گئی ہے، جو نہایت مضحکہ خیز ہے، اگر یہ صورت کسی عہد میں بھی جائز سمجھی جاتی تو نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے عہد میں بھی اس کا اعادہ ہونا چاہیے تھا جب کہ امیر مینائی استاد نواب تھے لیکن کسی نے بھی اس غلط تاویل کو قبول نہیں کیا، نواب محمد سعید خاں کے عہد کے تین سال غفلت نے دیکھے، اس دور میں ان کو نہ کوئی منصب ریاست میں حاصل تھا اور نہ ذاتی تقرب، پھر کس طرح کسی کو انکی شاگردی پر مجبور کیا جاتا، اور اگر اس کو وطن دوستی پر محمول کیا جائے تو پھر لکھنؤ اور دہلی کے تمام اساتذہ کو اس پر مجبور کیا جاتا کہ وہ ہر رئیس کے عہد کے مقامی شعراء اور ادبا کے سامنے زانوے تلمذ تہ کریں، دراصل اس داستان کے وضع کرنے میں صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ رام پور کی شاعری اور اسکے شاعر کبھی قابل اعتنا نہ تھے، اور وہ بیرونی لوگوں کے طفیل میں ترقی حاصل کرتے رہے، غفلت، مصحفی سے ملنے لکھنؤ گئے تھے، اور مصحفی نے ان کی مثنویوں اور قصائد کی تعریف کی تھی، رام پور میں ان کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے مضامین کی بلندی غزل میں بھی ضروری سمجھی اور تشبیہ، استعارے اور فارسی تراکیب کو کلام میں داخل کیا اور اسی سبب سے مصحفی نے ان کی غزل کی تعریف نہیں کی، لیکن قصائد اتنے بلند ہیں کہ ذوق کے قصائد سے کم نہیں بلکہ سودا کے قصائد سے لگا کھاتے ہیں، غفلت کی شاگردی پر خود بیمار کو ناز تھا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

اصلاحِ جنابِ غفلت اے بیمار گر ہوتی　　　تو معنی بھی نہ رکھتا شعر کوئی تجھ سخنداں کا

یہ تو ممکن ہے کہ وہ مصحفی کو دو ایک غزلیں ۱۲۲۳ھ کے بعد دکھا چکے ہوں، مگر وطن کی قربت کا لحاظ کرتے ہوئے گمان غالب یہی ہے کہ انھوں نے غفلت ہی سے اصلاحِ سخن حاصل کی،

فارسی میں معقول دستگاہ رکھتے تھے، غالباً ۱۲۵۵ھ میں طلسم بیضا (بوستان خیال) کا ترجمہ

ان کے سپرد ہوا، اس کام کو بیمار نے خوش اسلوبی سے انجام دیا، اور یہ داستان نثر میں موجود ہے، اسکے نظم کیے جانے کا جن تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے وہ بے بنیاد ہے، ورنہ کوئی حوالہ انتخاب یادگار میں ضرور ملتا، ان کے رام پوری شاگرد نظام ۱۲۸۹ھ میں فوت ہو چکے تھے، مگر سید احمد علی رسا زندہ تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد رام پور ہی میں زیادہ نظر آتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رامپور میں ان کے رنگ سخن نے اعتبار کا درجہ حاصل کیا، اور رام پور کی سکونت کے باعث مقامی اصحاب ہی سلسلۂ تلامذہ میں داخل ہوتے رہے، ان کے شاگردوں میں سید احمد علی رسا اور سید نظام شاہ رامپوری کو استادی کا درجہ حاصل ہے، ان دونوں شاگردوں سے رامپور اور بیرون رامپور ان کا سلسلہ جاری ہوا، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کا شمار صاحب خمخانۂ جاوید نے بیمار کے شاگردوں میں کیا ہے، تسلیم کے شاگرد راجہ کشن کمار وقار رئیس سہسپور بلاری تھے، اور نظام کے بیرونی سلسلہ میں ان کے شاگرد رشید مولوی ابوالحسن ساکت (د ۱۸۹۵ء) امروہوی سے سلسلہ چلا، میر کرامت علی خلش اجمیری، مولوی غلام نبی شاعر، میر حماد حسین شمیم امروہوی وغیرہ ساکت کے شاگرد تھے،

بیمار کے حسب ذیل شاگرد انتخاب یادگار سے درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱) سید احمد علی رسا متوفی محرم ۱۳۰۹ھ

(۲) سید نظام شاہ نظام " ۱۲۸۹ھ

(۳) صاحبزادہ اصغر علی خاں افگار (۱۲۹۰ھ) میں زندہ تھے،

(۴) صاحبزادہ امیر اللہ خاں امیر (" ")

(۵) حاتم علی خاں بیچین "

(۶) حاتم خاں تسلیم متوفی ۱۲۷۲ھ

(۷) مبارک شاہ خاں خانزادہ ۱۲۹۰ھ میں زندہ تھے،

(۸) سید محمد جعفر عرف میاں جعفر شاہ شفا (سنہ ۱۲۹۰ء) میں زندہ تھے،

(۹) مجتبیٰ خاں محو " "

(۱۰) مہدی علی خاں مہدی " "

(۱۱) سید جعفر شاہ واثق " "

(۱۲) عبد القادر خاں واقف " "

(۱۳) ہدایت علی خاں ساکت متوفی ۱۲۷۹ھ

صاحبزادہ مہدی علی خاں نجیب متوفی ۲، رمضان ۱۲۸۹ھ کو صاحب (مولف تذکرہ شعرائے اردو) نے شاگرد بیمار ظاہر کیا ہے، اور امیر مینائی انتخاب یادگار میں شاگرد ناظم لکھتے ہیں،

رسا کے بیٹے سید عابد حسین اوج کہنہ مشق شاعر تھے، اور ان کو رام پور میں مرتبۂ استادی حاصل تھا، شعرائے رام پور کی کافی تعداد نے ان سے فیض اصلاح حاصل کیا، ان کے علاوہ انتخاب یادگار میں ستائیس شاعروں کا ان کے شاگردوں کے زمرے میں حوالہ دیا گیا ہے، ساکت کے علاوہ محمد بشیر، لالہ چھیلے لال بہار، مبارک علی خاں عاشق، احمد نور خاں کمتر، حافظ شیخ محمد یعقوب یعقوب، ان کے شاگردوں میں تھے،

اسی رامپوری اسکول کا اثر تھا کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں کے شعرا غدر کے بعد اپنی اور دونوں نے اپنی اپنی انفرادیت کھوکر ایک نیا رنگ پیدا کرکے ملک میں رائج کیا، رامپوری تفصیل چاہتا ہے، مگر اس موقع پر اشارہ ہی پر اکتفا کی جاتی ہے،

رضا لائبریری رام پور میں ۱۲۷۶ھ کی ایک مکتوبہ بیاض میں ایک شعر فارسی غزل کا حسب ذیل تعا کے ساتھ ملتا ہے:-

شعر غزل صنی ہیچ مدار و من تصنیف شیخ علی بخش متخلص بہ بیمار دام مجدہٗ

زبیضۂ ہدہد سلیمان پرید زنگ رخ مسیحا　　مصور آفتاب وز ہرہ بزیر خامہ صور دارد

اب دیکھنا یہ ہے کہ بیمار نے معاصرین سے جدا راستہ اختیار کیا یا اسی پرانے راستہ پر چلتے رہے جس سے عوام و خواص سب بیزار ہو چکے تھے، اس لیے ہم ان کی لکھنوی رنگ سے ملتی جلتی ہوئی ایک غزل درج کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ آتش و ناسخ کی ہم طرح غزلیں بھی درج کی جاتی ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ بیمار نے لکھنوی رنگ میں بھی انفرادیت باقی رکھی تھی یا نہیں ؎

بیمار

تصور بندھ گیا دل پر سواد زلف جاناں کا	قیامت پر سحر ہوتا رہا اب شام ہجراں کا
شرار آہ و شور نالہ و درد دل و گریہ	سماں دکھلا رہا ہے برق و رعد و ابر باراں کا
اٹھا اس واسطے وہ جھاڑ کر دامن کہ دیکھوں تو	پہنچتا چاک دامن پر کس کس کے گریباں کا
شکست رنگ و کسر استخوان و دم کا اکھڑ جانا	بلا کیا کیا نہ لایا توڑنا اس بت کے پیماں کا
کمند زلف کے گرداب پیچوں سے بچے ہے دل	تو آکر طوق ہو جاتا ہے بالا گردن جاں کا
جو زخموں پر رفو ہوئے سے جائیں چڑھیں ٹانکے	تو بچ جاتا ہے گھاؤ خنجر و شمشیر و پیکاں کا
نہ اس جا کام بخیہ کا، نہ ٹانکوں کا نہ مرہم کا	جسے کیا خاک زخمی چشمک ابرو و مژگاں کا

ناسخ

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا	طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا
چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابر باراں میں	تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا
جنوں نے ہجر کی شب ہاتھ دوڑایا ہے جب اپنا	کیا ہے چاک تا جیب سحر اپنے گریباں کا
وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی آنکھوں میں سمایا ہے	کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا
تصور نے دکھایا زنداں میں بھی فارغ مجھے غم سے	سماں ہے خانۂ زنجیر میں بھی بزم جاناں کا

کفن کی جیب سفیدی دیکھتا ہوں کنج مرقد میں — تو عالم یاد آتا ہے شب مہتاب ہجراں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے — کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا

آتش

رواں رکھتا ہے خوں آنکھوں سے ہر اک داغ تاباں کا — شفق آلودہ رہتا ہے ہلال اپنے گریباں کا
چمک جانے سے اس کے بند ہو جاتی ہیں جو آنکھیں — یہ دھوکا برق دیتی ہے تمہارے روئے خنداں کا
خوشا حال اس کا جنوں سے جو برہنہ ہے — گریباں گیر ہے کوئی، نہ دامن گیر عریاں کا
گریباں گیر قاتل ہونگے ہم فردائے محشر کو — ہمارا محضر خوں ہے ہر اک پاٹ اپنے داماں کا
پھنسے ہیں بسکہ دل سودا زدوں کے تری زلفوں میں — ہر اک مو سے رسا پر لٹکے عالم ہے رگِ جاں کا
نشاں تیروں کا آنکھوں کی محبت نے بنایا ہے — ادھر پھر جاتے ہیں ہم رخ جدھر پھرتا ہے مژگاں کا
عدم کو بازگشت روح ہے اک روز ہستی سے — ارادہ بندہ رہا ہے مصر سے یوسف کو زنداں کا

بلندی مضامین ان کا خاص حصہ ہے، اور وہ اس میں ایسے مضامین شگفتہ اور دلفریب طرز سے ادا کرتے ہیں کہ معاصرین میں اس کی نظیر نہیں ملے گی ؎

کی نسیم صبح نے طرزِ زلیخائی پسند — یوسفِ گل چاک تیرا پیرہن ہو جائیگا
قربان جایئے ترے شوقِ ظہور کے — دے کر فریب خاک میں ہم کو ملا دیا
گر حیا سے خود فروشی کی اجازت مانگتا — وہ دو عالم ایک نظارہ کی قیمت مانگتا
انتظارِ یار میں ہوتیں اگر آنکھیں سفید — پنجۂ مژگاں ید بیضا سے بیعت مانگتا
کمد و خیالِ نرگسِ مخمور یار سے — دل خانۂ خدا نہ ہوا میکدہ ہوا
رحم اے وحشت بہت بیباک ہے وہ بدگماں — گالیاں دے گا مرا اُکھڑا ہی گریباں دیکھکر
عذاب آتش فرقت سے کانپتا تھا دل — ہزار شکر جہنم ملا سزا کے لیے

ہمصفیرو ہوش پرّاں ہیں اڑا جاتا ہے دل مائل پرواز جب سے گلستاں کا رنگ ہے

سادگی میں پرکاری بیمار کا نمایاں وصف اور ساحرانہ انداز میں عشق و محبت کا بیان ان کا خاص حصہ ہے، اور تمام تذکرہ نویس اس کے رطب اللسان نظر آتے ہیں، مومن خاں مومن اور میر حسین تسکین بھی اس کوچہ کے رہ نورد ہیں، لیکن بیمار کو اس رنگ کا خاتم کہا جا سکتا ہے، ان اشعار سے کون نہ مسحور ہوگا۔

آنکھ نیچی ہو گئی چپکے ہی دم دیتے بنی موت مانگی دل نے فرقت میں تو جی شرما گیا

اے اجل شام ہجر آپہنچی اب تجھے انتظار ہے کس کا

آپ بیمار ہم ہوئے رسوا سرنگوں راز دار ہے کس کا

رو کے ہنس پڑتا ہوں ظالم ہنس کے رو دیتا ہوں میں مہربانی پر تری دشمن کو نازاں دیکھ کر

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز بیمار کو شعور کسی بات کا نہ تھا

کوئی ان کے در تک پہنچا سلامت لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

ہر روز وہ بھر جاتے ہیں دم تک مرے آکر کچھ جذب محبت کو لگی ہے نظر ایسی

بیاں ہو عیب طبیعت یہ ہو چکا مجھ سے خدا کرے کہ نہ پوچھیں وہ مدعا مجھ سے

کیا سفر کا ارادہ جو بزم جاناں سے کوئی گلے نہ ملا موت کے سوا مجھ سے

وہی تو آنکھ ہے مرتا ہوں جس کی گردش پر یہ کس زباں سے کہوں یا پھر گیا مجھ سے

فریب یار کا شکوہ زباں پہ آ جاتا بھلا ہوا جو مرے دل نے کی دغا مجھ سے

کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

دل دھڑکتا ہے یہ کہتے ہوئے اس محفل میں یہاں کسی کو خفقاں کی بھی دوا آتی ہے

گر یہی رنگ ہے زمانے کا باز آیا میں کفر و ایماں سے

کس کی طاقت ہے کہ اس در سے اٹھے — ناتوانی کا بھروسا ہے مجھے

کھینچ پردہ پہ تصور سے شبیہ جاناں — ڈال اتنے تم وہ پرداز کہ پردا اٹھ جائے

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی — دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

دلِ مجروح میں قاتل کی ادا پھرتی ہے — رات دن سامنے آنکھوں کے قضا پھرتی ہے

خدا سے تجھ کو صنم مانگتا تو مل جاتا — مگر ادب نے اجازت نہ دی دعا کے لیے

سن کر معاملے ترے اہلِ نیاز سے — لایا جو تھا وہ بھول گئی التجا مجھے

میر نے یاس و غم کو بہم کرکے بہتر نشتر مہیا کیے ہیں، بیمار کے نشتر ملاحظہ ہوں،

قحط شاید درد الفت کی دوا کا ہو گیا — زہر جو دینا مجھے ان کو گوارا ہو گیا

اب کلیجا منھ کو آتا ہے پھٹا جاتا ہے دل — بس ہجومِ یاس دل گھبرا گیا اکتا گیا

کیا یاس کو روئیں کہ نہ تھی چشمِ تر ایسی — ہچکی نہ لگی رہتی تھی دو دو پہر ایسی

بیمار کو غفلت ہے بہت خیر نہیں آج — ہر چند کہ تھی حالتِ غش کل بھی پر ایسی

بنی ہے جی پہ دم لیٹے ترا بیمار بھرتا ہے — پر اس سختی میں بھی تیرا ہی دم لے یار بھرتا ہے

خمریات | اگرچہ خمریات کے چند ہی شعر ہیں، مگر کیفیت سے خالی نہیں،

دانت کس کا ہے جام پر ساقی — مے ٹپکتی ہے ابر نیساں سے

محتسب مے کو بتاتا ہے حرام — اس بہکنے کا اچنبھا ہے مجھے

خدا مے کشوں پر بہت مہرباں ہے — دیے ابر کے سائباں کیسے کیسے

انبوہ میکدے میں جو محشر سے کم نہیں — کیا غم ہے خم تو چشمۂ کوثر سے کم نہیں

کون دنیا سے بادہ خوار اٹھا — چشمِ تر ابرِ نو بہار اٹھا

ابر و ہوا سے آئی ابھر پھر جگر کی چوٹ — لا ساقیا شراب کہ سینکیں جگر کی چوٹ

خالص لکھنوی رنگ کے دو چار اشعار بھی ڈھونڈھے سے ان کے کلام میں مل جاتے ہیں، گو اس زمانہ میں مذاق بدل چکا تھا، لیکن سودا و میر کے دیوان بھی اس رنگ کے اشعار سے خالی نہیں ہیں مگر بیمار کی زبان کی صفائی نے ان کو بھی بامزہ بنا دیا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں،

موباف سرخ چوٹی سے کیا انکی کھل پڑا اک صاعقہ سا دل پہ مرے ناگہاں گرا

رونق رنگ مسی گر وہ دہن ہو جائیگا غنچۂ سوسن پہ گلچیں خندہ زن ہو جائیگا

گر ترا دھانی ڈوپٹہ دیکھتا او سیم تن چاندنی کا کھیت بھی بارانِ رحمت مانگتا

دل کے ڈسنے کو بن گیا ناگن نیلا ڈورہ تری کلائی کا

جوں شفق میں نظر آتی ہو کرن سورج کی نکلے وہ سرخ ڈوپٹہ پہ مسلسل ٹانکے

اب ایک عام انتخاب دیا جاتا ہے، جس سے ان کے رنگ اور طرز کلام کا اندازہ ہوگا،

کون پرساں ہے حال بسمل کا خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

جانکنی عاشقی سے آساں ہے کام مشکل ہے کاوش دل کا

لب جو کون سیر کو آیا موج منہ چومتی ہے ساحل کا

مردنی پھر گئی مرے منہ پر رنگ بدلا نہ ان کی محفل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

نصیب ہم کو ملا سنگ رہ گذر کا سا کہ ٹھوکروں میں رہا سر کا عمر بھر کا سا

میرے رونے پر نہ تجھ کو مسکرانا چاہیے شق دل پر درد اے غنچہ دہن ہو جائیگا

اللہ رے اضطراب اسیرانِ دام کا صیاد جو پیشہ نے دل کو ہلا دیا

دبتا تا جو دن جدائی کا کیا بگڑتا تری خدائی کا

مختصر تھی مگر لکھا نہ گیا حال طول شب جدائی کا

کل تھے رندی کے مجتہد بیمار   آج دعویٰ ہے پارسائی کا

درد تعظیم مرگ کو دل میں   شب فرقت ہزار بار اٹھا

بدلی نہ وہ نگاہ زمانہ بدل گیا   تیر قضا وہی ہے نشانہ بدل گیا
تقریر جس گھڑی لب مطلب تک آ گئی   بہکا یہ قصہ خواں کہ زمانہ بدل گیا
نغمہ قفس میں نالۂ بلبل نہ ہو سکا   نوحہ سے لاکھ بار ترانہ بدل گیا

قحط شاید درد الفت کی دوا کا ہو گیا   زہر جو دینا مجھے ان کو گوارا ہو گیا
کیا ہی چوکا ہوں ترا نہ عشق کہنا تھا مجھے   بت پرستی کا کس و ناکس میں چرچا ہو گیا
امتحاں ان کو لب جاں بخش کا منظور ہے   اب مجھے بھی اپنے جینے کا سہارا ہو گیا
جس کسی نے دل دیا ان کو چھپے چوری دیا   ایک میں کمبخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا
کھا گئے تھے وہ تو مجھ سے بے نقابی کی قسم   کیوں خداوندا قمر کا رنگ پھیکا ہو گیا
شک نہیں اپنے صنم کی بے نیازی میں نہیں   دل کے لینے کا خدا جانے سبب کیا ہو گیا
ہائے ری شوخی کہ آ پہنچا جو وہ گھر تک مرے   پھر گیا درباں سے یہ کہکر کہ دھوکا ہو گیا

دل سلگتا نہیں جو اے بیمار   منہ سے نکلا ترے دھواں کیسا

یہ مرا عالم ہے برہم زلف جاناں دیکھ کر   جس طرح کوئی اٹھے خواب پریشاں دیکھ کر

تری نگاہ میں ہیں ہوش و بیخودی دونوں   وہ سحر کیا ہے جو اس چشم فتنہ گر میں نہیں

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے   کیا درد دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے
کچھ کچھ سمجھ لیا ہے مگر کوئے یار کو   بے امتیاز جانتے ہیں پارسا مجھے
کہتا ہوں اضطراب میں دل سے میں حال دل   اپنا مآل کار نہیں سوجھتا مجھے
سنکر معاملے ترے اہل نیاز سے   لایا جو تھا وہ بھول گئی التجا مجھے

خواجہ عطار اور وحدت الوجود

از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی لکچرار شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی

بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آئینہ کیوں آغوش میں مہر درخشاں کو

مسلمانوں میں ایسے بزرگ بکثرت پیدا ہوئے جنھوں نے عربی و فارسی و اردو میں سرمدی ترانے گائے اور کوثر و تسنیم میں دھلی زبان اور ملکوتی لب و لہجہ میں واردات قلبیہ اور جذبات دلی ایسے جوش اور وارفتگی سے بیان کیے کہ دوسرے انسان ان کی دلی سوزش و تپش سے متاثر ہوئے، فارسی میں اگرچہ بہت سے شعرا ایسے گذرے ہیں جنھوں نے صرف تصوف و اخلاق ہی کے مضامین بیان کیے ہیں، لیکن جب سے میں نے شیخ مکیؒ کے قلمی رسالہ سے وحدت الوجود کا ٹکڑا شائع کیا ہے اس وقت سے مجھے ایسے شعراء کے کلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا جنھوں نے مسئلۂ وحدت الوجود میں ڈوب کر اشعار کہے ہوں اور اس مسئلہ کو اپنا خاص موضوع بنایا ہو، اور اسکے بیان میں شہرت و امتیاز حاصل کیا ہو، ایسے بزرگ دو ہیں، ایک خواجہ فریدالدین عطارؔ اور دوسرے مولانا جلال الدین رومیؔ۔

یوں تو فارسی شعرا میں سعدیؔ، امیر خسروؔ، خواجہ حسنؔ، خواجہ حافظ، ابوسعید ابوالخیرؔ، اوحدیؔ، سنائیؔ، عراقیؔ، مغربیؔ وغیرہ بہت سے شعراء نے عشق حقیقی کا اظہار اپنے کلام میں کیا ہے، اور اس لحاظ سے یہ سب شاعری کے مشاہیر ہیں، لیکن ہمارا مقصد وحدت الوجود کا موضوع ہے اور اس کے سب سے بڑے شارح و مبلغ یہی دونوں ہیں،

مسئلہ وحدت الوجود خود کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا، بلکہ سرے سے یہ کوئی علمی مسئلہ ہی نہ تھا، یہ تو حقیقت میں ایک وجدانی کیفیت، ایک ذوقی حالت، ایک ایمانی و روحانی احساس ہے، عارف کے قلب و نظر پر جب یہ کیفیت شدت کے ساتھ مستولی ہو جاتی ہے تو وہ "حیرت جلوہ" میں بیخود ہو کر کبھی کبھی اس کا اظہار اور اس کو الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، اول تو محسوسات کو ملفوظات میں منتقل کرنا ہی نہایت مشکل کام ہے، پھر یہ مشکل اس وقت اور بھی سخت ہو جاتی ہے جب وہ بیانات ایسے لوگوں میں پہنچ جائیں جو اس راز کے محرم اور اس شراب کے جرعہ کش نہ ہوں، آپ جوانی کی کیفیتوں اور لذتوں کو کسی بچہ کو سمجھانا چاہیں یا کسی نے پھل کا ذائقہ ایک ناواقف کو بتلانا چاہیں، تو اس کی صورت اس کے سوا کیا ہے کہ آپ تقریب فہم کے لیے کچھ تشبیہ سے کام لیجئے کہیں استعارہ کا سہارا ڈھونڈھیے، کبھی مجاز کہیے، اور اس قبیل کے ذرائع اختیار کیجئے، اور اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی اس کی کیا ضمانت ہے کہ آپ سمجھانے میں کامیاب بھی ہو گئے، اور آپ کا مافی الضمیر یعنے آپ کا مخاطب سمجھ بھی گیا، پھر اگر مخاطب منصف ہے تو وہ اس کے بعد بھی یہی کہے گا اور اسے یہی کہنا چاہیے کہ "میں ٹھیک ٹھیک تو آپ کا مفہوم نہیں سمجھ سکا، ہاں فی الجملہ ایک دھندلا سا خاکہ میرے ذہن میں آگیا ہے جسے میں "سمجھ لینا" نہیں کہہ سکتا، اور دوسروں کو سمجھا دینے کا تو وہم بھی نہیں لا سکتا"۔

ایسا ہی کچھ مسئلہ وحدت الوجود کو بھی پیش آیا، کسی عارف پر یہ کیفیت مستولی ہوئی اور وہ اس سے متاثر اور لذت یاب ہوئے تو اس محسوس لذت کو انھوں نے کبھی بیان بھی کر دیا، یہاں تک تو پھر بھی غنیمت تھا، آگے مصیبت یہ ہوئی کہ ان کے بیانات کو وہ لوگ لے اڑے جو اس نشہ سے بے خبر اور اس لذت سے ناواقف تھے، ایسی صورت میں انصاف تو یہ تھا کہ یہ لوگ ان بیانات کو دیکھنے سننے اور پڑھنے کے بعد بھی اپنے عدم فہم کا اعتراف کرتے اور اس کو "سمجھ لینے" کا دعویٰ ترک کرتے

مگر انھوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا، مگر سمجھے کچھ نہ تھے۔ اس لیے ان بیانات پر کچھ شکوک و شبہات بھی کیے اور بعض نے توسرے سے انکار ہی کر دیا، اس کے بعد جب اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی گئی تو وہ ذوقی حال، وہ وجدانی کیف اور وہ روحانی احساس ایک علمی اور استدلالی مسئلہ بن گیا اور ایک صاحب حال صوفی خانقاہ سے نکل کر مدرسہ کی قیل و قال میں جا پھنسا، پھر جب ایک "شعر" جو تصوف سے بہ مراتب کمتر بلکہ اسی اصل کی نقل اور اسی حال کے مقابلہ میں محض قال کی حیثیت رکھتا ہے، طالب علموں میں پہنچکر چیخ اٹھتا ہے کہ "مرا بمدرسہ کہ برد" تو مسئلہ وحدۃ الوجود جو تصوف کی بھی روح ہے، اور جو حسن و جمال کی طرح تحسین و آفرین (Admiration) کا تو متمنی ہے۔ لیکن فلسفیانہ عمل جراحی اور منطقیانہ لمس و بقائی کی تاب نہیں لاسکتا۔ وہ کیونکر اسے برداشت کرتا، یہ ہے اس کے مشکل بننے کی وجہ ؎

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

ہم ذیل میں تقریب فہم کے لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحریر سے اس مسئلہ کا مختصر خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں،

۱۔ صرف حق تعالیٰ کی ذات و صفات و وجود تو اصل اور حقیقی ہیں، ورنہ جملہ کائنات کا اور انسان کا وجود محض عارضی اور عطار حق ہے اور یہ وجود حق تعالیٰ کا محض ظل و سایہ ہے، ایسے وجود کو "وجود ظلی" کہتے ہیں۔

۲۔ حق تعالیٰ کے وجود کے سامنے ہم جیسے دنیادار اور بے عقل اپنے وجود کو الگ وجود، اپنی صفات یا کمال کو الگ اور مستقل صفات یا کمال مان لیں تو مان لیں ورنہ انصاف یہ ہے کہ جب نہ وجود اپنا، نہ کوئی وصف و کمال اپنا اور نہ ان کو اپنے اندر باقی رکھنا اپنے بس میں تو آخر کیا عقل کی موت نہیں ہے کہ پھر بھی اپنے وجود کو الگ وجود اور اپنے کسی وصف و کمال کو اپنا مستقل

وصف وکمال سمجھے جائیں،

۳۔ ایسی صورت میں صحیح صاحب احساس وایمان اور صاحب عقل وعدل اشخاص نے اپنے کو غیر وجود اور حق تعالیٰ کو موجود، اپنے کو لاشے محض اور حق تعالیٰ کو اصل وجود جانا اور مانا، یہی صورت وحدت الوجود کہلاتی ہے کہ وجود کو ایک ذات حق میں منحصر و محدود رکھا جائے، اسکے علاوہ کسی دوسرے کا وجود تسلیم ہی نہ کیا جائے، اپنے وجود یا کسی دوسرے وجود کا اعتبار ہی نہیں کیا جائے،

۴۔ لیکن یہ بھی عقل کی بات ہے کہ انسان بالکل معدوم تو ہے نہیں، اس کو جو وجود دیا گیا ہے وہ گو حق تعالیٰ کے مقابلہ میں ظل وسایہ کی طرح ہے، اور اس کے قوی وجود کے سامنے محض مضمحل اور ناقابل اعتبار ہے، پھر بھی کسی درجہ میں تو ہے، جسے اس کا وجود کہا جاتا ہے، اور جس کی بنا پر اس پر احکام شرع کی تکلیف اور امانت احکام کی ذمہ داری ہے اگر اس لحاظ سے اس وجود کا کچھ اعتبار کیا جائے تو اسی نظریہ کا نام " وحدت الشہود " ہے، ان دونوں نظریوں کو مختلف شعراء نے ادا کیا ہے،

نظریہ وحدت وجود | من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی   تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے   مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

نظریہ وحدت شہود | کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجاب دہر کو   توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگ صہبا دیکھتے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ نظریہ وحدت وجود بہت نازک حدود سے گھرا ہوا ہے، اس میں خطرات بہت زیادہ ہیں، جو اکابر صوفیہ اس کے قائل تھے وہ اسکے تمام حدود کی پوری پوری رعایت بھی کرتے تھے، وہ موحد کامل تھے مشرک نہ تھے، وہ نہ کسی غیر حق کو اہل حق کہتے تھے، نہ اپنے اقوال کو نا جنس بیان کرتے تھے، اس بارہ میں ان کا قول یہ تھا کہ ع   با مدعی مگوئید اسرار عشق ومستی

اس نظریہ کے سب سے بڑے مبلغ بلکہ موجد حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ ہیں، البتہ نظریۂ وحدت شہود میں خطرہ بہت کم ہے، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس میں حق تعالیٰ کی عظمت، بندہ کی شان عبدیت اور شریعت محمدیہ کا احترام سب چیزیں اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں، یہ نظریہ سنت نبوی سے بہت قریب اور فہم عوام کے لیے زیادہ موزوں ہے، اس نظریہ کے مبلغ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ ہیں، صحابہؓ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال بھی اسی نظریۂ وحدت شہود کے مطابق ملتے ہیں شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں جگنو اور بارش کے قطرے کا ذکر اسی وحدت شہود کے متعلق لکھا ہے،

امت محمدیہ میں قائلین وحدت وجود بہت سے گذرے ہیں، مگر اس کے امام تین ہیں، ایک حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ، دوسرے خواجہ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ، تیسرے مولانا جلال الدین رومیؒ اس نظریہ یعنی توحید وجودی ہیں، ان تینوں کے فرق مراتب کے متعلق ایک تمثیل بہت مشہور ہے، اگرچہ کچھ پھوہڑ ہے، مگر اس فرق کی تفہیم کے لیے بہت موزوں ہے۔ (نقل) مشہور ہے کہ کسی بزرگ سے لوگوں نے پوچھا کہ شیخ ابن العربی، خواجہ عطار اور مولانا روم تینوں ہی حضرات توحید وجودی کے دریا میں غرق نظر آتے ہیں، آخر ان تینوں میں فرق کیا ہے، فرمایا پہلے ایک مثال سنو، تین آدمی ساتھ سفر کر رہے تھے، پیاس لگی تو ایک کنوئیں پر پہنچے، وہاں ایک عورت کو پانی بھرتے دیکھا، ایک نے کہا "مائی ذرا پانی پلا دینا" دوسرے نے کہا "اے میرے باپ کی جورو ذرا پانی پلا دینا" تیسرا بولا "اے میرے باپ سے ہم بستر ہونے والی ذرا پانی پلا دینا" دیکھو تینوں آدمیوں نے ماں کی تعبیر کے لیے الگ الگ عنوان اختیار کیے، اب جو شخص تینوں تعبیروں کو سنیگا وہ یہی کہے گا کہ پہلی تعبیر نہایت شائستہ، دوسری کچھ نامناسب اور تیسری نہایت غیر مہذب ہے، بس یہی فرق ان تینوں ارباب حال بزرگوں میں بھی ہے، مائی کہنے والے شائستہ بزرگ مولانا جلال الدین رومی ہیں، جو اس شراب سے پوری طرح سرشار ہونے کے باوجود بدمست نہیں ہوتے، ضبط و احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔

اور باپ کی جورو کہنے والے حضرت خواجہ عطار ہیں جو ضبط کرنا چاہتے ہیں اور کچھ ضبط کیا بھی، مگر جذب دروں سے بے قابو ہو کر ان کی زبان سے کچھ نامناسب الفاظ بھی نکل گئے، اور تیسرے بزرگ حضرت ابن العربیؒ ہیں جو یا ان دونوں کے مقابلہ میں طبیعت کے کمزور واقع ہوئے تھے، اس لیے ضبط نہ کر سکے، یا عمداً ضبط کو خیرباد کہہ دیا، اور ننگ و نام کی بھی پروا نہ کی، ان تینوں میں مولانا رومی کے اقوال و احوال سنت رسول اور سنت صحابہ سے زیادہ قریب و مشابہ ہیں، مگر اس وقت ہمارے پیش نظر صرف خواجہ فریدالدین عطار، اور مسئلۂ وحدت وجود پر لکھنا ہے، اس لیے ہماری بحث انہی تک محدود رہیگی،

خواجہ صاحب کا ایک شعر ہے

پر شد از دوست ہر دو کون ولیک	سوئے اُو ذرہ اشارت نیست

یعنی دونوں جہاں دوست (حق تعالیٰ کے کرشموں) سے بھرا پڑا ہے، اس کے سوا یہاں کوئی ہے ہی نہیں، مگر اس ظہور اور شہود کے ساتھ غیب اور مستوری بھی اس غضب کی ہے کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کر سکتے، نعمانی نے اس کو بڑے شاعرانہ انداز میں لکھا ہے گو اسکے خیالات میں بے اعتدالی ہے،

مشکل حکایتے است کہ "ہر ذرہ عین اوست"	اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یعنی یہ عجیب مشکل ہے کہ یوں دیکھیے تو ہر ذرہ عین حق ہے (نعوذ باللہ) لیکن اس کی جانب اشارہ نہیں کیا جا سکتا، یعنی اس کو اشارہ سے نہیں بتلایا جا سکتا،

تو از دریا جدائی ویں عجب بیں	ز تو یک لحظہ ایں دریا جدا نیست

یعنی تو تو دریا سے جدا ہے اور اپنے کو جدا سمجھ رہا ہے، مگر یہ تماشا تو ذرا دیکھ کہ خود دریا تجھ سے ایک لحظہ کے لیے بھی جدا نہیں ہے، خواجہ صاحب نے اس شعر میں وحدت کے مفہوم میں اللہ معکم کے پہلو کو زور دے کر بیان کیا ہے، اس موقع پر کسی شاعر کی ایک بے مثل رباعی توحید وجودی کے مضمون کی یاد آگئی ؎

ہر نقش کہ بر لوحِ ہستی پیداست   ایں عکس کسے کہ ایں ہمہ نقش آراست
دریائے کہن چو بر زند موج نو   موجش خوانند و در حقیقت دریاست

یعنی ہستی اور وجود کے تختہ پر جو نقش بھی ظاہر ہوتا ہے وہ دراصل اسی ذات پاک کا عکس ہے جس نے یہ تمام نقشے سجائے ہیں، دریائے قدیم (ذات واجب و قدیم ہے) سے جو نئی لہر (ذات ممکن وحادث) اٹھتی ہے، اسے اگرچہ موج کہتے ہیں، مگر ہے وہ حقیقت میں دریا،

در عشق چو من تو ام تو من باش   یک پیرہن است گو دو تن باش

یعنی جب عشق کی بیخودی میں میں نے یہ درجہ پالیا کہ میری ذات ختم ہو چکی اور میں تو بن چکا تو اب تو بھی میری ذات بن جا کہ لباس تو ایک ہی ہے اگرچہ جسم دو ہوں،

دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم   نداند ہیچکس ایں سر مگر آں کو چنیں باشد

یعنی اس دریا میں (کیفیت وحدت میں) جس میں میں ہوں عجب حال ہے کہ نہ میں ہوں نہ دریا ہی ہے، اس معمے کو وہی سمجھ سکتا ہے جو اس مقام پر پہنچ چکا ہے،

یعنی یہ مسئلہ (توحید وجودی) کوئی علمی و استدلالی چیز نہیں کہ میں اسے سمجھا سکوں بلکہ یہ تو ایک ذوقی اور وجدانی، کشفی اور روحانی لذت ہے، جو اسے پائے وہی جانے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

یہاں تک تو خواجہ صاحب کے جستہ جستہ غزلیات وغیرہ سے نمونے کے طور پر وہ مثالیں دی گئی ہیں، جن میں خواجہ صاحب نے براہ راست یہ مسئلہ بیان کیا ہے، لیکن ان کا ایک مستقل قصیدہ "رائیہ" ہے، جو عام طور پر "قصیدہ در وحدۃ الوجود" کے نام سے مشہور ہے اور آگرہ یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں داخل ہے، اس کا موضوع ہی وحدت الوجود ہے، اس میں (۲۳۰) اشعار ہیں اور ہر شعر اسی رنگ میں رنگا اور اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ قصیدہ اور مثنوی میں خواجہ صاحب نے

کھل کر اپنے عقیدہ توحید وجودی کو ظاہر کیا ہے، اور خیال کا میدان وسیع تھا، اس لیے ان دونوں میں توحیدی وجودی کے مضامین کا ایک عالم نظر آتا ہے، پہلے مثنوی کے اشعار سنیے:

جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ — ہمہ در تو گم و تو در میاں نہ

یعنی اے خدا اے برحق سارا جہاں تجھ سے بھرا ہوا ہے، مگر تو اس میں محدود نہیں، ہر چیز تیرے اندر گم ہے لیکن تو بیچ میں نہیں۔ اصغر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

سارے عالم میں ہے ہنگامۂ شورش برپا — ہائے اس شوخ کا ہم شکل تمنا ہونا

خموشی تو از گویائی تست — نہانی تو از پیدائی تست

یعنی تیری خموشی تیری (غیر محدود) گویائی سے پیدا ہوئی ہے، اور تیری پوشیدگی کا سبب تیرا انتہائی ظہور ہے، اصغر مرحوم کا شعر ہے۔

وہ جلووں کی فراوانی وہ رخشانی وہ عریانی — پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

ترا با ذرہ ذرہ راہ بینم — دو عالم ثَمّ وجہ اللہ بینم

یعنی تجھے راستہ کے ہر ہر ذرہ کے ساتھ پا رہا ہوں، اور میں اس مقام پر ہوں کہ دونوں جہاں میں اینما تولوا فثم وجہ اللہ کا مشاہدہ ہو رہا ہے ؎

"جدھر رخ کرو بس ادھر ذات حق ہے"

دوئی را نیست رہ در حضرت تو — ہمہ عالم توئی و قدرت تو

یعنی تیرے حضور میں دوئی کی گنجایش نہیں، سارے جہان میں بس تو ہی تو ہے اور تیری قدرت ہے،

نکو گوئی نکو گفتہ است در ذات — کہ "التوحید اسقاط الاضافات"

یعنی ایک خوش گفتار شخص نے ذات کے بارہ میں کیا خوب کہا ہے کہ توحید تو بس اضافتوں کے ختم کر دینے کا دوسرا نام ہے،

خدا را جز خدا یک دوست کس نیست　　　　که در خورد خدا هم او ست کس نیست

یعنی خدا کا دوست بھی صرف خدا ہے، کوئی دوسرا نہیں، کیونکہ خدا کے لائق بس وہی ہے، سوا اسکی ذات کے اور کوئی نہیں ہے،

دریں معنی که من گفتم شکے نیست　　　　تو بے چشمی و عالم جز یکے نیست

یعنی یہ بات جو میں نے کہی ہے، اس میں کچھ شک وشبہہ نہیں، تمھارے آنکھ نہیں، ورنہ تم بھی کہتے کہ سارا عالم کچھ بھی نہیں، تو بس ایک ذات ہے،

اب قصیدہ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

چشم بکشا که جلوهٔ دلدار　　　　متجلی است از در و دیوار

یہ شعر قصیدہ کا مطلع ہے اور یہیں سے پورے جوش کے ساتھ دریائے وحدت میں ڈوب کر لکھتے ہیں ذرا آنکھیں کھول کر دیکھ، محبوب حقیقی کا جلوہ در و دیوار سے نمایاں ہے،

نحن اقرب الیه آمده است　　　　دور افتادهٔ تو از پندار

کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ تو خود کہہ رہا ہے کہ ہم انسان سے بہت زیادہ قریب ہیں، اب اگر تو اپنے (غلط) گمان اور پندار کے باعث دور پڑا رہے اور اپنے کو دور سمجھا کرے تو اس کا کیا علاج؛

کل شیٔ محیط می بینم　　　　آنکه می بینی اش به نقش و نگار

تم موجودات کے جو نقش و نگار دیکھ رہے ہو، مجھے ان سب کو حق تعالیٰ احاطہ کیے ہوئے نظر آرہا ہے؛ یہی مضمون حافظ شیراز کے رنگ تغزل میں ڈب کر دو آتشہ بن گیا ہے، کہتے ہیں ؎

مرا به کار جہان ہرگز التفات نبود　　　　رخ تو در نظر من چنیں خوشش آراست

مجھے اس جہان فانی سے کیا سروکار تھا، صرف تیرے جمال کی جہاں آرائی نے اس کو میری نگاہوں میں اتنا جمیل بنا دیا ہے،

اسی مضمون کو اردو کے حافظ شیراز کی زبان میں سنیئے،

یہ حسن دوست ہے اور انتہائے جانبازی تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے رحمن

خواجہ فریدالدین عطار کے قصیدے کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

او بہ پیش تو ایستادہ چو سرو سرفرو بردہ تو نرگس وار
سرمۂ گر ز نور بی تبصر در کشی در دو چشم پر زنگار
ز اندرون و برون نشیب و فراز از پس و پیش و از یمین و یسار
شاہد لا الہ الا ہو پیش تو پردہ گیر و از رخسار
ثم وجہ اللہ آیدت بہ نظر و ہو معکم نمایدت دیدار
کاروان "نفخت من روحی" بسرای تو می کشاید بار
این تماشا چو بنگری گوئی لیس فی الدار غیرہ دیار

اس قصیدے کے ۸۲ اشعار لکھنے اور حیرت جلوہ میں کھو جانے کے بعد کہتے ہیں،

می زند موج ہم درین معنی مطلع بحر مطلع الانوار
آن خروشان چو بلبلان بہار وین خموشان چو طبلۂ عطار
لیک کو غیر تا سخن گوید با خمش بر نشیند ای دلدار
خود انا الحق زد از لب منصور خود برآمد بشوق بر سر دار
رب ارنی بگوش خود خود ریخت خود بخود کرد حسرت دیدار
باز خود گفت لن ترانی را ہر چہ؟ بہر گرمی بازار
ناظر خود خود است خود منظور خود تماشا و خود تماشاکار
عاشق خود خود است و خود معشوق خود طبیب خود است خود بیمار

ازبرائے فریب خود خود گشت | جلوہ در قد و در قدم رفتار
تاب در زلف و وسمہ بر ابرو | سرمہ در چشم و غازہ بر رخسار
رنگ در آب و تاب در یاقوت | بوے در مشک و مشک در تاتار
خود بود طوطی و خود آئینہ | خود بود پیش آئینہ آئینہ دار
حمد خود از زبان می گوید | تاکہ بر خود بود پذیرفتار
من نیم او خود است قافیہ سنج | من نیم او خود است در گفتار
ہست آں یک حیات صرف تمام | بر ہمہ خیر و شر خودش دوّار

اس کے بعد ایک مختصر سی حکایت لکھی ہے، ابتک تو صرف خود اپنی سرمستی کا اظہار تھا، اب دو اور بزرگوں کی سرمستی کا پردہ فاش کرتے ہیں،

روز آدینہ بر سر منبر | گشت شبلی برائے خطبہ سوار
کرد توحید ایزدی آغاز | کہ یک است او چہ صد چہ ہزار
مگر آنجا جنید حاضر بود | گفت اے پاک باز نادرہ کار
آنچہ من با تو گفتہ ام بہ نہفت | تو عیانش ہمی کنی اظہار
گفت ہیہات اے یگانۂ عصر | سخن شر کانہ را بگذار
من ہمی گویم و ہمی شنوم | نیست کس غیر من بہ ہر دو دیار

یہ قصیدہ و آخر تک اسی جوش و سرمستی سے ایسا لبریز ہے کہ انتخاب دشوار ہے، اس لیے خواجہ صاحب کی ایک رباعی پر جو میں نے اپنے استاد مولانا محمد شریف صاحب سے سنی تھی مضمون ختم کیا جاتا ہے، اس رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب آخر عمر میں وحدت الوجود سے رفیع تر مقام پر پہنچ گئے تھے، اور حضرات صحابہؓ اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں عبدیت تک کے رمز

آشنا ہو گئے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں،

یک چند خدا از خود جدا دانستم　　چندے ہم خویش را خدا دانستم
عطار! از فیض شیخ رستہ رفتہ　　بندہ بندہ خدا خدا دانستم

خواجہ صاحب پر جب ایک زمانہ میں وحدت وجود کا عالم طاری تھا تو اس عالم میں ان کی زبان سے یہ نعرہ بلند ہوا تھا.

من نیم او خود است قافیہ سنج　　من نیم او خود است در گفتار

پھر عبدیت کا عالم طاری ہوا تو اس حقیقت کا اعتراف کیا، ؎

بندہ بندہ خدا خدا دانستم

عبدیت و بندگی کا مقام وہ بلند مقام ہے کہ خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقام پر فائز تھے، اور یہی آپ کا فخر تھا، علامہ اقبال نے اس مقام کی عظمت کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے،

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

اطلاع

پاکستان کے خریداران معارف سے گذارش ہے کہ وہ معارف کی سالانہ قیمت مکتبۂ الشرق، آرام باغ، کراچی کے پتہ پر بھیجدیں۔

منیجر

آثار علمیہ و تاریخیہ

مکتوب سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین میں حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے مکاتیب اور ان کے نام ہندوستان اور بیرون ہند کے بہت سے علما و مشاہیر کے خطوط محفوظ ہیں، ان میں سے اہم علمی و تاریخی خطوط کو وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا، اس سلسلہ میں ان کا ایک تاریخی خط جو ان کے ایک عزیز سید عبد الحکیم صاحب دسنوی کے نام ہے، شائع کیا جاتا ہے، اس میں جس ایڈریس اور وفد کی طرف اشارہ ہے، اس سے مراد وہ وفد ہے جو خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بارہ میں مسلمانوں کے جذبات اور مطالبات پیش کرنے کے لیے وایسرائے سے ملا تھا،

شبلی منزل، اعظم گڈھ

جناب مکرم السلام علیکم

میں پرسوں شب کو دلی سے واپس آیا، آپ کے پے درپے دو کارڈ ملے، حالات سے واقفیت ہوئی، جانے سے پہلے حسب وعدہ صر نہ بھیج سکا، یعنی جاتے وقت بھیجنا یاد نہیں رہا، کل سفر حسب الطلب بھیجدیے ہیں، پہنچیں گے،

میں شب کو خط لکھ کر دوسرے دن براہ کانپور دلی روانہ ہوگیا، اور ۱۷ کی شب کو وہاں پہنچ گیا، وہاں معلوم ہوا کہ جس مقصد کے لیے دعا و اکر کے وہاں آنا ہوا، اس کی تاریخ ۱۷ کے بجائے ۱۹

مقرر ہوئی ہے۔ وفد کے تمام ممبر پہنچ چکے تھے، اکثر حالات تو اخبارات سے معلوم ہو چکے ہوں گے، میں آپ کو زیر پردہ باتیں لکھنا چاہتا ہوں، ۱۷ کا دن تو ملنے جلنے میں صرف ہوا، ۱۸ کو ممبروں کا اجتماع ہوا کر ایڈریس کا مضمون سن لیں، سنکر سب نے پسند کیا، لیکن گاندھی جی نے نازک بات کہی کہ یہ تمام ایڈریس جذبات اور خطابت کے رنگ میں ہے، واقعات کی صورت میں نہیں ہے، تم دفعہ وار اپنے مطالبات مانگو اور بالتصریح ان کو شمار کرادو، اس پر اختلافات ہوئے، آخر گاندھی جی کی ترمیم منظور ہوئی لیکن دوسرے نے یہ اضافہ نامنظور کیا، اس کے بعد مشاورت کے مختلف مخفی اور ظاہر، خاص اور عام جلسے ہوئے، میں سب میں شریک رہا، لیکن ہر قدم پر یہ نظر آتا تھا کہ ہمارے علماء ابھی حقیقت سے منزلوں دور، اتحاد مقصد کے لیے اختلاف سے قطع نظر کرنا، ان کی فطرت سے بعید، ہمارے جدید رہنما ابھی میدان سیاست میں طفل نوخیز، باتوں اور ولولوں کے دھنی، لیکن پختہ مغزی، حقیقت شناسی اور حکمت عملی سے تہی، ہندو لیڈر اب پیرانہ سال، کہنہ مشق اور تجربہ کار ہو چکے ہیں، انکی بات بات سے ہوشمندی ٹپکتی ہے، بیچارہ گاندھی ہمارے ارباب عمائم کے مناظروں اور سرخ ٹوپیوں والوں کے ہنگاموں سے گھبرا گھبرا اٹھتا تھا، علماء میں مولانا ابوالکلام اور رہنماؤں میں حاذق الملک، متانت، سنجیدگی خیال اور اصابت فکر میں ممتاز نظر آئے، مولانا عبدالباری کا بار بار تند و تیز ہونا بڑا قہر تھا۔ سوا بار بار رائے بدلنے اور مشتعل الطبع ہونے کے اس شخص میں اور بہت سی خوبیاں ہیں، متواضع، خاکسار، ترفع پسند نہیں، ہر شخص کی رائے قبول کرنے کو تیار، مخلص، صداقت شعار۔

حسرت آئے تو گاندھی جی کے سامنے بلند آواز سے میں نے کہا جس میں وہ بھی سنیں کہ "یہ ہمارا گاندھی" ہے، لیکن چھوٹا گاندھی ہے، گاندھی جی مسکرائے اور فرمایا کہ "بڑا گاندھی میں ہی ہوں"، اس دفعہ ان سے ذرا کھل کے باتیں ہوئیں، کہنے لگے میں آپ کے بڑے بڑے مولویوں سے مل چکا ہوں میں نے کہا آپ پرانے مولویوں سے ملے ہیں، ابھی نئے مولویوں سے نہیں ملے، بولے اب ان سے

بھی لوں گا، ویریک سادگی، کفایت شعاری اور استقلال و روحانیت کا وعظ کرتے رہے، میں نے پوچھا کہ فرمایئے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو گذشتہ عہد میں کس نے ملایا تھا، بولے میں نہیں جانتا، میں نے عرض کی یوگ اور تصوف نے، فقہا اور پنڈتوں نے نہیں، اب پھر یہی روحانیت ہی انکو ملا سکتی ہے۔

صبح کو خواجہ حسن نظامی صاحب ان سے ملنے گئے، وہ آکر مجھ سے کہتے تھے کہ گاندھی جی کہتے تھے کہ "ان مولویوں میں یہ ندوی ہوشیار ہے" ——— وسیرائے کے ہاں وفد گیا، جواب سنا، تعارف ہوا، مصافحہ ہوا، زرنگار فرش، مطلا کرسی، تیغ بکف سارجنٹ، زریں کمر غلام، سب کچھ نظروں کے سامنے تھا، مگر کسی رکن پر ایک ذرہ رعب ہیبت کا اثر نہ پڑا، اللہ رے انقلاب!

وفد کو بڑی بڑی دعوتیں اور پارٹیاں دی گئیں، ان میں سے ایک میں شیخ بحرین کو دیکھا، فصیح عربی بولتا تھا، اوائل فروری میں وفد انگلستان جائے گا، پانچ آدمیوں کی اجازت لی گئی ہے، ان میں سے ایک خاکسار بھی ہے، اگر موقع مل سکا تو جانے سے پہلے ایک دن کیلیے حاضر ہوں گا، دیکھیے مسلمانوں کا حشر کیا ہو، حوصلہ افزا منظر کی تلاش ہے اور وہ عنقا، ولایت جانے کیلیے پابرکاب ہوں، مگر دل امیدوں سے ناآشنا ہیں، ولایت کے مطابق میرے پاس سامان نہیں، بمبئی میں حاصل کیا جائے گا، ۲۵ جنوری کو تار آگیا کہ ۲۹ کو لکھنؤ آؤ، یکم فروری کو بمبئی سے روانگی ہے، افسوس کہ نہیں آسکتا۔ اللہ حافظ!

والسلام

سید سلیمان

۲۴ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء

ادبیات

"مقام مسلم"

(بہ تتبع حضرت رومی و اقبال علیہما الرحمۃ)

از جناب مولوی محمد سراج الحق صاحب مچھلی شہری

ہاں! یکے دریاب قدرِ خویشتن | گر نمی دانی، بیا، بشنو ز من
تو ادب آموز اقوامِ جہاں | تو بہ اخلاقی امامِ امتاں
نعرہ زن لوتھر ز کیفِ دینِ تو | نانک آہن بند از آئینِ تو
معترف افرنگیاں فیضِ ترا | در فنِ الجبر و طب و کیمیا
آریہ در نقلِ تو توحید مست | برہمو از فیضِ تو تقلید مست
تو امامِ جملہ عالم بودۂ | ہاں! بیا آور سرِ کیواں سودۂ!!
اشرف المخلوق، می دانی کہ کیست؟ | معنی آں جز بہ مسلم ہیچ نیست
"نائبِ حق" اندریں عالم توئی | بہتریں ذریتِ آدم توئی
چوں بسے اولادِ آدم جاہل است | ذاتِ تو "مقصودِ انی جاعل" است
تو امین استی دُرِ توحید را | ناقد استی تو زرِ توحید را
وارثِ فردوس در عالم توئی | خلفِ صدقِ نوح و ہم آدم توئی

تو بہ تعلیمات این انبیاء
تو گواہِ انبیاءؑ روزِ جزا

پایۂ خود حیف نشناسی ہمی
تو ز ابراہیمؑ و احمدؐ نسلی

رحمۃٌ للعالمین را امتی
در طفیلش خود جہاں را رحمتی!!

"خیرِ امت اخرجت" در شانِ تو
"ختمِ امت" زینتِ ایوانِ تو

تو مسلمانی و معبودت یکے
کافرے معبودی دارد بسے

"عبدِ مومن" بہتر از مشرک بود
دیں عقیدہ (غیر ازیں) ہلک بود

از بریّۃ تو بہیں، او بدتریں
زاغِ او شہبازِ تو سدرہ نشیں

تو بہ اخلاقِ حسن، خوفِ خدا
از ملائک بہتری و از سما

در سیہ کاری و ایمانت بہ دل
ہمچو یاقوتی کہ آلودہ بہ گل

مردِ مشرک با عملہائے حسن
لاشِ قحبہ زن بہ دیبائی کفن

ایں جہاں قائم بہ ذکر اللہ تو
ظلمتش روشن ز نورِ ماہِ تو

تو بہ طوفِ "کعبۃ البیت الحرام"
ہاں! توئی "للناس و العالم قیام"

عظمتِ اسباط را خازن تولیٰ
اکنوں "اخترنا علی علم" تولیٰ

"اصطفینا من عباد" شانِ تو
لا الٰہ غیرہ ایمانِ تو

تو بہ شب نجمی و در روزے چو مہر
می درخشی بہرِ عالم بر سپہر

منصبت تبلیغ و ارشادِ جہاں
راہ بنما خلق را سوئے جناں

مردمِ ناخواندہ را تعلیم کن
بہرِ عقبیٰ خیر را تقدیم کن

تو بہ قیسِ ایں زماں لیلاستی
تو بہ خلدِ ایں جہاں حوراستی

گر جہاں خاتم نگیں در وے توئی
گر جہاں سم انگبیں در وے توئی

مطبوعات جدیدہ

زجاجۃ المصابیح | مولفہ جناب مولانا سید عبد اللہ شاہ صاحب حیدر آبادی تقطیع
حصہ اول و دوم | بڑی ضخامت ۵۹۰ و ۶۰۹ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر

قیمت فی جلد چھ روپے، پتہ مولف حسینی علم جوبلی پوسٹ آفس نمبر ۳ حیدر آباد دکن،

حضرت امام ابو حنیفہ اور ان کی فقہ پر یہ بہت پرانا اعتراض ہے کہ امام صاحب احادیث نبوگی کے مقابلہ میں قیاس ورائے کو ترجیح دیتے تھے، اور فقہ حنفی کی بنیاد حدیث و سنت سے زیادہ قیاس پر ہے، مگر ہر زمانہ میں اس کے اتنے جوابات دیے جا چکے ہیں کہ اب اس اعتراض کی کوئی وقعت باقی نہیں رہ گئی ہے، خود ہندستان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حدیث و سنت سے فقہ حنفی کی تائید میں "اعلاء السنن" کے نام سے دس بارہ جلدوں میں ایک کتاب مرتب کرائی ہے جس میں فقہ حنفی کے ہر مسئلہ کے متعلق حدیث و سنت کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے، اور حاشیہ میں اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے، اب مولانا سید عبد اللہ شاہ صاحب نے جو عالم دین ہونے کے ساتھ ایک صاحب باطن بزرگ بھی ہیں، اسی نقطۂ نظر سے مشکوٰۃ المصابیح کے طرز پر زجاجۃ المصابیح چار جلدوں میں تالیف فرمائی ہے اس کے ابواب کی ترتیب فقہی ہے، اور ہر باب سے متعلق حنفی مسائل کی تائید میں احادیث و سنن اور اقوال و آثار صحابہ و تابعین کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے، اسی کے ساتھ ان مسائل کے متعلق حاشیہ میں آیات قرآنی بھی لکھ دی گئی ہیں، جن مسائل میں ائمہ احناف کے اقوال مختلف ہیں، ان میں مفتیٰ بہ قول اختیار کیا گیا ہے، اور اس کی مؤید احادیث نقل کر دی گئی ہیں، فقہ حنفی کے جن مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے ان کا مدلل جواب بھی دیا گیا ہے، اور ان سے متعلق احادیث

کے مفہوم کی توضیح اور تعیین کرکے حنفی مسلک کی وضاحت کی گئی ہے، اور حسب ضرورت حنفی کتابوں کے حوالہ سے مسائل کا بھی جا بجا اندراج کیا گیا ہے، اور ان سے متعلق حدیثیں بھی نقل کر دی گئی ہیں، اسکے علاوہ بعض اور خصوصیات بھی جن کا اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ان خصوصیات نے اس کتاب کا افادہ اور زیادہ بڑھا دیا ہے، حضرت مولف نے یہ کتاب مرتب کرکے فقہ حنفی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے،

مشاہیر اسلام۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۳۵۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، مجلد، قیمت پانچ روپے، پتہ: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نمبر ۳۰۔ نیو کراچی، کواپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی۔

ڈاکٹر حسن ابراہیم، استاذ شعبۂ تاریخ فواد یونیورسٹی مصر کے مشہور صاحب قلم ہیں، اسلامی تاریخ پر انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں، ان کی بعض کتابوں کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے صدر فضل الرحمن صاحب کی فرمایش پر انھوں نے اسکول اور کالج کے طلبہ کے لیے مشاہیر اسلام پر ایک کتاب "اعلام الاسلام" کے نام سے لکھی تھی، اور اس کا اصل مسودہ سوسائٹی کے حوالہ کر دیا تھا، مشاہیر اسلام اسی کا اردو ترجمہ ہے، اس میں ایسے انتیس ۲۹ اکابر اسلام کے مختصر حالات ہیں جو علم و فضل، زہد و تقویٰ، شجاعت و شہامت، تدبیر و سیاست، کشور کشائی و جہانبانی اور سیاسی و تمدنی کارناموں وغیرہ مختلف اوصاف و کمالات میں نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں خلفاے راشدین کے علاوہ انیس ایسے اکابر صحابہ اور اموی خلفا حضرت امیر معاویہ، عبد الملک، ولید، حضرت عمر بن عبد العزیز، عبد الرحمن الداخل اور مشہور اموی سپہ سالار طارق بن زیاد فاتح اندلس کے حالات ہیں، جن کے کارنامے زندگی کے مختلف شعبوں میں اسوۂ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور طلبہ ان سے سبق حاصل کر سکتے ہیں، اس مقصد کے لیے یہ کتاب مفید ہے، مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، اردو میں

اس سے کہیں زیادہ ناموران اسلام کے مفصل حالات لکھے جا چکے ہیں، تنہا دار المصنفین کی سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام میں اس سے زیادہ حالات مل جائیں گے، مصنف چونکہ نئے تعلیم یافتہ ہیں اس لیے کہیں کہیں ان کے قلم سے قابلِ اعتراض باتیں بھی نکل گئی ہیں، لائق مترجم نے حاشیہ میں اس کی تنقید و تصحیح اور کہیں کہیں مصنف کے اجمالی بیان کی تشریح کردی ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے۔

یادِ رفتگان۔ از مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰۵ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہشت روپیہ (؟)، پتہ: مکتبۃ الشرق، آرام باغ، کراچی

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ ایک درد مند دل اور قدر شناس نگاہ رکھتے تھے، جہاں بھی کمال نظر آتا تھا اس کی قدر کرتے تھے، اور اپنے معاصرین کے کمالات کے اعتراف میں بڑے فیاض تھے، چنانچہ ان کے زمانہ میں جو اکابر اور اصحاب کمال اٹھتے تھے، شذرات میں ان کا ماتم کرتے تھے، اور جن سے زیادہ ربط و تعلق ہوتا تھا "وفیات" کے عنوان سے اس کے مستقل حالات لکھتے تھے، اور اس میں کسی جماعت اور کسی طبقہ کی تخصیص نہ تھی، بلکہ مسلم و غیر مسلم کا امتیاز بھی نہ تھا، انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور یورپین فضلا و اکابر کا بھی ماتم اور ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے، اور اس میں علماء، فضلاء، مشائخ و صوفیہ، مصنفین و اہل قلم، شعراء، و ادباء، سیاسی قائدین و رہنما ہر طبقہ کے اکابر ہیں، اس لیے ان کے اس قسم کے شذرات اور وفیات اس دور کے اکابر و مشاہیر کا تذکرہ بن گئے ہیں، اور اس سے ان کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے بہت سے تاریخی واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ان مضامین کو مرتب کر لیا تھا جن کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، اس میں ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک کے مختلف طبقوں کے ۱۴۵ اصحاب علم و کمال کی موت پر جذبات و تاثرات اور ان کے مختصر مفصل حالات ہیں اور متوفی کے کمالات اور کارناموں کے سلسلہ میں مختلف علمی و مذہبی، قومی و سیاسی حالات اور تاریخی واقعات

آگئے ہیں جس سے ہندوستان کی گذشتہ تیس پنیتس سال کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے یہ مضامین مصنف کے علمی مضامین کی طرح اپنے متنوع معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہیں،

حیات ز، خ، ش - مولفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ؎ مرتبہ مہتمم مطبوعات مسعود منزل، حمایت نگر، حیدرآباد

ز، خ، ش، یعنی زاہدہ خاتون شروانیہ کا نام نئی نسل کے لیے نامانوس ہوگا، مگر وہ بیسویں صدی کے ربع اول کی علمی و ادبی دنیا کی بڑی نامور خاتون تھیں، نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم کی صاحبزادی تھیں، انھوں نے پوری تعلیم گھر کی چار دیواری کے اندر حاصل کی تھی، اور عربی کی متوسط اور اردو و فارسی میں ایسی اعلیٰ درجہ کی استعداد بہم پہنچائی تھی کہ اس دور تعلیم و ترقی کی کوئی خاتون بھی ان علوم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ اپنے زمانہ کی نامور شاعرہ تھیں، اس زمانہ کا کوئی ادبی رسالہ ان کے کلام سے خالی نہیں ہوتا تھا، اور انکو ہر صنف سخن میں اتنی قدرت حاصل تھی کہ اس زمانہ کے مرد شعراء میں بھی چند ہی ان کے ٹکر کے تھے، نظمیں زیادہ کہتی تھیں، ان کے کلام کا مجموعہ فردوس تخیل کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ فارسی میں بھی خاصہ کہہ لیتی تھیں کبھی کبھی مضامین بھی لکھتی تھیں لیکن ان کے کمال کا اصل میدان شاعری تھا، اس نامور شاعرہ نے عین عالم شباب میں کل ۲۰ سال کی عمر میں انتقال کیا، اتنی عمر میں انھوں نے جو ادبی ذخیرہ چھوڑا ہے وہ ان کی ادبی منزلت کے ثبوت کے لیے کافی ہے، اب ان کی پھوپھی زاد بہن بیگم ہارون خاں شروانی نے انکی سوانح عمری لکھی ہے، اس میں شروانی خاندان کی مختصر تاریخ اور زاہدہ خاتون کے سوانح اور انکے علمی و ادبی کمالات اور اخلاقی خصوصیات و فضائل وغیرہ کی تفصیل ہے، یہ سوانحعمری اس حیثیت سے نئی تعلیم یافتہ خواتین کے لیے سبق آموز ہے کہ ایک مسلمان عورت پردہ میں رہ کر اور اسلامی تہذیب و شرافت کو قائم رکھ کر بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔

نقوش شخصیات نمبر - مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۸۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت

وطباعت بہتر قیمت ہے پتہ: ادارہ فروغ اردو نمبرا مال روڈ، لاہور

ادبی رسالوں کے خاص نمبر آئے دن نکلتے رہتے ہیں، مگر ان میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کا فائدہ مستقل اور پائدار ہو، عموماً ان میں وقتی تفریح کا سامان ہوتا ہے، اور وہ ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد بےکار ہو جاتے ہیں، مگر نقوش کا یہ نمبر ایک مستقل ادبی تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں سرسید احمد خاں کے عہد سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے ۲۸ اصحاب علم و قلم ادیبوں مصنفوں اور چند شعرا کے حالات جمع کیے گئے ہیں، جن میں ان کے سوانح کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کارناموں اور دوسری خصوصیات کا بھی ذکر ہے، اس طرح یہ نمبر انیسویں صدی کے آخر سے لیکر بیسویں صدی کے وسط تک کے ادیبوں اور مصنفوں کا تذکرہ ہے، جو ہمیشہ کام دے گا، اور اس سے آئندہ اردو زبان و ادب کی تاریخ لکھنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، لائق مرتب نے یہ نمبر نکال کر ایک مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے، مگر اس میں کچھ خامیاں اور فروگذاشتیں بھی ہیں، بعض فروگذاشتیں ۔ ۔ ۔ تو مجبوری کی ہیں جن کا اعتراف مرتب نے خود کیا ہے، مثلاً اس نمبر میں متعدد اہم شخصیتیں مناسب مضامین نہ ملنے یا دیر میں موصول ہونے کی وجہ سے چھوٹ گئی ہیں جن کی تلافی کا آیندہ وعدہ کیا گیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ تمام اہم اور قابل ذکر شخصیتوں پر اچھے مضامین کا فراہم کرنا آسان نہیں ہے، اور ایک ساتھ سب کی اشاعت بھی دشوار تھی، اسلیے نقوش کی یہ کامیابی بھی معمولی نہیں ہے، مگر بعض اکابر مصنفین کے حالات حاصل کرنے کی نقوش نے کوشش بھی نہیں کی، مثلاً مولانا عبد السلام صاحب ندوی جن کی شعر الہند نے کتنے لوگوں کو ادیب و ناقد بنا دیا، یہ صرف ایک مثال ہے، ممکن ہے ایسی اور مثالیں بھی ہوں، شعرا میں صرف چند کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اسی درجہ کے دوسرے شعرا چھوٹ گئے ہیں، اس کے مقابلہ میں بعض ایسے نوآموز افسانہ نگاروں کا تذکرہ ہے جو کسی حیثیت سے بھی ادیبوں کے زمرہ میں نہیں آسکتے، اور محفل میں ٹاٹ کا پیوند ذوق پر گراں گذرتا ہے، ممکن ہے یہ ذوق اور نقطۂ نظر کے اختلاف کا نتیجہ ہو، مگر ان خفیف فروگذاشتوں سے اس نمبر کی خوبی اور فوائد میں فرق نہیں آتا اور لائق اڈیٹر نے اس کو

نکال کر ایک بڑی علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے،

چراغ راہ مسعود عالم ندوی نمبر - مرتبہ جناب نعیم صدیقی، تقطیع بڑی، ضخامت ۰۰ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت: دو روپے، پتہ: مکتبہ چراغ راہ، کراچی

مسعود عالم مرحوم ندوہ کے لائق ترین فرزند اور ہماری جماعت کے گوہر شب چراغ تھے، مگر افسوس یہ چراغ اپنی روشنی پھیلا کر کل ۴۴ سال کی عمر میں خاموش ہو گیا "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود" مگر انھوں نے اس عمر میں جس قدر علمی و دینی کام انجام دیے وہ بہت سی بڑی بڑی عمر والوں کیلیے باعث رشک ہیں، ان کے علمی کمالات اور دینی کارناموں سے اصحاب علم واقف ہیں، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ان میں مسلمانوں کی دینی تجدید و اصلاح کا جذبہ شروع سے تھا، اور اس کے لیے وہ برابر قلمی جد و جہد کرتے رہے، اسی جذبہ کے ماتحت وہ جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے اور اس کے دار العروبہ کے ناظم تھے، ان کی عربیت کی وجہ سے اسلامی ممالک میں جماعت اسلامی کے تعارف میں بڑی مدد ملی، انھوں نے اس تحریک پر عربی اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے، اس کی تبلیغ کے لیے عراق و عرب وغیرہ کا سفر کیا، جماعت اسلامی کی چند اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء کی تاریخ اور جماعت اسلامی کے مقاصد اور کاموں پر "نظرۃ اجمالیہ فی الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند والپاکستان" کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھی، غرض وہ جماعت اسلامی کے رکن رکین تھے، اس لیے اس کے رسالہ چراغ راہ نے ان کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، اس میں ان کے سوانح، ان کے علمی کمالات، دینی خدمات، اخلاق و سیرت وغیرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان کے احباب، تلامذہ، رفقائے جماعت اور دوسرے اصحاب علم کے مضامین اور ان کی موت پر دنیائے اسلام کے متعدد علماء و اکابر کے تاثرات جمع کر دیے گئے ہیں، جس سے صاحب یادگار کے کارناموں کا اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے، قریب قریب سبھی مضامین ان کی زندگی کے کسی نہ کسی رخ کو نمایاں کرتے ہیں، لیکن ان میں ان کے رفقائے

مولانا سید ابوالحسن علی، مولانا محمد ناظم، ان کے تلامذہ محمد عاصم صاحب، سید مظفر شاہ اور محمد کاظم سابق کے مضامین خصوصیت کے ساتھ زیادہ بہتر ہیں، مرحوم کی وفات پر چند نظمیں بھی ہیں، چراغ راہ نے یہ نمبر نکال کر نہ صرف اپنے ایک ممتاز رفیق کا حق ادا کیا ہے، بلکہ ایک ایسے مجاہد کے حالات جمع کر دیے ہیں جس کی زندگی دوسروں کے لیے سبق آموز ہے،

البلاغ تعلیمی نمبر مرتبہ جناب محی الدین صاحب منیری تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۴ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ستے، پتہ: دفتر انجمن خدام النبی صابو صدیق، مسافر خانہ کرناک روڈ، بمبئی نمبر ۱۔

انجمن خدام النبی کے ماہانہ رسالے البلاغ نے جمعیۃ العلماء کے دینی و تعلیمی کنونشن منعقدہ بمبئی کی یادگار میں اپنا تعلیمی نمبر نکالا ہے، اس میں دینی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر مشاہیر علماء کے خیالات، مختلف علمی و دینی موضوعوں پر اصحاب علم و قلم کے مضامین اور اس دور کے بعض نامور متوفی علماء اور ہندوستان کی دینی درسگاہوں کے حالات جمع کر دیے ہیں، اس طرح اس نمبر میں دینی تعلیم، اس کے حامیین اور اس کے مرکزوں اور مختلف پہلوؤں پر معلومات کا نہایت مفید ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، خصوصاً دینی مدارس کے حالات بہت مفید ہیں، اور آئندہ لکھنے والوں کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوں گے، مضمون نگاروں میں مولانا حسین احمد صاحب، مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا حفظ الرحمن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اور بہت سے علماء اور اصحاب علم کے مضامین ہیں، البلاغ نے یہ نمبر نکال کر ایک مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے،

" م "

[illegible]

بزم تیموریہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم دوستی سے متعلق یہ پہلی کتاب بزم تیموریہ کے نام سے شائع ہوئی تھی جو اب بہت کچھ اضافوں کے ساتھ [illegible] تیموریہ [illegible] کے دور کے [illegible] مشائخ، اطبا و شعراء کے حالات بھی [illegible] سلسلہ [illegible] گیا ہے [illegible] انہوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے اور [illegible] جنگ [illegible] کی داستان [illegible] لکھی گئی ہو، لیکن انہوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی [illegible] اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بابر [illegible] [illegible] امیر خسرو اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا گیا [illegible] ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی [illegible] مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن [illegible]

مآل و مشیت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی [illegible] مآل و مشیت کی فلسفیانہ [illegible] ایک [illegible] اس کے بعد [illegible] موضوع پر [illegible] دو فقروں میں پیش کیا گیا ہے [illegible] پوری بحث [illegible] (صاحبزادہ [illegible] صاحب مترجم [illegible])

قیمت [illegible]

(طابع و ناشر [illegible])

سلیمان نمبر

معارف

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف اعظم گڑھ

جلد ۷۵ ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۵ء عدد ۵

فہرست مضامین

معارف خاص نمبر

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۱ - ۲

سیرت و سوانح

(۱) سوانح حیات — سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے — ۱

(۲) بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات — مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی — ۴۷

(۳) اخلاق و سیرت کے کچھ جلوے — سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے — ۵۰

فضائل و کمالات

(۴) سیرۃ السید کے کچھ انمول سبق — جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی — ۶۹

(۵) گنج گرانمایہ — پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی — ۱۱۰

(۶) استاذ مرحوم — مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم — ۱۳۲

(۷) مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں — مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے — ۱۵۰

علمی و دینی کارنامے

(۸) حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی و علمی خدمات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۱۶۳

(۹) تاریخ ارض القرآن — جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی — ۲۱۵

(۱۰) نقوش سلیمانی — جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی — ۲۲۹

(۱۱) بعض اہم علمی کام — مولانا محمد اویس صاحب ندوی استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء — ۲۴۵

(۱۲) تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب — مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین — ۲۵۲

سلوک و تصوف

(۱۳) سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو	جناب غلام محمد صاحب بی اے حیدرآبادی	۲۰۴
(۱۴) حضرت کا سلوک و تصوف	مولانا سید عبدالرؤف صاحب دزنگ آبادی	۳۰۷
(۱۵) حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام درسلوک و تصوف میں ان کا مقام	جناب سید حسین صاحب ڈپٹی کمشنر ریلی ڈویژن	۳۲۲

متفرق مضامین

(۱۶) ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم اور اُن کا تشخص	ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی صدر شعبۂ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی	۳۳۹
(۱۷) سفرِ حجاز کے تاثرات	جناب پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی	۳۴۴
(۱۸) علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم	جناب مالک رام صاحب ایم اے	۳۵۵
(۱۹) علالت اور وفات	جناب سید ابو عاصم صاحب ایم اے ایڈوکیٹ کراچی	۳۶۳
ہندوستان و پاکستان میں ماتم		۳۹۰

قطعات و تاریخی مادے

قطعات اور تاریخی مادے	جناب قاضی معراج الدین صاحب دھولپوری	۳۹۸
قطعۂ تاریخ	جناب قاضی فتح محمد فاتح بی اے منشی فاضل بھکر	۴۰۰
یادِ سیدؒ	جناب یحییٰ اعظمی	۴۰۱
صدا آہ	جناب حکیم سید مصلح الدین صاحب کاظمی	۴۰۳
قطعۂ تاریخ	جناب سید شاہ منظور الرحمٰن صاحب اختر کاکوی	۴۰۴
آہ سید سلیمان ندوی	جناب فانی مرادآبادی	//
تاریخِ وفات حسرت آیات علامہ سید سلیمان ندوی	جناب مشتاق راندیری	۴۰۵
قطعۂ تاریخ و تاریخی مادے	جناب سید مہدی حسن	۴۰۶
ہجری و عیسوی تاریخی مادے	جناب نسیم دہلوی	۴۰۷
قطعۂ تاریخ	جناب عطاء الرحمٰن پالوی	//
قطعۂ تاریخِ ارتحال	جناب اصطفا خاں صاحب لکھنوی	۴۰۸

شذرات

حضرۃ الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے چند ہی مہینوں بعد سے سلیمان نمبر کی تیاری شروع کر دی گئی تھی، مگر مضامین کے حصول میں اتنی تاخیر ہوئی جس کا پہلے تصور بھی نہ تھا، اور خیال یہ تھا کہ خواہ کچھ دیر ہو جائے مگر اس نمبر کو حتی الامکان مکمل ہونا چاہیئے اس لئے اسکی اشاعت میں اندازہ سے زیادہ تاخیر ہوئی، مضامین میں کمیت کے بجائے کیفیت کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ زیادہ مضامین جمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور قریب قریب کل مضامین انہی اصحاب علم کے ہیں جن کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی تعلق تھا، ان کے جلوے اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کو ایک نمبر میں دکھانا مشکل تھا،

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد

تاہم اس کی کوشش کی گئی ہو کہ ان کے جمال و کمال کا اجمالی مرقع سامنے آجائے،

شروع میں خیال تھا کہ مختلف پہلوؤں پر الگ الگ مضامین لکھائے جائیں اور کتابی ترتیب پیدا کر کے مرتب کیا جائے، اگر مضمون نگاروں کو موضوع کا پابند کر دیتے ہیں مضامین کے حاصل کرنے میں اور زیادہ دشواری ہوتی، اس لئے یہ خیال چھوڑ دینا پڑا، بیشتر مضامین کا موضوع اور اس کے مباحث عام ہیں یعنی ایک ایک مضمون میں مختلف پہلوؤں پر تبصرہ ہے اس لئے وہ ترتیب تو نہ ہو سکی جو پیش نظر تھی تاہم مضامین کی نیلبی حیثیت کے لحاظ سے ایک موٹی سی ترتیب یہ قائم کر دی گئی ہو کہ پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے پھر عمومی حیثیت کے مضامین ، اس کے بعد علمی کمالات اور علمی و دینی کارناموں سے متعلق مقالات،

پھر سلوک و تصوف کے اور آخر میں متفرق مضامین ہیں، اس طرح ایک نوع کی ترتیب قائم ہو گئی ہے،

..........❊..........

ان مضامین سے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور ان کے کمالات کے اہم رخ، اور انکے بعض ایسے جلوے بھی سامنے آجاتے ہیں، جو عام نگاہوں سے مستور تھے، مگر ایک ایسی جامع کمالات ہستی کے حالات کا احاطہ جو تقریباً نصف صدی تک علم و فن کی ہر مجلس میں ضیا بار رہی ہو اور جس کے قلم نے اسلامی علوم و فنون کے دفتر کے دفتر ڈالے ہوں، اور جس کے کارناموں سے دین و ملت کا ہر گوشہ معمور ہو، چند سو صفحات میں دشوار تھا، اس لئے یہ نمبر درحقیقت ان کا کوئی مفصل و جامع تذکرہ نہیں بلکہ اس کا ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ حیات سلیمانی میں پیش کیجائیگی، وما توفیقی الا باللہ،

آیندہ مہینہ کا پرچہ شائع نہ ہوگا، اس لئے ناظرین انتظار نہ فرمائیں،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوانح حیات

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب

ولادت و وطن | حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں دیسنہ ضلع پٹنہ، بہار میں ہوئی، یہ گاؤں پٹنہ کے سب ڈویژن بہار شریف سے مشرق جانب آٹھ میل پر واقع ہے، اور ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤں رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے اطبار، ڈاکٹر، انجینیر اور سرکاری حکام کے علاوہ علما، فضلا، صلحا، اور اتقیا پیدا ہوئے،

خاندان | سید صاحب اس گاؤں کے اُس خاندان کے لعل بے بہا تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا، ننہال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سید تھے، اُن کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے، اور صاحب دل صوفی بھی، اُن کی ایک کتاب نور محمدی معارف پریس اعظم گڈھ میں چھپی ہے، جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ حالات ہیں، فن طب میں انھوں نے دو کتابیں قرابادین محمدی اور مخزن الحکمۃ العلیا لکھیں، اُن کی وفات کی تاریخ یہ ہے،

کیا ہوا ثانی بقراط و ارسطا طالیس
۱۳۰۳

سید صاحب کے والد بزرگوار جناب سید ابو الحسن صاحب بھی بڑے حاذق طبیب تھے، زہد و تقویٰ و دیانت میں لا ثانی تھے، متانت و سنجیدگی تہذیب و شائستگی، اور نفاست و نظافت کے بھی نمونہ تھے، پٹنہ ضلع کے مشہور قصبہ اسلام پور

کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانہ کے بڑے صاحب ثروت و وجاہت رئیس تھے، اُن کے گھر کے سب افراد حکیم سید ابوالحسن صاحب کا بیحد احترام کرتے، اور اُن کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھتے تھے،

سید صاحب کے بڑے بھائی جناب سید ابو حبیب صاحب بھی فنِ طب مین بڑی مہارت رکھتے تھے اتباعِ سنت کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، پوری عمر زہد و تقویٰ مین گذری، مجددی سلسلہ مین حضرت شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی سے بیعت بھی تھے،

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے اٹھارہ سال چھوٹے تھے، اُن کی تاریخِ ولادت پر اُن کے دادا صاحب نے ایک قطعہ کہا تھا جس کے دو شعر یہ ہین،

چو جستیم تاریخ او از خرد یکایک سروشے ز تاریخ و سال
بگفتا کہ بے داد و شد مصرعے شدہ مہر تابان ز برج کمال

۱۳۰۲ھ

یہ تاریخ ایسی نیک ساعت مین کہی گئی تھی کہ سید صاحب واقعی برج کمال کا مدرج کر چکے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ مہر صوبہ بہار کے ایک گاؤن مین ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو طلوع ہوا، اور اکہتر سال کے بعد اسی تاریخ یعنی ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی کے اُفق مین غروب ہوا،

ابتدائی تعلیم | مکتبی تعلیم پہلے اپنے گاؤن کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی اکھدوی سے پائی، اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابین ختم کرنے کے بعد عربی مین میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب صاحب سے پڑھی، اس زمانہ مین اُن کے بڑے بھائی کو گاؤن کی مسلمان بی بیون کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اور اس کے لئے وہ ہفتہ مین ایک دن اُن کے سامنے اس طرح وعظ و تلقین فرماتے تھے کہ سید صاحب بی بیون کے بیچ مین بیٹھ کر مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان پڑھتے تھے، اور اُن کے بڑے بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اوسکی تشریح کرتے، اس طرح بھائی جو کچھ کہتے وہ سید صاحب کے دل مین بھی بیٹھتا جاتا، چنانچہ اپنی ایک تحریر مین فرماتے ہین،

"یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتین سکھائین، اور ایسی سکھائین کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ مین

بیسیون آندھیان آئین، اور کتنی ونو خیالات کے طوفان اُٹھے مگر اس وقت جو باتین جڑ پکڑ چکی تھین ان مین سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی ورازی وابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہون سے گذرے مگر اسمٰعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی"

بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور گئے، وہان سے ۱۸۹۹ء مین پھلواری شریف پٹنہ آئے، یہان ایک سال خانقاہ مجیبی مین رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے عربی کی ابتدائی کتابین پڑھین، خانقاہ کے بزرگون کی صحبت مین علم وادب کا شوق پیدا ہوا، خود سید صاحب اپنی ایک تحریر مین فرماتے ہین،

"یہان خانقاہ مین ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اُس کے اثر سے اس قصبہ مین شعر وسخن کا چرچا تھا، مین نے بھی اس فضا مین سانس لی، اور یہین سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، پھوٹ پھوٹ کر رو دیا"

یہان کے قیام کے زمانہ مین شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق بھی پڑھے پھلواری سے مدرسۂ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے، یہان چند مہینے رہے، اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ مین وہان کے طلبہ کی انجمن مین "تعلیم نسوان" پر ایک ایسا مضمون پڑھ کر سنایا کہ ہر طرف تحسین وآفرین کا نعرہ بلند ہوا، یہ مضمون پٹنہ کے مشہور اخبار "پنچ" مین بھی چھپا،

ندوہ مین داخلہ | ۱۹۰۱ء مین دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مین داخل ہوئے، یہان سات سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی، طالب علمی کے زمانہ مین بھی متانت وسنجیدگی، تہذیب وشائستگی، مہر ومحبت اور خلق ومروت مین ممتاز تھے، یہ اوصاف اُن کو اپنے والد بزرگوار سے ورثہ مین ملے تھے، عمر کے ساتھ یہ اوصاف بھی بڑھتے گئے، اور ندوہ مین ان کے علمی وادبی ذوق کی نشو ونما اور ترقی ہوتی رہی، دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ شعر وسخن کا ذوق بھی ابتدا سے تھا، چنانچہ کم عمری ہی مین اپنے وطن دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ مین ایک طویل ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کا

ایک شعر یہ ہے :

سچے کانون سے نہین سنتے ہین ارشاد نبی ہین مسلمان بس اتنے ہی کہ کہلاتے ہین

اسی زمانہ مین امیر مینائی سے زیادہ متاثر تھے، ان کا دیوان مرآة الغیب برابر مطالعہ مین رکھتے تھے، دارالعلوم کے مشاعرون مین امیر مینائی ہی کا روپ بھرتے تھے،

مضمون نگاری کی ابتدا

ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۰۳ء مین "وقت" کے عنوان سے مخزن لاہور مین چھپا جس کے اڈیٹر اس وقت اردو کے مشہور اہل قلم شیخ عبدالقادر تھے، اسی سال سید صاحب نے اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ مین "علم اور اسلام" پر ایک بسیط مضمون پڑھا جس کو اہل علم نے پسند کیا، اور جو علی گڈھ کے مشہور رسالہ علی گڈھ منتھلی میگزین مین اڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا،

شاہ سلیمان پھلواروی کی پیشین گوئی

اس زمانہ مین ندوہ کے معتمد مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اس کے رکن تھے، یہ دونون بزرگ سید صاحب کی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے ان پر بے حد شفقت فرماتے تھے، خود سید صاحب بھی مولانا محمد علی مونگیری کی مذہبی اور دینی زندگی کے بہت متاثر ہوئے، غالباً ۱۹۰۳ء مین نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ تشریف لائے، اور طلبہ کا امتحان لیا، اُن سے اخبارات پڑھوا کر سُنے، اس امتحان مین سید صاحب اوّل آئے، انھون نے نواب صاحب کی مدح مین اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا، جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانہ کے اخبارات مین مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اس قصیدہ کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ مین ایک سلیمان بہار کی سرزمین مین علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا،

مولانا شبلی کا سایۂ عاطفت

۱۹۰۵ء مین جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنؤ آئے، تو طلبہ نے اس خوشی مین جلسے کئے، تقریرین کین، نظمین لکھین، سید صاحب نے بھی اپنی مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ مین کیا جس کا مطلع یہ تھا :

بدہ ساقی مے کو بشکند جلباب ظلمانی خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

یہ پورا قصیدہ حیات شبلی میں درج ہے، مولانا شبلی میں جوہر شناسی کا خاص مادہ تھا، اس لئے ندوہ میں آتے ہی اس جوہر قابل کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا، اُن کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات رہتی تھیں، سید صاحب اُن کا برابر مطالعہ کرتے رہے جس سے اُن میں جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا، اور اتنا بڑھا کہ وہ جدید عربی کے بھی اچھے ادیب شمار کئے جانے لگے، ۱۹۰۴ء (جمادی الثانی ۱۳۲۲ء) میں مولانا شبلی نے ندوۃ العلماء کی طرف سے الندوہ نکالنا شروع کیا، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی اس کی ادارت میں شریک تھے، اسی زمانہ میں مولانا شبلی نے سید صاحب سے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص کرائی اور اس کو بہت پسند کیا، اور جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں شائع کیا، سید صاحب نے الندوہ کے لئے پہلا مضمون "علم حدیث" پر لکھا جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی، مولانا نے سید صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر اُن کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں الندوہ کی دیکھ بھال کا کام اُن کے سپرد کر دیا،

بنائے جامعیت | مولانا شبلی کی تربیت میں ایک طرف اُن کی مضمون نگاری کی مشق جاری رہی، دوسری طرف اپنے اُستاد مولانا حفیظ اللہ سے علم حدیث اور ہیئت میں علمی شوق کی تشنگی بجھا رہے تھے، اسی زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے رسالہ عجالہ نافعہ کے پڑھنے سے اُن کو علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی، پھر بستان المحدثین کے مطالعہ نے اس کا شوق اور بھی زیادہ کر دیا، اور آخر میں ائمہ محدثین میں سے امام مالک نے اُن کے دل پر قبضہ کر لیا اور موطا امام مالک سے بڑی گرویدگی پیدا ہو گئی، پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے مطالعہ سے محدثین کے کارناموں سے زیادہ واقف ہوئے،

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف رہنمائی کی، اور اس سلسلہ میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کرتے رہے، اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اوّل و آخر کے صفحے

بھر گئے ہین،

منطق، فلسفہ، اور ادب عربی کا ذوق مولانا فاروق چریاکوٹی کے درس مین پیدا ہوا، اور جب مولانا شبلی سے دلائل الاعجاز پڑھی، تو اُس سے بہت متاثر ہوئے، اور اسی سے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی، حماسہ اور نقد الشعر کے مطالعہ نے اس ذوق پر اور جلا دی اور ان مین عربی نظم کا بھی ذوق پیدا ہوگیا،

فقہ مفتی عبد اللطیف صاحب سے پڑھی علم کلام کا شوق تمامتر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ مین شہرستانی اور ابن حزم کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ نے یکے بعد دیگرے اپنا رنگ دکھایا،

عربی مین مضمون نگاری | دار العلوم ندوہ مین مصر و شام سے عربی اخبارات المؤید اور اللواء وغیرہ آیا کرتے تھے، سید صاحب اُن کو بالالتزام پڑھتے تھے لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے ادارہ نے اُن سے عربی مضامین کے اردو ترجمے بھی کرانا شروع کئے، اس زمانہ مین مولانا عبد اللہ عمادی عربی مین ایک رسالہ البیان نکالا کرتے تھے، سید صاحب نے بھی اس مین عربی کے چند مضامین لکھے، اسی زمانہ مین اُن کی تحریرین مصر کے مشہور اخبار المنار مین بھی شائع ہوئین،

خطیبانہ انداز کی پسندیدگی | سنہ ۱۹۰۷ء مین ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہ عام لکھنؤ مین ہوا، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس مین جدید و قدیم علوم کے ماہرین دار العلوم ندوہ کے بلند بانگ دعوؤن کا امتحان کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ مین سید صاحب نے علوم جدید و قدیمہ کے موازنہ پر اردو مین تقریر کی، تقریر کے دوران مین کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی مین تقریر کرین تو ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کرین، سید صاحب نے اسی وقت عربی مین ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت مین آگئے، مولانا شبلی نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ یہ تقریر پہلے سے تیار کرکے لائے ہین، اگر کوئی صاحب چاہین تو اسی وقت موضوع مقرر کردین، یہ تقریر کرین گے، حاضرین مین سے خواجہ غلام الثقلین نے یہ موضوع دیا کہ "ہندوستان مین اسلام کی اشاعت کیونکر ہو"

سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کردی، یہ دیکھ کر پورا جلسہ محو حیرت ہوگیا، اور ہر طرف سے نعرہ ہائے آفرین بلند ہونے لگے، مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اُتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا، اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا،

الندوہ کی سب اڈیٹری سید صاحب ۱۹۰۶ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے اُن کو الندوہ کا سب اڈیٹر مقرر کیا، اسی سال انھوں نے "علم ہیئت اور مسلمان" "عربی زبان کی وسعت" "طبقات الارض" "زبانا کی اکملی" "مسئلہ ارتقا"، اور "قرآن مجید" وغیرہ مختلف موضوعوں پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا، ان مضامین میں اُن کے استادی کے تحقیقی اور ادبی رنگ کی جھلک تھی، جو رفتہ رفتہ اور بھی نمایاں ہوتی گئی، الندوہ کے مضامین سے اُن کی شہرت علمی حلقہ میں بڑھتی گئی، اور اب وہ کبھی کبھی مولانا شبلی کے بجائے الندوہ کے شذرات بھی لکھنے لگے،

۱۹۰۷ء کے الندوہ میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان میں ایمان بالغیب، اور مکررات القرآن کی داد مولانا شبلی نے ایک مکتوب میں لکھ کر دی، اور اُن کے تصنیفی سلیقہ پر اظہار مسرت کیا،

ندوہ کی مدرسی ۱۹۰۸ء میں وہ الندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اور اس درس و تدریس کے زمانہ میں انھوں نے دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈریں لکھیں جو اب تک مقبول ہیں،

۱۹۰۹ء کے الندوہ کے مختلف نمبروں میں اُن کا مشہور مضمون "خواتین اسلام کی شجاعت" شائع ہوا، جو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی چھاپا گیا، اور اس وقت سے اب تک اُس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں، اور اب اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوگیا ہے، اس زمانہ کے دوسرے مضامین میں "اسلامی رصد خانے" کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور بعد میں اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا،

تدوین لغات جدیدہ فروری ۱۹۱۰ء تک الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، اسی سال

ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، یہ کام مجھ کے سپرد کیا گیا جس کو انھوں نے دو برس میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری (اڈیٹر المنار) تھے، پیش کیا، یہ ڈکشنری لغات جدیدہ کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی جس سے اب بھی عربی مدارس کے طلبہ کو بڑی مدد ملتی ہے،

سیرۃ النبی کی تالیف میں شرکت

۱۹۱۰ء میں جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سید صاحب اُس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے، اور اس کام میں استاد کی اعانت کے ساتھ ساتھ الندوہ میں مضامین بھی لکھتے رہے، اگست ۱۹۱۱ء میں الندوہ کی ادارت کا بار پھران پر ڈالا گیا، اور وہ یہ خدمت مئی ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے جس کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہو گیا جس کے اڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی تھے، اُن کے اس دور کے مضامین میں "اشتراکیت اور اسلام" اسمأ القرآن، اور "فنائے مادہ" کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۱۹۱۱ء کے وسط میں انھوں نے سیالکوٹ کی انجمن شبان المسلمین میں ایک خطبہ دیا، جو مذہب اسلام اور عقل" کے عنوان سے جولائی ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں شائع ہوا،

الہلال کی ادارت میں شمولیت

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا، تو اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک شور برپا ہو گیا، اور اُن کی سیاسیات میں اُبال آگیا، سید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے آپ کے استاد مولانا شبلی ملکی سیاست میں آزادی کے حامی تھے، اور اسلامی سیاست میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے اسی کا اثر اُن کے شاگردوں پر بھی ہوا، چنانچہ سید صاحب خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست میں آئے، جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے جو مولانا شبلی کے صحبت یافتہ تھے، کلکتہ سے الہلال نکالنا شروع کیا، ملکی اور اسلامی سیاسیات میں اس کا مسلک وہی تھا جو مولانا شبلی کا تھا، اس لئے مئی ۱۹۱۳ء میں سید صاحب الہلال کے اسٹاف میں شامل ہو گئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا، اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان کے

مسلمانوں کے جذبات کا سمندر بھی جوش میں آگیا تھا، ابھی یہ شور محشر بپا ہی تھا کہ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آگیا جس میں نہتے مسلمانوں اور اُن کے معصوم بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں، اس خونی سانحہ نے تمام ہندستان کو پرشور بنادیا، سید صاحب نے ۱۱ اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اپنے خونِ دل سے مشہدِ اکبر کے عنوان سے ایک دردانگیز مضمون لکھا جس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ میں اُن کی مذہبی حمیت، ملی غم خواری اور قومی درد کا طوفان اُمڈ پڑتا تھا، یہ مضمون الہلال کے جس پرچہ میں شائع ہوا، وہ حکومت نے ضبط کرلیا، الہلال میں انہوں نے اور بھی پرزور مضامین لکھے، اُن کے طرزِ نگارش میں چونکہ ابوالکلام ہی کا رنگ تھا، اور مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے، اس لئے بعض مضامین مولانا ابوالکلام کی جانب منسوب ہوگئے، خود سید صاحب نے رسالہ مستقبل کراچی (اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں تحریر فرمایا ہے،

"الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلاتحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کردیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہدِ اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں"،

دکن کالج پونہ کی پروفیسری

سیاسی واقعات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سید صاحب پھر مولانا شبلی کے دفتر سیرت میں لکھنؤ آگئے، لیکن جلد ہی ۱۹۱۳ء کے آخر میں مولانا شبلی کے ایما سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کی معلمی قبول کرلی، اب وہ ملک میں ممتاز اہلِ علم کی صف میں شمار کئے جانے لگے، اس لئے مذہبی اور تعلیمی جلسوں میں اُن کی طلب شروع ہوئی،

تدوین ارض القرآن

ان مشاغل کے ساتھ پونہ کے قیام کے زمانے میں ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی تالیف شروع کی جس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی اور تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے، اور قرآن مجید کے بیانات سے اُس کی مطابقت دکھائی گئی ہے، جس زمانہ میں وہ دفتر سیرت میں کام کررہے تھے، اُسی وقت سے

اس کے لئے مواد کی فراہمی شروع کردی تھی، پونا میں اُس کی پہلی جلد ترتیب دی، اور دوسری جلد کے لئے مواد فراہم کیا، اور یہیں بیٹھ کر الہلال کے لئے "علوم القرآن" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا،

رحلت استاد | پونہ گئے ہوئے ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی جنت کو سدھارے مرض الموت میں شفیق استاد نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا، اور جب وہ پہونچے تو مولانا نے معاہدہ کے طور پر شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا "سیرت (یعنی سیرۃ النبی) میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو" سعادت مند شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ضرور ضرور"

وہ شفیق اُستاد اور مُربی کی وفات سے بہت متأثر ہوئے، اور تأثرات کا اظہار "نوحۂ استاذ" میں کیا، جس کا مطلع یہ ہے،

سا اے متاعِ عزتِ شبلی کے پچھلے کارواں آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان

اخباروں میں یہ نوحہ شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولانا حمیدالدین فراہی نے سید صاحب کی سخن وری اور سخن سنجی کی داد دی لیکن عمادالملک بلگرامی نے اُن کو شعر و سخن کی طرف مائل ہونے سے روکا، اور انھوں نے اُن کی نصیحت قبول کی کبھی کبھی اشعار کہہ لیتے تھے لیکن اپنے کو "غیر فطری شاعر" کہتے تھے مگر ارباب نظر نے اُن کی شاعری کی بھی داد دی ہے، ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۴ء میں ان کو لکھتے ہیں کہ

"آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا،

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا، اور جو چند نظمیں انھوں نے لکھی تھیں وہ نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے"،

شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سید صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمیں کہہ لیا کرتے تھے،

تاسیس دارالمصنفین مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے، سید صاحب اُن کی رحلت کے بعد پونہ کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڈھ چلے آئے اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی، یہ گویا بغداد کے دارالحکمت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڈھ کی سرزمین پر نمودار ہوا،

سید صاحب نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی، اور جب وہ اہل علم کے سامنے آئی تو اُن کو دارالمصنفین کے علمی کام کی نوعیت اور سید صاحب کی تحقیقات اور اُن کے علم و نظر کی وسعت کا اندازہ ہوا،

انجمن ترقی اردو کی صدارت اسی سال انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا جس کی صدارت سید صاحب نے کی، اس میں انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ آگے چل کر اُردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دلیل راہ بنا،

سیاسی مشاغل اس علمی و ادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے، ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب ٹرکی نے جنگ عظیم میں شرکت کی، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا، اور اُن کے سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے، اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے بڑھا اس میں سید صاحب بھی تھے، چنانچہ ۱۹۱۵ء سے لیکر ۱۹۱۶ء تک انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا،

رسالۂ معارف کا اجراء لیکن اب اُن کا اصلی مرکز توجہ دارالمصنفین تھا، ابھی تک اس کا کوئی آرگن نہ تھا، اس لیے ۱۹۱۶ء کے رمضان المبارک میں معارف کا پہلا پرچہ اُن کی ادارت میں نکلا، اس کا اجرا ایسے مبارک مہینہ میں ہوا کہ اُسکی روشنی سے علمی دنیا آج تک منور ہے، معارف کے پہلے نمبر میں اُن کا مقالہ "روزہ" پر تھا، شروع کے نمبروں میں بیشتر مضامین انہی کے ہیں، رسالہ کی ادارت کے فرائض کے ساتھ استاذ مرحوم کے چھوڑے ہوئے مسودات اور سیرۃ النبی کی ترتیب و تبویب میں بھی مشغول رہتے، رفقا کے نئے علمی لائحۂ عمل تیار کرنے اور دارالمصنفین کے مربیوں اور ہمدردوں کا حلقہ پیدا کرنے کا بار بھی اُن ہی پر تھا،

دارالمصنفین کے فروغ میں جانکاہ کوشش

دارالمصنفین کے قیام کے آغاز سے آخر وقت تک اُن کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کرکے کتب خانہ میں آجاتے، ۱۲ بجے دن تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر کام کرتے، پھر کھانا کھاکر کچھ قیلولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر کتب خانہ تشریف لاتے، اور عصر تک کام میں مشغول رہتے، عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے، اس وقت رفقاے دارالمصنفین سے علمی مذہبی سیاسی اور تفریحی باتیں کرتے، مغرب کی نماز کے بعد بھی کام کا سلسلہ جاری رہتا، مگر جب کثرت محنت سے صحت خراب رہنے لگی، تو رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن دن بھر محنت شاقہ کرتے، جب علمی مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شرکت کے لئے سفر میں جاتے تو تشنۂ علمی ریاضت سے چھٹکارا اور کچھ آرام مل جاتا،

دارالمصنفین کے کتب خانہ، پریس اور دفتر کے تمام کارکنوں سے اس طرح ہمدردی، محبت اور لطف و شفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ اسی کو محبوب رکھتے ہیں، اور وہ اُن کی خوشنودی اور رضامندی کی خاطر بڑی تن دہی اور دلسوزی سے کام کرتا، اُن کی زندگی کا اصلی کارنامہ دارالمصنفین ہی ہے جس کو وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے،

اُن کے حُسنِ نیت کی وجہ سے دارالمصنفین کا علمی وقار ملک میں جلد ہی قائم ہوگیا، چنانچہ ابھی اس کو قائم ہوئے دو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے بڑے پیمانہ پر موازنۂ مذہب کا ایک ادارہ ایک فرانسیسی کی نگرانی میں قائم ہوا تو اسلامی علوم و مسائل کی تحقیقات اور رفع شبہات کے لئے دارالمصنفین ہی مرجع قرار پایا،

جلسۂ علماے بنگالہ کی صدارت

۱۹۱۷ء میں علماے بنگالہ کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی جس میں تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے، اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی اُن ہی تاریخوں میں تھے اس لئے مجلس علماے بنگالہ کا یہ جلسہ بڑا اہم تھا، اس میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا، وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا، یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جر

اس زمانہ میں نظر بند تھے، جرأت کے ساتھ لیا گیا، اس سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اُٹھا،

۱۹۱۶ء کے علمی کام

۱۹۱۶ء کے علمی مضامین میں "اہل السنت والجماعت" بڑا مقبول ہوا، پہلے یہ معارف کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، پھر رسالہ کی صورت میں چھپا، اس کا ترجمہ ملیالم، تلنگو اور بنگلہ میں بھی ہوا، اسی سال اُن کی کتاب "حیات امام مالک" شائع ہوئی، اُن کو امام مالک سے خاص عقیدت اور اُن کی موطا صحیحین سے زیادہ پسند تھی، گو آخر عمر میں جزوی مسائل میں بھی امام ابو حنیفہ کے مسلک کے پابند ہو گئے تھے، لیکن امام مالک سے عقیدت قائم رہی ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں "حیاتِ امام مالک" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، اور تقریباً ۹۰ صفحے پر مشتمل تھا، اس کو اور زیادہ مکمل کرنے کا برابر ارادہ کرتے رہے، مگر دوسرے کاموں کی مشغولیت نے اس کا موقع نہ دیا، اس لئے اسی مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا، یہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اُس کی مانگ ابھی تک جاری ہے، اور اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں،

سیرۃ النبی جلد اول کی اشاعت

۱۹۱۸ء میں اپنے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اول کو مرتب کرکے ملک کے سامنے پیش کی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا، اس کی اشاعت پر سید صاحب نے بجا طور پر لکھا تھا کہ

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت

اسی سال اُن کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی جس میں اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی، اور تمدنی حالات پر بحث ہے، اس سے اُن کی علمی شہرت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا، ۱۹۳۶ء میں مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور معلومات میں اضافہ کرکے اس میں انگریزی کے لحاظ سے بعض ترمیمیں اور تغیرات کئے،

۱۹۱۸ء کے معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے، اُن میں "ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں" کی طرف خاص طور پر لوگوں کی نظر اٹھی، اس میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب

لانے کی کوشش کی گئی ہے، ارباب تحقیق کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سید صاحب کی نظر تاریخ ہند پر بھی کتنی گہری ہے، اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے،

تحریک خلافت | ۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پرآشوب تھا، پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ٹرکی پر سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کئے جارہے تھے، ٹرکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہورہا تھا، اتحادی فتح کے غرور کے نشہ میں خدا کی خدائی کی شکست وریخت میں مصروف تھے اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ کررہے تھے، اس وقت ہندوستان کے چند بہادر غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں، اس مجلس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کردی کہ پورا ہندوستان اُس کی آواز پر اٹھتا اور بیٹھتا تھا، اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش رہے، اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، تو انھوں نے علما، اور ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا، اور ایسی پردرد تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائین تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہ گئے، اسی سال انھوں نے سید الاحرار سید فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں نظربندان اسلام کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا جو بہت پسند کیا گیا،

وفد خلافت میں یورپ کا سفر | فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ٹرکی کے معاملات میں انصاف طلبی اور مسلمانان ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ گیا تھا، اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر یہ بھی تھے، صدر مولانا محمد علی ارکان سید حسین اور سید صاحب اور سکریٹری حسن محمد حیات تھے، یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کرکے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا جب یہ لوگ پورٹ سعید پہنچے اور سید صاحب جامع عباسی میں نماز مغرب

پڑھنے کے لئے گئے، تو وہاں ایک بزرگ فقہ کا درس دے رہے تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر وفد خلافت کی نوعیت بتائی تو تمام حلقۂ درس جوش مسرت سے لبریز ہو گیا، اور سب نے وفد کی کامیابی کے لئے دعا کی، اور جب سید صاحب مسجد سے نکلے، تو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ وہ بدقت جان چھڑا کر آگے بڑھ سکے، اس وفد کے ارکان اٹلی، فرانس اور انگلستان میں ترکی کے حقوق کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعہ لڑتے رہے، لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملنے کے علاوہ حجاز و شام اور مصر کے وفود سے بھی ملاقات کی، حجاز و شام کے وفد کے سرگروہ نوری سعید پاشا اور حداد پاشا تھے، سید صاحب نے اُن سے مل کر خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور اُن کے مذہبی تعلقات بیان کئے، تو وہ سب بہت متاثر ہوئے، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اسی زمانہ میں سعد زاغلول پاشا بھی مصری وفد کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے، اُن سے بھی مل کر سید صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، سعد زاغلول نے اُن کی عربی سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہیں، اس سفر میں آرنلڈ، براؤن، اسٹوڈرڈ اور مارگولیتھ سے بھی ملاقات رہی، پروفیسر مارگولیتھ اور ایک فالوی مستشرق سے مسئلۂ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی، اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلہ "فارن افیرز" میں جو مدلل اور جامع مضمون لکھا، اس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی، وفد کے سیاسی کاموں کے ساتھ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانے بھی دیکھتے رہے، جس سے اُن کا یہ سفر علمی حیثیت سے بھی مفید رہا، لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اُن کو ایک خط میں تحریر فرمایا،

"مراجعت مع الخیر مبارک، آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے، اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا، وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا،......... تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا،"

واپسی پر قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی خلافت کمیٹی نے اُن کا شاندار خیر مقدم کیا، انھوں نے اس کمیٹی کے بڑے اجلاس کی صدارت بھی کی، اس میں صوبہ کے اکابر علما اور زعماء کے علاوہ بابو راجندر پرشاد (موجودہ صدر جمہوریۂ ہند) بھی تھے، جنھوں نے اپنی تقریر میں سید صاحب کی سیاسی بصیرت کو سراہا،

سیرۃ النبی جلد دوم کی اشاعت

لندن جانے سے پہلے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لئے دیدی تھی اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا، پہلی جلد نبوت کے پرآشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے،

سیرت عائشہؓ

ابھی وہ لندن ہی میں تھے کہ اُن کی کتاب سیرۃ عائشہ شائع ہوئی، جس کا آغاز طالب علمی کے زمانہ میں کیا تھا، مگر اسکی تکمیل بعد میں کی، اس کی اشاعت پر بیگم صاحبۂ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا، ڈاکٹر سر اقبال نے یہ کتاب پڑھی تو سید صاحب کو تحریر فرمایا کہ

"سیرۃ عائشہ کے لئے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے"

ترک موالات

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تو ترک موالات کی تحریک ہندوستان میں شروع ہو گئی، اور مجلس خلافت اور کانگریس کے پلیٹ فارم مشترک ہو گئے، سید صاحب نے بھی دوسرے علماء اور زعماء کے ساتھ مل کر ترک موالات کی تحریک کے سلسلہ میں ملک کا دورہ کیا، اخبارات میں مضامین لکھے، جابجا تقریریں کیں، ۱۹۲۱ء میں مجلس خلافت کا جو سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا تھا، اسکی صدارت کی، اسی سال خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام" اور "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے دو اہم تاریخی مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے، جو علٰحدہ علٰحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع ہوئے، ان رسالوں سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی، ۱۹۲۱ء کی کانگریس احمد آباد میں منعقد ہوئی، تو اسکی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے، اور سال بھر تک خلافت کیساتھ کانگریس کے کاموں میں شریک رہے، جمعیۃ العلما

کی مجلس عاملہ کے بھی رکن مقرر ہوئے،

دار المصنفین کی شہرت | سنہ ۱۹۲۲ء تک دار المصنفین کی شہرت مین چار چاند لگ چکے تھے، سیرۃ النبی کی دو جلدون اور سید صاحب کی تصانیف کے علاوہ مولانا عبد السلام ندوی کی اسوۂ صحابہ اور سیرۃ عمر بن عبد العزیز مولوی یونس فرنگی محلی کی روح الاجتماع، مولوی عبد الباری صاحب ندوی کی برکلے، اور "مبادی علم انسانی" اور مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کی "مبادی فلسفہ" اور مکالمات برکلے، پروفیسر سجاد مرزا کی الاستدلال، تسہیل البلاغت وغیرہ جیسی سنجیدہ کتابون اور معارف کے بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین نے تمام اصحاب علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، اور اردو زبان کا لٹریچر ایک نئے نہج مین ڈھلنے لگا، ڈاکٹر اقبال نے معارف کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی ایک پیارسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی مین ترقی ہوتی ہے، مولانا محمد علی مرحوم کو بھی معارف سے بڑا انس ہو گیا تھا، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴ر دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء مین سید صاحب کو لکھتے ہین،

"میرے متعدد انگریزی رسالون کی جلدین نہین بندھی ہین، اور ممکن ہو کہ میرے عزیز دوست اور سارق کتب سید جالب صاحب اُن مین سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہون، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائین گی،"

مولانا ابو الکلام آزاد اپنے ایک خط مین سید صاحب کو تحریر فرماتے ہین :-

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہین صرف یہی ایک پرچہ ہے، اور تو ہر طرف سناٹا ہے، بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائین رائگان نہ گئین، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی، جو صرف خدمت علم وتصنیف وتالیف کے لئے وقف ہو"

معارف اور دار المصنفین کی شہرت بیرون ہند مین بھی پھیلتی جا رہی تھی، چنانچہ اسی زمانہ مین ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) نے اس کے ناقدانہ مباحث علمی مقالات مستشرقانہ معلومات اور مشرقی ومغربی علوم وخیالات کی آمیزش کی داد دی، اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر فرانس کے مشہور مستشرق

شعیب قریشی تھے، سلطان ابن سعود نے سلطانیہ کے سلسلہ میں تمام دنیا سے مسلمانوں کی ایک موتمر مکہ معظمہ میں طلب کی تھی، جس میں ترکی، مصر، افغانستان میں اور دوسرے اسلامی ملکوں کے نمایندے شریک ہوئے، اور چند ہفتوں تک برابر اس کے جلسے ہوتے رہے، موتمر کے نمایندوں نے سید صاحب کو موتمر کا نائب رئیس منتخب کیا، اور صدر موتمر کی غیر حاضری میں اس کی صدارت بھی کی، اس میں انھوں نے جو عالمانہ اور مبصرانہ تقریریں کیں، ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی عظمت تمر کا کے دلوں میں قائم ہوگئی، حجاز میں وفد کے کاموں کی مشغولیت کے باوجود اُن کا قلم بھی رواں دواں رہا، چنانچہ وہاں سے آنے کے بعد حجاز کے کتب خانے" کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک طویل مضمون لکھا؛

مارگولیتھ سے علمی معرکہ | اس وفد سے واپسی کے بعد وہ زیادہ تر علمی، مذہبی، اور تعلیمی کاموں میں مشغول رہے، ۱۹۲۵ء میں مانچسٹر گارجین کے ایک عیسائی مضمون نگار نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض نامناسب باتیں مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے لکھیں جو خود مارگولیتھ نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاؤسن کے حوالہ سے لکھی تھیں، اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، سید صاحب نے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء کے معارف کے متعدد مضامین میں یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں ہے، اور اس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہے، تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیا جائے، مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی اس بحث میں حصہ لیا تھا، سید صاحب نے دونوں کو اپنے محققانہ اور فاضلانہ مضامین سے خاموش کیا، ان مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو ووکنگ میں بھی شائع ہوا، اور ایک صاحب نے حجاز میں ان کا ترجمہ عربی میں بھی کیا،

زہر کا تریاق | ۱۹۲۷ء میں ایک یورپین اہل قلم نے لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی مجالس کے قلی تھے" سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس کی فاضلانہ تردید کی جس کا انگریزی ترجمہ حیدرآباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں بھی شائع ہوا، اسی سال یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتوں کے لئے صد درجہ تنگ اور سخت گیر ہے

سید صاحب نے "مسلمان عورتوں کے حقوق" کے عنوان سے اس کی تردید میں ایک طویل مضمون لکھا، اور یہ دکھایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں، ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیلِ دین نے کیا، اور اُن کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا،

انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں تقریر اسی سال کے وسط اپریل میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی دعوت پر عہدِ رسالت میں اشاعتِ اسلام پر تقریر کی جو بہت پسند کی گئی، اس موقع پر لاہور کے تمام اصحابِ علم سے ملاقاتیں رہیں، ڈاکٹر اقبال نے بڑی تواضع سے ملنے میں پیش دستی فرمائی، ان کی قیام گاہ پر آئے، اور بڑی گرم جوشی سے ملے، اور پھر اُن کے اعزاز میں جتنی علمی صحبتیں رہیں، ان میں ڈاکٹر اقبال ہی شمعِ محفل رہے، چنانچہ سید صاحب نے پنجاب کے سفر سے واپسی پر شذرات میں تحریر فرمایا کہ .... انھوں نے (یعنی ڈاکٹر اقبال نے) "شمع اور شاعر" لکھا ہے لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا، اور قدرشناسوں کو اس کا پروانہ پایا، اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے، اُن کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات، اُن کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متأثر رکھتے ہیں" اس ملاقات کے بعد دونوں میں اور زیادہ گہرے تعلقات پیدا ہوئے،

جنوبی ہند کا سفر اسی سال کے اکتوبر میں مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچناپلی تشریف لے گئے، یہ مجلس تامل زبان میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعتِ تعلیم کا کام انجام دیتی تھی، اس سفر میں وینارام، امبور، عمرآباد، بنگلور، میسور اور حیدرآباد دکن میں بھی تقریریں کیں، اس لمبے سفر کا مقصد ندوۃ العلماء کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے چندے کا حصول تھا، وہاں سے واپسی کے بعد نومبر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امرتسر گئے، اسی اجلاس میں ندوہ کے لئے نواب صاحب بھاولپور نے پندرہ ہزار کی رقم عطا کی، امرتسر سے وہ جمعیۃ العلماء کے اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور بھی گئے،

دارالمصنفین کی روزافزوں شہرت ۱۹۲۰ء میں خاص علمی کاموں خصوصاً سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے،

دارالمصنفین اب اپنے مذہبی، علمی، ادبی کارناموں کی وجہ سے ہندا ور بیرونِ ہند میں بہت مشہور ہو چکا تھا، فرانس کے علمی رسالہ "دنیائے اسلام" میں اس کا ذکر کئی بار کیا گیا، مصر کے رسالہ المنار میں اس پر ایک مقالہ بھی شائع ہوا، ایک ترک نوجوان شہاب الدین آفندی نے جو مولانا روم کے خاندان سے تھے، اپنے مولف نادرۂ روزگار، مہندس استاذ عیسیٰ اور ان کے رفقاء کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلہ میں دارالمصنفین کی طرف رجوع کیا، امریکہ کے رسالہ مسلم ورلڈ اپریل ۱۹۲۳ء کے دو مضامین میں دارالمصنفین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، ٹرکی میں الفاروق اور سیرۃ النبی کے حصۂ اول دوم سوم سیرۃ عائشہ اور سیر الصحابہ کی بعض جلدوں کے ترجمے ترکی زبان میں کئے گئے، اور وہاں کے علماء اور عام شائقین نے ان کتابوں کو توقع سے زیادہ پسند کیا،

اس کی علمی شہرت سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں، اور وہ ایسا مرکز بن گیا، جہاں مسلمان اور ہندو لیڈر بڑے فخر سے آتے تھے، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، مولانا حسین احمد، چودھری خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی یہاں آئے، پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورہ میں جب اعظم گڈھ آتے تو ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں ٹھہرتے، شبلی منزل اُن کا بے تکلف مہمانخانہ تھا، پنڈت جواہرلال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا، وہ جب بھی اعظم گڈھ آئے دارالمصنفین میں آکر ٹھہرے، گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڈھ آئے تو اُن کے قیام کا انتظام تو اور جگہ تھا، مگر وہ خود شبلی منزل آئے، اور ایسے وقت آئے کہ اہلِ دارالمصنفین ایک کھلی جگہ میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے، یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے، اور ساتھ والوں کو باادب رہنے کے لئے اشارہ کیا، سید صاحب نے لالٹین کی روشنی میں اُن کو کتب خانہ دکھایا، دارالمصنفین کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی تو انھوں نے اردو میں دستخط کیا،

۱۹۲۳ء میں سید صاحب نے "ہندوستان اور علم حدیث" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جو دلچسپی سے پڑھا گیا، اس موضوع پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا، اس کی اشاعت کے بعد دوسرے اہلِ قلم نے بھی اس موضوع پر

مفید معلومات فراہم کئے اسی سال حیدرآباد کے سفر کے موقع پر حضور نظام نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے نتیجہ مین ریاست حیدرآباد سے دارالمصنفین کی سالانہ امداد جاری رکھی گئی،

ساردا ایکٹ کے خلاف احتجاج

۲۸ء و ۱۹۲۹ء مین ساردا ایکٹ یعنی نابالغون کی شادی پر پابندی کے سلسلہ مین مسلمانون مین بڑا ہیجان پیدا ہوا، انھون نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا لیکن اس قانون کے بعض مسلمان حامیون نے فقہ اسلامی مین تحریف کرنے کی کوشش کی، اور نابالغ لڑکیون کے نکاح کو ناجائز بتایا، اور زور استدلال مین حضرت عائشہؓ کی نابالغی کی عمر نکاح سے بھی انکار کر دیا، سید صاحب نے معارف مین نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر پر محققانہ اور فاضلانہ بحث کر کے ایسے تمام لوگون کا منھ بند کر دیا، اور یہ اعلان کیا کہ نابالغون کا نکاح تو شرعًا جائز ہے، مگر ہر حال مین مستحسن نہین لیکن کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانون کے نکاح و طلاق کے سلسلہ مین قانون بنانے کا حق نہین، غیر اسلامی حکومتون مین مناسب اصلاحات کو قانونًا نافذ کرنے کی صورت صرف یہ ہو کہ وہ شرعی تصریحات کے مطابق مسلمان والی یا قاضی کے ذریعہ جاری کی جائین، اسی سلسلے مین انھون نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانون کے پیش نظر جو معاملات ہین اُن مین ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آیندہ حکومت مین مسلمانون کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علٰحدہ نظام ہونا چاہئے، اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے، اس طرح کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار انھون نے بلند کی اور یہ بھی لکھا کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ کر مجھکو یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہین کی گئی، تو مسلمانون کی متاع ہستی اس ملک مین قائم نہین رہ سکتی،

عرب و ہند کے تعلقات پر لکچر

۱۹۲۹ء کے مارچ مین ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد کی دعوت پر عرب و ہند کے تعلقات پر لکچر دیئے جن مین ہند و مسلمان دونون کو اُن کا وہ زرین عہد یاد دلایا، جب دونون گونا گون تعلقات کے رشتون مین جکڑے ہوئے تھے، یہ خطبات تلاش و تحقیق محنت و کاوش اور جدت استدلال

کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہین، اُن کا انگریزی ترجمہ جناب سید لحق صاحب ام۔ اے (فی الحال نیو ا
نے کیا تھا، جو اسلامک کلچر حیدرآباد مین کئی سال تک شائع ہوتا رہا[1]،

ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ کی فراہمی | سنہ ۳۵ئہ مین زیادہ تر سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین مین مشغول رہے، اسی کے سا ندوۃ العلماء لکھنو کی مالی حالت کو درست کرنے کی بھی فکر رہی، چنانچہ اُن کی تحریک
کے مشہور مخیر ساہوکار سی عبد الحکیم صاحب نے ندوہ کو پانچہزار روپے کی رقم عنایت کی،

عربون کی جہازرانی | ۱۹۳۱ئہ کے مارچ مین "عربون کی جہازرانی" پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم کی سر
چار خطبے دیئے، جو بڑی دلچسپی سے سُنے گئے، اُن کے اقتباسات بمبئی کے انگریزی اور اردو اخبارات
کئے، ان مین یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہازرانی کی ترقی مین عربون کا کتنا حصہ ہے، ان خطبات
ترجمہ اسلامک کلچر حیدرآباد مین شائع ہوا،

قلمی جہاد | ان کا یہ سال زیادہ تر ان دشمن اسلام عناصر کے خلاف قلمی جہاد مین گذرا، جو مسلمانون
تحریرون سے گمراہ کرنے کی کوشش مین تھے، اسی زمانہ مین انگریزی اخبار اسٹیٹسمین مین ایک مضمون چھپا
مین واقعۂ کربلا کا حال ایسے انداز مین بیان کیا گیا تھا، جو مسلمانون کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھا،
سید صاحب نے سخت احتجاج کیا، اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نصاب مین ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ
اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی داخل ہوئین، تو انھون نے وہان کے اربابِ علم کو
توجہ دلائی کہ ان دونون کتابون مین اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی کے متعلق نہایت
نظریات اور لغو اعتراضات ہین جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہین کر سکتا، مسلمانون کے اخبارات نے
کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابین پنجاب یونیورسٹی سے خارج کر دی گئین، اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنو
کرام علیہم السلام، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی عقائد و اعمال کے متعلق دل آزار مضامین

---

[1] ان سطور کو لکھتے وقت یہ اطلاع ملی کہ یہ انگریزی ترجمہ کتاب کی صورت مین حکومت پاکستان شائع کرنے وا

سید صاحب نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی جس پر عام مسلمانوں نے اتنی مخالفت کی کہ اڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا، جو نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف میں بھی شائع ہوا،

سیرۃ النبی جلد چہارم

۱۹۳۲ء میں سید صاحب کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوتِ محمدی نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا، اس کی اشاعت سے دارالمصنفین کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگ گئے،

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں تقریریں

مارچ ۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی انجمن اردوئے معلٰی کی دعوت پر "ہندوستان میں ہندوستانی" پر ایک خطبہ دیا، یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر کی صدارت میں یونین ہال میں ہوا، جو اس موقع پر بھرا تھا، اس میں سید صاحب نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو کا نام دراصل ہندوستانی تھا، انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی، اُن کی دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی جس میں ان پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی نہیں پیدا کر سکتی ہے، اُن کی تیسری تقریر طبیہ کالج کے ہال میں ہوئی، اس میں اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ وہاں کے طلبہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کریں، کیونکہ ہندوستان کی صحت عامہ کا دارمدار دیسی طب پر ہے جس کی اکثر دوائیں ہمارے ملک کی پیداوار ہیں، وہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے،

تاج محل کے معمار کی تحقیق

اپریل ۳۳ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس کی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی، اس جلسہ میں انھوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا جس کا عنوان "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" تھا، اس میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے بڑی تلاش و تحقیق سے

مرتب کی گئی تھی، اور تاریخ میں پہلی دفعہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نادر العصر استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات
بتائے گئے، اور نہایت مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری
ہے جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد وہ تمام دعوے جو تاج
کے کاریگروں اور معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہو کر رہ گئے،

مغربی ہند کا سفر جولائی سنہ ۳۳ء میں سیرت نبوی پر تقریر کرنے کے لئے بڑودہ تشریف لے گئے، اس کا جلسہ ہزاکسلنسی
دیوان بہادر کی صدارت میں بڑودہ کالج میں ہوا، بڑودہ سے بھروچ، بھروچ سے راندیر، راندیر سے سورت، سورت
سے انکلیشور، اور وہاں سے ڈابھیل گئے، اور ہر جگہ ایک ایک دو دو مذہبی تقریریں کیں،

ضابطہ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب اسی سال حکومت حیدرآباد نے دارالمصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطہ جنایات
کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی، چنانچہ سابق دولتِ عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح
قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا، اور اس کا مسودہ سید صاحب نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا،

خیام اسی سال اُن کی مشہور و معروف تصنیف خیام شائع ہوئی، انھوں نے خیام پر پہلی دفعہ فروری سنہ ۲۴ء
کے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا، جو دراصل پروفیسر اقبال معلم فارسی اورینٹل کالج لاہور کے اس مقالہ کا جواب تھا،
جو انھوں نے "شعر العجم اور عمر خیام" کے عنوان سے رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) میں تحریر کیا تھا، اس مضمون کو قلمبند کرتے
وقت سید صاحب نے خیام کا ناقدانہ مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ
میں ایک مقالہ پیش کیا، ارباب نظر نے توقع سے بڑھ کر اس کی قدر کی، تو یہی مقالہ ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہو گیا
اس کتاب کی ترتیب میں انھوں نے سنین کی تحقیق و تطبیق، واقعات کی تلاش و تفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں
اور خیام کی فلسفیانہ تصانیف کی جستجو میں جو فکر و کاوش کی ہے، وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے، اس سے خیام ایک
بالکل ہی نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لیکر ایران کابل، اور یورپ تک کے فضلا
نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے ان میں ایک تحفہ خیام بھی تھا،

ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس پر پانچ سو روپیے کا انعام دیا، ڈاکٹر سر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا کہ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

سفر افغانستان | اسی سال نادر خان شاہ افغانستان کی طرف سے ایک تعلیمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور سید صاحب کو موصول ہوئی کہ وہ افغانستان آکر کابل یونیورسٹی کی ترتیب تنظیم اور وہاں کے تراجم و تالیف کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں اپنے مفید مشورے دیں چنانچہ سید صاحب[۲۳] اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان سے کابل روانہ ہوئے، پاسپورٹ کے ملنے میں تاخیر ہونے کے سبب وہ اپنے دوسرے رفقائے سفر کے ساتھ نہ ہو سکے، اور کابل اُن کے پہنچنے کے بعد پہونچے، سرکاری طور پر وہاں ان معزز مہمانوں کی بڑی پذیرائی ہوئی علمی انجمنوں نے اُن کو سپاسنامے پیش کئے، اور عام لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا، سید صاحب نادر شاہ افغان سے ملے، تو ان سے مسئلۂ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانے کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان بھی ہو، اور اُن میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو، شاہ افغانستان نے اس مشورہ کو پسند فرمایا، سید صاحب نے اسی قسم کے مشورے وہاں کے ماہرین تعلیم کو بھی دیئے جو انھوں نے قبول کئے، وہاں کے قیام کے زمانے میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے معزز مہمانوں کو ایک سپاسنامہ پیش کیا تو اس موقع پر افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبد اللہ صاحب نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جس میں سید صاحب کے متعلق یہ اشعار تھے،

سوم سید کہ از ندوہ است	ز دانش بہ ہندوستان قدوہ است
ز فیض و مشش تازہ شد جان علم	در اقلیم دانش سلیمان علم
چہ گلکش یعنی طراز ندہ شد	خیالات شبلی از و زندہ شد
چہ در شاہراہ حقایق شتافت	معارف از و رونق تازہ یافت
مضامین او جملہ محکم بود	نگارش بگلکش مسلم بود

کابل سے چل کر غزنین آئے، جہاں حکیم سنائی اور محمود غزنوی کے مزار پر حاضری دی، پھر مقر، قلات غلزئی، قندھار، چمن، کوئٹہ اور ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے اعظم گڑھ واپس آگئے، رخصتانہ میں نادر شاہ نے افغانستان کے بنے ہوئے چار عمدہ قالین، کچھ پشمینے اور اونی کپڑے بھی نذر کئے، اس طویل سفر میں اُن کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا، دن اور رات کے مختلف مشاغل کے باوجود سونے سے پہلے وہ سفر کے تمام کوائف قلمبند کر لیتے، چنانچہ آخر میں ایک سفرنامہ مرتب ہوگیا، جو معارف میں شائع ہوا، اور بعد میں سفرنامۂ افغانستان کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب ہوگئی، اس سفر میں ڈاکٹر اقبال اُن سے بے حد متأثر ہوئے، چنانچہ ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ

> "آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں"۔

جامعہ ملیہ کی توسیعی لکچروں کی صدارت فروری ۳۲ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ آئے، یہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی اولاد میں سے تھے، مصر کی طبی درسگاہ میں علم تشریح کے استاد رہ چکے تھے، وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد یورپ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے، ۱۹۲۰ء میں سید صاحب سے طریطے واقع سوئزرلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی، اسلامی احوال و اجریات پر اُن کا مطالعہ گہرا تھا، جامعہ ملیہ میں آکر چار خطبے دیئے، ڈاکٹر انصاری کے اصرار پر ان کے پچھلے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب ہی نے کی،

سفر رانچی جون ۳۴ء میں صوبہ بہار و اڑیسہ کے وزیر تعلیم آنریبل جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی تشریف لے گئے، ان کے ساتھ ان کے عزیز دوست مولانا مناظر احسن گیلانی (صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) بھی تھے، حکومت بہار نے اُن کو کئی بار مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے تقرر کے سلسلہ میں پبلک سروس کمیشن کا اکسپرٹ ممبر بھی نامزد کیا،

تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم اسی سال کے آخر میں بہت سے ہمدرد اہل علم کے تقاضے اور اصرار پر اسلامی ہند کی

مکمل تاریخ کی تدوین و ترتیب کا ایک خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا ، مسلمانون نے ہندوستان کو جو سیاسی ، قومی ، علمی ، تمدنی حیثیت سے ترقی دی ، اُس کی ایک مکمل اور جامع تاریخ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی ، سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۲ء کے معارف مین یہ تجویز پیش کی کہ ایسی تاریخ پندرہ جلدون مین لکھی جانی چاہیئے ، پورے ملک نے اس تجویز کی تائید کی ، چنانچہ دار المصنفین مین بعض اہل قلم کی خدمات حاصل کر کے اس اہم کام کو شروع کرا دیا گیا ، جو اب تک جاری ہے ۔

زنانہ جامعہ لاہور کا خاکہ جنوری ۱۹۳۵ء مین انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی مین شریک ہوئے انجمن نے اس موقع پر ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنا چاہا تو اس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے ، انھون نے علامہ اقبال کے ساتھ مل کر ایک خاکہ تیار کیا ، اس سفر کے سلسلہ مین لاہور ، لدھیانہ ، سہارنپور ، دیوبند اور دہلی کے علمی و تعلیمی ادارون اور کتب خانون کی بھی سیر کی ۔

ضابطۂ فوجداری حیدرآباد پر نظر ثانی اسی سال ریاست حیدرآباد دکن نے شرعی حیثیت سے وہان کے ضابطۂ فوجداری پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جس مین ایک سابق جج ہائی کورٹ ، مفتی ریاست اور سید صاحب تھے ، اس کمیٹی نے ایک مہینہ مین اپنا کام پورا کیا ،

سیرۃ النبی جلد پنجم اسی سال اُن کی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبی کی پانچوین جلد شائع ہوئی ، اس کا موضوع عبادات ہے ، سیرۃ النبی کی جلدین ہند اور بیرون ہند مین بے حد مقبول ہو رہی تھین ، ہندوستان مین ان کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی ، اور ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن شائع ہوئے ، پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ٹرکی مین اُس کی تین جلدون کا ترجمہ ہوا ، اور وہان اُن کی مقبولیت کا اندازہ نواب فخر یار جنگ کے حسب ذیل مکتوب سے ہوگا ، جو انھون نے سید صاحب کو تحریر فرمایا :-

"مین کچھ عرصہ ہوا ترکی گیا تھا ...... وہان ایک بڑی جماعت ایسے لوگون کی ملی جو سیرۃ النبی مبارک کی بڑی مداح ہے ، اور اس کا جو ترجمہ ترکی مین ہو چکا ہے ، اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہین ، خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہو چکا ہے ، وہان زیادہ لوگ نہین ملے لیکن بروصہ مین جو سابق عثمانیہ

کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سو سال کے اندر حکومت کرتا ہے، بہت سے احباب کو سیرۃ النبی کا ذکر بھی ہے

کرتے سنا، خدا آپکے مساعی جمیلہ کو بار آور کرے"

فارسی میں بھی سیرۃ النبی کی چند جلدوں کا ترجمہ کابل میں کیا گیا، مگر مقتطف اور مصر میں اس کے عربی ترجمہ کا خیال ہوا۔

اردو ہندی کا جھگڑا | اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مرض ذات الجنب کا شدید حملہ ہوا، کئی مہینہ کے بعد شفا ہوئی، تو ڈاکٹروں نے چھ مہینے تک مکمل آرام لینے کی ہدایت کی، تین مہینے دہرہ دون جیسے صحت بخش مقام میں جاکر قیام بھی کیا، اور آرام کے بعد اپنے علمی مشاغل پھر شروع کئے، تو اردو ہندی کے روز افزوں جھگڑوں سے اُن کو بہت دکھ پہنچا، معارف کے شذرات کے ذریعہ اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اردو دونوں کیلئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں کیونکہ زمانہ یہ فیصلہ کرچکا ہے کہ نہ اُردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، اور نہ ہندی اردو کو، دونوں اپنی اپنی راہیں چلتی رہیں گی، انھوں نے یہی خیالات علی گڑھ میں آل انڈیا اردو کانفرنس میں ظاہر کئے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

فلسطین کانفرنس کی صدارت | یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نیا نقشہ بننے کو تھا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی اُبال اور مذہبی جوش پیدا ہوا، مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد سید صاحب نے فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی، اور مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر ۲ نومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی، اس میں جو خطبہ پڑھا، وہ دنیائے اسلام میں بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اُس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ اُن کا شکریہ ادا کیا،

ایک ناخوشگوار واقعہ | وہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے کہ ایک بر خود غلط اہل قلم نے ۵ صفحہ کا ایک رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" لاکر اُن کے ہاتھ میں دیا، جس میں اُن کی تصانیف میں سے گیارہ غلطیاں فراہم کرکے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں، دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں ان اعتراضات کا جواب شائع ہوا، تو رسالہ کے مرتب نے مطمئن ہونے کے بجائے سید صاحب کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی، لیکن دہلی کے اس زمانہ کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمٰن صاحب

کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہوگیا، اور سید صاحب کو عدالت مین حاضر ہونے کی نوبت نہین آئی،

ہندستانی اکیڈمی کے جلسہ کی صدارت

جنوری ۱۹۳۶ء مین لکھنؤ کی نمایش گاہ مین ہندستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس کے شعبۂ اردو کی صدارت کی، اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، لیکن اس کانفرنس مین اردو اور ہندی کے دو خیمے علٰحدہ علٰحدہ تھے، ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اس سے سید صاحب کو بڑا دکھ ہوا، اور اسی وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانون کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہین، جیسا کہ انھون نے فروری ۱۹۳۶ء کے معارف مین اظہار کیا ہے،

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی

مارچ ۱۹۳۷ء مین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی علی گڈھ مین ہوئی، تو اس کے شعبۂ علوم و فنون اسلامی کی صدارت کی، اس مین خطبۂ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ "عرب اور امریکہ" کے عنوان سے پیش کیا، جس مین یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہازران امریکہ پہونچ چکے تھے کیونکہ ان کو زمین کی گولائی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصون کا علم تھا، اسی لئے ماوراے بحر ظلمات تک پہنچنے کی کوشش کی،

سفر مدراس و حیدرآباد

اکتوبر ۱۹۳۷ء مین جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس کا خطبۂ اسناد دینے کے لئے وہان تشریف لے گئے، مدراس کو اُن سے اور اُن کو مدراس سے ذاتی اُنس ہوگیا تھا، مدراس سے حیدرآباد آئے، وہان اُن کی آمد کی اطلاع اخبار مین حضور نظام کی نظر سے گذری، تو اُن کے لئے خاصہ بھیجا، اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، اس قیام کے زمانہ مین دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اُن کے اعزاز مین نواب مہدی یار جنگ کی صدارت مین ایک جلسہ کیا، جس مین انھون نے اپنا ایک مقالہ عربی زبان مین "ابوالبرکات بغدادی اور اُس کی کتاب المعتبر" کے عنوان سے پڑھا، اسی روز سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر کشن پرشاد نے اپنے یہان مدعو کرکے ایک خلعت عطا کیا، اس سفر سے اعظم گڈھ واپس آئے تو حضور نظام نے اُن کے لئے سو روپیہ ماہانہ کا ذاتی وظیفہ مقرر کرکے ان کے علم و فضل سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا،

ودیا مندر اور اردو اسکیم ۱۹۳۸ء میں سی پی میں ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم کی مہم شروع ہوئی، اس میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لئے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا، تو سید صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا، اور معارف کے ذریعہ یہ اعلان فرمایا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، پھر مسلمانوں نے جب کانگرسی وزارتوں کی واردھا اسکیم کی مخالفت شروع کی تو سید صاحب نے اُن کو بیجا جوش عمل کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی، اور یہ مشورہ دیا کہ "اسلامی صوبوں کی وزارتیں دارالقضاء، اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں، اور ان کو عمل میں لائیں تاکہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل سکیں"، مگر افسوس کہ اسلامی صوبے اس کام کو اب تک انجام نہ دے سکے ہیں،

سیرۃ النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء میں اُن کی سیرۃ النبی کی چھٹی جلد شائع ہوئی، اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم جلد ہے، یوں تو تمام جلدیں جدید علم کلام کی اساس ہیں،

نقوش سلیمانی اسی سال اُن کی کتاب نقوش سلیمانی بھی شائع ہوئی، یہ ان خطبوں تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق اُن کے قلم سے نکلے، یہ گویا پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا ایک مرقع ہے، اس لئے یونیورسٹیوں کے نصاب میں جلد داخل ہو گئی،

سفر دکن ۱۹۴۰ء کا آغاز ادبی اور علمی سفروں سے کیا، ۲۵ جنوری کو وہ ندوۃ العلماء کے کام سے حیدرآباد دکن گئے، وہاں سے پونہ آئے، اور دکن کالج میں ایک تقریر مسلمانوں کے تمدن پر کی، اس میں مسلمانوں کو خود یہ تجزیہ کرنے کو کہا کہ اسلامی کلچر کو وہ اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں، یا اس کو غیر برباد کر رہے ہیں، پونہ سے بمبئی آئے، وہاں کے اسمٰعیل کالج کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک تقریر کی جس میں فرمایا کہ دنیا کی قوموں نے جب کبھی ترقی کی ہے تو اس کی قوت بازو کے دو ہی پر ہوتے ہیں، ایمان اور عمل، ہمارے نوجوان ان دونوں سے بے پروا ہو کر ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے، اسمٰعیل کالج کے ہال میں ایک دوسری تقریر دکن اور گجرات میں اردو زبان کی تاریخ پر کی،

سفر سرحد و پنجاب اس سفر سے واپسی کے بعد ابھی تکان بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ پشاور، بہاولپور اور لاہور کا

سفر کرنا پڑا، اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے ایک تجویز یہ تھی کہ اس میں ایک ایسا شعبہ کھولا جائے جس میں بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختصر عربی، دینیات اور طب کی تعلیم دی جائے، جو گاؤں میں پھیل کر اپنی روزی بھی کمائیں، اور مسلمانوں کی مذہبی خدمت بھی کریں، اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سید صاحب مدعو کئے گئے، وہاں پہنچ کر مجوزہ نصاب کی ترتیب دینے کے علاوہ مختلف عنوانات پر کئی تقریریں کیں، جن میں وہاں کے نوجوانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ مسلمانوں کے اکثریت کے صوبے میں رہنے والے کی حیثیت سے اپنے کو ایمان و عمل میں اتنا ممتاز بنالیں کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اُن کے پیچھے چلیں، پشاور سے لاہور آئے، یہاں کے اصحاب علم نے بڑی پذیرائی کی، مختلف دعوتوں میں علمی و قومی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے، لاہور سے بہاولپور آگئے، جہاں کی جامعہ عباسیہ ۱۹۲۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی کے طرز پر قائم ہوئی تھی، یہاں کے وزیر تعلیم میجر شمس الدین اُس کے نصاب میں مزید اصلاح چاہتے تھے، سید صاحب نے پہنچ کر ضروری اصلاح کی، اس موقع پر وہاں کے صادق ایجرٹن کالج کی تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، تو خطبۂ اسناد سید صاحب ہی نے دیا، دوسرے دن رات کو اسی کالج کے ایک بہت بڑے جلسہ میں "خصائص اسلامی" پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی، پھر شہر کی جامع مسجد میں "فضائل نبوی" پر ایک وعظ میں مسلمانوں کو نسبت نبوی کے شرف کی بنا پر شرف الامم ہونے کی حیثیت سے خیر الامم بننے کا شوق دلایا، اور اولاد کو اسی رنگ میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا،

رحمت عالم | اسی سال بچوں کے لئے "رحمت عالم" لکھی جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہے، گو یہ بچوں کے لئے لکھی گئی تھی، لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں،

مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری | ۱۹۴۱ء کے نومبر میں ان کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملی، یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اُن کے علمی و ادبی کمال کا اعتراف تھا، لیکن اُن کے علمی فضائل اس رسمی ڈگری سے بہت بلند ہو چکے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کیا، فرماتے تھے جس وقت اس قسم کے اعزاز کی تلاش تھی، اس وقت یہ ملے نہیں، اب اِن کی کوئی خواہش نہیں، اس لئے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے سے کیا فائدہ،

روحانی انقلاب | اسی سال ان میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا، اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل میں تھے، جب کہ ہندوستان کیا، بلکہ عالمِ اسلام کے ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک بے مثل ادیب، ایک وسیع النظر مورخ، ایک اچھے سیاسی مفکر، اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، اُن کی نجی زندگی بھی بڑی پاک وصاف رہی، اور اُن کے نزدیک رہنے والوں کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ

ع مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

لیکن اپنی دینی عظمت اور علمی جلالت کا لحاظ کئے بغیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے آستانہ پر جاکر اپنا سرِ نیاز جھکا دیا، حضرت مولانا کو بھی علم وفن کے ایک شہباز اور گلستانِ رسالت کے ایک عندلیبِ خوشنوا کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی، اس تعلق کے بعد سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے، گو اُن کی پوری زندگی، دینداری اور پرہیزگاری میں گذری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد اُن کی دینداری میں تقویٰ و ورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہوگیا، عبادت وریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر وخطابت نے وعظ وپند کی شکل اختیار کرلی، زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد وہدایت میں صرف ہونے لگا، اس انقلاب کے بعد اپنی تمام پرانی تحریروں پر نظرثانی کی، اور جس میں ذرا بھی جمہور امت سے اختلاف کا شائبہ یا خلافِ احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کیا، چنانچہ "رجوع واعتراف" کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں ایک تحریر شائع کی جس میں فرماتے ہیں کہ

"مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید تنہا نہیں ہوسکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے لیکن کبھی کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی جس کی تائید ائمۂ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو، خصوصیت کیساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے، ایسا بھی دوچار دفعہ ہوا کہ

ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہو، یا اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہو، تو بعد کے اڈیشن میں اس کے مطابق تبدیل کر دی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری مجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے نہیں مل سکا اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے اڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی، اسی طرح فناے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی راے کا اضافہ کرکے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی، اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آگیا ہے"

اسی طرح وہ پہلے تصویروں کے کھنچوانے کو جائز سمجھتے تھے، اور زیوروں میں زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قائل تھے لیکن اس رجوع کے بعد جمہور علما کا مسلک اختیار کیا، اس سلسلہ میں تحریر فرمایا،

"یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بار الٰہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضاے بشری سے مجھ کو غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہ صواب دکھا"

اس رجوع و اعتراف کو اُن کے مرشد نے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا،

اُن کو مرشد کی طرف سے خلافت بھی عطا ہوئی تھی جس کے بعد وہ خاص خاص لوگوں کو بیعت بھی کرنے لگے تھے، جولائی ۱۹۴۳ء میں اُن کے مرشد کا وصال ہوا تو بڑے سوز و درد اور غم کے ساتھ "موت العالم موت العالم" کے عنوان سے ماتم کیا، اُن کی رحلت کے بعد اُن کی سوانحعمری لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن یہ پورا نہ ہو سکا،

اصلاحی کام | جنوری ۱۹۴۷ء میں نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ترتیب کے لئے ایک مجلس بنائی گئی جس کا پہلا اجلاس دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہوا، اس کے ارکان سید صاحب کے علاوہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، اس میں یہ طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک

چنانچہ ۳۷ء کے اگست میں جب راجندر بابو کی پیکٹ ہوا تھا تو اس میں یہی طے ہوا تھا کہ ہندوستان میں جو سرکاری زبان ہو، وہ اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیئے اور اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا یہ معیار ہو کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے، اسی پیکٹ کے بعد حکومت بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے لیکن بہار اور اردو دونوں مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ حل نہ کر سکے، اور یہ سیاست کے سیلاب کے تیز دھارے میں بہہ گیا،

رانڈیر اور سورت کا سفر | سید صاحب کا مدراس بمبئی حیدر آباد اور دہلی کا سفر ستمبر ۴۴ء میں شروع ہوا تھا اور اپریل ۴۵ء میں ختم ہوا، اُن کی صحت برابر گرتی جارہی تھی، پھر بھی اُن کے عقیدت مندوں کا اصرار ہر جگہ سے ہوتا کہ وہ اپنے قدوم لزوم میمنت سے اُن کے علمی جلسوں اور تعلیمی کاشانوں کو شرف بخشیں، ان کو بھی اپنے دینی اور علمی مشن کو جلد از جلد تکمیل کرنے کی دھن ایسی تھی کہ دور دراز مقامات کا سفر کرنے میں اپنی خرابی صحت کا خیال مطلق نہ کرتے، چنانچہ جولائی ۴۵ء میں رانڈیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے، اور جامعہ حسینیہ میں "تجدید و اجتہاد علمی المعاش والمعاد" کے عنوان سے ایک تقریر کی، اور مدرسۂ اشرفیہ میں "خشیت الٰہی" پر خطبہ دیا، اسی سفر میں کچھ دنوں بمبئی اور سورت میں بھی مقیم رہ کر

شدید علالت | اعظم گڈھ واپس آئے تو حوالی قلب میں ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا، اور حالت بہت ہی نازک ہو گئی، شفا ہوئی تو اطبا نے دماغی اور علمی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، لیکن عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا چھوٹ جانا مشکل تھا، اس لئے معارف کے صرف شذرات اور ہلکے پھلکے مضامین ہی لکھنے پر اکتفا کیا، معارف کے شذرات کے ذریعہ مسلمانوں کو دینی و ملی احیاء کی تلقین فرماتے رہے، اور اُن کو "تہذیب" اور "تفریح" دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا،

ندوہ میں قیام کی تجویز | صحت کی خرابی کے بعد اُن کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں مستقل قیام کر کے اسکی تعلیمی و مالی حالت درست کریں، وہ تقریباً چالیس سال تک ندوہ کے معتمد تعلیمات رہے، اور اعظم گڈھ سے ندوہ برابر آتے جاتے رہتے تھے وہاں کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر نبٹانے کی کوشش کرتے، کبھی اساتذہ کی باہمی کشمکش کو دور کرتے، کبھی اسکی مالی اصلاح کے لئے طرح طرح کی تجویزوں کو عمل میں لاتے، کبھی معلم بن کر درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے، وہاں کے

طلبہ کا اعتراف ہوکہ وہ کسی درجہ میں صرف و نحو پر باتیں کرتے، تو معلوم ہوتا کہ سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے، ادب عربی کی فصاحت و بلاغت پر کچھ کہتے، تو اندازہ ہوتا کہ جاحظ اور جرجانی سامنے ہیں، ابو علی سینا کی مشہور کتاب نجاۃ کبھی پڑھا دیتے تو طلبہ کی آنکھیں کھل جاتیں، اگر بخاری یا مسلم کے درس میں اپنے نکات بیان فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل میں گذاری ہے، فقہ اور اصول میں بھی بڑی عقدہ کشائی کرتے،

قیام بھوپال | ندوۃ العلماء میں اُن کے مستقل قیام کی صورت ممکن نہ ہوسکی، اسی اثناء میں نواب حمید اللہ خان والی بھوپال نے اُن کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دار القضاۃ اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کردیں، ٣٩ء و ٤٠ء میں نواب صاحب موصوف نے ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہوکر سید صاحب کی صدارت میں ماہرین تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس نے ان مدارس کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا اور اُن کی اصلاح و تنظیم کے لئے ضوابط بنائے، اس خاکہ کو عملی صورت میں لانے کے لئے نواب صاحب سید صاحب کو بھوپال برسوں سے مدعو کر رہے تھے، بقول جناب شعیب صاحب قریشی "قاضی ریاست کا عہدہ تو اُن کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا، لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کرسکے" چنانچہ جون ٤٦ء میں وہ بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے، لیکن دار المصنفین اور ندوۃ العلماء سے تعلقات بدستور سابق قائم رہے، جس مقصد کے لئے بھوپال تشریف لے گئے تھے، اس کی تکمیل کے لئے وہاں اکتوبر ٤٩ء تک قیام کیا، لیکن اگست ٤٨ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے لیل و نہار ہی بدل گئے، اس اثناء میں وہ معارف کے لئے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے معاصرین کی رحلت پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے، وفیات لکھنا ان کا خاص فن ہوگیا تھا، چنانچہ اُن کے معاصر جناب عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ "سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے، جو اُن کے سامنے وفات پا جائے، اور اُن کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ میں آئے"، کبھی کبھی معارف میں شذرات بھی لکھ دیتے، اُن کے آخری شذرات جون ٥٠ء کے معارف میں شائع ہوئے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے

"ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعاً ضروری

نہیں سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹاکر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو، اور مسلمان مسلمان رکھ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں اور اب بھی ہیں"

یہ گویا ہندوستان والوں کے نام اُن کا آخری پیام تھا،

سفرِ حج | ۱۹۴۹ء کے اکتوبر میں وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان سلمہٗ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر بنائے گئے، اور حجاز پہونچکر شاہ ابن سعود کے مہمان خاص رہے، ابن سعود نے کئی بار اُن کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا، حج کے بعد مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا، بارگاہِ نبوی میں رسول اکرم کے سوانح نگار نے اپنے درد و عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، کیف و سرور کا اظہار ایک نعتیہ غزل میں کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں،

کی مدنی ہاشمی و مطلبی ہے — آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے

پاکیزہ تر از عرش و سما جنتِ فردوس — آرامگہِ پاکِ رسولِ عربی ہے

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست ہو آواز — خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے

بجھ جائے تری چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج — جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

مدینہ منورہ میں عالمِ اسلام کے علما کا جب کوئی چھوٹا بڑا اجتماع ہوتا، تو اس میں وہ بھی مدعو کئے جاتے، اور ہندی زائرینِ حج کا بیان ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو کرتے تو سب میں ممتاز نظر آتے،

حج سے دسمبر ۱۹۴۹ء میں واپس ہوئے تو بمبئی پہونچ کر سخت علیل ہوگئے، وہاں اعظم گڈھ کے سیٹھ عبد العزیز انصاری صاحب نے بڑے اخلاق و محبت و فیاضی سے اُن کی تیمارداری کی، شفا پائی تو جنوری کے وسط میں بھوپال آئے، وہاں سے اپریل کے آخر میں اپنا تعلق ختم کر دیا، اہل و عیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہاں کانپور آ گئے، وہاں سے لکھنؤ ہوتے ہوئے مئی میں اعظم گڈھ آئے، بھوپال سے کئی بار اعظم گڈھ آتے جاتے رہے لیکن اس مرتبہ کی آمد سے رفقائے دار المصنفین خوش تھے کہ

پھر مستقل قیام کے لئے یہاں آجائیں گے، اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہو جائے گی، اب ان کو مکمل راحت اور سکون کی بھی ضرورت تھی،

ہجرت | لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے ان کو مسلمانوں کی ایک نوزائیدہ سلطنت کی آخری خدمت کے لئے جون ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچا دیا، وہ کراچی گئے، تو ہندوستان میں اپنی ساری چیزیں اور ساری املاک چھوڑ کر گئے، اس ہجرت سے اُن کو شدید مالی نقصانات پہونچے، رحمۃ للعالمین کے سیرت نگار کو رب العالمین نے سب کچھ عطا فرمایا تھا، ایک ہجرت کی سعادت باقی تھی، وہ بھی پوری ہوگئی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگار کو اپنے محبوب رسول کی طرح مہاجر ہی بن کر اپنی زندگی کا خاتمہ بالخیر کرنا تھا، وہ پاکستان کے شہری بن گئے، تو ۱۹۵۳ء میں معارف پر سے نہایت دکھ کے ساتھ بعض مجبوریوں کی بنا پر ان کا اسم گرامی ہٹانا پڑا، جو اس کے سرورق پر دُرِّ آبدار کی طرح ۱۹۱۶ء سے چمکتا رہا تھا، لیکن معارف پر اُن کا نام رہے یا نہ رہے، یہ اُن ہی کی یادگار ہے، اس علمی رسالہ نے ملک کا جو بلند پایہ علمی ذوق بنایا، اور مضمون نگاروں کو تحقیق و تلاش اور دقتِ نظر سے مضامین لکھنے کا جو سلیقہ سکھایا، پھر مستشرقین یا گمراہ مسلمان اہل قلم نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب کبھی زہر اگلا، اس کے خلاف اس میں جو تریاق پیش ہوا، وہ سب معارف ہی کے فیض ہیں، اگر وہ کوئی اور علمی کام نہ بھی کرتے تو صرف معارف کی ادارت ہی اُن کو زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھی

اب وہ دار المصنفین کے ناظم بھی نہیں رہ گئے تھے اور یہ اس ادارہ کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اس سے علٰحدہ ہوگئے، گو وہ اس پر خوش تھے کہ اپنی زندگی ہی میں موت کے بعد اس کا نقشہ دیکھ لیا لیکن درحقیقت اس کے جریدہ پر ان ہی کا دوام ثبت ہے، سید سلیمان ہی دار المصنفین ہیں، اور دار المصنفین سید سلیمان، جو ایک اسم کے دو مسمّی اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں، وہ ہندوستان میں علوم و فنون کا ایک تاج محل بنا کر پاکستان چلے گئے اُن کے بعد جب کوئی علمی سیاح اس تاج محل کو دیکھنے آتا، تو اس کو دیکھتا تو ضرور لیکن اُن کی عدم موجودگی میں اس تاج کو چودہویں رات کی چاندنی میں دیکھنے سے محروم رہتا،

اہلِ پاکستان کی مسرت | جب سید صاحب پاکستان کے باضابطہ شہری بن گئے، تو وہاں کے خواص و عوام کو بڑی

خوشی تھی کہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سیرت نگار اور عالم اسلام کا ایک متبحر عالم اُن کی مملکت کا باشندہ ہو گیا ہے، حکومت پاکستان نے دستور بنانے کے سلسلہ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا، سید صاحب کو اس کی صدارت ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر پیش کی گئی، لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا، اور رضاکارانہ طور پر وہاں کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی کاموں میں لگ گئے،

سنہ ۵۰ء کے نومبر میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اُن کے اعزاز میں ایک علمی جلسہ کیا، جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر مرکزی کابینہ نے کی، اور سید صاحب نے اپنا ایک مقالہ "ہندوستان کے نومسلم حکمران" پڑھا، لیکن اُن کے پاکستان جانے کی جو اصلی غایت تھی، اس کو اس عاجز راقم کو ایک مکتوب لکھ کر اس طرح ظاہر فرمایا، :

"یہاں اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحاب اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے، مسلمانوں سے اس کی اشاعت اور علوم دین کی حفاظت کا کام مقدم ہے"،

ان ہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ ارباب حکومت سے ملتے اور موقع بموقع اُن کو تلقین کرتے رہے، پھر اسی خیال سے اپنی قیامگاہ کے قریب ہی زیر تعمیر جامع مسجد میں قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا، اس جامع مسجد کا نام انھی کے نام پر جامع سلیمانی رکھا گیا، اس درس میں شرکاء کی تعداد اتنی بڑھی کہ لاؤڈ اسپیکر لگانے کی ضرورت ہوئی، اس مسجد کے چاروں طرف درس و تبلیغ کے کمرے، ایک کتب خانہ اور ایک علمی ادارہ بھی بنانے کا خیال تھا، لیکن یہ اُن کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا،

سلہٹ جمعیۃ العلماء کی صدارت

جمعیۃ العلماء اسلام کی دعوت پر جنوری سنہ ۵۱ء میں ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کا ایک دورہ بھی کیا، سلہٹ کے جمعیۃ العلماء اسلام کے ایک جلسہ میں ایک پر مغز صدارتی خطبہ بھی دیا، جس میں مذہبی اور دینی خدمت کی ترغیب دینے کے علاوہ پاکستان کی اقلیتوں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی بھی نصیحت کی، چنانچہ فرماتے ہیں:

"میں نے جب کبھی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا، تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی، مسلمانوں کا فرض ہے کہ خواہ کسی دوسرے ملک میں اُن کے ہم

ہم مذہبوں پر جو کچھ گذرے مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری پوری حفاظت کریں، اور اسی طرح دوسرے ملک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد کرسکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاہد) پر ظلم کریگا تو قیامت کے دن خدا کے سامنے اسکا دامن پکڑونگا اور یہ بھی فرمایا کہ جو اس پر ظلم کریگا وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھیگا

اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ ایک مسلمان پر غیر مسلم اقلیت کی جان و مال، عزت و آبرو کا کتنا بڑا فرض ہے،

تعلیمی و قومی سرگرمیاں

وہاں سے واپسی کے بعد موتمر اسلامی کا جلسہ تھا جس میں انھوں نے شرکت فرمائی اس کے بعد ہی ٹانڈہ میں ایک دینی درسگاہ قائم ہوئی، تو اس کی تاسیس میں پورا حصہ لیا، اور اس کے سرپرست مقرر ہوئے، اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا ایک کمیشن مقرر ہوا تو اس کے ممبر بنائے گئے، نومبر ۵۱ء میں ملتان میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا، تو اس میں شرکت کی، پھر قائد اعظم کی یادگار میں ایک مجوزہ دار العلوم کی جو کمیٹی بنی اس کے بھی رکن ہوئے، اور اس کے لئے لاہور، ملتان اور راولپنڈی کا سفر کیا، دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے بھی ممبر مقرر کئے گئے، اس کمیٹی میں ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کو قرآن اور سنت کے اتباع کی اہمیت یہ واضح کرکے بتائی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کتاب اور سنت کی جو دو نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ہدایت الٰہی انہی دونوں کے اندر منحصر ہے، اب جو بھی ایک کو چھوڑ کر صرف دوسری پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا، اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہیں سکتا، سید صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت بار بار کی، چنانچہ مذکورہ بالا کمیٹی کے ممبروں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی، اور انھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، جو قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہو،

فروری ۵۲ء میں انھوں نے دنیائے اسلام کے تمام علماء کو کراچی میں مدعو کیا، یہ کانفرنس احتفال علمائے اسلام کے نام سے منعقد ہوئی، اس کی کامیابی کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں عاجز راقم کو تحریر فرماتے ہیں،

"احتفال علمائے اسلام کی مشغولیت کے سبب جواب نہ دے سکا، احتفال کامیاب رہا، گو ادھر کے علماء کی شرکت نہ ہوسکی تاہم مختلف ملکوں کے علماء یکجا ہوگئے، خصوصاً ایران اور نجف کے علماء کی آمد سے شیعی اور

شیعہ علماء کے درمیان توافق بحمداللہ پیدا ہوا، اور ہم آہنگی ہوگئی؛

مارچ ۵۱ء میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبۂ اسلامی تاریخ کی صدارت کی، اور ایک مقالہ بھی "دین" کے عنوان سے پیش کیا، وہاں عربی زبان و ادب کی بھی ایک کانفرنس ہوئی، اس کی بھی صدارت انھوں نے فرمائی، پھر اسی مہینہ پنجاب یونیورسٹی میں اُن کا ایک توسیعی لکچر بھی ہوا،

اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع الفواد الاول نے اُن کو اپنا رکن بنایا، ابو علی سینا کی جوبلی کے موقع پر حکومت عراق نے اُنکو اپنے یہاں مدعو کیا، لیکن اس میں شرکت نہ فرما سکے،

اپریل ۵۲ء کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گذارا، یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے، تعلیم کے لئے مفید مشورے دیے، ملتان کو قائداعظم کے مجوزہ دارالعلوم کیلئے پسند فرمایا،

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر نامزد کئے گئے، جناب لیاقت علی خان مرحوم کی یاد میں ... نے پانچ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کتب خانہ قائم کرنا چاہا، تو اس کی تاسیس و تشکیل کی خدمت انہی کے سپرد ہوئی، ان کے ذریعہ پاکستان کے مذہبی و قومی کام تو انجام پا رہے تھے، لیکن خود ان کے لئے وہاں اب تک کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، چنانچہ ایک مکتوب میں اس راقم کو تحریر فرمایا کہ معاشی صورت پیدا کرنے کا ارادہ ہے کہ وہی پیشۂ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے، چنانچہ مکتبۃ الشرق کے نام سے کتابوں کی ایک دوکان کھلی، آئین کے سلسلہ میں وہاں کی حکومت نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا، اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جا رہی تھی، لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، لیکن ہجرت کے تقریباً ستائیس مہینے کے بعد یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا، وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۸ اگست ۵۲ء میں اس حقیر کو تحریر فرماتے ہیں کہ

"یہ (یعنی عہدۂ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلام) دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شرطیں رکھی تھیں، وہ اب پورے ہو رہے ہیں، یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کرنے کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو میں نے ۱۸ اگست کو قبول کر لیا، تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جا سکے"

گرآئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے"

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اپنے شرائط پر عہدہ قبول کیا، تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا،

۱۹۵۰ء کے آخر میں جمعیۃ العلمائے اسلام کے صدر مقرر ہوئے، اور اس نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے میں جو مساعی کی، اس میں اُن کا حصہ نمایاں رہا،

۱۹۵۳ء کے مارچ میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کیلئے ڈھاکہ تشریف لیگئے، وہاں خطبۂ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازع کے سلسلہ میں اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا جو وہاں کے ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہیں آیا، اسلئے جب کانفرنس کا اجلاس دوسرے روز شروع ہوا، تو انھوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی جس سے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا، اور جب سید صاحب موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیامگاہ کو واپس جانے لگے، تو شرارت پسند طلبہ نے اُن کی موٹر گھیر لی، ناروا الفاظ استعمال کئے، اور تشدد پر آمادہ ہو کر اُن کی اہانت پر اُتر آئے، لیکن وہ اُن کی اہانت نہیں کر رہے تھے، بلکہ علم و حکمت، تحقیق و بصیرت، تفکر و تدبر، عظمت و جلالت، اور متانت و وقار کی تذلیل کر رہے تھے، مشرقی بنگال کے طلبہ کا یہ شرمناک رویہ اُن کی قومی زندگی پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ بن کر رہے گا، یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا، تو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے صاحب کی قیامگاہ پر آکر اظہار ندامت کیا، اور معافی مانگی، لیکن اُن کی ذات والا صفات ان رسمی باتوں سے بہت ہی بلند تھی، ڈھاکہ سے کراچی واپس جانے لگے تو ہندوستان میں اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فتح پور ہسوا کے یہاں آکر ٹھہرے، یہیں دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت بنکر اُن کی قدمبوسی کیلئے حاضر ہوا، وہ اپنے گلشن فرزندی کو دیکھکر بیحد مسرور ہوئے، بڑے لطف و محبت سے پیش آئے، اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین میں آکر گذاریں گے، جس سے دارالمصنفین میں اُن کی روحانی اولاد بہت خوش ہوئیں، اسی سفر میں دارالعلوم ندوہ کی مقناطیسی قوت نے اُن کو اپنی طرف کھینچا، اور وہ فتح پور سے کھنچ کر ندوہ چلے گئے، وہاں کے طلبہ اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے بڑے والہانہ انداز سے ملے، اور وہ بھی اپنے محبوب فرزندوں سے مل کر اشکبار ہوئے، اُن کے اعزاز میں جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا، تو پورا بھر گیا، جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، اور درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھا

یعنی اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو میں اپنے آپ کو مانند مہمان لیکے آیا ہوں'

اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، جلسہ کی کارروائی، تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی، قاری نے شروع میں یہ آیت پڑھی،

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ جب کہ قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعنی حضرت

اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ یعقوبؑ) نے کہا کہ میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں،

تُفَنِّدُوْنَ، (یوسف) اگر تم مجھ کو بیوقوف نہ بناؤ،

اس کو سن کر تمام حاضرین متأثر ہوئے خود سید صاحب ضبط نہ فرما سکے، بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، گویا سماں بندھ گیا، ایک طالب علم نے عربی میں سپاسنامہ پڑھا جس کے بعد سید صاحبؒ بڑے درد بھرے انداز سے اپنی تقریر شروع کی، پوری تقریر سوز و درد کا مرقع تھی، اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان فرمائے، اور آخر میں اپنے عزیز طلبہ کو یہ پیام دیا،

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلبہ کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا جو ان کی مادر درسگاہ کے ہر زمانہ کے طلبہ کے لئے باقی و جاری رہیگا،

دارالمصنفین کے خدام رمضان المبارک کے بعد اعظم گڈھ اُن کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے کہ پہلے ایک خط میں موانع سفر کے اسباب لکھے، پھر اپنی علالت کی اطلاع دی، آخری خط میں اُن کے روبصحت ہونے کی بشارت تھی لیکن ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو عشاء کے بعد یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، آہ!

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا،

وہ ہم سے رخصت ہوگئے اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں :-

رفتم واز رفتنِ من عالمے تاریک شد من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مگر عالم بالا میں اُن کو دیکھ کر فرشتے پکار رہے ہونگے ع جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمد کا"

بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات

از

مولانا ابوظفر صاحب ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، جیسا کہ اُن کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن مرحوم کے سفینہ میں درج ہے، مقام ولادت صوبہ بہار ضلع پٹنہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں دسنہ نامی ہے، جو بہار شریف سے تین چار کوس کے فاصلہ پر واقع ہے، جہاں زیادہ تر سادات آباد تھے، اور اس کے باشندوں کی بڑی تعداد تعلیم یافتہ ہونے کے سبب اُس کی شہرت دور دور تک تھی جس گھر میں علامہ کی ولادت ہوئی تھی، وہ گھر آج بھی مسجد کے متصل موجود ہے

آپ کا اصلی نام سید ابونجیب ہے کیونکہ خاندانی نام زیادہ تر "ابو" پر ہیں چنانچہ اُن کے چچا کا نام ابوتراب، اور دوسرے کا ابویوسف، اور اُن کے بڑے بھائی کا نام ابوحبیب تھا،

آپ کے منجھلے چچا سید ابوتراب دہلی، لکھنؤ وغیرہ کا سفر کر چکے تھے، اور آج سے تقریباً ستر سال قبل جدید تہذیب سے متأثر ہو کر سر سید احمد خان کے ہم خیال ہو گئے تھے، اِن ہی نے اُن کا نام سلیمان رکھا تھا کہ جب وہ لندن تک جا پہنچیں گے، تو لوگ اس کو "مسٹر سلومن" کہیں گے چنانچہ اسی نام سے اُن کی شہرت ہوئی، اور علامہ موصوف نے خود بھی اسی کو پسند فرما کر اپنا نام سید سلیمان قرار دیا،

لطف کی بات یہ ہے کہ واقعی اپنے چچا کی زندگی ہی میں علامہ موصوف لندن گئے جس پر انھوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ میری پیشین گوئی صحیح نکلی،

آپ کا پدری سلسلہ نسب امام موسیٰ رضا تک پہنچتا ہے، اور مادری امام زید تک،

ابتدائی تعلیم | آپ کی عمر چار یا پانچ برس کی ہوگی کہ آپ کی بسم اللہ ہوئی، اور وہ مکتب مین بٹھا دیئے گئے، آپکے پہلے استاد کا نام مولوی مقصود علی تھا، مولوی صاحب موصوف خاکسار کے بھی پہلے استاد تھے لیکن مین اس قدر کم عمر تھا کہ انکی علمی قابلیت کا صحیح اندازہ اس وقت نہ لگا سکا، البتہ اس قدر یاد رہ گیا ہے، کہ فارسی کی بڑی چھوٹی سب کتابون کا درس دیتے تھے،

مجھے ہندوستان کے دوسرے صوبون کا حال نہین معلوم لیکن آج سے ستر پچھتر برس قبل، صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کے دیہاتون مین مکاتب کا نظام میری ابتدائی عمر تک موجود تھا،

گاؤن کا کوئی زمیندار کسی مولوی کو بہت معمولی تنخواہ پر اپنے بچون کی تعلیم کے لئے مقرر کرتا تھا تنخواہ کے علاوہ ناشتے کھانے کپڑے اور دھوبی حجام کے مصارف سب کا بار زمیندار پر ہوتا، ہر موسم مین کچھ غلہ بھی زمیندار ان کو دیتا تھا اس کے علاوہ گاؤن کے دوسرے بچون کو بھی اس کے ساتھ تعلیم کی اجازت ہوتی تھی، اُن کے والدین بھی مولوی صاحب کی اپنی اپنی استطاعت کے مطابق خدمت کرتے تھے، اس طرح مولوی صاحب کی زندگی خوش حالی سے بسر ہوتی تھی لڑکون کی تعداد بیس پچیس سے زیادہ نہین ہوتی تھی، اور بعض بعض گاؤن مین متعدد مکتب ہوتے تھے،

ان مکتبون مین ہندو مسلمان دونون کے بچے پڑھتے تھے، معلم عموماً فارسی دان مسلمان ہوتے اردو کی تعلیم برائے نام ہوتی تھی، سارا زور فارسی ادب پر صرف ہوتا تھا، اس زمانہ مین مسلمان شرفا خطوط بھی فارسی ہی مین لکھتے تھے، نصاب درس مین مندرجہ ذیل کتابین ہوتی تھین

آمد نامہ، گفتگو نامہ، تعلیم عزیزی، کریما، مامقیما، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، سکندر نامہ، بہار دانش، سہ نثر ظہوری، رقعات عالمگیری، اور انشاء خلیفہ وغیرہ،

تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم قطعی نہین ہوتی تھی، البتہ حساب مین جمع تفریق، ضرب تقسیم تک کی تعلیم ہوتی تھی خوش خطی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، طلبہ عموماً ۱۴-۱۵ سال کے اندر نصاب ختم کرکے شہر چلے جاتے، جہان عربی یا انگریزی مدارس مین داخل ہوجاتے،

یہ مجھے معلوم نہیں کہ علامہ موصوف نے کے برس اس مکتب میں تعلیم پائی، مکتبی تعلیم ختم ہونے کے بعد موصوف کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب صاحب نے تعلیم دینی شروع کی، آہستہ آہستہ تھوڑے طلبہ یہاں بھی جمع ہوگئے، یہ مکتب بھی کچھ مدت تک چلا، اور ایسا یاد آتا ہے کہ اُن کے حج کے لئے جانے کے سبب یہ سلسلہ ختم ہوگیا، ان مکاتب کی تعلیم میں بیت بازی بھی تھی، کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہوکر بیت بازی کرتے، اور کبھی دو مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا،

علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور اُن کے شیر خاص مولوی حکیم سید نجم الہدیٰ صاحب ندوی تھے، اور دوسری کے مولوی محمد قاسم صاحب، یہ دونوں آج بھی بقید حیات ہیں، اسکا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے ایک خاص لگاؤ ہوگیا، اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہوگئے، خاکسار بھی باوجود کم سنی کے ان جلسوں میں عموماً شریک رہتا تھا،

اسی سلسلہ میں علامہ نے ایک بیاض تیار کی تھی جس کے سرورق کو رنگ سے خوشنما کردیا تھا، اس میں ہزاروں منتخب اشعار درج تھے، میرے والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۹ء تک یہ بیاض میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی، چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لئے علامہ موصوف کو تقطیع کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی جس سے اُن کو فن عروض پر اس قدر عبور ہوگیا تھا، کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہوں گی،

علامہ موصوف کو کھیل کود اور اس قسم کے تفریحی مشاغل سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اُن کے احباب جب تاش یا شطرنج کھیلتے، تو وہ صرف تماشائی ہوتے تھے، یا اخبار وغیرہ پڑھنے لگتے، اگر کبھی کسی کھیل میں شرکت کی تو وہ کبڈی ہے جس کا رواج ہندوستان کے تمام صوبوں میں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہے،

علامہ صغر سنی میں ایک کھیل اور بھی کھیلا کرتے تھے، آپ کے والد، دادا، بھائی، بلکہ خاندان کے بیشتر بزرگوں کا پیشہ طبابت تھا، اس لئے گھر میں علاج معالجہ کا چرچا ہر وقت رہتا تھا، اس کی نقل میں کبھی کبھی مختلف قسم کے شیشیوں میں پانی بھر کر بچوں کا علاج کرتے تھے، اُن کی بڑی ہمشیرہ جب پوچھتیں کہ یہ کیا کرتے ہو تو کہتے کہ بیماروں کا علاج کرتا ہوں، لوگ کہتے کہ لڑکا آگے چل کر بڑا طبیب ہوگا، لیکن باوجود اُن کے والد کی دلی تمنا کے یہ

پیشین گوئی پوری نہ ہوئی ،

عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادر معظم حکیم سید ابو حبیب صاحب مجددی سے حاصل کرنے کے بعد دربھنگہ تشریف لے گئے، اُن کے ہم مکتبوں میں سے صرف مولوی سید نجم الہدیٰ صاحب نے اُن کا ساتھ دیا، وہاں کچھ عرصہ تک تعلیم پاتے رہے، افسوس ہے کہ اُن کے کسی استاد کا نام حافظہ نے محفوظ نہیں رکھا،

علامہ موصوف بچپن سے کم سخن اور خاموش طبیعت کے انسان تھے جس سے ان کے استاد اُن کو غبی اور کند ذہن سمجھتے تھے، اور اُن کے تیز زبان ساتھی اُن کو ذہین اور صاحبِ ذوق سمجھ کر اُن کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، اور پھر جب حصول فضل و کمال کے بعد دنیا میں اُن کی شہرت ہوئی تو ان کی کم سخنی کی وجہ سے لوگ اُن کو مغرور سمجھنے لگے، علامہ موصوف کو اس کا اندازہ ہوا، تو انھوں نے اپنے کو شگفتہ بنانے کی بے حد کوشش کی، اور آخری عمر میں تو واقعی اس قدر شگفتہ ہوگئے تھے کہ ان کی مجلس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا،

ایک لطیفہ سننے کے قابل ہے، علامہ موصوف اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں کسی تقریب سے حیدرآباد تشریف لے گئے، اتفاق سے اس وقت دربھنگہ والے استاد وہاں موجود تھے، انھوں نے اخبار میں پڑھا کہ مولانا سید سلیمان صاحب تشریف لائے ہیں، اور فلاں جگہ مقیم ہیں، تو شاہ سلیمان صاحب پھلواری کو سمجھ کر اُن سے ملنے کے لئے آئے، مگر اُن کے بجائے ایک دوسرے سلیمان کو پایا، مجھے یاد نہیں کہ خود استاد نے شاگرد کو پہچان لیا، یا تعارف کے بعد پہچانا،

تعارف کے بعد استاد نے کہا کہ "سلیمان! تو تو بڑا غبی اور کند ذہن تھا، اس قدر بڑا آدمی کیسے بن گیا" احباب نے قہقہہ لگایا، اور بات آئی گئی ہوگئی،

دربھنگہ کی تعلیم کے کچھ دنوں کے بعد پھلواری شریف (متصل پٹنہ) کے مدرسہ میں داخل ہوئے، جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کے بڑے صاحبزادے شاہ حسن میاں مرحوم آپ کے ہم عمر تھے اور غالباً ہم جماعت بھی تھے حسن میاں حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں میں نمایاں تھے، ندوۃ العلماء کا جو سالانہ جلسہ عظیم آباد پٹنہ میں ہوا تھا، اس میں خاکسار بھی باوجود نوعمری کے شریک تھا، اس وقت حسن میاں کی عمر ۱۴-۱۵ سال سے زیادہ نہ تھی، اور علامہ موصوف کی بھی

کم و بیش یہی عمر رہی ہوگی

جہاں تک مجھے یاد ہے، اس جلسہ میں شرکت کے لئے علامہ موصوف کے والد حکیم سید ابو الحسن صاحب بھی تشریف لائے تھے، وہ اس جلسہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے طے کیا کہ علامہ موصوف کو ندوہ بھیج دیا جائے، چنانچہ دوسرے سال وہ لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان سے پہلے اُن کے ہم مکتب مولوی محمد قاسم صاحب ابن حضرت شاہ تجمل حسین صاحب اور مولوی عبد السبحان پہنچ چکے تھے، غالباً موصوف دوسری جماعت میں شریک ہوئے، کیونکہ جب میں ندوہ میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو وہ چوتھی جماعت میں تھے اور شرح وقایہ پڑھتے تھے،

ندوہ میں ورزش کا بھی انتظام تھا، مگر ورزش قدیم طریقہ کی تھی، اور کشتی کے لئے اکھاڑا بنا ہوا تھا، اس کے آس پاس مگدر رکھے ہوتے، ڈھال اور لکڑی کی تلوار بھی تھی، لاٹھی چلانا بھی سکھلایا جاتا تھا جس کو طلبہ شوق سے سیکھتے تھے، اس زمانہ میں مسٹر مکڈانل اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے، یہ مسلمانوں پر بڑے مہربان تھے، انھوں نے اس کی ابتدا اردو زبان کی جڑ کاٹنے سے شروع کی، اودھ کی عدالتی زبان اردو کو بدل کر ہندی کردی[۱]، دوسرا حملہ ندوہ پر ہوا، اور جو تھا علی گڑھ پر لیکن نواب محسن الملک جیسے سیاست دان نے تو کالج کو بچا لیا، مگر غریب ندوہ چکر میں آگیا، مکڈانل صاحب نے اراکین ندوہ سے دریافت کیا کہ ندوہ میں ڈھال تلوار، مگدر، کشتی کی مشق کیا جہاد کی تیاری کے لئے کرائی جاتی ہے؟ اس سے اہل ندوہ اس قدر گھبرائے کہ سب کھیل بند کر دیئے گئے اور پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد ورزش کے بجائے فٹ بال کرکیٹ، ہاکی، اور شب جمعہ کو کبڈی کا رواج ہوا لیکن علامہ موصوف نے کبھی بھی ان ورزشی کھیلوں میں دلچسپی نہیں لی، ورزشی کھیلوں کا وقت عصر سے لیکر مغرب تک تھا، علامہ موصوف یہ وقت رسالہ، اخبار، یا کتب بینی میں صرف کرتے، اور وہ دار الاخبار کہ جس میں ہندوستان کے اکثر اخبارات اور رسالے آیا کرتے تھے، ناظم مقرر ہوئے، اس سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے ایک علمی پارٹی تیار کرلی جس کے ممتاز ممبر مشہور شاعر

۱؎ معارف اللہ نے بجائے ہندی نہیں کی تھی، بلکہ اردو کے ساتھ ہندی کو بھی عدالتی زبان بنا دیا تھا،

جلیل جانشین امیر مینائی کے صاحبزادے مولوی صدیق حسن صاحب اور عثمان پاشا تھے، جو شیخ پورہ ضلع مونگیر کے باشندے تھے، اسی زمانہ میں ایک ادبی انجمن تہذیب الاخلاق کے نام سے قائم کی جس میں طلبہ کو تحریر اور تقریر کی مشق کرائی جاتی جمعہ کے بعد اس کا جلسہ ہوتا، کبھی مہتمم صاحب اور کبھی کوئی دوسرا مدرس اس کا صدر ہوتا، بعض دفعہ آخری درجہ کا کوئی ہونہار طالب علم اس فرض کو انجام دیتا، اس انجمن کی نظامت جہاں تک مجھے یاد ہے، اکثر انہی کے ہاتھ میں رہی، وہ بہترین مقررین میں تھے لیکن انکی تقریر میں جوش و خروش نہ ہوتا اور نہ وہ جذبات کو ابھارنے والی ہوتی، بلکہ زیر بحث مسئلہ کو دلائل اور امثال کے ذریعہ سنجیدگی کے ساتھ دل نشین کرنے کی کوشش ہوتی، ایک مرتبہ "محنت" پر تقریر کی تھی جس سے یہ خاکسار اس قدر متاثر ہوا کہ اسی دن سے فٹ بال اور کرکٹ کے بجائے، کتابوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگا، جس سے کچھ لکھنا پڑھنا آگیا،

اب علامہ ممدوح نے مضمون نگاری بھی شروع کردی تھی، اس زمانہ میں مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی کے ناولوں کی بڑی دھوم تھی، اور مشہور رسالہ "دلگداز" ماہوار نکلتا تھا جس میں اس زمانہ کے مذاق کے مطابق تاریخی علمی اور ادبی مضامین ہوتے تھے، اس قسم کے ایسے رسالے اور ناول وہ بہت پڑھتے، ابتداے شباب سے اُن کی آنکھیں خراب تھیں، بار بار ڈاکٹروں نے ان کو ترک تعلیم کا مشورہ دیا تھا، وہ ترک تو کیا کرتے، رات کے ایک ایک بجے تک کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے،

اس زمانہ کا بہترین اردو رسالہ "مخزن لاہور" تھا جس کے اڈیٹر شیخ عبدالقادر بار ایٹ لا تھے، لکھائی چھپائی، کاغذ کی عمدگی کے علاوہ وہ ایک خالص ادبی رسالہ تھا، اور اردو داں طبقے میں بہت مقبول تھا، علامہ ممدوح کا پہلا مضمون اسی رسالہ میں شائع ہوا،

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں علامہ ممدوح بیت بازی میں پیش پیش تھے جس سے اُن میں شعر کا ذوق پیدا ہو گیا تھا جو لکھنؤ آکر اور تیز ہو گیا تھا ندوہ کے طلبہ میں مولوی رکن الدین دانا سہسرامی، سید عبدالغفور شہرت بہاری، ضیاء الدین فاروقی چریا کوٹی کے صاحبزادے مولانا معین وغیرہ شاعری کرتے تھے، اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلیل، ریاض، مضطر

وغیرہ تقیبجیات تھے، لکھنؤ مین گذشتہ ادبی سرگرمیان پوری طرح موجود تھین، عشرت لکھنوی کا نام طلبہ مین زیادہ معروف تھا "پیام یار" نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلون کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا، مرثیہ کی مجلسین اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے، علامہ موصوف ان مشاعرون مین اکثر شرکت کرتے، آخر خود بھی شعر کہنے لگے، اور انھین اپنے احباب خاص طور سے مولوی صدیق حسن اور عثمان پاشا کو سنا کر داد لیتے تھے،

علامہ موصوف نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی، اس کے ایک جانب عربی اور دوسرے جانب اردو اشعار تھے جس وقت یہ بیاض میرے ہاتھ آئی، اس وقت مین متنبی پڑھتا تھا، اس کو میری بدذوقی کہیئے کہ اُن کے عربی اشعار مجھے پھیکے نظر آئے، متنبی نے جس مضمون کو صرف دو مصرعون مین ادا کیا تھا، علامہ موصوف نے بہ تغیر الفاظ چار مصرعون مین کیا تھا، (ناظرین اس کا لحاظ رکھین کہ مین اون کے اوائل زندگی کا حال لکھ رہا ہون) میری اس بد مذاقی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کا ایک عربی شعر بھی مجھے یاد نہ رہا، مگر اُن کے اردو اشعار مجھے بہت یاد ہوگئے تھے، جو اُن کے دیوان یا بیاض سے نقل کئے تھے،

وہ اکثر مشاعرون مین شریک ہوتے تھے، اور اپنی غزل بھی سناتے تھے، ایک مرتبہ ایک مشاعرہ کی خبر شام کو ملی، رات کو مشاعرہ تھا، غزل کہنے کی کوشش کی، اور صرف ایک شعر کہنے پائے تھے کہ احباب آگئے، وہ ان کے ساتھ چل پڑے، اس زمانہ مین وہ ڈاسن کا جوتہ، علی گڑھ نما پاجامہ، کرتا، یا کٹ دار نیم، شیروانی چشمہ اور ترکی ٹوپی استعمال کرتے تھے، اور ہاتھ مین چھڑی لیکر باہر نکلتے تھے، اسی شان سے مشاعرہ مین پہنچکر بیٹھ گئے، اُن کی صورت شکل، اور لباس دیکھ کر شمع اُن کے سامنے بھی آئی، پہلے تو بہت پریشان ہوئے لیکن انتقال ذہن نے پریشانی سے بچالیا، انھون نے یہ معذرت کی کہ مجھے مشاعرہ کی مطلق خبر نہ تھی، ابھی احباب نے اطلاع دی، فوراً اٹھا چلا آیا، البتہ ایک شعر ذہن مین آیا ہے، وہ عرض کرتا ہون،

سر سے قدم تلک ہے ردا سے حیا پڑی
حاجت ہی کیا ہو آپ کو صاحب نقاب کی

یہ شعر لکھنؤ کے رنگ کا تھا، خوب داد ملی،

اس زمانہ کا ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے، مولانا فاروق چریا کوٹی (جن کی شاگردی کا فخر بندہ کو بھی حاصل ہے) کے ندوہ سے مستعفی ہونے کے بعد نائب کے طور پر جناب مفتی عبداللطیف صاحب مقرر ہوئے، (بندہ کو ان سے بھی تلمذ کی نسبت ہے) یہ فقہ حنفی کے بہت بڑے ماہر تھے، اور اس میں ان کو بڑا غلو اور مزاج میں بے حد تقشف تھا، ان کو بہت کم کسی نے مسکراتے ہوئے دیکھا، احکام کی تعمیل کرانے میں اس قدر سخت تھے کہ عدول حکمی تو بڑی بات ہو، تاخیر بھی روا نہ تھی، طلبہ ہی میں سے بعض کو انھوں نے جاسوس بنا رکھا تھا جن کے ذریعہ طلبہ کی مخفی باتیں ان کو معلوم ہو جاتیں، ان کی حکومت میں معافی کی کوئی دفعہ ہی نہ تھی، وہ شخصی حکومت کا مکمل نمونہ تھے، طلبہ ان کے نام سے تھرّاتے تھے، بعض طلبہ سمجھتے تھے کہ جن ان کے تابع ہے، جو طلبہ کے پرائیوٹ حالات سے ان کو باخبر کر دیتا ہے، ایک دن معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کہیں باہر جانے والے ہیں، یہ خبر سن کر طلبہ نے ڈرامہ کی تیاری شروع کر دی، اور ان طلبہ کو خاص طور سے شریک کیا گیا جن کی نسبت جاسوسی کا خیال تھا، چنانچہ رات کو کھیل شروع ہوا، علامہ موصوف انگریز جج بنے، اور مولوی ضیاء الحسن علوی ان کی لیڈی، مقدمہ شروع ہوا، ڈرامہ کا قصہ مجھے یاد نہیں رہا،

ڈرامہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ غل مچا، مفتی صاحب آگئے، ہر شخص اپنے اپنے کمرہ میں پہنچ گیا، اس ذکر کا اصل منشا یہ ہے کہ اس ڈرامہ میں بھی علامہ موصوف کا انتخاب ایک اعلیٰ عہدہ کے لئے کیا گیا جس کے لئے اعلیٰ قابلیت کی ضرورت تھی، اس انتخاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی وہ اپنے ہم عصروں میں اتنے ممتاز تھے کہ سب کی نگاہ انہی پر پڑی، دوسری قابلِ تعریف بات یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کو اس کی بھنک لگ گئی تھی، مگر وہ مجرموں کو گرفتار نہ کر سکے جس کے سرغنہ سید سلیمان تھے،

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی کی تشریف آوری کے بعد ان کا رنگ ہی بدل گیا، دارالاخبار، دارالمطالعہ وغیرہ سے دست بردار ہو گئے، ہفتہ وار ادبی انجمن میں بھی بہت کم حصہ لیتے، اور اب ان کا زیادہ وقت استاذ محترم کی خدمت میں گذرتا، خصوصاً عصر سے مغرب تک اردو کی ادبی کتابوں کا شوق سرد پڑ گیا، اب زیادہ تر عربی

کتابوں کا مطالعہ ہوتا جس میں تاریخ وادب کا حصہ زیادہ تھا، مضامین بھی علمی اور تاریخی ہونے لگے،

استاذ محترم علامہ شبلی نعمانی نے تربیت کے لئے چند ہونہار طلبہ کو منتخب کیا تھا جس میں سید سلیمان، عبد السلام، حافظ عبد الصمد، عبد الواجد، حمید الدین وغیرہ تھے، یہ لوگ بعد عصر وہاں پہنچ جاتے، علامہ شبلی کے پاس عربی کے متعدد اخبارات ورسائل اللواء، المؤید، الہلال، المقتطف وغیرہ آتے تھے، وہ کسی ایک طالب علم سے کوئی مقالہ پڑھوا کر سنتے، پھر اخبار لے لیتے، اور فرماتے کہ تم اپنی عربی میں اس کو بیان کرو، جہاں تک مجھے یاد ہے، اس میں علامہ سید سلیمان اور عبد الواجد صاحب زیادہ ممتاز رہتے،

استاذ محترم کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ ان میں تلاش اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا گیا، اور مضامین میں گہرائی آنے لگی، اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ متقدمین کی معصومیت کا جو رعب ان پر چھایا تھا، وہ اٹھ گیا، چنانچہ متعدد کتابوں پر تنقید لکھی، اس سلسلہ میں ہندوستان کے بعض قدیم مشاہیر علماء کی غلطیاں نکالیں جس سے ان کے حلقہ میں ایک شور مچ گیا،

علامہ موصوف بہت ذہین تھے، ان کا حافظہ بھی بہت قوی تھا، پشاور سے لیکر چین کی سرحد تک خاکسار کو جن جن اصحاب علم سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان میں مولانا انور شاہ کشمیری دیوبندی (محدث) مولانا ابوالکلام آزاد، اور علامہ سید سلیمان ندوی کو قوت حافظہ میں بے نظیر پایا،

ایک دفعہ میں نے ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے حوالہ سے مالابار کے حالات لکھے، نظر ثانی کے وقت علامہ موصوف نے مجھ سے کہا تم نے غلط لکھا ہے، میں نے سفرنامہ کا اردو ترجمہ لاکر پیش کر دیا، دیکھ کر فرمایا صحیح نہیں ہے، عربی اڈیشن میں دیکھو، اس کو دیکھ کر فرمایا، دیکھو مترجم نے ضمیر کا مرجع غلط قرار دے کر ترجمہ کیا ہے، غور کیا تو واقعی صحیح تھا،

استاذ محترم شمس العلماء مولانا ابوالفضل حفیظ اللہ صاحب اس جماعت کو جس میں علامہ موصوف تھے، درس قرآن دے رہے تھے، اسی اثناء میں آنریبل سید شرف الدین جج کلکتہ ہائی کورٹ تشریف لے آئے، اور درجہ میں بیٹھ گئے، "ووجدک ضالا فھدی" کی ایسی تفسیر کی خواہش کی جس سے لفظ "ضالا" سے جو شبہہ پیدا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے، جہاں تک مجھے یاد ہے اس درجہ میں صرف سید سلیمان ایسے تھے جنھوں نے لغت، محاورہ اور ربط کے لحاظ سے ایسا ترجمہ

یا تشریح کی جس سے جج صاحب موصوف کو تسکین ہو گئی،

ایک دفعہ پٹنہ میں خدا بخش خان مرحوم چیف جسٹس حیدرآباد سے ملنے کے لئے گئے، خاکسار بھی ساتھ تھا، وہ اپنے مشہور کتب خانہ (پبلک اورنٹیل لائبریری) کے اس سائبان میں بیٹھے تھے جس سے متصل بازار کی سڑک تھی اس وقت موجودہ بلڈنگ تیار نہیں ہوئی تھی، میز پر کچھ کتابیں تھیں، اور وہ کسی خاص کام میں مصروف تھے، ہم لوگ کرسی پر بیٹھ گئے، اور باتیں ہونے لگیں، اثنائے گفتگو میں آیۃ الکرسی کے متعلق گفتگو ہونے لگی، یہ مجھے یاد نہیں ہے کہ آیۃ الکرسی کی ایک تفسیر جو فیضی کی تھی، یا خود اُن کی تھی، یا کسی مفسر نے کسی کتاب میں لکھی تھی، علامہ موصوف کو سنائی، انھوں نے جو اصلاح دی، یا جوابات کہی، اُسے سُن کر جج صاحب پھڑک اُٹھے، اور دیر تک تعریف کرتے رہے

علامہ موصوف اردو، فارسی، عربی کے علاوہ عبرانی زبان سے بھی واقف تھے، وہ جب دکن کالج پونہ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، تو ایک یہودی سے اس کو سیکھا تھا، اور ارض القرآن لکھنے میں اس سے مدد لی تھی، انگریزی لکھ اور بول نہیں سکتے تھے لیکن اخبار اور کتابیں پڑھ لیتے تھے،

ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد علامہ موصوف بڑی کشمکش میں مبتلا ہو گئے، اُن کے والد ماجد اُن کے خسر اور بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ وہ خاندانی پیشہ یعنی طب کی تعلیم حاصل کریں لیکن خود اُن کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، استاذ محترم علامہ شبلی کی بھی یہی رائے تھی کہ طب کی تعلیم کے بجائے وہ علمی کاموں میں مصروف ہوں، چنانچہ انھوں نے استاد سے جب اس کا تذکرہ کیا، تو استاد نے اُن کے خسر کو ایک خط لکھا کہ سید سلیمان کو اُن کی علمی تحقیقات میں مصروف رہنے دو،

پھر اتفاق ایسا ہوا کہ استاذ محترم کسی ضرورت سے پٹنہ تشریف لے گئے، اور مولوی ابو یوسف صاحب (سید سلیمان صاحب کے خسر) اُن سے ملنے گئے، اس مسئلہ پر دونوں کی گفتگو ہوئی، آخر میں استاذ محترم نے فرمایا کہ اُن کے والد سے کہدو کہ سید سلیمان کو ہمیں دیدیں، والد کو یہ پیغام ملا تو استاد کی شفقت کو دیکھ کر خاموش ہو گئے، لیکن طب اور تصوف دونوں لائنوں سے علاحدہ ہو جانے کو خاندانی روایات کے خلاف سمجھ کر آخر عمر تک

پسند نہیں کیا، اس میں شبہ نہیں کہ اگر وہ طب کی تعلیم حاصل کرتے تو بھی اپنی ذہانت اور قوتِ حافظہ کی بدولت بہترین طبیب ہوتے لیکن ضلع پٹنہ کے باشندوں کے علاوہ اُن کو کوئی نہ جانتا، اور عالمِ اسلامی اُن کی بہترین تصانیف سے محروم رہ جاتا،

انھوں نے سب سے پہلی ملازمت ندوہ ہی میں کی، ایک ادیب کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا، الندوہ کے نائب اڈیٹر بھی رہے، اسی زمانہ میں آسی مدراسی مرحوم کے بڑے صاحبزادے قاری عبدالولی عربی زبان میں ایک ماہوار رسالہ "البیان" نکالتے تھے، علامہ اس کے بھی اڈیٹر تھے، اور ابتدا میں اسی کے ذریعہ حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ میں اُن کا تعارف ہوا،

ان کی پہلی شادی اُن کے چھوٹے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی جس سے تین بچے پیدا ہوئے، دوسری سے کوئی اولاد نہیں تھی، اور تیسری سے متعدد اولادیں ہوئیں جن میں اس وقت چار لڑکیاں، اور ایک لڑکا سلمان سلمہ موجود ہیں، آپ نے اکھتر (۷۱) سال کی عمر میں بمقام کراچی وفات ہوئی، اور ان کی وفات سے نہ دسنہ ضلع پٹنہ (بہار) کا گوہر نور گیا، بلکہ ہندوستان و پاکستان کی علمی دنیا اس کی ضیا باری سے محروم ہو گئی،

اخلاق وسیرت کے کچھ جلوے

از

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے خلق عظیم کا نمونہ تھے، اُن کے حسن اخلاق کے جلوے اتنے گوناگوں ہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ دشوار ہے، ذیل کی سطور میں صرف اُن کی ایک ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے،

حبِ وطن اپنے وطن دیسنہ سے بڑی محبت رکھتے جب گھر آتے اور یہاں سے رخصت ہونے لگتے، تو اشک بار ہو جاتے طالب علمی کے زمانے سے آخر عمر تک اس کے اجتماعی کاموں میں سے پوری دلچسپی لیتے رہے، وہاں کے باشندوں نے ۱۸۹۶ء میں اپنی معاشرتی وعلمی اصلاح وترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی جس کے ماتحت اردو کا ایک شاندار کتب خانہ بھی ہے، اس کی ترقی میں ہر قسم کی امداد کرتے رہے، انجمن کے سالانہ جلسوں میں کبھی اپنی نظم سناتے کبھی مقالہ پڑھتے، اور کبھی تقریر کرتے، اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کی، فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت سی کانفرنسوں کی صدارت کا شرف عطا کیا، لیکن جو لذت وطن کی انجمن الاصلاح کی صدارت میں محسوس ہوئی، وہ کسی اور میں نہیں ہوئی،

انجمن کا سالانہ اور دیگر اوقات بڑا وقتی چندہ پابندی سے ادا کرتے تھے، اپنے جد بزرگوار کی ایک تصنیف نورِ محمدی اپنے خرچ سے چھپوائی، اور اس کے سارے نسخے انجمن کے کتب خانہ کو دیدیے کہ اس کی فروخت کی آمدنی کتب خانہ کی ضروریات میں خرچ ہو، اسی طرح اپنی تصنیف خطبات مدراس کی پانچ سو جلدیں اس کتب خانہ کو دیں جن کی

قیمت ۵۵۰۰ روپیہ تھی،

قدیم آبائی مکان کے علاوہ ایک پرفضا مقام پر ایک شاندار بنگلہ بنوایا تھا، اُس میں اپنے اہل وطن کے ساتھ بیٹھ کر بڑی راحت محسوس کرتے، زندگی کے آخری دن اسی میں گذارنے کی تمنا اُن کو تھی لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا،

اپنے ایک ہم مکتب دوست کو ایک مکتوب مورخہ ۶ ارجون ۱۹۴۸ء میں لکھتے ہیں :-

"خلوت نہ زد حق کے سوا کہیں آرام نہیں ع جز بخلوت گاہ حق آرام نیست"..........

.....دیسنہ کا اس پیری میں قیام کا خیال ہمیشہ سے تھا، اسی لئے وہاں سب کچھ لگایا مگر افسوس کہ انقلاب زمانہ نے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے، اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بقیہ ایام عمر کہاں گذریں گے ...."

اہلِ وطن سے لگاؤ | تمام اہلِ وطن سے بڑا اُنس رکھتے تھے، ۱۹۱۵ء میں اُن کے ایک محبوب ہم وطن مظفرامام محمد وحید ڈپٹی کلکٹر کا انتقال ہوا تو بیحد مغموم ہوئے، ان سے صرف ہم وطنی کا رشتہ تھا، لیکن اُن کی وفات پر ایک عزیز کو تحریر فرمایا :-

"آہ وہ صرف دیسنہ کا چراغ بجھ گیا، بلکہ ہمارے دلوں کا بھی چراغ گل ہو گیا، ہماری زندگی کا تماشا جاتا رہا، وطن کی یاد فراموش ہو گئی، اور اس کی محبت سرد، خدا کی قسم میری زندگی میں یہ سب سے بڑی مصیبت ہو گی، اگر میرے دونوں بچے مرجاتے، تو اتنا غم نہ ہوتا بس اب ہو چکا

غریباں را دل از بہر تو خون است   دل خویشاں نمی دانم کہ چون است

۱۹۳۲ء میں دیسنہ کی ایک جوان خاتون کی حسرتناک موت ہوئی، سید صاحب اس وقت وطن ہی میں تھے، مرحومہ سے دور کا رشتہ تھا، لیکن ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے پیچھے زار زار روتے ہوئے تھے، اور جب جنازہ کی نماز پڑھانے گئے تو آنسوؤں سے بالکل تر ہو گئے،

جناب سید عبدالحکیم صاحب جو اب بھی بقیہ حیات ہیں، اُن کے رشتہ کے چچا ہوتے ہیں، عمر میں وہ سید صاحب سے تقریباً بارہ تیرہ برس بڑے ہیں، اُن سے تمام عمر اپنے حقیقی چچا سے زیادہ محبت کرتے رہے، ایک خط مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اُن کو لکھتے ہیں :۔

"آپکے دل کو مجھ سے، اور مجھے آپکے دل سے جو لگاؤ ہے، وہ سوال اور استدلال سے باہر ہے یقیناً آپنے اپنے دل کو بہت دکھ کھا اور یہاں بھی ہر روز آپ کو خط نہ لکھنے اور آپکے خط نہ آنے کا خیال رہا"

پھر کراچی سے ۱۵ جنوری ۵۰ء کو اُن کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"آپ کو اس ناکارہ سے جو رابطۂ قلبی ہے اس کا میرے دل پر اثر ہمیشہ رہا، اور وہ اب تک اسی طرح ہے"

ع حقِ مہربان نام ونشان است کہ بود

........افسوس ہے کہ وطن کا شیرازہ اور احباب و اعزّہ ایسے متفرق ہوئے کہ ان کے دیدار سے محرومی رہے گی، اور اس کا اپنے قلب پر بڑا اثر پاتا ہوں، یہاں کیا آیا کہ دنیا ہی بدل گئی، ہندوستان بھلانے سے بھی نہیں بھولتا،...... خدا جانے چمن پہ کیا گذری"

سید عبدالحکیم صاحب کو بھی اُن سے بڑی فریفتگی رہی، یوں تو وہ عمر میں بڑے ہیں، لیکن آخر میں وہ اُن سے روحانی استفادہ بھی کرنے لگے تھے، سید صاحب کی طالب علمی کے زمانہ سے اُن کے آخر عمر تک دونوں میں برابر خط و کتابت قائم رہی جس کو سید عبدالحکیم صاحب نے حرزِ جان بنائے رکھا ہے، یہ خطوط ایسی قیمتی دستاویز ہیں جن سے سید صاحب کے سوانحِ حیات مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

آخر زمانہ میں جب کبھی سید صاحب کا قیام وطن میں رہتا، تو اُن کا معمول تھا کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں کلام پاک کا درس دیتے، جمعہ کے روز وعظ بھی کہتے، اپنے ایک مکتوب میں سید عبدالحکیم صاحب کو لکھتے ہیں کہ دیسنہ کی ہر ٹھیکری میرے لئے لعل و گوہر سے زیادہ عزیز ہے، حبّ الوطن من الایمان، لیکن اس لگاؤ کے باوجود وہاں کی

متنازعہ فیہ باتون مین پڑنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے، فرماتے کہ قیام وطن کے زمانہ میں جذبات مین تین دور آتے ہیں، پہلے دور مین خیال ہوتا ہے، میرے ہم وطن چھوٹی چھوٹی باتون میں الجھ کر خواہ مخواہ تضیع اوقات کرتے رہتے ہیں، دوسرے دور مین خود ان چھوٹی چھوٹی باتون کے سننے کا جی چاہتا ہے، تیسرے دور مین نفس ان باتون مین حصہ لینے کو آمادہ کرتا ہے، اس وقت رخت سفر باندھ لیتا ہون، جب کسی اہل وطن سے کوئی شکایت ہوتی، تو وہ گفتگو کرکے خاموش ہوجاتے اور فرماتے میرا تو یہ مسلک ہے

ع: تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

اہل وعیال سے محبت | اُن کی خانگی زندگی شفقت ومحبت کے مناظر سے معمور ہے، پہلی اہلیہ کے مرض الموت مین بڑی دل سوزی اور تن دہی سے تیمارداری کی، اُن کو اعظم گڈھ سے لکھنؤ علاج کے لیے لے گئے، اور قرض لیکر علاج کراتے رہے، مگر وہ تیرہ سال کی رفاقت کے بعد ۱۹۱۵ء مین جنت کو سدھارین، رفیقۂ حیات کی جدائی پر غیر معمولی اثر ہوا جس کا اظہار ایک نظم "فراق یار" مین کیا، اُن کے غم والم کی خبر اکبر الہ آبادی کو ہوئی تو انھون نے خطوط مین اشعار لکھ لکھ کر اُن کو تسلی دی، پہلے خط مین یہ شعر لکھ کر تلقین کی،

اگرچہ تلخ ملا جام عمر ثانی کا — مگر محل نہین ساقی سے بدگمانی کا

دوسرے خط مین یہ رُباعی لکھ کر دلجوئی کی،

جس سے میری زندگی تھی مرگیا کیون کر سکا — چرخ نے مجھ پر ستم یارب کیا کیون کر سکا

واقعات جانگزا کا کیون ہوا ایسا وقوع — کیون نہ میری آہ سے قانون فطرت ٹل سکا

پھر اور دوسرے خطوط مین یہ متفرق اشعار تھے،

صدیون فلاسفی کی چنان اور چنین رہی — لیکن خدا کی بات جہان تھی وہین رہی

ساتھی جو تھے رنج وراحت کے اس موقعے پاتھون چھوٹ گئے،

اب پاس گرائے دیتی ہے، سب دل کے سہارے ٹوٹ گئے

مرنے والا مر چکا، اور رونے والا رو چکا، وائے بر ہستی اگر مقصود ہستی ہو چکا،

پہلی اہلیہ نے دو اولادیں چھوڑی تھیں، سیدہ مرحومہ، اور ابو سہیل سلمہ اللہ (کسٹم آفیسر مشرقی پاکستان) انہی سے دل بہلا کر بقیہ زندگی تجرد میں گزار دینے کا متہیہ کیا تھا لیکن اپنے والد بزرگوار کے اصرار پر ۱۹۲۰ء میں دوسرا عقد کیا، یہ اہلیہ بھی مشکل سے ڈیڑھ سال زندہ رہیں، اُن کی وفات پر پرانا غم تازہ ہوگیا، وطن اور اہلیہ ثانی کے گھر کو یاد کرکے مغموم اور بے چین رہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں،

"دیسنہ اور اس کے مکان کی ایک کوٹھری میرے لئے تاریخی غم کی یادگار بن گئی ہے، اور میرے احساس کو صدمہ پہنچاتا رہتا ہے"

تیسرا نکاح، ۸ جنوری ۱۹۲۳ عیسوی میں ہوا، ان اہلیہ سے ایک لڑکا عزیزی سلمان سلمہ اور چار لڑکیاں ہیں، شمیمہ (اہلیہ ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی) شکیلہ (اہلیہ سید حسن صاحب، اڈیشنل کمشنر، برنی ڈویژن)، اور دو ابھی ناکتخدا ہیں، اپنے تمام بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے، سب سے چھوٹی اولاد کو برابر اپنی گود میں بٹھائے رکھتے حتی کہ کبھی کبھی سفر میں بھی اس کو ساتھ لے جاتے، ان سب کو آپ ہی کہکر مخاطب کرتے، جب ان سے کسی بات پر ناراض ہوتے، تو ڈانٹنے اور جھڑکنے کے بجائے صرف یہ کہتے کہ یہ فلاں حرکت مجھ کو پسند نہیں، کئی بچے بچپن ہی میں فوت ہوگئے، ایک داماد اور ایک لڑکی کی جوانمرگی کا بھی غم اٹھانا پڑا، لیکن اُن کی اکلوتی اولاد سید نقی اشرف سلمہ اللہ (اسٹیٹ بنک پاکستان) کو اپنی آغوش شفقت میں لیکر ان دونوں کا غم غلط کرتے رہے،

ہمدرسوں سے تعلق | اپنے مکتب اور درس کے ساتھیوں سے انکو ہمیشہ لگاؤ رہا، انکے ایک ہم مکتب جناب محمد حنیف تھے جو تعلیم ختم کرنے کے بعد مختار ہوئے لیکن وارستگی مزاج کی بنا پر مختاری چھوڑ دی، اور اپنے وطن دیسنہ سے منتقل ہوکر اپنی سسرال گیلانی میں سکونت پذیر ہوگئے، وہ نہایت سادگی میں کھڑاؤں استعمال کرتے ہیں، اور نماز برابر پڑھتے رہتے ہیں، ایک بار سید صاحب کو دیسنہ سے گیلانی جانے کا اتفاق ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انکی علمی شہرت بہت زیادہ

پھیل چکی تھی، گیلانی پہنچ کر دریافت کیا کہ میرے پرانے ساتھی اور بھائی کھڑاؤں انناس کہاں ہیں، اُن کو تلاش کر کے بڑے اخلاق محبت اور بے تکلفی سے ملے، سید محمد حنیف صاحب ۱۹۵۳ء میں حج کے لئے گئے تو مکہ معظمہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے سید محمد حنیف صاحب وہاں سخت علیل ہوگئے، اُن کی علالت کی خبر سید صاحب کو ہوئی تو عیادت کے لئے گئے، اور ہر طرح اُن کو تسلی دی، سید محمد حنیف صاحب اس واقعہ کو جب یاد کرتے ہیں تو یہ کہکر آبدیدہ ہوجاتے ہیں کہ کہاں میں ایک لاابالی آدمی جو کس مپرسی میں پڑا ہوا تھا، اور کہاں سید صاحب کی ذات والا قدر جن کی تعلیم کے لئے حکومت سعودی کے بڑے بڑے حکام سر وقد کھڑے ہوجاتے تھے، وہ میری عیادت کے لئے آئے، اور تسلی و تشفی سے سرفراز کرتے رہے،

سید صاحب کے ایک دوسرے ہم مکتب مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی تھے، مکتب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کچھ دنوں دار العلوم ندوہ میں تعلیم پائی، پھر دیوبند میں تکمیل کی، مختلف مدرسوں میں ملازمت کرنے کے بعد آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس ہوئے، سید صاحب ندوہ سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کو دیوبند ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"دوسروں کے نام آپکے خط پہنچا کئے اور میں آپکے خط دیکھنے کو ترسوں، مجھے یاد نہیں کہ آپنے کبھی خط لکھنے میں سبقت فرمائی، صاحب جاہ مشکل نہیں نیاز مشکل ہے"

اور یہ بے تکلفی آخر وقت تک قائم رہی، دار المصنفین کے دور قیام میں اُن کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"اللہ رے ناز حسن کہ بولیں بھی وہ تو یوں ہاں وہ کہاں ہے در پہ جو میرے پڑا رہا

بھولے دوست اچھے ہیں کبھی یاد آؤں، آپ کو دار المصنفین کا خیال آیا، تو خیر سے استفسار کی گیا جاتی تھی شاید وہ منزل وار خطاب نہ تھا"

ندوہ کے ساتھیوں میں مولوی ضیاء الحسن علوی ندوی مرحوم کو بہت عزیز رکھتے تھے، ان کی وفات پر بے حد ملول ہوکر چنانچہ معارف کے ایک مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا،

"افسوس کہ میرے رفیق قدیم اور صدیق تیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۲۸ رجون ۱۹۴۹ء کو الہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے ساٹھ برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۸ رجون کو لکھنؤ میں اسی مدرسہ میں ملی، جہاں میں اور وہ مرحوم مل کر ایک جان دو قالب تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہو گیا، اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے گو تعلیم کے درجہ میں دو ایک سال بڑے تھے، اس لئے بظاہر یہی امید تھی کہ ان ہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے اُن کے فراق کا غم سہنا پڑے گا، اسی لئے امید غلط ثابت ہوئی، اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا،

ع : اکنون چہ توان کرد تقدیر چنین بود"

مولوی ضیاء الحسن مرحوم تعلیم میں اُن سے دو ایک سال سینیر تھے، اس لئے آخر وقت تک سید صاحب کو "تم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، ایک بار ضیاء الحسن صاحب مرحوم اُنکو اپنی ایک تحریر پڑھ کر سنا رہے تھے، سید صاحب نے اُن کو ایک جگہ ٹوکا، وہ بولے "سلیمان! تم اردو کیا جانو" اس فقرہ سے سید صاحب بہت محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کا ذکر کیا،

معاصرین سے محبت | اپنے معاصرین اہل علم میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے تھے، نجی مجلسوں میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصہ کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر اعظم پیدا ہوا ہے، ان کو موحد خالص، رسول کا شیدائی، دین کامل کا علمبردار، فلسفہ اسلام کا ترجمان، اور تجدید ملت کا طلب گار کہا کرتے، جب اُن کی رحلت کی خبر ملی تو معارف میں اسکا بڑا دردناک ماتم کیا، جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں :-

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو نو بجے کی کسٹھ بہار میں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی، اور ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر

فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملّت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزین کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرِ پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملّت کا یہ غم خوار شاعر ابرِ عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دل شکستہ کو جو ملّت کے غم سے رنجور تھا، غم خواری فرما، اور اپنی ربّانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزین کو مسرور کر"

سر شیخ عبدالقادر سے بھی متأثر تھے، ان کو پہلی دفعہ ۱۹۱۰ء میں پٹنہ میں ندوۃ العلماء کے جلسہ میں دیکھا تھا، اس موقع پر انھوں نے ایسی دلچسپ تقریر کی تھی جس سے حاضرینِ جلسہ کے ساتھ سید صاحب بھی محوِ حیرت ہو گئے، ان کے بیان کے مطابق اس کا یہ اثر ہوا کہ

"دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی"

بعد میں اُن سے اچھے خاصے مراسم پیدا ہو گئے تھے، اور جب اُن کا انتقال ہوا، تو اُن کی یاد میں لکھا،

"مرحوم کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی اور ہر مجلس و محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع، اور ملنسار تھے، اُن کی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت اُن کی ادبی خدمت ہے، اور وہ بھی خاص نوع کی، یعنی لکھنے والے تو بیسیوں ہیں، مگر ان کا کارنامہ یہ کہ انھوں نے بیسیوں کو ادیب، انشا پرداز، اہلِ قلم، مصنّف، اور شاعر بنا دیا، اور حق یہ ہے کہ انہی نے ہندوستان کو اقبال بخشا"

سیاسی دوستوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے قلبی تعلق رکھتے تھے، ۱۹۳۶ء کے موسمِ گرما میں دہرہ دون میں تھے، ۹ مئی کی شام کو وہاں کی ایک سڑک پر دور سے ڈاکٹر انصاری کو موٹر پر جاتے دیکھا، صبح اُن کی قیامگاہ کی

تلاش کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دہلی چلے گئے، اور شام کو اطلاع ملی کہ وہ راستہ ہی میں جنت کو سدھار گئے یہ خبر سن کر سید صاحب کا دل دھڑکنے لگا، آنکھیں اشکبار ہو گئیں، سینہ سے آہوں کے شعلے اٹھنے لگے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے صبر و تمکین کی ساری متاع جل کر خاکستر ہو رہی ہے، ڈاکٹروں نے اُن کو لکھنے پڑھنے کی ممانعت کی تھی لیکن اُن کی طبیعت نہ مانی، اور ڈاکٹر صاحب کا ماتم لکھنا شروع کر دیا جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:

"طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دفعتہً سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے سالار تھے، اور ڈاکٹر انصاری اس کے سب سے پرجوش رہبر تھے، افسوس کہ ان دونوں دردمندوں نے دل ہی کے آزار میں وفات پائی، دل کا درد مجازیں کر نمودار ہوا، اور اُن کی قومی زندگی کا باعث ہوا، اور وہی حقیقت بن کر اُن کی موت کا سبب ہوا"

محمد علی نے داغِ مفارقت دیا، اور اب

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

صلحاء، علماء کا احترام | مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے وطن دیسنہ سے نکلے تو کچھ دنوں جناب شاہ محی الدین صاحب پھلواری کے سامنے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، انکی قدر و منزلت سید صاحب کے دل میں آخر وقت تک قائم رہی، ایک تحریر میں فرماتے ہیں :-

"مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ محی الدین صاحب مرحوم کے قرب قیام کی، اور ایک ساتھ طعام کی، اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر، اور انھیں اس پر مسرت تھی"

جناب شاہ سلیمان صاحب پھلواروی سے ان کا کوئی رشتہ تو نہ تھا لیکن سید صاحب کے والد مرحوم اُن کے پیر بھائی اور اُن کے خسر کے مرید تھے، اس لئے سید صاحب ان کو اپنا بزرگ سمجھتے رہے، اور خود شاہ صاحب ان کو اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے، جب شاہ صاحب کا وصال ہوا تو سید صاحب نے

اُن کے صاجزادے مولانا سید شاہ غلام حسین صاحب پھلواروی کو ایک خط مورخہ ۱۹ اگست ۲۳ء میں لکھا:

"شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مجھ ذرۂ بے مقدار کے ساتھ جو شفقت تھی، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہی،

......بنارس کے جلسۂ ندوہ میں شاہ صاحب نے مولانا شبلی کی تحریک پر مجھ کو اپنی ایک عبا بطور امتحان

وانعام دینا منظور فرمایا تھا، میں ہمیشہ اس کا تقاضا کرتا، اور اس تقاضے میں اب بھی، اور اس عمر

میں بھی، مجھے کیا لطف آتا تھا، ایک دفعہ میں نے جب ہنوز عمر کی پختگی اور عقل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی

ایک عریضہ لکھا، اس میں جدید انشا پردازی کی پیروی میں السلام علیکم نہیں لکھا تھا، اس پر اُن کی

بزرگانہ ڈانٹ مجھے اب تک یاد ہے"

مولانا سید محمد علی مونگیری قدس سرہٗ العزیز سے بھی بہت متأثر تھے جس زمانہ میں وہ ندوہ میں تعلیم پاتے تھے، مولانا مرحوم ندوہ کے ناظم تھے، ایک روز انھوں نے سید صاحب کو بلا کر پوچھا تم کو کس فن سے ذوق ہے؟ سید صاحب نے جواب دیا "عربی ادب اور منطق سے، پھر پوچھا "کیوں"؟ سید صاحب نے کہا کہ اس لئے کہ یہ دونوں اصل مقصود میں علوم کے خادم اور ذریعہ ہیں، مولانا نے فرمایا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف کب توجہ ہوگی، سید صاحب نے کہا کہ جب ان میں کمال پیدا ہو جائے گا، یہ سُن کر مولانا نے فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم میں تو ہمارے علمار کی پوری عمریں بسر ہو جاتی ہیں، اور اصل مقصود کی نوبت نہیں آتی، اس کے بعد انھوں نے یہ حکایت بیان کی کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہاں تک کہ تمام کمرہ قلموں سے بھر گیا، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیوں رکھ رہے ہیں، تو متانت سے بولے کہ میرا ارادہ تصنیف کا ہے، پوچھنے والے نے کہا کہ پھر وہ کب شروع ہوگی، جواب دیا جب ان قلموں سے فرصت ملے گی، یہ تمثیل اس بات کی تھی، کہ عربی نصاب کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے سید صاحب کا بیان ہے کہ مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ میں نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان

نکھر ...

مولانا حمید الدین فراہی بی اے کا بھی بہت احترام کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں "ان سے قرآن پاک اور فلسفۂ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اٹھائی، اور مشکلات میں مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے، اُن ہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے"،

مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے اخلاق جو دو سخا، تواضع وانکسار، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، تلاش و مطالعہ اور قومی درد کے بیحد مداح تھے، سیاسی کاموں میں ایک عرصہ تک اُن کے ساتھ رہے، اور جب ۴۹ سال کی عمر میں اُن کی وفات کا دردناک حادثہ پیش آیا، تو اُن کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا "جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنا دینا، ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لئے اُن کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، اور بنابریں اُن کی جوانا مرگی ہمیشہ کے لئے تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار کیا جائے گا"

مولانا سجاد نائب امیر شریعت بہار کی رحلت کی خبر پائی، تو بے حد ملول رہے، ایک نجی خط میں اپنے ایک ندوی عزیز مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں :-

"ہاں بھائی! تمھارے دونوں خطوں میں مولانا سجاد مرحوم کے تاثرات کا عکس تھا، ع اک تیر تھا جو پار نے کلیجہ کے پار تھا، ۲۰ ر دسمبر کو خط سے اطلاع ملی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ کوئی رات ان کی یاد اور تصور ذہنی سے خالی نہیں، معارف میں ماتم لکھنے بیٹھا تو زبان و قلم نے ساتھ دینے سے انکار کیا مجبوراً چار سطریں لکھ کر چھوڑ دیں، ہمارا صدمہ خالی ہوگیا، اور کیا کہوں ع اک عالی دماغ تھا نہ رہا،

مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے، جب ان میں تصوف و سلوک کا ذوق پیدا ہوا، تو پہلے مولانا حسین احمد ہی کے جانب اُن کا میلان ہوا، اور ان ہی سے بیعت کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تشریف فرما ہیں، اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر وہ خود مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ بیٹھے ہیں، یکایک مولانا حسین احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سید صاحب

کا ہاتھ پکڑ کر مولانا اشرف علیؒ کے سامنے پیش کر کے فرمایا، ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں اسی خواب کے بعد وہ مولانا تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔

وہ اپنی زندگی کے آخر زمانے میں بقول اُن ہی کے روح کی الجھنوں میں مبتلا ہوگئے، اور اسی سے نجات کے لئے حضرت مولانا اشرف علی کی طرف رجوع فرمایا تھا، اس انقلاب کے بعد اُن کے پاس بہت سے خطوط آئے کہ اُن کے جیسے فاضل اجل اور محقق کو ایک پرانے طرز کے عالم کے سامنے سر جھکانے کی کیا ضرورت تھی، اس کے جواب میں آخر نجی صحبتوں میں فرماتے تھے کہ یہ لوگ مجھکو زبان سے تو فاضل اور محقق کہتے ہیں، مگر درحقیقت مجھ کو بے عقل جانتے ہیں آخر اس بات پر کیوں نہیں غور کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اگر واقعی محقق اور علامۂ دہر ہوں، تو کیا بلا وجہ میں نے مولانا تھانوی کا دامن تھاما، ؟ ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ میں نے اپنے اندر کوئی کمی پائی جس کی تکمیل کے لئے وہاں گیا، اسی سلسلہ میں اپنے ایک نجی خط مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۴۱ء میں سید عبد الحکیم صاحب کو لکھتے ہیں،

"آپ اپنی محبت سے مجھے سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن میں آپ کو کہوں وہ ہم علماء پر فرائض کا بار عام مسلمانوں سے زیادہ ہے، اس لئے اگر وہ درست نہ ہوں تو ہم پر عذاب دوسروں سے زیادہ ہے، معاملہ دماغ کا نہیں، قلب سلیم اور قلب منیب کا ہے، نفس کا نہیں، روح کا ہے، میری آدھی زندگی بندوں میں گزری اب کچھ اس زندگی کے لئے بھی کرنا چاہئے، جو باقی ہے، علم اور قوم کی خدمت بہت کچھ ہوچکی، ..... یہی میری منزل مقصود بہت دور ہے، ..... صرف تسبیح اور مراقبہ سے کچھ نہیں ملتا، جب تک دل کا تعلق دل والے سے نہ ہو، ہم تو بندوں کی رضامندی، اور ناراضی میں گرفتار ہیں، مالک کی رضامندی، اور ناراضامندی کی کس کو فکر ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے صحیح راستہ پر چلائے"

وہ "فرائض کے پابند اور بدعات سے نفور" تو شروع زندگی سے رہے لیکن آخر میں استقامت و خشیت "رغبت الی الطاعات"، "صلاح دل" اور "حصول اخلاص" کے خواستگار ہوگئے تھے،

انکسار | طبیعت میں انتہا درجہ کی متانت و سنجیدگی تھی، اس لئے دور سے دیکھنے والے اُن کی خاموشی اور کم آمیزی کو

اُن کے غرور اور پندارِ علم پر محمول کرتے تھے، ایک بار دہلی کے ایک رسالہ نے اُن کے خلاف کچھ لکھنا شروع کیا، اس رسالہ کے اڈیٹر سے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن) کے بھی مراسم تھے، سید صاحب نے عنایت اللہ صاحب کو لکھا کہ رسالہ مذکور کے اڈیٹر سے دریافت فرمائیں کہ مجھ سے اُن کو کیا شکایت ہے، جو میرے پیچھے پڑ گئے ہیں، عنایت اللہ صاحب نے اڈیٹر مذکور کو ایک خط لکھا، انھوں نے جواب دیا کہ مولوی سید سلیمان بڑے مغرور آدمی ہیں، اُن کے غرور کو توڑنا چاہتا ہوں، عنایت اللہ صاحب نے اپنی طرف سے اُن کو جواب دیا کہ میں بھی سید صاحب سے ملتا رہا ہوں، اُن کو کسی حال میں مغرور نہیں پایا، البتہ عالم اور بہت بڑے عالم ہیں، اپنے علم کے پندار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو یہ تو اُن کا بڑا وصف ہے،

وہ تحریر میں بھی مغرور نہ تھے، معارف کے شذرات لکھتے وقت برابر یہ خیال رکھتے کہ کہیں سے انکی بُو نہ آئے، اکثر ایسا ہوا کہ اگر کہیں میں لکھ جاتے، تو اس کو کاٹ کر اڈیٹر معارف یا خاکسار یا ہیچمدان بنا دیتے، اپنے نام کی رعایت سے ہیچمدان ہی لکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اپنی تحریر کے مسودے اکثر اپنے شاگردوں کو نظر ثانی کرنے کے لئے بلا تکلف دیدیتے، اور اُن کے مشوروں کو قبول کرنے میں مطلق تامل نہ کرتے، نجی صحبتوں میں دوستوں اور شاگردوں سے بہت بے تکلف رہتے، اگر ذہن میں کوئی اچھا فقرہ آجاتا، تو بلا تکلف کہہ ڈالتے، بعض اوقات ان فقروں سے اُن کے شاگردوں کو آنکھیں نیچی کر لینی پڑتیں،

اُن کے فطری انکسار کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک بار حیدرآباد دکن تشریف لے گئے، تو وہاں کے مشہور شاعر جناب امجد صاحب حیدرآبادی سے ملنے اُن کے مکان پر گئے، امجد صاحب نے اس کے شکریہ میں یہ اشعار لکھ کر بھیجے،

کردن شکر کس منہ سے تیرا خدایا — سلیمانِ اعظم میرے گھر میں آیا

از جلوۂ حسن خویش حیران کردی — کافر دل را مگر مسلمان کردی

بنواختی از قدومِ خود امجد را — این مورِ ضعیف را سلیمان کردی

تو سید صاحب نے اس کے جواب میں یہ رُباعی لکھ کر بھیجی ۔

اے تو اسیرِ لطفِ احسان کردی　　وز زورِ سخن دلم درخشان کردی

منت بہ غریبِ شہرِ حیدران کردی　　کان مورِ ضعیف را سلیمان کردی

لینت و مروت | طبیعت میں لینت و نرمی اور حلم و مروت اس قدر غالب تھی، کہ کسی معاملہ میں سختی و درشتی جانتے ہی نہ تھے حتیٰ کہ گھر کے ملازموں اور بچوں پر بھی سختی نہ کر سکتے تھے، ان کی زبان کبھی کسی درشت کلمہ سے آلودہ نہ ہوتی، اُن سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا، اور نہ کسی کی دل شکنی کی، اگر کسی بات سے ان کے شاگردوں کو آزردگی ہو جاتی تھی، تو طرح طرح سے اس کی تلافی کی کوشش کرتے تھے، اس وصف کا یہ نتیجہ تھا کہ جو شخص ان پر حاوی ہو جاتا، وہ اُن سے جو کام چاہتا لے لیتا تھا اور بعض اوقات اپنی طبیعت کے خلاف ایک کام کرنے پر مجبور ہو جاتے،

تحمل اور برداشت کے پہاڑ تھے، دوسروں کی تلخ سے تلخ باتوں کو پی جاتے، اور ناگوار سے ناگوار واقعات میں ان کے ابرو پر شکن نہ آتی، اس راہ میں انھوں نے اپنی ہستی فنا کر دی تھی، اُن کے دل پر کچھ بھی گذر جائے، مگر زبان پر کبھی شکوہ نہ لاتے تھے، انھوں نے مظلوم بننا گوارا کر لیا، مگر ظالم بننا گوارا نہ کیا، وہ نسلاً سید تو تھے ہی عملاً بھی سید تھے ۔

وہ اپنی سیاسی زندگی میں بھی شرافت اور مروت کے پیکر ہی بنکر کام کرتے رہے کسی سے سبقت لے جانے کی کوشش کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ ایک مکتوب مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سید عبد الحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں،

"......... میں نے بعد کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی دونوں سے الگ کہا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا پسند نہیں لیکن دونوں نے نامنظور کیا،"

۱۹۲۶ء میں ہندوستان کی طرف سے جو وفد حجاز گیا تھا، سید صاحب اس کے صدر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی اس کے اراکین تھے، سلطان ابن سعود کی بادشاہت کے بارہ میں سید صاحب کی رائے دوسرے اراکین سے مختلف تھی لیکن انھوں نے کھلم کھلا اختلاف کرنے کے بجائے سیاسیات ہی سے کنارہ کشی اختیار

کرلی، مولانا محمد علی مرحوم نے اس سلسلہ میں بعض ایسے مضامین لکھے اور بیانات دیئے جن سے سید صاحب کو اتفاق نہ تھا، لیکن ان کا جواب دینے کے بجائے وہ خاموش رہے، اسی زمانہ میں وہ دہلی تشریف لے گئے، تو مولانا محمد علی سے ملاقات ہوئی، سید صاحب نے اثنائے گفتگو میں اُن سے کہا کہ آپ چاہے جیسے بھی مضامین لکھیں یا بیانات دیں میں خاموش ہی رہوں گا، مولانا محمد علی کی حاضر جوابی تو مشہور ہے انھوں نے برجستہ کہا کہ یہ مضامین اور بیانات تو آپ کو خاموش کرنے ہی کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں، اس حاضر جوابی سے سید صاحب خود بھی محظوظ ہوئے، اور کئی بار اپنی نجی صحبتوں میں اس کو دہرایا، لیکن اختلاف رائے کے باوجود مولانا محمد علی کے بے حد مداح اور بڑے گرویدہ رہے، اور جب اُن کے انتقال کی خبر ملی، تو دیر تک آبدیدہ رہے، اور غایت اضطراب میں ٹہل ٹہل کر سکون پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور معارف میں اُن کا بڑا دردانگیز ماتم کیا جس کے بعض ٹکڑے یہ ہیں،

"افسوس وہ پُردرد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی، وہ بیقرار دل جو مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بے تاب کرتا تھا، دنیا کو قیامت تک کے لئے ساکن ہو گیا، وہ اشکبار آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشبو بن بن کر تپتے تھے، اُن کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اُس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تھم گیا، اور وہ ہر زور دست و باز و جو شب و روز کی خدمت گذاری اور سترہ آزمائی میں مصروف تھا، وہ اب ایسے جھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعداء کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہو سکا الوداع

والسلام الی یوم القیامہ،

پروفیسر محمود شیرانی مرحوم سے برابر علمی چشمک رہی لیکن اُن کی وفات پر بھی بہت ملول اور افسردہ ہوئے، اور اُن پر ایک مستقل مضمون معارف میں شائع کیا، اور اُن کے اوصاف کا ذکر ان الفاظ میں کیا،

"مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے، اُن کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا، .... مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا، .... حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے اور وسیلۂ مغفرت"

وہ کسی کے متعلق بھی بُری رائے نہ رکھتے، اُن کا قول تھا کہ جب میں کسی سے ملتا ہوں تو اس کو اچھا ہی سمجھتا ہوں اور اس وقت تک اچھا سمجھتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ خود اپنے کو بُرا نہ ثابت کردے، اپنے ایک ندوی عزیز کو ایک مکتوب میں لکھا کہ

"محبت، اعتماد، اور مسامحت میرا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا" (مورخہ ۹ اپریل ۱۹۴۱ء)

اشتعال انگیزی البتہ مذہب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی اہل قلم گستاخانہ اور نارواحملہ کرتا، تو اُن کے اشتعال اور رنج کی کوئی حد نہ ہوتی، اور اس کے جواب میں اُن کی جو تحریر نکلتی، وہ بہت ہی زہرناک ہوتی، ایسے موقع پر فرماتے کہ میرے قلم میں ایسا زہر بھی ہوتا ہے کہ سات سمندر کا پانی بھی اس کے زہریلے اثرات کو دور نہیں کرسکتا۔

کشادہ دستی دارالمصنفین میں اُن کی زندگی سو روپے ماہانہ وظیفہ سے شروع ہوئی جو ۳۲ سال کی خدمت کے بعد ۲۵۰ روپیہ سے زیادہ نہ بڑھ سکا، آبائی جائداد سے اخیر عمر میں فائدہ اٹھانے لگے تھے، اس سے ساٹھ ستر من غلہ سالانہ مل جایا کرتا تھا، لیکن اس محدود آمدنی میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی تھی کہ بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ضرورت کا ہر سامان اُن کے پاس موجود تھا، متعلقین کو اچھا کھلاتے اور پہناتے تھے، بعض اوقات معاش کی تنگی تو ضرور محسوس ہوئی لیکن کبھی کسی قسم کی تکلیف اٹھانے کی نوبت نہیں آئی، اعزہ واقربا کی امداد بھی کرتے

رہتے تھے، اُن کے ایک عزیز چار سو روپیے کے مقروض تھے، قرضدار کا بڑا سخت تقاضا تھا، انھوں نے اپنی پریشانی کا حال سید صاحب کو لکھا، اُن کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئے، اور حسب ذیل جواب دیا،

"آپ کا لفافہ ملا جس سے آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم ہوا، دل مضبوط رکھیے، اور خدا پر بھروسہ کیجئے...... اس میں امداد کے لئے میں حاضر ہوں، چار سو قرض ہیں، یہ قرض آپ مجھ پر سمجھیں، مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا، اس کی صورت نکالوں گا، اگر سو روپیے سال وہ لینا منظور کریں تو میں آسانی سے انشاء اللہ دے سکوں گا، اور اگر وہ چار سو اسی وقت لینے پر مصر ہیں، تو یہ بھی بفضل خدا ہو سکتا ہے، مگر اچھا ہو کہ اکتوبر کی تعطیل تک آپ مہلت لیں، یہ اس لئے کہ ڈاک سے بھیجنے میں، لوگوں کو معلوم ہو جائے گا، اور یہ کچھ اچھا نہیں،

اور جب یہ قرض ادا ہو گیا تو وہ بے حد مسرور ہوئے، ایک بار ان کے ایک عزیز نے وطن کے قیام کے زمانہ میں اُن سے کچھ قرض لیا، اور ایک دوسرے صاحب کو لکھا کہ یہ رقم اُن کو ادا کر دی جائے، جب وہ دینے لگے تو فرمایا یہ رقم قرض کے خیال سے دی ہی نہیں گئی تھی جس کی واپسی کا سوال ہو اور اس کے لینے سے انکار کر دیا،

ایک عزیزہ کی لڑکی کی شادی تھی، وہ خرچ کی کمی محسوس کر رہی تھیں، سید صاحب کو معلوم ہوا تو چپکے سے دو سو روپیے اُن کے پاس بھجوا دیئے، شادی ہو جانے پر ان عزیزہ نے اپنے بعض اعزہ سے اس رقم کا ذکر کیا، سید صاحب کو معلوم ہوا تو اس سے اُن کو بڑی آزردگی ہوئی۔

قومی چندے پابندی سے ادا کرتے رہے، ایک مکتوب مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۰ء میں سید عبد الحکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں، :-

"اب میرے سالانہ چندوں کی فہرست سنئیے، جو سالانہ ادا ہوتے ہیں، اور امسال ہو چکے ہیں، ہیہ:
طائف سالانہ ندوہ سو روپیے، مدرسہ سرائے میر دس روپیے، مدرسہ اسلامیہ اعظم گڈھ بارہ روپیے، انجمن امداد غربا اعظم گڈھ بارہ روپیے، رکنیت ندوہ پانچ روپیے، رکنیت ایجوکیشنل کانفرنس پانچ روپیے،

امارت شرعیہ دس روپے، انجمن تبلیغ الاسلام انبالہ دس روپے، انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ چھ روپے؛
ان چندوں کے علاوہ وطن کی انجمن الاصلاح کو عہ اور وہان کی مسجد کو بھی عہ سالانہ مستقل دیتے تھے،
اس کے علاوہ عارضی چندے بھی دیتے رہتے تھے،

دارالمصنفین کی ۳۲ سال کی خدمت کے بعد جب بھوپال تشریف لے گئے تو ایک ہزار تنخواہ مقرر ہوئی، وہان تقریباً چار سال رہے لیکن اس زمانہ کی آمدنی کا بڑا حصہ بعض اعزہ کی شادی انجام دینے، متعلقین کی خاص خاص ضروریات پوری کرنے اور اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرنے مین صرف ہوا،

استغنا و بے نیازی دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ مین جب اُن کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو مختلف جگہون سے بڑی بڑی تنخواہون کی ملازمتین اُن کے سامنے پیش ہوئین، مگر انھون نے ہمیشہ اُن کے قبول کرنے سے انکار کیا، ۱۹۱۹ء مین ڈاکٹر اقبال نے پنجاب یونیورسٹی مین ایک جگہ پیش کی، اس کو قبول کرنے سے بھی معذوری ظاہر کی، اس پر ڈاکٹر اقبال نے ان کو لکھا کہ

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کوئی قبول نہ کرین گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبرون کی تعمیل ارشاد مین آپ کو لکھنا ضروری تھا کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط مین تھا، اور وہ یہ کہ مین چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب والون کو صوبہ متحدہ کے علما و فضلا سے بیشتر فائدہ پہونچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہان رہنے سے بدستور جاری رہے،......"

تقسیم ہند کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی صدرنشینی جس کی تنخواہ ڈیڑھ ہزار ماہوار تھی پیش ہوئی اس کو بھی قبول نہ کیا، اور دوسرون کے لئے سفارش کر دی،

ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے شعبۂ دینیات کی پروفیسری قبول کرنے کے لئے اصرار کیا گیا، تو فرمایا کہ پھر دارالمصنفین کو کیا کرونگا، بعض ذمہ دار اشخاص نے تجویز کیا کہ یہ ادارہ بھی وہان منتقل کر دیا جائے، سید صاحب نے جواب دیا کہ پھر استاذ مرحوم کا مزار کس کے حوالہ کرونگا"

ایک بار علماء کے ایک اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور تشریف لے گئے، نواب زادہ سر عبد القیوم نے تمام علماء کو اپنے یہاں مدعو کیا، اور دعوت کے بعد ہر ایک سے علٰحدہ ملاقات کی، جب سید صاحب مل کر رخصت ہونے لگے، تو مصافحہ کرتے وقت سو روپیہ کا ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں دیدیا، مہمان نوازی کا یہ اخلاق سید صاحب کو پسند نہ آیا لیکن مروت میں خاموش رہے، اور نوٹ واپس نہ کر سکے، مگر لکھنؤ آکر یہ رقم دارالعلوم ندوہ کو دیدی اور اس کی باضابطہ رسید سر عبد القیوم کے پاس بھجوادی۔

۳۵ء میں ذات الجنب کے مرض میں مبتلا ہوئے، تو کئی مہینے تک علیل رہے، علاج میں آٹھ سو روپیے کے مقروض ہوگئے، دارالمصنفین کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ علاج کے سارے اخراجات ادارہ کی طرف سے ادا کیے جائیں لیکن انھوں نے اس کو گوارا نہ کیا، اور خود ہی قرض ادا کیا۔

پاکستان ہجرت کی تو آبائی مکانات، شاندار بنگلہ، باغ، جائداد، گھر کا سارا سامان، حضور نظام کا وظیفہ اور بھوپال کے پروویڈنٹ فنڈ کی رقم سب سے منھ موڑ لیا، اور مہاجرت کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے، جولائی ۱۹۵۱ء میں اس راقم کو لکھا کہ مہاجرت کی شان بہت بلند ہے، مہاجر صحابہ کی قدر اب معلوم ہوتی ہے، نہرو لیاقت پیکٹ سے بہار کے مہاجروں کو بہت کچھ سہولتیں دی گئیں، اُن سے فائدہ اٹھانے کے لئے بار بار اُن کی خدمت میں گذارش کی گئی لیکن غایت استغناء میں ۸ اگست ۵۲ء کو تحریر فرمایا:

"ہندوستان چھوٹنے پر جائداد و مکان کی محبت دل سے نکل گئی اور بقول شاعر

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا　　اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے

سلوک کی وہ منزل جو تصوف کی راہ سے شاید برسوں میں طے ہوسکتی ہے، اس مہاجرت میں دم کے دم میں طے ہوگئی"۔

پاکستان پہونچے تو ادارۂ تعلیمات اسلام کی صدارت پیش کی گئی، اس عہدہ کی بڑی تنخواہ تھی، یہ ادارہ دستور سازی میں مدد دینے کے لئے قائم کیا گیا لیکن پورے دو سال تک اس کو یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کرتے رہے کہ جب تک قوانین

مروجہ اسلامی نہ بنائے جائیں گے تنہا دستور سے کوئی مملکت اسلامی نہیں بن سکتی ہے، اور جب اُن کو مروجہ قوانین پر نظرثانی کرنے کی اجازت ملی، تو عہدہ قبول فرمایا، لیکن اس کی مدت ایک سال سے کچھ ہی زیادہ رہی، اس سے پہلے سوا دو سال تک متوکلانہ زندگی بسر کی، اور معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے بقول انہی کے اپنا پیشہ قدیم کتب فروشی اختیار کیا اور اسی لئے مکتبۃ الشرق قائم کیا،

دارالمصنفین سے لگاؤ

دارالمصنفین کے لئے انھوں نے جیسی قربانیاں کیں، اُن کی مثالیں اس زمانہ میں کم ملیں گی، اگرچہ حالات نے اُن کو آخر میں دارالمصنفین سے جدا کر دیا تھا، لیکن اس کے ساتھ اُن کی قلبی وابستگی آخر دم تک قائم رہی، اس کی ہر خلش پر بے چین ہو جاتے، اور اس کے ازالہ کی تدبیریں بتاتے، اور اس کی فلاح و بہبود کیلئے مفید مشورے دیتے رہتے، وہ ہندوستان ہی میں تھے کہ جون ۱۹۴۶ء میں بھوپال چلے گئے، دارالمصنفین سے ان کا ہٹنا کم اہم واقعہ نہ تھا، مگر بھوپال کے زمانۂ قیام میں وہ بدستور دارالمصنفین کے ناظم رہے، وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کے لئے آتے، اور ہدایتیں بھیجتے رہتے جس سے اُن کی کمی محسوس نہ ہوتی لیکن وہاں کے قیام کے دوران میں شاہ معین الدین صاحب ندوی نے دارالمصنفین کے مستقبل کے بارہ میں اپنی کسی تشویش کا اظہار کیا تو اس کے جواب میں دسمبر ۱۹۴۹ء میں ارقام فرمایا:

"میں دور ہوں مگر حالات سے قیاس کرتا ہوں کہ دارالمصنفین کا مستقبل خطرہ سے خالی نہیں ہے، معلوم نہیں اس کو کیا پیش آئے، یہ ظاہر ہے کہ اس کی تباہی میری تباہی ہے، اور مجھے اس سے کتنا رنج ہوگا، آپ کا یہ کہنا کہ اگر آپ واپس نہیں آئے تو میرے لئے بھی کہیں فکر کیجئے، مناسب نہیں کیونکہ دیر سویر تو ایک ضعیف العمر کو اس خاکدانِ فنا کو چھوڑنا ہی ہے، اور آپ لوگوں کو بہرحال اس ادارہ کو چلانا ہے، اور یہی عزم ہونا چاہیے"

وہ جب کراچی چلے گئے، تو وہاں سے اپنے شاگردوں کو تحریر فرمایا گیا کہ

"پہلے دارالمصنفین ایک شخص (مولانا شبلیؒ) کی یادگار تھا، اب اس کو دو کی یادگار سمجھ کر زندہ رکھو"

پھر علیحدہ علیحدہ خطوط لکھ کر شاگردوں کو تلقین کی کہ

"........آپ اسکو (یعنی دارالمصنفین) کو اپنی زندگی کا کام بنائیں، ورنہ لاکھوں کا سرمایہ اور عمروں کا حاصل تباہ ہو جائے گا"

اور جب دارالمصنفین کے پرانے نظام میں تبدیلی ہوئی، اور جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی کو شعبۂ علمی کی نظامت سپرد کی گئی تو بڑی مسرت و اطمینان کا اظہار فرمایا، چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء کے ایک مکتوب میں اُن کو تحریر فرماتے ہیں،

"دارالمصنفین میں آپ لوگوں نے جو کچھ طے کیا، اس پر میں راضی اور درگاہ الٰہی میں داعی ہوں کہ اس کو دارالمصنفین کے حق میں نافع فرمائے

سپردم بتو مایۂ خویش را تو دانی حساب کم و بیش را

آپکے ہونے کو میں اپنا ہی ہونا سمجھتا ہوں اور مجھ کو آپ کی قائم مقامی سے ویسی ہی خوشی اور طمانیت ہے جو کسی روحانی و جسمانی خلف الصدق کی جانشینی سے ہو سکتی ہے، خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی موت کے بعد کا نقشہ دیکھ لیا، اب آپ سے جہاں تک ہو سکے دین و ملت کی خدمت سمجھ کر اس کام کو انجام دیں اور ساتھ ہی اپنے رفقا کی تیاری میں مصروف رہیں، تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے اور استاد مرحوم کا سلسلہ قائم رہے، الحمدللہ آپنے معارف اور شذرات کے معیار کو قائم رکھا اور "تُو" اور "مَن" میں شاید ہی کسی کو فرق محسوس ہوتا ہو، وللہ الحمد"

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

سیرۃ السید کے کچھ نموال سبق

از

جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ "سید سلیمان" نام کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دار العلوم (ندوہ) میں سنہ ۱۳۱۸ھ کے آخر (غالباً ذی الحجہ) میں داخل ہوئے، اور راقم ہذا دوسرے ہی سال سنہ ۱۹ھ کے شوال میں، اس طرح بچپن اور نوعمری کے ابتدائی سالوں کو چھوڑ کر اُن کی پوری زندگی کے بڑے دور کو دور و نزدیک سے دیکھنے جاننے اور سمجھنے کے مواقع حاصل رہے، آخری دور ـ قیام پاکستان ـــ میں بھی وہ مہینے کے قریب بہت قریب سے چشم و گوش دونوں کو دید و شنید کی سعادت میسر رہی، ڈھائی ہفتے تو کراچی میں خود اُن کا مہمان رہا، ملتان میں خیر المدارس کے سالانہ جلسۂ دستار بندی میں یکجائی کا شرف حاصل رہا، اور پانچ ہفتے کے لگ بھگ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ[1] کی خدمت میں لاہور میں حاضری رہی، تو اس دوران میں کئی بار یونیورسٹی کی کمیٹی اور جامعۂ اشرفیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلہ میں تشریف لائے، اور خواجہ تاشی کے رشتہ سے مستقل حضرت ممدوح کے وہ بھی مہمان ہوئے

ندوہ میں نہ صرف طالب علمانہ معیت و رفاقت رہی، بلکہ جب استاد مقرر ہوئے تو شاگردی کی دولت بھی ملی، استاذ مرحوم و محترم علامہ نعمانی کی مجالس میں سالہا سال اُن کے پیچھے صفِ نعال میں شریک رہا، سب سے طویل دور اُن کا دار العلوم (ندوہ) اور دار المصنفین کی معتمدی و نظامت کا رہا، اس کم و بیش چوتھائی صدی کے دوران میں دونوں

---

[1] حضرت مفتی صاحب مجدد تھانوی علیہ الرحمۃ کے اجل خلفاء میں ہیں، متعنا اللہ بطول بقائہ۔

اداروں کے گوناگوں معاملات سے باضابطہ و بے ضابطہ خاکسار کو بھی تعلق رہا، "سیرت سلیمان" کے جلی و خفی نمایاں اور غیر نمایاں نقوش سب سے زیادہ اسی عہد میں ثبت ہوتے رہے، مکاتیب میں مرحوم زیادہ مستعد نہ تھے، پیش قدمی تو بلا ضرورت شدید شاذ ہی فرماتے، جواب بھی بارہا ہفتوں میں مرحمت ہوتا، خود مجھکو اپنے قلبی تغیرات کی بنا پر حفاظت مکتوبات کا بھی ہمیشہ اہتمام نہیں رہا، پھر بھی وفات کے بعد پرانے کاغذات جو الٹے تو "سید المکاتیب" کا ذخیرہ بھی ڈھائی سو کے قریب نکلا اور پوری نصف صدی سے بھی زیادہ روابط کے اس تسلسل اور تنوع کی بنا پر اس میں شک نہیں کہ "سیرت السید" کا بڑا کثیر مستند سرمایہ اس بے مایہ کے پاس ہونا چاہیے تھا، اسی توقع میں ہندوستان و پاکستان کے بعض ارباب رسائل کا حکم وارد ہوا کہ ان کے رسالوں کی خصوصی اشاعتوں اور مستقل سیرت کی تالیف میں کوئی بڑا وافر حصہ لے سکتا ہوں،

لیکن اس حسن ظن کے بدلے پر اُن کو کس طرح آمادہ کروں، اور کیونکر یقین دلاؤں کہ خود زندگی کے جس عالم سے گذر رہا، بلکہ جس پر زندگی ختم کر رہا ہوں، وہ بھی ہوئی آگ کے ایک ڈھیر سے زیادہ نہیں خصوصاً جب سے یہ بات بھی کی سمجھ میں یہ آگیا ہے کہ اسلامیت اور انسانیت کسی کا بھی بیڑا کاغذ کی ناؤ سے پار نہیں لگ سکتا، اور زبان و قلم کی رائج الوقت وبا سے ملک و ملت کے کاموں میں فلاح سے زیادہ فساد ہی کا مشاہدہ دن رات ہوتا رہتا ہے، اس وقت سے یقین فرمائیں کہ گو خود بھی اس وبا کے تعدیہ سے پوری طرح محفوظ نہیں تاہم مسلمان اور انسان دونوں کے دن بدن بگاڑ کو بناؤ سے بدلنے کی تدبیر اس کے سوا نظر نہیں آتی کہ خود مسلمان جن پر ساری دنیا کی ہدایت و امامت کی ذمہ داری ہے، وہ زبان و قلم کم چلائیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے شعبہ ذات میں مسلمان بن کر زیادہ دکھلائیں، بحقیقت اس بذات خود سراپا پا کا روکے لئے دن دوپہر کے سورج سے بھی بڑھ کر اتنی روشن و یقین ہو چکی ہے کہ لکھنا پڑھنا دونی کیا آتا ہے، ایسی مواقع پر اور بھی زبان گنگ اور قلم کند ہو جاتا ہے، خصوصاً تکلف و آورد سے ایک سطر بھی لکھنا پہاڑ ہوتا ہے،

اس کے علاوہ وہ اتفاقاتی تاریخی حافظہ پیدائشی طور پر حصہ میں بہت کم پڑا اور اب تو ناپید ہونے کے برابر ہے، لفظی روایت کسی بات کی گھنٹہ بھر بعد بھی مشکل ہی سے کر سکتا ہوں کسی گذشتہ واقعہ و معاملہ کی جزئیات

تفصیلات ذہن میں ڈھونڈھے نہیں ملتیں، زیادہ تر بس ایک ہیولی، وہ بھی دھندلا سا خاکہ دماغ میں رہ جاتا ہے، خود سید صاحب مرحوم کا قلم دینیات میں جیسی جیسی تاریخ وا جزئیات کے ساتھ متوقی کی معتوری فرمایا کرتا تھا، کسی موقع پر پاکستان ہی میں بڑی حیرت سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ آپ کے حافظہ کی کرامت ہے، یا کوئی یادداشت و روزنامچہ اس اہتمام سے ضبط فرماتے رہتے ہیں، ؟ جواب میں اُن کا محبوب مسکرانا تو یاد ہے لیکن جواب کیا ملا یا سرے سے کچھ ملا بھی ؟ یہ بالکل یاد نہیں آرہا،

ایسی صورت میں دوستوں کے حکم پر معذرت و ندامت کے سوا پیش ہی کیا کرسکتا تھا، البتہ دار المصنفین میں حضرت مرحوم کے مسند نشین برادر عالی قدر شاہ معین الدین سلمہ کو یہ جتنے جی مرحوم، خدا جانے کیسے اتنا یاد آگیا کہ ان کے حکم پر حکم کا تار نہیں ٹوٹ رہا ہے، آخر جب بیان تک نوبت پہنچی کہ سید صاحب کی بارگاہ میں آپ کا مضمون نہایت ضروری ہے، خواہ اس کے انتظار میں پرچہ کی اشاعت میں تاخیر کرنا پڑے، تو ذہن پر دباؤ زیادہ پڑا، اور ان سطروں تک پہنچا ہوں، والاتمام من اللہ،

سید صاحب کے علمی و عملی کمالات میں سب سے اونچا مقام اُن کی تصنیفی و قلمی یا ذہنی و دماغی خدمات کو حاصل ہو ذہن و ذہانت میں اُن کی طالب علمی کے متعدد رفیق[1] و معاصر متوقد الذہن اُن سے بڑھ چڑھ کر تھے، اور کہا جاتا تھا کہ اُن کے سامنے سید صاحب کا چراغ جلنا مشکل ہی لیکن ہر وصف کا کمال اس کا نقطۂ اعتدال ہوتا ہے، متوقد یا بھڑکتے ہوئے ذہنوں کے علوم و افکار کو اکثر جھلس ہی جاتے دیکھا، ذہن کا کوئی متوازن تخلیقی کارنامہ ذہانت کی نرم و معتدل آنچ ہی چاہتا ہے، مرحوم کا سبق آموز ذہنی کمال اُن کا ذہنی توقد نہیں توازن تھا، چنانچہ اُن کا ذہن اُن کے جسم کی طرح متانت ہی کی چال چلتا تھا، لیکن پڑتا ہر قدم مضبوط و ہموار زمین پر، بہت زیادہ ذہین، و ذکی آدمی بعضکم کم کرتے ہیں البتہ ذہانت کے زور سے اُگلتے زیادہ اور جلد ہیں،

سید صاحب کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے پڑھتے اور کتب بینی کرتے اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ

---

[1] مثلاً سید ظہور احمد وحشی شاہجہان پوری،

ہر طرح کی چیزیں پڑھتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ خوب چبا چبا کر ہضم کرتے، طلسم ہوش رُبا تک کو اس توجہ سے پڑھا تھا کہ چند وہ کے ایک وفد میں ساتھ تھا، یاد نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کئی میل پیدل چلنا پڑا، غالباً کچھ پانی بھی برس رہا تھا، اس عالم میں وہ طلسم ہوش ربا اس طرح سُناتے جا رہے تھے، جیسے کتاب پڑھ رہے ہوں راستہ تفریح کی سفر بن گیا، شاگردی کی سعادت کے بعد سے خدمت میں حاضری زیادہ ہونے لگی تھی، جب حاضر ہوتا، کچھ نہ کچھ پڑھتے لکھتے ہی پایا، آخر تک یہ رنگ دیکھا کہ کوئی معمولی اخبار و رسالہ یا کوئی گری پڑی کتاب بھی سامنے آگئی تو اُسی وقت اٹھا کر دیکھنے لگتے، ذرا بھی کوئی بات دلچسپی کی پاتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ خالی وقت گذاری کے طور پر نہیں توجہ کے ساتھ پڑھ رہے ہیں،

طبیعت اخاذ بہت تھی، ہر ادنی و اعلیٰ کتاب و رسالہ اور ہر کہ ومہ کی باتوں سے مطلب کی بات اخذ کر لیتے، اور حسب موقع کام لیتے، فوراً قابلِ قبول نظر آتی، تو غور فرمانے پر جب جتنا جز بھی کسی کی بات کا ان کا دل و دماغ قبول کرتا، تو قبول ہی نہیں، اعتراف بھی بڑی کشادہ دلی سے فرماتے، ایک آدھ مثال خود اپنے تجربہ کی یاد آگئی، میں کہا کرتا ہوں کہ یقینی موت ہے یا زندگی؟ زندگی تو اتنی غیر یقینی کہ یقین پل بھر کا نہیں اور موت اتنی یقینی کہ ٹلے نہ ٹلے "تیاری یقینی چیز کے لئے زیادہ کرنی چاہئے، یا غیر یقینی کے لئے؟ فرمایا کہ یہ بات تمہاری ایسی جی کو لگ گئی کہ اس سے کام لیتا رہتا ہوں، حیدرآباد میں وجودی رنگ کے ایک بڑے صاحبِ حال و قال بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، شیخ اکبر کے مسلک پر مخلوقات کی توجیہ معلوماتِ الٰہیہ کی تجلیاتی نمود و ظہور سے بڑے جوش و خروش سے فرماتے، نئے پُرانے دونوں طبیعتوں کے اہلِ علم بہت متاثر ہوتے جن میں ہمارے مولینا گیلانی، اور ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے مشہور معروف اصحابِ علم و قلم تک داخل ہیں بلکہ دونوں ماشاء اللہ مجاز و خلیفہ ہیں علماً تو شیخ اکبر کا زمانے کے خصوصاً بڑے حریص تھے اور چھاپہ تمام تر آیات و احادیث ہی سے مارتے تھے سید صاحب کا میلان ایک تو ابتدا میں اہلحدیث کی طرف زیادہ رہا، دوسرے زیر تربیت نئے مجددی مسلک کے بڑے بھائی کے رہ چلے وجودیت کے نام ہی سے چوکنا ہوتے تاہم جب آخری مرتبہ حیدرآباد تشریف لے گئے، تو وہ بھی اپنی اخذ و استفادہ کی طالب علمانہ صفت و سیرت کی بنا پر خاکسار اور مولانا

گیلانی کی "غیب و تعریب سے کئی بار حضرت ممدوح سے ملے، اور ان کے "حال" سے کافی متاثر ہوئے،

مین نے مولانا کی وجودیت کو سمجھنے کے لئے سید صاحب کو قرآن مجید کی اُن آیات کی طرف خاص طور سے توجہ دلائی جن مین خلق و خلاقیت کو علم کے ساتھ غیر منفک طور پر وابستہ ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً "الا یعلم من خلق بلی وھو الخلّٰق العلیم" وغیرہ، اور کچھ جدید فلسفیانہ وعقلی نظریات ورجحانات سے بھی اس کی تشریح کی، بڑی توجہ و دلچسپی سے سنا، پھر کچھ دن بعد فرمایا کہ بھائی ان آیات سے تم لوگون کی وحدۃ الوجود تو ابھی سمجھ مین نہین آئی لیکن تمھاری گفتگو کے بعد سے علم و خلق کی وابستگی کی آیات پر غور کرتا رہا، اس مین شک نہین کہ دونون کا ربط بہت تفکر و تدبر کے لائق ہے، (او کما قال)

عرفی طالب علمی سے لے کر علمی شہرت وعظمت کے اوجِ کمال تک اشخاص اور کتابون دونون سے کھلے دل و دماغ کے ساتھ اخذ و استفادہ کا یہی کمال کہنا چاہئے کہ اُن کو زندگی بھر لفظاً و معنیً "سچا طالب علم" بنائے رہا، گوناگون کمالات مین وہی صلاحیتون سے بہت زیادہ کسبی طور پر ان صلاحیتون سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کو دخل رہا، فطری ذہانت و ذکاوت، طبّاعی وجودت والے دنیا مین کم نہین ہوتے، ندوہ مین سید صاحب سے پہلے اُن کے ساتھ اور بعد ایک سے ایک بڑھ کر ذہین وطبّاع داخل و فارغ ہوتے رہے لیکن "سید سلیمان ندوی" ہونے مین سب پیچھے رہے، بڑا راز اس کا اُن کے کسبِ طلب کا کمال ہی تھا، اُن کی طالب علمانہ اور عالمانہ زندگی و سیرت کا یہ بڑا قیمتی سبق ہے،

علمی ذوق و شوق کی عام فضا ندوہ مین اُستاذ محترم (علامہ نعمانیؒ) کے دور مین پیدا ہوئی، لیکن سید صاحب جہان تک دیکھا سنا، اس سے پہلے بھی کتاب کے کیڑے تھے، کھیل کود مین کوئی نمایان شرکت تو قطعاً یاد نہین آتی، نہ میل جول، اور سیر و تفریح کی زیادہ عادت تھی، یہی رنگ طبیعت کا آخر تک رہا کہ خاص تعلق کے لوگون تک بھی وہ "بزمش" ہی پہنچ پاتے، گویا یکسوئی ان کا طبعی امر تھا، جو علم و عمل کی ہر راہ مین کسب کمال کی شرط ہے،

اعمال و اخلاق کے اعتبار سے ایک دینی درسگاہ کے شایان شان تو دارالعلوم ندوہ کا کوئی زمانہ نہیں کہا جا سکتا لیکن سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ خصوصیت کیساتھ بڑا مسموم تھا، طلبہ کیا بعض اساتذہ تک کی اخلاقی حالت کچھ اچھی نہ تھی، طلبہ کا کمروں میں چھپ چھپ کر تاش کھیلنا، راتوں کو بھاٹک پھاند پھاند کر تھیٹر جانا معمولی باتیں تھیں، پھر رات دن ساتھ رہنے والے طالب علموں میں ایک کا حال دوسرے سے کب تک چھپتا ہے باوجود یہ سید صاحب کی اس زہریلے ماحول سے متاثر کی کوئی بات دیکھنا کیا سننا بھی تعلقاً یاد نہیں، بس ایک ہی بات کی شہرت تھی کہ پیالوں کا زیادہ بند رہتا، مراد بکرے کا گوشت، اور گھی کے تار والا پیالہ ہے، جو اس زمانہ میں پانچ روپیہ ماہوار میں مستطیع، و غیر مستطیع سب ہی طالب علموں کو دو وقتہ ملتا تھا کسی کے پیالہ میں تار نہ ہوتا، تو دسترخوان ہی پر صدائے احتجاج بلند ہوتی، نماز کی غیر حاضری پر منتظمین نے سب سے کارگر سزا اس عزیز پیالہ کا بند کر دینا ہی قرار دے رکھی تھی، اور مسجد میں ہتوں کو اس تار والے پیالہ کی کشش ہی پہنچاتی،

ایک اور اصطلاح "پوستین" یعنی کاہل کی چلی ہوئی تھی؛ غالباً ہمارے درآمد کی ہوئی اور ہماری ہی طالب علموں کی چلائی ہوئی۔ بے تکلف احباب غریب سید صاحب پر اس کو خوب چست کرتے، ان کے پیالہ کی قربانی کا زیادہ تر اسی کو خیال کیا جاتا۔ یہ چیز زندگی کی اکثر عادتوں میں کم و بیش زندگی بھر ان کی رفیق رہی، خطوں کا مہینوں جواب نہ دینا، کہیں جانے آنے یا سفر کا ارادہ کر کے بارہا پورا یا وقت پر پورا نہ ہونا، اکثر اس طبعی خصوصیت کا مظہر ہوتا "پوستینی" اور کتب بینی میں بھی کچھ طبعی مناسبت معلوم ہوتی ہے، جس کا تجربہ راقم "پوستین" کو خود اپنی آخر زندگی میں خصوصاً ہو رہا ہے، اپنے مذاق کی کتابیں وغیرہ تو صبح سے رات تک پڑھتا رہ سکتا ہوں، کتاب و مضمون کی صورت میں کچھ لکھتا بھی رہ سکتا ہوں، لیکن عجیب بات ہے کہ خط کا ایک کارڈ بھی طبیعت پر جبر کر ہی کے لکھا جاتا ہے، جگہ سے حرکت کرنا، اس کا تو یہ حال ہو گیا ہے کہ صبح یا شام گشتی کی عادت کم و بیش چالیس سال سے جاری ہے، وہ تو عادت ہی کی بدولت چلی جاتی ہے، باقی کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے کہیں جانا ہوتا ہے تو دنوں ہفتوں، بارہا مہینوں ٹالتا رہتا ہوں، اس ناکارہ کا تو ذکر ہی کیا، سید صاحب کی طرح بعض دوسرے اکابر علم و قلم کا بھی

یہی حال دیکھا سنا، مولانا عبدالحمید فراہی رحمۃ اللہ علیہ جید عالم اور اپنے رنگ کے یگانہ مفسر ہی نہ تھے، بڑے صاحب تقویٰ و تقدس بزرگ تھے، اُن کے چھوٹے بھائی نے خود اپنی اور مولانا ممدوح کی اس "پوتینی" کی بڑی دلچسپ اور مزہ دار توجیہ سنائی، کہ ہم دونوں بھائیوں کے دو اصول ہیں، ایک کا یہ کہ جو کام کل ہو سکے آج نہ کرو، اور دوسرے کا یہ کہ جو دوسرے سے ہو سکے، خود نہ کرو، مزاج کی سنجیدگی بھی کچھ نہ کچھ سست روی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، سید صاحب کی غیر معمولی سنجیدگی اُن کا بڑا نمایاں وصف تھا، جلد بازی سے کسی کام میں بھی ذہن و جسم کسی سے بھی کام لینا گویا جانتے ہی نہ تھے،

اسی کی برکت تھی کہ ندوہ میں اعمال کے ساتھ عقائد کی سستی کا جب ایک تیز سیلاب آیا، تو سید صاحب اپنی جگہ سے اس سیلاب کی عین زد میں ہو کر بھی زیادہ نہ ہلے، راقم بنا "روشن خیالی" میں اپنے کو اُن سے بہت آگے پاتا، نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا، پھر بھی سید صاحب کے علم و عقل کا اتنا قائل تھا کہ اپنے شکوک و شبہات اُن ہی کے سامنے زیادہ پیش کرتا، ایک مرتبہ جبر و قدر کے متعلق اچھی طرح یاد ہے کہ اُن کی تفہیم و توجیہ سے خوب تشفی ہو گئی، گو بعد میں شرح صدر الحمد للہ کہ خود کتاب اللہ سے نصیب ہوا، کہنا یہ ہے کہ سید صاحب ندوہ کے دور روشن خیالی و عقل پرستی میں بھی "عقل پرست" کبھی نہیں ہوئے،

نقد ہر سود و جیب زیان اندا ختہ" گو عقائد و ایمانیات کی سستی و کمزوری سے بڑھ کر کوئی ضرر و زیان نہیں، تاہم ندوہ میں علم و تعلم کا ذوق و شوق اور دور دور و اسی دور کی یادگار ہے، اس ذوق شوق کی بدولت نہ کہ دینداری کے جذبہ سے اخلاقی مفاسد کا زور بھی کم ہوا جس میں کچھ بھی صلاحیت ہوتی تقریر و تحریر ادب و انشاء اور عربی یا دونوں کے میدان میں اتر پڑتا، بعض غریب صلاحیت و عقل دونوں سے کورے کچھ نہیں تو نخاس سے ٹوٹی پھوٹی میز کرسی خرید کر روزانہ قلم کاغذ لے کر بیٹھ ضرور جاتے، اور بزنہ صفت تعالیٰ ہی سے اپنی تشفی کرتے، زیادہ میلان تاریخ اور ادب کا تھا، دونوں کی صلاحیت و مناسبت سے قطعاً محروم ہونے کے باوجود کتنا نہ جانے کر ابن خلدون و ابن خلکان خود میں بھی بوزنہ وار ہی دیکھا کرتا، عربی میں زبردستی مقرر بننے میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ ایک دن استاد محترم (علامہ نعمانی) نے خود اپنے سامنے تقریر کرائی، اور پسند فرمائی، تقریر کا موضوع بھی

وغریب — اب بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں، — میں نے شبلیؒ اختیار کیا تھا، مگر صلاحیت کے خلاف زبردستی کے دن چل سکتی تھی، نہ مورخ بن سکا، نہ ادیب نہ مقرر، نہ عربی کا نہ اردو کا، طبیعت کو نسبتہً عقلیات سے کچھ لگاؤ پایا، وہ بھی زیادہ عقلیات جدیدہ سے جس کی شد بد عربی رسائل خصوصاً المقتطف — سے شروع ہوئی، دین مذہب کا جزو عقلیات میں کلامیات سے زیادہ لگتا ہے، اور جس طرح الفاروق، المامون کا مصنف تاریخ پسندوں کا آئیڈیل بنا، اسی طرح الکلام، اور علم الکلام کا مصنف، اس خبطی کے دیوانہ کا بن گیا تھا،

ہمارے "سید العلم" کی قلمرو سے ماشاء اللہ کلامیات وعقلیات کی اقلیم بھی باہر نہ تھی، ضابطہ کا شاگرد تو نہیں بھی اُن کا ہو چکا تھا کہ استاذ مقرر ہونے پر میری جماعت کا بھی ایک سبق اُن سے متعلق تھا، غالباً ادب کی کسی کتاب کا ساتھ ہی اس زمانہ میں جب وہ مدرسہ سے باہر مع اہل وعیال ایک چھوٹے سے مکان (موجودہ مرکز دعوت وتبلیغ کے قریب) قیام فرما تھے، تو میری حاضریاں زیادہ ہونے لگی تھیں، ان حاضریوں میں کس نوع کا استفادہ زیادہ کرتا تھا، یہ بالکل یاد نہیں، اپنی اُس وقت کی طلب وذوق کو دیکھتے قرین قیاس یہی ہے کہ کلامی وعقلی چیزوں میں زیادہ مستفید ہوتا ہوں گا،

ندوہ کی تاریخ کا یہی وہ دور ہے جس میں ایک طرف علامہ نعمانی جیسے صاحب علم وقلم کی تربیت میں ہونے والے "علامہ ندوی" کے علم وقلم کے وہبی وکسبی جوہر روز بروز کھل رہے تھے، اور دوسری طرف حرف شناس راقم ہذا کی نیازمندیاں بھی اسی زمانہ سے سید صاحب کی خدمت میں بڑھیں،

اس عہد میں مرحوم سے متعلق دہرانے والا وہی سبق برابر ملتا رہا کہ ذہنی ودہبی صلاحیتوں والے اور دوسرے بھی ندوہ میں اُن کے برابر کے یا بڑھے ہوئے موجود تھے لیکن کسب، طلب، اخذ واستفادہ کی دھن اور لگن میں ان کا ہمسر کوئی معلوم نہیں، جب اُن کے قیام گاہ کے چھوٹے سے بیرونی کمرہ میں حاضر ہوتا، فرش پر بیٹھے بیٹھے کتاب یا قلم ہی سے مشغول پاتا، یا کبھی کبھی کسی بچہ کے ساتھ پدری شفقت کا حق ادا کرنے میں تبلوی مجالس میں اور بھی بہت سے طلبہ واساتذہ ہوتے تھے لیکن سید صاحب کا شاید ہی کسی مجبوری میں کوئی دن ناغہ جاتا ہوگا

در خاص طور پر عام مجلس کے علاوہ اپنے مضامین کی اصلاح وغیرہ کے سلسلہ میں دوسرے خالی اوقات میں بھی سب سے
زیادہ حاضر ہونے والوں میں وہی تھے۔

ملک میں چھوٹی بڑی سیکڑوں دینی درسگاہوں کے ہوتے ندوہ نے ایک نیا دَارُالعُلوُم قائم کرکے دینی
تعلیم و تربیت کے جن نئے مقاصد کا بیڑا اٹھایا تھا، ان میں سب سے نمایاں وقت کا ایک اہم دینی مطالبہ ایسے علما کا
پیدا کرنا تھا، جو عصری تقاضوں اور علوم و فنون سے آگاہ ہوں، اور اُن کے مقابلہ میں دین کی علمی و عملی خدمات کا
حق ادا کرسکیں، اس مقصد عظیم خصوصًا جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لئے جیسا سامان و سرمایہ درکار تھا، ندوہ کو
کبھی میسر نہ آیا، بے سرو سامانی کے دیکھتے اس کے طلبہ میں نفسِ مقصد کی روح پھونکنے میں جتنی کامیابی حاصل
کی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری ساز و سامان بھی اگر کسی معتد بہ درجہ میں فراہم ہوتا، تو اسلامی نقطہ نظر
سے دینی ہی نہیں، دنیوی یا سیاسی و قومی قیادت کا مرکز ہندوستان کیا شاید سارے عالم اسلامی کا آج
ندوہ ہی ہوتا،

پھر بھی بہت سے ندویوں نے اس روح سے جو ملک کر ذاتی شوق و شغف اور کوششوں سے جس حد
ل ندوہ کے مقصد کو پورا کرسکتے تھے کیا، اور جماعتی حیثیت سے ندوی قلم نے جدید طبقات میں جو اعتبار پیدا کیا، اور
لم و کیف دونوں طرح جو خدمات انجام دیں کسی دوسرے مدرسہ و ادارہ میں اس کی مثالیں شاذ و نادر افراد ہی
ک ملتی ہیں، وہ بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ ندوہ ہی کی آواز بازگشت ہے، دارالمصنفین جیسے ایک مستقل و مستند تصنیفی
دارہ اور تربیت گاہ کو ندویوں ہی نے وجود بخشا، اور کون نہیں جانتا کہ اس وجود کا آغاز و انجام سیدنا
ہی کی ذات تھی، نری کتب فروشی یا کتب سازی کے علاوہ اب خالص تحقیقی و تصنیفی ذوق یا اُس کی تربیت
تعلیم کے جو کچھ بچے کھچے آثار رہ گئے ہوں، اُن کو اسی ذات والاصفات کے باقیات صالحات میں شمار کرنا چاہیئے

راقم سطور نے کسی کتاب کے دیباچہ یا مقدمہ میں مرحوم کے اس مرتبہ و مقام کے مدنظر اُن کو دارالمصنفین کا
سید الطائفہ[1] "لکھا تھا، لیکن آج جب ماضی و مستقبل کی طرف نگاہ جاتی ہے، تو اُن کی ہستی دارالمصنفین ہی نہیں ندوہ

---

[1] (ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ)

اور ندویت کی پوری ۶۰ سالہ تحریک و تاریخ کی سید الطائفہ نظر آتی ہے۔ ماضی میں تو ظاہر ہے کہ "ندویت" کے نام و کام میں اس مقام تک رسائی کسی نے نہیں پائی، مستقبل میں بھی امید بخش آثار و علائم نہیں، زبانِ خلق کا "خدائی نقارہ" بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطلق "علامہ ندوی" یا "مولانا ندوی" سے ندویت کا یہ فرد فرید "سید الطائفہ" مراد و مفہوم ہوتا رہے گا، بظاہر آیندہ ندوہ میں "سلیمان" کے نقش ثانی کے ابھرنے کی توقع نہیں[1]، والغیب عند اللہ

اسلام کی علمی و قلمی خدمات کا سب سے عظیم الشان و عالی مقام کارنامہ سید صاحب کا بالکل بجا طور پر سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قرار دیا جاتا ہے لیکن حضور کی سیرت کیا خود حضور کے دشمنوں نے بزعم خود بڑی سے بڑی داد تحقیق کے ساتھ نہیں لکھی، دشمنوں کو جانے دیجئے، دوستوں یا مسلمانوں کے متعلق سوال ہے کہ دین کی کوئی چھوٹی بڑی خدمت اگر دل کے اخلاص اور ایمان کے قلبی داعیات و محرکات کے ساتھ انجام نہ دی گئی ہو، تو اسلام کے ترازو میں اس کا کیا وزن ہوگا ؟ وہاں تو ہر چھوٹے بڑے عمل کی قیمت اسی حساب سے لگے گی جس حساب سے وہ کفر و شرک ہی نہیں، ریا و نفاق، مال و دولت، جاہ و شہرت کی گندگیوں اور آلایشوں سے پاک دل و دماغ سے کیا گیا ہوگا، خود اسلام کی کتاب نے حصر کے ساتھ اسی کا تو مطالبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول صرف

(حاشیہ ص گذشتہ) [1] لطیفہ یاد آگیا، دار المصنفین کی کسی صحبت میں "سید الطائفہ" کے جوڑ پر مولانا مسعود علی صاحب کے لئے "شیخ الطائفہ" کا خطاب تجویز ہوا تو قدرۃً ایک تیسرے رکن رکین کے لئے اس وزن کی فکر ہوئی، مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مطلق طائفہ"!

[1] مولانا علی میاں سلمہ کی غیر معمولی للّٰہیت کی بدولت دار العلوم (ندوہ) ان کے خاص رنگ و حال کے "ایک دار المبلغین" میں تبدیل ہو رہا ہے، اور تبلیغ کی خدمت بجائے خود دین کی ساری علمی و عملی خدمات کا مرکزی مقصد ہی نہیں بلکہ حضرات انبیاء کی بعثت کا واحد مقصد ہے، اور ندوہ کے خاص مقصد کے لئے اگر ایک ادارہ کی ضرورت ہو تو اس کے لئے میدان کی تاہم اگر ندوہ کی خصوصی تحریک بھی وقت کی کوئی قابل لحاظ دینی خدمت تھی یا ہے، تو دونوں ایک ہی مرکز میں مدغم کر دینے سے طلبہ و اساتذہ سب میں ایک ذہنی خلط و انتشار زیادہ مشاہدہ میں آرہا ہے، والعلم عند اللہ

اس کو نصیب ہوگا، جو اس کی رضا جزا یا آخرت کی فوز و فلاح کے سوا نام و نمود مال و منال وغیرہ تمام ناپاکیوں سے پاک و صاف دل لے کر حاضر ہوگا، الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔

تصوف کے نام کو بہت سے اچھے خاصے اہلِ علم افراد و جماعتوں نے محض کسی خاص تعصب و توہم یا مزاجی خشکی و توحش کی بنا پر اپنی چڑھ بنالی ہے "ندویت" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حالانکہ تصوف کے اسم و عنوان کا مسمیٰ و مضمون قلب کو "قلب سلیم" بنانے یعنی اُس کی صحت و سلامتی یا باطنی رذائل سے صفائی کے سوا کیا ہے، قلب کے اسی تصفیہ و تزکیہ سے تقویٰ کی زندگی اور اللہ تعالیٰ سے احسانی نسبت پیدا ہوجاتی ہے۔ جب تک قلب دنیا کی ہوا و ہوس کا بت خانہ بنا ہوا ہے، اس وقت تک سچ یہ ہے کہ کفر و شرک ہی نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا اخلاقی و باطنی رذائل اکثر کفر و شرک ہی کے چھپے ہوئے شعبے ہوتے ہیں، آخر خود قرآن ہی نے "ھوا" کو بھی "الٰہ" یا معبود کہا ہے، مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ ۔ تو ہوا پرستی کے ساتھ خدا پرستی کیسے جمع ہوسکتی ہے، اگر ریا و نفاق کا روزہ نماز، روزہ نماز نہیں تو تحریر و تقریر، تالیف و تصنیف کی نام نہاد دینی خدمات کی تہ میں بھی خدانخواستہ جاہ و جلال یا نفس و نفسانیت کے جذبات شریک ہوں، تو خدا و رسول کی راہ میں یہ شرک کے سوا کیا ہوگا ؟

دینی کے معروف ومسلّم خدمت گذاروں تک کو دیکھا جاتا ہے کہ جب اُن کا قلم کسی مسئلہ و معاملہ میں ایک دوسرے کی تردید و تنقید پر چلتا ہے، تو شاید ہی کوئی قلم باہمی بغض و حسد میں تنقیص و تحقیر کی ذاتیات تک نہ اُتر آتا ہو، بلکہ اس نمک مرچ کے بغیر قلم میں زور ہی نہیں آتا، حال ہی میں دیکھا کہ ایک دینی ہی جماعت کی کسی کتاب میں دوسری جماعت کی خدمات کا ذکر و اعتراف نہ تھا، اس پر قلم میدان میں آگیا کیسی چھوٹی اور اوچھی بات! دور و نزدیک سے بہت سے نئے پرانے اہلِ قلم کو جاننے پہچاننے کا موقع ملتا رہا، مگر اس طرح کی نفس و نفسانیت کے مظاہروں سے پاک ایک مثال بھی ذہن میں نہیں، تھوڑی بہت اگر ہے تو اُنہی کی جنہوں نے ع

"پیش مرد کاملے پامال شو"

کی تھوڑی بہت ہمت پائی، ورنہ عام طور پر تو خالص دینی مقاصد کے نام پر رسالے نکالنے والوں، مضامین لکھنے والوں

اور کتابیں تصنیف کرنے والوں کے دل میں تو یہ سوال بھی شاید پیدا ہوتا ہوگا کہ کسی خدمت و عمل کے دینی یا مقبول ہونے کی پہلی شرط مقصد و ارادہ یا قلب و نیت کی سلامتی و صحت ہے، صحیح نیت کے بغیر دین کی نگاہ میں کسی عمل کا اعتبار درجہ نہیں، انما الاعمال بالنیات" بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے،

قلم والوں کا بڑا دعویٰ اپنے علم و فہم کا ہوتا ہے لیکن دین کی فہم بھی تقویٰ ہی سے پیدا ہوتی ہے، اور تقویٰ کا سرچشمہ قلب ہی ہے، حضور نے قلب ہی کی طرف اشارہ فرما کر تکرار و اصرار کے ساتھ فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے تقویٰ یہاں ہے، التقویٰ ھٰھنا التقویٰ ھٰھنا، خود قرآن مجید نے اپنے سے ہدایت پانے کی لاکھوں ہی صحیح فہم قرآن ہے، شرط پہلے قدم ہی پر جو لگائی وہ نہ قلم کا مرد میدان ہونا نہ کتابوں کا حمال ہوتا، بلکہ متقی ہونا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ،

ایک طرف اپنے علم و نظر کی حد تک ایک "اتقی الناس" اور اس کے علم و عمل، فہم و فراست کو سالہا سال دیکھ کر یہ حقیقت دل میں بیٹھ چکی تھی کہ دین خالی کتاب و قلم سے ہرگز نہیں پیدا ہوتا، نہ علم میں نہ عمل میں، دوسری طرف اس مرض کا شدید مریض ہوں کہ کسی شخص کی کوئی خرابی و خامی چھوٹی ہو یا بڑی دیکھی نہیں جاتی، راستہ میں اگر کوئی نل کھلا اور پانی ضائع ہوتا دیکھتا ہوں، تو جب تک اس کو بند نہ کرلوں، قدم آگے بڑھایا نہیں جاتا، تو پھر گھر یا ہر عزیزوں، دوستوں، ملنے جلنے والوں میں دین و دنیا کی کوئی کمی و کوتاہی دیکھ کر کیسے رہا جا سکتا ہے، خود علم و عمل، ظاہر و باطن ہر طرح کے نقائص و رذائل کا مجسمہ ہوں، اور اُن کی دینی و دنیوی مضرتوں کو دن رات محسوس کرتا رہتا ہوں اس لئے اور بھی ہمدردی کا احساس تیز ہو گیا ہے، بالکل جس طرح دمہ کا کم و بیش چالیس سال سے مریض ہوں، اور اس کی تکلیف میں راستہ چلتے بھی کسی کو مبتلا دیکھ لیتا ہوں تو یہاں تک ہوا کہ گھر لوٹ آیا اور عارضی افاقہ کی جو مشہور مجرب دوائیں ہمیشہ پاس رہتی ہیں، لے جا کر پہلے کھلا دیا جب چین پڑا،

اپنا یہ مرض اس لئے عرض کر دینے کی ضرورت پڑی کہ سید صاحب کے علمی و قلمی کمالات ہی نہیں، بہت سے فطری و وہبی اخلاقی و قلبی فضائل کا زندگی کے مختلف حالات و معاملات میں جو تجربہ سالہا سال ہوتا رہا تھا، اُن میں بس ایک ہی آنچ کی کسر نظر آتی کہ کسی مرد کامل صاحب نظر تک پہنچ جائیں، ایسے صاحب علم و فضل کے لئے ذ

نظر اشرف "مرفت تھانہ بھون میں نظر آئی، اور آخر اپنے اسی مرض "خیر خواہی" سے مضطر ہو کر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا، ابتداءً غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی، وہیں یہ تقاضا قلب میں تیز ہوگیا تھا کہ میرے جیسے بے علموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم و قلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے افادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں انشاء اللہ کندن ہو جائے گا، الحمد للہ ایسا ہی ہوا،

بہتوں کو حیرانی رہی کہ مرحوم نے ایک ہی جست میں "ندوہ" سے "دیوبند" تک کا فاصلہ کیسے طے فرمایا، ماننے سنانے اور ہستی مٹنے کا ہے، سید صاحب ماشاء اللہ صوفی پیدا ہی ہوئے تھے، خدا رسی سے مانع، کفر کے بعد، بلکہ کفر کی بھی جڑ کبر ہے، ابلیس کو ابلیس اباء واستکبار ہی نے بنایا، "اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ" خصوصاً جو کبر علم اور اس سے بڑھ کر قلم کے زعم سے پیدا ہوتا ہے، اس کے "حجاب اکبر" کی مثالیں ایسی ایسی خود مشاہدہ میں آئیں کہ بس اللہ ایسے علم و قلم سے پناہ میں رکھے، اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے یہاں اس شیطانی خودی و خود رائی کے مٹانے پر اتنا زور کیوں ہے، حضرت حکیم الامت ہی فرمایا کرتے تھے کہ اس راہ کا حاصل بس خود کو مٹا دینا ہے، خدا و بندہ کے درمیان سب سے بڑا حجاب "خودی" ہے،

ع تو خود حجاب خودی حافظا از میان برخیز

مرحوم معصوم نہ تھے لیکن اُن کی زندگی کا جو رُخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم و بیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیادہ معصوم نظر آیا وہ یہی کہ خود نمائی و خود بینی کی دُور دُور نظر نہیں آئی، طالب علمی میں اُن کا شمار رفتہ رفتہ آگے چل کر ممتاز ترین طلبہ میں رہا، لیکن نیچے کے درجے کے طالب علموں کے ساتھ بھی کسی برتاؤ میں کوئی امتیاز ظاہر نہ ہوتا، عام طور پر دوسرے طلبہ ہم چشموں میں کچھ بھی امتیاز رکھتے، تو اس کے دبائے نہ دبتے، چندہ کے ذریعہ ندوہ میں بارہا سابقہ ہوا رئیس ندوہ سید صاحب ہی ہوتے، مگر یاد نہیں کہ کسی موقع پر کسی طور و طریق سے بھی دوسرے رفقا پر اپنا بڑا بننا ظاہر ہونے دیتے،

لہ ظاہر و باطن کے اس سراپا مریض میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت علیہ الرحمۃ ہی کی تھی،

طالب علم سے جب استاد ہوئے تو خود اپنا ایک ایسا تجربہ سناتا ہوں کہ آج بھی اس کی شرم سے گڑجاتا ہوں، ایک سبق میری جماعت کا بھی اُن سے متعلق ہوا، اب میرا شمار بھی کچھ اچھے طلبہ میں تھا، غالباً اسی کا غرور تھا کہ اس سبق میں جاتا چھوڑ دیا کہ کل تک جس سے طالب علمانہ ہمسری کا دعوی تھا آج اس کی استادانہ برتری کیسے قبول کروں بیسید صاحب اس کم ظرفی کے جواب میں ضابطے کام لیتے تو سزا دلوا سکتے تھے سرکشی سہی زیادہ تا تو مدرسہ سے نکلوا دیسکتے مگر اُن کی عالی ظرفی نے اس سبکے بجائے کس طرح کہوں کہ کیا کیا، نئے استاد نہیں پرانے طالب علم بھائی بن کر اپنے خود ہی سمجھا بجھا کر کسی طرح منالیا، مرحوم کی شفقت و محبت کا یہ پہلا بیج تھا جو دل میں پڑا، پھر آخر تک بحمد اللہ پھلتا پھوتا ہی رہا، دخل اس میں اُن ہی کی بے نفسی کو زیادہ رہا،

آگے چل کر دار المصنفین اور دار العلوم ندوہ کے جب تک وہ ناظم و معتمد رہے، اور میری رکنیت یا ضابطہ کا کچھ تعلق رہا، ایک موقع بھی خیال میں نہیں کہ اپنے مزاج و مذاق کے خلاف بات کو بھی پوری توجہ سے نہ سنا ہو اور سمجھ میں آتے ہی بے تامل قبول نہ فرمالیا ہو، حالانکہ بعض دوسرے احباب جو ہر طرح مرحوم کے خورد نہیں احقر سے بھی عمر میں بہت کم، اُن کے مقابلہ میں کوئی بات میری مان لینا چاہتے، تو دیکھا کہ کبھی کبھی میرے ساتھ اُن کو بھی سختی سے اور بگڑ کر جواب دیتے بعض بڑے صاحب اور بہت کم عمر دوستوں بلکہ کبھی کے شاگردوں تک کا یہ تجربہ ہوا کہ اللہ تعالی نے اُن کو کوئی علمی و قلمی یا جماعتی و تحریکی بڑائی عطا فرما دی، تو اپنی رائے ورنگ کے خلاف بات کا قبول کرنا کیا سننا بھی توجہ سے گوارا نہیں کرتے رہا

جواب جاہلان باشد خموشی

کا زبان حال سے اعلان کرتے ہیں، باقی اپنی کسی رائے سے خوشدلی سے رجوع کرتے، یا کسی کوتاہی کا برملا اعتراف و اعتذار اس کا تجربہ تو آج کے مشاہیر علم و قلم سے شاذ ہی ہوتا ہے،

لیکن سید صاحب کی روح ایسے مواقع پر کیسی بے چین ہو جاتی تھی، ابا اس زیر تحریر مضمون ہی کے لئے اگلے کچھ پرانے محفوظ خطوط دیکھنے لگا، اُن میں ایک ایسا معذرت نامہ ملا کہ آج اُن کی روح عالم آب و گل میں مل جاتی

تو بے تابانہ قدموں میں گر جانے کا جی چاہتا تھا، غالباً ذاتی مصنفین ہی کے کسی معاملہ میں میری نسبت کچھ غلط فہمیاں اُن کو پیدا ہو گئیں، اُن سے ایسا متاثر ہوئے کہ خود مدعیٰ علیہ کو صفائی کا موقع دیئے بغیر ایک بڑا طویل شکایات نامہ تحریر فرما دیا، مگر اسی تاثر کے بعد نظرِ ثانی پر واللہ اعلم کیا محسوس فرمایا اور کتنے بے قرار ہوئے کہ میرے جواب کا انتظار بھی نہ فرما سکے "معذرت نامہ" نہیں اُن کی اخلاقی کرامت کا یہ سراپا دوگانہ "کرامت نامہ" ہے،

"پرسوں ترسوں میں نے آپ کو ایک طویل خط لکھا تھا، مقصود یہ تھا کہ مدت سے میرے دل پر ایک بوجھ تھا، وہ ہلکا ہو جائے، مگر دیکھتا ہوں کہ اس خط کے لکھنے کے بعد دوسرے قسم کا بوجھ پڑھ گیا، میں نے رات اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے غبار نہ پیدا ہو، بایں وجہ جو کچھ میں نے لکھا تھا، اس کو ایک رازِ سربستہ کی طرح دفن فرما دیجئے، اور مجھے معاف کیجئے کہ میں گو اپنے جانتے صرف اخلاص سے آئندہ کے لئے حسنِ معاونت کی خاطر لکھا تھا، مگر میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے کہ مجھ سے آخر صبر نہ ہو سکا، اب اس کی تلافی یہی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں، اور میری اس تحریر کو بھی میرے گذشتہ اعمالِ بد کا ایک جزو ہی سمجھیں، اس وقت مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں، اس وقت کا احساس یہی ہے، کوشش کروں گا، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ میرا یہی احساس قائم رہے"،

اسی "محرم اعترافِ گناہ نبودہ" کے بعد بھی "سید لقاوب" کو چین نہ آیا، آگے فرماتے ہیں کہ

"میں بے چینی سے آپ کے لطف آمیز و محبت آمیز خط کا انتظار کروں گا، آپ کا یہ بڑا بھائی کم ہمت ہے، اپنی کم ہمتی سے ایسا کر گذرا ہے، اور شاید عمر میں اس کا پہلا قصور ہے، آپ کا بڑا احسان ہوگا، اگر آپ اس تحریر کو نسیاً منسیاً سمجھیں،...... آپ کا مجھ پر بڑا کرم ہوگا"،

اب یاد کیا آسکتا ہے کہ اس سراپا "کرامت نامہ" کا جواب کیا عرض کیا، مگر اپنے نفس کو ٹٹولتا ہوں تو اس کی موٹائی سے خیال یہی ہوتا ہے کہ بہت زور لگانے اور تکلف و تصنع سے کام لینے پر بھی جواب میں اُن کی

بے نفسی کا مقابلہ ہرگز نہ ہوسکا ہوگا، اپنی نالائقیوں اور کوتاہیوں کی معافیاں اُن سے اور دوسروں سے مانگنے کی فیق الحمدللہ بار ہا ملی، اور ملتی رہتی ہے لیکن شکستگی اور فروتنی کے اس بلند مقام تک رسائی چھوٹوں کیا کسی بڑے لے مقابلہ مین بھی یاد نہین، سن و سال، علم و فضل، جاہ و مرتبت ہر لحاظ سے بڑے سے بڑے اور استاذ تک ہوکر اپنے م ہمت بڑا بھائی" ہونے کا جس طرح اظہار فرمایا ہے، ذرا کوئی چھوٹا سے چھوٹا بھی یہ ہمت کرکے دیکھے، تو حضرت حوم کی قدر و کرامت معلوم ہو۔!

سید صاحب کی "بے نفسی" کا یہی وہ فطری جوہر تھا جس نے اس راقم بے بساط" جیسے کی توجہ دلانے پر علم و فضل ی ساری "ندوی" شہرت و عظمت کو ایک "خانقاہ نشین" دیوبندی کے قدمون پر بے تکلف نثار کر دیا، کچھ یہی کشش پہلے سے بھی تھی جس کا ایک والا نامہ مین اس طرح اظہار فرمایا کہ

"مولینا گیلانی نے مجھے لکھا ہے کہ سنا آپنے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ مین ہاتھ دے دیا ہے؟ مین لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گو اب بھی دیا ہو نہ دیا ہو مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا پھر مجھے فخر یہ ہے کہ آپ لوگون نے مولانا تھانوی کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانوی نے بار بار اپنی طرف کھینچا۔ (بجالیم، دیا)"

اس بیعت و ارادت کی نہ خود حکیم الامت کے ہان کوئی خاص اہمیت تھی، نہ مین نے کبھی "صلاح نیک" کے سلسلہ مین اس کی طرف کوئی اشارہ کیا، اشارہ و تصریح دو ہی باتون کی بار بار کرتا رہا، ایک تو یہ کہ "فہم دین" بھی ض کتابی تعلیم و تعلم سے پیدا نہین ہوتی، دوسرے یہ کہ بظاہر بڑی سے بڑی خدمتِ دین کا بھی صحیح معنی مین مت دین" یا عنداللہ مقبول ہونا قلب و نیت کی سلامتی کے بغیر مشتبہ ہی رہتا ہے، اور تزکیہ باطن کی یہ دولت سی "مزکی" کی صحبت و تربیت کے بغیر میسر آنا الشاذ کالمعدوم ہے۔

سید صاحب ماشاء اللہ علمی و نظری طور پر اس حقیقت کی تصریح و تفصیل کے محتاج نہ تھے، منقولہ بالا الا نامہ ہی مین ہے کہ

"میں آپ کا ممنون ہوں کہ مجھے ہر وقت صلاح نیک دیتے رہے، آخر وہ وقت آیا کہ دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور سے سمجھ میں نہ آتی تھی، وہ عملاً سمجھ میں آگئی، اور اب تلافی مافات میں مصروف ہوں، لعلَ اللہ یرزقنی صلاحاً"

اس دوران صلاح کی "صلاح نیک" کا تعلق زیادہ تر عملی قدم اٹھانے ہی کی طرف ملتفت کرنے سے رہا، تھانہ بھون کے دوران حاضری میں قدرۃً اس کا خیال زیادہ ہوتا، جولائی و اگست ۳۸ء کی حاضری میں کچھ طویل قیام کی سعادت حاصل تھی، تو زیادہ الحاح اور اصرار سے لکھا کہ بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں ہمت فرما کر آہی جائیں، اصرار کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جا رہا تھا، ڈر تھا کہ کہیں یہ آفتاب ارشاد و تربیت لب بام نہ ہو، مقامی اور پرانے علاج اور معالجوں سے کوئی نمایاں نفع نہ ہو رہا تھا، بالآخر علاج کی غرض سے لکھنؤ آنا طے پایا، ۱۰ راگست کو تھانہ بھون سے روانہ ہو کر رات کو سہارنپور میں قیام فرمایا، اور دوسرے دن لکھنؤ تشریف فرما ہو گئے، زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ ریل کے ایک ہی ڈبہ بلکہ ایک ہی بنچ پر معیت سفر کی سعادت بھی نصیب ہو گئی، آداب فن کے کتنے اور کیسے کیسے سبق ملے!

سید صاحب کی خدمت میں اس دفعہ میرا عریضہ خاص طور پر تفصیل و اصرار کا ضرور تھا، پھر بھی قبول کی امید کم تھی لیکن قلوب جس کے ہاتھ میں ہیں، اس کو پلٹتے کیا دیر لگتی ہے، تھانہ بھون پہونچ ہی گئے، البتہ ایک دن بعد۔ ذوق طلب کو کچھ اور تیز ہونا تھا،

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک — آتش عشق تیز تر گردد

میرے عریضہ کا جواب بھی تھانہ بھون ہوتا ہوا لکھنؤ میں ملا کہ

"لفافہ ملا۔ میں آپ کے حرف حرف سے متفق ہوں، کل صبح انشاء اللہ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ راگست تک وہاں (تھانہ بھون) میں ہیں، میں بھی انشاء اللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱ راگست کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہرونگا، اور بقدر ظرف مادہ

اٹھاؤں گا"

تھانہ بھون میں "مطلوب" کو نہ پاکر سیدھے لکھنؤ کی راہ لی، ایک ہی آنچ کی تو کسر تھی، چار ہی دن میں رُخ پلٹ گیا، واپسی پر تحریر فرمایا کہ

"لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی، مگر مولانا کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی، اور آخر اُن کی ہدایت کے بموجب، اور آپ کا مشورہ تو پہلے سے یہی تھا، باب مکاتبت وا ہے، اور اب تو وہی وہ ہیں،

ع آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معائنہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمہ تک نوبت آتی ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

"بہرحال اب اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے، منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا دعا کیجئے ......"

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے مطابق پائے، اور احوال و کیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں، افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل و محروم رہا"

زیادہ تر یہی افسوس راقم کو بھی اپنے خورد انہ حدود سے تجاوز کر کے بار بار عرض و اصرار کا باعث ہوتا رہا، یہ بے علم و عمل نامہ سیاہ جو ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتا ہے اپنے حق میں اس کو رحمتِ حق کا ایک بڑا سہارا جانتا ہے کہ حضرت مرحوم کی زندگی بھر کی خدمات علم و عمل کو مقبول و مقبول تر بنانے والا انشاء اللہ اُن کی زندگی کے قلبی انقلاب کا یہی آخری دور یا حسن خاتم ثابت ہوگا،

ہمہ کتابے صد ورق در نار کن — جان و دل را جانبِ دلدار کن

کے عالم میں ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں،

"برادرِ مکرم! میری عمر اب ساٹھ کے قریب آگئی ہے، میں دنیا کو نہ چھوڑوں، دنیا خود مجھے چھوڑ رہی ہے، اب نہ دارالمصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے نہ ندوہ سے اور نہ علمی مقالات و تصانیف سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے، اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترک تعلق کر سکوں، آپ بھی میرے لئے دعا فرمائیں۔"

دارالمصنفین میں ہیں تو فکر لوگوں کو اب خالی مصنف بنانے کی نہیں، احقر کی اس بارے میں ایک درخواست کے جواب میں ارقام ہو کہ

"میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ رفقا میں وہ فضا پیدا ہو جس کی تمنّا آپ کو ہے، مگر ظاہر ہے کہ مجھی میں کیا ہے، جو دوسروں پر اثر ہو، حضرت کی باتیں اُن کو سُناتا ہوں، اور اُن کی تصنیفات کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔"

ہر بہانہ سے حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں کی طرف رفقاء کو مائل فرمانا چاہتے ہیں، ایک ذرا آزاد مزاج رفیق قدیم کا ذوق حضرت کی ادبیت کا ذائقہ چکھا کر اس طرح بدلنا چاہتے ہیں کہ اب وہ ادبیت کی تلاش میں اُن (حضرت) کی تصنیفات پڑھیں گے، اور ممکن نہیں کہ یہ بالواسطہ مطالعہ اُن کے دل کے اندر گھر نہ کر جائے کیسے دردِ دل کی آواز ہے!

"برادرم! صمیم قلب سے دعا کیجئے کہ دارالمصنفین کی یہ چھوٹی سی برادری صراطِ مستقیم کو پاکر اس پر قائم رہے، ہم لوگوں کی عمر بھر کی محنت ہمارے لئے وبالِ آخرت بننے کے بجائے باعثِ برکات و خیرات ہو۔"

"یہ چھوٹی سی برادری حضرت مرحوم کی پوری وفاداری کا حق جب ہی ادا کر سکتی ہے کہ اُن کی سب سے بڑی زندہ یادگار دارالمصنفین میں ایمان و اخلاص کی وہی روح اپنے تمام نجی تعلقات اور ادارہ کی خدمات میں پیدا کرے جس کے خود حضرت مرحوم اپنے دہان کے آخری دو برس قیام میں ساعی و متمنی تھے، قلب و باطن کی صلاح و سلامتی کی روح کے بغیر جب خالص دینی اعمال تک جاہ و مال، ریا و نفاق وغیرہ سے آلودہ ہو کر خالص دنیا طلبی سے زیادہ ناپاک ہو جاتے ہیں، تو پھر علم و قلم کی بظاہر اعلیٰ سے اعلیٰ خدمات بھی اس روح کے بغیر محض دین کی چھاپ لگا دینے سے "وبالِ آخرت" کے سوا کیا بن سکتی ہیں،

اعاذنا اللہ منہ،

الحمد للہ کہ سید صاحب رحمہ اللہ کے اس انقلاب حال کی برکت سے دارالمصنفین کے بہت سے حضرات نظری طور پر قلب و قالب دونوں کی صلاح و فلاح کی اہمیت سے خوب آشنا ہو چکے ہیں، لیکن عملی طور پر نفس و شیطان سے زندگی کی آخری سانس تک بھی مامون و مطمئن نہ ہونا چاہیے، یہ غفلت انتہائی ہلاکت تک پہنچا دے سکتی ہے، ہر عمل و حرکت میں قلب کی نگرانی مرتے دم تک جاری رہنا ضروری ہے، پھر علم و قلم کی خدمت تالیف و تصنیف سے لے کر طباعت و اشاعت تک کے ہر چھوٹے بڑے خادم کے لئے "وبال آخرت" کے بجائے انشاء اللہ تمام تر "باعث خیر و برکت" ہی ہوگی اور خود حضرت مرحوم کی ایسی خیر جاری یادگار، جو اُن کی روح کے لئے ابدی سرور و سکون کا سرمایہ ہوگی،

سید صاحب "نسبی سید" ہی نہیں ماشاء اللہ بڑے "نسبی سعید" تھے، بظاہر اُن کی روزی قلم سے وابستہ "ضرور رہی" تاہم انھوں نے خالص روزگار بنا کر قلم شاید ہی کبھی چلایا ہو، یہ نسبی سعادت ہی کی بدولت علمی کبر و غرور کا بھی کوئی شائبہ اُن میں مشکل ہی سے نظر آتا تھا، انتہا یہ کہ راقم الحروف کی علمی خصوصاً علوم دین کی بے بضاعتی سے ناواقف نہ تھے، پھر فن سیرت میں کسی فنی و علمی بصیرت سے اور بھی محروم ہی رہا، چہ جائیکہ خود سید صاحب جیسے اس فن کے مسلّم ماہر و محقق کے سامنے، مگر سیرت کی پانچویں جلد نکلنے پر خصوصیت کے ساتھ کیا تحریر فرمایا کہ

"آپنے سیرت کی پانچویں جلد پڑھی بھی، آپ لوگوں سے اس لئے نہیں پوچھتا کہ تحسین مقصود ہے، بلکہ اس لئے کہ میں محسوس کروں کہ غلط نہیں چل رہا ہوں، سہارا چاہتا ہوں، تعریف نہیں"

جب تھانوی علم و عمل کی روشنی میں اس بے علم و عمل کی آنکھوں پر سے بھی "جہل مرکب" کے کچھ پردے ہٹے تو نہ صرف ظاہری و باطنی گوناگون علمی و اخلاقی بیماریاں علاج طلب نظر آئیں، بلکہ "ندویت" اور "روشن خیالی" کے عہد کا ایمانی و اعتقادی اضمحلال بھی سامنے آیا، تو بعض ایسی تحریریں جن کا تعلق کچھ دینی مباحث سے تھا حضرت علیہ الرحمۃ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ خود ہی پیش کر دیں کہ ضلال و اضلال دونوں کی ممکن تلافی و تدارک کی ہدایت فرمائی جائے، سیرت ہی کی تیسری جلد میں معجزات پر میرا ایک مضمون شریک تھا جس میں کوئی بات حضرت کو اصلاح و رجوع کی نظر آئی

اور اس کے اعلان کا ایما فرمایا، میرے نفس نے تو خود الحمدللہ مطلق کشمکش نہیں کی، اور معارف میں اشاعت کے لیے صاحب کو ایک تحریر بھیج دی،

وہ ایک آریخ کی کسر اپنی اس علمی بے نفسی کے باوجود جس کا اپنا ہی تجربہ ابھی اوپر ہی عرض کر چکا ہوں، اس کے شائع کرنے میں لیت و لعل فرماتے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مصنفین خصوصاً سیرت کے علمی و تصنیفی وقار کا استخفاف محسوس فرما رہے ہیں، بالآخر میرے اصرار پر فرمایا کیا ایسا ہی ہے، تو دوسرے اڈیشن میں نظر ثانی کر لینا میں نے عرض کیا کہ اس کی نوبت خدا جانے کب آئے، اور حضرت کا منشا فوری اصلاح و اعلان کا معلوم ہوتا ہے، تب بادل ناخواستہ وہ بھی میری خاطر سے شائع فرمایا،

حضرت کے ہاں اہل قلم کا یہ ایک بڑا امتحان ہوا کرتا تھا کہ اپنی قلمی غلطیوں یا لغزشوں کے اظہار میں نام نہاد علمی وقار شان تو مانع نہیں ہوتی، نیز شیخ کے مقابلہ میں اپنی رائے کے فنا کرنے پر کہاں تک آمادگی ہے آج کل کلام مجید کی تحریفی تفسیروں کی جیسی گرم بازاری ہے خصوصاً سیاست اور معاشیات کے مسائل میں، ایک ایسے ہی شیخ التفسیر اور تفسیری مصنف جو اپنی تربیت و اصلاح کے لئے مکاتبت شروع بھی کر چکے تھے، اس امتحان اول ہی کے سلسلہ میں فیل ہو گئے، عام طور پر تو فنا کو آخر مقام کہا جاتا ہے لیکن حکیم الامت کی حکیمانہ رائے میں فنا ہی مقام تھا، اور تائید میں عارف روم کا یہ شعر پڑھا کرتے،

ہیچ کس را تا نہ گردد او فنا　　　نیست رہ در بارگاہ کبریا

کوئی عقلمند مریض طبیب معالج کی تشخیص و تجویز کے مقابلہ میں اپنی رائے لگانا اور چلانا چاہے تو اس کا علاج شروع ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور آخر مقام فنا ہونے کی حکیمانہ توجیہ یہ فرماتے تھے کہ اس سے مراد باطنی امراض کا فنا ہونا ہے کہ وہ علاج کے بعد آخر ہی میں فنا ہوتے ہیں، بہرحال حضرت کے ہاں اس راہ میں مجنون ہونا شرط اول قدم تھا،

سید صاحب ایک تو فطری طور پر خود رائی سے بہت دور تھے، دوسرے اس حقیقت کو خوب سمجھ لیا تھا کہ

شیخ کا مقام نبی کے وارث یا قائم مقام کا ہے اگر وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہوتا تاہم اگر علم و عمل، زہد و تقویٰ فہم درست، خوف و خشیت میں اس کا درجہ طالب سے بلند اور بہت بلند ہے، تو لازماً طالب کے مقابلہ میں خطا و لغزش سے محفوظ نہیں بھی زیادہ اور بہت زیادہ ہوگا،

جب کسی کو ہم نے اپنے سے علم اور تقویٰ واصلح جان اور مان لیا، تو پھر اس کی رائے کو اس وقت تک نہ ماننا جب تک خود ہماری رائے کے موافق نہ ہو خود اپنی ہی رائے پر اصرار کے سوا کیا ہے، اسی کا نام خود رائی ہے، ورنہ پھر نہ موم "خود رائی" کا مصداق ہی کیا رہتا ہے، حضرت کے نزدیک تو اس خود رائی کا "رائی بھر" بھی باقی رہنا راہ کا پہاڑ تھا، پھر دین کے مسائل و معاملات کا تعلق تو بواسطہ یا بلا واسطہ تمام تر عالم غیب کے غیبیات سے ہے دنیا کے معاملات میں کا تعلق اسی عالم شہادت کے مشاہدات و تجربات سے ہے۔ اُن میں بھی اگر زیادہ علم و بصیرت والے کے مقابلہ میں آدمی کو اپنی ہی رائے پر اڑا رہنے کا حق دے دیا جائے، تو عملاً زندگی کا سارا کارخانہ معطل اور نظم و نسق درہم برہم ہو کر رہ جائے،

اس ذرا طویل "جملہ معترضہ" کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ میں قلب و باطن کے تزکیہ و ترقی کا بڑا فطری جوہر اُن کی یہی خوبی یہی تھی کہ بڑوں کیا چھوٹوں کی بات کو بھی قبول کرنے کی آمادگی میں جتنا اُن کے ظرف کو عالی پایا، اتنا کم ہی کے ظرف کو پایا، بڑی حد تک اسی استعدادی کمال نے اُن کو کہنا چاہیے کہ مرید ہوتے ہی پیر بنا دیا، اجازت و خلافت کے لئے اُن کے پیر کا مسلک یہ تھا کہ خاص صورتوں میں بالفعل کمال کے بجائے متوقع کمال یا قوی استعداد ہی کو کافی تصور فرماتے تھے، اس راہ میں قدم رکھتے ہی حضرت مرحوم جو اس تیزی سے چل پڑے، اس کا بڑا راز یہی تھا کہ شیخ کے مقابلہ میں اُن کو خود رائی یا انانیت کی ایک ٹھوکر بھی شاید ہی لگی ہو

اندازہ فرمائیے کہ کہاں تو سیرت میں خاکسار کے صرف ایک ضمنی باب کی صرف چند سطروں کے رد و بدل میں تسلیم و تصحیح میں جھجک تھی، اور کہاں مرشد تھانوی تک پہنچتے ہی ایسے بدلے کہ حضرت کے اشارہ ہی سے اپنی

تصنیفات کے ہزاروں صفحات کی نظرثانی پر تل گئے، ۱۱ رمضان مبارک ۱۳۶۲ھ کے والا نامہ میں فرماتے ہیں،

"ادھر جب سے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایما ہوا تھا جس سے متعلق اشعار معارف میں چھاپ دیئے ہیں، یہ خیال غالب رہا کہ اپنی تصنیفات پر نظرثانی کرکے رکھ جاؤں، پھر جب چھپیں، چنانچہ سیرت جلد ثانی پر نظرثانی آدھی سے زیادہ ہوگئی ہے، اور وہ چھپ بھی رہی ہے"

اس سے[1] بڑھ کر یہ کہ سیرت کا وہی احقر کا حصہ جس کی چند سطروں کے تغیر و تبدل میں تامل تھا، اب اس گرامی نامہ میں اس کی نظرثانی کی کتنی تاکید ہے یا کیوں نہ ہو کہ اب تقویٰ کی نظر مصنف اور امت دونوں کی آخرت پر ہے!

"اسی سلسلہ میں سیرت کی تیسری جلد معجزات والی بھی آتی ہے، اس میں جو حصہ آپ کا ہے اس کو آپکے پاس بھیجتا ہوں ازبانی بھی کہہ چکا ہوں .... آپ مہربانی فرماکر اس پر نظر ثانی فرماکر بھیج دیں، لیت و لعل یا تساہل و غفلت نہ کریں"

آگے یاد رکھنے کی بات اس غفلت سے بچانے کی وجہ ہے کہ "اس میں آپ کا فائدہ ہے، اور امت کا بھی" یعنی آخرت پر نظر کہ مصنف خدانخواستہ اپنے اور امت کے ضلال و اضلال کا باعث نہ بنا رہے،

یہ امت کے سید المصنفین کی خاص تصنیفی و علمی کایا پلٹ کی ایک جھلک تھی، کچھ عام قلبی انقلاب کا بھی نظارہ ہو جائے،

---

[1] اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "مرشد کے ارشاد سے برملا بہت سے معتقدات سے رجوع کیا، اور اس فنائیت و سپردگی سے کیا کہ شاید حضرت تھانوی سید صاحب کے اس والہانہ انداز عقیدت پر وجد کیا کرتے تھے"

یہ شہادت صاحب "برہان" مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی سلمہ نے تازہ برہان (رجب ۱۳۷۳ھ) میں ادا فرمائی، راقم بذا کے علم میں نہ تھی، آگے مولانا سلمہ خود اپنی نسبت لکھتے ہیں کہ "حضرت سید صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شاید اتنے بڑے ایثار کے لئے تیار نہ ہوتا"، وہ کیا کسی کے لئے بھی اپنے زعم علم سے اتنی دست برداری آسان نہیں! اسی سے تو مرشد تھانوی کے ہاں اس کی اتنی قدر و قیمت تھی!

باطنی انقلاب نمائشی نہیں ہوا کرتا، اس کا اثر سب سے زیادہ ذاتی و خانگی زندگی پر پڑا کرتا ہے...... اچھے اچھے خاندانی علما و مشائخ کو دیکھا کہ اپنی اولاد کے معاملات میں دنیا کے سامنے دین کو بے تکلف نظر انداز کر جاتے ہیں، لڑکی و لڑکوں کا رشتہ تلاش کرنے میں بھی نظر دین سے زیادہ کیا کرتا ہے کہ تمام تر دنیا ہی پر رہتی ہے لیکن حضرت مرحوم کا دل بدلنے کے ساتھ نظر بھی ایسی بدلی کہ اپنی صاحبزادی سلمہا کی نسبت کی خبر دیتے ہوئے سب سے پہلی خوشخبری یہ سناتے ہیں کہ "آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میں اپنی منجھلی لڑکی کی نسبت ایک ایسے نوجوان صالح سے کر رہا ہوں جو حضرت مولانا تھانوی کے متوسلین میں ہیں"، پھر اس سلسلہ میں نکاح و رخصتی وغیرہ سے فراغت اور وطن (دسنہ) سے اعظم گڈھ واپسی کے ارادہ پر ارقام ہے،

"تھانہ بھون کا بھی قصد ہے، حضرت میرے ہر معاملہ حتی کہ ذاتی معاملہ سے بھی خبر دار ہیں یہ میرا جوش محبت ہے کہ والد شفیق کی طرح ان کو ہر معاملہ لکھے بغیر چین نہیں ملتا"

حرف حرف راقم نالائق کی ترجمانی فرما دی، اس کا بھی حضرت کی زندگی بھر یہی حال رہا کہ ذاتی و خانگی معاملات کی چھوٹی سے چھوٹی...... باتوں کی بھی اطلاع دیئے بغیر رہا نہیں جاتا تھا، حد یہ کہ ایک مرتبہ مہترانی نے اسٹرائیک کر دی تو وہ بھی لکھ بھیجا، پھر جس معاملہ میں جو ہدایا ارشاد ہوتا تھا، اس کے خلاف الحمد للہ کہ قدم اٹھانے کا جی ہی نہ چاہتا، پورے انشراح کے ساتھ اتباع کی توفیق ملتی، اس کا راز بھی سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رازشناس سے معلوم کریں،

"میرا مذاق یہ ہے کہ شیخ وقت قائم مقام نبی ہے، ان امور میں جو مختص بالنبوۃ نہیں"

سیرت نبوی کے مسلم محقق و ماہر و راز شناس سے بڑھ کر وقت کے "قائم مقام نبی" کو پہچاننے کا دعوی کون کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ مرحوم صرف اپنا شیخ نہیں "شیخ وقت" فرما رہے ہیں، پھر تمام ذاتی و خانگی امور تک میں جو اتباعی و جنی وابستگی ہے، اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ

"جس طرح نبی کی یہ شان ہے کہ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من

والناس والد و لدہ و نفسہ[1] (او کما قال) اس کا عکس شیخ کے ساتھ معاملہ میں بھی ہونا چاہئے

آپ نے حضرت عمرؓ والی روایت خوب لکھی، آپنے کہاں دیکھی"[2]

اس گرامی نامہ کی پشت پر اپنے اس حال کا کچھ تازہ قال دو غزلیں بھی نقل فرمائی ہیں، ایک کا عنوان

"فراق شیخ" ہے، اور دوسری کا "انتظار جواب"، اہل ذوق شریک کیف ہوں،

دل میں کیا کیا آرزوئے دید ہے   مومنوں کو انتظار عید ہے

میکدہ، مسجد میں یاد آیا کیا   روز افسزوں نشۂ توحید ہے

حضرت "جامع المجددین" علیہ الرحمۃ کی تجدیدی جامعیت تو ایک دن دوپہر کا واقعہ ہے آج بھی جو چاہے

حضرت کے کارناموں کو کتابی صورت میں مطالعہ کرکے خود معلوم کرسکتا ہے، پھر بھی بعض قلوب پر "جامع

المجددین" کا عنوان گران تھا، وہ حضرت سید صاحب جیسے دین کے دیدہ ور کی زبان سے اسی غزل میں "خاتم

المجددین" ہونے کی شہادت سن لیں،

اس سے پایا ردی ملت نے فروغ   ختم اس پر دورۂ تجدید ہے"

"انتظار جواب" کا پورا لطف اُن کو آئے گا جن کو "خاتم المجددین" کی خدمت میں مکاتبت کی کچھ سعادت

حاصل رہی ہے،

دن گنے جاتے ہیں قاصد کیلئے   انتظار نامۂ محبوب ہے،

شعر کی شعریت تو شعر و شاعری والے جانیں لیکن واقعہ کی واقعیت کا اندازہ شدید لفظ لفظ کہ اک اک

مشکل ہی سے کوئی علمی و عملی اشکال یا ظاہری و باطنی مرض کا سوال ہوتا ہوگا، جس کا جواب تیر بہدف یا نسخۂ

---

[1] کوئی شخص تم سے ایمان (کا حق ادا کرنے والا) نہ ہوگا جب تک وہ مجھ کو اپنے والد اولاد، اور خود اپنی ذات سے زیادہ دوست و محبوب نہ رکھے،

[2] یادہنیں آرہا کیا روایت تھی، شاید اس کا تعلق نبی کی اتباع و محبت ہی سے رہا ہوگا،

ثابت نہ ہوتا"

نسخۂ اکسیر و داروے شفا　　　تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہو

بقول مولانا دریابادی سلمہ کے بس جی چاہتا تھا کہ لکھنے والے کی انگلیاں چوم لے" ایک اور شعر "اشرف المجالس" کے بادہ خواروں کے لئے،

قہر ہو یا قہر ہو جو کچھ بھی ہو　　　ہر ادا محبوب کی محبوب ہے

سب سے آخر کے شعر "ہن کوئی سالک ہے" کے نیچے اس بدنام کا نام سوا ایہ نشان کے ساتھ تحریر ہے،

اندرون حلقۂ پیر مغان　　　کوئی سالک ہو کوئی مجذوب ہو
(گیا عبد الباری؟)

۲۸ مارچ کو اس میخانہ (تھانہ بھون) میں ایک عشرہ کی سرمستیوں کے بعد واپسی کی اطلاع ایک کارڈ پر صرف اس شعر سے فرمائی،

نہ من تنہا درین میخانہ مستم　　　جنید و شبلی و عطار شد مست

راقم احقر کو "علامہ ندوی" نہیں بلکہ "جنید و شبلی" کے "یار میخانہ" کی "مستی" کے کچھ یادگار سبق سنا دینا زیادہ مد نظر تھا، یہ نشہ ان کی علمی و تصنیفی زندگی سے لے کر خانگی و ذاتی معاملات تک پر بھی جس درجہ چھا گیا تھا اس کا ہر سبق مستقل درس ہے، اور سب سے بڑھ کر بڑا درس علم و قلم والوں کے لئے،

"علامہ ندوی" نہ صرف عام علوم دین کے علامہ بلکہ فن سیرت کے خاص طور پر وقت کے سب سے بڑے علامہ تھے جن کی "سیرۃ النبی" کا کوئی جواب تو کیا ہوتا، اس کے بعد سے "سید الاولین والآخرین" علیہ التحیۃ والتسلیم کا کوئی چھوٹا بڑا سیرت نگار اس سے مستغنی نہیں رہ سکا، اور نہ آئندہ رہ سکتا ہے، پھر سوچنے کی بات ہے کہ جنید و شبلی والے میخانہ" میں پہونچ کر کوئی تو بات اُن کو ایسی ملی کہ اپنے سارے تصنیفی دفتر کے ساتھ اس سیرت تک کو نظر ثانی سے مستثنیٰ نہ پا سکے،

باقی بچ کی زندگی مین تو اس مستی کا رنگ یہان تک دیکھا کہ ایک رفیق کی سالہا سال رفاقت مین لباس اور رہن سہن مین کچھ تکلف و تنعم آگیا تھا، وہ بھی اب اتنا ختم ہوگیا تھا کہ لاہور مین ایک بڑی محبت والے عزیز شاگرد و دوست نے میری دعوت کی، سید صاحب بھی لاہور مین موجود تھے، میری ہی وساطت سے اُن سے درخواست کی، پہلے کی اُن سے کوئی بے تکلفی کیا شاید شناسائی تک نہ تھی، مگر جب وہ لینے آئے، تو جس طرح نعش کرتے ٹوپی مین بیٹھے تھے، اسی طرح بے تکلف ساتھ ہو لئے ورنہ عادۃً اپنے مواقع پر صافہ و شروانی پہن لیا کرتے تھے، اور بھی کراچی و لاہور وغیرہ مین اس سے بھی زیادہ تکلف کے مواقع جلسون وغیرہ تک مین اُن کی ذاتی زندگی نمود و نمایش آرایش و زیبایش سے دُور و نفور ہو چکی تھی، بلکہ بعض دوسرے علم و دین کا نام لینے والون مین جا بجا نمایشی عادات و تکلفات دیکھ کر بہت متاسف ہوتے تھے کہ بناؤ سنگار علم کی شان ہے نہ دین کی، پاکستان مین بہت سے شروع شروع مین پہنچ جانے والون کو جہان ملازمت اور معاشی کاروبار وغیرہ کے اموال غنیمت ہاتھ آئے، وہان بعض مولاناؤن کو "لیڈری" کی دولت ہاتھ لگی، ایسے ہی ایک "مولانا لیڈر" کا برسبیل تذکرہ کسی سفر مین رفاقت کا خود اپنا یہ تجربہ نہایت تاسف کے ساتھ بیان فرمایا کہ ریل مین پہلے صبح صبح بعد غسل روزانہ نیا لباس تبدیل کر لیتے، تب اسٹیشن پر منتظر استقبال و مشتاق دید مجمع مین نمودار ہوتے، علم و دین کا نام لگا کر وہ حقیقت یہ خفیف الحرکاتی، بڑی شرمناک معلوم ہوتی ہے، علما کو تو طالب علمانہ وضع ہی زیب دیتی ہے،

بات وہی ہے کہ نفس کا تزکیہ، وَیُزَکِّیْھِمْ، کتابی تعلیم و تعلّم پر بھی مقدم ہے، اور یہ کسی ایسے ہی "مزکّی" و مربّی "وارث نبی" کی صحبت و تربیت کے بغیر عملاً ناممکن ہے، جو خود "مزکّٰی" یا تربیت یافتہ نہ ہو، بلا ایسی صحبت و تربیت کے نفس و نفسیات کی بیماریون کا علاج کیا ہوگا، ان کو بیماریان سمجھنے والے ہی تمام علما و مشائخ تک مین کتنے ہوتے ہین، اتعجب کی بات درحقیقت نفس و نفسانیات کا وبائی عموم نہین، بلکہ تزکیہ و تربیت سے غفلت کا عوام مین نہین خواص تک مین عموم ہے، خالص علمی و دینی ہی نہین، دنیوی و سیاسی خدمت گذارون کے لئے بھی دوسرون کی مذمت سے پہلے اور ساتھ ساتھ خود اپنی اصلاح اور تزکیۂ نفس کی فکر ناگزیر ہے، دن رات کا مشاہدہ ہے کہ

دین ودنیا دونوں کے "غیر صالح" "مصلحین کے ہاتھوں اصلاح سے کہیں زیادہ افساد کی خدمات انجام پا رہی ہیں

دین کی بنیادی حقیقت "یوم دین" یا آخرت کا ایمان ویقین ہے، آخرت کو پیش نظر رکھے بغیر علم وعمل کے کسی انفرادی کمال یا اصلاحی خدمت کا دین کی میزان میں قطعاً کوئی وزن نہیں، "وہاں" پوچھ نہ تہذیب وتمدن کی ترقیوں کی ہوگی، نہ حکومت وسیاست کی ہنگامہ آرائیوں کی، نہ علوم وفنون کے کارناموں کی، نہ خطابت وتقریری کی زبان آوریوں کی، نہ انشاء وقلم کی زور آزمائیوں کی اور نہ تصنیف وتالیف کے انباروں کی، وہاں تو ہر ہر فرد کے ظاہر وباطن کے ہر ہر قول وعمل، ہر ہر فکر ونظر، ہر ہر ارادہ ونیت کے متعلق سب سے پہلے پوچھا، اور دیکھا جائے گا کہ اس میں خدا کی رضا وآخرت کا کیا اور کتنا حصہ تھا، وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا"

علامہ "سلیمان" کو آخر آخر میں جس فکر ونظر نے "حضرت سلیمان" بنایا، وہ "یہاں" کی نہیں "وہاں" کی فکر تھی، حقیقت دین کی یہی یافت اُن کی ساری علمی وعملی یادگاروں کو قابل یاد بنا سکتی ہے، اس کو بھول بھلا کر اُن کی ہر یادگار اُن کو یاد کرنا نہیں "بھلانا" ہوگا، اس یافت کو خود اُن ہی کے اس "یادگار انقلاب" کے سیدھے سادے دو مصرعوں میں یاد رکھیں،

ہم ایسے رہے یا کہ ویسے رہے،
"وہاں" دیکھنا ہے کہ کیسے رہے،

"وہاں" کے ساتھ "یہاں" کے لئے بھی جو بات سب سے زیادہ یاد رکھنے کی ہے آگے ہی وہ بھی سُن لیں کہ کن فی الدنیا کانک غریب"

حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش وغم سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

بس اللہ تعالیٰ اُن کے اس حال وقال کو اُمت کے عوام وخواص کا بھی حال وقال بنادیں، اسی میں دین ودنیا دونوں کا بناؤ ہے، اور یہی اُن کی علمی وعملی زندگی کے آخری انقلاب کا سب سے گرانقدر

سبق ہے،

حال کے کسی صدق مین صاحب صدق نے ایک بڑی سچی بات کہہ ڈالی تلخ ہو یا شیرین لیکن ہے حقیقت ہی کہ ادھر دس بارہ سال سے سید صاحب خالص ندوی نہ رہے تھے، مگر اس نالائق ندوی کی سمجھ مین تو ان ہی ۱۰ ۱۲ سال مین سید صاحب پورے ندوی بنے، ندوہ کے اہل انہون نے علوم دین کا ایک نیا دارالعلوم اس لئے ہرگز نہین کھڑا کیا تھا کہ اس کے علماء کی تقریر و تحریر خطابت، صحافت مین زود کمال پیدا ہو کر ایمان و عمل صالح کی ظاہری و باطنی زندگی مین ضعف و اضمحلال پیدا ہو جائے، اور دین کا سارا زور سمٹ سمٹا کر زبان و قلم مین رہ جائے بلکہ ان کا مقصد علم کے ساتھ اعمال کی تحسین بھی تھا،

مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ۱۰، ۱۲ سال مین "ندویت" کی اس خلا و خامی کی تلافی و تدارک فرمایا! "ندوی برادری" بھی اگر اپنے سب سے بڑے "فخر ندویت" بھائی کے اس یادگار انقلاب باطن سے سبق لے تو اس کے علم و قلم کی داد مخلوق سے ملے یا نہ ملے لیکن خالق سے انشاء اللہ بھرپور مل کر رہے گی، دین نام ہی اس باطنی انقلاب کا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے علمی و عملی انفرادی و اجتماعی کام مین نظر مخلوق و دنیا سے ہٹ کر خالق و آخرت پر ہو جائے، ندوہ کے "سید الطائفہ" نے یہ نظر پیدا کر کے "ندویت" ہی کی تکمیل نہین فرمائی، بلکہ دین کا نام لے کر سارے قلم چلانے والون کو سب سے بڑا سبق دے کر گئے ہیں، اسلام اپنی تعلیمات کی خالی زبان و قلم سے داد لینے نہین آیا، زبان سے بڑھ کر دلون کو بدلنے یا قالب سے زیادہ قلب کے انقلاب کی دعوت لیکر آیا ہے، الہ آباد کے عارف اکبر نے زبان و قلم کی اس بیداد پر اپنے رنگ مین کس لطف و خوبی کے ساتھ متنبہ فرمایا ہے،

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پر کرو
پیش درگاہ خدا داد کی حاجت نہین

زبان و قلم سے تو اپنی فاسد تعلیمات کی داد دینے مین اہل باطل بھی، خصوصاً آج کل کے، ہم سے پیچھے نہین

آگے اور اتنے آگے ہیں کہ اس محاذ پر اُن سے بازی لے جانا ناممکن ہی ہے، اسلام کا اصل محاذ عمل صالح کی زبان ہے، جس کے سامنے قلم کی زبان کا کوئی طلسم نہیں ٹھہر سکتا، اور عمل صالح "صالح" جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس کا سرچشمہ قلب باطن کی طہارت ہو، اگر قلب صالح و درست نہیں تو پھر عمل صالح کی ہر سعی و سرگرمی فساد ہی فساد ثابت ہوتی ہے، اذا فسد فسد الجسد کلہ" دلوں کے اس فساد کا آج سے بڑھ کر ہمہ گیر فسادات کی صورت میں دنیا کی تاریخ نے شاید ہی پہلے کبھی ثبوت فراہم کیا ہو،

تسلیم دل بزور مسخر نمی شود
این فتح بے شکست میسر نمی شود

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا حکم تھا کہ مرحوم کی سیرت کے سلسلہ میں اُن کی طالب علمی کے رنگ روش کی تفصیل خصوصیت کے ساتھ کروں، اپنی نالائقی اس معاملہ میں اوپر ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی جواد علی خان صاحب عالی راقم الحروف کے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، وہ سید صاحب کے نہ صرف ہم مدرسہ بلکہ بہت بے تکلف ہم درس اور ہم سبق رہے ہیں، قلم میں بھی کچھ قدم ساتھ چلے، پھر:

او بصوا رفت و ما بکوچہ رسوا شدیم

بہرحال مولانا دریابادی کی فرمایش میں نے اپنے پورے اصرار کے ساتھ خان عالی کی طرف منتقل کر دی کہ وہ یہ ادا کر سکیں گے، مگر جواب ان کا بھی اس مضمون کے ختم ہونے پر اس عذر ہی کا آیا کہ مرحوم و مغفور کے متعلق حافظہ کی معذوری سے سوچ بچار کے باوجود کوئی مواد حاصل نہ کر سکا، بجز ان معمولی باتوں کے کہ

"اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا، تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے، کبھی سخت کلام یا لب ولہجہ سخت نہ ہوتا، درسی کتابوں کی تکرار میں لب ولہجہ زوردار البتہ ہوتا، اور بیان کی قوت روانی سے شرکا کے دل پر تکلم کا رعب بیٹھ جاتا،

"متانت ہر انداز پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے، بے تکلفی میں ظرافت سے باز نہ آتے، اس میں بھی متانت قائم رہتی، کوئی ناگواری ہوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے، مگر زبان پر قابو رہتا"

آپ نے دیکھا کہ نوجوانی اور طالب علمی کے اس چند سطری آئینہ میں خد و خال کی وہی جھلک موجود ہے جو آگے چل کر پوری سیرت کے قدآدم آئینہ میں اُبھر کر گھر باہر اپنے پرائے سب کے سامنے جلوت و خلوت میں آتی رہی

اللّٰھمّ صلِّ علیٰ سیّدنا محمّد و من اٰلہٖ علیٰ سیّدنا سلیمان بارک وسلّم۔

گنجِ گرانمایہ

از

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی

"رشید صاحب نے اس مضمون کا کوئی عنوان نہیں لکھا تھا، اور اس کو میری رائے پر چھوڑ دیا تھا، مجھے اُن کے مجموعۂ مضامین گنجہائے گرانمایہ کی مناسبت سے جو انھوں نے وفیات پر لکھے ہیں، گنج گرانمایہ زیادہ مناسب معلوم ہوا" (م)

سید صاحب سے پہلے پہل اعظم گڈھ میں ملاقات ہوئی تھی، مولینا سہیل کی معرفت، بہت دن ہوئے، شاید ۳۰ ۳۲ برس، تعطیلوں میں تفریحاً مولینا اور دوسرے عزیزوں دوستوں سے ملنے اعظم گڈھ گیا تھا، سہیل صاحب کو علامہ شبلی مرحوم سے بڑا شغف ہے، شبلی کے سامنے وہ سب کو بے حقیقت سمجھتے ہیں، حد یہ ہے کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو بھی! "کبھی کبھی" یوں کہ اس بارۂ خاص میں مولینا کے بیانات میں اکثر تضاد رہا ہے!!

فرمایا چلئے تم کو حضرت مرحوم کے جانشین سے ملاؤں، میں نے کہا مولانا آپ کے ہوتے کون جانشین ہو گیا، یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ کسی اور کو مرحوم کا جانشین مانتے ہیں، آپ اپنے حاشیہ نشینوں کا ایمان کیوں پرکھتے ہیں، جو آپ کو حضرت مرحوم کا صدق دل سے جانشین سمجھتے آئے ہیں، اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ کے بعد نہ حضرت مرحوم کا کوئی جانشین رہے گا، اور نہ خود آپ کا!

مولانا اس پر مسکرائے اس طور پر کہ پان کی پیک جو دہن کے گوشہ سے باہر سرک آئی تھی، اس کو ہاتھ سے

اس طرح پوچھا کہ اس کی سرخی کچھ ڈاڑھی مونچھوں پر رہ گئی، اور کچھ ہتھیلی پر آئی، اور وہاں سے اس بچے کے کرتے پر منتقل ہوئی جو پہلو میں بیٹھا ہوا تھا، لوگوں نے شور مچایا، تو بولے ارے یہ کہاں سے آگیا میں تو سمجھ رہا تھا کہ منشی جی مقدمہ کے کاغذات رکھ گئے ہیں!

شام کو مولانا کے ہمراہ شبلی منزل گیا، سید صاحب سے ملاقات ہوئی سہیل صاحب نے تعارف کرایا، شبلی منزل کے اور احباب و بزرگوں سے بھی ملاقات ہوئی، سید صاحب بڑی شفقت سے ملے، ابھی لطف و رحمت کی باتیں ختم نہیں کی تھیں کہ سہیل صاحب نے کوئی ادبی یا فقہی مسئلہ چھیڑ دیا، جسے معارف کے اوراق میں کبھی دیکھ چکے تھے، سید صاحب نے ہاں نہیں میں بات ٹال دی، شبلی منزل میں کسی اور کی ہمت نہ ہوئی کہ مولانا سے الجھے، مولانا کو دلائل سے زیر کرنا ناممکن تھا، طالب علمی میں ہم سب کا طریقہ یہ تھا کہ بحث کی آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے مولانا سے زبردستی کچھ قرض لے کر چل دیئے، اور مولانا کسی اور سے بھڑنے کسی اور طرف چلے گئے!

اس دن کے بعد سے آخر زمانہ تک جب وہ پاکستان تشریف لے گئے، اور پھر جوار رحمت میں پہنچ گئے، سید صاحب سے ملنے اور ان کی محبت و مروت سے بہرہ مند ہونے کے بے شمار مواقع ملے، علی گڈھ آنا ہوتا، تو ہمیشہ میرے ہاں قیام کرتے، میرا، میرے بچوں کا، میرے عزیزوں دوستوں کا بڑا خیال کرتے تھے، اتنا خیال کہ کبھی کبھی میں اپنے سے شرمندہ ہونے لگتا، یونیورسٹی کورٹ کا معرکہ کا کوئی جلسہ ہونے والا ہوتا تو عمائد قوم کا اچھا خاصہ اجتماع ہو جاتا، ایسے مواقع پر یونیورسٹی کے طلبہ یونین میں کوئی مباحثہ یا مشاعرہ منعقد کرتے، علی گڑھ میں اکابر شعرا مجتمع ہو جاتے وہ ایک دن بڑی رونق کے گذرتے، میرے ہاں مختلف الخیال حضرات یکجا ہو جاتے مثلاً سید صاحب، اصغر صاحب ذاکر صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب، سید الطاف حسین صاحب، ان میں کچھ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی حمایت میں تشریف لاتے تھے، کچھ ذاکر صاحب کا ساتھ دینے کے لئے۔

میرے ہاں وہ مسائل نہیں چھیڑے جاتے تھے، جو کورٹ میں پیش ہونے والے ہوتے، اس لئے کہ شریک ہونے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جو پہلے سے رائے قائم نہ کر چکا ہوتا تھا، اس وقت کورٹ کا یہی رنگ تھا، اب

وہ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئی تھی، البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کا کوئی عزیز قریب یا حکومت کا کوئی بڑا عہدہ دار زیادہ سرگرمی دکھانے کے لئے مرحوم کی حمایت میں بحث کرنے آجاتا، یہ موقع بڑا پرلطف ہوتا تھا ڈاکر صاحب بھی موجود ہوتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کے حامیوں کے دلائل اس سنجیدگی اور ہمدردی سے سنتے، اور کہیں کہیں ہمت افزائی کے طور پر ایسا لقمہ دے جاتے کہ بولنے والا اور بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگتا، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سمجھدار ساتھی بڑی دقت میں مبتلا ہوجاتے، اور چاہتے کہ یہ بحث کسی نہ کسی طرح ختم ہوجائے،

سید صاحب کا مسلم یونیورسٹی سے بڑا پرانا اور گہرا تعلق رہا، جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم ۲۴، ۱۹۲۳ء سے علیگڑھ آنے جانے لگے تھے، کورٹ کے مسلسل ممبر رہنے کے علاوہ مرحوم ان کمیٹیوں اور شعبوں کے ممبر منتخب یا مقرر ہوتے رہے جو علوم مشرقیہ یا مذہبی اور ادبی مسائل سے متعلق ہوتے، یہ سلسلہ تقسیم ملک تک قائم رہا، تقسیم کے پہلے یونیورسٹی پر طرح طرح کے دور آئے، سید صاحب کسی نہ کسی حیثیت سے برابر ارباب یونیورسٹی کے شریک کار رہے، اور اکثر اہم مواقع پر سید صاحب کی اصابت رائے سے یونیورسٹی کو بڑا فائدہ پہنچا،

سید صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب ہم وطن تھے، دونوں کے سیاسی معتقدات جداگانہ تھے بعض مذہبی امور میں بھی ذہنی یگانگت نہ تھی، مولانا سلیمان اشرف صاحب بڑے ملنے کے آدمی تھے جس بات میں جو خیال رکھتے تھے، اس کا اظہار برملا کرتے تھے، اور کوئی جھگڑا آن پڑے تو مفاہمت کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ کئے جاسکتے تھے، علامہ شبلی مرحوم کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے، دارالمصنفین کے بھی کچھ ایسے معترف نہ تھے جس کسی کو اپنی طبیعت کا نہیں پاتے تھے، نہ اس کے قریب جاتے تھے، نہ اسے قریب آنے دیتے تھے،

لیکن سید صاحب جب کبھی علی گڈھ آتے تو مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاں ضرور جاتے، دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتے، اور نہایت خلوص اور بے تکلفی سے گفتگو کرتے، اور میں جانتا ہوں کہ اس میں اس کا مطلق کوئی دخل نہ تھا کہ سید صاحب سلیمان اشرف کے ہم وطن یا دارالمصنفین کے کرتا دھرتا تھے یا ملک میں اُن کی بڑی مان دان تھی، ان دونوں بزرگوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کا موجب ایک طرح مولانا

ابوبکر محمد شیث فاروقی صاحب جونپوری ناظم دینیات تھے جن کے سید سلیمان صاحب سے بڑے پرانے اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور خود مولانا سلیمان اشرف صاحب مولانا ابوبکر صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے، اور اُن سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔

سید صاحب کا مزاج مولانا سلیمان اشرف کے مزاج سے بالکل مختلف تھا، سید صاحب کو کوئی مشتعل نہیں کر سکتا تھا، وہ کسی حال میں برہم یا بے اختیار نہیں ہوتے تھے، سید صاحب خود علامہ شبلی سے طبعاً مختلف تھے، میں نے علامہ شبلی مرحوم کو نہیں دیکھا، لیکن اُن کی تصانیف پڑھی ہیں، جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا تھا اُن سے ملا ہوں، خود شبلی پر جو کچھ لکھا گیا، اُس سے بھی تھوڑا بہت آشنا ہوں، علامہ شبلی جتنے ذہین اور جذباتی تھے (ذہین اکثر جذباتی ہوتے ہیں) شعر کہنے اور پرکھنے کا جیسا ملکہ ان میں تھا، اُن کی شاعری، اُن کی نثر اُن کے خطوط اسب میں "حسن طبیعت" اور "سوز دروں" کی جیسی دل آویز مثالیں ملتی ہیں، اور دنیوی معاملات میں جس سوجھ بوجھ سے وہ کام لیتے پائے گئے تھے، سید صاحب ان سب سے عاری تھے۔

سید صاحب کی جس بات کا میں گرویدہ تھا، وہ ان کا علمی تبحر ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علمی دیانت بھی تھی، وہ کبھی علم کو کسی ادنیٰ مقصد کے حصول کے لئے کام میں نہیں لاتے تھے، علم نہایت ہی خطرناک چیز ہے کم ذی علم ایسے پائے گئے ہیں جنھوں نے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ ہی نقصان نہ پہنچایا ہو، جس کی ایک مثال مذہب کا غلط استعمال ہے، میں بطور کلیہ تو کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنی ہوش کی زندگی میں اب تک یہی دیکھتا آیا ہوں کہ جہاں کہیں لوگوں کو اپنے ادنیٰ مقاصد میں کامیابی نظر نہ آئی، انھوں نے مذہب کو آڑ بنا لیا، اور پھر جو آفتیں نازل ہوتی ہیں، وہ سب جانتے ہیں، میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ علم، مذہب اور آزادی باوجود بہترین نعمت ہونے کے، نااہل سوسائٹی میں بڑے خطرناک عناصر ہیں۔

بات کہاں پہنچی کہنا یہ شروع کیا تھا کہ سید صاحب کا علم کیا تھا، اور کیسا تھا، وہ علم ہی سے واقف نہ تھے، علم کی برگزیدگی کا بھی احساس رکھتے تھے، اور اس کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے، اکثر ایسے عالم دیکھے گئے ہیں، جو صرف

علم کا بیوپار یا بیوپار کرنا جانتے ہیں، علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے، جب تک کوئی معلم علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیئے۔ آج کل دنیا میں جو ہلچل، افراتفری یا بے دلی، اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ علوم اور ان علوم کو پھیلانے کے وسائل تو بہت بڑھ گئے ہیں لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور زیادہ خطرناک بن گیا ہے، دنیا میں ہر مرض کی تیر بہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں اگر اچھے اطبا میسر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرہ کا موجب بن سکتی ہیں، یہی حال علوم کا ہے!

سید صاحب جن علوم سے بہرہ مند تھے اُن پر اُن کی نظر پیشہ ورانہ نہ تھی محرمانہ تھی، وہ محض فنی اصول پر کسی مسئلہ کو ناپ تول کر ختم نہیں کر دیتے تھے، بلکہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ اس مسئلہ کے رد یا قبول میں دماغ اور دل دونوں متفق ہو جائیں، سید صاحب نے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل سے (خواہ وہ معاش سے متعلق ہوں یا معاد سے) طرح طرح سے بحث کی ہے لیکن مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا، جہاں یہ محسوس ہوا ہو کہ مصنف نے اپنی بات ہوکے ڈھنگ سے یا خطابت اور شاعری کے زور سے یا منطق اور فلسفہ کا چکر دے کر یا علی کٹی سنا کر یا رو پیٹ کر منوانے کی کوشش کی ہو جیسا کہ بعض نام کے مولوی اور اشتراکی بالعموم کیا کرتے ہیں، سید صاحب نے ہمیشہ بات متانت اور دیانت سے کہی تلی کہی، اور اس طرح کہی اور اس لئے کہی کہ اُن کو ایک بیش بہا بات معلوم ہوئی تھی جس کے لئے انھوں نے بڑی محنت، قابلیت اور وقت صرف کیا تھا، اور چاہتے تھے کہ اسے ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، علم کا معلم سے یہی تقاضا ہے!

سید صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ اُن کے خطبات مدراس ہیں، میرا خیال ہے کہ شاید سب سے پہلے میں نے ہی سید صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان خطبات کا اچھی انگریزی میں ترجمہ ہو جائے، تو بہت مفید ہوگا، سید صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا تھا بعض عزیزوں نے اس پر کچھ کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا، لیکن پھر کیا ہوا مجھے اس کا علم نہیں، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

کہ اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی یہی نہیں بلکہ اگر یہ خیال بھی ہوتا ہو کہ اسلام اور اسلامیات سے متعلق جتنی مفید اور معیاری تصانیف ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و نظر پیش کی ہیں، اسلامی ممالک میں اس پایہ کی کتابیں شاید نہیں تصنیف ہوئیں، دور جانے کی ضرورت نہیں صرف دار المصنفین اعظم گڈھ کی گذشتہ چالیس سال کی مطبوعات کا جائزہ لیا جائے، تو اس بات کا آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے یہ گمان اور قوی ہو جاتا ہے جب ہم اس امر کو بھی مد نظر رکھیں کہ دار المصنفین جیسے چھوٹے بڑے ادارے ہندوستان میں اور بھی ہیں !

یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ دس بارہ سال ہوئے یا شاید اس سے بھی زیادہ، ایک بار سید صاحب سے اس مسئلہ پر گفتگو آئی کہ مذہبی، اخلاقی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں سے موازنہ کیا جائے، تو کیا نتیجہ نکلے گا سید صاحب نے بتایا کہ تینوں اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پایہ باہر کے مسلمانوں سے بلند ملے گا، اثنائے گفتگو میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہئے، باہر کے مسلمانوں کی علمی حالت بحیثیت مجموعی ایسی نہیں ہے جس پر یہاں کے مسلمان بھروسہ یا اُن کے رہن سہن اور طور طریقوں کی تقلید کریں۔

خیام کے بارے میں مغربی مصنفین نے جو کچھ لکھا تھا اور اُن کی دیکھا دیکھی یا سُنی سنائی ہم ہندوستانی جو کچھ کہنے لگے تھے، وہ میرے پیش نظر تھا، لیکن خیام پر سید صاحب کی تصنیف سامنے آئی تو دل باغ باغ ہوگیا معرکہ کی ایک تصنیف اردو میں دیکھنے میں آئی، جو کسی زبان کے بڑے سے بڑے تحقیقی کارناموں کے ساتھ رکھی جاسکتی ہے، اس کتاب کی تصنیف میں سید صاحب کے حیرت انگیز طالب علمانہ شغف، مورخانہ ژرف نگاہی، ادبی اور عالمانہ بصیرت کا پورے طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے معمولی سے معمولی دعوی کو مستند سے مستند ماخذوں سے مستحکم کیا ہے، ماخذات کے لئے کس کس بے کنار سر د سنسان اور دشوار گذار جنگل اور گھاٹیوں سے گذرنا پڑا ہوگا تب کہیں جاکر کسی رہرو کے نقش قدم ملے ہوں گے، اور جادۂ و منزل کے متعین کرنے کا امکان پیدا ہوا ہوگا معلوم نہیں

اس تصنیف پر سید صاحب کو کیا داد ملی حکومت سے، قوم سے یا کسی اکیڈمی سے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی یا اکیڈمی سید صاحب کو اس کتاب پر بڑے فخر اور خوشی سے اعلیٰ علمی ڈگری دے سکتی ہے۔

سید صاحب کو اپنے استاد علامہ شبلی مرحوم سے بڑی عقیدت تھی، سیرت شبلی لکھ کر سید صاحب نے اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے، اس کتاب میں جہاں کوئی کمی ملتی ہے، وہ سید صاحب کے فنی شعور کی کوتاہی کے سبب اتنی نہیں، ہے جتنی اس شغف کے بنا پر ہے، جو ایک نہایت درجہ شریف اور سعید شاگرد کو اپنے شفیق اور محترم استاد سے ہو سکتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں مصنف اپنے ہیرو میں کوئی خامی دیکھنا نہیں چاہتا، یہ بات ٹھیک ہے یا نہیں سمجھ میں آسانی سے آجاتی ہے!

باوصف اس عقیدت کے سید صاحب کی شخصیت اور ان کا اسلوب تحریر بھی شبلی سے مختلف ہے، شبلی کے قلم میں بڑی رعنائی اور برنائی ہے تخیل میں رنگینی اور جذبہ میں حرارت اور تلملاہٹ ملتی ہے، جذباتی اور تخیلی فن کا رون کے یہ خاص صفات ہیں، یہ صفات فنون لطیفہ کے لئے جتنے کارآمد ہو سکتے ہیں، تاریخ تحقیق یا تنقید کے لئے نہیں! شبلی کی طرح سید صاحب کو بھی تاریخ سے بڑا لگاؤ تھا، بہت زیادہ لگاؤ، کوئی مسئلہ ہو سید صاحب اس کے موجود کو اس کے ماضی میں تلاش کئے اور پرکھے بغیر نہیں رہتے تھے، سید صاحب کی کسی قسم کی تحریر ہو تاریخ کے حوالے اس میں ضرور ملیں گے، اور شاید یہ اسی کا فیضان تھا کہ واقعہ کچھ ہو شخصیت کسی کی ہو سید صاحب کا قلم اکثر و بیشتر چلتا تھا اپنے ہی راستہ پر، اور اپنی ہی رفتار سے! جس میں ثابت قدمی اور ہمواری ملتی ہے،

سید صاحب تاریخی دیانت و امانت کا اس درجہ لحاظ کرتے تھے کہ ان کو اپنی تصانیف میں شاعری کرنے کی بہت کم فرصت یا مواقع ملتے تھے، وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے، اور محنت کرتے تھے، اتنی ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے، تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی، دونوں کی ادبی شخصیت میں بھی یہ امتیاز نمایاں ہے بحیثیت طالب علم میں شبلی سے متاثر ہوا، اور بحیثیت معلم سید صاحب سے!

یہاں سید صاحب کی تصانیف اور مقالات پر تبصرہ مقصود نہیں ہے، یہ کام بڑا طویل اور مشکل ہے اور ایک آدمی کے بس کا ہے بھی نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ علمی تدقیقات کے جدید طور طریقوں سے ناآشنا ہونے کے باوجود اس کے آداب سید صاحب اپنی تصانیف میں بڑی خوبی اور پابندی سے ملحوظ رکھتے تھے۔ کتنے مستند حوالے کہاں کہاں سے فراہم کرتے تھے، اور تقسیم ابواب اور ترتیب مضامین میں کس سلیقہ سے کام لیتے تھے کہ معمولی سے معمولی طالب علم بھی پوری تحقیقات سے پورے طور پر آشنا ہو جاتا تھا۔

سید صاحب کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن بڑا مرتب تھا، اُن کے ذہن میں تنقیحات بڑی واضح اور مکمل ہوتی تھیں، کام کی باتیں ضخیم سے ضخیم کتاب اور پیچیدہ سے پیچیدہ بحث سے بہت جلد اخذ کر لیتے تھے، اور اُن کو اُن کا صحیح مقام دینے میں خاص ملکہ رکھتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ذخیرہ معلومات کی ذہنی فہرست اتنی ہی واضح اور مکمل رکھتے ہوں جتنی کسی اچھی لائبریری کی فہرست کتب جو جدید ترین اصولوں پر مرتب کی گئی ہو، میں نے سید صاحب کو مطالعہ کرتے یا کتاب لکھتے نہیں دیکھا ہے لیکن اُن کی تصانیف پڑھنے اور اُن سے بعض مسائل پر گفتگو کرنے سے جن باتوں کا اندازہ لگا سکا ہوں، وہ بیان کر دی ہیں، ممکن ہے استنباط نتائج میں مجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہو!

حسب نسب، علم و فضل، اخلاق و عادات، خدمت ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مسلّم ہے، جہاں تک میری معلومات ہیں، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پرانے طریقوں پر پرانے استادوں، اور بزرگوں کے سایۂ شفقت اور پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی، جدید علوم و فنون سے براہ راست انھوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا، لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے انھوں نے اپنے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آشنا کر لیا تھا کہ وہ کہیں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، چاہے وہ اہل علم کا حلقہ ہو، چاہے ارباب سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو، خواہ عامۃ الناس کا اجتماع، جدید افکار اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنا کیوں نہ ہوتا، سید صاحب سے تبادلۂ خیال کرنے میں اُسے کبھی یہ محسوس ہوتا

کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں، یا جس کا ذہن بند ہے ملکے خانوں میں اسیر ہے یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے۔ علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرصع نوجوانوں کو میں نے دیکھا کہ خاص علمی اور ذہنی سطح پر مولانا کی ہم سری نہ کر سکتے تھے، اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے،

نوجوانوں کے ذہنی رجحانات کے بارہ میں ایک بار سید صاحب سے مفصل گفتگو آئی تھی، فرماتے تھے کہ عربی فارسی ماخذات پر عام نوجوان طالب علموں کو عبور نہیں، ان ماخذات سے متفرق و ناکمل باتیں جو یورپین تصانیف میں نظر آجاتی ہیں، وہ اُن کو غلط راستہ پر لگا دیتی ہیں یہ نوجوان ذہین اور اپنے افکار کے اعتبار سے مخلص ہوتے ہیں، یہ قیاس صحیح نہیں ہے کہ وہ طبعاً دین کی باتوں سے بیزار اور تاریخ و روایات سے بیگانہ ہوتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ان کو صحیح ماخذ، صحیح مفہوم اور صحیح سیاق و سباق بتانے والا کوئی نہیں، بات کچھ اور آگے بڑھی تو فرمانے لگے، اس صورتِ حال کی ذمہ دار ایک تاریخی حقیقت بھی ہے،

بات یہ ہے کہ صلیبی محاربات نے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف ہر طرح کی قوتوں کو ابھارا، سیاسی اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے یورپ میں تا حال مسلمانوں کو جس جس طرح مطعون و مغلوب کیا گیا، وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے، اس کے ساتھ ساتھ یورپ کے اہل فکر و نظر بالخصوص وہ جن کی ذہنی اٹھان مذہبی تھی، انہوں نے اسلامی تصانیف سے جہاں تہاں سے ایسے اقتباسات لئے جو اُن کے تبلیغی تصنیفی پروگرام کے لئے مفید تھے، ہر ملک میں علوم کی ابتدائی تاریخ تقریباً یکساں رہی ہے، یعنی مذہبی طبقہ تصنیف و تبلیغ کا اجارہ دار رہا ہے، اور مصنفین کا یہ طبقہ اکثر دانستہ اور کبھی کبھی نادانستہ طور پر اپنی غرض کو زیادہ پیش نظر رکھتا ہے حقیقت کو کم! پھر کچھ لطیفے سناتے رہے کہ کس طرح کے اقتباسات کہاں سے لے کر کس طرح کے فتنے اٹھائے جا سکتے ہیں، یا اٹھائے گئے ہیں، اور انگریزی سلطنت اور انگریزی زبان کے عروج کے ساتھ یہ غلط بیانیاں کہاں کہاں پہنچیں، اور کیا رنگ لائیں،

ایک بار کسی کمیٹی یا شعبہ کی میٹنگ میں شرکت کرنے تشریف لائے تھے، یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں نے

سید صاحب سے درخواست کی کہ موصوف کلب میں تشریف لاکر کسی موضوع پر تقریر فرمائیں، اشاف کلب اس طرح کی فرمایش کسی سے بہت کم کرتا ہے، تقریر کا موضوع غالباً فن تاریخ پر مسلمانوں کا احسان یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور موضوع تھا، سید صاحب نے سوا گھنٹہ سے اوپر تقریر فرمائی، وہ لوگ جن کو اس موضوع کا ذوق تھا، بیان کرتے تھے کہ سید صاحب کی نظر اس موضوع پر جتنی وسیع اور واضح ہے، اور جتنے متنوع اور مستند ماخذ سید صاحب کے علم میں ہیں، اتنے شاید ہی کسی اور کے علم میں ہوں، جس طرح بچے آٹوگراف لینے مشاہیر کے گرد اسی طرح سید صاحب سے لوگوں نے ماخذات نوٹ کئے،

سید صاحب تقریر کرنے میں چہرہ باندھنے یعنی تمہید اٹھانے یا کسی نہ کسی معذوری کے بیان کرنے میں مطلق وقت نہ صرف کرتے جیسا کہ عام طور پر پیشہ ور مقرروں کا دستور ہے، کچھ گلے اور سینے کی تکالیف، کچھ سفر کی صعوبت کچھ ملک و ملت کی ابتری یا اپنی نا اہلی کا تذکرہ کیا، اس کے بعد تقریر شروع کی، سید صاحب کبھی اس طرح کی باتیں نہ کرتے، اپنی جگہ سے اٹھے تقریر کرنے کی جگہ پر آکھڑے ہوئے، سلام علیکم کہا، مذہبی موضوع ہوا تو تسمیہ پڑھی، کلام پاک کی کوئی آیت نہایت سادگی اور احترام سے تلاوت فرمائی، اور تقریر شروع کر دی،

آواز میں اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، چہرے پر جذبات کی دھوپ چھاؤں نہ طاری ہونے دیتے، ہاتھ پاؤں پٹکتے، نہ پھینکتے، کوئی بلند یا بلیغ فقرہ کہکر اس کے متوقع نہ رہتے کہ حاضرین سے شور تحسین اٹھے، جیسا کہ اکثر کرتے ہیں، باتیں بڑی واضح کہتے، الفاظ و عبارت کی دھوم دھام نہ ہوتی، البتہ کبھی کبھی ایک آدھ فقرہ رعایت لفظی کے ساتھ کہہ جاتے لیکن یہ رعایت لفظی صرف تفریحی نہ ہوتی، بلکہ اس کے پیچھے کوئی بھید ہوتا صاحب جس بات کو چھپا کر اجاگر کرنا چاہتے تھے، یا اجاگر کو چھپا کر کہنا چاہتے تھے، وہاں اس طرح کی مناسبت لفظی سے کام لیتے، سید صاحب کو رعایت لفظی سے تفریح ضرور ہوتی، بے تکلف اور مخلص لوگوں کی صحبت میں تھوڑی دیر تک ضلع جگت کا التزام رہتا، یہ مشغلہ رعایات اور مناسبات سے بھی بڑھنے لگتا تو اور زیادہ محظوظ ہوتے!

سید صاحب تقریر کرنے میں کہیں اٹکتے نہ تھے، اچھے سے اچھے مقرر بھی کبھی کبھی جملہ میں مبتدا اور خبر کو مربوط نہیں کر پاتے تو ذرا دیر اٹکتے اور بھٹکتے ہیں، سید صاحب کی تقریروں میں شاید کبھی کوئی ایسا موقع آیا ہو، ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری تقریر قلم بند ہو جسے وہ اطمینان و اعتماد سے دہراتے جارہے ہوں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سید صاحب کی تقریر کب ختم ہوگی کسی قدر لمبی تقریر کرتے تھے، تقریر کے کچھ ایسے ماہر بھی نہ تھے لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کی تقریر سے دل اکتاتا نہ تھا، ہر مجمع میں کچھ نہ کچھ ایسے بے فکرے ضرور ہوتے ہیں جو زیادہ دیر تک خاموش اور سنجیدہ نہیں بیٹھ سکتے، کوئی جادو بیان مقرر ہو اور موضوع دلچسپ تو مجمع دیر تک خاموش رہ سکتا ہے، اور لطف اندوز بھی ہوتا ہے لیکن سید صاحب یقیناً مقرروں کے اس زمرہ میں نہیں آتے تھے جن کو جادو بیان تو کیا غیر معمولی بھی کہا جا سکے، وہ تقریر کے فن و فسون سے بے نیاز تھے لیکن ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا اور ذہن کے کسی نہ کسی حصہ میں اتر جاتی تھیں۔

ان تقریروں میں بڑا خلوص، بڑا وزن اور بڑی سادگی ہوتی تھی، سننے والوں کو اس پر اعتماد ہوتا کہ سید صاحب کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس کے ثبوت میں قوی سے قوی سند نہ پیش کر سکتے ہوں، سید صاحب سے اختلاف کرنا بڑا مشکل تھا، اور معاملہ خواہ علمی یا اجتماعی ہو، وہ بڑی جچی تلی اور شریفانہ رائے دیتے تھے، مجھے تقریر سننے کا بالکل شوق نہیں لیکن بعض لوگوں کی تقریر ضرور سنتا ہوں اس لئے کہ اس کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہیں گے جس سے میں فائدہ اٹھا سکوں ان میں سے سید صاحب ایک تھے۔

مذہب کی بات ہو یا سیاست کی، علمی مسائل ہوں یا کوئی اور بحث، سید صاحب بڑی سنجیدگی سے اظہارِ خیال کرتے تھے، اور دوسروں کا نقطۂ نظر سننے میں بڑے تحمل سے کام لیتے تھے، بحث میں وہ کبھی جزبز نہ ہوتے، بلند آواز سے گفتگو نہ کرتے، کسی کی بات نہیں کاٹتے تھے، کوئی پھبتی، فقرہ یا دل آزاری کی بات نہ کہتے، گفتگو میں کوئی کتنا ہی نا واجب لب و لہجہ کیوں نہ اختیار کرتا، سید صاحب کے رکھ رکھاؤ میں ذرا فرق نہ آتا تھا۔

سید صاحب کا تعلق دارالمصنفین سے تقریباً ۳۰-۳۲ سال تک رہا، ان کی قیادت میں اس ادارہ کا یہ زمانہ [illegible] اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا، مجھے یقین نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دارالمصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکے گا معلوم نہیں

کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دارالمصنفین سے علحدہ ہوکر بھوپال میں ملازمت کرلی، جو بات سید صاحب خود ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے، اس کو اُن کے سامنے میں کسی شکل میں نہیں چھیڑتا تھا، نہ اس ٹوہ میں رہتا کہ کیا ہوا، اور کیوں ہوا، میرا یہ رویہ سید صاحب ہی کے ساتھ نہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ بھی تمام عمر رہا، تا وقتیکہ مجھے اس کا یقین نہ ہوجاتا کہ وہ اپنی دشواری میرے سامنے اس لئے نہیں پیش کرتے تھے، کہ اُن کے خیال میں اس سے میرے تردّدات میں اضافہ ہونے کا امکان تھا، ایسی صورت میں اُن کے فکر و پریشانی کا پتہ لگانے کی ضرور کوشش کرتا ہوں،

سید صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو وہاں سے ایک خط لکھا جس میں اس کا بالکل تذکرہ نہیں کیا تھا کہ انھوں نے دارالمصنفین کیوں چھوڑا، اور بھوپال کی ملازمت اختیار کرنے کا باعث کیا ہوا، بلکہ کچھ اس طرح کی باتیں تھیں کہ بھوپال میں وقت کس طرح کٹتا تھا، کام کرنے کے امکانات کیا تھے، آیندہ کا پروگرام کیا ہوگا، وغیرہ البتہ یہ بات ظاہر ہوتی تھی کہ بھوپال میں زیادہ دن قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا،

عرصہ ہوا میں نے ایک بار سید صاحب سے عرض کیا تھا، کہ وہ کسی طرح علی گڈھ آجائیں، جہاں اُن کی بڑی ضرورت تھی، پھر جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وائس چانسلر ہوکر علی گڑھ تشریف لائے تو موصوف بھی اس کے کوشاں ہوئے کہ سید صاحب علی گڑھ آجائیں لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب سید صاحب ارادہ کرچکے تھے کہ وہ پاکستان ضرور جائیں گے، بھوپال کے قیام کے دوران میں میں نے عرض کیا تھا کہ جس طرح یا جس لئے سید صاحب نے اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کے لئے وقف کردی تھی، وہ مسلّم ہے لیکن مسلم یونیورسٹی میں رہ کر کام کرنا اور اس کی شہرت میں اضافہ کرنا، اس نصب العین کے خلاف نہ تھا، جو اُن کے سامنے تھا، کام کی نوعیت دونوں جگہ تقریبًا یکساں تھی، علی گڑھ میں قیام کا مزید فائدہ یہ تھا کہ نوجوان طلبہ ان کی تصنیف ہی سے نہیں اُن کی شخصیت سے بھی بہرہ مند ہوتے۔

ملک کی فضا ان دنوں کچھ ایسی ہورہی تھی کہ سید صاحب کا بھوپال میں زیادہ دنوں تک قیام نہیں ہو سکتا تھا، میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میکدہ چھٹا تو پھر سہرج کیا آسی، ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو"، لیکن سید صاحب نے مانے، یوں تو ہوتا وہی ہے جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے لیکن یہ بات دل میں بار بار آتی رہی کہ سید صاحب مستقلًا علی گڑھ

آگے ہوتے تو بحیثیت مجموعی اس سے بہتر ہوتا جو بعد میں پیش آیا!

سید صاحب بڑے سمجھدار شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے، اُن کی خدمت و خاطر کرنے میں مجھے بڑی لذت اور بڑائی محسوس ہوتی تھی، کسی ذاتی معاملہ میں میرا ان کا کبھی سابقہ نہ ہوا، ہوتا تو مجھے اپنے اوپر تو اعتماد نہیں لیکن سید صاحب کے بارہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری خاطر وہ سب کر ڈالتے جو شاید اپنے لئے نہ کرتے، سید صاحب اپنی بڑائی اشارۃً یا مزاحاً کبھی نہیں بیان کرتے تھے، اور دل کھول کر کسی اور کی بڑائی بھی کم ہی کرتے تھے!

فطرۃً سید صاحب خاموش، قناعت پسند اور عافیت جو تھے، وہ اپنے بچوں اور ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول لینے میں زندگی کی تفریح پا لیتے تھے، اور خوش ہونے کے لئے کسی بڑی تقریب کے منتظر رہتے تھے، چھوٹی خوشیوں میں بڑی خوشیاں ڈھونڈھ لیتے اور پا لیتے، یہ بہت بڑی صفت اور نعمت ہے اور بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے،

میں نے اکثر یہ بھی محسوس کیا جیسے سید صاحب کسی قدر حزیں رہتے ہوں، کیوں اور کیسے یہ نہیں بتا سکتا، یہ میں نے کبھی اُن سے پوچھا بھی نہیں لیکن یہ حزن ان میں طبعی نہ تھا، اس لئے کہ جب کبھی ملول نہ ہوتے تھے صاف معلوم ہوتا کہ طبعاً شگفتہ مزاج ہیں، سید صاحب کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا اور اس آسانی سے وہ ہنس پڑتے تھے کہ اُن کو کوئی الم پرست، خشک مزاج، یا کم آمیز نہیں کہہ سکتا تھا، ممکن ہے یہ زندگی کے آخری دور کے تغیرات کا نتیجہ ہوا مذہب کا بیوپار کرنے والوں سے میں ذرا الگ ہی یا والّٰلہ رکھتا ہوں، ایسے لوگوں کو میں نے بالعموم احساس کمتری کا شکار پایا، اور یہ احساس انسان کے خصائل کو ایسا مسخ و ماؤف کر دیتا ہے، کہ شرافت و شجاعت، درگذر، دردمندی، اور اس طرح کی دوسری انسانی صفات جو مذہب و اخلاق کی روح ہیں اکثر ان لوگوں میں نہیں پائی جاتی ہیں، جو اپنے آپ کو مذہب کا اجارہ دار بتاتے ہیں، اور ان اخلاقی خرابیوں میں ان کو مبتلا پایا، جن سے مذہب نے روکا ہے،

میرے ذہن میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ مذہب بالخصوص اسلام جیسے مذہب کی پیروی کے لئے جس احساس ذمہ داری اور احترام انسانیت کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ کیسے پیدا کر سکتے ہیں جو زندگی کی نہایت درجہ معمولی

ذمہ داریون کو بھی سمجھنے اور برتنے کی توفیق نہین رکھتے، دنیا وعقبیٰ زمان ومکان کے اعتبار سے کتنے ہی مختلف ہون لیکن یہ دونون انسانی زندگی ہی کے دو رخ ہین اور انسان کے نتائج اعمال ہی کا نام عقبیٰ ہے، اس لئے ایک مسلمان کے لئے دنیا کا مرحلہ عقبیٰ سے بھی زیادہ سخت ہے، اور جو شخص دنیاوی ذمہ داریون سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ نہین ہوسکتا، وہ عقبیٰ مین بھی کامیاب نہین ہوسکتا،

اس بحث کو مین پھیلانا نہین چاہتا کہنا صرف یہ چاہتا تھا کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے طبقہ مین جس نااہل کو نفع یا نمود کی کہین گنجایش نہین نکلتی وہ اس مقصد کے لئے مذہب کو آڑ بنا کر ملک وملت کا محسن بن جاتا ہے، سید صاحب کس درجہ مذہبی آدمی تھے لیکن کس طرح ان باتون سے دور تھے، اس کا خیال کرتا ہون تو ان کی یاد سے دل تروتازہ اور روح بالیدہ ہوجاتی ہے،

مذہب کے معاملہ مین سید صاحب کا رویہ نہایت شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ ہوتا، اُن کی ذاتی قومی تصنیفی، مذہبی زندگی اس پر گواہ ہے، کہ انھون نے اسلام اور اسلامی زندگی کی حفاظت وحرمت مین اپنی بہترین صلاحیتین بے دریغ صرف کین لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھون نے جہان تک بن پڑا، مذہب کو خود غرض لوگون کے ہاتھون مین کھلونا بننے نہین دیا، مجھے جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے، اور اسی اعتبار سے سید صاحب کی وقعت بڑھ جاتی ہے، وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ سید صاحب کی تعلیم وتربیت کسی ماڈرن یونیورسٹی مین نہین ہوئی تھی، بلکہ کلیتہً قدیم طور طریقون پر ہوئی تھی مگر وہ یونیورسٹی کے مقصد، معیار اور وقار کا کتنا احترام کرتے تھے[۱] تفصیلات مین جانا نزاکت سے خالی نہین لیکن اتنا کہنے مین مضائقہ بھی نہین کہ انھون نے اکثر مواقع پر یونیورسٹی اور اس کے خدمت گذارون کی آبرو بڑی دلیری اور قابلیت سے بچائی!

یونیورسٹی مین تارہ بس جانے کے سبب سے مین نے مسلمانون کی گذشتہ ۲۰۔۲۵ سال کی سیاسی اور مذہبی سرگرمیون کا مشاہدہ بڑے اطمینان سے کیا ہے، اطمینان سے یون کہ مجھے ازل سے ایمان، عقل، آمنت وغیرہ

---

[۱] دارالمصنفین تشریف لانے سے پہلے سید صاحب دکن کالج پونا مین پروفیسر تھے۔

کا جو حصہ ابتدائی ہوا تھا، وہ ذرا دھیمی ہی تھا، اس لئے کوئی تحریک یا تہلکہ کہیں اٹھا کیا ہی اٹھتا، میں اپنے اس بہرہ کو بچائے رکھنے کی فکر کرتا تھا یعنی نہ اُن تحریکوں اور تہلکوں سے کبھی آنکھ چرائی، نہ زور آزمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ شغل، صحت آبرو سب بحال رہے، میرا خیال یہ ہے کہ قومی تحریکوں میں بیشتر سیاست دانوں نے عوام علماء اور طالب علموں کو آنکھ بند کرکے اور جی کھول کر اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا، پھر یہ ہوا کہ پانسہ پلٹا اور عوام علماء اور طالب علموں کے بھی دن پھرے، اب انھوں نے سیاست دانوں کی خبر لینی شروع کر دی ہیں اور کا مجھے علم نہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہی دیکھنے میں آرہا ہو کہیں کم کہیں زیادہ،

سید صاحب نے شروع سے سیاست میں حصہ لیا، اور جنگ بلقان سے لیکر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی بیچ اونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنھوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو، اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں، سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انھوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کر لی تھی، اسی پر اخیر دم تک قائم رہے، یہ سید صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے تمام عمر رائے عامہ کو صحیح تربیت دینے میں صرف کی، معمولی طریق پر نہیں، بلکہ اپنی بلند پایہ تصانیف اور تقریرسے اور اپنی سیرت کی پختگی، اور پاکیزگی سے، سید صاحب ہماری قومی زندگی میں کس درجہ دخیل رہے ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہو، اس کے ساتھ ساتھ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اس تبسیلہ سے تعلق رکھتے ہوئے جس سے وہ تعلق رکھتے تھے، سید صاحب کی تحریر تقریر یا تصنیف سے کوئی فتنہ نہیں کھڑا ہوا،

کچھ عرصہ سے سید صاحب نے وفیات کے عنوان سے معارف کے صفحات پر اہم نا شناسا شخصیتوں کی وفات کا ذکر تفصیل سے لکھنا شروع کر دیا تھا، یہ مضامین ہر اعتبار سے بڑے مفید اور اہم ہوتے تھے، اور ہر حلقہ میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے گئے، سید صاحب کو تاریخ اور سیرت میں جیسی بصیرت تھی، اس کی بڑی اچھی جھلک ان تحریروں میں ملتی ہے کس حسن ترتیب اور تفصیل سے ان مرحومین کے زندگی کے واضح نقوش ان صفحات پر چھاپ دیتے

نظر آتے ہیں!

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مرنے والوں کے سوانح زندگی کو سید صاحب کسی بیاض میں بڑی پابندی اور احتیاط سے قلم بند کرتے رہے ہوں، اور وقت آنے پر اُن کو معارف میں نقل کر دیتے ہوں، سید صاحب میں یہ بات مجھے نہایت غیر معمولی نظر آئی، یعنی اُن کا حافظہ کتنا قوی اور کس درجہ مرتب تھا کہ ہم۔ ہم سال کے واقعات بقید سال و ماہ و مقام بے تکلف اس طرح لکھتے جاتے جیسے اُن کے سامنے وقوع میں آ رہے ہوں، میں اسلئے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ مرنے والے کا وہ بہی کھاتہ نہ رکھتے ہوں گے، بلکہ ساری باتیں اُن کے حافظہ میں جیتی جاگتی محفوظ ہوں گی!

ان مضامین کے لکھنے میں سید صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، بہت کم ایسا ہوا ہے جہاں وہ مورخانہ حدود سے بے اختیارانہ تاثرات کے حدود میں چلے گئے ہوں، ان مضامین کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سید صاحب وہ فضا نہیں پیدا کر سکے، یا پیدا نہیں ہونے دیتے تھے جس کے بغیر یہ مضامین اتنے مؤثر نہیں ہوتے، جتنا ہونا چاہئے، اور جس کا اس طرح کے مضامین تقاضا بھی کرتے ہیں، اس نوعیت کے مضامین کی حیثیت تاریخی دستاویز کی اتنی نہیں ہوتی، جتنی ایک طرح کی نذر عقیدت کی، تاریخی دستاویز میں ذاتی تاثرات کا دخل نہ ہونا چاہئے لیکن جہاں ایک اعتبار سے نذر عقیدت پیش کی جا رہی ہو، وہاں ذاتی تاثرات کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، ان مضامین کو جہاں تاریخی دستاویز ہو کر نہ رہ جانا چاہیئے، وہاں خالص شاعری یا نری بین و بکا بھی نہ ہونا چاہئے، یہ تاریخ اور شاعری کے درمیان کی ایک چیز ہے، جو تاریخ نہ ہونے کے باوجود تاریخ کی جگہ لے سکتی ہے، اور شاعری نہ ہونے کے باوجود شاعری کے تقاضے پورا کرتی ہے،

یہاں میں ایک بار پھر اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ سید صاحب کا حافظہ کتنا قوی ذہن کتنا مرتب، تاریخی احساس کتنا بیدار، اپنے اور بیگانوں سے تعلقات کتنے شریفانہ اور ان کی شخصیت انسانیت کا کیسا اچھا نمونہ تھی کہ وہ اتنے پاکیزہ اور متوازن مضامین وفیات کے تحت لکھتے تھے!

ایک زمانہ سید صاحب پر ایسا آیا، جب ان پر وارفتگی سی طاری رہنے لگی تھی، ذہنی اور جسمانی دونوں
اس زمانہ میں علی گڑھ وہ بہت کم تشریف لائے۔ علی گڑھ سے باہر بھی کبھی ملاقات ہوئی۔ تو میں نے ان کو تھکا ہارا
بھی پایا، غالباً یہی دور تھا جب وہ حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور کے آستانہ مبارک پر اکثر
حاضر ہوتے تھے۔ حضرت مرحوم سے شیفتگی بے اندازہ بڑھ گئی تھی۔ زیادہ وقت اوراد و وظائف اور عزلت
میں گزرنے لگا تھا، ممکن ہے یہی یا اس کے آس پاس کا وہ زمانہ بھی رہا ہو جب سید صاحب کو دل کی کچھ تکلیف
ہوئی تھی، یہ بھی یاد آتا ہے کہ یہ زمانہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑے انتشار کا تھا، مجھے سید صاحب کے اس
رجحان سے بڑا تردد ہوا، میں نے ایک موقع پر سید صاحب کو غالباً انہی کا ایک فقرہ یاد دلایا تھا کہ آپ
کیا کر رہے ہیں، جب جہاد کی صف کو مرتب اور مضبوط کرنے کا وقت آیا تو آپ خانقاہ کی آبادی بڑھانے لگے،

سید صاحب میرے اس طرح کے فقروں یا خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے، دوستوں اور عزیزوں
سے اُن کی خیریت دریافت کرتا تو یہی معلوم ہوتا کہ بے دلی اور افسردگی کا وہی عالم ہے، پھر خط لکھتا، کبھی کبھی لہجہ خشن
بھی ہو جاتا، لیکن سید صاحب کے ہاں سے کوئی جواب نہ آتا، ایک دفعہ علی گڑھ آ گئے، طبیعت بحال تھی، میرا جی نہ
چاہا کہ اپنے پچھلے خطوط کی یاد دلاؤں، سید صاحب نے خود اس قصہ کو چھیڑا، میں نے اپنے رویہ کی معافی مانگی، کہنے لگے
نہیں نہیں، باتیں سب ٹھیک تھیں، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا عالم گذرا، پھر مسکرا کر فرمایا

"دیوانگی ہم عالمے دارد"!

میں بھی ہنس پڑا اور سید صاحب کو کسی قدر شگفتہ پا کر عرض کیا، سید صاحب ایک بات آپ سے کہے بغیر
نہ رہوں گا وہ یہ کہ جو لوگ آپ کے منصب کو پہنچ چکے ہیں، اُن پر کچھ ہی کیوں نہ گذر جائے، وہ کسی حال میں اپنی
پسپائی کا اظہار یا اعلان میرے جیسے گئے گذرے لوگوں کی طرح اور اُن کے سامنے نہیں کر سکتے۔ آپ کو تو اسی
جگہ کھڑا رہنا ہو جہاں آپ کی اُمت آپ کو کھڑا دیکھنا چاہتی ہو! سوال یہ نہیں ہو کہ آپ پر کیا گذرے گی سوال
یہ ہو کہ آپ کی اُمت کدھر جائے گی، سید صاحب نے بات ہنسی میں ٹال دی،

شکل صورت، وضع قطع، چال ڈھال، بات چیت ہر اعتبار سے سید صاحب کی شخصیت بڑی دل آویز اور قابلِ احترام تھی، اُن کو دیکھ اور پاکر ایک طرح کی تقویت محسوس ہوتی تھی کہ وہ شفقت کریں گے، "رسوا نہ کریں گے" جب تک ساتھ رہیں گے، زندگی میں بڑائی اور حلاوت محسوس ہوگی، جیسے وہ اپنی طرح طرح کی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں، (اپنی ہی نہیں، ہماری ذمہ داریوں کا بھی) حساس، وہ ہمیشہ صاف ستھرے رہتے تھے ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے،

لباس، بستر، سازوسامان صاف ستھرا، اور مکمل رکھتے تھے، اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نفاست بھی ہوتی، بستر بند کھٹا بچھا میلا کچیلا تڑا مڑا نہ ہوتا، ہینڈ بیگ چمڑے کا پرانا لیکن ستھرا اور پالش کیا ہوا تکیہ کا غلاف اور چادر، نہایت صاف اوڑھنے بچھانے کا سامان آرام دہ، نہ خوشنما، لوٹا گلاس، ناشتہ دان صابن دان سب منجا ہوا، تولیہ لمبا چوڑا اور بڑا اور بہت صاف دھلا ہوا، سفر کتنا ہی مختصر ہو، بکس میں پہننے اوڑھنے بچھانے کھانے سامان رکھتے تھے، کلام پاک اور اوراد و وظائف کی کتاب بڑے ستھرے اور خوبصورت جز دان میں ہوتی، عبادت ہمیشہ چھپ کر کرتے، جس کے مہمان ہوتے، اس کے لئے تحفہ ضرور لیجاتے، تشریف لاتے تو نام بنام سب کی خیریت پوچھتے، اور چونکہ وہ میرے ہی دیار سے آئے ہوتے، اس لئے میرے تمام دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی خیریت سناتے کسی کا پیغام سناتے کسی کا تحفہ اور کسی کی فرمایش پہنچاتے، فرمایش ساتھ کر دیجاتی، تو بڑی خوشی کے ساتھ لیجاتے، اور بڑی حفاظت سے پہنچا دیتے!

سفر میں نوکر ہمراہ نہ ہوتا، ہر کام خود کر لیا کرتے تھے، جہاں ٹھہرتے وہاں ہر شخص ہر خدمت کے لئے حاضر رہتا، میں نے یا تو ہمیشہ سپید عمامہ میں دیکھا، یا نچ کی صحبت میں سفید دو پلیہ ٹوپی میں جو مجھے سید صاحب پر خاص طور سے بڑی دلکش نظر آتی، کپڑا ہمیشہ بہت اچھا سلا ہوا پہنتے، اور دوسرے ہی دن شاید بدل دیتے تھے، اس لئے کہ میں نے سید صاحب کے جسم پر میلا تو درکنار کبھی ملگجا لباس بھی نہیں دیکھا، موزہ بالعموم پہنتے، جو ہمیشہ صاف و شفاف ہوتا، اور رومال نہایت صاف رکھتے تھے، اور بہت جلد بدل دیتے تھے،

کھانا بڑے سلیقہ سے کھاتے تھے، اور دسترخوان کے آداب اس خوبی اور نفاست سے برتتے تھے کہ دل خوش ہوجاتا تھا، جو چیز جتنی بھی میں آجاتی، اتنی ہی پیٹ میں رکھ لیتے، کھانا کتنا ہی لذیذ یا ان کا مرغوب کیوں نہ ہوتا لیتے تھوڑا ہی، جی چاہتا تو تھوڑا سا دوسری بار بھی لے لیتے، جو چیز پسند آجاتی اس کی بڑے شگفتہ اور شریفانہ انداز سے تعریف کرتے، دسترخوان پر زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو مخاطب کرکے نرم لہجہ میں لطف و محبت کی باتیں کرتے، جن دوستوں نے شبلی منزل کی صحبتیں اور وہاں کی مہمان نوازی دیکھی ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ دسترخوان پر سید صاحب کا رکھ رکھاؤ کوئی نئی یا تعجب کی بات نہ تھی؛

سید صاحب میں ایک خوبی ایسی تھی جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں یعنی مہمان ہو کر وہ میزبان کے فرائض غصب کرکے اپنی صیانت و حکم برداری میں نہیں لے لیتے تھے، جیسا کہ اکثر نہایت درجہ سرگرم اور مخلص مہمان کیا کرتے ہیں، یعنی خود ہر کھانا میزبان کے سامنے پیش کرنا، اور اصرار کرنا کہ وہ ضرور کھائے اور نہ کھائے تو وہ بہانہ اور وجہ بتائے تو یہ تعزیت کا رزولیشن پاس کریں، یا کوئی چورن تجویز کریں؛

اس طرح کی باتیں بیان کرنا ضروری نہ تھا لیکن میں کسی آدمی کی سیرت اور شخصیت کا اس سے بھی اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ میزبان یا مہمان کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے اور کس حد تک دسترخوان کے آداب ملحوظ رکھتا ہے، میں اپنے مہمانوں سے خواہ ان میں محترم خواتین ہی کیوں نہ ہوں، حتی الوسع اصرار نہیں کرتا کہ وہ فلاں چیز ضرور کھائیں، یا کتنی کھائیں، کھانا سامنے ہے، اور انہی کے لئے ہے، بڑے شوق اور اخلاص سے پیش کیا جارہا ہے، اب اگر وہ اس درجہ شرمیلے نشانمارا ورسادہ لوح واقع ہوتے ہیں کہ بغیر قول قسم یا منت سماجت کے کچھ نہیں کھانا چاہتے، تو ذمہ داری اُن کی ہے، میری نہیں، میں مہمان کا خیر مقدم کرتا ہوں، اس لئے کہ میں اُس کی طرح طرح سے خدمت اور خاطر کر سکوں گا، اور اپنے طور پر اپنے لئے خوش ہونگا کہ اسلئے کہ مہمان کو کھانا کھلانے سے ثواب ملتا ہے اور عاقبت سنورتی ہے؛

میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں خواہ وہ کتنے ہی پڑھے لکھے یا ملک و ملت میں مقتدر کیوں

نہ ہوں جو دسترخوان کے آداب سے واقف ہوں اور اُن کو برت سکتے ہوں، کھانے پر کھانے سے یا کھانے والوں کے ساتھ تجربے یا تکلف یا بے تکلفی برتنا بڑی کم سمجھی کی بات ہے جس کو لوگ بے تکلفی سمجھتے ہیں، وہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اس نزاکت کو سمجھنا اور نباہنا بڑا مشکل کام ہے، بے تکلفی کا تعلق فن سے نہیں تہذیب سے ہے! کھیل میں کھانے پر اور سفر میں ہر شخص کا عیب و ہنر کھل جاتا ہے، خواہ وہ اس کے چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، میں نے سید صاحب کو میزبان اور مہمان دونوں حیثیتوں سے برتا ہے، اور دونوں اعتبار سے وہ میری میزان پر پورے اُترے ہیں، سید صاحب کی جو بڑائی میرے دل میں ہے اس میں سید صاحب کی اس خوبی کا خاصہ اونچا درجہ ہے!

سید صاحب نے دارالمصنفین کا کام غالباً ۱۹۱۵ء میں سنبھالا، اس وقت سے لیکر تقسیم ملک تک کم و بیش ۳۲ سال وہ اس ادارہ میں یا یہ ادارہ سید صاحب میں اس طرح گھلے ملے رہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل تھا، دارالمصنفین کا خیال کیجئے تو ذہن فی الفور سید صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا، اور سید صاحب کو دیکھئے تو دارالمصنفین سامنے آجاتا تھا کسی ادارہ کی روایت و شخصیت اسی طرح وجود میں آتی اور برگ و بار لاتی ہے!

شبلی منزل ایک خالص علمی ادارہ ہونے کے علاوہ زندگی کی بہت سی دوسری اعلیٰ و صحت مند سرگرمیوں کا بھی گہوارہ تھا، کتنے دانایانِ سیاست، اربابِ فضیلت، اور شیدایانِ شعر و ادب وہاں سے نسبت رکھنا، اپنے لئے ایک امتیاز سمجھتے تھے، جن دوستوں کو شبلی منزل میں قیام کا اتفاق ہوا ہے، اور جنھوں نے وہاں کی مدارات و مہمان نوازی رفقا کا آپس کا میل محبت اور کام کرنے کا شغف دیکھا ہے، وہ بتا سکیں گے کہ اعظم گڈھ کا یہ مختصر ساخطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمائندگی کرتا رہا، بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافے کرتا رہا!

کوئی مہمان عزیز آجاتا تو دارالمصنفین کے سارے لوگ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے، کھانے متنوع اور بہت اچھے پکے ہوئے نیچے پایہ کی ہوا، اور یکساں چوکیوں پر نہایت تکلف سے اعلیٰ درجہ کا سفید دسترخوان بچھایا جاتا جس پر بڑے خوبصورت اور ستھرے برتنوں میں یہ کھانے چنے جاتے، لوگ حسب مراتب قالین اور چاندنی پر

چوکیوں کے گرد بیٹھ جاتے، سید صاحب میزبانی کے فرائض انجام دیتے، یہ تقریب اس طرح کی تقریب محض کھانے پینے کی نہ ہوتی، بلکہ اس سے آدمی کی بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ جاتیں، اور زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا :

مل جل کر بیٹھنے کھانے پینے اور بات چیت کرنے کے فوائد کا اندازہ بہت کم لوگ کر سکتے ہیں، علی گڈھ کی جن خصوصیات اور خوبیوں کو متفقہ طور پر سراہا گیا ہے، ان کو بروئے کار لانے میں علی گڈھ کی اس روایت کو بڑا دخل ہے کہ یہاں ساتھ کھانا کھانے اور دسترخوان کے پورے آداب برتنے کا خاص طور پر التزام رکھا جاتا ہے !

رات میں میرے ہاں جب کھانا ختم ہو لیتا اور سید صاحب کے متقدین اپنے گھروں کو چلے جاتے تو بعض مسائل پر اطمینان سے دیر تک گفتگو ہوتی، کوئی اور نہ ہوتا، اس لئے سید صاحب سے بات کرنے میں میں ذرا بے تکلفی، اور بے باکی کو بھی دخل دے جاتا، سید صاحب بڑی توجہ سے تمام باتیں سنتے، کبھی کبھی کوئی فقرہ بڑے لطف کا، اور کبھی ایک آدھ بڑی حسرت سے کہہ جاتے !

ایک رات زیادہ دیر تک اسی طرح کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، سید صاحب نے ان تمام تعلیمی طریقوں کا ذکر کیا، جو گذشتہ عہد کے مسلمانوں میں رائج تھے، پھر موجودہ حالات پر تبصرہ کرتے رہے، سید صاحب کی اس رات کی گفتگو بڑی عالمانہ اور دلنشین تھی، وہ، رہ رہ کر اس پر زور دیتے کہ جب تک تعلیم بطور شرف وسعادت حاصل نہ کی جائے گی، معاشرہ کا توازن اعتدال پر نہ آئے گا، محض روٹی کمانے یا دولت جمع کرنے کی نیت سے تعلیم دینا یا تعلیم حاصل کرنا ہمیشہ بے برکتی کا موجب ہوگا،

میں نے عرض کیا سید صاحب آج کل معمولی سے معمولی کام بھی مخصوص تعلیم و تربیت حاصل کئے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا، اور دنیا میں کاموں کی نوعیت اتنی بڑھ گئی ہے، اور تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے کہ اب محض تعلیم کی خاطر تعلیم کون حاصل کرے، یہ تو نہ ممکن ہے نہ مناسب، سید صاحب نے اس سے اتفاق کیا، لیکن فرمایا کہ ان کا مطلب تعلیم کے ابتدائی مدارج سے تھا، مثلاً آٹھویں نویں جماعت تک جہاں پہنچ کر بچوں کی اخلاقی بنیاد ایک حد

استوار ہو جاتی ہے، پھر فرمانے لگے ہمارے ہاں بچوں کو تعلیم دینے اور ان کا اخلاق سدھارنے کا کام یا تو ماسٹر کے سپرد ہے یا مُلا کے، اور دونوں ایسی معاشی زبون حالی اور اس کے عواقب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ ایسی اہم خدمات ٹھکانے سے انجام نہیں دے سکتے، جہاں سب سے زیادہ ذمہ داری کا کام سب سے معذور ہاتھوں میں دیا جائے گا، وہاں صلاح و فلاح کی کیا صورت نکل سکتی ہے،

یہ رات مجھے خاص طور پر یاد رہ گئی ہے، وقت زیادہ گذر گیا تھا، اور سید صاحب تہجد کی تیاری کرنا چاہتے تھے، میں اٹھ کھڑا ہوا، تو فرمانے لگے،

"رشید صاحب! شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد" زندگی کا بھی عجیب ڈھنگ ہے جب کچھ باتیں قابو میں آنے لگتی ہیں، اور حوصلہ ہوتا ہے کہ اب انھیں پیش کریں گے تو رخصت ہونے کا پیغام آجاتا ہے جس شوق اور محنت سے جو کچھ دیکھا سیکھا، پڑھا تھا، اب وہ برگ و بار لانے والا تھا کہ عمر کا آفتاب غروب ہونے لگا، اس برگ و بار کا کیا ہوگا جب سے تمدن کا آغاز ہوا، اور جب تک دنیا کا کارخانہ قائم رہے گا، اس طرح کے کتنے حسرتناک سانحے پیش آتے رہے ہیں، اور آتے رہیں گے،!!"

میں گھبرا سا گیا، سید صاحب کے اس موڈ (کیفیت ذہنی) سے میں خود بچنا چاہتا تھا، اور سید صاحب کو بھی بچانا چاہتا تھا، میں نے کہا سید صاحب آپ کے دل میں جو بات آئی ہے کون ایسا شریف اور صاحب علم و فن ہے جس کے دل میں نہ آئی ہو گی، عظیم شخصیت اور عظیم فن کار اس کیفیت میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن آپ تو اللہ کی مشیت و مصلحت کے مجھ سے زیادہ قائل ہیں، یہی نہیں بلکہ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ آپ بہتوں سے زیادہ اس کے مقرب بندوں میں ہیں، آپ اس کا غم کیوں کریں کہ آپ جتنا دیکھنے تھے نہ ہونے نہ سکے غم اسے ہو جس نے ایسا ہونے نہ دیا!

جب تک ارادہ اور عمل آپ کے بس میں رہا، آپ نے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، بلکہ فرض سے زیادہ کر دکھانے کے آرزومند رہے، جب آپ کو یا مجھ کو کارآمد و کارآفریں رکھنے کے بجائے معطل و معزول کر دیا گیا (موت

واقع ہوئی) تو ہمارا کیا قصور، اور جب ہمارا قصور نہیں تو انجام کچھ ہی ہو، زندگی کی مہم میں فتح ہماری ہی رہی"!

سید صاحب مسکرائے لیکن یہ مسکرانا کسی اور سبب سے اتنا نہ تھا، جتنا شاید میرے اظہار قابلیت یا طلاقت لسانی پر، لیکن میں بھی نہ جھجکا، بلکہ دل ہی دل میں کسی قدر جھنجلا کر بولا، سید صاحب مایوسی اور مصائب کا علاج منطق فلسفہ الہیات وغیرہ میں ڈھونڈنے سے علامہ لوگوں کو مل جاتا ہو، تو مل جاتا ہو اس خاکسار کو تو آج تک نہیں ملا"

سید صاحب نے میرے لہجے کی تلخی یا بے باکی کو غالباً محسوس کر لیا تھا، مسکرا کر بولے، "اور کیوں جناب آپنے علامہ اور خاکسار میں کوئی خاص رعایت تو مدنظر نہیں رکھی ہے"، مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، میں نے کہا سید صاحب جب تک آپ کا ذہن ایسے موقعوں آپ کا ساتھ دیتا رہے گا، آپ کو اپنی طرف سے اطمینان ہو یا نہیں، مجھے آپ کی طرف سے اطمینان رہے گا"!

پھر میں نے کہا سید صاحب آپنے جو بات کہی وہ مجھ سے اٹھائے تو نہیں اٹھتی لیکن مجھے تو اُس مسلمان جنرل کی ادا پسند آئی جس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک خشکی ملے گی، وہ خدا کے نام پر فتح کرتا چلا جائے گا، فتح کرتے کرتے خشکی کا حصہ ختم ہو کر سمندر آگیا، تو اُس نے گھوڑے کو پانی میں ڈال دیا، اور کہا بار خدایا خشکی ختم ہو گئی، میرا عہد بھی ختم ہوتا ہے، تو سید صاحب اللہ کے ساتھ اس کے سپاہیوں کا یہی معاہدہ ہوتا ہے، اس کے بعد نام اللہ کا"!

سید صاحب پھر مسکرائے اور فرمایا، اب جاکر آرام کیجئے، آج بڑی دیر ہو گئی!

بالآخر یہ ہوا کہ سید صاحب پاکستان تشریف لے گئے، میں یہ جانتا تھا کہ سید صاحب جائیں گے ضرور گو معلوم نہیں کیوں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ سید صاحب وہاں خوش نہ رہیں گے تقسیم ملک کے بعد سید صاحب سے ایک بار کسی قدر اطمینان کی ملاقات ہوئی، اثنائے گفتگو میں فرمایا، سید صاحب عجب بے بسی کا عالم ہے، بن بیاہی لڑکیاں اور بوڑھے ماں باپ تو یہاں رہ گئے نوجوان پاکستان چلے گئے، کیا کیا جائے کیا ہوگا، اس طرح کی بعض دوسری مصیبتوں کا ذکر بھی بڑی مایوسی سے کیا، سید صاحب کی اس گفتگو سے میرا دل بھر آیا، اس لئے اور کہ سید صاحب اس طرح کی باتیں اکثر نہیں کرتے تھے معلوم نہیں کیوں اور کیسے، میرے دل میں وسوسہ سا پیدا ہوا کہ دیکھئے آئندہ

سید صاحب پر کیا گذرتی ہے،

سید صاحب پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی ایک دن اخبار میں پڑھا کہ اردو کے مسئلہ پر تقریر کرنے کے دوران میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحب کو تکلیف پہنچائی، بڑا قلق ہوا، سید صاحب کے لئے یوں کہ کس منزلت کا آدمی کہاں جا کر کس بنا پر رسوا ہوا، اور طلبہ کے لئے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی، اس نے یہ سلوک سید صاحب سے کیا جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور اتنی گرانمایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں، پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سنی تھی، طلبہ کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی،

اگر ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوتی ہوگی!

استاذ مرحوم

(نقوش اور تاثرات)

از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

"دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کا یہ منظر بھی کس قدر عبرت آموز ہے کہ شفیق و محبوب استاد کی یادگار میں ایک عزیز اور سعادتمند شاگرد کا مضمون اس وقت شائع ہو رہا ہے، جب وہ خود دوسروں کے لئے یادگار بن چکا ہے، جب یہ مضمون لکھا گیا ہے، اس وقت کس کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی شاگرد خود استاد کے حضور میں پہنچ جائے گا"
"م"

ٹھیک ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل نام کب سنا؟ حافظہ پر زور دینے سے اتنا خیال آتا ہے کہ ایک مرتبہ اپنی طالب علمی کے آغاز میں، غالباً گیارہ بارہ سال سے زیادہ عمر نہ ہوگی۔ ایک ہم سبق دوست محمد شمیم[1] دسنوی کے گھر پہنچا تو دیکھا وہ ایک اردو کتاب پڑھ رہے ہیں، پوچھا کیا پڑھتے ہو؟ بولے تم نہیں جانتے؟ مولوی سلیمان صاحب کی سیرۃ النبی ہے" یہ ۲۲ء کا ذکر ہے، اس کے کچھ ہی دن بعد ہمارے مدرسہ[2] میں اردو اخبارات اور رسالوں کا چرچا ہونے لگا، ایک انجمن قائم ہوئی اور رسالے اور اخبار جاری کرائے گئے، اسی سلسلہ میں پہلی مرتبہ رسالہ المعارف کا نام سننے میں آیا، پھر یہی، دو کتہ کے بعد جاری ہوا، تو وہ المعارف کے بجائے معارف نکلا، سب سے پہلا پرچہ جو ہماری نگاہوں سے گذرا وہ نومبر ۲۵ء کا شمارہ تھا، اس کا سپید غلاف اب تک نگاہوں کے سامنے ہے، اس میں ایک مقالہ (دستی تاریخ)

---

[1] ڈاکٹر سید محمد شمیم ام، بی، بی، ایس [2] مدرسہ عزیزیہ بہار شریف پٹنہ،

عزاسمہ پر ایک جمالی نگرنا گزنظر) تھا، جو گو ہم نے پڑھا، مگر پلے کچھ نہ پڑا، ایک مضمون شاید مولانا عبدالعزیز میمن کا بھی تھا، وہ بھی ہماری استعداد سے بلند تھا، مگر اس کے باوجود بڑے ذوق و شوق سے رسالے کا حرف حرف پڑھا گیا اور اڈیٹر کی وقعت و عزت دل میں گھر کرتی گئی، اور دو چار نمبروں کے بعد تو اُن کے علم کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا، یہ تاثر راقم اور اس کے اکثر احباب کا تھا،

اس کے بعد معارف کے علاوہ مدیر معارف کی ایک دو کتابیں اور پڑھیں، ان میں خطبات مدراس کی یاد تازہ ہے، بڑے ذوق و شوق اور عقیدت کے ساتھ پڑھی گئی، اور مصنف سے ملنے کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، پھر قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ۲۷ء کے اکتوبر میں مصر کے کچھ عربی رسالے نظر سے گذرے اور ایک دوست[1] کی عنایت سے الہلال (مصر) کی متعدد جلدیں مل گئیں، راقم بے سوچے سمجھے اُن کی تلاوت میں لگ گیا، ان دنوں الہلال میں طٰہٰ حسین کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، یہ ناآشنائے کوچۂ ادب پہلے پہل اُن سے بہت متاثر ہوا اور جی میں آنے لگا کہ "مصر چل کر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیجئے"

اس خام خیالی میں ایک اور دوست[2] بھی ہم نوا تھے، انھوں نے تو راست خط و کتابت بھی شروع کر دی، راقم نے مولانا سید سلیمان ندوی (یہ اس وقت کی زبان نقل کر رہا ہوں) سے مراسلت کی طرح ڈالی، پہلا خط گھنٹوں کی محنت کے بعد ٹوٹی پھوٹی عربی میں غالباً میری زندگی کا یہ پہلا عربی خط تھا، اعظم گڈھ کے پتہ پر لکھا، اتفاق سے مولانا رمضان گذارنے کے لئے دیسنہ آئے ہوئے تھے، جواب وہیں سے ملا، اور بہت حوصلہ افزا، مصری درسگاہوں کے متعلق استفسار کے جواب میں ارشاد ہوا "بہتر ہوگا کہ تم سال دو سال کے لئے ندوہ میں داخلہ لے لو" جواب سلیس اور سادہ عربی میں تھا، زبان دل کو لگ گئی، پڑھتے پڑھاتے خط ازبر ہوگیا، اب کیوں چوکتا؟ دوسرا خط فوراً ہی دیسنہ کے پتہ پر حاضر کیا، اس کا جواب بھی بر وقت ملا، اس میں حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ طٰہٰ حسین اور اس کی ذریات کی سخت تنقید بھی تھی، غالباً راقم نے خط میں اس کی ثنا خوانی کی تھی، ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری تھی "میں دوسری

[1] حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب، بہار شریف (پٹنہ) [2] جوان مرگ ابو یوسف ندوی مرحوم (ف ۱۹۳۲ء)

شوال کو اعظم گڈھ جا رہا ہوں"، بس، پھر کیا تھا، دن گننے لگا، روانگی تو بہر حال بہار شریف ہی کے اسٹیشن سے ہو گی، یہ توقع کیوں ضائع کیا جائے؟ یہ دوسرا مکتوب بھی اسی سہل ممتنع زبان میں تھا، یہ بھی دوستوں کو پڑھتے پڑھاتے یاد ہو گیا اور آج ۴۶ سال گذرنے کے بعد بھی یہ دونوں خطاب تک حرف بحرف یاد ہیں، نوجوانی کا شوق اسی کو کہتے ہیں۔

یہ مارچ ۲۸ء (رمضان ۴۶ھ) کا ذکر ہے،

۲ر شوال ۴۶ھ کو وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا، ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ایک وجیہ نورانی چہرہ نظر آیا، سفید براق عمامہ، قاعدے کی سلی ہوئی شیروانی، ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی، اور پاؤں میں گوہ کے چمڑے کا سادہ لیکن نفیس جوتہ، ہو نہ ہو یہی علامہ سید سلیمان ندوی ہیں، یقین تھا پر کسی سے تصدیق کر لوں تو آگے بڑھوں، حسن اتفاق سے قریب ہی پٹنہ کے شہر کے طبیب حکیم عبدالقیوم صاحب ڈیانوی پر نظر پڑ گئی، اُن سے ڈرتے ڈرتے اپنے خیال کی تصدیق کی، پھر آگے بڑھ کر سلام و مصافحہ کی سعادت حاصل کی، فرمایا "میں نے تمہیں نہیں پہچانا"، عرض کیا: خاکسار کا یہ پہلا موقع ہے"، پھر اپنے خطوط کا ذکر کیا، دریافت کیا "کیا پڑھتے ہو، اور کس سے پڑھتے ہو؟" پھر ارشاد ہوا: "درسی کتابوں کے علاوہ کیا پڑھتے ہو؟" الہلال اور دارالہلال کے ہفتہ وار اخباروں کا نام سُن کر فرمایا "یہ کیا پڑھنے کی چیزیں ہیں؟ مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر (ابن اثیر) پڑھا کرو"، مقدمہ ابن خلدون اور المثل السائر تو اس وقت میرے بس کی نہیں تھیں، پر الہلال کے متعلق مولانا کا ارشاد نہیں بھولا،

دوسرے دن مدرسہ پہنچا، تو اپنے ہم چشموں کو انٹرویو کی داستان مزہ لے لے کر سُنائی، ہمارے مدرسہ کے ادیب مولانا انوار الحق ندوی اعظمی مرحوم، دیوبند کے فارغ اور بڑے ذہین آدمی تھے، جدید مصری ادب میں الہلال کا ان پر گہرا اثر تھا، میں نے جب علامہ ندوی کی رائے سُنائی تو وہ جھنجھلا کر بولے: "معارف میں بھی الہلال کے ترجمے کے سوا کیا ہوتا ہے؟" ایک تو علامہ کا علمی رعب، دوسرے معارف پر اپنے استاد کی ناروا تنقید نے مجھے اُن سے بدگمان کر دیا، "آخر تین سال سے میں بھی معارف پڑھتا ہوں، الہلال کا ترجمہ کہاں ہوتا ہے؟ مولوی صاحب یقینی تعصب سے کام لے رہے ہیں"، یہ خیال میرے دل میں جاگزیں ہو گیا، رسالہ الزہرا بھی قاہرہ سے آنے لگا تھا۔

الہلال کے مقابلہ مین راقم اس کا داعی اور ثناخوان بن گیا، انہی دنون سیرۃ عائشہؓ[1] پر الزہرا[2] مین اس کے بخیہ معزز صاحب علم اڈیٹر محب الدین خطیب کے قلم سے ایک شاندار ریویو نکلا، اس سے علامہ ندوی کی وقعت دل مین اور بڑھ گئی "اللہ اللہ! مصر کے رسالون مین ان کی تعریف چھپتی ہے"، دوستون سے کہتا اور اپنے ہونے والے استاذ مخدوم کے گن گایا کرتا،

(۲)

آخر یہ عقیدت و محبت ندوہ لے گئی، اور اس طرح لے گئی کہ وہین کا ہو کر رہ گیا، پہلی نسبتین معدوم ہو گئین، پہلی جولائی ۳۲ء کو لکھنؤ پہنچا، آٹھوین جماعت (جو اس وقت دار العلوم کی آخری جماعت تھی) مین داخلہ ہوا، پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام مین لگ گیا، پورا سال تعلیمی انہماک مین گذرا، سید صاحبؒ قبلہ معتمد تعلیم کی حیثیت سے ہر ماہ تشریف لاتے، عام طور پر نواب علی حسن خان صاحب شاہجہان ناظم ندوۃ العلماء کے ہان قیام ہوتا، ہم لوگ وہان پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے، اور حضرۃ الاستاذ کے متنوع سوالات کا بوجھ سب مل کر برداشت کرتے، سید صاحب طلبہ سے سوال بہت کیا کرتے، اس لئے بعض طالب علم اُن کی خدمت مین حاضر ہونے سے جھجکتے تھے، مگر ہم لوگ اس شرم و ندامت کے باوجود، جو معقول جواب نہ دینے پر محسوس ہوتی، برابر حاضر ہوتے اور استفادہ کا موقع کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے، یہ سلسلہ سال بھر جاری رہا، اس دوران مین ایک بات قابلِ ذکر پیش آئی، سیرۃ النبی جلد دوم مین مولینا شبلیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف (قبل تحریم) شراب پینے کی نسبت کی ہے، اور کچھ اپنی طرف سے نہین، بلکہ ابوداؤد کی ایک روایت کی بنا پر خلفائے راشدین (مؤلفہ حاجی معین الدین مرحوم) بھی چھپی تو حاشیہ مین سید صاحب قبلہؒ نے اسکی تردید کر دی، اس پر ہم لوگون مین چہ می گوئیان رہین، اور آخر عبد السلام صاحب قدوائی کے مشورہ سے (جو اس وقت ساتوین جماعت مین پڑھتے تھے) راقم نے سید صاحب کو ایک خط لکھا جس مین اس تردید پر اپنے عدم اطمینان

---

[1] مصنف محب الدین خطیب کی نظر سے سیرت عائشہ کا ترکی ترجمہ گذرا ہوگا [2] الزہرا، بیر کاظہ سے معارف یا معارف کا مثنی تھا ۱۹۰۰ء، مینچ کر اس عجوبہ نقب خطاب سے آشنا ہوئے،

کا اظہار تھا جواب ڈاک کے بجائے زبانی ملا، اوران الفاظ مین،

"تو کار زمین را نکو ساختی کہ با آسمان نیز پرداختی"

اور پھر یہ لطیف فقرہ: آخر تمھین حضرت علیؓ کے خلاف معرکہ آرائی کی ضرورت کیا پڑی تھی؟ "مولانا عبد الودود صاحب جیراج پوری، مدرس دار العلوم (جو اس وقت سید صاحب کے ساتھ تھے) بولے: "جی ہان! سادات کرام تو طبعاً مائل بہ اہل بیت ہوتے ہی ہین" ان فقرون کے بعد پھر تحقیقی طور پر اس روایت کی اصلیت[1] واضح کی،

اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی نہین بھولتا، مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ عربی مدرسون کا مرکز ہے، وہین ایک مدرسہ مین والد ماجد قبلہ بھی مدرس اول تھے، راقم اس مناسبت سے مئو گیا ہوا تھا، انھی دنون مدرسہ فیض عام (اہلحدیث) اور مدرسہ مفتاح العلوم (حنفی جس کے صدر مدرس مولانا حبیب الرحمن صاحب تھے، اور شاید اب بھی ہون) مین سالانہ جلسے تھے، سید صاحب قبلہ دونون طبقون کے مرجع تھے، ایک ہی دن صبح شام دونون جلسون کی صدارت کی، مفتاح العلوم کے جلسے مین عاجز بھی ساتھ تھا، نماز کو جاتے ہوئے خادم نے استاذؒ کے جوتے اٹھالیے، استاذؒ نے مسکرا کر تمام حاضرین کے سامنے فرمایا: "یہ میرا باضابطہ شاگرد نہین، مگر شاگردی کا حق ادا کر رہا ہے" خادم نے دبی زبان سے عرض کیا: آخر شاگردی کی تعریف کیا ہے؟

(۳)

جولائی ۱۹۲۰ء مین سالانہ امتحان ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خاکسار نے نمایان کامیابی حاصل کی، اور اپنی جماعت مین اول رہا، سید صاحب قبلہ نے نتیجہ کے اعلان کے ساتھ حوصلہ افزا نوٹ لکھا، اور والد ماجد (مولانا حکیم محمد عبد الشکور صاحب مدظلہ؛ مولود ۱۲۹۰ھ) کو خط کے ذریعہ مبارکباد دی، اور تو اور انھی دنون مولانا حمید الدین فراہی مرحوم و مغفور کسی تقریب سے ندوہ تشریف لائے، اور ہم لوگ اُن کی خدمت مین حاضر ہوئے تو استاذ مرحوم نے تعارف کے انداز مین (مولانا فراہی کی طرف مخاطب ہوکر) فرمایا:

---

[1] سیرت النبی جلد چہارم مین حضرت الاستاذؒ نے اس کی پوری تحقیق فرمادی ہے،

"لوگ اس سے (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) مٹھائی مانگ رہے ہیں، یہ اپنی جماعت میں اول آیا ہے"

ان فقروں سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ ہوئی، اور عجیب اتفاق کہ مولانا فراہیؒ کی مجلس میں یہ میری پہلی اور آخری حاضری تھی، مگر اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

ستمبر ۱۹۲۹ء اور اس کے بعد کا ذکر ہے، اب میں درجۂ تکمیل ادب کا طالب علم ہوں، یوں تو تکمیل کے پہلے سال میرے باقاعدہ استاذ مولانا عبد الکلیم صدیقی (استاذ تفسیر و ادب دار العلوم ندوۃ العلماء) تھے لیکن مشورہ سید صاحب سے ضرور کرتا، اور مراسلت بھی ہوتی، مگر بسا اوقات جواب زبانی ملتا، یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو اس زمانے کی بھولی بسری باتیں یاد آ رہی ہیں، ایک آدھ بات تو بیان کر ہی دی جائے، راقم اور محمد ناظم صاحب[۱] (جو اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے، مگر ادبی استعداد بہت بلند تھی) کو عربی کا جنون تھا، ندوہ میں بعض طلبہ ہماری اصطلاح میں شعوبی یعنی عربی کے مخالف تھے، وہ اردو میں کمال پیدا کرنا ہی اپنا منتہائے نظر سمجھتے تھے، ہماری ان کی کشمکش رہتی تھی، محمد ناظم صاحب اپنی ذہانت اور اعلیٰ استعداد کے باوجود عزم کے کمزور ہیں، ان پر کبھی کبھی شعوبیوں کے طعنے کا اثر ہو جاتا، ایک شام کو ہم لوگ سید صاحب قبلہ کے ساتھ لال باغ[۲] سے موتی محل کے پل کی طرف آ رہے تھے کہ محمد ناظم صاحب نے کہا:-

"عربی پڑھتے تو ہیں مگر یہاں اس سکے کی کیا قیمت ہے؟"

سید صاحب نے یہ سن کر بڑی تسلی دی اور فرمایا:

"میرا بھی یہی خیال تھا، مگر جب وفد خلافت میں یورپ جانا ہوا، تو یہ عربی کام آئی، اور اس وقت دار العلوم کی ابتدائی مشق کا فائدہ معلوم ہوا، مولانا محمد علی نہ عربی بول سکتے تھے، نہ فرنچ، اور عرب ملکوں کے نہ خود عربی بول سکتے تھے، یا فرنچ ـــ ایسے تمام اہم موقعوں پر میری عربی کام آئی،

---

[۱] مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاول پور [۲] لال باغ لکھنؤ کا ایک محلہ ہے، جہاں نواب علی حسن خان صاحب مرحوم کی کوٹھی تھی،

"پھر دوسری مرتبہ موتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں اس مشق نے پورے ہندوستان کی لاج رکھ لی،

گھبراؤ نہیں، جوہر ضائع نہیں ہوتا"

کس قدر صائب رائے اور کتنی دور بین نظر تھی؟ آج ندوہ کے وہ طالب علم جو عربی لکھنے بولنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں، خود محمد ناظم صاحب کو اس کا عملی تجربہ ہو رہا ہے، اس سال کا ایک اہم واقعہ طلبۂ ندوہ کی اسٹرائک تھی (مئی: ۱۹۳۰ء)۔ بات معمولی تھی، بڑھ گئی، سید صاحب قبلہؒ نے بڑی کوشش کی، مگر نوعمر اور پرجوش طالب علموں نے ایک نہ مانی، اسٹرائک ناکام رہی، اور جولائی ۱۹۳۰ء میں دار العلوم کھلتے ہی دھڑا دھڑ معافیاں داخل ہونے لگیں، چھ طالب علم (جن پر قیادت کا الزام تھا) خارج کئے گئے، اور ندوہ کی اصطلاح میں "ممنوع الادخال" قرار پائے، ان میں ایک راقم بھی تھا، گو میری حیثیت عام طالب علم کی نہیں رہی تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ دار کونسل یا مجلس عمل کا ممبر میں بھی تھا، اس لئے میرے باب میں اسٹاف کی رائے مختلف تھی، اور اسی اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سید صاحب قبلہ نے میرا اخراج منسوخ کرا دیا، باقی دوسرے پانچ قائدین کے داخلہ سے بھی حضرۃ الاستاذ کو اختلاف نہیں تھا، اور نواب صاحب بھی تیار تھے، مگر ندوہ کی مجلس انتظامی کے ایک ندوی رکن نے سید صاحب کی نہ چلنے دی، حالانکہ استاذ مرحوم معتمد تعلیم تھے، وہ چاہتے تو اپنے اختیار خاص سے معاف کر دیتے، مگر سید صاحب قبلہ لڑنا نہیں جانتے تھے، اور ان کے بعض رفیقوں نے اُن کی اس نرم مزاجی سے ہمیشہ ناروا فائدہ اٹھایا جس کا اُن کی صحت پر بھی پڑتا رہا —

تیس اور کے دوسرے سال ہماری زندگی بدل گئی، ندوہ میں بہار کا موسم آیا یعنی اگست ۱۹۳۰ء میں استاذ محترم شیخ تقی الدین محمد بن عبد القادر الہلالی المغربی تشریف لائے، ندوہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک چوٹی کے عرب ادیب و زبان داں نے کرسی تدریس کو زینت دی، — بس پھر کیا تھا، سارے مشاغل بالائے طاق رکھکر زبان و ادب کی تحصیل میں لگ گیا، علی میاں[۵۱] اور حفیظ خلیل عرب[۵۲] صاحب کی صحبت میں زبان کا خاصا ذوق

---

[۵۱] مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی (معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء) [۵۲] شیخ خلیل بن محمد بن حسین ندوی (مدنی الاصل)

پیدا ہوچکا تھا، اور اب زیادہ تر حدیث کے درس میں مشغول رہا کرتے تھے) بھی از سر نو نحو و ادب کی تجدید و تکمیل میں لگ گئے، اکثر ہم لوگوں کا ساتھ رہتا، ہلالی صاحب بھی ہم لوگوں سے بہت خوش تھے، ہمارے علاوہ محمد ناظم صاحب اور ابو اللیث[1] صاحب کا بھی، ہلالی صاحب کے خاص شاگردوں میں شمار تھا، سید صاحب قبلہ جب بھی تشریف لاتے، ہلالی صاحب سے ملتے، اور ان کا بڑا احترام کرتے، ہلالی صاحب ہم لوگوں کی بہت تعریف کرتے، اور بار بار زور دیتے "ان لوگوں سے ندوہ میں تدریس کا کام لیا جائے"

باتیں بہت ہیں، اس دوران میں ایک اور دلچسپ بات عرض کر دی جائے، تو اچھا ہو، ہلالی صاحب کی آمد سے پہلے، راقم یکسو نہیں تھا، طب کی تحصیل کا خیال بھی بار بار آتا، علی گڑھ سے دستور العمل منگوا کر تیاری بھی شروع کر دی تھی، سید صاحب قبلہ سے مشورہ کیا، تو کچھ دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

"جو چاہو کرو، مگر طالب علمی کو پیشہ نہ بنانا"

(۴)

ستمبر ۱۹۳۱ء میں تکمیل ادب کا امتحان ہوا "تاثیر الاسلام فی الشعر العربی" (اسلام کے اثرات عربی شاعری پر) اطروحہ ([illegible]) کا عنوان تھا، اطروحہ منظور ہوا، اور راقم نے وطن کی راہ لی، اور انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل میں لگ گیا، ادھر ہلالی صاحب نے سید صاحب کو ایک عربی ماہنامہ نکالنے کی ترغیب دی اور راقم کا نام ادارت کے لئے پیش کیا، تجویز طے پا گئی، اور علی میاں نے فرط مسرت سے فوراً اطلاع دی، اور راقم انگریزی پروگرام کی بساط الٹ، لکھنؤ پہنچ گیا، (مارچ ۱۹۳۲ء)۔ مئی ۱۹۳۲ء (محرم الحرام ۱۳۵۱ھ) سے "الضیاء" کا اجراء عمل میں آیا، عام طور پر زبان کی تصحیح ہلالی صاحب کرتے اور دوسرے امور کے متعلق سید صاحب قبلہ ہدایتیں دیتے، یہ پہلا موقع تھا کہ حضرۃ الاستاذ کی راست نگرانی، اور سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا، یہ سلسلہ تقریباً چار برس جاری رہا، پہلے دو سال ہلالی صاحب مدظلہ کے مشورے بھی رہنمائی کرتے تھے، ہلالی صاحب کے چلے جانے کے بعد

---

[1] مولانا ابو اللیث ندوی اصلاحی اعظمی، امیر جماعت اسلامی ہند (رام پور)

دو برس صرف سید صاحب قبلہ کی نگرانی اور مشورے، اس ناتجربہ کار اڈیٹر کے لئے مشعل راہ بنے رہے، ان چار سالوں میں بہت کچھ سیکھا، اور جس چیز کو زندگی کا تجربہ کہتے ہیں، وہ پہلی مرتبہ حاصل ہو رہا تھا، سید صاحب قدم قدم پر ٹوکتے، معمولی زبان کی غلطیوں کی نشان دہی فرماتے، کتابت کے متعلق بھی مشورے دیتے، مضامین کی سطحیت پر تنبیہ کرتے، اور ساتھ ساتھ کبھی حوصلہ افزائی بھی فرماتے، اور اپنے مخصوص انداز میں ــــ اسی دوران میں راقم نے عربی اخباروں میں اسلامی ہند کی سیاسیات پر لکھنا شروع کیا، اس پر کبھی ٹوکتے کبھی خاموش رہتے اور کبھی حوصلہ افزائی فرماتے، یہ تاکید ہمیشہ رہتی کہ شہرت کے پیچھے نہ دوڑو، کبھی لکھتے "تمھیں عربی لکھنا آگئی، مگر نہیں معلوم کیا لکھیں؟" الضیاء کا پہلا افتتاحیہ خود اپنے قلم سے لکھا تھا، اور خوب تھا، آج بھی پڑھا جا سکتا ہے، ہم لوگوں کو حیرت تھی کہ بیس برس کے بعد بھی حضرۃ الاستاذ کی عربی انشاء میں بانکپن باقی ہے، اپنا عربی کلام بھی اشاعت کے لئے دیتے،

تعلقات بڑھے تو چھٹیوں میں ایک آدھ بار دیسنہ بھی ضرور حاضر ہوتا، استاذ مرحوم عام طور پر گرمیوں کے دن دیسنہ[1] ہی میں گذارتے، ندوہ میں بھی چھٹیاں ہوتیں، راقم جب بھی دیسنہ حاضر ہوتا، ایک دو مقامی دوست یا ندوہ کے کوئی پردیسی طالب علم[1] ضرور ساتھ ہوتے، ۱۹۳۲ء کی گرمیوں کا ذکر ہے، ندوہ کے ایک طالب علم محمد حسن مالدیپی کو لے کر دیسنہ حاضر ہوا، طعام و کلام کے سلسلہ کے بعد دوپہر کو اوپر کی منزل میں (جو برادرم ابوسہیل[2] صاحب کا کمرہ تھا،) آرام کرنے کا حکم ہوا، راقم دن کو سونے کا عادی نہیں، بستر پر پڑا رہا، نماز ظہر کے وقت خود حضرۃ الاستاذ تشریف لائے، سلمان میاں[3] گود میں تھے، کمرے میں سہیل صاحب کی انگریزی ٹوپی (ہیٹ) لٹکی ہوئی تھی، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ بولے "دیکھا آپ نے زمزم میں شراب کی آمیزش" پھر ننھے سلمان

---

[1] ندوہ کی روایات میں داخل تھا کہ دور دراز کے طالب علم لمبی چھٹیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ اُن کے گھر جاتے اور گھر کے افراد کی طرح وہیں چھٹیاں گذارتے [2] حضرۃ الاستاذ کے بڑے صاحبزادے سید ابوسہیل عظیم آبادی بی اے (علیگ)

[3] چھوٹے صاحبزادے سلمان میاں سلمہ اللہ،

کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے، "دیکھو بیٹا! صرف میرے نام کے نقطے نہ مٹایا کرنا"۔ اس لطیف فقرے کے بعد مجھ سے فرمایا، "کچھ سمجھے؟" عرض کیا: جی ہاں! اللہ تعالیٰ علمی میراث بھی عطا کرے"۔

یہ ۱۹۳۳ء کی گرمیوں کا ذکر تھا، اس سے چھ ماہ پہلے (دسمبر ۱۹۳۲ء۔ جنوری ۱۹۳۳ء) دارالمصنفین بھی حاضری ہوئی تھی، اور رمضان المبارک کا پورا مہینہ وہیں گذرا تھا، باضابطہ "شاگردی" کا موقع بھی یہیں نصیب ہوا، محمد ناظم صاحب اور ابو اللیث صاحب بھی ساتھ تھے، ہم تینوں قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیتے، غالباً سورہ بقرہ کا ایک ربع ہو سکا، اس کے نوٹ اب تک حسن اتفاق سے محفوظ ہیں، حجۃ اللہ کے ابتدائی ۲۵، ۳۰ صفحے ہوسکے تھے۔ دس بجے صبح کو سید صاحب کے کمرے میں درس ہوتا، اسی وقت ڈاک بھی آتی، اور بڑے لطیفے رہتے، ایک مرتبہ ایک انگریزی خط آیا، مجھے پڑھنے کا حکم ہوا، میں نے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی شروع کر دیا، فرمانے لگے "میں انگریزی سمجھتا ہوں، صرف اس خط کا عادی نہیں" بڑی ندامت ہوئی، ایک روز دفتر کا ملازم ایک پرزہ دے گیا، ۷، ۸ روپیے، پہلے تو جیب میں رکھ لئے، پھر پرزہ اور روپیے نکال کر کہنے لگے۔

"تم لوگ خیال کرتے ہوگے کہ میں بہت کچھ کماتا ہوں گا، بس میرا حصہ اسی قدر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انتظامات ہیں، اپنے بندے کے ہاتھ سے خرچ کراتا ہے، ملازموں عزیزوں، اور دوسروں کو ان کا اپنا رزق ملتا ہے، میرے حصہ کے یہی چند روپیے ہیں، اسے اچھی طرح سمجھ لو، تم لوگ بھی اس منزل سے گذرنے والے ہو"۔

اسی دور میں ندوہ میں پھر ایک ہنگامہ ہوا، (۱۹۳۵ء) طلبہ کی معاونت کا الزام ایسے تین افراد پر بھی تھا، جو کسی نہ کسی حد تک اسٹاف میں شمار کئے جاتے تھے، ان میں سب کمزور ابو اللیث صاحب تو فوراً الگ کر دیئے گئے، مفتی محمد سعید صاحب اور راقم کو دارالعلوم سے باہر رہنے کا حکم ہوا، حالانکہ ابو اللیث صاحب میرے مقابلے میں بہت نرم، بے زبان، اور مرنجان مرنج آدمی تھے، راقم کے متعلق مشہور تھا کہ اسے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مانتے ہیں، اور غالباً اسی لئے مجھ پر سخت وار کرنے کی ہمت نہیں پڑی، ورنہ ہنگامے میں میرا رویہ

مدرسہ جو غیر محتاط تھا، مفتی محمد سعید صاحب کا تکیہ بھی ایک بڑے ستون پر تھا، اور وہ بھی بال بال بچ گئے، اسی زمانہ میں استاذ مرحوم کا ایک بڑا مفصل خط آیا، جس میں خداوندانہ لہجہ میں نصیحت کی گئی تھی، وہ خط آج بھی حکمت و موعظت سے لبریز نظر آتا ہے، نیز دارالعلوم تشریف لائے، تو ابو اللیث صاحب اور خاکسار کو الگ برآمدے میں کھڑے کھڑے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ نصیحتیں کیں، حضرۃ الاستاذ ابو اللیث صاحب کو بہت مانتے تھے، یہ نام (ابو اللیث) بھی انہی کا رکھا ہوا تھا، (ان کا اصل نام شبیر محمد تھا) اور ندوہ کے لئے انہیں مغتنم سمجھتے تھے، مگر جب ابو اللیث صاحب رخصت ہونے گئے، تو اُن کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے، بولے، تو صرف اس قدر.... صاحب معافی کرلو، سید صاحبؒ مدرسے سہنے کے خوگر تھے، اپنے اختیارات استعمال کرنا یا عام زبان میں اپنے کو آہ و ددہ کرنا جانتے ہی نہیں تھے ۔۔۔۔ اس واقعہ کے ہفتہ عشرہ بعد ہی ان پر امراض قلب کا وہ شدید حملہ ہوا جس سے مہینوں ذی فراش رہے، اور ہفتوں موت و حیات کی کشمکش رہی، اور پہلی سی صحت تو پھر نصیب ہی نہیں ہوئی،

"الضیا" بھی اسی علالت کے دنوں میں بند کرنا پڑا، اور راقم کے ذمہ صرف تدریس کی خدمت رہ گئی، فارغ وقت میں علمی تحقیق و مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور اس کے لئے سید صاحب قبلہ سے برابر مشورہ کیا کرتا، مراسلت کے ذریعہ اور زبانی بھی، اسی زمانے میں لغات جدیدہ کی تکمیل کی، اور آغاز میں جدید اسالیب بیان پر ایک مفصل مقدمہ کا اضافہ کیا، حضرۃ الاستاذؒ بہت خوش ہوئے، اور دریافت فرمایا،

"اپنی محنت کا معاوضہ کیا چاہتے ہو؟ نام یا دام؟"

خادم نے عرض کیا "صرف استاذ کی خوشنودی مزاج" ۔۔۔ کتاب کے سات نسخے مرحمت ہوئے، "ٹائٹل" پر "مع اضافہ جدید از مسعود عالم ندوی" کا اضافہ ہوا، نیز دیباچہ میں ایک حوصلہ افزا نوٹ مزید تحریک عمل کے لئے ثبت ہوا، ابھی ابھی سال دو سال ہوئے، پھر مزید اضافہ کا حکم ہوا تھا، تعمیل ارشاد میں کافی اضافہ ہو چکا ہے اور چھپ بھی گیا، مگر آہ! کہ یہ کوشش استاذ کی نگاہ ذرہ نوازی سے محروم رہی اور رہے گی،

اسی دوران میں راقم نے بے اجازت مدینہ (بجنور) کے شعبۂ ادارت کی رکنیت قبول کر لی تھی، عتاب ہوا اور حسب الحکم ڈیڑھ ماہ کے بعد ندوہ واپس آگیا (اگست ۳۷ء)

(۵)

دسمبر ۳۷ء میں حضرۃ الاستاذ کی تحریک اور مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش و تائید سے خدا بخش اورینٹل لائبریری میں میرا تقرر ہوگیا، اس علمی ماحول میں بھی میرا مرجع اعظم گڈھ ہی رہا، جو کچھ بھی لکھتا، پہلے حضرۃ الاستاذ سے مشورہ لیتا، ادھر عربی سے تعلق کچھ کم ہوا، تو معارف میں لکھنا شروع کیا، بہت ڈرتے ڈرتے ہمت ہوئی، مگر سید صاحب قبلہ کی حوصلہ افزائی نے یہ مرحلہ آسان کر دیا، ۳۸ء سے ۴۲ء تک معارف کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا، سید صاحب پٹنہ اکثر تشریف لاتے، مختلف سرکاری کمیٹیوں میں اُن کی شرکت ضروری خیال کی جاتی، مخدومی مولانا ریاض حسن خان صاحب خیالؔ کی کوٹھی پر قیام ہوتا، استاذ مرحومؒ کے تشریف لاتے ہی مولانا کا ملازم اطلاع کر جاتا، اور جب تک سید صاحب قیام فرما ہوتے، راقم روزانہ حاضر ہوتا، اور گھنٹوں وہاں نشست رہتی، پٹنہ میں یہی ایک رئیس کا گھر تھا، جہاں بے تکلف کھانے پینے میں شریک ہوتا، مولانا ریاض حسن خان خیالؔ استاذ الاساتذہ مولانا شبلی کے ملنے والوں میں تھے، سید صاحبؒ بھی ان کا احترام کرتے، اور ہم وابستگان سیدؒ و شبلیؒ کو تو وہ اپنا عزیز ہی سمجھتے، مولانا ریاض حسن خان صاحب اور اُن کے بڑے بھائی مرحوم مولانا اعجاز حسن خان صاحب خوب آدمی تھے، ہماری پچھلی تہذیب اور شائستگی کے زندہ نمونہ،

پٹنہ میں خاکسار تقریباً سات سال رہا، (دسمبر ۳۷ء تا ستمبر ۴۴ء) اس دوران میں بیسیوں ملاقاتیں ہوئیں کبھی کبھی ندوہ میں بھی اجتماع کے موقع ملے، ایک آدھ بار شبلی منزل بھی حاضر ہوا، دیسنہ تو بار بار جانا ہوا، باتیں بہت ہیں مگر اس تحریر کی محدود گنجائش میں کیا کیا بیان کیا جائے؟ بہرحال دو چار ضروری باتیں تو بیان کرنا ہی پڑیں گی،

۴۰ء تک سید صاحب قبلہؒ سے کبھی کسی مسئلہ میں اختلاف نہیں ہوا تھا، مگر اس کے بعد اُن کے افکار و

رجحان میں کچھ تبدیلی ہونے لگی جس سے پہلے پہل میرے بنے بنائے افکار و خیالات کو سخت جھٹکا لگا، سید صاحبؒ کو خود بھی اس کا احساس تھا، پہلے تو یہ کہکر تسلی دی: کہ میں نے بیعت میں فقہی مسلک کو آزاد رکھا ہے" مگر اندازِ فکر بتا رہا تھا کہ فقہی مسلک میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مگر بہت آہستہ، اس لئے قدرۃً سنہ ۴۲ء اور اس کے بعد ایک عرصہ تک گفتگو اور خط و کتابت جو کچھ بھی ہوتی، وہ تصوف پر، فقہی مسلک کو نہیں چھیڑتے، اس لئے کہ ذہنی طور پر وہ اپنے مسلکِ تحقیق پر قائم تھے، راقم گفتگو میں تو کیا جرأت کرتا، مگر خطوط میں خوب دل کھول کر لکھتا، اور وہ بڑے صبر و تحمل سے جواب دیتے، اس سلسلہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے دو چار ایسے جامع اور مفصل خط لکھے ہیں، جو بعض حیثیتوں سے تصوف کی بڑی تصنیفات پر بھاری ہیں، ایک مرتبہ گفتگو اس حد تک پہنچی کہ "دلائل کا جواب دو یا بات مانو" میں نے عرض کیا "جواب تو دے نہیں سکتا، مگر دل میں بات نہیں اترتی"۔

فقہی مسلک کا ذکر آیا ہے تو چند لطیفے سن لیجئے، راقم شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی سیرت لکھ رہا تھا اس کا پہلا باب **معارف** میں نمونہ کے طور پر تازہ تازہ شائع ہوا تھا، (مئی۔ جون سنہ ۴۱ء) اتفاق سے انہی دنوں سید صاحبؒ پٹنہ تشریف لائے، دیکھتے ہی فرمایا "آج کل تمہیں نجدیات سے بڑا تعلق ہو گیا ہے" میں کیا عرض کرتا، نگاہیں نیچی کر لیں، پھر میری داڑھی کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے "خیر اب داڑھی تو بڑھ رہی ہے"

اس سے تقریباً ایک برس پہلے (سنہ ۴۰ء) کا ذکر ہے، مدرسہ اکزامینیشن بورڈ (بہار) کی مجلس تھی، سید صاحبؒ مسند نشین تھے، موضوع اصلاح نصاب تھا، صوبہ کے تمام مشہور علماء موجود تھے، مخدومی مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، حاجی معین الدین ندوی مرحوم ان میں زیادہ نمایاں تھے، راقم بھی ایک ممبر کی حیثیت سے حاضر تھا، اسی دن شام کو پٹنہ سیٹی (پٹنہ کی قدیم آبادی عظیم آباد) میں انجمن محمدیہ کے زیر اہتمام تبلیغی جلسہ تھا، مولانا سجادؒ نے سید صاحبؒ اور مولانا گیلانی کو دعوت دے دی، اور خاکسار کو بھی ان کی معیت میں آنے کا حکم ہوا، وہاں پہنچے، تو مولانا ابوالقاسم بنارسی سے ملاقات ہوئی، سب لوگ ڈائس کے قریب بیٹھ گئے، راقم وہیں مولانا بنارسی سے الگ باتیں کرنے لگا، سید صاحبؒ نے تعجب سے فرمایا، تمہارا ان سے کیا

تعلق؟ مین نے عرض کیا: ہمارے اُن کے خاندانی تعلقات ہین[1]، بولے اور میری داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
جو اس وقت چھوٹی تھی) جی ہان! اب تو داڑھی منڈے بھی اہل حدیث ہوتے ہین، مولانا ابوالقاسم صاحب سے
بہت متاثر ہوئے، اور پھر دونون زمانے کے انقلاب کا شکوہ کرنے لگے،

سیرت ابن عبدالوہاب کی تالیف مین بھی حضرۃ الاستاذ ہی سے مشورہ دیتا چونکہ یہ میری پہلی علمی تصنیف تھی
بڑی تمناؤن کے ساتھ سید صاحب کے نام معنون کرنے کی جرات کی،

انتساب

" اپنے استاذ، مربی اور مخدوم حضرت مولٰنا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

کے نام

جن کے مفید مشورون نے مجھ مین لکھنے پڑھنے کا مذاق پیدا کیا، اور جن کی پدرانہ شفقت میری
زندگی کے اُتار چڑھاؤ کی نگہبان رہی ہے، اور اپنی طالب علمی کے گذشتہ بارہ تیرہ سالون مین جن کے
مشورون کا یکسر پابند رہا ہون،

اپنی اس حقیر علمی کوشش کو معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہون،

گر قبول افتد زہے عزوشرف

خاکسار

مسعود عالم ندوی"

---

[1] والد صاحب قبلہ کے پھوپھی زاد بھائی اور استاذ مولانا سید عبدالکبیر بہاری عمر بھر بنارس ہی مین مولانا ابو
کے والد مولانا محمد سعید کی بنارسی کے دست راست کی حیثیت سے کام کرتے رہے، مولانا سعید کے تمام صاحبزادوں
نے انہی سے تعلیم پائی، اور انھین "چچا" کہتے تھے، اور مولانا عبدالکبیر صاحب کے صاحبزادے برادر محترم حافظ
صاحب مولٰنا ابوالقاسم کو بڑے بھائی کہتے تھے،

اور عجب شومیٔ قسمت کہ یہ سفرنامہ اپنے وقت پر استاذ مرحوم کے ملاحظہ میں نہ آیا، یہ راز بھی کئی سال کے بعد مدینۂ منورہ کھلا، ایک شام کو سید صاحبؒ سلمان میاں کے ساتھ غربت کدہ پر تشریف لائے، (محرم ۱۳۶۹ھ / نومبر ۱۹۴۹ء) دوران گفتگو میں دریافت فرمایا: "تمھاری محمد بن عبدالوہاب یہاں ہے؟" کتاب نکال کر پیش کی، سفرنامہ پر نگاہ ٹھٹک گئی، بہت متاثر ہوئے اور آنکھوں میں دو آبدار موتی چمکتے نظر آئے اور پھر بڑی محبت سے فرمایا "آپ یہ جنس وفا عنقا ہے"، وہ منظر اب تک نہیں بھولتا، اور نہ بھولنے کی چیز ہے۔ — عرب ملکوں میں امیر شکیب ارسلان (ف ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۶ء) "امام الاوفیاء" کہے جاتے ہیں، سید رشید رضا مرحوم (ف ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء) نے بھی اپنے استاذ محمد عبدہ کے ساتھ "حق وفا" کو خوب نباہا، ہمارے ملک میں یہ جنس گراں بہت نایاب ہے، حضرت سید صاحبؒ اسلامی ہند کے "امام الاوفیاء" کہے جا سکتے ہیں، استاذ کی رفاقت واطاعت سے لے کر استاذ کے ہم نشینوں اور دوستوں تک جس ذات گرامی نے عہد وفا کو نباہا، وہ وفا شعاروں کا قافلہ سالار نہ ہو تو کون ہو؟ اب دیکھیں کہ اس کے خوان علم کے زلہ ربا اس عہد وفا کو کس طرح نباہتے ہیں؟

تصوف اور فقہی مسلک کے علاوہ ایک دوسرا مسئلہ بھی اس دور میں ہمارے لئے پریشانی کا موجب رہا، ۱۳۳۱ھ ہی سے اسلامی ہند میں ایک نئی فکر بیدار ہو رہی تھی، جس نے ۱۹۴۱ء (۱۳۶۰ھ) میں ایک منظم دعوت وتحریک کی صورت اختیار کر لی، اور راقم بھی پورے ذوق وشوق اور انشراح صدر کے ساتھ اس میں شریک ہو گیا، اصولی اتفاق کے باوجود حضرت سید صاحبؒ کو اس کے متعلق کچھ شکوک وشبہات تھے، جس کی وجہ سے ہم عقیدت مندوں کے لئے بڑی مشکل کا سامنا تھا، بہرحال اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ یہ مشکل سد راہ نہ بنی اور جہاں تک استاذ مرحوم کی محبت وعقیدت اور ان کی طرف سے شفقت ومحبت کا تعلق ہے، اس میں بھی کوئی فرق نہ آیا، اور راقم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا رہا، اس سلسلہ میں سب سے بڑا مرحلہ ملازمت چھوڑ کر دار الاسلام پٹھان کوٹ جانے کا تھا، پہلے والد ماجد مدظلہ سے اجازت لی، اس کے بعد سید صاحب قبلہؒ سے اجازت کا سوال تھا، اتفاق سے سفر کے وقت لکھنؤ میں ملاقات کا پروگرام بن گیا، (اکتوبر ۱۹۴۲ء) شاہ معین الدین صاحب بھی اتفاق سے

وہیں موجود تھے وہ اور دوسرے دوست سید صاحب سے کہتے "آپ سے جانے نہ دیں" وہ فرماتے "میں کس طرح روکوں؟" اور میں خاموش اُن کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا، "کیوں آزردہ تو نہیں؟" محبت اور فرض کی کش مکش بڑی سخت ہوتی ہے "آخر الوداع کی ساعت آگئی، ہاتھوں میں ہاتھ لے کر فرمانے لگے "اب میں وہی ترکیب کروں گا، جو مولانا الیاس صاحب نے علی میاں کے لئے کی تھی" میں نے کہا "وہ کیا" فرمایا "الالتجاء الی اللہ" عرض کیا "اس کو کون روک سکتا ہے،؟" فرمایا اگر دعا قبول ہو گئی، "تو عرض کیا" تو پھر کیا؟ خود بخود واپس چلا آؤں گا، ——— ان لطیف جملوں کے بعد دیدۂ پرنم کے ساتھ رخصت فرمایا، اور میں نے اسے اپنی بڑی کامیابی خیال کی (۲۸ راکتوبر ۱۹۴۴ء)

——— اس کے بعد ایک مدت تک اس سلسلہ میں خط وکتابت ہوتی رہی، موضوع زیادہ تر تصوف ہوتا، اور کبھی کبھی جماعتِ اسلامی کے اخبارات اور بعض لکھنے والوں پر تنقید، خاکسار اپنی بساط بھر اس خلیج کے پاٹنے کی کوشش کرتا رہتا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ بالکل ناکام رہا ؟

سید صاحبؒ قبلہ میں مہمان نوازی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ وینہ پہنچ کر ہوتا، شبلی منزل میں وہ مصروف رہتے، دینہ میں نسبتہً فرصت ہوتی، وہاں وہ اپنے شاگردوں اور چھوٹوں کی بھی بڑی آؤ بھگت کرتے، حضرت الاستاذؒ کو آموں کا بہت شوق تھا، بڑے شوق سے اپنا باغ بھی لگایا تھا، ایک مرتبہ آموں کے موسم میں دینہ حاضری ہوئی تھی، الدین نعمانی میرے پٹنہ کے رفیق بھی ساتھ تھے، سید صاحب اپنے ہاتھ سے ایک ایک قاش کاٹ کر تقسیم فرماتے، ایک مرتبہ سید صاحب قبلہ کے ہاتھوں میں گٹھلی رہ گئی تھی صاحب نے ازراہ تواضع گٹھلی طلب کی، فرمایا آموں کے باب میں یہ تواضع نہیں"

پٹنہ میں حضرۃ الاستاذؒ نے ایک مرتبہ راقم کے غربت کدہ پر بھی قیام فرمایا، (۱۹۴۳ء) اپنی تنگ دامانی اور استاذ مرحوم کے معمولات کے پیش نظر کبھی اس تحریک کی خود جرأت نہ ہوئی، مگر اب کی سید صاحب قبلہ نے خود ہی اطلاع دی، مدرسہ اکزامنیشن بورڈ کی مجلس منعقد ہو رہی تھی، گرمیوں کا موسم تھا، راقم کا مستقر اجتماع گاہ سے بہت قریب تھا، شاید اسی وجہ سے غربت کدہ کا انتخاب ہوا ہو، بہرحال جونہی اطلاع ملی بڑی خوشی ہوئی

مگر ساتھ ساتھ فکر بھی دامنگیر ہو گئی کہیں تکلیف نہ ہو، بہرحال اپنی سی ہرممکن کوشش کی، مگر سچ یہ ہے کہ آرام و آسائش کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا، اسی موقع پر ایک دن ظہر کی نماز کے بعد کا ذکر ہے، ــــــ سید صاحب قبلہ اوراد و وظائف میں مشغول تھے، خاکسار اُن کے قریب گذرا، فرمایا "ٹھہرو، تم بہت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، یہ (اذکار کی) کتاب دیکھو، اس میں کونسی چیز خلاف سنت ہے؟" اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَب۔ عاجز نے چھوٹی سی مختصر کتاب (جس پر غالباً مناجات مقبول نام درج تھا) ہاتھ میں لی، اور درمیان سے ورق الٹا، تو ایک منظوم شجرہ پر نظر جم کر رہ گئی جس کی ردیف کے واسطے تھی اس گستاخ نے فوراً انگلی رکھ دی "یہ ہے توسل بالاموات" فرمایا کوئی اور چیز بتاؤ، عرض کیا "میری کیا مجال کہ خوردہ گیری کروں؟ یہ تو صرف تعمیل ارشاد کی گئی،

اس حکایت کے بیان کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرۃ الاستاذؒ کس قدر رواداں تھے؟ مسلک و رجحانِ فکر کی تبدیلی کے باوجود اُن کے علم نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا،

اسی طرح کا، لیکن اس سے بالکل الگ ایک واقعہ مکہ معظمہ میں پیش آیا، راقم ایک دن رباط بھوپال حاضر ہوا خاص قسم کی مجلس تھی، اور مجذوب صاحب کی غزل پڑھی جارہی تھی، میں بھی بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد سید صاحب نے فرمایا "تمہیں بھی شعر و شاعری کا ذوق ہے؟" عرض کیا اور ذرا جرأت کے ساتھ "ذوق تو آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے مگر خادم تو کسی اور چیز کی طلب میں حاضر ہوا کرتا ہے" اس پر میں نے طواف سے متعلق ایک سوال کیا، جس میں مفتوں سے الجھا ہوا تھا، اور حنفی مسلک کی تائید حدیث سے نہیں ہوتی تھی، سید صاحب قبلہ کچھ دیر غور فرماتے رہے، پھر مختلف کتابوں کی مراجعت کا مشورہ دیا، نیز مولانا عبدالوہاب دہلوی سے پوچھنے کو کہا، اتنے میں وہ صاحب جو ابھی ابھی غزل سنا رہے تھے، بولے "تم تو حنفی ہو، فقہائے حنفیہ کا مسلک معلوم ہو جانے کے بعد اتنی چھان بین کی کیا ضرورت" میرا جی جل گیا، اور عرض کیا "معاف کیجئے گا میں حنفی نہیں ہوں"، سید صاحب قبلہ مسکرائے اور اشاروں میں میرے اس مخلصانہ جواب کی داد دی،

غزل خوانی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک واقعہ مدینہ منورہ کا بھی سنا دوں، شاید اس کم سواد تحریر میں حجین

کے تذکرے سے کچھ آب و تاب پیدا ہو جائے، مدینہ منورہ میں بھی استاذ علیہ الرحمۃ کا قیام، رباط بھوپال میں تھا، ایک دن نو بجے صبح کو (اپنے یہاں کے وقت سے) حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں، غزل خوانی ہو رہی ہے، اور کلام خود استاذ کا ہے، دلچسپی سے سننے لگا، اتنے میں کسی صاحب نے دریافت کیا، یہ کلام کس دور کا ہے؟ سید صاحب قبلہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: یہ نہیں بتاؤں گا، میرے بعض عزیز ایک خاص دور کے بعد کا میرا کلام قبول نہیں کرتے، اتنے میں وہ صاحب بولے، پھر تو آپنے بتا ہی دیا، کلام کی مناسبت سے واقعات کی تاریخی ترتیب قائم نہیں رہ سکی، اور نہ اس تحریر میں اس اہتمام کی خاص ضرورت تھی،

اکتوبر ۱۹۴۶ء میں پنجاب آگیا تھا، دو تین ماہ چکر لگانے کے بعد جالندھر کی آب و ہوا، ساز گار نظر آئی اور وہیں اپنے کام کی طرح ڈال دی، اس دوران میں خط و کتابت برابر جاری رہی، شرف نیاز صرف ایک مرتبہ لکھنؤ میں حاصل ہوا، (جولائی ۱۹۴۵ء) راقم گھر جاتے ہوئے، مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے ندوہ ٹھہر گیا تھا، کچھ خیال یہ بھی تھا کہ عربی لٹریچر کی تیاری کا کام یہیں رہ کر کیا جائے، پورے برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کا کام کرنے کے لئے ندوہ سے اچھا ماحول اور بیش قیمت کتاب خانہ نہیں مل سکتا، سید صاحب نے مستقل قیام کی اجازت بھی دے دی تھی، مگر پھر ارادہ بدل گیا، اور تقسیم کے بعد تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔

(۶)

تقسیم کے بعد مدتوں حالات سے بے خبری رہی، اعزاء و احباب میری زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، اور عرصہ کے بعد استاذ محترم کو میری سلامتی کی خبر ملی، اور مراسلت شروع ہوئی، اس دور کے خطوط میں زیادہ تر نئی مملکت اور اس کی ہمسایہ ریاست کا حال پوچھتے، خاص طور پر ہر خط میں برادرم سید مظفر حسین ندوی اور ان کے اعزا و اقربا کی خیریت دریافت کرتے، بعض بعض خطوط کا انداز بیان بڑا لطیف ہوتا تھا، ان کے جواب بھی رمز و کنایہ کی زبان میں جاتے تھے،

اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کے قربان جائیے، چار سال کے بعد وفات ہوئی تو ارض حرم میں تین ہفتے کوئی

خبر بھی نہیں تھی، راقم عراق و نجد کا چکر لگا کر مکہ مکرمہ پہنچا، (ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ) تو ہمارے معلم شیخ عبدالرحمن مظہر نے سب سے پہلے خوشخبری سید صاحبؒ کی سنائی ان کے ایک معاون نے اس پر دریافت کیا "ندوی کسی خاندان کا نام ہے" میں نے کہا جی ہاں! بہت بڑا خاندان ہے" دوسرے ہی روز علی الصباح رباط بھوپال حاضر ہوا، اور سید مرحوم کی اس ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، پھر تو برابر حاضری ہوتی،

وہیں معلوم ہوا کہ سید صاحب کو پاکستان بلایا جا رہا ہے، پوچھنے والا ہی تھا کہ ایک روز خاص طور پر مجھے الگ بٹھا کر کچھ سرکاری کاغذات دکھائے، یہ حکومت پاکستان کی طرف سے تعلیمات اسلامی بورڈ کی صدارت قبول کرنے کی دعوت تھی، اس کے بعد میری رائے دریافت کی، عرض کیا: "ذاتی طور پر تو مجھے بہرحال آپ کی آمد سے خوشی ہوگی لیکن ڈر لگتا ہے کہیں آپ کے انتقالِ مکان سے ندوہ اور دار المصنفین کو نقصان نہ پہنچ جائے" اس پر وہ سوچ میں پڑ گئے پھر فرمانے لگے "تمہاری جماعت کا رویہ کیا ہوگا"؟ اس کا جواب میرے لئے بہت مشکل تھا، بہرحال اچھی طرح غور کرنے کے بعد عرض کیا، جماعت کی پالیسی تو امیر اور اس کی شوریٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن جہاں تک میں جماعت کے موقف کو سمجھا ہوں اسے آپ کی آمد اور صدارت قبول کرنے سے خوشی ہی ہوگی، اس طرح بورڈ کے اندر بھی ایک صحیح مسلک کی توضیح ہو سکے گی، اور حکومت کو من مانی کارروائیاں کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا ——
—— البتہ اگر آپ کی صدارت میں بورڈ نے کہیں کوئی ایسی سفارش کی جو جماعت کی نگاہ میں قابل قبول نہ ہوئی تو پھر ظاہر ہے کہ جماعت مخالفت کرے گی" آپ کی شخصی نہیں، بلکہ بورڈ کے فیصلے کی" کوئی نصف گھنٹہ گفتگو رہی اور رازداری کا عہد لے کر اجازت دی، اور یہ پہلا موقع ہے کہ یہ گفتگو کھول کر بیان کر رہا ہوں"

اتفاق سے اسی سال (۱۳۶۷ھ ۱۹۴۹ء) خواجہ شہاب الدین صاحب وزیر داخلہ (حال گورنر صوبہ سرحد) بھی حج کو آئے ہوئے تھے، وہ نماز عشاء سے پہلے اور بعد حنفی مصلّٰی کے پاس سید صاحبؒ کے پہلو میں بیٹھتے، اور دونوں میں روزانہ گفتگو ہوتی، خواجہ صاحب اور راز و نیاز کی قسم کی خالص مذہبی باتیں پوچھتے، اور حضرۃ الاستاذ امورِ مملکت اور زندگی کے دوسرے مسائل چھیڑتے، یہ شوریٰ اور مہذب مناظرہ دونوں کے درمیان برابر جاری رہا، سید صاحبؒ قیام

کا اپنا تاثر یہ تھا کہ یہ لوگ معذور ہیں، اور اپنی مخصوص تعلیم و تربیت کی وجہ سے سمجھ نہیں سکتے کہ دین ایک نظام زندگی کا نام ہے" خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ مجلس تعلیمات اسلامی کی صدارت قبول کرنے پر انھیں راضی کریں، سید صاحب نے انکار تو نہ کیا، مگر خواجہ شہاب الدین جیسا ہوشیار انسان بھی سید صاحب سے زبان نہ لے سکا، یا عام زبان میں کوئی (Commitment) نہ کرا سکا، ہمارے بعض احباب حضرۃ الاستاذؒ کو سادہ لوح سمجھتے تھے، یہ خیال خود سادہ لوحی پر مبنی تھا، اُن کی سب سے بڑی خوبی یا کمزوری صرف اُن کی حد سے بڑھی ہوئی شرافت اور مروت تھی، معاملہ فہمی میں وہ کسی بڑے ذہین سے ذہین اور تجربہ کار سے تجربہ کار آدمی سے کسی طرح کم نہیں تھے،

یہ پاکستان آنے کی تمہید تھی حسن اتفاق کہ جس دن حضرت سید صاحب قبلہؒ، دہلی سے لاہور تشریف لائے ہیں، راقم لاہور میں موجود تھا لیکن ان کے اس پروگرام سے بالکل بے خبر۔ مولانا مودودی، اور اُن کے رفقاء مولانا امین احسن اصلاحی اور میاں طفیل محمد صاحب بیس ماہ کی نظر بندی کے بعد تازہ تازہ رہا ہوئے تھے، (اواخر مئی ۵۰ء) اور جماعت کی مجلس شوریٰ منعقد ہو رہی تھی، (جون ۵۰ء / اواخر شعبان ۱۳۶۹ھ)۔

انہی دنوں ایک روز مغرب کے بعد ہم لوگ دفتر جماعت اسلامی (مرکز) کے باہر کھلے صحن میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ دفتر کوثر سے فون پر اطلاع ملی، "مولانا سید سلیمان آئے ہوئے ہیں، اور کل صبح مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور مسعود عالم سے ملنے کے لئے آئیں گے" خبر پا کر جو مسرت ہوئی، اس کا کیا پوچھنا؟ مگر فکر یہ ہوئی کہ کسی طرح اڑ کر دفتر کوثر پہنچ جاؤں، مگر رات کو چار میل کی مسافت کس طرح طے کی جائے؟ آخر علی الصباح اپنے ایک رفیق رانا اللہ داد خاں کی موٹر پر مولانا اصلاحی کو اُن کے گھر سے لیتے ہوئے، دفتر کوثر پہنچے، سید صاحب قبلہ ابھی چائے سے فارغ ہوئے تھے، اور انتظار ہی کر رہے تھے، تھوڑی دیر میں ادھر وہ واپس آگئے، مولانا مودودی کے دفتر میں نشست ہوئی، اندر صرف ہم چار آدمی تھے[1]، اور تمام ارکان شوریٰ اور رفقاء مرکز باہر برآمدے میں بیٹھے رہے باتیں دیر تک ہوتی رہیں، سید صاحبؒ نے مولانا مودودی کو عرصہ کے بعد دیکھا تھا، کہنے لگے، اب تو ماشاء اللہ

---

[1] سید صاحب قبلہ، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور خاکسار،

آپ کی داڑھی خوب بڑھ گئی ہے" پھر نعیم صاحب کو دریافت کیا، وہ بلائے گئے، اور اُن کی پیٹھ ٹھونکی، اور دینی خدمات کی انجام دہی پر مبارک باد دی، اتنے میں رفقاء کا تقاضا ہوا کہ باہر تشریف لائیں، تاکہ سب لوگ نیاز حاصل کرسکیں، باہر برآمدے میں بھی دیر تک نشست رہی، وہاں سید نقی علی صاحب علوی (جو ان دنوں "تسنیم" کے اسٹاف رپوٹر مقرر ہوئے تھے، اور آج کل سنٹرل جیل میں نو سال کی قید کاٹ رہے ہیں) نے کچھ سوالات کئے، اور تسنیم کے لئے اچھا خاصا انٹرویو تیار کرلیا،

اس وقت تو سید صاحب قبلہ خیرسگالی کے وفد میں آئے تھے، واپسی کا عزم مصمم تھا، مگر کراچی جاکر کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی، یا کردی گئی کہ وطن مالوف کو نہ لوٹ سکے،

پاکستان نے حضرت الاستاذ کی آؤ بھگت میں کمی نہیں کی، سرکاری اور غیر سرکاری، ہر حلقہ میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، حکومت کی ہر ایسی چھوٹی بڑی کمیٹی جس میں اسلامی نگاہ کی نمایندگی مطلوب ہوتی، اس کی رکنیت اُن کو پیش کی جاتی، اور وہ اس میں شریک ہوتے، اپنے مفید مشوروں اور تجربوں سے کمیٹی کی مدد کرتے، دستور ساز اسمبلی کی مجلس تعلیمات اسلامی سے پہلے تو الگ رہی، لیاقت علی خان مرحوم نے بہت ترغیب دی، مگر سید صاحب ضمانت (Assurance.) چاہتے تھے کہ بورڈ کے مشورے قبول کئے جائیں گے، مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بورڈ کی صدارت قبول کرلی، اور ہمارے نقطۂ نظر سے بھی ان کا قبول کرنا اچھا رہا، "ہمارے نقطۂ نظر" سے مراد پاکستان میں اسلامی دستور کیلئے جدوجہد کرنے والوں کا نقطۂ نظر ہے،

سید صاحب کبھی کبھی پنڈی بھی تشریف لاتے، دو مرتبہ دارالعروبہ کی بھی عزت افزائی ہوئی، ایک مرتبہ استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی[1] (حال پروفیسر بون یونیورسٹی جرمنی) کی موجودگی میں، جب کہ وہ عراق سے کچھ دنوں تفریح کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے، (اگست ۱۹۵۱ء)

میرا بھی کبھی کبھی کراچی جانا ہوتا، اور سید صاحب کے دولت کدہ پر دلچسپ صحبتیں رہتیں، اس موقع پر فروری ۱۹۵۱ء کی

[1] ہلالی صاحب کا مستقل قیام بغداد ہی ہے، اس سال بون یونیورسٹی نے عراقی حکومت سے ان کی خدمات مستعار لی ہیں،

کی ایک دعوت نہین ہوتی، بہار کی تیوہاری اور سیخ کباب کا مزا کبھی ہونے ہی کا نہین، حکیم نصیرالدین صاحب ندوی اور خاکسار نے خاص طور پر کبابون ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، حضرۃ الاستاذ ہماری اس بے تکلفی اور طفلانہ حرکت سے بہت محظوظ ہوئے،

مارچ ۵۳ئہ مین اس گنہگار کو بھی بے گناہون کے ساتھ سرکاری مہمان خانہ کی ضیافت نصیب ہوئی، حضرۃ الاستاذ پر اس کا بہت اثر ہوا، بار بار عزیزی محمد عاصم صاحب رفیق دارالعروبہ سے خیریت دریافت کرتے، جیل مین بھی دو والانامے ملے جن سے بڑی مسرت اور طمانیت حاصل ہوئی، پر افسوس کہ رہائی کے بعد (اگست ۵۳ئہ) پھر نیاز نہ حاصل ہوسکا، اور اس سے زیادہ افسوس کہ آخری دنون مین حضرۃ الاستاذ کی علالت سے بھی بے خبر رہا، اسے قسمت کی ستم ظریفی کے سوا اور کیا کہا جائے کہ جیل مین اچھا خاصا رہا، مگر رہائی کے بعد مرض (دمہ) کے مسلسل اور سخت حملے ہونے لگے، اور نومبر (۵۳ئہ) کے آغاز مین تو ایسا حملہ ہوا کہ اپنی بیماری کی پچیس سالہ زندگی مین کبھی ایسا حملہ نہین ہوا تھا، دو تین ماہ ذمی فراش رہا، ایک دوست کو کراچی لکھا کہ استاذ محترم کی خدمت مین حاضر ہوکر دعا کی درخواست کیجئے، (۱۳ر نومبر ۵۳ئہ) مگر ہونا کچھ اور لکھا تھا، مین بستر علالت پر روزانہ کراچی سے جواب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ ۲۲ر نومبر کی شب (۱۴ر ربیع الاول ۷۳ئہ) کو ۸½ بجے ایک اخبار کے نمایندے نے آکر وفات حسرت آیات کی اطلاع دی، اناللہ وانا الیہ راجعون ۔

ایتھا النفس اجملی جزعاً　　　ان ما تحذرین قد وقعاً

تعزیت کے لئے بھی کراچی نہ جاسکتا تھا، چلنے پھرنے کی سکت بھی نہین تھی، کئی ہفتون کے بعد جاکر سفر کے قابل ہوا، دسمبر کی ۱۰ر کو کراچی پہنچا، اور برادرم ابوعاصم صاحب اور سلمان میان سلمہ اللہ کی معیت مین اس قطعۂ ارض کی زیارت کی، جہان استاذ مرحوم کا جسد خاکی مصروف استراحت ہے، اللہ تعالیٰ اُن کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے اور انھین اعلیٰ علیین مین جگہ دے،

اب ہمارے نصیبون مین ماتم ہی ماتم ہے، جو جگہ خالی ہوتی ہے وہ پر نہین ہوتی، ہائے شبلی منزل کی

وہ دوگز زمین جسے استاذ مرحوم نے اپنی آرام گاہ کے لئے پسند فرمایا تھا، وہ اپنے استاذ کے پہلو میں استراحت کرنا چاہتے تھے، مگر قدرت انھیں ایسی جگہ لے آئی، جہاں ساحل عرب کی ٹھنڈی ہوائیں صبح و شام آیا کرتی ہیں، شاید ان کے تحت الشعور میں کوئی ایسی آرزو رہی ہو،

"یہ نقوش اور تاثرات" نہایت عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں، اس سے اپنی تعریف مقصود نہیں دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے، مطلوب یہ ہے کہ غلطیوں اور فروگذاشتوں سے درگذر کیا جائے، اس تحریر میں جو تاریخیں درج کی گئی ہیں، یا جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، وہ سب اپنے کمزور حافظے کے سہارے ان میں غلطی کا بہت کچھ امکان ہے، اگر کسی دوست کو ایسی فروگذاشت محسوس ہو، تو ضرور مطلع کریں، عنایت ہوگی، اسی طرح جہاں جہاں حضرۃ الاستاذ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ اکثر و بیشتر روایت بالمعنی ہیں، اصلی الفاظ یاد رکھنا میرے بس سے باہر تھا، البتہ واقعات و اقوال کی صحت کا پورا اطمینان ہے،

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین،

دلفگار

"مسعود عالم ندوی"

مولانا سید سلیمان ندوی میری نظر میں

از

جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم اے پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم، اور صاحب طرز انشا پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے جس سے مولانا کا اصل مقام، اور مرتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ اُن کا صحیح حق ادا ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر، اور بالخصوص اس کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو، یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر و استدلال، اور تہذیبی امیال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور اُن کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے، اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا، اور اُس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سیادت بخشی ہے، اس کی نظیر آج پورے عالم اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی، اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے،

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے نامور استاذ مولانا شبلی کے زیر سایۂ عاطفت جب تصنیف و تالیف کا قلم سنبھالا، تو یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تعلیم یافتہ مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک قدیم تعلیم یافتہ یعنی علماء اور دوسرا جدید انگریزی تعلیم یافتہ گروہ، دونوں کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ تھا، اور صرف اتنا ہی نہیں،

بلکہ دونوں میں رقابت تھی، ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتا تھا، علماء کی علمی کوششوں اور تحریری و تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ چند فروعی اور جزئیاتی مسائل، یا متون درسیہ کے شروح و حواشی تک محدود تھا، تصنیف و تالیف کی زبان صاف، دلچسپ اور رواں نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اُن کے ساتھ نہ کوئی دلچسپی تھی، اور نہ اس کی نگاہ میں ان مسائل و مباحث کی کوئی اہمیت تھی، مغربی علوم و فنون اور انگریزی تعلیم نے اسلامی مسائل سے متعلق طرز فکر و بحث میں جو تبدیلی پیدا کردی تھی، علماء کو نہ اس تبدیلی کا احساس تھا، نہ اس تبدیلی کے اسباب سے ان کو واقفیت تھی، اور نہ ان کی زبان و قلم وقت کے جدید طرز سخن سے آشنا تھی،

دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ چونکہ سرسید کی آخری عمر کی پالیسی جو مسٹر بیک پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے زیر اثر تھی، اس سے کافی متاثر تھا، اس بنا پر اس کے دل و دماغ پر انگریزوں کی نقالی اور ان کی تہذیبی و تمدنی تقلید کی دھن سوار تھی، اس جنون میں اس کو نہ مذہب سے لگاؤ تھا، نہ دینی اور قومی روایات سے دلچسپی تھی، اور نہ قومی تہذیب اور کلچر کی اس کے دل میں عظمت تھی، مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اگر اسے تھوڑی بہت کچھ واقفیت تھی بھی، تو اس کی معلومات کا ذریعہ خود مسلمان مصنفین کی کتابوں کے بجائے یورپ کے متعصب مصنفین یا مستشرقین کی تصنیفات تھیں، جو علمی تحقیق اور ریسرچ کے پردہ میں اسلام کی روایات حسنہ کو بھی اسی طرح پیش کرتے تھے کہ ایک مسلمان اسے پڑھکر شرم سے گردن جھکا لیتا تھا، اور اس کے دل میں اپنی تاریخ سے نفرت پیدا ہوجاتی تھی، اس طرح دونوں گروہوں کی راہ منزل مقصود سمت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتا تھا، طنز و تعریض کرتا تھا، اور ان میں اختلاف و افتراق کی ایسی وسیع خلیج حائل تھی جس کا دور کرنا آسان نہیں تھا، (۱)

وقت کی ملی اور قومی ضرورتوں کا تقاضا تھا کہ دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، ان میں صلح کراکے مصافحہ کرایا جائے، تاکہ دونوں باہمی اشتراک عمل سے وقت کے جدید تقاضوں کو پورا کرسکیں،

اس کی صورت بجز اس کے کچھ اور نہین ہوسکتی تھی کہ ایک طرف تعلیم قدیم کے نصاب مین تغیر و تبدل کرکے ایسے علما پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، جو صرف فروعی اور جزئیاتی مسائل مین ہی وقت صرف کرنے کو دین کی سب سے بڑی خدمت نہ سمجھتے ہون، بلکہ تعلیم جدید نے اسلام اور اسکی تعلیمات و روایات سے متعلق جو صدہا نئے قسم کے سوالات و مباحث پیدا کر دیئے تھے، اون پر وقت کی زبان مین گفتگو کر سکتے، اور اسلام کے نمایندہ کی حیثیت سے بزم نو کے ارکان کو خطاب کر سکتے ہون، اور دوسری طرف ضرورت تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ پر مغربی علوم و فنون اور انگریزی تعلیم سے جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اور جس کے باعث وہ خود اپنی تاریخ، کلچر تہذیب و تمدن اور روایات سے متعلق احساس کمتری مین مبتلا تھا، اوس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی. اس سلسلہ مین کرنے کے اصل کام دو تھے ایک یہ کہ علی گڈھ کے نصاب تعلیم مین عربی فارسی اردو، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ و دینیات، یہ مضامین بھی شامل کرائے جاتے، اور دوسرا کام یہ تھا کہ صاف ستھرے، اور دلچسپ و دلنشین انداز بیان و زبان مین مغربی مذاق تحقیق و تصنیف کے مطابق اسلامی مسائل و مباحث اور اسلامی تاریخ و تمدن پر کتابین لکھ کر شائع کی جاتین تاکہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ بھی ان کو پڑھ کر فائدہ حاصل کر سکے۔

مولانا شبلی جو قدرت کی طرف سے ایک بڑا احساس دل اور بیدار دماغ لے کر پیدا ہوے تھے، انھون نے ان دوگونہ ضرورتون کو محسوس کیا، اور علی گڈھ کو خیرباد کہکر ہمہ تن اس کام مین لگ گئے تقاضاے وقت کے مطابق علما پیدا کرنے کی غرض سے وہ ندوۃ العلما سے وابستہ ہوگئے. جو خاص اسی غرض سے قائم ہوا تھا، اور تربیت یافتگان سرسید کی خصوصاً اور عام مسلمانون کی عموماً ذہنی اصلاح کے لئے انھون نے تاریخ و فلسفۂ اسلام کو اپنا خاص موضوع بنا کر کتابین لکھنی شروع کین اس سلسلہ مین اور سب چیزون سے قطع نظر؛ مولانا نے اردو پر جو احسان عظیم کیا ہے، وہ کبھی فراموش نہین کیا جا سکتا، جو زبان اب تک صرف شعر و شاعری یا افسانہ خوانی و داستان طرازی کی زبان تھی، اس کو ایک نہایت باوقار مگر ساتھ ہی دلچسپ و شگفتہ علمی زبان بنا دیا، اور بحث و تحقیق، تنقید اور جمع و ترتیب معلومات کے اعتبار سے اردو اب تک جس جدید مغربی انداز تصنیف سے ناآشنا تھی

مولانا نے اس کو اس سے مالا مال کر دیا،

مولانا شبلی نے جو پودا لگایا اور جس درخت کا بیج بویا تھا، اگرچہ ان کی زندگی میں برگ و بار لانے لگا اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پودے کو ایک تناور درخت بنانے میں سب سے بڑا دخل انہی کے جانشین و تلمیذ خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، انھوں نے جس طرح اس تحریک کو چلایا، اس کو کامیاب بنانے کے لئے جو راہ (مصنوعی طور پر نہیں بلکہ فطری اور طبعی طور پر) اختیار کی، سچ یہ ہے کہ وہ مولانا شبلی کے بس کی بات بھی نہیں تھی،

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی، انھوں نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے، اور عملی بھی، انھوں نے نثر کے میدان میں بھی گوہر لٹائے، اور نظم کے سبزہ زار میں حسن تخیل، لطافت بیان اور جذبات و اثر کے پھول کھلائے، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی یہاں تک کہ سیاسی اور تعلیمی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو متاثر کیا، اور سب پر کچھ نہ کچھ اپنا نقش چھوڑا، آج ہم واضح طور پر ان وسیع اثرات و نقوش کو ہر جگہ محسوس کر سکتے ہیں لیکن بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی بنا پر جن میں سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتاد مزاج سے تھا، مولانا شبلی کو نہ قدیم الخیال علما کا پورا اعتماد حاصل ہو سکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کا، مولانا نے الکلام علم الکلام اور سیرت النبی میں بعض خاص بحثیں اپنے نقطۂ نظر سے لکھی تھیں، علماء کا طبقہ ان کو برداشت نہ کر سکا، یہاں تک کہ خود ان کے سب سے بڑے قدردان اور مداح نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی بھی اُن کی تحریک ندوہ کے مخالفوں میں ہو گئے[1]، اور اس پر جو طوفان برپا ہوا، اور مولانا پر جس طرح اس طبقہ کی طرف سے حملے ہوئے وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہیں،

رہا تعلیم جدید کا گروہ، تو چونکہ یہ گروہ سرسید کے زیر اثر تھا، اور مولانا شبلی سرسید کی سیاسی بلکہ ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے، اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ مولانا کو

اس طبقہ کا پورا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا تھا، علاوہ برین بعض کوتاہ نظروں نے خواہ مخواہ مولانا شبلی کو خواجہ حالی سے ٹکرا دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جدید کے لوگون مین ایک مستقل گروہ ایسا پیدا ہو گیا جس کا سب سے محبوب ادبی مشغلہ خواجہ حالی کی جا و بیجا مدح سرائی اور منقبت کرنا، اور ساتھ ہی مولانا شبلی پر مختلف دروازون سے حملہ کرتے رہنا تھا، چنانچہ تنقید شعر العجم عطیہ فیضی کے نام مولانا شبلی کے خطوط وغیرہ کتابون اور ان جیسے مضامین ومقالات کی اشاعت اسی طبقہ کی اندرونی کوششون اور سرگرمیون کی رہین منت ہے،

ان حالات اور اس ماحول مین مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ ان کو مولانا سید سلیمان ندوی کی شکل مین ایک ایسا شاگرد مل گیا جو وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق، دقیقہ رسی، اور علم وفضل مین استاد کا صحیح جانشین تھا، اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیان اور کمالات رکھتا تھا، جو اسی کا اپنا حصہ تھے، اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رو اور سبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط واعتدال سے منحرف نہین ہوتا تھا، اس کی طبیعت مین متانت وسنجیدگی اور علم وبردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے خامۂ گوہر فشان کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیظ وغضب کے تیور ظاہر نہین ہوتے تھے، تشرع، تدین، بلکہ تقشف اس کی قبائے علم کا تکمۂ زرین تھا، جس کے باعث کسی مسئلہ مین اختلاف کے باوجود جماعت علماء کو بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہین ہو سکتی تھی، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج مین استقلال، طبیعت مین صلح پسندی، مزاج مین سکنت تھی، فکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی، ہان خداداد اوصاف وکمالات کے باعث وہ جس محفل مین بھی بیٹھا، صدر بزم ہو کر رہا، جس انجمن مین بھی شرکت کی شمع انجمن کہلایا،

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف وکمالات تھے جن کے باعث جہان مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے، اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا، وہ ان کے استاد کو حاصل نہین ہو سکا تھا، علماء نے ان پر اپنے اعتماد کلی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے

سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے، ایک عرصہ تک اوس کی مجلس عاملہ کے سربرآوردہ ممبر رہے، جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اہتمام دلی میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ہوئی تو اس کے صدر بھی وہی ہوئے، خود ندوۃ العلماء کی وہ سرزمین جو مولانا شبلی پر تنگ ہوگئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے اُس نے عزت واحترام کے ساتھ اپنی آغوش کھول دی، پھر علماء خواہ کسی مسلک خیال کے ہوں مولانا کا ہر ایک مسلک کے علماء میں بڑا وقار اور درجہ تھا، اور سب دل سے مولانا کے علم وفضل کے مداح ہونے کے ساتھ اُن کے اخلاق وفضائل کے قدردان تھے، دوسری طرف جس علی گڈھ کو مولانا شبلی نے حالات سے تنگ اور مجبور ہوکر خیر باد کہا تھا، اُسی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور اسلامی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ مولانا کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے پر فخر کیا، علاوہ بریں وہ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے اور اس کی بعض اور مجلسوں کے رکن رکین ایک مدت تک رہے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو مولانا کی ذات کے ساتھ جو عقیدت وارادت تھی، اس کا اظہار مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہما کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے، جو ان دونوں بزرگوں نے مولانا کو لکھے ہیں، مولانا محمد علی کے خطوط میں تو خیر بڑی عقیدت اور جوش ارادت کا ہی اظہار ہے لیکن ڈاکٹر اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مسائل ومباحث پر غور کرتے وقت انھیں جب کبھی کوئی الجھن اور دقت پیش آتی تھی، تو وہ فوراً مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کو مولانا کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی، اس کا عملی اظہار انھوں نے اس طرح بھی کیا کہ ادارۂ معارف اسلامیہ جس کے بانی خود ڈاکٹر صاحب تھے، اس کے اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت انھوں نے مولانا کو پیش کی، اور پھر صدارت کی تحریک کرتے ہوئے انھوں نے جو الفاظ مولانا کی نسبت کہے تھے وہ اُن کے دلی جذبات ارادت کے آئینہ دار تھے، انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اعتماد کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ خلافت کا وفد انگلستان گیا تو مولانا اوس کے رکن تھے، حجاز کی موتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے خلافت کا جو وفد گیا تھا، جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی جیسے لوگ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے

نمایندے تھے، مولانا اس وفد کے رئیس و امیر تھے، ان کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری یونیورسٹیاں اور ان یونیورسٹیوں کے مختلف علمی اور ادبی ادارے مولانا کو بار بار بلاتے رہتے، اور ان کے چشمۂ علم و فضل سے سیراب ہوتے رہتے تھے،

اس اعتماد کے باعث مولانا کی تصنیفات و تالیفات، مضامین و مقالات، تقریریں اور خطبات دونوں تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول و پسندیدہ تھے، ہر ایک ان کی قدر کرتا، اور ان سے فائدہ اٹھاتا تھا، اس طرح مولانا شبلی کی تحریک کا جو اصل مقصد تھا، وہ باحسن وجوہ تکمیل کو پہنچا یعنی ایک طرف علماء کرام نے کتب درسیہ کے متون و حواشی اور منہیات و شروح کے دائرہ سے باہر نکل کر علماے سلف کے علمی کارناموں کا جائزہ لینا شروع کیا، ان میں ذوق تحقیق و جستجو پیدا ہوا، تاریخ جس کو انھوں نے اپنے لئے شجر ممنوعہ بنا رکھا تھا، اور اگر اس کی طرف توجہ بھی ہوتی، تو اس کا دارو مدار علامہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفاء پر تھا، اسکی طرف متوجہ ہوتے، فلسفہ، تاریخ کا ذوق بڑھا، واقعات کی تحقیق و تنقید کا جذبہ ابھرا، اسلامی علوم و فنون کے بہت سے گوشے تھے، جن کی طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی تھی، ان کی طرف بھی رجحان ہوا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وقت کی زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامیات سے دلچسپی ہوئی، قومی روایات کا احترام اور ان کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مغربی مصنفین کی غلط بیانیوں نے اسلامی تاریخ و ثقافت سے متعلق جو نقوش بد ان کے دل و دماغ میں جما دیئے تھے، وہ مٹنے لگے، اور اب خود ان میں مستند و نافع معلومات کی روشنی میں اسلامیات پر ریسرچ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا اور اس طرح انھوں نے استادان مغرب کی اندھی پیروی سے نجات پائی، آج ہم میں کتنے ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہیں جن کا موضوع تحقیق و تصنیف، اسلامی علوم و فنون، اسلامی دینیات اور اسلامی ادبیات ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس عام فضا کے پیدا کرنے میں مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی اور اسلامی کارناموں کو بہت بڑا دخل نہیں ہے،

اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کے احسانات دونوں طبقوں پر ہیں، اور چونکہ ان دونوں کو مولانا نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا، اور ان میں علمی و دینی ارتباط و اتفاق پیدا کر کے انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ باہمی اشتراک و تعاون سے اسلام کی اور مسلمانوں کی بیش از بیش مفید تر خدمات انجام دے سکیں، اس بنا پر مولانا کا احسان تمام مسلمانوں پر بھی ہے، اس عام فیضان و احسان کے علاوہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ مولانا طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے یونیورسٹیوں کے ایوانوں کے بجائے مدرسہ کی چٹائیوں پر بیٹھ کر علم حاصل کیا تھا، اور وہ اپنی وضع قطع شکل و صورت، لباس اور عادات و اطوار ہر لحاظ سے کٹر قسم کے تعلیم قدیم کے فرد تھے، اور اُن کو اس میں اتنا غلو تھا کہ تعلیم جدید کے حضرات کی بڑی بڑی انجمنوں میں بیٹھ کر بھی اپنی مولویت کو چھپاتے نہیں، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے، اور جب کبھی موقع ملتا تھا، ایک مخصوص لطیف پیرایہ میں چٹکیاں بھی لے لیا کرتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کو یاد ہے ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ (غالباً ۲۶ء میں) امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا، میں اس زمانہ میں طالب علم تھا، اور لاہور میں مقیم تھا، لاہور سے میں اور ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی جو ڈاکٹر اقبال مرحوم سے خاص تقرب رکھتے، اور اُن کے ایڈیکانگ کی حیثیت سے رہتے تھے، اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے امرتسر پہنچے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے، میں اور چغتائی صاحب مغرب کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی قیامگاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے، تو مولانا نے علیک سلیک کے بعد چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا، کیوں ماسٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) تشریف نہیں لائیں گے، چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا، تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا، اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا، یہاں سب علماء جمع ہوں گے اُن کو سنانے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہوگا، چغتائی صاحب معلوم نہیں سمجھے، یا نہیں، لیکن دہلی اور لکھنؤ کے جو حضرات اس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے مولانا کے اس فقرہ سے بڑا لطف لیا،

غالباً ۳۹ء یا ۴۰ء کی بات ہے، ایک مرتبہ دہلی میں تشریف فرما تھے، اسی اثناء میں حسب معمول

ازراہ شفقت بزرگانہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر واقع قرول باغ میں ایک دن شام کے وقت تشریف لائے، ہم سب بیٹھے چائے پی رہے تھے، اور مولانا کی شفقت آمیز باتوں اور مشوروں سے مستفید ہو رہے تھے کہ اتنے میں ملک کے ایک مشہور صاحب قلم جن کا رجحان تجدد کی طرف تھا، اور جن کا ایک مقالہ "برزخ" کی بحث پر حال میں ایک علمی مجلہ میں شائع ہو چکا تھا، اچانک دفتر برہان میں آ نکلے، مولانا نے انھیں دیکھا تو نیم استادہ ہو کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، اور مسکراتے ہوئے فرمایا "السلام علیکم یا اھل البرزخ" وہ تو یہ سن کر کچھ جھینپ سے گئے لیکن مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کے اس فقرہ نے کہا کہ دنیا میں جنت کہاں ہے؟ فضا کو صاف کر دیا، اسی مجلس میں مولانا نے اپنی سیرت النبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ سیرت پہلی، اور دوسری جلد میں ختم ہو گئی، اب سیرت کہاں ہے؟ یہ تو سب اسلامی تعلیمات ہیں جن پر باقی جلدوں میں بحث ہوئی ہے، تو بھئی اصل بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کسی ایسی کتاب کو پڑھتے ہی نہیں جس میں خالص دینی اور مذہبی بحثیں ہوں، وہ صرف تاریخ اور سیرت سے مانوس ہیں، اس لئے میں نے دراصل عنوان سیرت کا ہی رکھا ہے، اور اس بہانہ چاہتا ہوں کہ ان حضرات کو اسلام کی تمام دینی اور اخلاقی تعلیمات اور ان کے احکام و مسائل سے واقف کر دوں، اس طرح گویا میں نے بچوں کی طرح اپنے اصل مقصد کے چہرہ پر ایک مٹی کا مصنوعی چہرہ لگایا ہے، تاکہ ان حضرات کو توحش نہ ہو، اور وہ سیرت محمدیہ کے ساتھ ساتھ شریعت محمدیہ سے بھی واقف ہو جائیں۔

بہرحال اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ مولانا علماً و عملاً صورۃً و شکلاً ظاہراً و باطناً ایک عالم دین تھے، انھوں نے جو کچھ کیا، اسی حیثیت سے کیا، اور اپنے عالمانہ وقار کو ہر جگہ اور ہر موقع پر برقرار رکھا، اس بنا پر طبقۂ علما کو ان کا خاص طور پر ممنون و شکر گذار ہونا چاہئے کہ ان کے ایک فرد فرید نے یونیورسٹیوں کی علمی مجلسوں ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاسوں اور ادبی و تحقیقاتی اداروں کے جلسوں کی صدارت کر کے، اور اسلامی علوم و فنون کے علاوہ دوسرے علمی، ادبی، تاریخی، اور سیاسی مسائل و مباحث پر محققانہ تصنیفات و مقالات لکھ کر صرف اپنے آپ کو سرفراز و سربلند نہیں کیا، بلکہ تعلیم جدید کے حضرات کے دل و دماغ پر پورے طبقۂ علما اور مدارس عربیہ کی علمی تحقیقی سیادت

گنجائش بھی ثبت کر دیا، ورنہ ظاہر ہے ان علمی مجلسوں میں علما کا گذر ہی کہاں تھا!

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان خدمات علم و دین کا ایک بڑا روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا خود ہی نہیں کیا، بلکہ ان ہی مدارس عربیہ کے پڑھے ہوئے اور بوریہ نشین علماء میں سے ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جو ارباب قلم بھی ہیں، اور علم و تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی، اسلامیات کے نبض شناس بھی ہیں، اور ادبی مسائل و معاملات کے نکتہ دان و نکتہ سنج بھی، واقعہ یہ ہے کہ خود مصنف اور محقق ہونا اس قدر مشکل نہیں ہے جتنا کہ مصنف گر اور محقق ساز ہونا ہے، مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی قدرت نے اس کا خاص ذوق اور ملکہ عطا فرمایا تھا، اور اُن میں دوسروں کی علمی نگرانی و رہنمائی کا بڑا جذبہ تھا، دارالمصنفین، مولانا جس کے ناظم اعلیٰ اور سرخیل و امام تھے، اس کا تو خیر قیام ہی اسی مقصد کے لئے ہوا تھا کہ ارباب قلم علما، اور محقق مصنفین پیدا ہوں، اس بنا پر اس ادارہ کے ارکان و رفقا کو تو مولانا کے فیضان تعلیم و تربیت سے بلاواسطہ و براہ راست بہرہ مند ہونے کا شرف حاصل تھا ہی لیکن اس ادارہ سے باہر ملک کے دور دراز گوشوں میں جو نوجوان علمی ذوق رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں مولانا سے استفادہ کرنا چاہتے تھے، مولانا نے کبھی اُن کی امداد و اعانت میں دریغ نہیں فرمایا، اور بڑی خوشی سے جو علمی رہنمائی بھی وہ کر سکتے تھے، وہ کرتے تھے، خود راقم الحروف کو یاد ہے غالباً ۲۷ء میں جب کہ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والا تھا، میں نے مولانا کو ایک خط لکھا کہ میں کچھ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دو تین سال دارالمصنفین میں آپ کے زیر تربیت رہکر اپنے اس ذوق کی تکمیل کروں تو کیا یہ صورت ممکن ہے؟ مولانا نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دارالمصنفین کے قواعد و ضوابط کی ایک کاپی ارسال کر دی، اور افسوس کے ساتھ تحریر فرمایا کہ بالفعل کسی معاوضہ پر یہاں قیام کی کوئی صورت نہیں ہے، "ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً" اس کے بعد لکھا کہ بہرحال آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ مجھ سے جو فائدہ یہاں رہکر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنی جگہ پر رہتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں، آپ جس عنوان پر لکھنا چاہیں، مجھکو اس سے مطلع کر دیں، میں بتا دوں گا کہ اس عنوان سے متعلق مواد کہاں

گمان ملے گا، اسے کس طرح جمع اور کس طرح مرتب کرنا چاہیئے اور پھر جب آپ مقالہ تیار کرلیں، تو میرے پاس بھیج دیجئے، میں اس میں اصلاح کردیا کروں گا۔"

اس واقعہ کے دو تین سال بعد کا ذکر ہے، اس زمانہ میں میرے اسی قسم کے مضامین و مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے، لیکن مجلۂ معارف کی جو عظمت میرے دل میں تھی، اس کی وجہ سے شوق تھا کہ کبھی معارف میں بھی میرے نام سے کوئی چیز شائع ہو، اس معیار کا کوئی مقالہ تو لکھا نہیں گیا، ایک نظم لکھی تھی جو بعد میں پنجاب کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوگئی تھی، اس نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف کے معیار کے مطابق ہے، فوراً مولانا کی خدمت میں ارسال کردی، مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا "آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے، یہ آپکے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجئے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہوسکتی ہے، اور یہی ہونی چاہئے، مولانا کے اس گرامی نامہ کا میرے دل پر خاص اثر ہوا، اور مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے مولانا کے اس مکتوب گرامی کے جواب میں یہ شعر لکھا تھا،

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشم غفلت کھل گئی

بہرحال حق یہ ہے کہ ارباب قلم و تحقیق علماء کی ایک جماعت پیدا کرکے مولف نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے وہ آج پورے عالم اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے، ورنہ عہد حاضر کے ترکی، مصر، ایران، شام و بیروت، اور افغانستان پر نگاہ ڈالئے، تو معلوم ہوگا کہ مغربی طرز پر تحقیق و تصنیف کا جو کام بھی ہو رہا ہے، اسے جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی انجام دے رہا ہے، طرز قدیم کی تعلیم کے حامل جو حضرات ہیں وہ اب تک اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور سیاست و دینیات کے حلقہ کردوں سے باہر نکل کر نئی دنیا کی آب و ہوا سے زیادہ آشنا نہیں، اس کا

یجہ یہ ہے کہ ان ملکون کے جدید تعلیم یافتہ حضرات پر اسلامی تہذیب و ثقافت اور تمدن و معاشرت کا رنگ اتنا گہرا نہین ہے، جتنا کہ ہندوستان کے اس طبقہ پر ہے، وہان جدید و قدیم کا فرق و امتیاز اُن کی باہمی رسہ کشمکش اب تک قائم ہے، مصر مین جامعہ ازہر اور جامعہ فواد دونون ایک دوسرے کے حریف ہین لیکن یہان دیوبند علی گڈھ ندوۃ العلما اور جامعہ ملیہ سب ایک دوسرے کے حلیف شریک اور متعاون ہین غور کیجیے اس انقلاب عظیم کا سرچشمہ کہان ہے؟ اس مین شک نہین کہ اس مین خلافت کی تحریک اور بعد مین کانگریس کی سیاسی جدوجہد کو بھی دخل ہے لیکن جہان تک اس انقلاب کے علمی پہلو کا تعلق ہے، کوئی شبہ نہین، وہ بڑی حد تک سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششون کا مرہون ہے!

اب ایک اور پہلو سے دیکھیے خالص علمی اور تحقیقی کام اور پبلک لائف دونون مین بیر ہے، دونون کو نباہنا جام و سندان باختن سے کم مشکل نہین ہے لیکن مولانا کو قدرت نے جو عجیب ہمہ گیر اور جامع طبیعت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے انھون نے اس راہ کو بھی اپنے لئے آسان کر لیا تھا، تحریک خلافت اور اسکے بعد تحریک آزادی کے زمانہ مین وہ ان دونون تحریکون کے سرگرم زعما کے دوش بدوش چلتے رہے، ملک کے دور دراز گوشون کے اور ملک سے باہر بھی سفر ہو رہے ہین، جلسون مین تقریرین ہو رہی ہین، اجلاس کا خطبۂ صدارت پڑھا جا رہا ہے، مشاورتی کونسلون مین شرکت ہو رہی ہے، قومی کارکنون کی عملی نگرانی کی جا رہی ہے غرض کہ مسلمانون کی قومی زندگی کا کوئی گوشہ تعلیمی ہو، یا سیاسی، مذہبی ہو یا معاشرتی، ادبی ہو یا علمی ایسا نہین ہے جس مین مولانا عملاً شریک نہ رہے ہون اور اس کی سرگرمیون مین حضور قلب و دماغ کے ساتھ حصہ نہ لیتے ہون، اس بنا پر مولانا کی شہرت اور اُن کی شخصیت کی عظمت کا احساس صرف طبقۂ خواص تک محدود نہین رہا بلکہ عام مسلمانون اور ابنائے وطن نے بھی اُن کی بزرگی اور زعامت کے سامنے سر نیاز مندی خم کر دیا۔

علم و فضل کمال و ہنر اور عروج و ارتقا کے یہ تمام منازل و مراحل طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت بھی آ گیا جب کہ علم کے حجابات ظاہری بھی اٹھ گئے، اور شاہد حقیقی کا جمال معنوی بلا کسی واسطہ و وسیلہ کے

پر تو فگن ہونے لگا، بعض کوتاہ نظر خواہ کچھ کہیں لیکن حق یہ ہے کہ آخر عمر میں مولانا کو جو روحانی مقام حاصل ہوا، اور جس کی وجہ سے وہ علمی اور تحقیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، وہ قرب و اتصالِ الٰہی کا ایک بلند مقام، اور ایک انسان کے کمال کی معراج ہے، عشق کی فغاں سنجی یا زمزمہ پیرائی ہجر و فراق کی مدت کے دراز ہونے تک باقی رہتی ہے لیکن جب حسن خود بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے، اور اپنی جلوہ طرازیوں سے عشق کی کائناتِ زندگی پر مستولی اور غالب ہو جائے تو عشق کی زبان گنگ ہو جاتی ہے، وہ مسحور و بے خود ہو کر قوتِ گفتار سے محروم ہو جاتا ہے، اور تجلیات میں گم ہو کر حیرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ علم کی مثال اس نقشِ پا کی سی ہے جس کے ذریعہ محبوب تک پہونچنے کی کوشش کی جائے لیکن جب محبوب خود سامنے آ جائے تو اس وقت بھی اس نقشِ پا کی پیروی کرنا اور اسی کے اشاروں پر چلنا خود منزلِ مقصود سے دور ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ حقیقت ہے جس کو "علم حجاب اکبر" میں بیان کیا گیا ہے،

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

حضرت سید صاحب کا آخر عمر میں روحانی لطائف و مزایا کی طرف مائل ہو جانا، اور اس میں غلو کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اب تک وہ جو کام کرتے رہے تھے، اس کو انھوں نے تکمیل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا تھا، ولیا کی تخصیص نہیں بلکہ ہر صاحب کمال کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اس کا کمال عروج و ارتقا کے آخری نقطہ تک پہنچ جاتا ہے، تو اب اُس کو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی، اور وہ اس سے منہ موڑ کر ایک ایسے رہ زار میں جا نکلتا ہے۔ جو زمان و مکان، این و آن اور زوال دنیا کے خرخشوں اور حد بندیوں سے ورا الوریٰ ہوتا ہے، اور جہاں کسب کمال کی تشنگی کبھی نہیں بجھتی، خوب سے خوب تر تلاش کرنے والی نگاہ کو کبھی سیری نہیں ہوتی، جہاں دامانِ طلب کبھی پر نہیں ہوتا، جہاں قرب و اتصال کی ٹھنڈک شوق و اشتیاق کی آگ کو سرد نہیں کرتی، بلکہ اُسے اور مشتعل کرتی ہے، آئزک نیوٹن جس نے عالم طبعیات میں ایک انقلابِ عظیم

پیدا کردیا جب وہ سب کچھ کرچکا تو خود اس سے منحرف ہوکر گرجاسے وابستہ ہوگیا، اور اس کے قلب و روح کو سکون وہین ملا حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انورشاہ الکشمیریؒ کا حال بھی یہی تھا، عمر بھر علم وتحقیق کے میدان کو نہ کونہ کی خاک چھانتے پھرے، اور ہزاروں کو اپنے فیوض علیہ سے باکمال بناگئے، لیکن خود آخرعمر مین ذکر و شغل اور مراقبہ ومناجات کی طرف حد سے زیادہ مائل ہوگئے تھے، اور فرماتے تھے کہ افسوس! ہم علم کے پیچھے لگے رہے لیکن اصل کام جو کرنے کا تھا وہ نہ کیا!!

جس طرح آئزک نیوٹن اپنی لافانی تحقیقات واکتشافات سے بیزار ہوکر ایک گوشہ مین جا بیٹھا لیکن دنیا آج تک اس سے فائدہ اٹھارہی ہے، اور اٹھاتی رہے گی، اسی طرح اگرچہ سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود آخر مین اپنے عمر بھر کے کامون سے، ایک بلند تر داعلیٰ تر مقصد کی خاطر، کنارہ کش ہوگئے تھے لیکن یہ انھون نے اس وقت کیا تھا، جب اُن کی کوششون کا لگایا ہوا پودا پورے طور پر بارآور ہوچکا تھا، اور اُن کو یقین تھا کہ اس سلسلہ مین انھین خود جو کام کرنا تھا، وہ اسے پورا کرچکے تھے، اور اب ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی، جو اُن کے نقش قدم پر چل کر اس کام کو برابر جاری رکھے گی اور فروغ دے گی، اس بنا پر اب یا آئندہ اس راہ مین جو کام بھی ہوگا، وہ مولانا کی منت کشی احسان سے آزاد نہین ہوسکتا،

جیسا کہ مین نے اوپر کہا مجکو مولانا سے براہ راست تلمذ واستفادہ کا شرف حاصل نہین ہوسکا لیکن واقعہ یہ ہے کہ مین اپنے تئین مولانا کا تلمیذ معنوی سمجھتا ہون، کیونکہ مین نے مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی دونون کی کتابون سے کافی استفادہ کیا ہے، مجکو ان دونون بزرگون کی کتابین اور بالالتزام مجلہ معارف پڑھنے کا شوق اُس وقت سے تھا، جب کہ مین پورے طور پر ان کے مضامین سمجھنے کی استعداد بھی نہین رکھتا تھا دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ مین مین اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے مشہور تھا، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب (مولانا سید محمد انورشاہ) کو یاجوج وماجوج سے متعلق ایک بحث کا مطالعہ کرنے کے سلسلہ مین ارض القرآن کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا تو ایک دن عشاء کی نماز کے بعد مسجد سے کمرہ کی طرف واپس

جاتے ہوتے، سیدھے میرے کمرہ میں تشریف لائے، اور کتاب طلب کی، جب میں نے افسوس کے ساتھ عرض کیا کہ کتاب ہو مگر یہاں نہیں آگرہ میں ہو تو فرمایا بس جب کتاب یہاں تمھارے پاس بھی نہیں تو ادھر کس کے پاس ہو گی، دارالمصنفین کی کتابیں یہاں اور پڑھتا کون ہو!"

تلمذ روحانی کی اس نسبت کی وجہ سے مجکو سید صاحب کی ذات اور شخصیت کے ساتھ نہ صرف ایک رسمی عقیدت تھی، بلکہ محبت بھی تھی، اور مجکو یہ کہنے میں مسرت اور فخر دونوں محسوس ہوتے ہیں کہ حضرت سید صاحب بھی مجکو اسی بزرگانہ شفقت و کرم سے دیکھتے، اور اسی کے مطابق برتاؤ کرتے تھے، دلی جب کبھی آتے تو ناممکن تھا کہ شرف ملاقات عنایت فرمائے بغیر واپس چلے جاتے، ایک مرتبہ میں نے برہان کے نظرات میں اسلامی تعلیم گاہوں کی خصوصیات بتاتے ہوئے ندوۃ العلماء کی نسبت "دینی مگر دنیوی" کا فقرہ لکھدیا، یہ پرچہ حضرت سید صاحب کی نظر سے گذرا تو بڑا ملال ہوا، اسی اثنا میں کسی سفر میں کہیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور سید صاحب کی ملاقات ہو گئی، سید صاحب نے مولانا حفظ الرحمٰن سے فرمایا ہم لوگ تو مولوی سعید صاحب کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے لیکن اب اُن کے قلم سے ندوہ کی نسبت یہ الفاظ پڑھ کر سخت صدمہ اور ملال ہوا ہے"، مولانا سیوہاروی نے دہلی پہونچ کر مجکو سید صاحب کی یہ شکایت پہنچا دی تو مجکو خود اس کا بہت افسوس اور ملال ہوا، کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں ایک جلسہ کے سلسلہ میں سید صاحب سے ملاقات ہو گئی تو میں نے اس واقعہ کا ذکر کرکے عرض کیا کہ دراصل مجھ سے تعبیر میں کوتاہی ہو گئی، مجکو "بھی" کا لفظ اور لکھنا چاہئے تھا، یعنی دینی مگر دنیوی بھی، تو میرا مطلب زیادہ واضح ہوتا، کیونکہ ظاہر ہے دین کے ساتھ دنیا جمع کرنا عیب اور نقص نہیں، بلکہ ہنر و کمال ہے،

"دین و دنیا بہم آمیزکہ اکسیر اینست"

اور درحقیقت ندوہ کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ ایسے علما پیدا کئے جائیں جو علوم دینیہ کے ساتھ علوم دنیویہ میں بھی کوتاہ نہ ہوں، حضرت سید صاحب یہ سُن کر غایت شفقت سے مسکرا دیئے، اور فرمایا، کہ آں

اصبت اور بات رفت وگذشت ہوگئی،

اب وہ شفقت ومحبت اور کرم وتوجہ یاد کرتا ہوں تو دل تڑپا کیے رہتا ہے، گویا میر تقی میر سے معذرت کے ساتھ!

مصائب اور تھے پر اُن کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے!

میر کے اصل شعر میں بجائے "اُن" کے "دل" ہے،

فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وطاب ثراہ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے دینی و علمی خدمات
(اُن کی تصانیف کی روشنی میں)

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی جامع کمالات شخصیتین کہین صدیون مین پیدا ہوتی ہین، وہ اپنے کمالات مین ائمۂ سلف کی یادگار تھے، جملہ اسلامی علوم پر اُن کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی، اور بعض علوم مین امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، اور اُن مین اپنی علمی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگارین چھوڑی ہین جو مدتون علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہین گی، ان کا علمی درجہ اتنا بلند اور اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گوناگون اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، ایک مضمون مین اس کو سمیٹنا دریا کو کوزہ مین بند کرنے کی سعی لاحاصل کرنا ہے، اس لئے اس مضمون مین صرف اُن کی اہم تصانیف کی روشنی مین اُن کے علمی کمالات پر اجمالی تبصرہ کیا جائے گا، اور اُن کی تصنیفی خصوصیات دکھانے کی کوشش کی جائے گی جس سے اُن کے علمی درجہ اور ان کے دینی و علمی خدمات کا سرسری اندازہ ہو سکے،

اُن کے علمی و دینی خدمات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے اس کے بغیر اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہین ہو سکتا، اٹھارہوین خصوصاً انیسوین صدی مین مسلمانون کے سیاسی زوال کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کے ہر شعبۂ زندگی مین ایک عام جمود و انحطاط طاری ہو گیا تھا، اور حکومت کیساتھ

دین وملت علم واخلاق اور تہذیب وروایات بھی رخصت ہورہے تھے، مغربی قومون کی یلغار ایک طرف اسلامی حکومتون کو ختم کررہی تھی، دوسری طرف ان کے علوم وفنون اور نظر فریب تہذیب مسلمانون کے مذہب واخلاق اور تہذیب وتمدن کے قلعون کو مسمار کررہے تھے، اور مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی غلامی مین بھی مبتلا ہوتے جارہے تھے، جو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ سخت تھی،

یہی حال ہندوستان کے مسلمانون کا بھی تھا، خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور بھی پست وپامال ہوکر رہ گئے تھے، عوام کو اس کا احساس نہین تھا، اونچا طبقہ اس وقت بھی تعیش مین مبتلا اور خواب غفلت مین مدہوش تھا، علمائے کرام کا بڑا طبقہ اس انقلاب کے نتائج سے بے خبر پرانی بے روح مدرسی تعلیم فقہی جزئیات کی ردوقدح اور فروعی مسائل مین جنگ ومناظرے مین مشغول تھا، تاہم ان مین کچھ نفوس ایسے ضرور تھے جن مین مسلمانون کی اس زبون حالی کا احساس اور ان کی سیاسی و مذہبی تجدید واصلاح کا جذبہ موجود تھا، اور ان مین مجاہدانہ روح بھی تھی، مگر وہ بھی نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے اسباب وذرائع سے واقف نہ تھے اور صرف مذہبی تعلیم اور مذہبی اصلاح کو مسلمانون کی دینی اور دنیوی فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور ان کی ساری کوششین اسی دائرے کے اندر محدود رہین، ان مین سے بعض مجاہدین قوت کے ذریعہ نئی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے، مگر اس مین کامیابی کا کوئی امکان نہین تھا،

اس کے مقابلہ مین ایک نیا گروہ تھا، اس کا مقصد بھی مسلمانون کی فلاح تھا، وہ نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے وسائل سے بھی واقف تھا، مگر نئی حکومت اس کے علوم وفنون اور اس کی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ محض جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کی نقل وتقلید ہی کو مسلمانون کی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا، اس لئے اس کی کوششین زیادہ تر اسی دائرہ کے اندر محدود رہین، اور ان دونون کوششون سے مسلمانون کو فائدہ پہنچا، اگر علماء کا طبقہ نہ ہوتا، تو ہندوستان سے دینی علوم اور دینی روح کا خاتمہ ہوجاتا، اور نئے طبقہ کی کوششین نہ ہوتین تو دنیاوی حیثیت سے مسلمانون کا وجود ختم ہوجاتا، اس لئے ان دونون کی کوششین امت کے شکریہ کی مستحق ہین

ان حالات میں سب سے سخت مرحلہ مسلمانوں کے مذہب اور اُن کی تہذیب وروایات کی مدافعت اور اُن کے تحفظ کا تھا، جن پر دو سمتوں سے حملے ہو رہے تھے، ایک عیسائی مشنریوں کا تبلیغی حملہ، دوسرے علم وتحقیق کی راہ سے مشنریوں کا طریقہ تو پرانے بحث ومناظرے کا تھا، اس نے اس دور کے علماء اور بعض نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے اس کا پوری کامیابی سے مقابلہ کیا، اور ان کے خطرات کو بڑی حد تک روک دیا، مگر مشنریوں سے کہیں زیادہ خطرناک، اور ضرررساں مستشرقین اور فضلائے مغرب کی جماعت تھی، جس نے پرانے طرز کے اعتراضات اور بحث ومناظرے کے بجائے جن کی اس عقل ودانش کے زمانہ میں کوئی قدر وقیمت نہ رہ گئی تھی، ایک نیا علمی اور سائنٹفک طریقہ اختیار کیا، انھوں نے عربی زبان سیکھی، اور اس کی نادر ونایاب کتابیں تلاش کرکے بڑی محنت سے تصحیح وتحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا، اور خود مسلمانوں کی کتابوں سے غلط اور غیر معتبر واقعات وروایات ڈھونڈ کر، اور صحیح روایات میں تدلیس وملمع سازی کرکے علم وتحقیق کے رنگ میں مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ وتہذیب پر اعتراضات شروع کر دیئے، اور اُن کو ایسی بدنما شکل میں پیش کیا، کہ انھیں پڑھکر خود مسلمانوں کو شرم آنے لگی، ان مستشرقین میں ایسے بھی ہیں جو مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کے بڑے مداح ہیں، اور انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اسلام کی خوبیوں اور ساری دنیا خصوصًا یورپ پر مسلمانوں کے علمی وتمدنی احسانات کا اعتراف کیا ہے، اور اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں لیکن ایسے کم ہیں جن کا دامن بالکل پاک ہو، اور انھوں نے کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی زہر چکانی نہ کی ہو،

اس قسم کی تحریروں کا اثر نہ صرف دوسری قوموں بلکہ ان تعلیم یافتہ مسلمانوں پر بھی جو اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے، بڑا اثر پڑتا تھا، اور اسلام کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل رہی تھی، اس حملہ کے مقابلہ کے لئے دینی علوم میں پوری مہارت اور دینی بصارت کے ساتھ اسلامی تاریخ میں وسعت نظر، تلاش وتحقیق کے جدید طریقوں، مغربی زبانوں، جدید افکار وتصورات اور نئے رجحانات سے واقفیت ضروری تھی، اور ان تمام باتوں کا اجتماع نہ پرانے علماء میں تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں، علماء کا بڑا طبقہ سرے سے ان حالات ہی سے بے خبر تھا، نیا طبقہ

جو باخبر تھا، اس میں صحیح دینی روح نہ تھی تاہم سب سے پہلے اسی طبقہ کے فضلاء میں سرسید احمد خان، اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اپنی بساط کے مطابق اس فرض کو انجام دیا، اور مستشرقین کے اعتراضوں کے جواب میں مضامین اور کتابیں لکھیں، مگر یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے، اور نہ صحیح دینی بصیرت رکھتے تھے، اس کے علاوہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز میں اسی کو رد و قبول کا معیار سمجھتے تھے، حسن نیت کے باوجود انھوں نے بھی وہی غلطی کی جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب میں متکلمین فلاسفہ معتزلہ اور باطنی کر چکے تھے یعنی معترضین کے تمام اعتراضات کو صحیح مان کر ان کے جوابات دینے کی کوشش کی گو ان کے بعض جوابات محققانہ بھی تھے لیکن جن اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا ان میں خود اسلامی عقائد و تعلیمات میں ایسی تاویلیں کیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا، تاہم انھوں نے حسن نیت سے اپنے مقدور بھر اس فرض کو انجام دیا، اس سے ایک طبقہ کو فائدہ بھی پہنچا،

علماء کی جماعت میں مولانا شبلی پہلے شخص ہیں جن میں یورپین فضلاء کے اس علمی حملہ کے مقابلہ کے شرائط بڑی حد تک موجود تھے، وہ اسلامی علوم کے بھی ماہر تھے، اسلامی تاریخ پر بھی اُن کی نظر بہت وسیع تھی، نئے خیالات ودجانات، اور مستشرقین کے اعتراضات سے بھی ان کو ایک حد تک واقفیت تھی، اس لئے اُن کی نظر اس فتنہ کے تمام گوشوں تک پہنچی، اور ہر گوشہ سے انھوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی، اور ان کے زمانہ میں جن اعتراضات کا زیادہ شہرہ تھا، اُن کے نہایت محققانہ جوابات دئے، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، اورنگزیب عالمگیر اور الانتقاد علی التمدن الاسلامی وغیرہ اس سلسلہ کے معرکۃ الآرا مضامین ہیں،

اس سلسلہ میں اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ متفرق اعتراضات کے جواب کے ساتھ انھوں نے مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس میں اعتراض کی گنجایش باقی نہ رہے، اور معترضین بھی اُن کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں، اور اس سلسلہ میں بکثرت مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں، یہ مضامین مقالات شبلی میں موجود ہیں، اور اُن کی بیشتر تصانیف اسی سلسلہ کی

کرایا ہیں، اور اُن کی ساری تصانیف کا مرکز و محور ایک ہی نقطہ ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں، اس سے ایک نیا علم کلام پیدا ہوا، جس کی بنیاد پرانے فلسفہ اور منطق کے بجائے عقل و درایت اور تنقید و تاریخ پر ہے، اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ہے،

بعض مستشرقین نے اسلام کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کیا تھا کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہی کو اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کر دیا جائے، اس سے خود بخود اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی، چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف قسم کے اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، علامہ شبلی مرحوم نے ان متفرق اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ سیرۃ النبی پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں سوانح نبوی کے ساتھ اسلام کے عقائد و احکام و اعمال کی بھی تفصیل آ جائے، اور وہ سیرت پاک اور اسلام کا ایسا صحیح اور دلکش مرقع ہو جس میں کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، اور جسے دیکھ کر مخالفین کو بھی آنحضرت صلعم، اور آپ کے لائے ہوئے مذہب کی حقانیت، صداقت اور عظمت و جلالت کا یقین ہو جائے، چنانچہ بڑے سر و سامان سے اس کتاب کی تالیف شروع کی، مگر ابھی اس کی دو جلدیں لکھی تھیں، اور وہ شائع بھی نہ ہوئی تھیں کہ اُن کا وقت آخر ہو گیا، اور وہ اس کام کی تکمیل اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کر گئے، جنھوں نے نہ صرف اس عظیم الشان کام کو مکمل کیا، بلکہ اسلامی علوم و فنون میں تلاش و تحقیق اور اس کی تعبیر و ترجمانی کی نئی نئی راہیں نکالیں، اور اس کی مختلف شاخوں میں اپنے علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تلاش کے بے مثال نمونے چھوڑ گئے،

اُن کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے یعنی اسلامی احکام و تعلیمات کی صحیح اور دلنشین تعبیر و ترجمانی، اور اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی تمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آ جاتی ہے، اور اُن کی بیشتر بلکہ تقریباً کل تصانیف اور مضامین کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے، گو اُن کے ہمہ گیر علم و قلم کی عنان کبھی کبھی خالص علم و ادب کی جانب بھی مڑ جاتی تھی، مگر بہت کم مضامین ایسے نکلیں گے، جو کسی نہ کسی حیثیت

سے اصل مرکزی مقصد سے تعلق نہ رکھتے ہوں، ان کی نظر تمام اسلامی علوم پر یکساں تھی، مگر قرآن مجید، قدیم و جدید علم کلام، اور اسلامی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھے، اور اُن کے بیشتر مضامین و تصانیف اسی سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سیرۃ النبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اُن کے خاص فنون کا اجتماع ہے، اور اُن کے علم و تحقیق کی تمام شانیں نمایاں نظر آتی ہیں،

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرۃ کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی، سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرۃ نبوی پر جس قدر کتابیں لکھی گئیں، وہ زیادہ تر مغازی اخلاق و شمائل نبوی پر مشتمل ہیں، اور ان میں روایات کی صحت اور تحقیق و تنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا، اور وہ ہر قسم کی رطب و یابس روایات کا مجموعہ ہیں، صرف بعض کتابیں مثلاً قاضی سلیمان صاحب منصور پوری کی رحمۃ للعالمین، اور اس قسم کی چند کتابیں اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر ان کا نقطۂ نظر بھی دارالمصنفین کی سیرۃ النبی سے مختلف تھا، اور وہ صرف دیندار مسلمان کے ذوق کی تھیں، ان میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور جدید ذوق و رجحان کی تشفی کا کوئی سامان نہ تھا، اس لحاظ سے اردو میں یہ پہلی سیرت ہے جس میں ان تمام ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اور جس میں سوانح اور شمائل نبوی اور اسلام کی تعلیمات کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے منکرین و مخالفین بھی اُن کی صداقت و عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں، اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ تنہا سوانح نبوی نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کا خلاصہ آگیا ہے، اور اس حیثیت سے وہ اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف کہی جا سکتی ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے رد و قبول میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اور اُن کی تحقیق میں نقد و جرح اور روایت و درایت کے تمام محدثانہ اور تحقیقی اصولوں کو کام میں لایا گیا ہے، اور صرف معتبر اور مستند روایتیں لی گئی ہیں، اس سلسلہ میں سیرۃ النبی کا مقدمہ جس میں سیرت نبویؐ کے عربی ماخذوں اور روایت و درایت کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے،

نہایت اہم چیز ہے، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ان تمام اعتراضوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو مخالفین کرتے ہیں اور مناظرانہ بحث و مباحثہ اور اعتراض و جواب میں پڑنے کے بجائے نفس واقعہ کو ایسے محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے، اور جو اعتراضات غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، وہ ان کی تنقید ہی سے رد ہو جاتے ہیں، اسی کے ساتھ جدید دور کے سیرت نگاروں اور متکلمین کی غلطیوں سے پورا احتراز کیا گیا ہے، وہ محض اعتراض سے بچنے کے لئے نہ کسی صحیح واقعہ کا انکار کیا گیا ہے، اور نہ غلط تاویل کی گئی ہے، بلکہ اعتراض سے پہ محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو اعتراضات غلط فہمی یا قصور نظر کا نتیجہ ہیں اُن میں غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے، جو غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، ان پر تنقید کر کے ان کی بے اعتباری ظاہر کر دی گئی ہے، اور جو معترضین کے خود ساختہ نقطہ نظر کا نتیجہ ہیں، اُن میں نقطہ نظر ہی کو غلط ثابت کیا گیا ہے، اور کسی مسئلہ میں صحیح اسلامی نقطہ نظر سے قلم ہٹنے نہیں پایا ہے، اور سارے مسائل کو قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اور کسی عقیدہ و خیال میں سلف صالحین کے عقیدہ سے انحراف نہیں کیا گیا ہے،

یہ کتاب چونکہ اسلامی تعلیمات کا بھی خلاصہ ہے، اس لئے اس میں مذہبی عقائد، شرعی قوانین اخلاقی اصول اور تاریخی واقعات ہر قسم کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، جن میں عالم غیب، وحی، ملائکہ، یوم آخرت جزا و سزا، دلائل و معجزات وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی نازک مسائل بھی ہیں، جن کو ایمانی ذوق اور وجدان سلیم کے بغیر تنہا عقل اور مادی حواس کی مدد سے سمجھنا مشکل ہے، اور ایسے موقعوں پر بڑے بڑوں سے چوک ہو جاتی ہے مگر مصنف نے ادنیٰ لغزش کے بغیر اس خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے کہ کہیں نقل و روایت اور کتاب و سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، اور کسی صحیح عقیدہ کی غلط تاویل نہیں کی گئی ہے، دوسری طرف ہر بحث عقل و درایت کی حیثیت سے اس قدر مدلل، دلپذیر اور دلنشین ہے کہ عقل سلیم کے لئے اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی، غرض سیرت نبوی علم و نظر کی وسعت، تحقیق و تنقید، دیدہ وری و نکتہ سنجی، دلائل کی دلنشینی، اسلامی تعلیمات کی صحیح اور حکیمانہ تعبیر و ترجمانی کا ایسا شاہکار ہے اور اس میں مصنف کے علمی کمالات کے ایسے

گوناگوں جلوے ہیں، کہ اُن کی ایک جھلک بھی اس مضمون میں دکھانا ممکن نہیں، اگر سیرۃ النبی کے مباحث کی صرف سرخیاں نقل کیجائیں تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہوجائے گی، ایسی حالت میں ایک مختصر مضمون میں ان تبصرہ کی گنجایش کہاں سے نکل سکتی ہے، اس لئے صرف ہر جلد کے موضوع اور اس کے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیجائے گی جس سے ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ ہوسکے،

سیرۃ النبی چھ ضخیم مجلدات میں ہے، پہلے دو حصے علامہ شبلی کے قلم سے ہیں، اور باقی چار مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیف ہیں، پہلے حصہ میں فن سیرت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں سیرۃ نبوی کی اہمیت و ضرورت اور سیرت نگاری کی مختصر تاریخ اور اس کے قدیم ماخذوں کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور سیرت سے متعلق حدیث، مغازی و سیرت اور تاریخ کی روایات کے رد و قبول کے بارہ میں محدثانہ اصول سے ناقدانہ بحث کی گئی ہے، اور آخر میں سیرت کے یورپین مصنفین اور اُن کی تصانیف پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ مقدمہ اپنے معلومات و مباحث کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد دوسرے مقدمہ میں عرب کی قدیم سیاسی و مذہبی تاریخ ہے جس میں خانہ کعبہ کی تعمیر، حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے کی بحث بھی آگئی ہے،

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر پہلے حج تک غزوات و سرایا کے مفصل اور محققانہ حالات ہیں، اس میں اسلامی جہاد و غزوات نبوی، یہود خیبر کی جلاوطنی، اور بعض ازواج مطہرات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کا محققانہ جواب بھی دیا گیا ہے، آخر میں غزوات پر مجموعی تبصرہ ہے جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کا مقصود قتل و خونریزی اور ملک گیری نہیں، بلکہ صرف اسلام کی پر امن تبلیغ اور عرب میں امن و امان کا قیام تھا، اور یہ لڑائیاں محض کفار و مشرکین کی مزاحمت اور اُن کی زیادتیوں کی وجہ سے پیش آئیں، اس کے باوجود اسلام نے نہایت منصفانہ اصول جنگ اختیار کئے اور پرانے وحشیانہ طریقوں کا خاتمہ کرکے اسلامی جہاد کو عبادت اور خیر بنا دیا،

دوسرے حصہ میں نبوت کی پر امن زندگی یعنی اسلام کی تبلیغ و اشاعت قبائل عرب کا قبول اسلام،

مدینہ میں اسلامی حکومت کی تاسیس، اس کے سادہ نظام، مذہبی تعلیمی و تبلیغی انتظامات، شریعت کی تکمیل، اس کے اصولی عقائد، عبادات، معاملات حلال و حرام، حجۃ الوداع، خطبۃ الوداع، وفات نبوی، آپ کے شمائل و معمولات اخلاق و سیرت، ازواج مطہرات، اولاد امجاد، اور اہل بیت کی زندگی کے حالات ہیں، اور ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے تعلق رکھتے ہوں، یا میدان جنگ سے خانگی زندگی سے متعلق ہوں، یا پبلک زندگی سے پیغمبر کی حیثیت سے ہوں، یا عام انسان کی حیثیت سے دشمنوں سے متعلق ہوں، یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس سے آپ کی پیغمبرانہ صداقت، اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے، اور آپ کے خلق کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے،

جہاں تک خاص سیرت نبوی کا تعلق ہے، وہ ان دونوں حصوں پر ختم ہو جاتی ہے، مگر اس سیرت کی تالیف کا مقصد محمد الرسول اللہ کے سوانح کے ساتھ آپ کے لائے ہوئے مذہب کو بھی پیش کرنا تھا، اس لئے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں، اس میں سب سے اہم مسئلہ دلائل و معجزات کا ہے، اگرچہ معجزات اور خوارق عادات تمام مذاہب میں مشترک ہیں، مگر عقل پرستوں کے عقل کی سمائی سے سب سے زیادہ وہی باہر ہیں، اس لئے تیسری جلد دلائل و معجزات پر ہے، اس میں پہلے نفس معجزہ کی حقیقت، اور قرآن مجید، قدیم و جدید فلسفہ اور علم کلام کی روشنی میں معجزہ کے امکان و وقوع پر بڑی مبسوط بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے، کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے بھی خوارق عادت یا معجزہ میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے، اس میں حسب ذیل بحثیں ہیں، دلائل و معجزات کی حقیقت، دلائل و معجزات اور فلسفۂ قدیم و علم کلام، معجزات اور فلسفۂ جدید، معجزات کا امکان اور اس کا استبعاد، معجزات کا یقین، اس کی غرض و غایت، آیات و دلائل اور قرآن مجید، ان مباحث کے بعد خصائص نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، نزول ملائکہ، رؤیا اور معراج و شرح صدر کا بیان ہے، پھر ان آیات و معجزات کا ذکر ہے جو قرآن مجید اور معتبر روایات سے ثابت ہیں، اس کے بعد غیر معتبر روایات پر تنقید کی گئی ہے، پھر بعثت نبوی کی ان بشارتوں

کا تذکرہ ہے، جو قدیم الہامی صحیفوں میں ہیں، اور آخر میں خصائص محمدی کا ذکر ہے، ان مباحث میں اس جامعیت اور استقصار کے ساتھ معجزات پر بحث کی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور کوئی رخ چھوٹنے نہیں پایا ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزات کے صدور میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے، اور نہ وہ نوامیس فطرت کے خلاف ہیں، دنیا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہو سکتی، اس لئے اگر خالق کائنات قادرِ مطلق کسی حق کے اثبات اور کسی پیغمبر کی تائید کے لئے خرق عادت کا ظہور کر دے تو اس میں کوئی عقلی استحالہ ہے، اور معجزات کا مقصد صرف عوام کی تشفی ہوتا ہے، خواص کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی،

چوتھی جلد اسلام کے بنیادی عقائد پر ہے، اور اس میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا، اور جنت و دوزخ وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی مسائل پر بحث ہے، اس لئے وہ تیسری جلد سے بھی زیادہ اہم ہے، اس میں پہلے منصب نبوت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت، اس کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس کے لوازم و شرائط بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی حالت، اور ان کی اخلاقی اور روحانی پستی کا نقشہ دکھایا گیا ہے، خصوصاً عرب کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، اور عربوں کی اصلاح میں آپ کو جو گوناگوں دشواریاں پیش آئیں، اور بالآخر اسلام نے جو عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں، انبیاء، رسل، اور کتب سماوی پر ایمان کی تفصیل ہے، پھر عالم برزخ، جزا و سزا، دوزخ و جنت اور قضا و قدر کے مباحث ہیں، اور آخر میں ایمان کے نتائج کا ذکر ہے، اور ان تمام نازک اور دقیق مسائل کو جن کا محض عقل و مادی حواس کے ذریعہ سمجھنا بہت دشوار ہے، ایسے حکیمانہ اور دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قلب سلیم کی تشفی کے لئے بالکل کافی ہے

پانچواں حصہ عبادات پر ہے، اس میں پہلے اعمال صالحہ کی اہمیت دکھائی گئی ہے، اور اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم عبادت ہے، اس کے بعد اسلامی عبادات کی خصوصیات اور اس کے اصول

قوانین پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر جسمانی عبادات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تشریح ہے، پھر قلبی عبادات جو جسمانی عبادات کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً تقویٰ، اخلاص، توکل، اور صبر شکر وغیرہ کی تفصیل، اور ان کی ایسی حکیمانہ تشریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی اخلاق کے تزکیہ و تطہیر اور تعلق مع اللہ کا سب سے بہتر وسیلہ اسلامی عبادات ہیں، اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادتوں کا موازنہ بھی آگیا ہے،

چھٹا حصہ اخلاق پر ہے، دنیا کا سارا نظام اور انسانیت کا سارا شرف اخلاق ہی سے وابستہ ہے، اس لئے تمام مذاہب میں اخلاق کی اہمیت ہی، اور اس حیثیت سے کہ ان کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے، وہ عبادات سے بھی زیادہ اہم ہیں، اور اسلام میں اُن کی سب سے زیادہ اہمیت ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل بتلایا ہے، اس حیثیت سے یہ حصہ بھی نہایت اہم ہے، اور اس میں فلسفۂ اخلاق اور اس کی تمام جزئیات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، اس میں پہلے اسلام اور اخلاق حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے، اور اسلام میں اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، پھر دنیا کے تمام اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز نمایاں کیا گیا ہے، پھر اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کی خامیاں اور کمزوریاں اور اُن کے مقابلہ میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی جامعیت و کاملیت دکھلائی گئی ہے، پھر تعلیم اخلاق کے مختلف طریقوں کو بتلا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تعلیم کی خوبی ظاہر کی گئی ہے، پھر انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور اخلاق فاضلہ اور اخلاق ذمیمہ کی تفصیل ہے، آخر میں آداب معاشرت کا اجمالی ذکر ہے، اس طرح یہ کتاب اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مرقع ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اسلام نے اخلاق کو کتنی اہمیت دی ہے، اور اس کی اخلاقی تعلیمات کس قدر جامع کامل اور حکیمانہ ہیں،

اسلام درحقیقت کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ قدیم الہامی مذاہب کی اصلاح شدہ ترقی یافتہ اور آخری تکمیلی

شکل ہے ان مذاہب میں دو قسم کی خامیاں تھیں، ایک انسانوں کی پیدا کردہ، دوسری فطری، انسانوں کا پیدا کردہ نقص یہ تھا کہ انھوں نے ان میں اپنے حسب منشا تصرفات کر کے اُن کی شکل اس قدر بدل دی تھی، اور اُن میں اس قدر آمیزش کر دی تھی کہ اصل شکل کا پہچاننا مشکل تھا، اور ان کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا تھا، اسلام نے اُن کو بیرونی آمیزش سے پاک کر کے اصلی شکل میں جلوہ گر کیا،

فطری نقص یہ تھا کہ مذاہب درحقیقت انسانیت کی تکمیل کا نصاب ہیں، اور نصاب تعلیم کی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے انسانی ارتقاء کے ساتھ مذاہب کی تعلیمات بھی بدلتی رہیں، اور ہر دور کے انسانوں کی عقل و دانش، اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ان میں تغیر اور ترقی ہوتی رہی، قدیم انسانوں کی قوت ادراک و تعقل ادنیٰ درجہ کی تھی، اور اُن کی ضروریات بھی سادہ اور محدود تھیں، اور اُنکا دائرہ خاص خاص قوموں تک محدود تھا، اُن میں عالمگیریت نہ تھی، اسلئے اُنکے مذاہب بھی اسی کے مطابق تھے پھر جیسے جیسے انسان عقل و شعور میں ترقی کرتا گیا، اسکی ضروریات بڑھتی گئیں، اور انسانیت کا دائرہ پھیلتا گیا، اسی قدر اُن کے مذاہب میں بھی بلندی، وسعت، گہرائی اور عالمگیریت آتی گئی، اور پرانے مذاہب کی وہ تعلیمات جو ترقی یافتہ دور کے انسانوں کے لئے موزوں نہ رہ گئی تھیں منسوخ ہوتی گئیں، اور اُن کی جگہ نئی موزوں تعلیمات آتی گئیں، اور مذہب کا یہ ارتقا انسانی ارتقا کیساتھ برابر جاری رہا، تا آنکہ انسان عقل و دانش کے کمال تک پہنچ گیا، اور اس کے ساتھ اس کی ضرورتیں بھی نہایت وسیع ہو گئیں، ایسے ترقی یافتہ انسانوں کے لئے ایسے جامع کامل عالمگیر اور دائمی مذہب کی ضرورت تھی جو اس کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا کفیل ہو، یہی آخری تکمیلی مذہب اسلام ہے، جو ایک کمل نظام زندگی ہے، اور جس کے دائرہ سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی باہر نہیں ہے، اور اس کی تعلیمات جملہ دینی و دنیوی، اور مادی و روحانی ضروریات پر حاوی ہیں، سیرۃ النبی میں اسلام کی اسی جامعیت و کاملیت اور اسکی تعلیمات کے حکم و مصالح کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کا امتیاز نمایاں ہو جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت کا آخری جامع و کامل اور دائمی عالمگیر مذہب اسلام ہی ہے، اس

اس لحاظ سے سیرۃ النبی جدید علم کلام کی بڑی معرکۃ الآرا کتاب ہے، اور اسلام کا ایسا کامل مرقع ہے جس میں اس کے سارے خط وخال نمایاں ہیں،

خطبات مدراس

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خطبات مدراس ہے، یہ وہ خطبات ہیں، جو مدراس کے بعض دیندار مسلمانوں کی فرمایش پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر دیئے گئے تھے جنھیں بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا، یہ کل ڈیڑھ سو صفحوں کی کتاب ہے، مگر اپنے معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرت کی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے، اور تنہا یہ کتاب مصنف کے فخر کے لئے کافی ہے، اس میں ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے اسلوب سے سیرۃ نبوی کے ان پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، جن کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت، آپ کی جامعیت و کاملیت، اور آپ کی زندگی کے عملی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام میں ساری دنیا کے لئے دائمی نمونۂ عمل آپ ہی کی ذات مقدس ہو سکتی ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، وہ سب اپنے زمانہ کے پیغمبر برحق تھے، لیکن اُن کی بعثت کسی خاص قوم، خاص خطۂ زمین اور ایک محدود زمانہ تک اور ایک محدود مقصد کے لئے تھی، اس لئے ان کی تعلیمات کا دائرہ بھی محدود تھا، اور وہ ان کے زمانہ کے بعد منسوخ ہو گئیں، اس لئے ان کے حالات اور ان کی تعلیم میں آیندہ زمانہ کے لئے تاریخی استناد اور جامعیت و کمال کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے قدرت کی جانب سے بھی اس کا انتظام نہیں کیا گیا، چنانچہ جن جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں، اور جن کے مذاہب موجود ہیں، ان میں سے کسی کے مستند تاریخی حالات نہیں معلوم، بلکہ بعضوں کی شخصیت تک مشتبہ ہے، اور جن کے حالات کچھ معلوم ہیں وہ اتنے ناقص اور غیر معتبر ہیں کہ اُن سے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی رہنمائی نہیں ہو سکتی، مگر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا، اور اسلام ساری دنیا کے لئے دائمی مذہب بنا کر بھیجا گیا تھا، اور آپکی

ذات جامع کمالات بنائی گئی تھی، اس لئے آپکے حالات کی حفاظت کے لئے قدرت کی جانب سے یہ اہتمام کیا گیا کہ آج تیرہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آپ کی پوری زندگی کا ایک ایک واقعہ اور ہر ہر پہلو اس تفصیل اور اس تاریخی اسناد کے ساتھ محفوظ ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ بھی صحت؛ استناد میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی خطبات مدراس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تاریخیت، آپکے حالات کی جامعیت اور آپ کی تعلیمات کی کاملیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،

پہلے خطبہ میں دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے، اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ سلاطین و کشورکشا جنھوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، وہ مدبرین و سیاستدان جنھوں نے قوموں کی قسمتیں پلٹ دیں، وہ مقننین جنھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے دستور بنائے، اور وہ حکماء و فلاسفہ جنھوں نے بہتر سے بہتر فلسفے پیدا کئے، انسانیت کے امراض کا مداوا نہ کر سکے، اور دلوں کی دنیا منور نہ کر سکے، اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اخلاق و روحانیت کا نور نظر آتا ہے، وہ صرف انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے،

دوسرے خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دائمی اور عالمگیر نمونۂ عمل ہونے پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں سیرت محمدی کے تاریخی و تکمیلی پہلوؤں اور اس کی جامعیت و عملیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ آج ہم کو جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں، ان میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند تاریخی حالات کا علم ہے، اور اس جامعیت کے ساتھ کہ آپ کی پوری زندگی کا ہر پہلو پوری طرح محفوظ ہے، اور اس میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے اسوۂ عمل موجود ہے، پھر آئندہ خطبات میں ان میں ہر ایک پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے،

تیسرے خطبہ میں سیرت نبوی کے تاریخی پہلو پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اتنا مواد دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کے حالات میں نہیں مل سکتا، اور اس سلسلہ میں سیرت کے تمام ماخذوں قرآن مجید، کتب حدیث، مغازی و سیر،

تاریخ اور دلائل و شمائل نبوی کے پورے ذخیرہ کا جائزہ دیا گیا ہے، اس میں ان علوم کی اجمالی تاریخ آگئی ہے اور پھر محدثانہ اصول سے اس ذخیرہ پر بحث و تنقید کی گئی ہے، ان بحثوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جتنا مستند ذخیرۂ معلومات موجود ہے اسکے عشر عشیر غیر مستند حالات بھی کسی پیغمبر کے نہیں مل سکتے،

چوتھے اور پانچویں خطبہ میں آپ کی جامعیت و کاملیت پر بحث کی گئی ہے، یہ دونوں چیزیں درحقیقت ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں، کاملیت سے یہ مراد ہے کہ شروع زندگی سے وفات نبوی تک آپ کی زندگی کا ہر واقعہ محفوظ ہے، مثلاً خاندان، آبا و اجداد، پیدائش، شیرخوارگی، بچپن، سنِ شعور، جوانی، اس زمانہ کے مشاغل، پیشہ شادی، احباب قبل از نبوت، قریش کے معاہدہ میں شرکت، امین کا خطاب، آثار نبوت، تنہائی پسندی، غار حرا کی خلوت نشینی، اور چلہ کشی نبوت کا آغاز وحی، اسلام کا ظہور، اس کی دعوت، اس راہ کے مشکلات و مصائب، ہجرت، قیام مدینہ، غزوات کے حالات، دعوت اسلام کے خطوط، اسلام کی اشاعت و تکمیل حجۃ الوداع، اور وفات وغیرہ کے تمام حالات محفوظ و معلوم ہیں، اسی طریقہ سے زندگی تمام معمولات، عادات و خصائل کے حالات شمائل کی کتابوں میں موجود ہیں، جن سے آپ کی زندگی کے جزئی سے جزئی واقعہ کا علم ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ واقعات بھی جن میں وحی کے ذریعہ آپ کو تنبیہ کی گئی ہے اور ایسے واقعات بھی جن پر مخالفین اعتراض کرتے ہیں بجنسہ محفوظ ہیں، یہ سیرت نبوی کا کاملی پہلو ہے

اس کا دوسرا پہلو اس کی جامعیت ہے، یعنی مختلف انسانی طبقات اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق آپ کی زندگی میں اسوۂ عمل موجود ہے، مثلاً شاہ و گدا، حاکم و محکوم، فاتح و مفتوح، امیر و غریب، تاجر و مزدور، عزیز اور دوست وغیرہ مختلف حالتوں اور حیثیتوں سے آپ نے زندگی بسر کی ہے، اسلئے ان سب کی حیثیت اور ان کے تعلقات و فرائض کا سبق بھی ہم کو سیرت پاک سے مل سکتا ہے، پھر ہر انسان کے معمولات زندگی اور روزانہ کے کاروبار مثلاً اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سونے جاگنے، ہنسنے بولنے، لین دین تعلیم و تعلم، عبادت و ریاضت غرض ان تمام معمولات و مشاغل کا سبق بھی جو روزانہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، ہم حیات طیبہ سے سیکھ سکتے ہیں، حتیٰ کہ انسانی اوصاف اور ان کے ذہنی و جذباتی کیفیات و احوال مثلاً خوشی و رضامندی، غم

غصہ، عزم واستقلال، صبر و توکل، شجاعت وشہامت، استغنا، وقناعت، جود و سخا، تواضع وانکسار وغیرہ تک کی تعلیم بھی ہم کو اسوۂ نبی سے ملتی ہے، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حالت اور اس کے سارے مظاہر کا سبق ہم سیرت نبوی سے سیکھ سکتے ہیں،

چھٹے خطبہ میں سیرت نبوی کے عملی پہلو کو دکھایا گیا ہے یعنی آپ نے جو اخلاقی تعلیمات دیں، آپ خود اُن کا عملی نمونہ تھے، اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے ہر قسم کے اخلاقِ فاضلہ کے واقعات نقل کئے گئے ہیں،

ساتویں خطبہ میں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں پیغام محمدی کی جامعیت، عالمگیریت اور اس کی پیدا کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ جملہ مذاہب کی مشترک اور بنیادی تعلیمات یعنی ایمان وعمل صالح عقائد وعبادات اور اخلاق ومعاملات وغیرہ کو اسلام ہی نے تکمیل تک پہنچایا، اور دوسرے مذاہب کی کتابیں اور اُن کے صحیفے اس حیثیت سے بالکل ناقص ہیں، چنانچہ توراۃ وانجیل میں عقائد وعبادات تک کی تعلیمات اتنی مبہم غیر واضح اور ناصاف ہیں کہ ان سے عیسوی اور یہودی مذہب کے عقائد وعبادات کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکتی، توراۃ میں دنیادی قوانین البتہ کسی قدر تفصیلی ہیں، مگر اوّلاً وہ نہایت سخت ہیں جس کا تحمل انسانی طاقت کے لئے دشوار ہے، دوسرے بعض حیثیتوں سے ناقص بھی ہیں، پھر اُن کا دائرہ بنی اسرائیل تک محدود ہے، اسلام نے ان کی سختی کو کم اور اُن کی خامیوں کو دور کرکے اُن کو معتدل اور عالمگیر بنایا، اسی طرح اخلاق کے ناقص حصہ کی تکمیل کی، اسلام سے پہلے انسان ہر اس قوت کے سامنے جس سے اس کے وہم میں ضرر کا اندیشہ یا فائدہ کی امید ہوتی، سربسجود ہو جاتا تھا جس سے بے شمار دیوی اور دیوتا پیدا ہو گئے تھے، عیسائی اور یہودی مذہب میں اگرچہ اس قسم کے معبودانِ باطل کی پرستش نہیں ہوتی تھی، مگر ان میں قسیسوں اور رہبانوں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیکر اس کی عظمت نمایاں کی، اور یہ تبلایا کہ انسان کائنات کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ کائنات اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس لئے دنیا کی کوئی چیز بھی اُس کی

پرستش کے لائق نہیں ہے، توحید کا یہ پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا، دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے انسان کو فطرۃً خطاکار قرار دیا ہے جس سے نجات پانا دشوار ہے، اسی سے آریائی مذاہب میں تناسخ کا اور عیسائیوں میں کفارہ کا عقیدہ پیدا ہوا، مگر اسلام نے انسان کو فطرۃً معصوم اور گنہ گاری کو برے اعمال کا نتیجہ قرار دیا، اور ہر انسان کے لئے نجات کی راہ کھلی رکھی، اسلام سے پہلے انسانیت نسلی اور جغرافی حدود میں بٹی ہوئی تھی، اسلام نے ان حدوں کو توڑ کر عالمگیر انسانی برادری قائم کی، دوسرے تمام مذاہب میں درمیانی واسطوں کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا تھا اسلام نے ان واسطوں کو ختم کر کے براہ راست ہر انسان کا خدا سے تعلق قائم کیا، پیغمبروں اور صلحاء و اخیار کے ساتھ غلو عقیدت نے شرکت و بت پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی، اسلام نے ان کا صحیح درجہ متعین کر کے شرک کے ایک بڑے وسیلہ کو ختم کیا،

آٹھویں خطبہ میں پیغام محمدیؐ کی بنیادی تعلیمات کو تبلایا اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب میں بھی خالص توحید نہیں تھی جن مذاہب میں کسی حد تک تھی بھی تو وہ خدا اور بندہ کے تعلق کی تشبیہ و تمثیل اور اس کی ذات و صفات میں التباس و اشتباہ اور افعال خداوندی کی نیرنگیوں کی غلط تعبیر کی وجہ سے شرک میں بدل گئی تھی، اسلام نے اس سارے التباس و اشتباہ کو دور کر کے شرک کا ہر دروازہ بند کر دیا، اور دنیا میں توحید خالص کو پہلی مرتبہ پیش کیا، اسی طرح عبادت کے غلط مفہوم یعنی ترک دنیا، رہبانیت اور جسمانی اذیت کو مٹا کر اس کی صحیح شکل تبلائی، اور اس کا اصلی مقصد و منشا، واضح کیا،

اسلام سے پہلے انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، اور وہ دوسری ملک کی سمجھی جاتی تھی، آقا غلام کو قتل کر سکتا تھا، دیوی اور دیوتاؤں پر انسانوں کی قربانی عام تھی، عورت شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہو جاتی تھی، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، اسلام نے انسانی جان کا احترام قائم کیا، اور کسی انسان کو خود اپنی جان کا بھی مالک نہیں بنایا، چنانچہ خودکشی تک حرام قرار دی، حسب و نسب کی تفریق کو مٹا کر تقوی کو معیار فضیلت اور اسلام کے عالمگیر تصور کے ماننے والوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا، اور اس قبیل کی دوسری

اصلاحات کین،

یہ خطبات مدراس کے مباحث کا اجمالی خلاصہ ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، درحقیقت یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت وعظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے ثبوت کے لئے کافی ہے،

سیرت عائشہؓ

سلسلۂ سیرت کی تیسری کتاب سیرت عائشہؓ ہے، اگرچہ وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سوانح عمری ہے لیکن ایک حیثیت سے وہ بھی سیرت نبوی کا ضمیمہ ہے، انسان کی زندگی مین اس کی رفیقۂ حیات کو بڑا دخل ہوتا ہے خصوصاً اگر بیوی تعلیم یافتہ اور ہوشمند ہو تو شوہر کے کامون کی تکمیل مین اس سے بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کے حالات سے شوہر کی زندگی کے مختلف رخون پر روشنی پڑتی ہے، اس حیثیت سے ازواج مطہرات کے حالات بھی سوانح نبوی کا جزء ہین، یون تو بہت سی ازواج مطہرات تھین لیکن وہ بیویان جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج مین زیادہ دخل تھا، اور جنھون نے کسی نہ کسی حیثیت سے دین کی خدمت کی، اور جن سے اسلام کی تبلیغ واشاعت مین مدد ملی، دو تھین، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ، حضرت خدیجہؓ نے سب سے پہلے آپ کی نبوت کی تصدیق اور اس زمانہ مین آپ کی تشفی و دلدہی کی جب کہ کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا، اور ان کی دولت و دعا سے اسلام کی ابتدائی تبلیغ واشاعت مین بڑی مدد ملی، مگر ان کا انتقال ہجرت نبویؐ سے کئی سال پہلے ہوگیا تھا اور اسلام کی ترقی کا زمانہ انھون نے نہین پایا، حضرت عائشہؓ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد مین آئین، اور وفات نبوی تک برابر ساتھ رہا، اور اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک زندہ رہین، اس لئے اسلام کے عروج وترقی کا پورا زمانہ انھون نے آنکھون سے دیکھا، اور اس زمانہ کے بعض واقعات وحوادث مین بھی انھون نے حصہ لیا، وہ اپنی ذاتی صلاحیتون اور گوناگون اوصاف وخصوصیات کے اعتبار سے اپنے دور کی نسوانی دنیا مین امتیازی درجہ رکھتی تھین، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ مین مختلف حیثیتون سے ان کا نمایان حصہ رہا ہے،

وہ بڑی ذہین و ذکی اور ابتدا سے علم و تعلیم کی شائق تھیں، اور اُن کے شعور کی تکمیل تعلیم و تربیت کا وقت میں کھلیں، جہاں ہر وقت دینی تعلیم کا چشمۂ ابلتا رہتا تھا، اس لئے حضرت عائشہؓ پوری طرح اس چشمہ سے سیراب ہوئیں، اور تعلیم کے جو مواقع بھی ان کو ملے، اُن سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا، اور اُن کو سب سے زیادہ اس کے مواقع حاصل تھے، اس لئے اُن کے ذوق و شوق اور تعلیم نبوی نے ان کو اپنے زمانہ کی بڑی عالمہ بنا دیا اور تفسیر و حدیث فقہ و فتاوی وغیرہ دینی علوم میں اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی، اور تفقہ کلام و حقائق اسرار دین تک پر اُن کی نگاہ بڑی گہری اور مجتہدانہ تھی، جس کا اندازہ ان کی روایات اور اُن کے فقہی مسائل سے ہوتا ہے، ان علوم میں وہ نہ صرف عورتوں بلکہ جماعتِ صحابہ میں امتیازی درجہ رکھتی تھیں، اور بڑے بڑے صحابہ محدثین، اور ائمہ اُن سے استفادہ کرتے تھے، وہ باقاعدہ دینی علوم کا درس دیتی تھیں جن میں بڑے بڑے علما شریک ہوتے تھے۔ حج کے زمانہ میں جب مکہ میں ساری دنیائے اسلام کا اجتماع ہوتا تھا، اُن کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا، اُن کے پاس دور دراز سے فتاوی آتے تھے، خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ تک ان مسائل میں جو اُنکے علم میں نہ ہوتے تھے، اُن کی جانب رجوع کرتے تھے، اگر اُن کے فتاوی کو جمع کیا جائے، تو کئی ضخیم جلدیں ہو جائیں گی، اُن کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، غرض حضرت عائشہؓ کے ذریعہ دینی علوم کی بڑی اشاعت ہوئی خصوصاً عورتوں سے متعلق بیشتر دینی احکام و مسائل انہی سے مروی ہیں، دینی علوم کے علاوہ، وہ اس زمانہ کے دوسرے مروجہ علوم، انساب شعر و ادب اور تاریخ وغیرہ میں بھی مہارت رکھتی تھیں،

انھوں نے طویل عمر پائی، اور حضرت امیر معاویہ کے زمانہ تک زندہ رہیں حضرت عثمان کی شہادت کے بعد جو انقلاب برپا ہوا، اور جس نے مسلمانوں کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر کر دیا، اور اُن کی تلواریں آپس ہی میں بے نیام ہو گئیں تو اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لئے حضرت عائشہؓ نے اس زمانہ کی سیاست میں بھی حصہ لیا، اور آخر تک اصلاح حال کی کوشش کرتی رہیں، مگر فریقین کے فتنہ انگیز عناصر کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں جس شرکت کا انھیں بعد میں بڑا افسوس رہا،

غرض دینی علوم کی مسند سے لیکر رزمگاہ و سیاست تک حضرت عائشہؓ کے نہایت نمایاں کارنامے ہیں،
جو اسلام نے عورتوں کو صالح ترقی کے جو حقوق عطا کئے ہیں، حضرت عائشہؓ کی ذات اس کا عملی نمونہ تھی،
انھوں نے اپنی ذہانت و قابلیت سے جنس نسوانی کا درجہ بلند کر دیا، اور عملاً ثابت کر دکھایا کہ ایک مسلمان
عورت نسوانی حدود میں رہ کر بھی علمی، اجتماعی اور سیاسی کاموں اور دنیا کے دوسرے حقوق و فرائض کی
ادائگی میں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکتی ہے، وہ عورت تھیں اس لئے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی
تعیین و تصریح اُن کے تحفظ اور عورتوں کی عظمت و وقار قائم کرنے میں اُن کا بڑا حصہ ہے، اور ان امور سے متعلق
اُن کی کثرت روایتیں اور واقعات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اس لئے سیرت نبویؐ کے اس پہلو کی وضاحت،
اسلام میں جنس نسوانی کے حقوق کی تعیین، اُن کے تحفظ و نگہداشت اور اس کی عملی مثال کی حیثیت سے سیرت نگار
نبویؐ ہی کے قلم سے حضرت عائشہؓ کی سوانح نگاری کی ضرورت تھی، چنانچہ اسی نقطہ نظر سے سیرت عائشہ لکھی گئی
ہے، جس میں اُن کے حالات، اُن کے اوصاف و کمالات، اُن کے علمی و دینی اور سیاسی خدمات کو بڑی تفصیل سے دکھایا
گیا ہے، اور ان کے اور حضرت علیؓ کے تعلقات اور جنگ جمل کے بارہ میں جو غلط واقعات مشہور ہیں، اور اس سلسلہ میں
بعض اسلامی فرقے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کے متعلق مستشرقین جو اعتراضات کرتے ہیں، اُن کی
پوری تنقید و تردید کی گئی ہے، اس سوانح عمری سے یہ پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو کتنے حقوق
عطا کئے ہیں، اور اُن کا درجہ کتنا بلند کیا ہے، اور اس پہلو سے حضرت عائشہؓ نہ صرف اپنے زمانہ کے اعتبار سے
بلکہ موجودہ دور کے نسوانی ترقی کے صحیح اسلامی تصور کے لحاظ سے بھی کتنے بلند درجہ پر فائز تھیں، اور آج بھی ایک
مسلمان عورت اُن کی تقلید کے ذریعہ صحیح اور صالح ترقی کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے،

ارض القرآن

اس سلسلہ کی تیسری کتاب ارض القرآن ہے، اگرچہ اس کا موضوع سیرت سے جدا ہے، مگر

بقول مصنف اس کو سیرۃ النبی کا دیباچہ سمجھنا چاہئے، اس کا مقصد کلام مجید کے بعض تاریخی اور جغرافی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق و تنقید ہے، اسلام سے پہلے عربون مین لکھنے پڑھنے کا رواج محض برائے نام تھا، اور اُن کی پرانی تاریخ کا دار و مدار زیادہ تر زبانی روایات اور قومی داستانون پر تھا جس مین غلط و صحیح کی آمیزش ناگزیر ہے، اس لئے ایک زمانہ تک عربون کی قدیم تاریخ پر پردہ پڑا رہا، اسلامی عہد مین جب تاریخ نگاری شروع ہوئی تو عربون کی زبانی روایات کی بنا پر عرب قبل اسلام کی تاریخ کے بارہ مین صحیح و غلط ہر قسم کے واقعات شامل ہو گئے،

مستشرقین نے جب عربون کی تاریخ پر تحقیقات شروع کی، تو انھون نے قدیم یونانی اور رومی مورخین و جغرافیہ نویسون کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ وسائل سے معلومات حاصل کئے جو عربون کی قدیم روایات کے خلاف تھے،

کلام مجید مین عبرت و بصیرت کے لئے عرب کی قدیم قومون، اُن کے انبیاء و رسل اور اُن کے اماکن و آبادیون کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے بعض بیانات مستشرقین کی تحقیقات سے مطابقت نہین کرتے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بے احتیاط مفسرین نے ان بیانات کی تفسیر مین عربون کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات نقل کر دین، اس سے مستشرقین کو یہ بھی اعتراض کا موقع مل گیا، جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مشتبہ ہو جاتی تھی، ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق مین لکھی گئی ہے اگرچہ سیرۃ نبوی کی طرح اس کا طرز بھی مناظرانہ کے بجائے تحقیقی و تنقیدی ہے، اس مین قدیم و جدید دونون ماخذون سے قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور اسکا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے، کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات کی تنقید و تردید کا خصوصیت سے کام ارکھا گیا ہے جس سے دونون مین مطابقت پیدا ہو جاتی ہے یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے، اگرچہ مصنف کی ابتدائی تصنیف ہو مگر علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تنقید کے لحاظ سے وہ درجۂ کمال کی تصانیف سے کم نہین ہے اور اسکے شروع کا حصہ جسکو کتاب

کا مقدمہ سمجھنا چاہئے، اور جس میں عرب کی تاریخ و جغرافیہ کے قدیم و جدید ماخذ یعنی قرآن مجید، تفسیری روایات، اسرائیلیات، کلام عرب، عرب قدیم کی تاریخ کے اسلامی مصنفین، ان کی تاریخوں، کتب جغرافیہ، انساب عرب، اسرائیلی لٹریچر، رومی و یونانی مصنفین کی کتابوں، عربوں کی قدیم روایات اور جدید اثری اکتشافات پر بحث و تنقید ہے، بڑا فاضلانہ اور محققانہ ہے، اور اس بحث و تنقید ہی سے اعتراضات کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد عرب قدیم کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ، اور کلام مجید میں جن اقوام و قبائل اور مقامات کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق ہے، اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید، توراۃ، یونانی و رومی مصنفین کے بیانات اور اثری اکتشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام تجارت، اور ان کے مذاہب پر تفصیل کے ساتھ بحث اور جدید ماخذوں سے کلام مجید کے بیانات کی تائید و توثیق کی گئی ہے اور مستشرقین کے بیانات کا رد کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب گویا عرب کی قدیم اقوام و ملل اور اماکن و مقامات کے متعلق کلام مجید کے بیانات کی تاریخی، جغرافی اور اثری تفسیر ہے، اور اس کی روشنی میں اس کے بہت سے تاریخی و جغرافی بیانات کی تائید و وضاحت ہو جاتی ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

مذکورہ بالا علمی و مذہبی تصانیف کے علاوہ متعدد خالص علمی تصانیف بھی ہیں، مگر وہ بھی تکلماً مقصد سے خالی نہیں ہیں، ان میں عرب و ہند کے تعلقات اور خیام زیادہ اہم ہیں، اور اپنے معلومات کی وسعت اور تلاش و تحقیق میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں، اور ان کو یورپین زبانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف کے مقابلہ میں بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان دونوں میں عرب و ہند کے تعلقات امتیازی حیثیت رکھتی ہے، یہ کتاب اگرچہ خالص علمی و تاریخی ہے، مگر اس کا مقصد ہندو و مسلمانوں کے تعلقات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان دونوں کے تعلقات کی قدامت اور اس کی خوشگواری دکھانا ہے، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کے لئے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان میں

سے ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤن سے مسلمانون کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ رہا ہے اور وہ سندھ کی اسلامی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان سے مسلمانون کا تعلق غزنوی عہد سے شروع کرتے ہین جن کا مقصد اُن کے نزدیک ہندوستان کی دولت کا سمیٹنا تھا اور اسی مقصد کے ماتحت بعد کے مسلمان حکمران خاندانون نے ہندوستان کو فتح کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے عربون کا تعلق اس کی فتح بلکہ اسلام کے ظہور سے بھی صدیون پہلے سے تھا، عرب ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور شام و عراق کا تجارتی سامان ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین تک لیجاتے تھے، اور ان ملکون کی چیزین مذکورۂ بالا ملکون مین پہنچاتے تھے، پھر ظہورِ اسلام کے بعد ہندوستان مین اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے مسلمانون اور ہندوؤن کے درمیان علمی مذہبی اور تمدنی ہر قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقون مین ان کی بڑی بڑی آبادیان قائم ہو گئی تھین، اور ان کے محاسن اخلاق کی وجہ سے ہندو راجہ ان کا بڑا لحاظ اور اُن کے ساتھ بڑی رعایت کرتے تھے، جہان اُن کی زیادہ آبادی تھی، وہان ان کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلہ کے لئے قاضی مقرر تھے،

عرب و ہند کے تعلقات مین تعلقات کے ان تمام پہلوؤن کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے، یہ کتاب پانچ ابواب مین منقسم ہے، پہلے باب مین ہندوستان سے عربون کے تعلقات کی ابتدا پر بحث کی گئی ہے، اور تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ مین یہ بھی ثابت کیا گیا ہے، کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فنیشین عرب تھے، جو شام کے ساحل پر بس گئے تھے، اور اُن کے علمی اثرات ظہورِ اسلام سے بہت پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے، اس کے بعد ہندوستان پر مسلمانون کے ابتدائی حملہ اور سندھ کی فتح کا مختصر تذکرہ ہے، پھر مسلمان جغرافیہ نویسون ابن خرداذبہ ۲۵۰ھ، سلیمان تاجر ۲۳۷ھ، ابوزید حسن سیرافی ۲۶۴ھ، ابودلف مسعر بن مہلہل ۳۳۱ھ، بزرگ بن شہریار ۳۰۰ھ، مسعودی ۳۰۳ھ، اصطخری ۳۴۰ھ، ابن حوقل ۳۳۱ھ، بشاری مقدسی ۳۷۵ھ، البیرونی ۴۰۰ھ، ابن بطوطہ ۷۹۰ھ وغیرہ کی کتابون سے جو خود ہندوستان آئے تھے، اور اپنی کتابون مین اس زمانہ کے ہندوستان کے حالات لکھے ہین، اور وہ ہندِ قدیم کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہین، ہندوستان کے حالات نقل کئے ہین، اور ان

دکھلایا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان جغرافیہ نویسون نے ہندوستان کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے، ان بیانات سے ہندوستان کے عام حالات کے ساتھ ہندو مسلمانون کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس کے بعد ان جغرافیہ نویسون اور مورخین کا تذکرہ ہے، جو خود تو ہندوستان نہین آئے مگر اپنی کتابون مین اس کے حالات لکھے ہین،

دوسرے باب مین تجارتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ مین ان تعلقات کی قدامت، مشرق و مغرب کے درمیان عرب تاجرون کی اہمیت، ان ملکون کے درمیان تجارتی راستون، ان کی درمیانی منزلون اور بندرگاہون کی تفصیل، ہندوستان مین دوسری بیرونی قومون کی تجارت، ہندوستان کی پیداوار، مصنوعات اور دوسرے سامان تجارت، تجارتی درآمد و برآمد، عرب کے ہندو بیوپاریون، بحر ہند مین چلنے والے جہازون کی وسعت، ہندوستان کی بحری تجارت اور دولت و ثروت وغیرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور آخر مین یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بحر روم کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت سے بحر ہند مین آنے کے راستے کے اکتشاف کا سہرا پرتگالیون کے سر باندھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت اس کے پہلے رہنما عرب تھے، اور پرتگالیون کو ہندوستان پہنچانے والا ایک عرب بحری ابن ماجد تھا

تیسرا باب علمی تعلقات پر ہے، اس مین یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانون اور ہندوستان کے درمیان علمی تعلقات کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بنی امیہ کے آخری دور ہی سے شروع ہو گیا تھا، مگر خود مسلمانون کی اصل علمی تاریخ جب انھون نے دوسری قومون کے علوم کی جانب توجہ کی عباسیون کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے، اسی زمانہ سے مسلمانون نے دوسری علمی قومون کے علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا، اور یونانی، سریانی اور ایرانی علوم وغیرہ کی طرف توجہ کی تو اس سلسلہ مین انھون نے ہندوستان سے بھی علمی روابط پیدا کئے، عباسی خلفاء خود بھی صاحب علم اور علم و فن کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے لیکن عباسی دور کی علمی ترقیون کا سہرا بڑی حد تک برمکی خاندان کے سر ہے، اس لئے اس کتاب مین ہندوستان سے عربون کے علمی تعلقات کے باب کا آغاز برامکہ کی تاریخ سے کیا گیا ہے، ان کے متعلق عام شہرت تو یہی ہے کہ وہ مجوسی تھے، مگر اس کتاب مین عقلی دلائل اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ برامکہ نسلاً ایرانی مگر مذہباً بدھسٹ تھے، یہ محققانہ بحث دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، اس رشتہ سے ہندوستان سے ان کا مذہبی تعلق تھا، اور ہندو

اس زمانہ مین بہت سے علوم کا مرکز تھا، اس لئے برامکہ نے یہان کے مختلف علوم کے فضلا رکو بڑے اعزاز و اکرام سے بغداد بلایا، ان کی بڑی قدردانی کی اور اُن کے علوم سے پورا فائدہ اٹھایا، جس کا سلسلہ برامکہ کے زوال کے بعد مامون کے عہد مین بھی قائم رہا، بلکہ مامون کی علم نوازی کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا، اس بحث مین طب، نجوم، جوتش، ہیئت، ریاضی، بیطاری، موسیقی، جنگ و سیاست، منطق و کیمیا، جفر و رمل، قصص و حکایات، اور اخلاق و حکمت وغیرہ کی سنسکرت کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین، اور ان ہندو علما رکا جنھون نے بغداد مین علمی خدمات انجام دین مفصل تذکرہ ہے، اس باب کا خاتمہ البیرونی کے حالات پر کیا گیا ہے جس نے قدیم ہندوستانی علوم اور اس کی تاریخ و تہذیب کی اتنی خدمت انجام دی، جو اس زمانہ کے کسی ہندو سے بھی نہین ہو سکی، اُس نے ہندوستانی علوم پر بہت سی کتابین لکھیں، سنسکرت کی بعض کتابون کا عربی مین ترجمہ کیا، اس کی کتابین قدیم ہندوستانی علوم اور ہندوستانی کلچر کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہین،

چوتھا باب مذہبی تعلقات پر ہے، ہندو مسلمانون کے مذہبی تعلقات کے سلسلہ مین ہم کو انگریزون کا پڑھایا ہوا صرف یہ سبق یاد رہ گیا ہے، کہ مسلمان ہندوون کو کافر و مشرک سمجھتے تھے، اُن کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، اُن سے جزیہ وصول کرتے تھے، اُن کی عبادت گاہون کو ڈھاتے تھے، اور اس کے ثبوت مین ترک، افغان اور مغل سلاطین کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہین، اس لئے اس باب مین پہلے اس شہرت عام پر بحث و تنقید کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وسط ایشیا کے جن مسلمان خاندانون نے ہندوستان مین حکومت کی، ان کے بعض سلاطین اور عہدہ دارون کو چھوڑ کر وہ قوم کی مجموعی حیثیت سے اسلام کے صحیح نمایندے نہ تھے، اور نہ اُن کی حکومت کو اسلامی نظام حکومت سے کوئی علاقہ تھا، اور اُن کے افسرون کو جو زیادہ تر غیر مسلم یا بالکل جدید الاسلام تھے اسلام کے صلح و جنگ اور حاکمیت و محکومیت کے قوانین ہی سے واقفیت نہ تھی، اور جس زمانہ مین ان خاندانون نے حکومت کی، اُن کی قوم مسلمان بھی نہ ہوئی تھی، اور اس مین ہزارون غیر مسلم تھے، جو لوگ مسلمان بھی تھے، وہ بھی اسلامی مدوح سے محض بیگانہ، اور اپنی قومی خصوصیات پر قائم تھے، اور انھون نے جو کچھ بھی کیا، خواہ وہ مذہب کے نام پر

گیا ہو، مگر درحقیقت اس کو مذہب سے کوئی علاقہ نہ تھا، او محض سیاست کے لئے تھا، اس لئے اُن کے ذاتی اعمال کی بنا پر اسلام پر رکھنا اور پوری مسلمان قوم کو ان پر قیاس کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہو،

اسلام کے اصل نمایندے عرب تھے، وہ حکمرانی میں اسلام کے مقرر کئے ہوئے حدود سے آگے نہ بڑھتے تھے، اور ان کی حکومتوں میں محکوموں کے ساتھ زیادتی کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں، جن سے دنیا کا کوئی حکمران خاندان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، مذہب کے معاملہ میں وہ بڑے روادار تھے، جن جن قوموں پر انھوں نے حکومت کی اُن کے مذہبی عقائد و مذہبی نظام بلکہ مذہبی رسم و رواج تک میں کوئی مداخلت نہیں کی، اور نہ اُن کی عبادت گاہوں میں ہاتھ لگایا، اور جزیہ اور خراج کے لینے کے بعد انکو تمام حقوق میں مسلمانوں کے برابر قرار دیا، خود سندھ میں عربوں کی حکومت اسی روش پر رہی، اور ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دے کر اُن کی عورتوں سے شادی اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کی ممانعت کے علاوہ ہر چیز میں اُن کو اہل کتاب کے برابر حقوق عطا کئے، مسلمانوں کے اس فیاضانہ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ سندھ کے ہندو مسلمان حکمرانوں کے گرویدہ ہو گئے، اس سلسلہ میں اہل کتاب، شبہ اہل کتاب کا فرق مسلم اور جزیہ کے مسائل کی بحثیں بھی آگئی ہیں، جن سے ان امور کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں،

اس کے بعد اصل بحث مذہبی تعلقات کی شروع ہوتی ہے، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ گوناگون تعلقات کی بنا پر عربوں کو یہاں کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا، اور انھوں نے بڑی محنت سے اس کی تلاش و تحقیق کر کے اپنی کتابوں میں اُن کے حالات لکھے، اور ان مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے علاوہ جن کے نام اوپر گذر چکے ہیں، اور جنھوں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کے عام حالات کے ضمن میں یہاں کے مذاہب کا بھی حال لکھا ہے، دوسرے مسلمان علماء میں ابن ندیم، مطہر بن طاہر مقدسی، ابوالعباس ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی نے خاص طور سے اپنی کتابوں میں ہندو مذاہب، اُن کے فرقوں، اُن کے عقائد اور مذہبی رسوم کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں، اور ان بیانات کو نقل بھی کیا ہے، اس سلسلہ میں فرقہ سمنیہ پر جس کا عربی تاریخوں میں ذکر آتا ہے، بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ

بدھ تھے جنہیں شمنیہ کہتے تھے، ہندوستان میں ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ میں خصوصاً جن علاقوں سے مسلمانوں کا تعلق رہا زیادہ تر بدھ آباد تھے، اس لئے وہی عربوں سے زیادہ متاثر ہوئے، اور اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان میں پھیلنے لگا بعض ہندو راجہ بھی مسلمان ہوئے، اور آج سے ایک ہزار سال پہلے سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کرایا، ہندوستان میں توحید خالص کا تصور بھی، اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، گو ہندوؤں کے بعض فرقوں میں ایک حد تک توحید پائی جاتی تھی، مگر تنزیہی اور کامل توحید اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، اسی طریقہ سے مسلمان بھی ہندوؤں سے متاثر ہوئے اور اس بحث میں دونوں پر ایک دوسرے کے اثرات دکھائے گئے ہیں،

آخری اور پانچواں باب "ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے پہلے یعنی غزنویوں سے قبل مسلمانوں کی آبادی" ہے، یہ باب درحقیقت گذشتہ ابواب و مباحث کا نتیجہ اور ان کا حاصل ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ دکن اور جنوبی ہند میں جہاں مسلمانوں کی حکومت سب سے آخر میں قائم ہوئی، وہیں مسلمان سب سے پہلے آباد ہوئے اور اس کا کوئی ساحلی علاقہ اور تجارتی شہر مسلمانوں سے خالی نہ تھا بعض بعض شہروں میں اُن کی تعداد کئی کئی ہزار تھی، اور یہاں کے ہندو راجاؤں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا، اور وہ ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے، ان کو ہر طرح کی سہولتیں دے رکھی تھیں، اُن کی تمام آبادیوں میں مسجدیں تھیں، اور جہاں اُن کی آبادی زیادہ تھی، وہاں اُن کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلے کیلئے ائمہ و قضاۃ مقرر تھے، ان مسلمانوں کے اخلاقی اثر سے بعض ہندو راجہ مسلمان بھی ہوئے۔

اس بحث میں ان علاقوں میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ اُن کی بڑی اور مرکزی آبادیوں، اور اُن کے حالات کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور مالدیپ، سراندیپ، ملیبار، کولم (ٹراونکور)، کاروّمنڈل، جیمور (چیول) تھانہ (بمبئی) کھنبایت، گجرات، گندھار (بھڑوچ کے قریب) بیرم، گوگہ (بھاؤنگر کے پاس) چندا پور (گوا کے قریب) ہنور (ضلع بمبئی) ملیبار میں ابی سرور، باکنور (موجودہ برکور) منگلور، ہیلی (کنانور کے قریب) جرفتن (موجودہ سری کنا پورم) دہ فتن، بدفتن، پنڈارنی، کالی کٹ، چالیات، سینون کالوٹی، وراثمندر، علاقہ میسور کا

قدیم پایۂ تخت) وغیرہ مین مسلمانون کی آمد، اُن کی آبادیون، اُن کے نظام ہندوؤن سے اُن کے تعلقات اور اس زمانہ کے ان علاقون کے مختلف حالات لکھے گئے ہین،

آخر مین سندھ و ملتان مین مسلمانون کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے حملہ سے بھی پہلے یہان کئی سو مسلمان آباد تھے، سندھ کی فتح سے لیکر امویون کے خاتمہ بلکہ عباسیون کے ابتدائی زمانہ تک سندھ مین مسلمانون کی تاریخ بہت صاف ہے، مگر اس کے بعد سندھ کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ بڑی گنجلک اور پیچیدہ ہے، غزنویون اور غوریون سے پہلے یہان کئی مسلمان خاندانون نے حکومت کی، بلکہ ایک ایک وقت مین دو دو حکومتین رہی ہین جن کے حالات تاریخون مین بہت کم اور اتنے گنجلک ہین کہ ان خاندانون اور ان کے حکمرانون کی تعیین مشکل ہے، اور بعض خاندانون کے متعلق یہ بھی نہین معلوم کہ اُن کی اصل و نسل کیا تھی، اور اُن کا زمانہ کونسا ہے، اس باب مین ان تمام خاندانون کی تحقیقات کر کے اس کی تعیین کی گئی ہے، اور ان کے حالات لکھے گئے ہین جس سے سندھ کے حکمرانون کا سلسلہ بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے، یہ بحث بڑی محققانہ ہے، ان خاندانون کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے سندھ کے بڑے بڑے شہرون کے مختلف قسم کے حالات لکھے ہین، اور ان پرانے شہرون کے جاے وقوع کی جن کے اب صرف نام تاریخون مین باقی رہ گئے ہین تعیین کی گئی ہے، اور اس بحث پر یہ اہم کتاب ختم ہو جاتی ہے، ان مباحث سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

خیّام

علمی سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خیّام ہے، اس نامور حکیم اور جلیل القدر فاضل کو اہل یورپ نے ایک عیش پسند اور بدمست رندلاابالی کی شکل مین پیش کیا ہے، جو ہمہ تن شاہد و شراب مین غرق رہتا تھا، اور جس کا مقصد زندگی رندی اور عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھا، اور اس مشرب کا وہ بہت بڑا مبلغ بھی تھا، مگر اس تصویر کو حکیم عمر خیام کی اصل شکل سے کوئی علاقہ نہین ہے، وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا

عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا، مذہبی حیثیت سے وہ ایک دیندار مسلمان تھا، اور مذہبی علوم میں پوری دست گاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، مگر اہل یورپ کا مذاق خود رندانہ ہے، اس لئے رباعیات خیام کے ظاہری آئینہ میں اس کی جو تصویر دیکھی وہ ہم مشربی کی بنا پر بڑی دلکش نظر آئی، چنانچہ اسی کو اصل سمجھکر اس کی اتنی تشہیر کی کہ عمر خیام آبدست شرابی ہم معنی بن گئے، حالانکہ کسی شاعر کے کلام سے اس کی عملی زندگی کا قیاس صحیح نہیں ہے، خصوصاً مشرقی شاعری میں تو سراسر غلط ہے، بڑے بڑے مسلّم صوفی شعراء کا کلام بھی شراب و شاہد کے ذکر سے خالی نہیں ہے، مولانا روم، شمس تبریز، ابوسعید ابوالخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شراب و شاہد کی رنگینیاں نظر آتی ہیں، اور خواجہ حافظ کا کلام تو پورا میخانہ ہے، لیکن بعض ظاہر بین حافظ کی شراب کو بھی شراب ناب ہی پر محمول کریں لیکن اُن کے علاوہ اور بزرگوں کو کون رند شاہد باز کہہ سکتا ہے، اس کو فارسی شاعری کا عیب سمجھا جائے یا ہنر، شراب و شاہد، چنگ و رباب، گل و بلبل، پھر وصال اُس کے ایسے لوازم بن گئے ہیں کہ اُن کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی شاعری کے میدان میں نہیں چلا جا سکتا، اور نہ اُن کے بغیر اس میں حسن و دلکشی پیدا ہوتی ہے، اس لئے حکیم و فلسفی اور صوفی صافی شعراء بھی ان کنایات و استعارات کے استعمال پر مجبور رہتے، اور غالب نے تو صاف صاف کہدیا ہے کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس نے خیام کے شاہد و شراب کو کیوں حقیقت پر محمول کیا جائے، اس کے علاوہ اس کی بہت سی رباعیاں فلسفیانہ اور اخلاقی بھی ہیں، ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے، خصوصاً جب تاریخی حیثیت سے یہ معلوم و مسلّم ہو کہ وہ ایک بڑا عالم حکیم اور صوفی تھا جس پر اس کی تصانیف شاہد ہیں، مگر ظاہر پرست اہل یورپ نے اس کی رندانہ رباعیوں کے آئینہ میں اُس کی ظاہری تصویر دیکھ کر اسی کو اصل سمجھ لیا، اگر انھوں نے رباعیوں کے بجائے تاریخ کے اوراق اور خود خیام کی فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ خیام کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اس کی اصلی شکل نظر پڑتی، کتاب خیام میں اس کی صحیح شکل پیش کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ رند شاہد باز نہیں

بلکہ بڑا عالم حکیم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا،

خیام پر مشرق سے زیادہ مغرب میں لکھا گیا ہے، مگر جس قدر لکھا گیا ہے، اسی قدر اس کے حالات و واقعاتِ زندگی میں مختلف قسم کی تاریخی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہوگئی ہیں، مصنف نے اس کے سوانح کے تمام مشرقی و مغربی ماخذوں سے اُن پر تنقید کرکے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے، اور نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بھی پہلی مرتبہ اس بسط و شرح اور تحقیق و تنقید کے ساتھ خیام کے حالات لکھے گئے ہیں، اور اس کے علمی کمالات اور علمی کارناموں پر مفصل تبصرہ کرکے دکھایا ہے کہ عمر خیام اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل حکیم، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور صوفی مشرب فلسفی تھا، اور اس کے سوانح کے سلسلہ میں سلجوقیوں کے دور کے علمی اور خیام کے معاصر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں،

بعض دوسرے شعراء کے کلام کی طرح عمر خیام کی رباعیاں بھی دوسرے شعراء کی رباعیوں سے غلط ملط ہوگئی ہیں اسلئے رباعیات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے خیام کی رباعیات کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے، اور رباعیات کے ایک قدیم اور صحیح قلمی نسخہ کی نقل بھی کتاب میں شامل کردی گئی ہے، اس کے علاوہ خیام کے سات نادر فلسفیانہ رسالوں کو جن میں سے چھ عربی میں ہیں، اور ایک فارسی میں تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مرتب کرکے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس کے گوناگون علمی مباحث مختلف النوع تاریخی معلومات، اور مصنف کی وسعت و دقتِ نظر اور تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے،

حیاتِ شبلی

ان کے علاوہ علمی سلسلہ کی دو اہم کتابیں اور ہیں، ایک حیاتِ شبلی اور دوسری عربوں کی جہازرانی ان میں حیاتِ شبلی مختلف حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے، وہ ایک جلیل القدر اور شفیق استاذ کے حضور میں ایک فاضل شاگرد رشید کا نذرانۂ عقیدت ہے، اس لئے مصنف نے اس میں اپنا پورا تصنیفی کمال اور زورِ قلم صرف کر دیا ہے، علامہ شبلی

کی زندگی میں جب کسی نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا، تو وہ اس کو ٹال گئے، اور اسی قسم کی ایک فرمائش کے سلسلہ میں انھوں نے ہونہار شاگرد کو لکھا تھا کہ دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے تم ہی جب کبھی دنیا کے اور کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا" اس نے حیات شبلی کی تالیف ہمیشہ مصنف کے پیش نظر رہی، مگر یہ اتفاق ہے کہ ان کو اسی وقت اس کی تالیف کا موقع ملا جب دنیا کے اور کاموں سے بڑی حد تک فرصت مل چکی تھی، چنانچہ حیات شبلی ان کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہو گیا،

مولانا شبلی کی ذات جامع کمالات تھی، وہ قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے، اور جدید افکار و خیالات کے واقف کار بھی، قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی، اور جدید طبقہ کے شریک بزم بھی رہے تھے، وہ مفکر و محقق بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی، انشا پرداز بھی تھے، اور خطیب بھی، مورخ بھی تھے، اور متکلم بھی مصلح بھی تھے، اور ماہر تعلیم بھی، اور سیاست کا ذوق بھی رکھتے تھے، اور ان سب میں ان کے بڑے کارنامے ہیں، وہ محض پرانے طرز کے عالم نہ تھے، بلکہ زمانہ کے نئے حالات و ضروریات کی بنا پر بہت سے خیالات میں انقلابی تھے اور قدیم بنیادوں پر جدید قصر ملت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے، اس لئے ان کے خیالات پرانے اور نئے دونوں طبقوں سے مختلف تھے، اور دونوں ان سے کھٹکتے تھے، خصوصاً عربی تعلیم اور علماء کی مذہبی و تعلیمی اصلاح کے لئے انھوں نے جو انقلابی قدم اٹھایا وہ بالکل نیا تھا، وہ ان دونوں کی اصلاح کرکے ان کو جدید دینی و ملی ضروریات کے مطابق بنانا چاہتے تھے، جس کا نمونہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے اور اسلامی علوم و معارف پر غور و فکر اس کی تعبیر و ترجمانی اور علمی تلاش و تحقیق کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا جس کا نمونہ دارالمصنفین ہے، ان دونوں باتوں سے پرانے علماء بالکل نامانوس تھے، اس لئے علامہ شبلی کو طرح طرح کی بدگمانیوں کا سامنا ہونا پڑا، لیکن بالآخر زمانہ کے حالات نے سب کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا، اور جو اس سے الگ رہے، ان کے ملی خدمات کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا، یہ علامہ شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی عاقبت اندیشی اور فراست سے دینی علوم اور علماء کا بھرم قائم کر دیا، ورنہ قدیم اور جدید کی کشمکش میں ان کا وقار قائم رہنا مشکل ہو جاتا

مگر اسی کے ساتھ وہ جدید تعلیم وتہذیب سے مرعوب نہ تھے، اور اس کے بعض محاسن کے اعتراف کے ساتھ اس کی خامیوں کے ناقد بھی تھے. اور سیاسیات میں آزادانہ خیالات رکھتے تھے، اس لئے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے مطمئن نہ تھا.

اس کے علاوہ مسلمانوں کی تمام قومی تحریکیں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا اصلاحی علمی ہوں یا سیاسی جو اُن کے زمانہ میں اٹھیں، ان سب میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اور بعض تحریکوں کے وہ خود بانی اور رہنما تھے، اور ان میں سے کسی راہ میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود مجتہد اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے، اسلئے اس زمانہ کے بعض اشخاص و جماعتوں سے انکو اختلافات بھی پیش آئے، اس لئے ان کی سوانح کا اس طرح لکھنا کہ مولانا شبلی کے کمالات و کارنامے اُن کی جدت و ندرت اور قائدانہ و مجتہدانہ حیثیت بھی نمایاں ہو جائے، اور کسی آبگینہ کو ٹھیس بھی نہ لگنے پائے، بڑا نازک کام تھا، مگر مصنف نے بڑی خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے، اور مولانا شبلی کے کمالات اور اُنکے کارناموں کا ایسا دلکش مرقع تیار کیا ہے جس میں اُن کے سارے خط و خال نمایاں اور وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں، اس کتاب میں اُن کے ذاتی سوانح کے ساتھ ان کے علمی و تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کارناموں کی پوری تفصیل آگئی ہے، اور چونکہ انکی پوری زندگی قومی و ملی کاموں میں گذری اور انھوں نے مسلمانوں کے گوناگوں کام انجام دیئے، اور ان کی ہر تحریک میں سرگرم حصہ لیا، اس لئے اُن کے سوانح کے سلسلہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ ملی سرگذشت بھی آگئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ نہایت فاضلانہ اور اپنی جگہ پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں پرانے صوبہ اودھ خصوصاً اس کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی علمی، دینی، اخلاقی اور روحانی تاریخ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جمع کی گئی ہے جو کسی ایک کتاب میں اس طرح مرتب اور یکجا نہیں مل سکتی، اس طرح یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کے حالات اور کارناموں کا مرقع بھی ہے، اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ بھی،

عربون کی جہازرانی

یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ سنہ ۱۹۳۱ء مین اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمایش پر دیئے گئے تھے جنھیں کتابی شکل مین شائع کر دیا گیا تھا، جیسا کہ اوپر عرب و ہند کے تعلقات پر تبصرہ کے سلسلہ مین لکھا جاچکا ہے کہ عرب قدیم الایام سے ایک تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے، وہ مصر و افریقہ اور عرب شام اور عراق کا تجارتی مال ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین لیجاتے تھے، اوران ملکون کا سامان مذکورہ ممالک مین پہنچاتے تھے، ورظہور اسلام کے بہت پہلے سے اپنے زمانہ کے بڑے بحرپیما، اور جہازران تھے، اس کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب سے نکل کر افریقہ اور یورپ کی طرف بڑھا، تو اُن کے سمندر عربون کے بحری بیڑون کا جولانگاہ بن گئے، اور ایک صدی کے اندر وہ بحر عرب خلیج فارس بحیرۂ اسود بحر قلزم اور بحر روم کے حکمران بن گئے، اور ان کی بحری حیثیت واہمیت تقریباً وہی ہو گئی جو اس زمانہ مین برطانیہ کی ہے، اور اس سلسلہ مین انھون نے علمی اور عملی دونون حیثیتون سے فن جہازرانی کو بڑی ترقی دی،

ملک گیری کے بعد جب دوسری صدی سے ان کی علمی ترقی کا دور شروع ہوا تو علم و فن کے دوسرے شعبون کے ساتھ سمندرون کے متعلق تحقیقات اور جغرافی اکتشافات کے سلسلہ مین انھون نے اس زمانہ کے معلوم سمندرون کا چپہ چپہ چھان مارا بعض نئے سمندرون کا پتہ چلایا، مختلف سمندرون کے راستے دریافت کئے، نامعلوم جزیرون کا اکتشاف کیا، یورپ ایشیا اور افریقہ کے نامعلوم خطون سے واقفیت پیدا کی، فن جہازرانی کو ترقی دی، اس کے بہت سے آلات ایجاد کئے، سمندرون کے حالات اور جہازرانی پر کتابین لکھین، عربون کی جہازرانی مین ان سب کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے،

پہلے لغات عرب اور کلام مجید سے عربون کی بحری واقفیت اور ان کی جہازرانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اس کے بعد عہد رسالت مین عربون کے بحری سفرون کا حال لکھا ہے، پھر خلافت راشدہ

مین جہازرانی کی ترقی کا ذکر ہے، اس کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہوا تھا، اور امیر معاویہ نے شام کی گورنری کے زمانہ مین بحرِ روم کے متعدد جزائر فتح کئے تھے، اور اسلامی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ ۳۱ھ مین جب قیصر روم نے چھ سو جہازون کے ساتھ شام کے سواحل پر حملہ کیا، تو اسلامی بیڑے نے اس کو نہایت فاش شکست دی، لیکن عربون کی بحری ترقی کا اصل زمانہ اموی عہد ہے، اس زمانہ مین بحرِ روم اسلامی بیڑے کی ترک وتاز کا جولانگاہ بن گیا، اور مسلمانون نے چند دنون کے اندر سسلی اور اسپین کا پورا جزیرہ اور اٹلی کے بعض حصے فتح کر لئے، اور بڑھتے بڑھتے فرانس تک بڑھتے چلے گئے،

ان فتوحات کے سلسلہ مین مختلف حیثیتون سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اور امویون کا بحری بیڑا اس زمانہ کا سب سے زیادہ طاقتور بن گیا، اس کے بعد بنی عباس کے زمانہ مین اگرچہ مشرقی خلافت مین بحری سرگرمی کم ہوگئی تھی مگر مغرب مین بنی امیہ اندلس اور فاطمیہ مصر کے یہان اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور عباسیون کے عہد مین علمی و فنی حیثیت سے جہازرانی کو بڑی ترقی ہوئی، اس لئے ان دونون زمانون کی ترقی کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے، اور اس سلسلہ مین عرب اور عراق کی پانی اور عربون کی قائم کردہ نئی بندرگاہون کا بھی ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد مشرقی ملکون مین عربون کی تجارت کے حالات ہین، اور اس سلسلہ مین مغربی ہند کی بندرگاہون سے لیکر سیلون، برہما، جاوا، سماٹرا، وغیرہ جزائر شرق الہند اور چین تک کی بندرگاہون، یہان عربون کی تجارت اور اُن کے اثرات کی تفصیل ہے، پھر افریقہ کے سواحل یعنی بحرِ روم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکون سسلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ مین عربون کی جہازرانی اور اس کی بندرگاہون کے حالات ہین،

پھر بحرپیمائی اور فن جہازرانی کے متعلقات مین عربون کے علمی کارنامون، اور ان کے ایجادات واکتشافات کا ذکر ہے، اور اس سلسلہ مین سمندرون کے بارہ مین عربون کے علم، ان کی پیمائش، بحر ابیض سے ان کی واقفیت، عرب جہازرانون کی تحقیقات، بحرِ محیط، (اٹلانٹک) کے جزائر مین انگلینڈ، آئرلینڈ، وبار انگلستان، جزائر خالدات (فرجوبنلس آئرلینڈ) بحرِ چین اور بحرالکاہل مین جاوا، سماٹرا، جاپان، فلپائن، نڈیگاسکر اور کمورو سے ان کی تحقیقات

اور ان کی کتابوں میں ان کے بارہ میں ان کے بیانات کی تفصیل ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ بحر روم اور بحر اٹلانٹک سے افریقہ کے سواحل پر گھوم کر بحر ہند میں آنے کا راستہ دریافت کرنے والا پہلا شخص ایک عرب ابن ماجد تھا، اور واسکو ڈی گاما اسی کے ذریعہ ہندوستان پہنچا تھا،

اس کے بعد عربوں کے بنائے ہوئے بحری نقشوں، ان کے تعمیر کردہ لائٹ ہاؤس اور میل کے نشانات کا ذکر اور جہازرانوں کے رہنما ستاروں، سمندری ہواؤں اور ان کے جغرافیہ پر عربوں کی تصانیف کا حال ہے، پھر قطب نما کی ایجاد اور ترقی کی بحث اور عربوں کے ایجاد کردہ ان فلکی آلات کا ذکر ہے جن سے جہازرانی میں مدد ملتی ہے پھر عربوں کے قائم کردہ جہازرانی کے کارخانوں، مصنوعی بحری لڑائیوں، ڈوبے ہوئے جہازوں کے نکالنے، جہاز کے عملہ، جہازسازوں، جہازی سازوسامان وغیرہ جہاز کے مختلف متعلقات کی تفصیل، اور بحر ہند اور بحر عرب کے راستوں کا تذکرہ ہے، اور مسلمانوں کی بحری ترقی کے خاتمہ پر یہ داستان ختم کی گئی ہے، آخر میں عربوں کی بحری تصانیف کا اجمالی تذکرہ ہے، یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، اور اس میں اس موضوع پر جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں، اُن کا صحیح اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں،

مضامین ومقالات وخطبات

ان تصانیف کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مضامین لکھے علم وادب کا مشکل ہی سے کوئی گوشہ ایسا نکل سکتا ہے جو تشنۂ تحقیق رہا ہو، اور ان کی نظر سے چھوٹا ہو، انھوں نے اسلامی علوم وفنون کے بہت سے مستور گوشے بے نقاب کئے، علمی و مذہبی مباحث پر لکھا، ادبی ولسانی مسائل پر بحث وتنقید کی، مختلف اعتراضات کے جواب دیئے، تاریخی گتھیوں کو سلجھایا، قومی و ملی مسائل پر اظہار خیال کیا، مسلمانوں کے علمی وتمدنی کارناموں کو اس طرح پیش کیا کہ اسلامی تاریخ علم وفن اور تہذیب وتمدن کا تماشا گاہ نظر آنے لگی، غرض اسلامی علوم وادب کی ہر شاخ، اور ہر پہلو پر معلومات کا ایک دفتر جمع کر دیا، اور جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کو

اس تحقیق و جامعیت کے ساتھ لکھا کہ پھر اس پر اضافہ کی گنجایش نہ چھوڑی،

صرف ایک موضوع اردو زبان و ادب پر ان کے مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ان کا مجموعہ کئی سو صفحات میں نقوشِ سلیمانی کے نام سے شائع ہوا ہے، اس سے اُن کے دوسرے مضامین کی تعداد کا قیاس کیا جا سکتا ہے اگر ان سب کو جمع کیا جائے، تو ان کا مجموعہ کئی جلدوں میں آئے گا، ان میں سے بعض مضامین اتنے طویل ہیں کہ مستقل رسالوں کی شکل میں شائع ہوئے، مثلاً رسالۂ اہلِ سنت والجماعت، بہادر خواتینِ اسلام، حیاتِ مالک، اور خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام، ان سب مضامین پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اگر صرف ان کے ناموں کی فہرست لکھی جائے، تو بھی کئی صفحوں میں آئے گی، اس لئے مختلف موضوع و مسائل سے متعلق نمونۃً کچھ مضامین کا نام لکھا جاتا ہے، اس سے ان کی نوعیت، اور اُن کے تنوع کا اندازہ ہوگا، مثلاً

محبتِ الٰہی اور اسلام، اسلام میں حیوانات کیساتھ سلوک، احکام القرآن، توکل، صبر کا قرآنی مفہوم، مذہب کا قانونی حصہ، ارضِ مقدس کی داستان، ارضِ حرم، اور قرآنی احکام، خلیل اللہ کی بشریت، ذبحِ عظیم، قربانی کا اقتصادی پہلو، فنِ تصوف اور محدثین و صوفیہ میں تطبیق کی راہ، لفظ اللہ کے معنی، اور اسم اعظم کی تحلیل، اسلام اور حریت، یا جبر و قدر، کیا خلقی معذورین کی پیدایش انصاف الٰہی کے خلاف ہے، اسلامی عقیدہ کے مطابق بچوں کی پیدایش کے احوال کا اختلاف، امتِ مسلمہ کی بعثت، تخلیق عالم کا مقصد، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، سنت، وحی، وحی اور ملکۂ نبوت، کیا قرآن پاک انسانی ذہن و دماغ سے ماخوذ ہے، حکومتِ الٰہیہ، اور مسلمانوں کا مطمحِ نظر،

اسلامی تہذیب و تمدن، مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ، اسلام اور زنانِ ہند، تحفظ حقوق زوجین، احادیث و سیر کی تحریری تدوین، اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ، خلفائے اسلام کا اقتدار، خلفائے راشدین کا طرزِ حکومت، موجودہ ہندوستان میں کاشتکاروں کے حقوق، سیاسیات اسلام کے نظریے، مسلمانانِ ہند کی مذہبی تنظیم، دنیائے اسلام میں ذہنی انقلاب، عالم اسلام کی تنظیم کا مسئلہ، نظم ملت، اندماج کا علاق

دفتر قضاۃ مسلمانانِ ہند کا شرعی نظام،

ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی مسلمانوں کے عہد حکومت میں مرہٹوں کا فوجی نظام، عہدِ اسلام میں تعلیم نسوان کی درسگاہیں، ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی، ہندوستان میں علم حدیث، مسلمان حکما اور یونانی فلاسفہ، نظام اور اس کا فلسفہ، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، عربوں کی بحری تصنیفات، رد آمن کیتھلک کی چند من گھڑت کہانیاں، برک اور پرکھ، واقدی پھر واقدی، اصولِ تہنید، ہندوستانی کی اصلیت اور اس کے کچھ اصول، حجاز کے کتب خانے، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا ذخیرہ،

ان مضامین کے علاوہ ان مقالات کی بھی خاصی تعداد ہے، جو مختلف علمی مجالس میں پڑھے گئے، اور معارف میں شائع ہوئے، اس قسم کے بیشتر مقالات مضامین سے زیادہ اہم ہیں، چنانچہ اُن کی متعدد اہم کتابیں مثلاً عرب و ہند کے تعلقات، خطبات مدراس، خیام اور عربوں کی جہاز رانی اصل میں مقالات ہی تھے، جو ترمیم و اضافے کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئے، ان میں حسب ذیل مقالات زیادہ اہم ہیں، مسلمانوں کی آیندہ تعلیم، یہ مقالہ جامعہ ملیہ میں پڑھا گیا، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، اور تمدنِ آج، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دو مختلف اجلاسوں میں پڑھے گئے، اردو کیونکر پیدا ہوئی، ناگری پرچارنی سبھا کے لئے لکھا گیا تھا، ابوالبرکات بغدادی اور اس کی کتاب المعتبر دائرۃ المعارف حیدرآباد میں عربی میں پڑھا گیا تھا، اور اس کا اردو ترجمہ معارف میں شائع ہوا، عرب اور امریکہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا تھا، اس کے علاوہ اور بھی مقالات ہیں، مگر ان سب کا استقصا مقصود نہیں،

انھوں نے مجلس خلافت جمعیۃ علماے ہند، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۃ المعارف حیدرآباد، آل انڈیا ہسٹری کانگریس وغیرہ مختلف علمی و دینی مجالس کے اجلاسوں اور قومی و ملی کانفرنسوں کی صدارت کی، اور ان میں صدارتی خطبے پڑھے، ان میں سے جو خطبات تحریری تھے، وہ معارف میں شائع ہوئے، اس لئے وہ محفوظ ہیں، وہ جملہ امور و مسائل میں خواہ وہ علمی ذخیرہ

نیا قومی و ملی ایک سوچی سمجھی ہوئی پختہ اور صائب اور مستقل خیالات و نظریہ رکھتے تھے اور ان کا علمی ذوق و مشاہدہ اور ہمہ گیر تھا
کوئی خطبہ اور تقریر بھی خواہ وہ کسی موضوع پر ہو افکار و نظریات اور علمی و تاریخی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی علمی مجالس اور علمی جماعتوں کے
ومات کا خزانہ اور قومی و ملی کانفرنسوں اور جلسوں کے خطبات زیر بحث مسئلہ کے متعلق تفکر و تدبر فہم و بصیرت
اور سلجھی ہوئی رائے کا درس ہوتے تھے، ان کا کوئی خطبہ بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں ہے، علمی و تاریخی
بات میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے شعبۂ علوم و فنون اور اسی کانفرنس کے اجلاس
ت کے شعبۂ اردو اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس مدراس کے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ کے خطبات
رت علمی و تاریخی معلومات کا گنجینہ اور ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، طب سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا لیکن طبیہ
دل پٹنہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت اسلامی طب کی پوری تاریخ ہے، ان خطبات کی بڑی تعداد ہے
صرف چند خطبات کا تذکرہ کر دیا گیا،

ان کے علاوہ ان کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے وہ مختلف النوع وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل
مات پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے، اس لئے اُن کے شذرات و مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے
ۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن سے گذشتہ تیس پینتیس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و
امات اور دوسرے پیش آمدہ حالات و واقعات کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، اور اُن کے متعلق مصنف کے
ت معلوم کئے جا سکتے ہیں، اُن کے شذرات غور و فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور
زو اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کا شاہکار ہیں،

مذکورۂ بالا تصانیف اور مضامین و خطبات کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے انکی وسعت و وقت نظر،
جامعیت و ہمہ گیری کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں وہ جامعیت علوم کی تنہا مثال تھے اُن میں
رشد و ابن خلدون، ابن تیمیہ و ابن قیم، غزالی و رومی شاہ ولی اللہ و مجدد سرہندی کے علمی جلووں کی جھلک
نظر آتی تھی، اسی لئے ان کی تحریروں سے مسلمانوں کو جس قدر فیض پہنچا، اس کی مثال اس زمانہ میں کمتر

ملے گی، صحیح العقیدہ لیکن بے عمل مسلمانوں کو باعمل، طالبِ دین کو دیندار اور دیندار کو متقی بنا دینا بہت آسان ہے لیکن پڑھے لکھے جوانوں کو شیشہ میں اتارنا اور تعلیم یافتہ متشککین اور منکرین کو دین کی راہ پر لگانا بہت دشوار ہے، اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس دشوار کام کو سب سے زیادہ سید سلیمان کی تحریروں نے انجام دیا، اور جو لوگ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے نام سے شرماتے تھے، وہ اس پر فخر کرنے لگے، اور ان میں اس کا ذوق اور اس کی طلب پیدا ہو گئی، اس طرح سید سلیمان ندوی نے ہزاروں گم کردہ راہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو راہِ راست پر لگایا۔

ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اسلامی علوم و فنون پر تحقیقات کا ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا، اور اس کو اس درجہ تک پہنچا دیا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں اس کی شہرت ہے، اور اس کے کاموں کو عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور اُن کی تربیت کردہ جماعت کے علاوہ اُن کی تصانیف اور مضامین نے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی سنجیدہ علمی و تحقیقی کاموں کا مذاق پیدا کر دیا، چنانچہ آج جن مسلمانوں میں بھی اس قسم کا ذوق نظر آتا ہے، اور ہندوستان میں جہاں بھی اس قسم کا کام ہو رہا ہے، اس میں سید سلیمان ندوی کی تصانیف کو بڑا دخل ہے، اس لئے وہ درحقیقت ایک علمی دور اور ایک خاص مکتبِ خیال کے بانی تھے، اور جب تک علمی دنیا قائم ہے، سید سلیمان کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔

ان کا مزاج و مذاق اگرچہ ابتدا سے دینی تھا، اور اُن کی کسی دور کی تحریریں بھی دینی روح سے خالی نہیں ہیں، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ دین کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے، و من احسن من اللہ صبغۃ، اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہو گیا تھا، اس دور میں اُن کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہو گیا، اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا، یہاں تک کہ اپنے بعض پرانے خیالات اور تحریروں سے رجوع کیا، اور اُن کے نزدیک اُن کے قلم سے جو بھول چوک ہوئی تھی، اس کو رجوع و اعتراف کے نام سے معارف میں شائع کیا، یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس کو بڑا آدمی ہی انجام دے سکتا تھا، اور یہ اُن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

اس روحانی انقلاب اور اس کے نتائج کے بارہ میں دو قسم کے خیالات ہیں، ایک جماعت اس کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتی، اور اس کو ان کی علمی عظمت کے منافی تصور کرتی ہے، اس میں اس کو ان کے علمی مرتبہ کا استخفاف نظر آتا ہے، دوسری جماعت اس انقلاب اور اس کے بعد ہی کی زندگی کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور حاصل زندگی سمجھتی ہے اور اس سے پہلے کے علمی کاموں کو ناقابل اعتنا تصور کرتی ہے، یہ دونوں رائیں غلط اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں ان دونوں زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، اور اس سے ان کا مرتبہ اور مقام اور زیادہ بلند ہو گیا، اس سے نہ اُن کی علمی منزلت میں کوئی فرق آتا ہے، اور نہ ان کے علمی کاموں کی اہمیت گھٹتی ہے ان کے علمی کاموں کا مقصد بھی دین و ملت اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت تھا، اس لئے مذہبی حیثیت سے بھی ان کی اہمیت پوری طرح قائم رہتی ہے، اور اُن کے روحانی انقلاب کو اتنی اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ اس کے مقابلہ میں اُن کے علمی کارناموں پر پانی پھیر دیا جائے، یہ دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں، اور ایک کو بڑھانے کے لئے دوسری کی اہمیت نہیں گھٹائی جا سکتی، یہ کوئی غیر معمولی واقعہ یا نئی مثال نہیں ہے، اس قسم کے واقعات دوسرے اکابر اسلام کی زندگی میں بھی پیش آ چکے ہیں، امام غزالی، مولانا روم حتیٰ کہ امام رازی تک کو ان مراحل سے گذرنا پڑا، لیکن آج کون صاحب علم و نظر اُن کے علمی کارناموں کی اہمیت کا انکار یا اس کی زندگی کے دونوں رخوں سے کسی کا استخفاف کر سکتا ہے، اس لئے اس سے سید صاحب کی بھی کسی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا،

درحقیقت یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، نہ سید صاحب رحمہ اللہ نے راہ سلوک اختیار کرنے کے بعد علمی کاموں کو چھوڑا، اور نہ ان کا یہ راہ اختیار کرنا کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض ہو سکتا ہے، ان کا مذاق ضرور بدل گیا تھا، لیکن علمی کاموں کا سلسلہ بدستور جاری رہا، انھوں نے بہت سے خالص علمی مضامین مثلاً ابو البرکات بغدادی، اور اس کی کتاب المعتبر، ابن منصور کو سولی نہیں پھانسی دی گئی، عہد اسلامی میں تعلیم نسواں کی درسگاہیں، عدل جہانگیری کا ایک واقعہ، کیا مرزا بیدل عظیم آبادی تھے، برکت اور برکھ، ملا خیر اللہ مہندس کے چند رسائل، قنوج، اور توقیت وغیرہ اس کے بعد لکھے، حیات شبلی

جیسی، ہم کتاب بھی اسی زمانہ کی ہے، مکتوب فرنگ کے نام سے اپنے ان خطوط کا مجموعہ مرتب کیا جو وفد خلافت کے سفر میں لندن سے اپنے احباب واعزہ کو لکھے تھے، یا درفتگان کے نام سے اُن کے لکھے ہوئے وفیات کا جو مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے اس کو بھی وہ ترتیب دے چکے تھے، معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، اُن کی ترتیب بھی پیش نظر تھی، علمی مجالس کی شرکت بھی برابر جاری رہی، چنانچہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، انجمن ترقی اردو وغیرہ کے جلسوں کی صدارت انہیں کی اور اپنے خطبۂ صدارت پڑھے، اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی راہ میں آنے کے بعد انھوں نے علم کا کوچہ بالکل چھوڑ دیا تھا یا اس کی کوئی اہمیت اُن کی نگاہ میں نہ رہ گئی تھی، اگر کسی خاص حالت میں ان کی زبان یا قلم سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جس سے تصنیف و تالیف یا علمی کاموں کی بے وقعتی ظاہر ہوتی ہو، تو اس کو حقیقت پر محمول کرنا خود دیکھنے والوں کی خوش فہمی ہے، جو لوگ شطحیات صوفیہ تک کی تاویل کرتے ہیں، کم از کم ان سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی،

اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا، راہ سلوک میں آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دوسروں کو دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے تو ہمارا انجام کیا ہوگا، یہ اشارہ سمجھکر فرمایا میں یہ نہیں کہتا کہ علمی کام بے کار ہیں یا ان کی ضرورت نہیں رہی، یا اُن کو چھوڑ دیا جائے، بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطۂ نظر بدل جانا چاہیے اور اس کے لئے خود اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے، میں نے عرض کیا، اور ان خالص علمی کاموں کے متعلق کیا ارشاد ہے جس کے لئے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، اس کے جواب میں حسب عادت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا، شوق سے کیجئے اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے، اور اُن کی دلآویز مسکراہٹ پر بات ختم ہو گئی،

لیکن جو لوگ اُن کے سلوک تصوف پر اعتراض کرتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں، ہر انسان پر دوسروں کے حقوق و فرائض کے ساتھ اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں، اور دوسروں کی خدمت اور صلاح و فکر کے ساتھ اپنی

ذکر بھی ضروری ہے، اس مین کوئی شبہ نہین کہ سید صاحب نے جو علمی کام انجام دیے، ان کا مقصد دین و ملت ہی کی خدمت تھا، اس لئے وہ بھی اُن کے اعمالِ حسنہ مین داخل ہین لیکن ان کا تعلق زیادہ تر دوسرون کی اصلاح سے تھا، اسلئے اس فرض کی ادائیگی اور اس کام کی تکمیل کے بعد اگر انھون نے اپنی فلاح و تکمیل کے لئے کوئی راستہ اختیار کیا تو اسمین اعتراض کی کونسی بات ہے، درحقیقت ایک مسلمان کی زندگی کے مراحل کی فطری ترتیب یہی ہے، اور اسوۂ نبوی بھی یہی تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اگرچہ آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تعلق مع اللہ اور رضائے الٰہی کی طلب سے خالی نہ تھا، اور آپ کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ، اسکی تعلیمات کی اشاعت، روے زمین پر حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور اُس کے احکام کے نفاذ کی جد و جہد مین گذری مگر جب ان کامون سے فراغت اور دین کی تکمیل ہوچکی تو حضرت کے ساتھ تسبیح و تحمید اور توبہ و استغفار کا حکم ہوا، اور سورۂ فتح نازل ہوئی، اور جیسا کہ بخاری اور حدیث کی دوسری کتابون مین ہے، اس کے بعد آپ کا زیادہ وقت تسبیح و تہلیل مین بسر ہونے لگا، اس لئے سیرت نگار نبوی نے بھی اسی اسوۂ نبوی پر عمل کیا، اور ہر مسلمان کا یہی عمل ہونا چاہئے،

درحقیقت ان دونون زندگیون مین کوئی تضاد نہین ہے، بلکہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ، ایک ہی عمارت کے نقش و نگار اور ایک ہی گلدستہ کے مختلف رنگ و بو کے پھول ہین، جن کے بغیر تصویرِ حیات کی تکمیل نہین ہوتی، اس لئے جو لوگ ان دونون پہلوؤن مین سے کسی کو بھی نظرانداز کرتے ہین، وہ خود ناآشنائے حقیقت ہین،

تاریخ ارض القرآن

کے متعلق
میرے ذاتی احساسات و تجربات

از

جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

الفاظ یا ترتیب کے معمولی ردو بدل سے پیش رو مصنفین کی کتابوں کو نقل کر کے اپنی طرف منسوب کر لینا، شاید دنیا لی عام کتابی زبانوں کا یہ ایک ایسا عارضہ ہے جو نہ کسی ملک کے ساتھ مخصوص ہے، اور نہ کسی فن اور نہ علم کی حد تک تہ مہ محدود نظر آتا ہے، خصوصاً نصابی کتابوں کے ساتھ تجارتی اغراض جب سے وابستہ کر دیئے گئے ہیں، تو اس ارضہ نے وبائی شکل اختیار کر لی ہے۔ شمار کرنے والے ان کتابوں کے لکھنے والوں کو مصنفین اور مؤلفین ہی کے یل میں شمار کرتے چلے آئے ہیں، اور آج بھی ان لوگوں کو مصنف و مؤلف ہونے کی سند ملتی ہی چلی جا رہی ہے، حالانکہ سی کے کلام (نظم یا نثر) کو بغیر کسی ردو بدل کے کوئی اپنی طرف اگر منسوب کرے، تو لگانے والے اب بھی اسے سرقہ اور علمی دزدکاری کا بے محابا الزام عائد کر دیتے ہیں لیکن سوچا جائے تو پہلے اور دوسرے فرق میں عملاً و حقیقۃً ندان فرق نہیں ہے،

لیکن تصنیف و تالیف ہی کے دائرہ میں کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو کسی علم و فن کے کسی فروع کو اس وقت تک چھوتی بھی نہیں، جب تک کہ اس کے متعلق کوئی نیا پہلو تازہ و نادر نگاہ اُن کے سامنے

نہ آئے۔ سچ پوچھئے تو صحیح معنون مین مصنف اور مؤلف قرار پانے کا قدرتی استحقاق ان ہی بزرگون کو حاصل ہوا ورنہ دوسرون کی باتون کا دہرانے والا اگر سارق نہین تو ایک نقل نویس کاتب کے سوا اور بھی کچھ ہے، دنیا مین کتابون کی تعداد مین غیر معمولی اضافہ زیادہ تر انہی وزدانِ علم اور نقل نویسون ہی کی وجہ سے ہوا ہے، اور کی یہ داستان کافی ہے مین کہنا چاہتا ہون کہ ہمارے سید علامہ مولینا سلیمان الندوی قدس اللہ سرہٗ، جو اردو زبان کے اعظم المصنفین بجا طور پر سمجھے جاتے ہین، اور انھون نے اپنے بعد ہزار ہا ہزار صفحات کی شکل مین اپنی تالیفی یادگارین چھوڑی ہین آپ اُن کو پڑھ جائیے، سب سے بڑی خصوصیت سید صاحب مرحوم کے تصنیفات مین کم از کم اس فقیر کو تو یہی نظر آتی ہے کہ انھون نے جو کچھ بھی ارقام فرمایا ہے، اس مین نئی بات، نئے معلومات پڑھنے والون کو ملتے چلے جاتے ہین یا کم از کم پہلے جو باتین مجمل شکل مین تھین، سید صاحب کی تحقیق و تدقیق نے ان ہی باتون کو زیادہ مفصل اور زیادہ اُجاگر کر دیا ہے۔

مرحوم غفر اللہ لہ دینیات و اسلامیات کے عالم تھے لیکن اسی کے ساتھ عربی فارسی، اردو زبانون کے ادب کا بھی صالح ذوق رکھتے تھے، اسی لئے اُن کے عام علمی کارنامون کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی سے ہے لیکن اسی کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی اُن کو کچھ لکھنے کا موقع اگر مل گیا، تو اُس مین بھی انھون نے ہمیشہ نئی راہین پیدا کین، اور ایسے اچھوتے نتائج اُن کی بدولت اس سلسلہ مین بھی دنیا کے سامنے آئے کہ ہر طرف مرحبا و آفرین کے ساتھ اُن کا استقبال کیا گیا۔

قرآن و حدیث، فقہ، کلام و تصوف، اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی، اور ان سب کے مباحث جس موضوع پر سید صاحب نے قلم اٹھایا ہے، اور اس سلسلہ مین نئے معلومات، یا نئے نقاط نظر سے دنیا کو انھون نے روشناس کیا ہو بتانے والے اگر اُن کی فہرست بنائین گے، تو میرا خیال ہے کہ اُن کی تعداد لاکھون نہین، تو ہزارون تک ضرور پہنچ جائے گی، یہ اُن کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطمح نظر سے اُن کے تصانیف اور شائع کردہ مقالات مضامین کا جائزہ لے، دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے قلیل عرصہ مین اس بندۂ خدا نے جدید معلومات اور متعلقہ علوم

کے سلسلہ میں کتنے نئے پہلوؤں کا اضافہ فرمایا، بڑے بڑے مصنفین کی کتابوں میں بمشکل گنی چنی چند ہی نئی چیزیں ہاتھ آتی ہیں، لیکن سید صاحب کی کتابوں میں قدم قدم پر نئے انکشافات اچھوتے معلومات سے پڑھنے والوں کا دامن تحقیق بھرتا چلا جاتا ہے، یہی ان کی تصنیفات کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، معارف کے سلیمان نمبر نکالنے کا ارادہ جب کیا گیا تو فقیر نے چاہا تھا کہ قرآن کے متعلق سید صاحب کی مشہور کتاب "تاریخ ارض القرآن" سے ان چیزوں کو نتخب کر کے پیش کرے، جن کے متعلق اپنا خیال یہی ہے کہ ایک خاص پہلو سے "قرآن فہمی" کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہو گیا ہے، اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر عوام ہی نہیں خواص کے فہمیدہ و سنجیدہ طبقات بھی سید صاحب کی اس نئی علمی کوشش اور اس کے نتائج سے اکثر و بیشتر متاثر ہوئے، میری خواہش تھی کہ سید صاحب کی اس جدید قرآنی خدمت پر سیر حاصل بحث کروں، لیکن ٹھیک ان ہی دنوں میں جب اس مقالہ کی تیاری میں مشغول تھا، بیمار ہو گیا، اور ایسا بیمار کہ پانچ چھ مہینے گذر چکے ہیں اس وقت تک لکھنے پڑھنے کی صلاحیت جیسی کہ چاہئے واپس نہیں ہوئی ہے، احباب دار المصنفین کا تقاضا ہوا کہ واقعی شہیدوں میں شریک ہونے کا موقع اگر نہیں ہے، تو خون ہی لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤں، اسی حکم کی تعمیل کر رہا ہوں،

واللہ ولی الامر والتوفیق،

سید صاحب مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن اول سے آخر تک ایسے معلومات سے بھری ہوئی ہے جو کم از کم علماء کے لیے صرف یہی نہیں کہ نئے ہیں، بلکہ ان معلومات کی راہنمائی میں مطالعہ اور تحقیق کے ارباب ذوق کو تجربہ بتائے گا کہ کافی مدد مل سکتی ہے، عرب کے جغرافیائی معلومات کے مصادر و مآخذ کی طویل فہرست اس کتاب میں درج ہے جن میں اسرائیلی و یونانی و رومانی ادبیات، اور اکتشافات اثریہ کے سوا سید صاحب نے ادبیات اسلامیہ کے ذیل میں جن مطبوعہ اور غیر مطبوعہ عربی زبان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہ ایک ایسی علمی فہرست ہے کہ ہمارے علماء جو انگریزی یا اسی قسم کی جدید عصری زبانوں سے ناواقف ہیں، وہ بھی ادبیات اسلامیہ کی ان کتابوں سے کافی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں، یہ واقعہ ہے کہ سالہا سال کی

کد و کاوش تحقیق و جستجو کے بعد ہم جن کتابون تک رسائی حاصل کر سکتے تھے، سید صاحب کی درج کردہ فہرست سے بیک نظر معلومات کا یہ سارا ذخیرہ ہمارے سامنے اس طرح پر آجاتا ہے، کہ کتابون کے مصنف کون ہیں تصنیف مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ، غیر مطبوعہ شکلون مین ان کتابون کے نسخے کہان کہان پائے جاتے ہین، عموماً ان امور کے متعلق بھی کافی وشافی اشارے ملتے چلے جاتے ہین،

اسی طرح توراۃ اور عہد عتیق و قدیم کا مطالعہ کس طریقہ سے کرنا چاہئے توراۃ کے سوا کتب منیم، ترگوم مدراش اور تالمود نامی کتابون کی اسرائیلی دین مین کتنی اہمیت ہو، اوران کتابون کے مضامین کی نوعیت کیا ہے؟ تاریخ ارض القرآن کے ابتدائی اوراق ہی مین یہ سارے قیمتی معلومات ایک ہی جگہ مین مل جاتے ہین،

عرب اور اس کے جغرافیہ و تاریخ کے ساتھ یورپ کے ارباب تحقیق نے جن معلومات کو وقف عام کیا ہے اور اُن سے غلط یا صحیح نتائج نکالنے کی سنجیدہ کوششین کی ہین، ایک بڑا قیمتی تبصرہ اس سلسلہ مین بھی آپ کو اس کتاب کے شروع ہی مین مل جائے گا، جو دونون مین اس کا شوق پیدا کرتا ہے کہ غیرون کی دلچسپیون کا حال عرب کے ساتھ جب یہ ہے تو ہم مسلمانون کا علمی فرض اس باب مین یقیناً اس سے کہین زیادہ ہونا چاہئے،

بہرحال آپ اس کتاب کو پڑھتے چلے جائیے، کتاب پڑھنے سے پہلے آپ کے جو علمی احساسات، اور معلومات تھے، مین یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہون کہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اُن مین پائین گے کہ ترمیم ہوتی چلی جاتی ہے، سید صاحب کے پیدا کئے ہوئے نتائج سے اتفاق و اختلاف بجائے خود ایک الگ جداگانہ مسئلہ ہے لیکن اُن کی کاوش وکوشش کی داد مین بخل میرے خیال مین صرف تنگ دلی ہی نہین، بلکہ گونہ ایک قسم کی عقلی اور طبیعی سفاہت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے،

وہ کیون جائیے، قرآن مجید کے لفظ "عاد" ہی کے متعلق مین پوچھتا ہون انصاف سے دلون پر ہاتھ رکھ کر کہئے کہ ہمارے علماء کا عام علمی احساس اُس کے متعلق کیا یہی نہین تھا کہ عاد کسی غیر معمولی صفات رکھنے والی شخصیت کی تعبیر تھی، اگرچہ خود قرآن کی یہ تعبیر کہ "قوم نوح کے بعد عاد والے زمین کے خلیفہ بنائے گئے" دلون کے اس عام

احساس ہو کہ "عاد" کسی خاص آدمی کا نام نہیں ہو رہی تھی،

اسی لئے زیادہ وسیع النظری سے کام لینے والے بھی بجائے شخص کے "عاد" کو عرب کے کسی ناپید اشدہ مختصر قبیلہ کا عنوان قرار دیتے تھے، لیکن سید مرحوم نے جب یہ اعلان کیا کہ

"عاد صرف کوئی محدود اور مختصر قبیلہ نہ تھا، وہ ایک عظیم الشان قوم تھی، جو عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی،

اور یہ فرماتے ہوئے کہ عادی تہذیب و تمدن عرب ہی کے کسی خاص علاقہ تک محدود نہ تھا، سید صاحب نے ناقابلِ انکار مستحکم تاریخی و اثری شہادتوں سے یہ ثابت کیا کہ عاد جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ ہوئے اور یہ کہ

"ایشیا، اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے (یعنی عاد کے) زور و قوت کا تماشا گاہ تھا،

(ص ۶۵-۶۷)

اور صرف ایشیا و افریقہ ہی نہیں، بلکہ سید صاحب نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ یورپ ہی کے بعض علاقوں مثلاً یونان و کریٹ تک عربوں کے کسی قدیم تمدن کا جو نشان ملتا ہے، یہ سارے قصے اسی "عاد" سے تعلق رکھتے تھے جو قوم نوح کے بعد زمین کے خلیفہ قرآن کے رو سے قرار پائے تھے،

انصاف سے کہیے کہ قرآنی آیت جس میں عاد کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے،

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح	اور یاد کرو (اے عاد کی قوم والو) جب قوم نوح کے بعد خدا نے تم کو (زمین) کی خلافت بخشی،
(الاعراف)	

اس کا صحیح وزن سید مرحوم کے بیان و تحقیق کے بعد قلوب میں پیدا ہوتا ہو گیا، یہی وزن وہ روایتیں ڈال سکتی ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ اگر کچھ پتہ دیا گیا ہے تو وہ اسی قدر ہے کہ

کانت عاد ما بین الیمن الی الشام	یمن سے شام تک عاد والے چیونٹیوں کی طرح

مثل الذر (ص ۹۶ ج ۳ درمنثور) پھیلے ہوئے تھے،

ورنہ عام طور پر عاد والوں کے متعلق یہی سمجھا بھی جاتا ہے، اور کہا بھی جاتا ہے کہ

فیما بین عمان الی حضرموت عمان سے یمن کے اس علاقے تک محدود تھے،

بالیمن (درمنثور ص ۹۶ ج ۳) جسے حضرموت کہتے ہیں،

یہ دوسروں کے متعلق کیا کہوں سچی بات تو یہ ہے کہ نسلِ انسانی کی تاریخ کو نبوات ورسالات کی تاریخ کی روشنی میں جب ادوار (پیریڈ) پر تقسیم کرنے کی ضرورت جامعہ عثمانیہ کے اسباق کے لئے خود فقیر کو ابتدا میں پیش آئی اور اس سلسلہ میں جیسا کہ میرا دستور تھا، ان پانچ دوروں میں بنی آدم کی تہذیبی و تمدنی اولوالعزمیوں کو تقسیم کرکے بیان کیا کرتا تھا یعنی

(۱) پہلا دور تو از آدم تا قوم نوح کا قرار دیتا تھا،

(۲) دوسرے دور کا نام اپنی اصطلاح میں میں نے دجنیلی تمدن رکھ چھوڑا تھا،

مقصد یہ تھا کہ ایک خاص علاقہ جو دریائے دجلہ اور دریائے نیل کے درمیان محدود تھا اسی کے مختلف مقامات میں عمران وارتقا کا ظہور ہوتا رہا، کبھی اس کی ابتدا جنوبی عرب سے ہوئی کبھی شمالی عرب سے کبھی ارض بابل و نینوہ سے انسانی تہذیب تمدن نے سر اٹھایا اور کبھی دریائے نیل کے کنارے اس کے ہنگامے برپا ہوتے رہے، اسی دور میں عاد و ثمود اور اُن کے انبیاء ھود و صالح (علیہما السلام) اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن اور نمرودی تمدن، آخر میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعونی تہذیب کے مقابلہ پر اس دور کی داستان ختم ہو جاتی تھی

(۳) تیسرا دور میرے خیال کے مطابق تاریخ انسانی کا وہ تھا جب پرانی دنیا کے مشرقی و مغربی، شمالی و جنوبی علاقوں میں بنی آدم کی کافی تعداد آباد نظر آتی ہے۔ اور ہر خطہ کے باشندے اپنے اپنے احوال اور امکانات کے مطابق اپنی اپنی تہذیب و تمدن کی تعمیر میں اس طور پر مصروف و مشغول ہیں کہ دوسرے علاقوں سے ان کا کوئی قوی رشتہ قائم نہ ہوا تھا، چین، ہند، ایران، یونان و روم وغیرہ اقلیموں کی تمدنی تاریخ کا تعلق اسی دور

سے تھا، اسی زمانہ میں شام و فلسطین میں اسرائیلی تمدن برسرِ عروج تھا، اور عرب کے جنوبی حصہ میں سبائی تبع و حمیر وغیرہ نے اسی عہد میں امتیاز حاصل کیا تھا، الغرض یہ تہذیبیں بھی مقامی تھیں، اور اُن کی اصلاح و تصحیح کے لئے بھی مقامی مصلحین خدا کی طرف سے جو اٹھتے رہے، وہ مقامی مصلحین تھے،

(۴) چوتھا دور انسانیت کی تاریخ کا وہ ہے جب مختلف سیاسی و مذہبی عوامل و مؤثرات کے زیرِ اثر سارے مغربی ممالک میں قیصر نامی قوت کو اور سارے مشرقی علاقے میں کسریٰ نامی طاقت کو مرکزیت کا مقام حاصل ہوگیا، قیصر و کسریٰ کے مقبوضات کے درمیان عرب کی سرزمین ایک ایسی سرزمین تھی جس پر نہ پورا اقتدار قیصری کو حاصل تھا، اور نہ کسریٰ کو، یہی وہ زمانہ ہے کہ وسطِ عرب سے

اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ — جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو پھر کسریٰ نہ ہوگا،

ولیھلکن قیصر فلا قیصر بعدہٗ — اور قریب ہے وہ زمانہ بھی جب قیصر بھی ہلاک ہو جائے گا، پھر اس کے بعد قیصر نہ ہوگا،

کا پیغمبرانہ نعرہ بلند ہوا جس نے مغرب و مشرق کے سارے تصوّن ہی کو ختم کر دیا، اور اسی کے بعد دنیا پانچویں دور میں داخل ہوگئی، اس وقت سے آج تک قدرتی کارفرمائیاں توحیدِ عالم کے نظریہ کو واقعہ کا قالب عطا کرتی چلی جارہی ہیں، بے شمار خطوں اور اقلیموں میں بٹی ہوئی دنیا ایک ملک بلکہ شاید ایک شہر ایک بستی کی شکل اختیار کئے چلی جارہی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ ساری نسلِ انسانی ایک ہے، اس کا معبود و خدا ایک ہے، اس کی زندگی کا قدرتی آئین بھی ایک ہے، اس کی کتاب بھی ایک ہے، اس کا نبی بھی ایک ہے، اس کا کعبہ بھی ایک ہے، سارے مقامی حصے حذف کر دیئے گئے، اور وہ حذف ہوتے چلے جارہے ہیں، باہر سے زور لگانے والے اگرچہ "ایک انسان ایک دنیا" کو لاکھوں انسانی قسموں اور بیسیوں دنیاؤں میں تقسیم کرنے پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں[1]، لیکن قدرتی مشیت باہر

---

[1] ان کی مذبوحی حرکتوں کی یہ انتہا ہے کہ شام جیسے مختصر ملک کو انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد لبنان، اسرائیل، فلسطین، شرق اردن، سوریہ پانچ پانچ مستقل علاقوں کی شکل میں بانٹ رکھا ہے، حالانکہ اس مختصر سرزمین کے باشندوں میں نہ

کا امارہ و انسان کا ارادہ نہیں کر سکتا تقسیم و تجزی کی آگ لگانے والے ہی توحید عالم کے ذرائع فراہم کرتے

چلے جا رہے ہیں۔ تخریب ہی والوں سے توحید عالم کی تعمیر کا کام لیا جا رہا ہے، اور لیا جاتا رہے گا،

حتّٰی یکون الدین کلہ للہ، تاآنکہ دین صرف اللہ (خالق عالم) ہی کے

ساتھ وابستہ ہو کر رہ جائے،

باوجود انتہائی اختصار پسندی اور اجمال کے بیچ کا یہ جملہ معترضہ کافی طویل ہو گیا، اقرار یہ کرانا چاہتا تھا

کہ انسانی تاریخ کے ان پنجگانہ ادوار کی ترتیب کے سلسلہ میں مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ کم از کم و جنیلی لحظہ

والے دوسرے دور کے متعلقہ معلومات کی فراہمی میں بہت زیادہ مدد مجھے سید مرحوم کی اسی کتاب تاریخ ارض

القرآن ہی سے اس وقت ملی تھی، جب آج سے تیس پینتیس سال پہلے درس عثمانی کو پہلی دفعہ مرتب کرنے کا مرحلہ

میرے سامنے پیش آیا تھا،

خلاصہ یہی کہ نسل انسانی کے مذکورۂ بالا ادوار و قرون میں سے سید مرحوم کی کتاب تاریخ ارض القرآن

میں مجھے دوسرے دور کے متعلق تاریخی اور تاریخی سے زیادہ اثری اکتشافات سے مدد ملی تھی، بلکہ اسی سے یہ

سمجھ میں بھی آیا کہ قرآن بذات خود گو کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے، اور جس قصص کا تذکرہ اس کتاب میں بھی کیا

گیا ہے، اصلی مقصود سب سے موعظت و بصیرت کا درس ہی ہے تاہم اسی کے ساتھ انسانی تاریخ کے اس

حصہ کو جسے لوگ بھول جانے والے تھے خاص انداز اور طریقہ سے اس حصہ کو قرآن میں محفوظ کر دیا گیا ہے، اور

اس کی مصلحت سمجھ میں آئی کہ پہلے اور دوسرے دور کے متعلق قرآن نے نسبتہً زیادہ تفصیل سے کیوں کام لیا، آخر

کیسی تفصیل ہے کہ قوم نوح[1] کے متعلق آج کوئی چاہے تو قرآن سے ان تاریخی نتیجوں کو پیدا کر سکتا ہے، مثلاً یہ کہ ندا

بقیہ حاشیہ (۲۲۱) زبان ہی کا اختلاف تھا نہ رنگ کا، نہ نسل کا حتیٰ کہ مذہبی حیثیت سے بھی اکثریت کا دین ایک

ہی تھا لیکن با این ہمہ انتہائی بے شرمیوں سے کام لے کر اس غریب ملک کی تکا بوٹی کر دی گئی،

[1] سورۂ نوح میں اسی قوم کی طرف و استغشوا ثیابھم کے الفاظ منسوب کئے گئے ہیں، ثیاب ثوب کی جمع ہے

دباغیا نی ہی نہین بلکہ آب پاشی کے عام ذرائع خصوصاً دریاؤن کو کاٹ کر نہرون کا نظام بھی قائم کرچکی تھی، ایسے جانور اور مویشی جنھین عربی مین الانعام کہتے ہین، یعنی اونٹ گائے بیل بھیڑ بکریان کو لوگ پالتو بنا کر اُن سے اُن کے مناسب حال کام لینے لگے تھے، بلکہ قرآن کے ایسے الفاظ یعنی ثیاب دسر کا ترجمہ اگر دہی کیا جائے، جو لغۃً اُن سے سمجھا جاتا ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ جامہ بافی (حیاکت) آہنگری جیسی صنعتون کا رواج بھی اس عہد تک ہوچکا تھا، بلکہ جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ نجاری کا فن عہد نوح تک کافی ارتقائی مراتب طے کرچکا تھا، اس وقت تک سفینۂ نوح اور جن کاریگرون سے اس مین کام لیا گیا، ہم اس کی توجیہ نہین کرسکتے، اسی طرح چھوت چھات، یا جات چار کی طبقاتی تقسیم کا سراغ بھی قصۂ نوح مین ملتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک اس مسئلہ مین اتنی قوت حاصل ہوچکی تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کے انکار کی ایک وجہ اُن کی قوم کی طرف سے یہ بھی بتائی گئی تھی، کہ تمھارا ساتھ اراذل (یا اچھوت نیچ طبقات) نے دے رکھا ہے، یہی نہین بلکہ اسی سلسلہ مین حضرت نوح علیہ السلام کے دعوئ نبوت کی تنقیح کرتے ہوئے جو باتین اس قوم کی طرف سے پیش ہوتی تھین، ہم ان پر جب غور کرتے ہین، تو پتہ چلتا ہے کہ احتجاج کیئے، یا اپڈ کیسی کی مشق مین یہ قوم کہان تک ترقی کرچکی تھی کہ سورۂ المومنون کے ان الفاظ پر غور کیجئے فرمایا گیا ہے، کہ

قال الذین کفروا من قومہ ما	نوح کا جنھون نے انکار کیا تھا وہ بولے کہ
ھذا الا بشر مثلکم، یرید ان	نہین ہے یہ ایک آدمی تم ہی جیسا، چاہتا
یتفضل علیکم ولو شاء اللہ	ہے، کہ تم پر بڑائی حاصل کرے، خدا چاہتا
لانزل ملائکۃ ما سمعنا	تو فرشتون کو اتارتا، ہم نے اپنے گذشتہ
بھذا فی اٰبائنا الاولین ان	باپ دادون مین یہ بات سنی نہین ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۲) جس کے معنی کپڑا ہین، اسی طرح سورۂ القمر مین سفینۂ نوح کے متعلق ذات الواح و دسر کالفظ پائے جاتے ہین، دوسر کی تفسیر سمار کے لفظ سے کی گئی ہے، ترجمہ جس کا میخ آہنی ہے،

هو الا رجل به جنة فتربصوا به — مگر ایک آدمی جس پر جنون کا اثر ہے پس

حتی حین، — انتظار کرو کچھ دن کے لئے،

بجائے ایک دلیل کے آپ دیکھ رہے ہیں، پانچ پانچ باتیں اپنے انکار کی توجیہ میں اُن کی طرف سے پیش ہو رہی ہیں، یعنی وحی کے ایک جدید علمی ذریعہ کا دعویٰ اس لئے صحیح نہیں ہے کہ نوح ہم ہی جیسا ایک آدمی ہے، احساس و ادراک کی جو قوتیں عام انسانوں میں مشترک ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ نیا حاسہ اس میں پیدا ہوا ہو، پھر اس جدید حاسہ کا دعویٰ اُس نے کیوں کیا؟ اس کا جواب دیتے کہ بڑے بننے کی خواہش ہی اندرونی محرک ہے جس نے اس دعوی پر اس کو آمادہ کیا ہے، باقی یہ خیال کہ خدا نے اپنے بندوں کی اصلاح کے لئے اس شخص کو اس جدید علمی ذریعہ سے سرفراز فرمایا ہو، اس کا جواب دیتے کہ خدا کے لئے اس سے زیادہ آسان یہ تھا کہ اپنے کسی فرشتہ کو ہم میں بھیج دیتا، جسے عوام و خواص بآسانی تسلیم کر لیتے، آخر میں تاریخی شہادت یہ پیش کرتے کہ ہماری گذشتہ تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یعنی کسی نے وحی و نبوت کا دعویٰ کیا ہو، آخر میں کہتے کہ دماغی توازن اس شخص کا کچھ بگڑ گیا ہے، جو خود بخود رفتار زمانہ کے ساتھ درست ہو جائے گا[1]،

اور یہ تو میں نے چند اجمالی اشارے کئے ہیں، ورنہ قرآن میں انسانی تاریخ کے دور اول یعنی از آدم تا

---

[1] میں نے مختصر لفظوں میں قوم نوح کے پیش کردہ نقاط کا ذکر کر دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ غور کرنے سے ہر نقطہ بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی منطقی اور استدلالی قابلیت کافی ترقی یافتہ ہو چکی تھی، آج بھی وحی و نبوت کے مخالفین جو باتیں بناتے ہیں، شاید وہ اسی قسم کی ہیں، اس زمانہ میں قوموں کا ایک دستور یہ بھی ہے کہ اپنی قومی زندگی کی جوہری بنیادوں کا خلاصہ چند الفاظ میں کر لیتے ہیں، مثلاً اخوت، مساوات، عدالت، پھر ان لفظوں کو معبود بنا کر ساری قوم کو ان کے آگے جھکنے کا حکم دیتے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قوم نوح میں ود (محبت ....) سواع (وقت اور اس کی قدر و قیمت) یغوث (باہمی امداد میں ایک دوسرے کی فریاد رسی) یعوق (دماغی قوتوں کی تعبیر) نسر (کوئی خاص موسم جب بنات نسر میں ستارہ آ جاتا تھا)، ان پانچ دیوتاؤں کی عبادت کا مطلب یہی تھا کہ اپنی قومیت کی صفاتی بنیادوں کو معبود بنا

تا قوم نوح، اسی طرح دور ثانی یعنی عاد و ثمود، ہود و صالح علیہما السلام کی مخاطب قومون، یا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام نے جن لوگون مین کام کیا، اپنی خاص اصطلاح مین جس تمدن و تہذیب کا نام مین نے "جنبلی تمدن" رکھدیا ہے، اس کے بعض پہلوؤن کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ قرآن مین محفوظ کر دیا گیا ہے، شاید ان دونون ادوار کے متعلق اُن کے معلومات قرآن کے سوا اور کسی ذریعہ سے ہم حاصل نہین کر سکتے، سید مرحوم کو خدا جزائے خیر دے کہ ان قرآنی قصص کے متعلق یورپ نے شکوک و شبہات کے جو گرد و غبار اچھالے تھے، خود ان ہی کے طریقہ تحقیق سے اُن کے صاف کرنے کی ایک ایسی راہ کھول دی ہے کہ کام کرنے والے چاہین تو اس سلسلہ مین بہت کچھ کام کر سکتے ہین، اپنی اثریاتی دحفریاتی جد و جہد سے یورپ و امریکہ والے ایسے نئے نئے انکشافات دنیا کے سامنے لا رہے ہین جن سے قرآنی بیانات کی قدر و قیمت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے،

بہرحال اپنی تاریخ کے جس حصہ کو یعنی دور اول و ثانی جسے لوگ عموماً بھول جانے والے تھے، اسی حصہ کے متعلق قرآن مین نسبتہً جو زیادہ تفصیل پائی جاتی ہے، اور ان کے سوا تیسرے دور جس مین دنیا کے اکثر حصون مین مقامی تمدنون کا ظہور ہوا، اس کے متعلق بجز اس قسم کے اجمالی اشارون کے کہ زمین مین چلو پھرو، اُن کے حالات تم پر واضح ہون گے" یا قرآن کی پہلی مخاطب قوم عرب کو اجمالی لفظون مین اطلاع دی گئی ہے کہ دنیا کی تعمیر و ارتقاء کا کام تم سے بہت زیادہ بہتر طریقہ پر دوسری قومین انجام دے چکی ہین، اور ان کی اصلاح کے لئے راہ نما اٹھتے رہے، ہر آبادی مین چونکانے والے (نذیر) گذرتے رہے، اسی طرح چوتھا دور جس مین دنیا قیصریت وکسرویت کی مغربی و مشرقی قوتون کے ساتھ بلا واسطہ یا بالواسطہ وابستہ ہو گئی تھی، اس کے متعلق سورۂ روم کی ابتدائی آیتون مین حد سے زیادہ اجمالی اشارہ کر کے قرآن جو گذر گیا ہے تو بظاہر اُس کی مصلحت غالباً یہی نظر آتی ہے کہ دونون پچھلے ادوار سوم و چہارم کی حالت اول اور دوم ادوار کی جیسی نہ تھی، بلکہ ہر ملک اور ہر قوم

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۴) یا اصنام کی شکل مین انھون نے ڈھال لیا تھا، اور ہر شہر قصبہ گاؤن مین انہی بتون کو نمایان مقامات پر گاڑ کر قوم کو وہ زندگی کا درس دیتے تھے، تفصیل کے لئے معلومات کا مطالعہ کرنا چاہئے،

اپنی تاریخ اور اپنی اثری یادگاروں کو اس طور پر قائم کر چکی تھی کہ بآسانی اُن کے متعلق کافی معلومات عام تحقیقاتی ذرائع سے حاصل کئے جا سکتے تھے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا بڑا حصہ آج ان کا مرتب شکل میں ہمارے سامنے موجود بھی ہے،

خیر یہ بحث دور نکل گیا، کہنا یہ چاہتا تھا کہ سید مرحوم کی تاریخ ارض القرآن نے قرآنی مطالعہ کے متعلق ایک نئے زاویہ نظر کو پیش کیا جس کا اعتراف قرآن کے ہر خادم کو کرنا چاہئے، انھوں نے صرف "عام انسانی تاریخ" کے سلسلہ میں نئی راہیں آیندہ تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لئے نہیں کھولی ہیں، بلکہ قرآن کی بعض جزئی شخصیتوں کے متعلق بعض ایسے اہم انکشافات پیش کئے ہیں جن کی روشنی میں اُن کی حیثیتوں اور اُن کی قدر و قیمت میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً لقمان نامی ایک شخص کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے اور اُن کی طرف منسوب کرکے بعض قیمتی نصائح اس کتاب میں ملتے ہیں، اب ایک طرف سوچئے جو عام طور پر مشہور ہے کہ لقمان کسی عرب کے حبشی غلام تھے، اور دوسری طرف سید صاحب مرحوم کی اس تحقیق کو سامنے رکھئے جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم عاد کے مادی عروج کے بعد جو زوال ہوا، اور اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد یہی قوم ہود کی شریعت کے مطابق "اسلامی تہذیب و تمدن" کے نظام کے قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، اسی عہد کے ایک اولوالعزم حکمران لقمان تھے، سید مرحوم نے مختلف تاریخی شہادتوں سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتے ہوئے آخر میں عدن کے قریب حصن غراب نامی مقام کے کھنڈروں سے نکلے ہوئے اس کتبہ کو جسے ایک انگریز افسر ولسٹڈ نے ۱۸۳۴ء میں برآمد کیا تھا اسی کتبہ کے اس فقرے سے یعنی

"ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں، جو کمینہ خیالات سے بہت دور، اور شریروں کو سزا دینے والے تھے، ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے، اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے" (ص ۱۰۲ ج ۱ تاریخ ارض القرآن)

انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کتاب جس میں فیصلوں کے نقل کرنے کا جو ذکر ہے یہی وہ کتاب ہے جو

مجلۂ لقمانؑ کے نام سے عرب مین عام طور پر مشہور تھی جس کا مطلب یہی ہوا کہ قرآن نے جیسے تورات و انجیل وغیرہ کی سچائیون کو اپنے اندر محفوظ کر دیا ہی، اسی طرح سورۂ لقمان کی وہ باتین جن کا لقمانی حکمت کے نام سے قرآن مین تذکرہ کیا گیا ہے ایہ یہودی شریعت کی غیر فانی صداقتون سے تعلق رکھنے والی باتین ہین، گویا قرآنی دعوی "مصدقا لما بینہ" ہی کی ایک شکل لقمانی حکمت بھی ہے،

اس مین شک نہین کہ اس سلسلہ مین سید صاحب کے بعض دعاوی دلائل کے لحاظ سے اب بھی محل غور و تحقیق ہین لیکن کہنے والون نے جیسا کہ کہا ہے سوال اور جواب علم ان ہی دونون باتون کے مجموعہ کی تعبیر ہے، ہر علم اور فن مین سوال اٹھانے والے علم کے نصف حصہ کے حقدار ہوتے ہین، خواہ اُن کے پیش کردہ جوابون سے لوگون کو اختلاف ہی کیون نہ ہو، یہی بات سید صاحب مرحوم کے متعلق مین کہنا چاہتا ہون انھون نے قرآن کے ایک خاص پہلو کو اپنی اس کتاب مین تلاش و تحقیق کے لئے پیش کیا ہو، ان کا دعوی یہی ہی فرماتے ہین کہ

"تیرہ سو برس مین ایک کتاب بھی مخصوص اس فن مین نہین لکھی گئی" (ص ۲ ج ۱)

اس سلسلہ مین اُن کے جوابون سے ممکن ہے، اختلاف کیا جائے لیکن سوالات کے پیدا کرنے والے یقیناً وہی قرار پائین گے، انھون نے علم سے دین کی خدمت کی ایک نئی راہ نکالی، امید ہے کہ آیندہ اس پر کام کرنے والون کے اجر مین اُن کا بھی حصہ ہوگا،

سید صاحب نے جس زمانہ مین اپنی یہ کتاب مرتب کی تھی، جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین اُن پر عقلیت پسندی ہی کا زیادہ اثر تھا، اور شاید اسی کا نتیجہ ہو کہ بعض مواقع پر مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی پیدایش کے سلسلے مین چٹان سے نکلنے کے واقعہ کا جو انھون نے صاف لفظون مین انکار کیا ہے[1] غالباً یہ اُن کی عقلیت پسندی کی یادگار ہی، لیکن با این ہمہ حیرت ہوتی ہے کہ اسی زمانہ مین سورۂ فیل کا تذکرہ کرتے ہوئے سر سید احمد خان کی تفسیر کے متعلق اُن کے قلم سے یہ الفاظ نکل پڑے ہین کہ

---

[1] دیکھو ارض القرآن ج ۱ ص ۱۹۰

"سرسید نے اس سورہ کی جو تفسیر تہذیب الاخلاق میں لکھی تھی، اور جس سے اس واقعہ کے اعجوبہ پن کو دور کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سرتا پا لغو اور اغلاط سے مملو ہے" (ص ۳۲۲)

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں ہدہد پرندے کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھتے ہوئے کہ

"اس زمانہ کے بعض نیچر پرست کہتے ہیں کہ مرغ کا بولنا، اور اس کی بولی سے مفہوم کا سمجھنا خلاف عقل ہے"،

سید مرحوم نے جو یہ ارقام فرمایا ہے کہ

"جانوروں کی عاقلیت کا مسئلہ مسلم ہوتا جاتا ہے، بندروں کی بولیوں کی ابجد تیار کی جا رہی ہے، تو ہُدہُد کے بولنے پر تعجب کیوں ہو"

اسی کے ذیل میں یہ اضافہ بھی اُن کے قلم نے کیا ہو کہ

"اگر پرندوں کا بولنا اب بھی کھٹکتا ہے تو فرض کر لو کہ نامہ بر کبوتروں کی طرح تربیت یافتہ نامہ بر ہدہد ہوگا"

مگر اسی کے ساتھ اسی سلسلہ میں اُن کا یہ فرمانا کہ

"طیر کے معنی فوج لینا جیسا کہ مولوی چراغ علی نے لیا ہے، اسی طرح بے ثبوت ہے جس طرح سرسید کا سورۂ فیل کی تفسیر میں طیر سے خیال پرندوں لینا" (ص ۲۴۰)

یہی باتیں اُن کی حقیقی دینی فطرت کی غمازی کر رہی ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ اسی پر اُن کا خاتمہ بالخیر ہوا و العاقبة للتقوی

"نقوش سلیمانی"

ادب و انشاء کی کچھ جھلکیاں

از:

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

"تو یہ کہئے کہ آپ امیر مینائی کی غزل گوئی کے قائل نہیں صرف اُن کی فن دانی اور تحقیقِ لغت و زبان کے قائل ہیں، اچھا ایک شعر سناتا ہوں، .....بتائیے کیسا ہے......"

"اچھا اور بہت اچھا ہے،"

"اور یہ شعر!!....."

"یہ بھی خوب ہے، سبحان اللہ"

اچھا اور یہ.......اور یہ...... لے اب کہاں تک سنئے گا، یہ سارے شعر امیر ہی کے تھے یا ذکر دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہو گا کہ ہاں اردو والوں کے شہر اکبر آباد میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ حسب معمول خوب جمگھٹے سے ہوا ہے، جلسہ میں عید کی دھوم دھام، جشن شاہی کا تزک و احتشام، خواص کا مجمع اور عوام کا اژدہام ملک کے گوشہ گوشہ سے پڑھا لکھا مسلمان کھنچا چلا آرہا ہے، مہمانوں کے ایک خیمہ میں آخر دسمبر کی ایک منڈی رات میں دو شخص آس پاس بیٹھے ہوئے وقت گذاری کے لئے شغل اردو شعر و شاعری سے کر رہے ہیں،

امیر کو داغ سے ٹکرا رہے ہیں، ایک کو گرا اور دوسرے کو چڑھا رہے ہیں، یہ شعر و شعرا پر تو زبان سانے والا ہے سیدی حا سلیمان ندوی، ۵۳ھ کا شیخ طریقت نہیں، ۱۳۱۳ھ کا جوان عمر صاحب نظر و صاحب قلم، اور سن سن کر بلا بیت بازی مات کھا جانے والا ہے، ان سطور کا راقم آثم، پڑھا نہ لکھا، نام محمد فاضل! — سید صاحب کا رعب دربار ایک مدت سے قائم تھا، اُن کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا، یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا، کلام امیر کا حافظ نکلے گا، مرآۃ الغیب[1] کا آئینہ بردار صنم خانۂ عشق[2] کا پرستار! یہ پہلی بار کھلا کہ یہ حضرت با این زہد و تقوی اردو شعر و سخن کے رسیا ہیں، ہمارہ و غزل و تشبیب کے متوالے!

سید صاحب کے فاضل اجل اور عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے، دنیا کو مسلّم ہے کہ وہ فنِ تاریخ میں امام وقت تھے، اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ، لیکن آخر تک کم ہی لوگوں نے اُن کے ادبی شعری (ادبی) تنقید مرتبہ کو جانا، اور کمتر ہی لوگوں نے انھیں ادیب انشا پرداز، سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا! — علم و ادب کی تاریخ میں ایسی ناشناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معلوم!

اب آخر زمانہ میں تو اُن کا عام مطالعہ یوں بھی بہت گھٹ گیا تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ سمٹ سمٹا کر صرف "دینیات" تک محدود ہو گیا تھا، لیکن جب شوق مطالعہ جوان تھا، اور دن بھی جوانی کے تھے، تو اردو کی غزلیات کیا معنی ہزلیات تک کا دفتر بے معنی و با معنی اُن کی انگلیوں کی نوک پر تھا، دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے، کلیات پر کلیات ختم کر دئے اور "گلدستہ" کا تو اب لفظ بھی تشریح طلب ہو گیا ہے، (اپنے وقت میں تازہ غزلوں کے ماہنامہ کو کہتے تھے) ایک زمانہ میں ان گلدستوں کی بہار تھی، لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے، اودھ اور شمال بلکہ قصبوں[3] تک میں اُن کے ورق، ورق گل کی طرح کھلے ہوئے، اور سید صاحب تھے کہ ان کی خوشبوؤں میں بسے ہوئے، پھر شاعروں کی باہمی نوک جھونک کے رسالے، اپنی بوقلمونیوں میں مولوی صاحبان کے مناظرانہ رسالوں سے

---

[1] امیر مینائی کا دیوان اول [2] ایضاً دیوان دوم [3] غیر آباد قصبات اودھ کا ذکر ہی غالباً!

ٹکر لیتے ہوئے اس نے اُس کی زبان پکڑی، اُس نے اس سے محاورہ کی سند مانگی، اس نے اُس کے کلام میں ایطائے جلی نکالا، اُس نے اس کے استادوں تک کو پُن کے رکھ دیا، انھوں نے اُن پر سرقۂ مضمون کا الزام رکھ کر اُن کی موتی سی عزت اُتار لی، انھوں نے اِن کے شعر میں پہلوے ذم و فحش نکال کر اُن کی گردن ناپ دی، —

پٹنہ سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے حق میں گلزار، اور پھر سید صاحب کا لکھنؤ میں سالہا سال کا قیام جو کور کسر رہ گئی تھی پوری ہو گئی، سید صاحب اس چمن کے ایک چہکتے ہوئے بلبلِ خوشنوا خود بن گئے،

شاعر بھی تھے، تخلص رفؔزی کرتے تھے، کبھی قطعہ کبھی رباعی کہتے، اور تفریحاً ہر بحرِ سخن میں شادی کر لیتے، جون ۱۹۱۱ء میں جب اس ہیچمدان کا عقد ہوا ہے، سید صاحب نے ازراہِ محبت و یگانگت کئی رباعیاں فی البدیہہ موزون کر دی تھیں، صرف ایک یاد رہ گئی، آپ بھی سُن لیں،

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد نوشاہ بنے ہیں آج عبد الماجد
وہ روزِ سعید بھی خدا لائے جلد بن جائیں گے جب کسی کے والد ماجد

غزل بھی کبھی کبھی چوری چھپے کہہ لیتے، صرف دو چار شعر نمونہ کے حاضر ہیں،

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں جو نہ بیخود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں
مدرسہ چھوڑا، خرابات میں آکر ٹھہرا دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں
توبہ توبہ، مری توبہ بھی ہے کوئی توبہ ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں

تشہیر کا باعث نہ ہو دامانِ قبا دیکھ لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہدا دیکھ
انکار تھا تجھکو مری تاثیرِ دعا سے اب میری طرف دیکھ تو تاثیرِ دعا دیکھ
آزاد مکاں سے ہوا سے قیدِ مکاں کیا گر آنکھ ہو بتخانہ میں بھی نورِ خدا دیکھ

یہ مضمون سید صاحب کی شاعری پر نہیں، نثر پر ہے، اُن کی شاعری پر نقد و تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے، اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے، پہلے کوئی خاک گر ذرا تلاش و تفحص سے کام لے کر اُن کا سارا کلام

یکجا تو کرین،

سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھایئے تو دیدہ و دل حیران، کہ شروع کہاں سے کیجئے، اور ختم کہاں پہنچ کر کیجئے، سیرۃ النبیؐ کی ضخیم مجلدات سے لے کر خیام، خطبات مدراس اور رحمتِ عالم تک بڑی مجھولی اور چھوٹی کتابون تک کون سی ایسی ہے، جہاں حضرت سلیمانؒ ایک خشک مولوی مُلا نے معلوم ہوتے ہون، اور صحت زبان و سلاست بیان نمایان نہ ہو؟ شستگی، متانت، شرافت، یہ تو اُن کے اسلوبِ تحریر کے جوہر اصلی ہیں، اور اس پر جا بجا شوخی و ظرافت کی گلکاریان، اور حسنِ صناعت کی سحر طرازیان، جیسے خاتم سلیمانی میں نگین، اور مستقل تصنیفات کو چھوڑیئے معارف کے شذرات اور معارف اور دوسرے رسالون کے مقالات سب کو یکجا کیجئے، تو صفحات کی تعداد سیکڑون نہین، ہزارون تک پہونچے، اور مجموعہ کو تقسیم کیجئے، تو جلدون پر جلدین کتابون کی ڈھلتی اور نکلتی چلی آتی ہیں ـــــ اتنے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنا ہے بڑے جگر کا کام، اور ممکن اُسی کے لئے ہے، جو ایک چھوٹے سے مضمون کا نہین، پوری ایک کتاب کا تہیہ کرکے بیٹھے، اور فرصت دو چار دن کی نہیں، ایک مدت دراز کے لئے نکال رکھے، سلیمان عالی جاہ کے حدود مملکت کا جائزہ لینا ہرگز کم ہمتون، کم فرصتون، کوتاہ نظرون کا کام نہین۔

"ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سیکڑون سے کرنا چاہتے ہیں تا کہ یہ لفظی دولت معنون کی معنوی دولت کے لئے فالِ نیک بن سکے۔" (ص ۲۹۰)

یہ الفاظ سید صاحب کے ہیں، اور ایک مقالہ کی تمہید سے منقول ہیں، جو بعض پرانے لفظون کی نئی تحقیق کے عنوان سے ہندوستانی اکیڈمی یو۔پی کے سالانہ اجلاس الہ آباد میں ۱۹۳۰ء میں انھون نے پڑھ کر سنایا تھا، اور بعد کو وہ اُن کے دوسرے خطبات، مقالات و مقدمات کے ساتھ مل کر اُن کے ادبی و علمی مضامین کے مجموعہ میں شائع ہوا ہے، مجموعہ کا نام نقوشِ سلیمانی ہے، اور یہ کتاب ۲۰ × ۲۶ کے سائز پر ۴۰۰ صفحہ پر ۱۹۳۹ء میں شائع ہو چکی ہے، کتاب کیا ہے سید صاحب کے کمالات ادبی و علمی کی ایک مرزدہ دستاویز آگے اقتباسات جو پیش ہون گے، اسی کتاب سے ہون گے۔

ہان تو سید صاحب اپنی زبان کے خزانۂ ادب میں تحقیق الفاظ کے نوادر کا اضافہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں،

اور تہنیہ کے اس ڈھیر بہا کے جدیوں گہرافشان ہیں:

"ہماری زبان کا ایک پامال لفظ "دام" ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہیں، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہیں، جس کی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان میں چھدام کی ہے، جو چھ اور دام دو لفظوں سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے ہم کو آج سے دو ہزار برس پہلے لوٹ جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشورکشا اور سوداگر پورے ایشیا پر چھا گئے تھے، ان ملکوں میں یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانوں پر تھے، ....

.... یونان کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم تھا، اس نے عربی میں درہم اور فارسی میں بیچ سے ایک حرف گرا کر درم کی صورت اختیار کی، اور ہندوستان میں ایک حرف اور گرا کر اور اس کی جگہ ایک لمبی آواز بڑھا کر دام ہوگیا[1]، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا، سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طب میں وزن کا وزن درہم اور فارسی طب میں درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہوگیا جو اب ہمارے انگریزی طبی کا بجوں، دواخانوں اور شفاخانوں میں ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہیں کہ دام اور ڈرام دونوں کی ایک ہی شخصیت ہے، صرف آب و ہوا، لہجہ اور شکل و صورت کا فرق ہوگیا ہے،

اکبر کے زمانہ میں دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکہ کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام تھا، اس کو پہلے پیسہ کہتے تھے، اور اب بھی کہتے ہیں، یہ روپیہ کا چالیسواں حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کرکر ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے اب اسکو گنڈا کہتے ہیں، اکبر کے زمانہ میں بھی اس کا نام ملتا ہے، اسی تقسیم سے پورب کی زبان میں ایک محاورہ چلتا ہے، ہر گاؤں یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ ر فرض کی جاتی ہے، اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہیں، ایک دام

---

[1] یہ عبارت نقل کرتے وقت درم و دام، کی اس قرابت پر ایک ماہی کو غالب کا یہ مصرعہ بے اختیار یاد پڑ گیا، "درم و دام اپنے پاس کہاں" یہاں فارسی کا چلا ہوا فقرہ "دامے درمے بھی"،

کا آدھا ادھیلا اور ¼ پاؤلہ اور ⅛ دمڑی کہلاتا ہے، اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے، آئین اکبری کے مطابق ایک من تانبے میں ایک ہزار چوالیس درم (پیسے) تیار ہوتے تھے" (ص ۲۹۰-۲۹۱)"

سید علیہ الرحمۃ نے یقیناً فیلالوجی (لسانیات) پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی لیکن اس ایک ہی نمونہ سے اندازہ ہوگیا ہوگا، کہ انھیں فن لغت و اشتقاق الفاظ سے کتنی مناسبت تھی، اس میدان میں اپنا ذہن کہاں کہاں دوڑاتے رہتے، کن کن آسمانوں سے تارے توڑ توڑ کر لایا کرتے، اور خشک لغوی تحقیق کو کتنا شگفتہ بنا کر رکھتے —— آنا پھیلا و تو آ پیسے صرف ایک لفظ دام کی خاطر دیکھا، کتاب کا پورا ڈیڑھ صفحہ اسی کی نذر ہوگیا، قدر جب اس گھٹیا سکہ کی یہ ہوئی تو پھر اشرفی کی قیمت تو اس سے کہیں زائد ہے، اس کی وجہ تسمیہ کی کاوش میں تو جو کچھ پاپڑ نہ بیل ڈالے ہوں، بجا ہے، سنیئے اور کچھ دیر تک کان لگائے سنتے رہیئے!

"دام اور فیرا جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں، اُسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ "اشرفی" کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر دل کو یہ کہکر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے، اس لئے اشرفی کہلایا، مگر دفعتہً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی، تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے وہ اشرف تھا،

طلائی سکہ کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے مگر چونکہ عربوں میں یہ سکہ جاری تھا، اس لئے انھوں نے عبدالملک کے زمانہ میں سنہ ۷۴ھ یا ۷۵ھ میں طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام "دینار" ہی رہنے دیا، جب اُن کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار بھی اُن کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ چند دینار سُرخ رسمی طور سے جاری ہے، تغلق کے زمانہ میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکہ زر، یہ تنکہ ٹکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا، اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی، پیادہ کی ماہانہ تنخواہ ۷۸ تنکہ اور سوار کی ۲۳۴ تنکہ تھی، مخدوم زادہ عبداللہ

کے لئے دس لاکھ تنکہ و خلیفہ مقرر ہوا۔ مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو "چندیں طبقہا پر از تنکۂ زر و نقرہ برآں نثار شد" (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانہ میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴) روپیہ کو تنکۂ نقرہ اور اس سے کم درجہ کے سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے، خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج ٹکے کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں؟

دوسرا لفظ "مہر زر" ہے، اس کو مہر اس لئے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نقش ہوتا تھا، مہر زر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے،

"سلطان محمد مہر مس پیدا آورد فرمان داد کہ مہر مس را خرید و فروخت چنانچہ مہر زر و نقرہ جاری است" (ص ۵۰۴)

...... دکن میں طلائی سکہ کا نام ہون تھا، جو آخر میں مخفف ہو کر ہن ہو گیا، اور آج ہماری زبان میں اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی میں ہن برسنا ایک یادگار رہ گیا ہے، روپیہ کا لفظ اور سکہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے، (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجب نہیں کہ روپا سے بنا ہو، سونے کے سکہ کے لئے اشرفی کا لفظ ہندوستان میں نور الدین جہانگیر کے زمانہ میں استعمال میں آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں حسن گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان میں لکھا ہے:—

"زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی طلائی و طلائے غیر مسکوک دید"

(فرشتہ۔ نولکشوری ص ۲۷۴)

...... مصر کے چرکسی بادشاہوں میں ایک برسبائی تھا، اس نے ۸۲۵ھ سے ۸۴۱ھ تک حکومت کی، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا مصدر و معدن ہے، مشہور عرب جہازران

ابن ماجد اسد البحر نے جس نے ۸۹۵ھ (۱۴۹۰ء) میں واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا، الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا زمانہ نویں صدی ہجری کا اخیر اور دسویں صدی ہجری کا شروع تھا،

............اس کی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک خاص سلسلہ میں لکھتا ہے:-

الحادی عشر بوسائی الاشرف ضارب — گیارہواں بادشاہ برسبائی اشرف ہے جو اشرفی
سکۃ الاشرفی (ص۳ طبع پیرس) — سکہ کا چلانے والا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند میں داخل ہوا تھا، اور وہاں سے پورے ہندوستان میں پھیل گیا، ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب ۸۹۵ھ میں لکھی ہے اور اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۱۵ھ میں لکھی، اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ میں اشرفی کا نام بھی پیدا نہیں ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے زمانہ کے بادشاہوں کے سونے کے سکوں کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہہ دیتے ہیں" (ص۲۹۲)

یہ ساری تحقیق، جو یہاں ذرا مختصر ہو کر نقل ہوئی ہے، کتاب کے پورے چار صفحوں میں آئی ہے، ا—

اور اسی طرح لفظ پر لفظ لکھتے اور ہندی کی چندی کرتے چلے گئے ہیں، "کرانت"، بیمہ، ڈاک، تمری، سوسی، نیز رقم، ہندسہ، ریاضیات، سیاسیات" یہ دس عنوانات اور اس لغاتچہ کے ہیں، اور ان بارہ لفظوں کے اشتقاق اور تحقیق تسمیہ کی موشگافیوں میں پورا مقالہ ختم ہو گیا ہے،

پھر یہ بارہ لفظ وہ ہیں جن کی ذاتیں بالکل الگ الگ ہیں یعنی ان کا تعلق باورچی خانہ سے بھی ہے اور بزازے سے بھی، اجڑا یا خانہ سے بھی اور صرافے سے بھی، سرکاری ایوانوں سے بھی اور درسی کاشانوں سے بھی، یونہی زبردستی گلے میں پٹا ڈال کر اکٹھے نہیں کر لئے گئے ہیں، بات میں بات پیدا کی گئی ہے، نکتہ سنجی کو کھل کھیلنے کا میدان ہاتھ لگ گیا ہے، اور انشائے لطیف نے جیسے الگ تھلگ رہنے والے روٹھے ہوؤں کو گلے ملوا کر

ایک دوسرے سے متصل بنا دیا ہے — دعویٰ پر دلیل ملاحظہ ہو،

"ڈاک" کے مقابلہ "قمری" آیا ہے، بھلا ان دو اسموں میں کیا ربط اور کیا تعلق ہو سکتا ہے، لغت "ڈاک" کے خاتمہ پر سنیئے :۔

"اگلے زمانہ میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتری سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجئے"

دیکھا آپ نے، ادب و انشاء کے اس شہباز نے کس طرح ہنستے کھیلتے ڈاک کے تھیلے کی ڈور قمری کے پر سے باندھ اس سے حق سیرہ پڑھوا دیا! اسی ہلکے پھلکے انداز سے ربط تمہید "ڈاک" کے "قمری" اور "رقم" کے، اور "رقم" اور "ہندسہ" کے درمیان قائم ملے گا، — اس ربط ضبط کی ساری داستان پڑھنا ہو تو اس کتاب کی طرف توجہ فرمائی جائے،

پھر یہ نہیں ہوا کہ یہ لسانیاتی کاوش اسی ایک لکچر پر ختم ہو گئی ہو، اس کی چاٹ جو پڑی تو مصرع طرح پر غزل کے بجائے دو غزلہ تیار ہو گیا، لکچر تو اکیڈمی میں سنایا گیا تھا، اس کا دوسرا نمبر اسی عنوان کے ساتھ خاص معارف کے لئے لکھا، اور دو سمبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا، اس میں الفاظ ذیل زیر بحث آئے،

ناشتہ[1]، نہار[2]، فلسفہ[3]، قاب[4]، رکابی[5]، قلیہ[6]، قورمہ، شوربا[7]، شراب[8]، کباب[9]، قالین[10]، شاگرد پیشہ[11]، راحت زحاما[12]، مستری[13]، خراد[14]، ساہول[15]، گنیا[16]، جہاز[17]، جہیز[18]، تجہیز[19]، سرخی[20] (عنوان)، مسل[21]، نستعلیق[22]، جلد[23]، کفش[24]، مادری[25]، قلعی[26]، تماشہ[27] — یعنی پہلے مقالہ کے دونے سے بھی زائد، ۱۲ کی جگہ ۲۷، نقش ثانی کے معنی ہی یہی ہیں کہ نقش اول سے بڑھ ہی کر رہے، کیا کیفیت میں اور کیا کمیت میں،

اس مقالہ کا بھی رنگِ انشاء آپ دیکھنا چاہتے ہیں؟ اچھا تو ایک ہلکی سی جھلک سہی، شوربا کی نمکینی کے بعد قلم کی زبان یوں شکر فشاں ہوتی ہے، اور مستی کے ذکر میں بھی رندی تک نہیں پہنچتی، صرف شوخی کے حدود کے اندر رہتی ہے :۔

"اسی عربی شُرب (پینا) سے ایرانیوں نے شراب اور شربت تیار کیا، اور اُسے ہندوستانیوں نے قبول کر لیا، شراب کے معنی عربی میں ہیں "جو چیز پی جائے" یہاں تک کہ قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا ہے، ایرانیوں نے جس کو شراب کہا، اُس سے متوالی شراب مراد لی، اس سے یورپی زبانوں میں سیرپ تیار ہوا، جو شکر پڑکر میٹھا ہو گیا، لیکن ایرانیوں کے اثر سے ہم نے پانی میں گھول کر جو چیز تیار کی، اس کو شربت کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی میں اس کے معنی فقط پینے کے ہیں" (ص ۳۱۶، ۳۱۷)

ان میٹھے میٹھے بولوں کو سُن کر خیال یہ نہ گذرے کہ سید صاحب کی ہر تحقیق سَو فی صدی صحیح ہی تھی، کون فاضل اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ بشر بہرحال بشر ہے، اور سید صاحب اپنی بشریت کے اعتراف و اقرار میں ہرگز کسی سے پیچھے رہنے والے نہ تھے، لسانیات کے ایک ماہر خصوصی ہمارے صوبہ میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سندیلوی ثم الٰہ آبادی ہیں، انھوں نے جب بعض حصوں پر نقد کیا، تو سید صاحب نے یہی نہیں کہ فراخ دلی کے ساتھ اسے معارف میں شائع کر دیا، بلکہ شوربا کی حد تک تو کھلے طور پر، اور دستری کے لئے بھی ایک حد تک اپنی تحقیق سے رجوع بھی کر لیا،

لُغوی اور اشتقاقی بحثوں کا شعبہ ختم ہوا سید صاحب کے دو اور بڑے کارنامے مستقل قدر و قیمت رکھنے والے یہ ہیں، کہ

(۱) انھوں نے عربی و فارسی کی تمام تر ماتحتی سے نکال کر اردو کی خود مختاری اور ایک قائم بالذات زندگی کی سرگرم وکالت کی، وہ اصلاً ایک عالم دین اور مولوی تھے، قدرتاً اُن کے طبقہ سے توقع یہ تھی کہ وہ اُردو پر عربی کی حاکمیت سے خوش ہونگے، اور ساری کوشش اس کے قائم و برقرار رکھنے کی کریں گے، لیکن اس کے برعکس انھوں نے عربوں کی "تعریب" اور فارسیوں کی "تفریس" کی طرح، اہلِ ہند کو پورا حق "تہنید" کا دلایا،

"جب اہلِ ہند یہی کریں، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے، اپنی زبان میں ملالیں تو اُس کو تہنید کہیں گے، یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت ہی

مفید ہو، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اُس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں، کہ زبان بڑھ پاسکے" (ص ۳۲۸)

آج ۱۹۵۵ء میں یہ بات بالکل صریح و واضح معلوم ہو رہی ہے مگر ۱۹۳۹ء میں جب سید صاحب نے "تہنید" کے عنوان سے اُسے معارف میں پیش کیا تو یہ آواز کچھ نامانوس سی تھی، پرانے خیال کے اہلِ قلم خاصی تعداد میں اس پر مصر تھے کہ عربی و فارسی کے قاعدے اردو میں بھی چلائے جائیں گے، اور اُن کے پاس دلیل بجز تقلید کے اور کوئی نہ تھی، اُس کے مقابلہ میں سید صاحب کا سیدھا، صاف و دلنشین استدلال ملاحظہ ہو:-

. . . . ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندوستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ کرے، مگر وہ ہمارے ہندی حرفوں کو کبھی نہ بول سکے گا، وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظوں کو نہ نکالے گا، مگر اس میں بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا،

یہی حال ہندیوں کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہیں کرسکتے، ع، ء، اور الف میں، ث، س اور ص میں اور ت اور ط میں وہ فرق نہیں کرسکتے، اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے ہاں آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھر ملو نہ بن جائے گا، وہ ہمارے دیس میں رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزاروں لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں، وہ ہماری زبان کے قاعدوں پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل و صورت اختیار کرنے پر مجبور ہیں،

معمار کے معنی میں راج کی اصل عربی اور فارسی میں راز ہے، مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا صحیح لفظ تمنّٰی ہے، مگر فارس والوں نے اُسے لیا، تو تمنّا کر دیا، اور ہم نے بھی اُسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو ایرانیوں نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لینٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے، [illegible] ۲

غلط ہی کیوں نہ ہو، لیکن ہماری زبان میں یہ صحیح ہے کہ اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادُل کی کوشش زبردستی ہے"۔

(ص ۱۳۳)

قدیم طرز کے عالموں سے اس کی توقع ہو ہی نہیں سکتی مگر سید صاحب عالم تھے ہی تو ندوی، اور اُن کی ندویت اُن کی خوش ذوقی اور سلامتِ مذاق کی پوری طرح ضامن تھی ——— ۲۰ صفحہ کے مقالہ میں سید صاحب نے پچاسوں عربی لفظوں کی مثالیں دے دے کر دکھایا، ہر کہ عربی میں اُن کے معنی کچھ تھے، اردو میں آکر کچھ ہوگئے، یا اُن کا تلفظ عربی سے اُردو ہوگیا یا اُن کے واحد جمع بنانے میں عمل اُردو قاعدوں پر ہوا ہے"۔

(۲۰) اسی درجہ کا بلکہ اس سے بھی بڑا دوسرا کارنامہ سید صاحب کا اردو زبان کے سلسلہ میں اس کے نام سے متعلق ہے، سید صاحب کا اصرار تھا کہ اس کا نام "ہندوستانی" چلانا اور پھیلانا چاہیئے، کہ یہی اس کا نام فی الاصل ہے بھی، اور یہی اُس کی اشاعت و مقبولیت میں بھی بہت معین ہوگا، شروع شروع اس تحریک کی خاصی مخالفت ہوئی، اور انہی مخالفوں میں میں بھی تھا، اور بدگمانی مجھے یہ ہو رہی تھی کہ اردو کے خلاف، اس کے اسم و مسمّیٰ دونوں کے خلاف جو زبردست پروپگنڈا اردو کے دشمنوں نے شروع کر رکھا ہے، اس سے کسی حد تک سید صاحب بھی متاثر و مرعوب ہوگئے ہیں، اور نام کی حد تک ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ——— لیکن غالباً ۱۹۳۲ء میں جب کہ ایک بار اُن سے علی گڑھ میں اس پر زبانی مفصل گفتگو ہوئی، تو قائل ہونا پڑا کہ رائے انہی کی صحیح و صائب تھی، اور اردو کے بجائے ہندوستانی نام رکھنے کا مشورہ کسی مرعوبیت کی بنا پر نہیں، بلکہ اردو کی دوستی و ہواخواہی ہی پر مبنی تھا، سید صاحب کا کہنا یہ تھا کہ

"ہم اس زبان کا نام اردو جو صرف سو ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں، اور اسی کو شہرت دیکر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے موسوم و منسوب ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، احتراز کے قابل ہے، اور اس کے بجائے

اس کا ہندوستانی نام، ہندوستان، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جس کو پورے ملک سے تعلق ہے، اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے، عام خیال یہ ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں، ...... ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کریں گے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کرے گا، اور مغلوں کے لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ اردو میں چھپی، ہم کو نجات دے گا" (ص ۷۵، ۷۶)

یہ مقالہ ۱۹۳۲ء کا ہے، اور آج اس کی قدر ہوتی ہے، کہ اس زمانہ میں اُس کے اندر کتنی دور اندیشی تھی کتنی مصلحت شناسی تھی، ــــ مقالہ میں اور بھی جو مشورے درج تھے، وہ سب ایسے تھے جو اردو کے ایک دوست دانا ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے تھے، مثلاً یہ کہ عربی و فارسی کے جتنے الفاظ اب تک ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، بس اُن کے علاوہ (بجز اصطلاحات کے) اور نئے نئے لفظوں کو فرہنگ و قاموس کی مدد سے گڑھ گڑھ کر اردو میں نہ لایا جائے، اور یا پھر یہ کہ ہندی کے جو لفظ اردو یا ہندوستانی میں بہ آسانی کھپ جانے والے ہوں، اُن کے لینے میں خواہ مخواہ ضد اور ہٹ کو کام میں نہ لایا جائے،

سید صاحب کو اُن کی زندگی کے صرف آخری ۵، ۶ برسوں میں جنھوں نے دیکھا ہے، اور جن کی واقفیت اُن سے اسی زمانہ تک محدود ہے، وہ عجب نہیں کہ انھیں محض ایک مقدس "شیخ خانقاہ" سمجھ رہے ہوں جس کے اوقات صرف اوراد و نوافل، اذکار و اشغال کے لئے وقف رہتے ہیں اور جس کو شعر و شاعری، زبان و ادب کے مضمون سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا، ــــ معتقدوں، مریدوں اور مسترشدوں کی یہ رائے کتنی ہی اخلاص نیت پر مبنی ہو، غلط فہمی ہر حال میں غلط فہمی ہی ہے، سید صاحب اور جو کچھ بھی ہوں، (اور یقیناً وہ اور بہت کچھ تھے بھی) اُن کے اس مرتبہ امتیاز سے کوئی انھیں محروم نہیں کر سکتا، کہ وہ ایک ادیب صاحب طرز تھے، اور طرز اُن کا شگفتہ و لطیف، ایک انشا پرداز تھے، شوخ و ظریف نقاد تھے، گہری نظر رکھنے والے،

سخن سنج تھے، کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے لکھنوی نہ تھے، پر لکھنوی ہی تھے، اپنے استاد شبلی نعمانی ہی کی طرح بلکہ اُن سے بھی کچھ بڑھ کر، وطن ثانی بھی مثل وطن ہی کے ہو جاتا ہے، یہ اعتراف آپ خود اُن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں، تو سنئے، جنوری سنہ ۱۹۳۴ء میں وہ ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ سالانہ میں شعبۂ اردو کے صدر منتخب ہوئے خطبۂ صدارت کے شروع ہی میں فرماتے ہیں:-

"......آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں لیکن گذشتہ ۳۴ برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے۔"

خوش نصیب ہر وہ ماں جو ایسے جوہر قابل کو گود دے لے، مبارک ہے وہ فرزند نامور جسے ایسی مادر مہربان کا آغوش نصیب ہو جائے ـــــ اعزاز و اکرام کی تالی دونوں ہی ہاتھ مل کر بجتی ہے،

نازاں منم کہ ہمچو توئی قدرداں من
نازاں توئی کہ ہمچو منے مدح خوانِ تو!

تنقید و تبصرہ کی بہار دیکھنا ہو تو اسی مجموعہ کے صفحہ ۳۶۴ سے لے کر ۴۹۹ تک کے سو صفحوں سے اوپر "مقدمات" کی سیر کر جائیے، نثر و نظم کی ۱۱- ادبی و شعری کتابوں پر مقدمے ہیں، جو کتابیں گمنام، غیر معروف یا دھندلی سی تھیں، وہ جیسے اس شمس سلیمانی سے چمک اٹھی ہیں، اور جو پہلے ہی سے روشن و معروف تھیں، اُن میں اور چار چاند لگ گئے ہیں!

اگر یہ نقد و تبصرہ، داد و تحسین، آپ بہتوں کے قلم سے پڑھ چکے ہیں، اب ذرا دیکھئے کہ حضرت سلیمانؒ

جب یہ اپنی زہد و متانت اِس پیکرِ شوخی و ظرافت کو اپنی بزمِ معارف میں لاتے ہیں، تو تعارف کس انداز سے کراتے ہیں، اور نقیب بن کر صدائیں کیا کیا لگاتے ہیں۔ —— "نقیب" کی تشبیہ کسی معتقد کو گراں نہ گذرے، ذکر ۱۹۱۶ء کا ہے، اکبر اُس وقت ۷۰ سال کے معمر و محترم بزرگ ہیں، اور مولانا ندوی اُن کے خوردوں کے خورد، یعنی اُن کے صاحبزادہ سے بھی کم عمر۔

"ظرافت کا رنگ جو سید انشا، اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری میں پیدا ہو گیا تھا، اس کا مقصد محض تفریحِ طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایتِ لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اس کا مقصد بھی صرف تفننِ طبع تھا، لکھنؤ میں امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، جان صاحب کا رنگ گو زنانہ لہجہ میں آکر بدنما ہو گیا تھا تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریحِ طبع تھی، میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انھوں نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغزِ سخن کو امانت کے الفاظ میں اور سید انشا کی بولی میں اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریحِ طبع اور واہ واہ کا سامان رہا بلکہ اُس کی تہ میں پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل، اجتماعی مباحث نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور اقوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادہ افرنگی کی آمیزش سے ذوقِ کلام کو لطف دیتے ہیں............ میر صاحب اسی شیر و شکر میں پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤں کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہیں جن کو یوں پینا اس جدید دورِ لطافت و نزاکت پسندی میں ناممکن تھا، میر صاحب بھری محفل میں علمائے کرام، مشائخ عظام، امرا و حکام، مدعیانِ رہبریٔ عام، اور نوجوان تعلیم یافتوں کا خاکہ اڑاتے ہیں۔ اور اُن کی چتون پر میل تک نہیں آتا۔" (ص ۱۶۵، ۱۶۶)

اور پھر چند صفحوں کے بعد:-

"جدید تہذیب کے دلدادہ، بے پردگی کے حامی اور عورتوں کو پبلک میں دیکھنے کے مشتاق ہیں،"

سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے، گویا وہ تعلیم سے عاری ہے۔ میر صاحب اُن کے دعویٰ کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہے شمعِ بزم پہلے چراغِ خانہ تھی

"شمعِ بزم اور چراغِ خانہ کی تشبیہ سن کر عجب نہیں کہ عورتوں کی بے پردگی، اور انگریزی تعلیم کے مدعی چراغ پا ہو جائیں؟"

رخصت اے بزمِ شبلی کے مکین، بلکہ سروِ صدر اور چشم و چراغ، سلیمان ندوی رخصت! تو نے جہاں ایک طرف الحاد و بے دینی کے بڑے بڑے سرکش و منہ زور جنات کو بوتلوں میں بند کیا، وہیں الفاظ و معانی کی کیسی کیسی لطیف پریاں بھی شیشہ میں اتارتا رہا!

سید صاحب کے پیش نظر
بعض اہم علمی کام

از

مولانا محمد اویس صاحب ندوی استاذ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

سید صاحبؒ اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے، لیکن جو کچھ چھوڑ گئے ہیں، وہ بھی کم نہیں ہے، اُن کی تصنیفات، مقالات، خطبات، اور مکاتیب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، موجودہ اور آیندہ نسلوں کی دینی، اخلاقی، علمی، اور ذہنی رہنمائی کے لئے اس میں بڑا قیمتی سامان موجود ہے،

لیکن ان "الباقیات الصالحات" کے سوا سید صاحبؒ کے سامنے کچھ اور بھی کام تھے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی جو باتیں میرے علم میں ہیں، اُن کو قلم بند کردوں، ممکن ہے کہ دوسرے حضرات کے پاس بھی اس سلسلہ کے کچھ معلومات ہوں، اگر یہ سب چیزیں جمع ہوجائیں تو آیندہ کے کاموں کا ایک نقشہ تیار ہو سکتا ہے، اور سید صاحبؒ کے حسنات کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے،

سید صاحبؒ کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن مجید سے تھا، آیاتِ قرآنی سے کلامی، فقہی، اخلاقی اور سیاستِ اسلامی کے مسائل کا استنباط، اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح، اور تاریخی مباحث کی تحقیق اُن کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا، ارض القرآن، اور سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضخیم جلدیں، اُن کے اس مذاق کی شاہد عادل ہیں،

سید صاحبؒ کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک نقشہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے دیانت اور ذہن کی سلامتی کے ساتھ آیاتِ قرآنی پر غور کیا جائے، اور ان آیات سے جن کلامی، فقہی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہو سکے، ان کو احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نیز صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے،!

یہ تجویز بظاہر بہت مختصر معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو پورا ایک ادارہ اس کام میں لگ سکتا ہے، اسلامی علوم میں مفید ترین کتابوں کا اضافہ اور اسلامی نظریات کو سمجھنے کے لئے بہترین مواد جمع ہو سکتا ہے!

سید صاحبؒ نے عقائد القرآن اور فقہ القرآن کے نام سے اس سلسلہ میں دو عنوان قائم فرما کر کچھ کام بھی شروع کر دیا تھا، فقہ القرآن کے لئے راقم سطور سے قرآن مجید کی آیاتِ احکام کو جمع کرایا تھا، جو میرے پاس موجود ہیں،

دوسرے محققین کی طرح سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ آیاتِ قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے، اور احادیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہی کلیات کی تشریح ہیں، اس سلسلہ میں سید صاحب کی رائے تھی کہ قرآن مجید نیز ذخیرۂ احادیث کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے، اور ارشاداتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انہی کلیات کے ماتحت جمع کیا جائے، اس موضوع سے متعلق سید صاحبؒ نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے، پہلا عنوان یہ ہے:

"الآیات التی استدل بها النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی ما قالہ"

اس عنوان کے تحت میں سید صاحبؒ نے ۵ استدلالاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جمع فرمایا تھا، مثال کے طور پر چند ملاحظہ ہوں،

(۱) فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم ثم تلا انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (ترمذی تفسیر)

(۲) فلما قضی الصلوٰۃ قال من نسی الصلوٰۃ فلیصلها اذا ذکرها فان اللہ تعالیٰ قال اقم الصلوٰۃ لذکری (ابوداؤد)

(۳) نهانا عن الاستخصاء ثم قرء علینا، یا ایها الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ (بخاری)

(۴) ان اللہ یملی الظالم ثم قراء وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القری و هی ظالمة۔ (مسلم)

دوسرا عنوان یہ ہے،

القسم الثانی من الاحادیث التی تفسر القرآن بغیر ذکر القرآن،

اس عنوان کے تحت میں سید صاحب نے ۲۸ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اسکی مثالیں ملاحظہ ہوں،

(۱) ایاکم والظن (مسلم) ان بعض الظن اثم،

(۲) انما هی اعمالکم ترد علیکم ولا تجزون الا ما کنتم تعملون،

(۳) انفق ینفق علیک۔ وما انفقتم من شیء فهو یخلفه

دوسرے علماء نے بھی اس عنوان سے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے، مثلاً صاحب روح المعانی کا خیال ہے کہ دعا اللهم من احییته منا فاحیه علی الاسلام ومن توفیته منا فتوفه علی الایمان کا اقتباس ہے ولا تموتن الا وانتم مسلمون[1] سے، اسی طرح حضرت مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ولکن منکم امة یدعون الی الخیر الآیہ استنبط منه حدیثه صلی اللہ علیہ وسلم،

---

[1] روح المعانی ج ۴ ص ۱۷،

لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق وحدیثہ صلی اللہ وسلموا الجہاد ماضی الی یوم القیامۃ[1]

ان عنوانات کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی اہم اور مفید خدمت ہوگی، اور اگر اس موضوع پر کچھ کام کر ڈالا جائے، تو اپنے طرز کی نئی چیز ہوگی،

ان اہم اور بنیادی کاموں کے سوا قرآن مجید کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کے پیش نظر حسب ذیل کام بھی تھے، ان میں سے بعض سید صاحب کی نگرانی میں انجام پاچکے ہیں، مگر ابھی ان کی طباعت کی نوبت نہیں آئی ہے،

(۱) دارالمصنفین کے کتب خانہ میں الفوز الکبیر کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس میں شاہ صاحبؒ کے حواشی قرآن مجید اور اصول ترجمۂ قرآن مجید کا رسالہ بھی ہے، سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو شائع کیا جائے،

(۲) قرآن مجید میں کائنات کی مختلف چیزوں کو بطور "آیات الٰہی" کے پیش کیا گیا ہے، سید صاحبؒ کا خیال تھا کہ ان تمام آیات کو الگ الگ عنوانات کے ماتحت جمع کیا جائے، اور جن چیزوں کو بطور آیات کے پیش کیا گیا ہے، اُن کے متعلق قدیم و جدید ماخذ سے ایسے معلومات کو جمع کردیا جائے، جن سے ان آیات الٰہی کے آیت (یعنی) نشانی) ہونے کی حیثیت اور حقیقت واضح ہوجائے، سید صاحبؒ نے ان آیات کو عنوانات کے ماتحت جمع کرایا تھا، اُن کی تشریح کا، کام باقی ہے،

(۳) سید صاحب کا خیال تھا کہ معانی و بلاغت نیز دوسری کتابوں میں مسائل کی تشریح کے ضمن میں قرآن مجید کے لطائف ادبیہ کو واضح کیا گیا ہے، اگر آیات متعلقہ کو عنوان بنا کر ان سب کو سور توں کی ترتیب کے ساتھ جمع کردیا جائے، تو قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے غور کرنے والوں کے لئے ایک مفید خدمت ہوگی، بحمدللہ دو جلدوں میں یہ کام پورا ہوا،

---

[1] مشکلات القرآن ص ۱۹،

(۴) قرآن مجید کے اعجاز کا مسئلہ قرآنی علوم میں جو اہمیت رکھتا ہے، وہ ظاہر ہے، ہر عہد میں مختلف نوعیتوں سے اس پر کلام کیا گیا ہے، مسلمانوں کے عہد تصنیف سے لیکر اس وقت تک اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اس کو سنین کی ترتیب کے اعتبار سے سید صاحب نے جمع کرایا، یہ مجموعہ ایک جلد میں تیار ہوا، اسکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں لوگوں نے کن کن نوعیتوں سے اس مسئلہ پر غور کیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، سید صاحب کی نگاہوں میں بہت اہمیت رکھتی تھی، مگر اُن کے نزدیک اس کی حیثیت متن کی تھی، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس کا تحشیہ کیا جائے، شاہ صاحب کے ارشادات کو آیات قرآنی سے مدلل کیا جائے، نیز اُن کے بیانات کی دوسرے محققین کی کتابوں سے توثیق کی جائے، اس سلسلہ میں بھی تھوڑا کام ہو چکا ہے،!

دارالمصنفین کے زمانۂ قیام میں سید صاحبؒ نے مجھ سے اسلام کے نظام کاشتکاری، اور کتب فقہ سے زراعت و آب پاشی کے مسائل کو اُردو میں مرتب کرنے کے لئے فرمایا، میں نے کام شروع کر دیا، اسی زمانہ میں سید صاحب تھانہ بھون تشریف لے گئے، وہاں مولانا تھانویؒ سے اس کا ذکر آیا، اور رائے یہ قرار پائی کہ شروع سے پورے سلسلۂ فقہ کو اردو میں مدون کر دیا جائے تاکہ اردو داں طبقہ کے ہاتھ میں ایسا مجموعہ آجائے جو روزمرہ کی ضروریات میں اُن کے لئے کافی ہو، سید صاحبؒ نے تھانہ بھون سے تشریف لاکر اس تجویز کا ذکر فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ اب کتاب الطہارۃ سے کام کو شروع کرو، اس کی تعمیل شروع کر دی گئی، مگر اس کے بعد میں دارالعلوم ندوہ چلا آیا، اور سید صاحب قبلہ بحیثیت قاضی القضاۃ بھوپال تشریف لیگئے، وہاں پہنچ کر سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کی اور ضرورت محسوس ہوئی، اور بار بار خطوط میں اس سلسلہ کی تکمیل کی تاکید فرماتے رہے، میں نے کتاب الطہارۃ کو ایک جلد میں مکمل کرکے بھوپال ارسال خدمت کیا، تو بھوپال کے بعض علما سے اس پر تقریظیں لکھا کر واپس فرمایا اور دوسری جلد کا کام شروع کرنے کی تاکید فرمائی مگر افسوس کہ پہلی جلد سے کام آگے نہ بڑھ سکا، سید صاحب کو اس سلسلہ کی تکمیل کا ہمیشہ خیال رہا، ملاقات سے چند ماہ پیشتر جب ڈھاکہ تشریف لائے تو بار بار فرماتے

تھے کہ اس وقت نئے نئے مسائل سامنے آرہے ہیں، اور ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ان مسائل کا تشفی بخش جواب دے سکیں، اس لئے فقہ کی تعلیم پر بہت توجہ کرنا چاہئے، دارالعلوم کے طلبہ کے سامنے جو تقریر فرمائی تھی اس میں بھی اس پر زور دیا تھا، بہرحال اردو میں فقہ اسلامی کی تدوین کی تجویز اہمیت رکھتی ہے، اور یہ کرنیکا کام ہے۔

ہندوستان کے گذشتہ اور موجودہ علماء کے حالات کے جمع و ترتیب کا کام بھی سید صاحب کے پیش نظر تھا، اسی خیال سے معارف میں وفیات کا عنوان قائم فرمایا تھا، ارشاد فرماتے تھے کہ آئندہ مورخ کو اس سے بڑی مدد ملے گی،

نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم کے کتب خانہ میں ہندوستان کے گذشتہ علماء کے حالات پر کچھ قلمی مسودات فارسی زبان میں تھے، سید صاحب ان مسودات کو دارالمصنفین لائے، ان کو صاف کرایا، مبیضہ کو اصل سے مطابقت کا کام میرے سپرد فرمایا، اسی زمانہ میں مجھ کو ملاجیونؒ امیٹھوی کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک قلمی نسخہ ملا، گو اس کو خود نوشت کہنا آسان نہیں ہے، بہرحال میں نے سید صاحب کو دکھلایا، سید صاحب نے اس کو بھی نقل کرایا، اور اسی مجموعہ میں شامل کرایا، اُن کا خیال تھا کہ یہ مجموعہ شائع کر دیا جائے، میں نے برادرم مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین سے اس مجموعہ کے متعلق دریافت کیا تھا، مگر وہ فرماتے تھے کہ دارالمصنفین میں موجود نہیں ہے، خدا کرے یہ مجموعہ محفوظ ہو، اگر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئی تو ایک تاریخی خدمت ہوگی،

سید صاحب نے ایک بار میبذی پڑھاتے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان فلاسفہ نے طبعیات کے سلسلہ جن عملی تجربات کا ذکر کتابوں میں کیا ہے، اگر ان سب کو جمع کر دیا جائے، تو ان علماء کی اس سلسلہ کی خدمات پر روشنی پڑ سکتی ہے،

اسی طرح منطق کے سلسلہ میں سید صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے فن منطق میں جو اضافے کئے ہیں ان کے متعلق بھی مفصل طور سے لکھا جائے،

آخر میں سید صاحب کی ایک خواہش کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق خود اُن کی تصانیف سے ہے اور جس سے اُن کے تصنیفی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خواہش یہ تھی کہ اُن کی تصانیف بالخصوص سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظرِ ثانی کا کام کیا جائے، اپنے بعض شاگردوں سے زبانی اور خطوط میں اس کا ذکر فرمایا، گو صرف عقیدۃً نہیں بلکہ حقیقۃً سید صاحب کا قلم خود اس قدر محتاط تھا کہ اُن کی تصانیف پر خصوصی طور سے نظرِ ثانی کی ضرورت نہیں ہو لیکن اُن کی یہ خواہش اُن کی عالی ظرفی، وسعت نظری، تلاشِ حق کی فکر، اور مسائلِ دینیہ میں انتہائی ورع و احتیاط کی کھلی ہوئی دلیل ہے، شاید عام طور سے لوگوں کو نہ معلوم ہوگا، کہ دارالمصنفین میں جب سیرۃ کی کوئی جلد چھپتی تھی، تو پہلا اڈیشن بڑی تقطیع پر چھپتا تھا، اور اس کے دو ڈھائی سال کے بعد چھوٹی تقطیع والا اڈیشن چھپتا تھا، یہ تاخیر صرف سید صاحب کی احتیاط کی وجہ سے ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے، کہ پہلا اڈیشن اصحاب علم اور اہل نظر کی نگاہوں سے گذر جائے، اُن کی تنقید کا حال معلوم ہو جائے، تب دوسرا اڈیشن چھاپا جائے تاکہ اس نئے اڈیشن میں تصحیح وغیرہ کا موقع مل جائے، اللہ تعالیٰ عام مصنفین کو اسی فضل و کمال اور رسوخ علم کے ساتھ یہی احتیاط نصیب فرمائیں، آمین۔

تحریک ندوۃ العلماء اور سید صاحب

از

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا جو زمانہ یورپ کی تاریخ کا سب سے زرین دور شمار ہوتا ہے وہی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے تاریک اور مظلم دور ہے، یورپ اس زمانہ میں اپنی ترقی کے نقطۂ عروج تک پہنچ رہا تھا، اور اسلامی ممالک زوال کے آخری نقطے تک گر کر موت کی ہچکیاں لے رہے تھے، دنیا کی سیاسی و تمدنی قیادت کی وہ باگ جو ایک ہزار برس سے اُن کے ہاتھوں میں تھی یورپ کے ہاتھوں میں جا رہی تھی، اور یہ موت کا سنبھالا لے کر یکے بعد دیگرے اپنی قیادت کی زندگی سے محروم ہو رہے تھے، یا محروم کئے جا رہے تھے، یورپ غالب ہو رہا تھا، اور یہ محکوم و مغلوب ہو رہے تھے،

مسلمانوں کا یہ زوال کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا، جو اچانک پیش آ گیا ہو، بلکہ اپنے پیچھے اسباب زوال کی ایک لمبی تاریخ رکھتا ہے، اسی طرح یورپ کا یہ غلبہ اور عروج محض کوئی ہنگامی سیاسی تغلب نہیں تھا، جو یکایک اُسے حاصل ہو گیا ہو، بلکہ اس کے جلو میں ایک جدید تمدن، ایک جدید فلسفہ، علم و فن، ایجاد و اختراع کی ہمہ گیر قوت اور سیرت و کردار کی ایک نئی طاقت تھی، جو اُس نے برسوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد فراہم کی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات جہاں پڑے، وہاں اُس کو محض سیاسی و معاشی غلبہ ہی حاصل نہیں ہوا، بلکہ ان سے وہاں کی تہذیب و تمدن، علم و فن اور فکر و عمل کے تمام گوشے متاثر ہونے، یورپ کے

اس غلبہ کا اثر یون تو ساری دنیا پر پڑا، مگر اس کا شکار سب سے زیادہ اسلامی ممالک ہوئے، ہندوستان مین اہلِ یورپ کے معاشی اور کچھ سیاسی اثرات تو اٹھارویں صدی کے آخر سے پڑنا شروع ہو گئے تھے، تاہم ابھی تک یہان ایک نام نہاد مرکزی حکومت باقی تھی، جو عام ہندوستانیون اور خاص طور سے مسلمانون کی امیدون کا آخری سہارا تھی، لیکن جب ۱۸۵۷ء مین انگریزون نے اس پر بھی قبضہ کر لیا، اور یہ آخری سہارا بھی جاتا رہا تو یہان کے عام باشندون مین شکست خوردگی اور انتشارِ ذہنی کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی،

تحریک ندوۃ العلماء کا پس منظر | مسلمانون پر اس نئی صورتِ حال کا ردِ عمل دو طرح سے ہوا، ایک گروہ نئے انقلاب کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے مین لگ گیا، اور دوسرا گروہ اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کی حفاظت مین مشغول ہو گیا،

پہلے گروہ کا نقطۂ نظر زندگی کے ہر شعبہ مین سراسر نقل و تقلید تھا، اس لئے اس سے جو لوگ متاثر ہوئے وہ آہستہ آہستہ سیاست، معیشت، تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق حتیٰ کہ دین و مذہب کے بارے مین بھی اُن کا وہی نظریہ بن گیا، جو حکمران قوم کا تھا، اس سے کچھ نہ کچھ مادی فوائد ضرور حاصل ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس طرزِ عمل کی بدولت ہمارا تصورِ دین بدلا، تصورِ اخلاق بدلا، فلسفۂ زندگی بدلا، اور ہماری تہذیب کی بنیادین متزلزل ہو گئین،

دوسرے گروہ کا ردِ عمل اس کے بالکل برعکس ہوا، پہلا گروہ اگر آنے والے سیلاب مین بہ نکلا، تو دوسرا گروہ جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گیا، اس نے کوشش کی کہ علم و مذہب اور اخلاق و معاشرت اور روایات کی اس پوری میراث کو جو اٹھارہوین صدی کے لوگون نے چھوڑی، اور انیسوین صدی کے لوگون نے پائی تھی جون کا تون باقی رکھا جائے، اور نئی فاتح قوم کا نہ کوئی اثر قبول کیا جائے، اور نہ اس کے سمجھنے مین اپنا وقت ضائع کیا جائے، انھون نے ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہین کیا، کہ اگلون کی میراث کا تجزیہ کر کے دیکھین کہ اس مین کیا چیز باقی رکھنے کے اور کیا بدلنے کے لائق ہے اور نہ اس کی جانب توجہ کی کہ جدید تہذیب سے کیا لینے کے

قابل ہے، اور کیا چھوڑنے کے قابل ہے، اس کے بجائے انھون نے اپنا سارا زور پہلی حالت کے باقی رکھنے پر صرف کیا، ان کا نصاب وطریقۂ تعلیم، اُن کے مشاغل، اُن کے مسائل، اُن کا انداز فکر اور طریق کار سب کا وہی تھا جو ایک صدی پہلے تھا، الا ماشاء اللہ،

اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ہمارے بزرگون نے دین واخلاق کی جو میراث چھوڑی تھی، کچھ لوگ اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے، اور آیندہ نسلون کو منتقل کرنے لگے، اور آج قرآن وسنت کا جو علم ہمارے پاس باقی رہ گیا ہے وہ ان ہی کی بدولت رہ گیا ہے، مگر اس گروہ کے طرز عمل سے کچھ نقصانات بھی ہوئے،

انیسوین صدی کے آخر مین قریب قریب پورے ہندوستان مین یہی صورت حال رونما تھی، کہ ایک طرف جدید گروہ تھا جس مین ایک ولولہ اور جوش تھا، اور جس کا اثر ورسوخ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا، دوسری طرف ہمارا قدیم گروہ تھا، جو اپنی موجودہ حالت پر بڑی حد تک قانع تھا، اور جس کا حلقۂ اثر روز بروز گھٹتا اور سمٹتا جا رہا تھا، ان دونوں گروہوں کے فکر وعمل کے اس اختلاف اور اس مین افراط وتفریط کی وجہ سے اُن مین اجنبیت وبے گانگی کی ایک ایسی خلیج حائل ہوگئی، کہ دونون کا ایک جگہ جمع ہونا اور دونون سے بیک وقت تعلق قائم رکھنا بھی دشوار ہوگیا، نہ مذہبی طبقہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید تعلیم کے فوائد سے بہرہ مند ہونا چاہیے، بلکہ وہ اس کو الحاد وزندقہ قرار دے رہا تھا، اور نہ جدید تعلیم یافتہ گروہ نے اس بات کی کمی محسوس کی، کہ علم دین حاصل کرنے کے لئے اہل دین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ وہ اس کو قدامت پرستی، اور تنگ نظری سمجھتا تھا،

قدیم وجدید کی اس کشمکش کے علاوہ خود مذہبی گروہ بھی آپس مین متفق ومتحد نہین تھے، بلکہ وہ مختلف جماعتون مین بٹے ہوئے تھے، اور ہر جماعت دوسری جماعت کو گمراہ سمجھتی تھی، اُن کا آپس مین ایک جگہ جمع ہونا، اور ایک دوسرے کے پیچھے چلنا ناممکن ہوگیا تھا، یہان تک کہ کتنی جگہ انھون نے خانۂ خدا کو بھی تقسیم کر لیا تھا، جن کے اثرات کہین کہین اب بھی باقی ہین، اس صورت حال کی وجہ سے مسلمان قدیم وجدید کی تفریق کے ساتھ دوسری

بہت سی قسموں اور فرقوں کا شکار ہو رہی تھی،

مگر اس اختلاف و پراگندگی کے دور میں بھی قوم میں بعض ایسے عاقبت اندیش اور اعتدال پسند افراد موجود تھے جو اس اختلاف کو قومی و دینی حیثیت سے سخت مضر سمجھتے تھے، اُن کے خیال میں مسلمانوں کے لئے نہ تو جدید طبقہ کی مرعوبانہ اور خالص ترقی پسندانہ ذہنیت بالکلیہ مفید تھی، اور نہ قدیم گروہ کا جمود و تعطل، تعصب و تحزب، اور جدید تعلیم سے گریز پسندیدہ تھا، مگر ان طبقوں میں اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی تھی، کہ اس کا پاٹنا اور ان کو کسی ایک مقصد پر متحد کرنا آسان نہیں تھا، اس لئے پہلے انھوں نے ایسے تمام لوگوں کو جو موجودہ صورت حال کو بدلنے اور اس کی اصلاح کا جذبہ رکھتے تھے، ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ انہی کے ذریعہ موجودہ فضا کو بدلنے اور قدیم و جدید اور مذہبی گروہی عصبیت کو مٹانے کا کام انجام دیا جائے، اسی اعتدال پسندانہ اور جامع تخیل کی صورت گری ۱۸۹۲ء میں کانپور میں مجلس ندوۃ العلماء کی شکل میں ہوئی،

اس مجلس نے جب اس تخیل اور مقاصد کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا، تو ابتدا میں بعض جماعتوں خصوصاً قدیم مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی، مگر اس کے باوجود قوم کے عاقبت اندیش، درد مند اور اعتدال پسند عناصر خواہ ان کا تعلق کسی گروہ اور کسی فرقہ سے رہا ہو، اس آواز پر کھنچ آئے، اور دو برس کے بعد یعنی ۱۸۹۴ء میں یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ مختلف الخیال اور متضاد عناصر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر دین و ملت کے تحفظ کی تدبیریں سوچنے لگے، اور اجنبی حکومت کی وجہ سے جو نئی صورت حال اور مشکلیں پیدا ہو گئی تھیں اُن کے حل کرنے کے منصوبے بنائے،

دار العلوم ندوۃ العلماء

اس مجلس نے اپنے وسیع اور ہمہ گیر تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں، اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ ایک ایسی درسگاہ کھولی جائے جس کا طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم قدیم و جدید کی خامیوں سے پاک اور ان کی خوبیوں کا جامع ہو، تاکہ اس سے جو افراد تعلیم پا کر نکلیں، وہ قوم کے اندر اس جامع تخیل کا احساس پیدا کر سکیں جس کی اس وقت ضرورت تھی، اور جس کے لئے مجلس ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تھا، چنانچہ

اسی تجویز کے تحت لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے ایک درسگاہ کا قیام عمل میں آیا، اسی جامع تخیل درسگاہ کے گوہر شب چراغ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے،

اس وقت مجلس ندوۃ العلماء کا مظہر محض ایک عربی درسگاہ رہ گئی ہے، مگر جس زمانہ میں یہ مجلس قائم ہوئی تھی اسوقت مستقلاً ایک نئی تحریک، دعوت اور قدیم وجدید کی جامعیت کا ایک نشان تھی، اس کے پلیٹ فارم سے دین وملت کے بیسیوں مسئلے طے ہوئے تھے،

درسگاہ کے قیام کے بعد بھی بہت دنوں تک یہ مجلس اپنی اصلی ہیئت میں باقی رہی، مگر آہستہ آہستہ اس کی تحریکی حیثیت ختم ہوتی گئی، اور اس کے ارباب بست وکشاد کی ساری توجہ اس درسگاہ تک محدود ہو کر رہ گئی، اس میں شک نہیں کہ اس درسگاہ نے تحریک کی جامعیت اور اس کی ہمہ گیری کو کسی نہ کسی حد تک باقی رکھا، اور اس کے تخیل کو عملی جامہ پہنایا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ درسگاہ درسگاہ ہوتی ہے اور تحریک تحریک، درسگاہ کا اثر محدود ہوتا ہے، اور تحریک کا اثر ہمہ گیر اور وسیع ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس درسگاہ کے نونہالوں نے مسلم قوم کے ہر طبقہ کے فکر وعمل میں جو انقلاب، جو حرکت اور جو اعتدال وتوازن پیدا کیا، اسکو بھلایا نہیں جا سکتا،

آج ہم جس شخصیت کا ذکر کر رہے ہیں، وہ اسی مادر علمی کا پروردہ اور اسی دانشکدۂ علم وفن کا گل سر سبد تھا، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی آغوش سے محض ایک سید سلیمان ندوی ہی کی شخصیت پیدا ہوئی تھی، تو بھی ہم اس تحریک کو ناکامیاب نہیں کہہ سکتے تھے، مگر اس نے تو ملک کے اندر اور ملک سے باہر اتنے نشانات چھوڑے ہیں کہ ان کے ذریعہ دین وملت کے کتنے راہ رو منزل مقصود کا پتہ پا رہے ہیں،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً نصف صدی تک ندوہ کی جامعیت، ہمہ گیری اور اعتدال پسندی کو نہ محض زندہ رکھا، بلکہ اس میں اور وسعت دی، قدیم وجدید کی تفریق اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹانے اور ان کو باہم شیر وشکر کرنے میں پورے اخلاص کے ساتھ حصہ لیا، اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے، خود اسلام اور اسلامی تمدن وتاریخ پر جو داخلی اور خارجی حملے کئے جا رہے تھے، ان کی روک تھام کیلئے ندوہ نے جو

داخلی اور خارجی حملے کئے جارہے تھے، اُن کی روک تھام کے لئے ندوہ نے جو پروگرام بنایا تھا، اسے سید صاحب نے ہی اپنی دلیلی دونوں حیثیتوں سے پورا کیا یعنی انھوں نے ان حملوں کا جواب بھی دیا، اور اسلامی مسائل کی ایسی صحیح اور دلنشین تشریح کی کہ حملہ کرنے والوں کی ہمتیں چھوٹ گئیں، اور کتنے تائب ہوکر اسلام کے گرویدہ ہوگئے،

سید صاحب کی شخصیت ملک و قوم کے مختلف الخیال عناصر کا ایک سنگم تھی، جہاں مختلف دھارے آکر مل جاتے تھے، اُن کی ذات پر ہر حلقے، ہر طبقہ اور ہر گروہ کو اعتماد تھا، ندوہ کی سالانہ مجلس جب تک ہوتی رہی اس میں ہر مکتب خیال کے لوگ اکٹھا ہوتے رہے، مگر اس مجلس کے برہم ہونے کے بعد علماء میں صرف ایک سید صاحب ہی کی ذات تھی جہاں یہ عناصر جمع ہو سکتے، ہر طبقہ کے لوگ ان پر یکساں اعتماد کرتے، اور اُن کو اپنی مشترک علمی دینی اور سیاسی مجلسوں کا صدر نشین بناتے تھے،

تحریک ندوۃ العلماء کے پیش نظر جو مقاصد تھے، مختصراً ان کا تذکرہ کرنے کے بعد اُن کی روشنی میں سید صاحب کے کارناموں کی تفصیل کی جائے گی،

ان مقاصد کی تفصیل علامہ شبلی کی زبان سے سنیئے جنھوں نے ندوہ کے قالب میں نئی روح پیدا کی،

جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت بنی شروع ہوئی، اور اس کی دیواریں کچھ بلند ہوگئیں تو علامہ شبلی پر اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، اور ایک دن تمام طلبہ کو لے کر عمارت کے پاس گئے، جو کمرہ تفسیر قرآن کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، وہاں سے مزدوروں کو ہٹا دیا، اور طلبہ کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کچھ دیر اینٹیں، گارا اور چونا ڈھوتے رہے، اسکے بعد طلبہ کو جمع کرکے ایک تقریر کی جس کے آخر میں انھوں نے بڑے الحاح وزاری کے ساتھ یہ دعا کی،

"اے خدا یہ چند ناتوان، کم حیثیت، کم مایہ بچے تیرے گھر میں مزدوری کرنے آئے ہیں، ان کی مزدوری قبول کر، مغربی خیالات کا سیلاب مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے جاتا ہے جن کے ساتھ اُن کی مذہبی حالت، مذہبی علوم، مذہبی شعائر سب اس طوفان کی زد میں ہیں، اے خدا! ان

چند ناتوان بچوں کا دعوی ہے کہ وہ اس سیلاب کی ٹکر کو سنبھالیں گے، یہ بہت بڑا دعویٰ ہے جو ان کے چہرہ پر نہیں کھلتا تو بھی ہے جو ان کی آبرو رہ جائے "

علامہ شبلی جن ناتوان بچوں کو لے کر مزدوری کے لئے گئے تھے، اور جن کے لئے انھوں نے خدا کی بارگاہ میں یہ دعا مانگی تھی کہ ان کو مغربی سیلاب کے مقابلہ کے لائق بنا، ان میں ایک سید سلیمان ندوی بھی تھے،

یہ پردرد اور پرسوز دعا اس کمرے کے پاس مانگی گئی تھی، جو کلام الٰہی کی تفسیر کے لئے تعمیر ہو رہا تھا، جو اس بات کی علامت تھی کہ مغربی سیلاب کے روکنے کے لئے نونہالان ندوہ جو بھی کوشش کریں گے، اس کی بنیاد کتاب اللہ پر ہوگی، چنانچہ سید صاحب نے اپنی تمام علمی سرگرمیوں میں اس کو پیش نظر رکھا،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ندوہ نے نہ تو جدید گروہ کی راہ عمل اختیار کی تھی، اور نہ قدیم گروہ کی، اس نے شروع میں اس کی شدید مخالفت ہوئی، علامہ شبلی نے اس کے جواب میں بہت سے مضامین لکھے، اور اپنا نقطۂ نظر نہایت سنجیدگی سے سمجھایا، ۱۹۰۵ء میں الندوہ میں ندوہ کی تعلیمی پالیسی پر ایک مضمون لکھا جس کے آخر میں لکھتے ہیں

" ہم نے بار بار کہا ہے، اور پھر یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزو مشرقی اور دوسرا مغربی ہو"

جب ندوہ کی چند سالہ کوششوں سے اس کے نتائج نگاہ کے سامنے آئے تو علماء کو جدید تعلیم کی ضرورت کا کسی قدر احساس ہوگیا، مگر جدید حلقہ میں دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس ابھی پیدا نہیں ہو سکا تھا، علامہ شبلی نے اس کے لئے ایک طویل مضمون لکھا جس میں حسب ذیل سوالات قائم کئے، اور پھر خود ہی اُن کے جوابات دیئے،

(۱) جدید تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ (۲) قدیم تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا، اگر کسی کو ہو تو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں،

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں وقتہً نفی کی صورت میں آئے گا لیکن ذرا غور سے کام لینا چاہئے، اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہئے،

(۱) کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا کچھ ہے ؟

(۲) اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر اُن کی قومیت کیونکر قائم رہے گی ؟

(۳) اگر مذہب کی ضرورت ہے، تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیونکر قائم رہے گی ؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے، اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اسی قدر تعلیم سے قرآن وحدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے ؟ کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام.................. جو اعتراضات کرتے ہیں انکے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے، ؟

اس کے بعد قدیم وجدید دونوں طریقہ تعلیم پر تنقید کرکے آخر میں لکھتے ہیں،

"دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزاء ہیں . . . . دونوں کو آپس میں دست وبازو ہوکر کام کرنا چاہئے،

" علماء کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح واضافہ چاہتے ہیں، وہ ان اصولوں کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں، جو ندوہ نے اختیار کیا ہے (مقالات شبلی ج ۳)

یہ تفصیلات اس لئے پیش کی گئی ہیں، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ ندوۃ العلماء محض ایک درس گاہ کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک جامع تحریک تھی، جس کے پیش نظر حسب ذیل مقاصد تھے،

(۱) مغربی افکار وخیالات اور تہذیب وتمدن کا سیلاب جو مسلمانوں کو اپنی رو میں بہائے لیے جا رہا تھا، اس کا مقابلہ کیا جائے۔

(۲) قرآن وسنت کی حفاظت، اور اُن سے براہ راست تعلق پیدا کرانے کی کوشش کیجائے یعنی اُن کی تعلیمات کو ایسے موثر انداز سے پیش کیا جائے کہ لوگ ان کا زیادہ سے زیادہ اخلاقی اثر لین، اور اُن کو عملاً اپنی زندگی مین نافذ کرین،

(۳) قدیم وجدید دونون طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی جائے، اور اس کا عملی تجربہ دار العلوم ندوۃ العلماء مین کیا جائے، تاکہ قوم مین ایسے تعلیم یافتہ افراد پیدا ہون جو قوم کی صحیح راہ نمائی کرسکین،

(۴) قدیم وجدید طبقون کی اجنبیت اور علماء کی گروہی عصبیت کو مٹا کر ان کے اندر اعتدال پیدا کیا جائے

سید صاحب کی زندگی، اور ان کے کارنامون پر اگر ایک سرسری نظر بھی ڈال لی جائے تو یہ اندازہ ہوجائیگا کہ وہ ان مقاصد کا عملی پیکر تھے، انھون نے زندگی کے ہر کام اور ہر موقع پر ان مقاصد کو پیش نظر رکھا، وہ سیاست کی ہنگامہ آرائیون مین ہون، یا علم وفن کے گوشۂ تنہائی مین، ندوۃ العلماء کے پرسکون اجلاس مین ہون، یا جمعیۃ العلماء کے پرشور جلسون مین، فاضلانِ دیوبند کے حلقہ مین ہون یا ندویون کی برادری مین، قدیم گروہ کے حجرون مین ہون یا جدید طبقہ کے عشرت کدون مین وہ ندوہ اور اُس کے مقاصد کو کبھی نہین بھولتے تھے،

ندوہ کے مذکورہ مقاصد کی افادیت کو آج ہر طبقہ اور ہر گروہ نے محسوس کر لیا ہے، اور اسی کے مطابق اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل مین کچھ نہ کچھ تبدیلیان بھی کرلی ہین، مگر نصف صدی پہلے اس کی شدید مخالفت کی گئی تھی، اس مخالفت کے نتیجہ مین علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علحدگی اختیار کرلی، سید صاحب کو بھی ان مخالفتون کا سامنا کرنا پڑا، مگر ان کی جامع اور ہمہ گیر شخصیت مین یہ ساری مخالفتین چھوٹے چھوٹے گندے نالون کی طرح گرین اور بہ گئین،

یون تو ندوہ کے پورے حلقہ نے اس کے مقاصد کو پورا کرنے مین کچھ نہ کچھ حصہ لیا، مگر سید صاحب نے اس مین سب سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اور اُن کی کوششین سب سے زیادہ نتیجہ خیز ہوئین،

درسگاہ کے قیام کے بعد ندوہ کے مقاصد کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ

الندوہ جاری کیا گیا، اس رسالہ نے مسلمانوں کے فکر و نظر پر جو اثر ڈالا، اس کا کچھ حال سید صاحبؒ کی زبان قلم سے سنئے:

"اس پرچہ میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے، اس رسالہ نے سیکڑوں برس بعد علماء کی سطح جامد میں حرکت پیدا کی، اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق، عقائد اور فقہ کے چند مسائل قرار پائے تھے جن پر گو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، پھر بھی جو آتا تھا، وہ انہی کو دہرا دہرا کر اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا، حالانکہ زمانہ کا رُخ ادھر اُدھر پھر چکا تھا، اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کیلئے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دیئے تھے، الندوہ کا یہ بڑا فیض ہے کہ اُس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا، اور ان کو کتنی ہی ناگواری ہوئی ہو اور ان کی پیشانی پر کتنے ہی بل پڑ پڑ گئے ہوں، لیکن انھوں نے اُس کو پڑھا اور پڑھنے پر مجبور ہوئے،

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا، اسلام اور علوم اسلام کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے، زبان و بیان کے انداز و پیرایۂ بیان معلوم ہوئے،

الندوہ کا اثر خصوصیت سے نوجوان[1] علماء اور قریب فارغ التحصیل طلبہ پر جدید پڑا، نام نہیں لونگا، مگر بتا سکتا ہوں کہ بڑے بڑے مقدس آستانوں اور درسگاہوں کے حاشیہ نشینوں نے اس کے طرز نگارش اور پیرایۂ بیان کی نقل اتاری، اور اپنے اپنے دائرہ میں ناموری حاصل کی، اور ان سے دین و ملت کو فائدہ پہنچا، خود دارالعلوم ندوہ کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، اور کئی مستعد طالب علموں کی (جو اس وقت مشہور مصنف ہیں) بسم اللہ اسی دبستان سے ہوئی،"

---

[1] خاص طور سے مولانا ابوالکلام قابل ذکر ہیں جن کی علمی تحریروں کا آغاز الندوہ سے ہوا،

خود سید صاحب نے ندوہ کے مقاصد کے پیش نظر دینی اور تحقیقی کام انجام دیئے، اس کی ابتدا الندوہ ہی سے ہوئی، ابھی سید صاحب نے اس میں دوسرا یا تیسرا ہی مضمون لکھا تھا کہ مولانا حالی پڑھ کر باغ باغ ہو گئے، اور علامہ شبلی کو ان لفظوں میں مبارکباد دی،

"سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت ہی عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے، فبارک اللہ فیھا وفی طلبتھا وفی تعلیمھا، مجھے امید نہیں، بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج ویسا ایک بھی نہ پیدا کر سکی"[1]

سید صاحب کی اسی صلاحیت کی بنا پر ان کی طالب علمی ہی کے آخری زمانہ میں ان کو الندوہ کی نیابت سپرد کر دی گئی، جس کو انھوں نے بدفعات تقریباً چار سال انجام دیا، سید صاحب نے اس مدت میں بہت سے ایسے مضامین لکھے جس کے ذریعہ مغربی خیالات اور مادی تصور حیات کی سطحیت اور ناپائداری ثابت کی، اور اس کے مقابلہ میں اسلامی احکام کی فوقیت اور اسکی پائداری دکھائی مثلاً

مذہب اسلام اور علم و عقل، القرآن والفلسفۃ الجدیدہ، فنائے مادہ، اسلام پر ایک جرمن کا لکچر، امکرات القرآن، ایمان بالغیب، اسماء القرآن وغیرہ،

ایک اہم مضمون | اس وقت اردو زبان میں اشتراکیت اور اسلام کے معاشی نظام پر بیشمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اس زمانہ میں یہ موضوع بالکل نیا تھا اور اردو میں غالباً سب سے پہلے سید صاحب ہی نے اس پر قلم اٹھایا، اور الندوہ میں کئی قسطوں میں اشتراکیت اور اسلام کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا جس میں اشتراکیت پر سخت تنقید کی، اور اس کے مقابلہ میں اسلام کے معاشی نظام کی خوبی دکھائی، تعلیم سے فراغت کے بعد سید صاحب ندوہ ہی میں استاذ ادب مقرر ہو گئے جسکی وجہ سے تعلیمی حیثیت سے بھی ان کو ندوہ کی خدمت کا موقع ملا،

---

[1] الندوہ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

اسی زمانہ میں علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے علیحدگی اختیار کرلی، اور وہ مجلس برہم ہوگئی، جو ندوہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے علامہ شبلی نے کئی برس کی جانکاہ محنت کے بعد بنائی تھی، ان کی علیحدگی تحریک ندوہ کے لئے بڑا حادثہ ثابت ہوئی، اور اس میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا، جس کا اثر برسوں رہا، اور وہ خلا اس وقت پر ہوا جب ۱۹۲۳ء میں سید سلیمان ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنائے گئے، اس علیحدگی کا سبب ندوہ کے تعلیمی مقاصد میں مولانا شبلی، اور مدرسین و کارکنان ندوہ میں نقطۂ نظر کا اختلاف تھا، مدرسین اور کارکنوں کی اکثریت ندوہ کو اسی پرانے ڈھرے پر لیجانا چاہتی تھی، جس کی اصلاح کے لئے ندوہ کا قیام عمل میں آیا تھا، اور علامہ شبلی ندوہ کو ان اصلاحات کا نمونہ بنانا چاہتے تھے، جن کے لئے یہ درسگاہ قائم کی گئی تھی، غرض اسی کشمکش کے نتیجہ میں علامہ شبلی کو الگ ہونا پڑا، اس طرح وہ بزم علم و دین جس کی شیرازہ بندی انھوں نے برسوں کی محنت کے بعد کی تھی، منتشر ہوگئی، خود سید صاحب بھی ندوہ سے علیحدہ ہوگئے، گو اب استاذ اور شاگرد دونوں کا ندوہ سے کوئی قانونی تعلق باقی نہیں رہا تھا، مگر اس کے مقاصد کی تکمیل کا جذبہ جو ان کی زندگی کا اب مشن بن چکا تھا، باقی رہا،

اسی زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں ایک نیا شور طرابلس پر اٹلی کے حملہ سے برپا ہوا، جس سے ہر صاحب احساس کا دل بے چین ہوگیا، مولانا ابوالکلام نے جو ہندوستان میں اس کے سب سے بڑے وکیل تھے، الہلال کے ذریعہ سے ایک دینی و قومی مسئلہ بنا دیا، اور مسلمانوں کے دلوں میں مغرب کے خلاف ایک نیا جوش و جذبہ پیدا کر دیا، علامہ شبلی نے بھی زبان و قلم دونوں سے اس میں حصہ لیا اور مولانا ابوالکلام کی درخواست پر سید صاحب کو الہلال کی معاونت کے لئے بھیجا، اس طرح مغربی سیلاب کے مقابلہ کا جو کام سید صاحب اب تک الندوہ کے پرسکون علمی گوشہ میں بیٹھ کر رہے تھے، اب وہ کام سیاسی میدان میں آکر الہلال کے شعلہ بار مضامین کے ذریعہ انجام دینے لگے، الہلال کے زمانۂ ادارت میں انھوں نے بہت سے معرکۃ الآراء مضامین لکھے، اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف جو جذبہ مولانا ابوالکلام کے الہلال نے پیدا کیا تھا، اس میں سید صاحب کے زور قلم کو بھی بڑا دخل تھا، خصوصیت سے ان کا مضمون مشہد اکبر، تحریر یتہ فی الاسلام تو اس وقت بچے بچے کی زبان پر تھا،

جب ہندوستان کی سیاست میں ذرا سکون پیدا ہوا، تو سید صاحب پھر لکھنؤ واپس چلے آئے، اور احباب کے مشورے سے پونا چلے گئے،

پونا ہی کے زمانۂ قیام میں ارض القرآن جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا، ارض القرآن کا موضوع جغرافیہ قرآن ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مگر اس وقت اس کے بارے میں چند باتیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں، عرض کی جاتی ہیں،

آج سے پچاس برس پہلے خالص جغرافیہ قرآن پر اردو کیا عربی زبان میں بھی کوئی جامع اور مکمل کتاب موجود نہیں تھی، قدیم عربی تاریخوں میں منفرق طور سے اس پر بحثیں ضرور ملتی ہیں، مگر عربی مورخین کو قدیم یونانی اور رومی تاریخوں اور اثری انکشافات سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملا تھا، اس لئے جب یہ کتابیں ان کے سامنے آئیں، اور عرب و شام عراق وغیرہ میں اثری انکشافات ہوئے تو ان کی روشنی میں یورپین مورخین نے قرآن میں مذکورہ مقامات اور ان کی قوموں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں مغربی مصنفین کے تمام جدید ذرائع معلومات اور قدیم ماخذ کو سامنے رکھ کر پورے قرآن کا جغرافیہ لکھا، مغربی مصنفین کی تاریخی تحقیقوں اور قیاس آرائیوں کی کمزوری دکھائی، اور قرآن پر کئے گئے ایک ایک اعتراض کا پردہ فاش اور اس کا مکمل جواب دیا، اس سلسلہ میں انھوں نے عربی مورخین کی بھی بعض تاریخی غلطیوں کی وضاحت کی،

غرض اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے قرآن کو ہدف طعن بننے سے بھی بچا لیا، اس لئے ان کی یہ خدمت دینی حیثیت سے بھی بہت اہم ہے، اور علمی و تحقیقی حیثیت سے بھی،

سیرت نبوی سیرت نبوی کی تالیف کا کام علامہ شبلی نے ندوہ ہی میں شروع کیا تھا جس میں سید صاحب شریک تھے، اس تالیف سے ان کا مقصود محض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کی واقعات نگاری اور آپ کی کچھ اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ نہیں تھا، بلکہ اس کے متعدد مقاصد تھے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ

اسلام اور آپ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں ان کو دور کیا جائے اور آپ کی سیرت کا صحیح مرقع دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، جلد اول کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا۔

یورپ کے مورخین آنحضرت صلعم کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ نعوذ باللہ ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلام کے حالات و سوانح دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح آہستہ آہستہ یہ زہر آلود معلومات اثر کر جاتی ہیں۔"

علامہ شبلی نے اس کا جو وسیع خاکہ تیار کیا تھا ابھی اس میں وہ رنگ نہیں بھرنے پائے تھے کہ جوارِ رحمت میں جگہ پا گئے۔ ان کے بعد سید صاحب نے انہی کے نقشِ قدم پر چل کر اس کی تکمیل کی، سیرت جلد چہارم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :۔

"ہم انشاء اللہ تفصیل سے بتائیں گے کہ تمدن، معاشرت، بالخصوص قوانین نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت (سیاست) اقتصادیات، وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے، اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کا معراجِ ترقی شریعتِ اسلام کا پایۂ اولین ہے"

سید صاحب نے فکر و نظر کی جس وسعت اور مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ سیرت کا ذخیرہ تیار کیا اور اس کے ذریعہ مغربی افکار و خیالات پر جو تنقید کی ہے اس کی مثال کم از کم ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی

دارالمصنفین | ندوہ نے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے اور ندویوں کی فکری و علمی تربیت کے لئے یہ کوشش کی تھی کہ ندوہ میں ایک شعبۂ تصنیف و تالیف بھی قائم ہو، چنانچہ ۱۹۱۰ء میں دلی میں ندوہ کا اجلاس ہوا تو علامہ شبلی نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک نئی تجویز پیش کی کہ اس کے لئے ایک بڑا کتب خانہ فراہم کیا جائے ان کی تجویز کے الفاظ یہ تھے،

"یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف ہو، ...... یہ اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جائے"،

اسی جلسہ میں سید صاحب نے بھی ایک مضمون پڑھا تھا جس میں اسی تجویز کو عملی شکل دینے کی متعدد تجویزیں تھیں انھوں نے آخر میں لکھا تھا،

"ندوۃ العلماء جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ میں تیار کرنا چاہتا ہے، وہ اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجۂ عالمیت یا درجۂ تکمیل کے بعد تالیف و تصنیف میں مشغول ہوں، اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تصنیف و تالیف قائم کیا جائے، .... اور اس ادارہ کا نام دارالمصنفین ہو"

مگر بعض کوتہ اندیشوں اور بدا ندیشوں کے اختلاف کی وجہ سے استاد اور شاگرد کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ دارالمصنفین ندوہ میں کھلے، پھر بھی علامہ شبلی آخر وقت تک اس کیلئے کوشش کرتے رہے، اور ان کے دوسرے شاگردوں کی بھی یہی خواہش تھی، جب مولانا مسعود علی صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی تو ان کو لکھتے ہیں،

بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے، کہ میں بناؤں حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے"،

جب وہ ارباب ندوہ کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئے، تو اسے اعظم گڈھ میں کھولنا طے کیا وہ اس کا خاکہ تیار کر چکے تھے، اور ندوہ کے بعض ذہین طلبہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا، مگر ابھی اس کی صورت گری نہیں

کرپائے تھے کہ عالمِ علیین میں جگہ پا گئے، سید صاحب نے اُن کے بعد ندوہ کے اس مقصد کو پورا ہی نہیں کیا، بلکہ اس میں وسعت بھی دی،

دارالمصنفین کے کارناموں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن اگر اس کے کارناموں پر ایک اجمالی نظر بھی ڈال لیجائے، تو اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ مغربی مصنفین نے اسلامی نظامِ حکومت، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلائی تھیں دارالمصنفین نے ان میں سے ایک ایک کا جواب نہایت ہی علمی اور تحقیقی انداز سے دیا، یہاں کی ہر کتاب گویا ایک سوال کا مدلل جواب ہے، دارالمصنفین کا یہ علمی و تحقیقی کام گو ایک پوری جماعت نے انجام دیا ہے، مگر یہ سب سید صاحب ہی کے فیضِ تربیت کا اثر ہے،

سیرتِ نبوی کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین کا سب سے بڑا کارنامہ سیر الصحابہ کی تکمیل ہے، اس سلسلہ کی سب سے پہلی کتاب خلفائے راشدین ہے، اسلام جس طرح کا نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اس کی تفصیل تو سیرت کے ذریعہ کی گئی تھی، مگر اس سوال کا جواب کہ یہ نظام اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ آنحضرت کے بعد بھی باقی رہا یا نہیں، اس کتاب سے ملتا ہے، پھر اس کے ذریعہ اس خیال کی بھی تردید کی گئی کہ مذہب و سیاست دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، دونوں کی آمیزش ممکن نہیں ہے

اس کے بعد کی جلدوں میں عام صحابہ کے حالات ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی انفرادی سیرتیں اسلام کی عملی تفسیر تھیں،

سیر الصحابہ کے ساتھ سید صاحب نے تاریخ اسلام کی تالیف کا کام بھی شروع کرایا، جس کے ذریعہ بتایا گیا کہ گو خلافت راشدہ کے بعد اسلامی حکومت کا طریقہ انتخاب شورائی نہیں رہا تھا جس کی وجہ سے اسلامی جمہوریت کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور اس کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی، پھر بھی نظام حکومت کا بڑا حصہ اسلامی ہی تھا، اس لئے علم و تمدن، اخلاق و معاملات، اور عقائد و عبادات پر صدیوں تک اس کی برکتیں باقی رہیں، نیز اس کے ذریعہ اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں کو بھی صحیح اور واضح طور سے پیش کیا گیا جن کو مغربی مصنفین

نے غلط طور پر پیش کیا تھا،

ہندوستان کی جو تاریخیں انگریزوں نے لکھیں ان میں انھوں نے اپنے سیاسی مصالح کے پیش نظر مسلمانوں کے دور کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمکش کی خلیج زیادہ سے زیادہ وسیع ہو،

سید صاحب نے ادارہ کے ابتدائے قیام ہی سے اس کام کی طرف توجہ کی، خود متعدد مضامین لکھے اور دار المصنفین کے متعدد رفقاء کے سپرد یہی کام کیا،

اس کے علاوہ کون ایسا اہم موضوع ہے جس پر دار المصنفین نے کتابیں نہیں پیش کی ہیں، قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، تمدن، غرض کوئی گوشہ نہیں چھوٹا ہے،

معارف | ادارہ کے قیام کے تقریباً دو ہی سال بعد سید صاحب نے معارف نکالا، اس پرچہ کے ذریعہ انھوں نے دین و مذہب کی، ملک و ملت کی، اور زبان و ادب کی جو بیش بہا خدمت انجام دی اور اسکے ذریعہ ندوی تحریک کو جس طرح زندہ کیا، ہندوستان میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، قدیم و جدید کا کون سا ایسا مسئلہ ہے، جس پر معارف میں مضمون شائع نہیں ہوا، خصوصاً مغربی افکار و خیالات کی تردید میں تو صدہا مضامین اس میں شائع ہوئے ہوں گے، خود سید صاحب نے جو بیش قیمت مضامین اس میں لکھے ہیں، اُن کی ضخامت کئی ہزار صفحات ہوگی، انھوں نے خاص طور سے اہل مغرب کے افکار و خیالات کے جواب میں جو مضامین لکھے ہیں انکی تعداد بھی کافی ہے،

یورپ کے مشہور مستشرق مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے مانچسٹر گارجین میں ایک مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بارہ میں شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے بعض نامناسب باتیں واقدی کی روایت سے نقل کی تھیں، سید صاحب نے کئی نمبروں میں اس کا جواب دیا، اس بحث میں مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی حصہ لیا، سید صاحب نے ان دونوں کو اپنے محققانہ مضامین کے ذریعہ خاموش کیا، ۱۹۲۶ء میں ایک یورپین اہل قلم نے ایک مضمون میں لکھا کہ "مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے"، سید صاحب نے اس کا

نہایت ہی محققانہ جواب دیا، اور ثابت کیا کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کی خدمت ضرور کی ہے، مگر اس فلسفہ کے وہ مقلد نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے اس کے سارے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہے، اسی زمانہ میں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام پر اعتراض کیا گیا، اس کے رد میں ایک طویل مضمون لکھا، ۱۹۳۱ء کا پورا سال تقریباً اسی طرح کے مضامین کے لکھنے میں صرف ہوا، مشہور انگریزی اخبار سٹیٹسمین میں ایک مضمون واقعۂ کربلا کے بارے میں شائع ہوا، جس میں بعض قابلِ اعتراض باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کا جواب دیا، اسی سال پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ داخلِ نصاب کی گئی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بارے میں بعض بے بنیاد اور توہین آمیز باتیں تھیں، سید صاحب نے اس کے خلاف معارف میں سخت احتجاج کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب نصاب سے خارج کر دی گئی، اس کے علاوہ خود ہندوستان کے بہت سے فتنہ نگاروں کا بھی جواب دیا،

معارف کی علمی اہمیت اور اس کی قدر افزائی کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ مولانا محمد علی نے ایک بار سید صاحب کو لکھا کہ

"میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرائی جائیں گی،"

مولانا ابوالکلام اس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"معارف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، صرف یہی ایک پرچہ ہے، جو ہر طرف سناٹا ہے"

ایک اہم کارنامہ | اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ سیرت النبی کی تالیف ہے، یہ کتاب نہ محض سوانح نبوی کا بہترین ذخیرہ ہے، بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کا بھی ایک عمدہ مرقع ہے،

اردو کیا عربی میں بھی سیرت نبوی پر جتنا ذخیرہ موجود ہے، کوئی بھی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے خالی نہیں ہے، مگر اس سیرت کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی ساری بنیاد یا تو قرآن پر ہے یا صحیح

درمستند احادیث نبوی پر،

سیرت نبوی کے علاوہ بھی سید صاحب نے جتنے دینی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں ان کی یہ خصوصیت نمایان نظر آے گی کہ انھون نے اپنے ہر دعوی کی دلیل قرآن یا سنت صحیحہ سے دی ہے ہر سوال کے جواب میں قرآن کی کوئی آیت یا حدیث نبوی پیش کی ہے، غرض یہ کہ سیرت کا عظیم ذخیرہ ہو، یا خطبات مدراس اور معارف کے مضامین ان سب میں اُن کی یہ امتیازی خصوصیت نمایان نظر آے گی، خود فرماتے تھے کہ میں نے سیرت کی تالیف اور اسلامی مسائل میں کتاب و سنت کے علاوہ کسی تیسری چیز کو بنیاد نہیں بنایا ہے"

بسا اوقات قرآن و سنت سے استدلال کرنے میں وہ اس وقت نظری سے کام لیتے ہیں کہ عام اہل علم کے ذہن کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض کم سوادون نے اپنے ذہن کی اسی نارسائی کی بنا پر اُن کی قرآن فہمی پر اعتراضات بھی کئے ہیں،

سید صاحب کی اس خصوصیت کی تفصیل کے لئے مستقل ایک مضمون کی ضرورت ہے اگر مجمل طور سے اُن کے کارنامون کے بارے میں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سید صاحب نے براہ راست قرآن و سنت سے اسلامی مسائل کی جو عالمانہ تشریح کی اور انکی روشنی میں سیرت نبوی کی جیسی جدید ترتیب و تبویب کی ہے، اور پھر ان سب کا ایک دوسرے سے جو ربط و تعلق دکھایا ہے، اس کی مثال پورے اسلامی لٹریچر کی کسی ایک تصنیف میں ملنی مشکل ہے، چند مثالیں یہان دیجاتی ہیں جن سے قرآن و سنت پر ان کی وسعت نظر، ان میں غور و تدبر اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں اُن کی مجتہدانہ بصیرت کا اندازہ ہوجائے گا، اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ سیرت نبوی کے سرچشمہ کو انھون نے ضعیف روایتون کی آلایشون سے کس طرح پاک و صاف کرکے ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اور اس کا انداز سب سے زیادہ معجزات کی بحث میں ہوتا ہے،

معجزات نبوی کے سلسلہ میں مسلمانون نے ہمیشہ یا تو افراط سے کام لیا ہے یا تفریط سے جن لوگون نے افراط سے کام لیا، وہ انکا انکار ہی کر بیٹھے، اور جن لوگون نے تفریط کو راہ دی، وہ ہزارون بے سروپا

روایتوں کو جزو ایمان بنا بیٹھے، آج بھی مسلمانوں میں ان دونوں انتہا پسندیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ سید صاحب نے سیرت کا جو حصہ معجزات پر لکھا ہے، اس میں ان دونوں باتوں کو سامنے رکھا، ایک طرف انھوں نے عقل پسندوں کی خشک پسندی کی دھجی بکھیری، اور دوسری طرف ہزاروں روایتوں سے انتخاب کرکے معجزات نبوی کا ایک صحیح مرقع پیش کیا، اور اس استدلال اور انتخاب میں انھوں نے کسی تجدد سے کام نہیں لیا، بلکہ انھوں نے منکرین کے سامنے انہی کے مسلّم عقلا و ائمہ کے اقوال سے معجزات نبوی پر استدلال کیا، اور روایت پرستوں کے موقف کی کمزوری انھوں نے خالص محدثانہ اصول کی روشنی میں دکھائی، جن کی وجہ سے دونوں کو خاموش ہونا پڑا،

معجزات نبوی کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ہے کہ معجزہ نام ہے محض کسی ظاہری خرق عادت واقعہ کا، جیسے عصائے موسیٰ، ید بیضا، شق القمر وغیرہ، سید صاحب نے اس عام غلط فہمی کا پردہ بڑی خوبی کے ساتھ چاک کیا، اور انھوں نے بتایا کہ معجزہ محض اسی کا نام نہیں ہے، یہ تو معجزہ کی ظاہری اور معمولی قسم ہے، کسی نبی کا اصل معجزہ اس کی تعلیم، اس کے اثرات اور نتائج، اس کی پاکیزہ سیرت، اس کا اخلاق اور کردار ہوتا ہے، جن کا اس کی زندگی کے ہر لمحہ میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اس کو انھوں نے باطنی معجزہ سے تعبیر کیا ہے، ظاہری معجزہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے، مگر اس کی حیثیت اصل کی نہیں فرع کی ہے، اس کا اثر کچھ دیر رہتا ہے، اور باطنی معجزہ کا اثر تا قیامت رہے گا، پھر اس دعویٰ پر انھوں نے قرآن و سنت سے سیکڑوں دلیلیں دی ہیں، جن میں سے ہر دلیل نہایت ہی محکم، اور نا قابل تردید ہے، (ملاحظہ ہو سیرت حصہ سوم (ص ۱۹۴ تا ۲۲۵)

معجزہ کے سلسلہ میں دوسری غلط فہمی یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام براہ راست کائنات کے تصرف پر قادر ہیں، وہ جس وقت جو چاہیں کر سکتے ہیں، اس غلط فہمی کا شکار سب سے زیادہ عیسائی، اور کسی حد تک جاہل مسلمان ہیں، سید صاحب نے اس سلسلہ میں قرآن کی بے شمار آیات کی روشنی

میں ثابت کیا ہو کہ قرآن نے اس ذہنیت کی اصلاح کی ہے، اور اس نے بتایا ہے کہ معجزہ کا ظہور نبی کی قدرت و تصرف سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ خالص خدا کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہوتا ہے،

غرض یہ کہ اس سلسلہ میں اس طرح کی نہ جانے کتنی غلط فہمیوں کو انھوں نے دور کیا ہے، یہ کہنا ایک واقعہ کا اظہار ہوگا کہ معجزات انبیاء سابقین اور معجزات نبوی پر قرآن کے دلائل کا اتنا انبار، اور فکر و استدلال کا ایسا اچھا مرقع، صحیح روایات کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی زبان میں حتی کہ عربی میں بھی موجود نہیں ہے،

معجزات نبوی کی طرح معراج نبوی کے بارہ میں بھی عام طور پر اہل علم محض روایات ہی پر اعتماد کرتے چلے آئے تھے جس کی وجہ سے یہ ایک مافوق الفطرت واقعہ تو ضرور معلوم ہوتا تھا، مگر اس مافوق الفطرت واقعہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہماری زندگی کے لئے اس کی کیا اہمیت ہے؟ اگلے انبیاء کے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا یا نہیں؟ اس کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ اس میں بارگاہ خداوندی سے کیا پیغام عطا ہوا ہے؟ اس کے یہ سب گوشے بڑی حد تک تشنۂ تفصیل تھے، سید صاحب نے ان تمام گوشوں پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور ہر جگہ اپنے استدلال کی بنیاد قرآن اور صحیح روایات ہی کو بنایا ہے، محض واقعہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کہیں کسی روایت کا سہارا نہیں لیا ہے، خاص طور سے انھوں نے معراج کے پیغام کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی نظیر کسی دوسری کتاب میں کم از کم عاجز کو نظر نہیں آئی،

عام طور پر معراج کا پیغام پنج وقتہ نماز کو سمجھا جاتا ہے، سید صاحب نے بتایا کہ یہ معراج کے پیغام کا ایک اہم جزو ہے، کل نہیں ہے، انھوں نے دکھایا ہو کہ سورۂ اسراء میں عقائد، عبادات، تمدن اور معاشرت و سیاست کے جو اصول بیان کئے گئے ہیں، وہ سب معراج ہی کے پیغامات ہیں، معراج نبوی محض ایک خرق عادت واقعہ نہیں ہے، بلکہ یہاں سے نبوت محمدی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، سیرت جلد ۳ میں تفصیل ملاحظہ ہو،

اسی طرح سید صاحب نے سیرت جلد ۵ میں عبادات قلبیہ کے تحت اخلاص، تقویٰ، توکل، صبر،

شکر وغیرہ کی جو تفصیل کی ہے، اور ان باطنی کیفیات کے حصول کے لئے قرآن وسنت کی روشنی میں جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی مروجہ تصوف کی کتاب میں نہیں ملتا، سلسلۂ سیرت کی دوسری اہم کتاب خطبات مدراس ہے یہ وہ خطبے ہیں جو انھوں نے مدراس میں دیئے تھے، اس کتاب میں انبیائے کرام کی انسانی خدمت دوسرے بانیان مذاہب کی تعلیم کی تاریخی حیثیت اور سیرت نبوی کی ہمہ گیری کا جو مرقع پیش کیا گیا ہے اگر اس کو کوئی غیر مسلم غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے پڑھے، تو وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ذات سے متاثر ہی نہیں بلکہ ان کا عقیدتمند ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس کتاب نے مسلم قوم کو سیرت نبوی پر بولنے اور لکھنے کا ایک نیا ماخذ دیا، اس کی بدولت مقررین کو سیرت نبوی کے پیش کرنے کا ایک نیا انداز اور نیا ڈھنگ معلوم ہوا، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کی بدولت کتنے لوگوں کو سیرت پر بولنا آگیا،

دوسرے ان کے وہ بیسیوں مضامین ہیں، جو انھوں نے قرآن وسنت کے مختلف موضوعوں پر معارف میں لکھے ہیں، ان مضامین کے علاوہ انھوں نے اس مقصد کی خاطر مولانا حمید الدین صاحب فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مختلف حصوں کو اپنے خاص اہتمام سے چھپوایا، جن کی وجہ سے قرآن فہمی کی ایک نئی راہ کھلی،

اس مختصر تفصیل سے اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ قرآن وسنت کی حفاظت وخدمت کے سلسلہ میں سید صاحب کی امتیازی خصوصیت کیا تھی، اور علما میں اُن کا مخصوص مقام کیا تھا،

دوسرا مقصد | ندوۃ العلماء کے پیش نظر دوسرا اہم مقصد موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح تھا، نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے سلسلہ میں ندوہ کے پیش نظر قریب قریب وہی نقشہ تھا، جو ڈیڑھ صدی پہلے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا، یعنی ابتدائی صرف ونحو اور عربی ادب کی تعلیم کے بعد طلبہ کو براہ راست قرآن وسنت کی تعلیم میں لگا دیا جائے، اور پھر یہ سلسلہ تکمیل تعلیم تک جاری رہے البتہ طلبہ کی استعداد کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم وتدریس کے معیار میں بھی اضافہ ہوتا جائے، یہاں تک کہ اختتام تعلیم تک ان ماخذ پر ایک تحقیقی نظر ہو جائے، دوسرے علوم وفنون مثلاً فقہ، اصول فقہ، کی تعلیم، قرآن وحدیث کی تعلیم کے بعد یا پھر ضمنی طور

اُن کے ساتھ ہی دی جائے تاکہ طلبہ کے ذہن میں اصل و فرع کا فرق بھی پورے طور پر بیٹھتا جائے، اور یہ بھی معلوم ہوتا جائے، کہ یہ علوم بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ اس ماخذ قرآن و سنت کے خادم یا تابع کی حیثیت سے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس اصلاح کی ابتداء سب سے پہلے خود دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہونی چاہیئے تھی، مگر ابتداء میں ندوہ کو جو مدرسین اور منتظمین ملے، اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جو اس نصاب تعلیم پر کئی صدی سے عربی مدرسوں میں پڑھایا جا رہا تھا، کسی ترمیم کے لئے راضی نہ تھے، حالانکہ یہ اُن کو بخوبی معلوم تھا کہ اس نئی درسگاہ کے قیام کا بنیادی مقصد ہی اصلاح نصاب ہے، اور اُن کو اس طرف بار بار توجہ بھی دلائی گئی، مگر چونکہ اُن کے پشت پر پورے مذہبی طبقہ کی حمایت موجود تھی، اس لئے انھوں نے اپنے اس رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے کہ امرتسر میں ندوہ کے سالانہ اجلاس میں جب علامہ شبلی نے اپنا مشہور اصلاحی ترکیب بند پڑھا، تو مولانا فاروق چریا کوٹی جو ندوہ ہی میں صدر مدرس اور علامہ شبلی کے استاد رہ چکے تھے، ان شعروں پر بہت خفا ہوئے، جن میں ۳ و عناصر کے نظریہ اور فلسفۂ قدیم پر تعریض و تنقید تھی اور طلبہ کے سامنے ۳ و عناصر کے وجود پر کئی دن تک تقریر کرتے رہے، اس ترکیب بند کا ایک شعر یہ ہے؛

تا بہ کی سود دہد آن فلسفۂ عہد قدیم
تا بہ کی سود دہد آن ہیئت پارینہ ہنوز

علامہ شبلی نے جو تحریک ندوۃ العلماء میں ابتداء سے شریک تھے، اس ذہنیت کے بدلنے کے لئے بڑی سخت جدوجہد کی، اسی غرض سے دارالعلوم میں قیام کیا، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے، مگر پھر اُن کی علحدگی سے یہ اصلاح کی تحریک کچھ دنوں کیلئے دب گئی، اور پھر اس کو پوری کامیابی اس وقت ہوئی جب سید صاحب معتمد بنائے گئے،

سید صاحب نے بھی ندوہ کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے پوری جد و جہد کی اور اُن کی اس جد و جہد کا نتیجہ ندوہ کے اندر بھی اچھا نکلا، اور ندوہ سے باہر بھی، علامہ شبلی نے اپنے زمانہ معتمدی ہی میں قرآن کی

تحقیقی تعلیم اور براہ راست اس کے مطالعہ کا سلسلہ شروع کرا دیا تھا، اسی طرح نحو و صرف کی کتابوں میں بھی انھوں نے بہت کچھ رد و بدل کر دیا تھا، بلاغت و معانی میں مختصر و مطول کے بجائے امام بلاغت عبد القاہر جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز کر دی تھی، انگریزی تعلیم کا بھی کچھ سلسلہ شروع ہو گیا تھا، سید صاحب نے اس اصلاح کی اور وسعت دی، انھوں نے عربی ادب کا معیار پہلے سے بلند کر دیا، حدیث کی تعلیم تیسرے یا درجہ سے شروع کرائی، براہ راست قرآن سے قرآن کی تعلیم بالکل ابتدا سے انتہا تک پھیلا دی، حتی کہ دار العلوم ندوہ میں بچوں کو ترکیب کی مشق بھی قرآن کے آخری پارہ سے کرائی جاتی ہے، انگریزی کو نصاب کا ایک ضروری جزء قرار دیا،

عربی مدارس میں عموماً عربی ادب کی جو کتابیں خواہ وہ نثر کی ہوں، یا نظم کی پڑھائی جاتی ہیں، وہ بیشتر متاخرین یا عجمی مذاق شعراء و ادباء کی ہیں جن کا اسلوب بیان نہایت ادق اور پیچیدہ ہوتا ہے جن میں الفاظ زیادہ اور معانی کم ہوتے ہیں، اُن کے پڑھنے پڑھانے سے عام طور پر طلبہ کو عربی الفاظ اور کچھ عربی ترکیبوں پر تو ضرور عبور ہو جاتا ہے، مگر ان کے ذریعہ تو عربی کا ستھرا اور پاکیزہ مذاق ہی پیدا ہوتا ہے اور نہ قرآن کے سادہ اور دلنشین اسلوب بیان سے مناسبت ہی پیدا ہوتی ہے،

اس سلسلہ میں دوسری خامی قدیم طریقۂ تعلیم میں یہ تھی کہ اس میں طلبہ میں عربی تحریر و تقریر کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، ندوہ کی اصلاحی تحریک سے پہلے عربی مدارس کے عربی مذاق کا کیا حال رہا ہوگا، اس کا اندازہ ایک حال کے واقعہ سے لگائیے، جو مولانا ابو الحسن علی صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا، مولانا نے بیان کیا، کہ میں ایک مجلس میں گیا، جہاں ایک مشہور عربی درسگاہ کے ممتاز فضلاء موجود تھے، میں جس وقت مجلس میں پہنچا، تو یہ حضرات کھانے میں مشغول تھے، مجھ کو دیکھ کر ایک برگزیدہ بزرگ نے برجستہ عربی میں فرمایا کہ

یا شیخ تعال واجلس ههنا وکل معنا:

مولانا نے کہا اس غربت پر مجھے ہنسی تو بہت آئی، مگر بزرگوں کا مجمع تھا، اس نے ضبط کرکے کہا:۔

"اما الجلوس فنعم واما الطعام فلا"

اس کے بعد پھر اردو میں بات چیت شروع ہوگئی،

ندوہ نے شروع ہی سے عربی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اس خامی کی طرف توجہ کی تھی، اور کسی حد تک یہ خامی شروع ہی میں دور بھی ہوگئی تھی، مگر پھر بھی جدید ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے، ابھی اس میں مزید وسعت کی ضرورت تھی، سید صاحب نے اس کی طرف خاص طور سے توجہ کی، متعدد نثر و نظم کی پرانی کتابیں نصاب سے خارج کیں، اور متعدد نئی کتابیں داخل کیں، عربی ادب و انشا کی تعلیم کیلئے بعض ممتاز اساتذہ کو عربی ممالک سے بلاکر ندوہ میں رکھا، بعض طلبہ کو عربی ممالک میں تعلیم کے لئے بھیجا، عربی اخبارات و رسائل کے منگانے کا اہتمام کیا، طلبہ کی ایک مجلس نادیۃ العربی کو جو خاص اسی مقصد سے قائم کی گئی تھی، ترقی دی، غرض اس شعبہ کی اصلاح کے لئے ہر ممکن کوشش کی،

سید صاحب کے دور میں ندوہ کے تمام علمی شعبوں کو ترقی ہوئی، مگر خاص طور سے اس مبارک دور میں عربی ادب و انشاء کو بہت زیادہ عروج ہوا، اس دور میں ندوہ نے عربی ادب کے جیسے لعل بے بہا قوم کے سامنے پیش کئے، اس کی مثال ہندوستان کی کوئی درسگاہ نہیں دے سکتی، اس دور کے متعدد ندوی فضلا کی عربی ریڈریں داخل درس ہیں، اور ان کی متعدد عربی تصنیفیں وہاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں، اور ان کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں،

اصلاح نصاب کے سلسلہ میں موجودہ ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک کام جدید عربی ریڈروں کی تیاری کا بھی تھا، سید صاحب نے اس سلسلہ میں دوسروں سے بھی کام لیا، اور خود بھی اس کام کو انجام دیا، انھوں نے بچوں میں عربی کا مذاق پیدا کرنے کے لئے دروس الادب کے نام سے دو رسالے لکھے جن میں سیکڑوں

جدید و قدیم عربی الفاظ ترکیبیں، اور انشاء کے مشقی سوالات ہیں جن کو پڑھ کر بچوں میں عربی مذاق آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے، جدید تعلیمی تقاضوں اور تجربوں کے پیش نظر ندوہ کے دوسرے فضلاء نے اس کے لئے اچھی سے اچھی ریڈریں تیار کرلی ہیں، مگر اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش سید صاحبؒ نے کی، اُن کی یہ کتاب ملک میں کافی مقبول ہوئی، اس مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے، کہ اب تک اس کے ۱۵ - اڈیشن نکل چکے ہیں،

اس سلسلہ میں سید صاحب نے دوسری کوشش یہ کی کہ جدید عربی الفاظ کا ایک لغت "لغات جدیدہ" کے نام سے تیار کیا، جس کے ذریعہ ہندوستان کے عربی مدارس کے طلبہ ہزاروں جدید عربی الفاظ سے واقف ہوئے، یہ کتاب سید صاحب کی ابتداء عمر یعنی آج سے پچاس برس پہلے کی تصنیف تھی، اور جدید عربی ادب میں مغربی افکار و خیالات اور جدید انکشافات کی وجہ سے برابر نئے الفاظ، نئی ترکیبیں داخل ہو رہی تھیں، اس لئے اس کتاب کے دوسرے تیسرے اڈیشن کے وقت اُن کو اس کتاب میں ترمیم و اضافہ کا خیال ہوا، اس کام کے لئے انھوں نے اپنے محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو منتخب کیا، اور اُن کی اصلاح کے بعد یہ کتاب دوبارہ سہ بارہ شائع ہوئی،

اصلاح نصاب کی ان داخلی کوششوں کے علاوہ سید صاحب نے بہت سی خارجی کوششیں بھی کیں، اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے، متعدد بڑی اور چھوٹی قدیم اور جدید درسگاہوں کو اس سلسلہ میں مفید مشورے دیئے، خاص طور سے جو درسگاہیں ان کے مشورے سے مستفید ہوئیں ان میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، جامعہ عباسیہ بہاولپور، مدرسہ شمس الہدی پٹنہ، اسلامیہ کالج پشاور وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں،

۱۹۳۳ء میں سید صاحب نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان گئے، اس سفر میں ڈاکٹر اقبال اور بعض دوسرے اہلِ علم بھی سید صاحب کے ساتھ تھے، سید صاحب نے نادر شاہ سے تعلیم کے مسئلہ پر جو گفتگو کی اس میں انھوں نے ندوہ کے خیالات کی پوری ترجمانی کی، انھوں نے فرمایا کہ

"افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانہ کے لحاظ سے

سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان ہو، اور ان میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو،

۱۹۳۶ء میں صوبہ بہار اور اڑیسہ کے وزیر تعلیم جناب سید عبد العزیز صاحب مرحوم نے سید صاحب کو عربی مدارس کے نئے نصاب کی ترتیب و اصلاح کے لئے دائمی تکلیف دی، اور سید صاحب نے اس مبارک کام کو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کی معیت میں انجام دیا، بہاولپور میں ندوہ کی طرز کی ایک درسگاہ جامعہ عباسیہ ہے، اسکے نصاب کی ترتیب و اصلاح میں بھی سید صاحب نے حصہ لیا۔

تیسرا مقصد | ندوہ کا تیسرا مقصد مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں، جماعتوں اور جدید و قدیم تعلیم یافتہ گروہ اور افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق، اور ان میں انتہا پسندی، اور تعصب و تحزب کے بجائے، اعتدال پسندی اور وسعت نظری پیدا کرنا تھا، ارباب ندوہ نے شروع سے اس مقصد کے لئے جدوجہد کی، اور اس میں اسکو بڑی حد تک کامیابی ہوئی، ندوہ کی انتظامی مجلس، اور اس کے عام اجلاس اس اتحاد و اتفاق کا نہایت ہی روح پرور منظر پیش کرتے تھے۔

سید صاحب نے بھی ندوہ کے دوسرے مقاصد کی طرح اس مقصد کو بھی ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا ۱۹۲۶ء میں سید صاحب کو جمعیۃ العلماء کی صدارت پیش کی گئی، تو انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں قوم پر ندوہ کے اس احسان کا ذکر علماء کے بھرے ہوئے مجمع میں ان الفاظ میں کیا،

"آج سے تیس برس پہلے چند عاقبت بین اور معاملہ فہم علماء نے ندوۃ العلماء کی تاسیس کی کہ آیندہ اسلام کو جس قسم کے خدمتگذاروں کی ضرورت پیش آئے گی، اس کے لئے قبل از وقت تیاری ہو، اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں جدید و قدیم نئے اور پرانے خیالات اور جمود و نظرت کے بیچ میں صراط مستقیم قائم ہو گئی، اور پٹنہ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں یہ موقع پیش آیا، کہ طربوش و دستار (یعنی جدید و قدیم) میں مصافحہ ہو گئی،

"آج ہمارے درمیان جو چند مصلحت شناس واقف حال اور اصلاح کوش علماء کا وجود ہے

اور چند مخلص الایمان، جان نثار اسلام اور دینی عقیدت سے سرمست جدید تعلیم یافتہ ہستیاں ہیں، وہ اسی مصالحت اور مواخات کے خوشگوار نتائج ہیں،

یہ طرز روش و رفتار میں مصالحت سید صاحب ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی،

مسلمانوں کی تفریقوں اور فرقہ بندیوں کا ایک بڑا سبب علماء کی غلطیاں اور ان کی تنگ نظری ہے سید صاحب نے اسی مجمع علماء میں بڑے درد و سوز کے ساتھ اُن کو اس خامی کی طرف متوجہ کیا،

"مسلمانوں کی مضبوطی کا راز خود اُن کے درمیان باہم اتفاق و اتحاد اور رواداری ہے، تمام وہ لوگ جو قائلین توحید و رسالت ہیں مشترک اسلامی مفاد کی غرض سے ملت کے باہم مشترکہ مسائل میں اپنی وحدت ارادہ، اور وحدت عمل کا ثبوت دیں، اور مختلف فیہ مسائل میں اظہار اختلاف کے لئے مناسب لب و لہجہ اور طریقہ ادا سے کام لیں، مسلمان جس ملک میں تباہ ہوئے وہ حدیث مشہور کے مطابق دشمنوں کے حملہ سے نہیں، بلکہ آپس کے اختلاف سے"

(خطبہ صدارت ص ۵۲)

سید صاحب زندگی بھر اس جادۂ اعتدال اور محبت و مسامحت کی اس صراط مستقیم پر قائم رہے اور اپنی اس روش کی وجہ سے علماء میں سب سے زیادہ کامیاب رہے، اپنے سب سے زیادہ محبوب شاگرد مولینا مسعود عالم صاحب ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں،

"محبت، اعتماد اور مسامحت ہمارا دستور العمل ہے، چنانچہ اس وقت تک اس میں کامیابی ہوئی ہے، جس دن یہ بات نہیں رہے گی، میں نہیں رہوں گا،"

(مکاتیب سلیمان ص ۱۱۳)

سید صاحب کے اس طرز عمل کا اثر یہ ہوا کہ مختلف خیال کے لوگ اعتماد کرتے تھے، اور وہ ان کے آپس کے اختلافی مسائل میں اکثر حکم بنائے جاتے تھے، مولانا محمد علی اور مولانا عبد الباری کے سیاسی اور مذہبی

ملاقات کے زمانہ میں سید صاحب ہی کی ایک ذات ایسی تھی، کہ باوجود دوری کے ان پر دونوں اعتماد کرتے، چودھری خلیق الزمان اور مولانا عبدالباری کی کشمکش سید صاحب ہی کی کوششوں سے ختم ہوئی، اس کے علاوہ علماء کے مختلف گروہوں اور افراد کے درمیان بھی عموماً سید صاحب ہی نقطۂ اتصال بنتے تھے، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی میں بعض سیاسی مسائل میں اختلاف تھا اور اب بھی انکے ماننے والوں میں باقی ہے، گو سید صاحب کو مولانا اشرف علی صاحب سے تعلق خاطر زیادہ تھا، مگر مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے متوسلین بھی سید صاحب پر پورا اعتماد کرتے تھے، اور یہ دونوں مجلسوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، علماے پھلواری، علماے بدایوں، اور علماے فرنگی محل کے مسلک سے سید صاحب کو یک گونہ اختلاف تھا اور اس سے وہ لوگ واقف بھی تھے، مگر سید صاحب کی ندوی روش نے کبھی آویزش نہیں ہونے دی، بلکہ یہ لوگ بھی ان کو بڑی وقعت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مسلم لیگ و کانگریس سیاسی اختلاف کی وجہ سے پورے ہندوستان کے مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے، اور دونوں میں عوام سے لیکر لیڈروں اور علماء میں شدید کشمکش پیدا ہو گئی تھی اس کشمکش میں بھی سید صاحب کبھی جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹے،

سید صاحب کی اس معتدل روش کا نتیجہ تھا کہ اُن کے زمانہ کی مختلف مذہب و مشرب کی تمام اہم شخصیتوں سے اُن کے تعلقات تھے، ان سب سے ان کے ذاتی اور نجی تعلقات تھے، اور اس مدت میں کوئی ایسا قومی سیاسی، یا دینی کام نہیں ہوا جس میں سید صاحب نے کوئی اہم حصہ نہ لیا ہو، سید کرامت حسین اکبرآبادی، نواب عماد الملک، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی، موتی لال، جواہر لال، نواب فضل اللہ، سر راس مسعود، ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، مولٰنا عبداللہ قاضی پوری، مولانا عبدالحق ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، قاضی سلیمان منصورپوری، مولانا عبدالماجد بدایونی، شاہ سلیمان پھلواروی، مولانا سلیمان اشرف، مولانا ابوبکر شیث، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی، مولانا حمید الدین

فراہی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ جیسے مختلف الخیال، اور مختلف المزاق اشخاص سے سید صاحب کا کسی نہ کسی درجہ میں تعلق تھا، ممکن ہو کہ ان کی اس خوبی کو کوئی شخص خامی پر محمول کرے، مگر بہرحال اس خامی کے پیدا کرنے کے لئے بھی بڑی عالی حوصلگی، اور وسعت ظرف کی ضرورت ہے جو بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے،

سید صاحب ندوہ کی درسگاہ کے لئے عملی طور پر بھی بہت کچھ کیا ہے، دارالعلوم ندوہ کی مسجد انہی کے دور کی یادگار ہے، عباسیہ ہال انہی کے دور میں مکمل ہوا، طلبہ کا دارالاقامہ انہی کی کوششوں سے بنا، ندوہ کو ہزاروں روپئے کی مالی امداد تنہا ان کی کوششوں سے حاصل ہوئی،

سید صاحب کو ندوہ سے جو تعلق خاطر تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آخر عمر میں وہ ندوہ کے مقصد کے بغیر کوئی سفر کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، مولانا مسعود عالم صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"گو دعا کراور جا وا سے بلاوا تھا، مگر اب تک ندوہ کے بغیر سفر کرنے کو جی نہیں چاہتا"،

ندوہ کے طلبہ میں کچھ دنوں بدنظمی اور دینی احساس کی کمی ہو گئی تھی، ان کی کوششوں سے جب یہ خامی دور ہونے لگی، تو ان کو حد درجہ مسرت ہوئی، اس مسرت میں مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں،

"آپ سن کر خوش ہوں گے کہ دارالعلوم کا رنگ بدل رہا ہے، طلبہ، ذمہ داریوں سے آشنا ہو رہے ہیں"،

سید صاحب ندوہ کے مقاصد اور اس کے طریقہ کار کو جامد چیز نہیں سمجھتے تھے جن میں ضرورت کے مطابق کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ اس کو ایک ترقی پذیر چیز سمجھتے تھے جس میں ضرورت کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے، انہی کو لکھتے ہیں،

"ندوہ کے مقاصد و مطالب کو نئی روشنی میں پھر سے دیکھنا ہے، کہ اب کیا ہوا اور

کیا کرنا ہے"

ندویوں کی تربیت | سید صاحب کی یہ خواہش تھی کہ ان کی جیسی دینی حمیت اور جامعیت، اُن کی اعتدال پسندی اور حق پرستی، ان کا شیوۂ محبت و مسامحت ہر ندوی میں پیدا ہو جائے، وہ قدیم ندویوں کے مجمع میں ہوں یا جدید طلباء دارالعلوم کے جھرمٹ میں سب کو یہی تلقین کرتے تھے تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، اس لئے اُن کے خطوط کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں، مولانا مسعود عالم کو لکھتے ہیں،

"الفرقان میں آپ کا مضمون دیکھا، دین کی حمیت کی شان دیکھ کر خوشی ہوئی، میری امیدوں کے مرتے آپ ہی جیسے چند عزیز ہیں،

مولانا مسعود عالم میں دینی حمیت اور توحید میں شدتِ غلو کی وجہ سے بعض مصلحین سے ان کا تعلق غلو کی حد تک ہو گیا تھا، اُن کو اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں،

تصلب و تعصب حکم دین میں ہونا چاہئے، نہ کہ اشخاص اور ان کے مسالک میں خواہ حنفیت ہو یا وہابیت بل ملۃ ابراہیم حنیفاً،

ایک خط میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق کی اہمیت اور اظہار رائے میں صداقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:-

"میں قانون کے مقابلہ میں اخلاق زیادہ پسند کرتا ہوں، .... رائے عدل و صداقت کیساتھ دیجائے ولو کان ذا قربیٰ،

مولانا مسعود عالم ندوی نے اشتراکیت اور اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، تو اُن کی ہمت افزائی کرتے ہیں، اور عہد جدید کے فتنوں کے مقابلہ پر ابھارتے ہیں،

"بہت خوب آپ نے اشتراکیت اور اسلام پر لکھنا شروع کر دیا جی چاہتا ہے کہ جس طرح وقت کے دوسرے فتنوں کے ازالہ میں علمائے ندوہ نے کام کئے ہیں، اسی طرح وہ اس کے ازالہ میں بھی کام

کریں اور آپ لوگ اس کے اہل ہیں"

یہ چند اقتباسات میں نے مولانا مسعود عالم ندوی کے مجموعہ مکاتیب سلیمان سے نقل کر دیئے ہیں، اس طرح کے خطوط وہ خورد وکلاں ندوی کو لکھتے رہتے تھے، مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کو جو اس وقت انکے علمی جانشین ہیں، اس طرح کے بیشمار خطوط لکھے ہیں۔ خود اس عاجز کو انھوں نے جو تربیتی خطوط لکھے ہیں، اس کا ایک ایک جملہ حرز جان بنائے رکھنے کے قابل ہے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ،

سیرت سلیمانی کا عرفانی پہلو

از

جناب غلام محمد صاحب بی اے حیدر آبادی

اہل اللہ کی بزم قدس میں تین طرح کی ہستیاں نظر آتی ہیں، ایک تو وہ جن کی سیرتیں سرتا سر جذب و عشق اور معرفت کا آئینہ ہیں، مثلاً بایزید بسطامیؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ وغیرہ، دوسری وہ جن کی زندگیاں گو بے داغ ہیں، لیکن ان کا جوہر عرفانی ایک عرصہ بعد کھلا ہے، جیسے امام غزالیؒ، عارف رومیؒ شیخ فریدالدین عطارؒ وغیرہ، تیسری وہ ہستیاں جن کی حیات کبھی تو عام معیار اخلاق سے بھی پست تھی، مگر جب انقلاب آیا، تو رشک تقوی اور معیار معرفت قرار پا گئی، مثلاً سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، حضرت بشر حافیؒ وغیرہ ــــــ ہمارے ممدوح کا مقام اس اعتبار سے وسطانی زمرہ میں نظر آیا،

وراثت انسانی سیرت دو ہی اجزا سے عبارت ہے، ایک تو موروثی صفات، اور دوسرے اکتسابی کمالات ہمارے حضرت والاؒ کو دونوں جہتوں سے حظ وافر ملا تھا، وہ سید زادے تھے، شرافت و مروت، عفو و درگذر ایثار و سخاوت، علم و بردباری، عالی حوصلگی، اور پامردی حضرت کو ورثہ میں ملی تھی، پھر یہ بھی خوش بختی کی بات تھی کہ یہ صفات آپکے گرد و پیش کے بزرگوں میں پوری طرح نمایاں تھیں، اور آپ کا ماحول علم و عرفان اور طبابت جسمانی و روحانی کا سنگم بنا ہوا تھا، آپکے والد ماجد ایک عالم و طبیب حاذق اور نقشبندی ابو العلائی سلسلہ کے شیخ اور صاحب نسبت بزرگ تھے، راقم نے خود حضرت کو یہ فرماتے سنا کہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا

تھانویؒ سے زیادہ بے ہمہ اور با ہمہ ہستیاں اپنی عمر میں نہیں دیکھیں، آپ کے بڑے بھائی مولانا حکیم ابو حبیب جو عمر میں آپ سے ۱۲ سال بڑے تھے، پٹنہ کے ایک مشہور طبیب جید عالم، اور حضرت شاہ ابو احمد بھوپالی مجددیؒ کے خلیفہ مجاز تھے، آپ کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحب حال بزرگ اور شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے،

اکتساب اس پاکیزہ ماحول اور ان اعلیٰ موروثی صفات کے ساتھ حضرت والا کو کسب کمالات کے بھی پورے مواقع ملے، ابتدا ہی سے آپ کے والد ماجد نے آپ کی اخلاقی تربیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، پھر آپ کے بڑے بھائی مولانا ابو حبیب صاحب نے بھی پوری توجہ صرف فرمائی۔ خود حضرتؒ فرماتے تھے کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب کے حسب ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے، اور ان کے حلقہ توجہ میں بھی بیٹھا کرتا تھا، اور ان کے فیض صحبت سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا لیکن یہ باطنی پہلو اس دور میں کچھ اُجاگر نہ ہو سکا، کیونکہ اس وقت حصول علم مقدم تھا، چنانچہ ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری شریف میں پائی، اور پھر غالباً ۱۹۰۱ء میں ذہن و فکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پہنچے، خداداد فہم و ذکا، اور پھر مولانا شبلی کی تعلیم و تربیت نے مل کر حضرتؒ کو صف علماء میں اس قدر ممتاز کیا کہ متنوع علوم و فنون کی جامعیت اور ان میں تحقیق و نظر کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد اگر نظر کہیں آ کر ٹھہرتی ہے، تو وہ حضرت سید صاحب ہی کی ذات گرامی ہے، ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء،

حکیم الامت سے مراسلت کا غیبی سبب علوم و فنون کی فضاؤں میں تخت سلیمانی تو خوب پرواز کرتا رہا، مگر مولانا شاہ ابو حبیب صاحبؒ کی برکت سے روحانی عالم کے جو اثرات قلب سلیمانی پر پڑ چکے تھے، وہ ساری علمی مصروفیات کے باوجود قائم رہے، اور برابر فکر لاحق رہی کہ کوئی شیخ کامل ایسا مل جائے جو روحانی پرواز میں مدد دے سکے، عجیب بات ہو کہ اواخر ۱۹۲۹ء میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایما سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے رسالہ کشف الدجیٰ لکھا، اور اس کا ایک نسخہ تقریظ کے لئے حضرت علامہ

کی خدمت میں ارسال فرمایا، ہمارے حضرت نے اس کے جواب میں حکیم الامت کو ایک خط لکھا، اس مکتوب کی نقل یہاں طوالت کا موجب ہوگی، البتہ اس کا جواب جو حکیم الامت کی طرف سے عطا ہوا وہ اقتباساً درج ذیل ہے، اس سے طرفین کی خط وکتابت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

مولانا المحترم دامت فیوضہم[1] السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

عجیب بات ہے کہ انبساط کا قصد نہ میرا تھا، نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب پیش آگئے، اُس طرف کا واقعہ تو جناب نے تحریر ہی فرمادیا، اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں نے بالتعیین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا، دو وجہ سے ایک یہ کہ مجھ کو بزرگوں کی فہرست ہی بہت غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی خصوص اگر میرا کلام ہو، تو بے حد حجاب ہوتا ہے، یہ رسالہ میرے ہمشیر زادہ نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ آج کل عام طبائع کی حالت پر نظر کرکے اس استفتاء کی مضرتِ عامہ کا قوی اندیشہ تھا، اس لئے انسداد کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے، اس لئے میں نے عزیز موصوف کو مصارف دیکر مشورہ دیا کہ جہاں جہاں مناسب ہو بھیج دیا جائے، میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا، غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا، بہرحال حجاب مرتفع ہونے کے بعد اب مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں، جناب کی تواضع نے ضرور مجھکو ایک معتد بہ درجہ میں معتقد بنادیا، اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ اور قوت ہو، ۔۔۔ مسئلہ کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے، اس سے سہل اور دل میں اتر جانے والا عنوان کم ذہن میں آیا ہے[2] بارک اللہ تعالیٰ فی معارفکم، ....

---

[1] حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں ہر ایک کے حفظ مراتب کا جو پاس و لحاظ تھا اس کی بیّن مثال یہ مکتوب گرامی ہے۔ [2] حضرت علاّ

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ موانع محتملہ کا ذکر فرمایا ہے[1]

اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ رونق افروز ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہوتے لیکن اب بعض حسن ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں، اس سے آگے ہیچ، البتہ میں زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادۂ حجاب سابق اور نو ہیں انبساط لاحق سمجھکر پسند نہیں کرتا، اس لئے بلاتکلف معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں، کہ جناب کا یہ حسن ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو لا یوثق بہٖ" اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں درستی کرنے کے لئے تیار ہوں، بشرطیکہ مجھکو علوم میں مخاطب نہ بنایا جائے، کہ اُن سے مقرّا ہونے کا اوپر ظاہر کر چکا ہوں، والصدق ینجی والسلام

ناکارۂ آوارۂ ننگِ نام اشرف برائے نام

از تھانہ بھون، ۲۸ر دسمبر ۲۹ء،

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک اور عریضہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا جس کا متعلقہ جزو یہ ہے :-

---

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۶) کی رائے یہ تھی: "آپ (یعنی مستفتی) جس کو مکروہ سمجھتے ہیں، میں اس کو عین ربوا کہتا ہوں، اور میرے نزدیک تو نقل و قال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلف کرام ہے، کہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا، اور نہ کبھی اس پر عمل کیا،

[1] حضرت علامہ نے یہ تحریر فرمایا تھا: "بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا گھبرا اٹھتا ہے، اور بے اختیار کسی سکینت و روحانیت کے امن کی تلاش ہوتی ہے تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے، لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بیگانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو، اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں...... وغیرہ، اس کشمکش کی منزل میں ہوں جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے، دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں۔"

"میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں، کہ مجھ میں استقامت و تثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو، فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے سلسلہ سے عقیدت تام ہے، خرافات وطاماتِ صوفیہ کا منکر ہوں،...."

اس کے جواب میں حکیم الامت نے اپنے رسالہ "قصد السبیل" کی تسہیل روانہ فرمائی، اور ساتھ ہی ذیل کی باتیں یہ تحریر فرمائیں جو عطر تصوف ہیں،

"مامور بہ وجوباً یا استحباباً اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں، مثلاً استقامت وتثبت ورغبت الی الطاعات والتزام فرائض وتنفر عن البدعات ولذت وذوق واخلاص واصلاح قلب وامثالہا، ان میں جو چیزیں یا بعض چیزوں کے جو اجزاء افعال ہیں، وہ مامور بہ ہیں، کیونکہ وہ اختیاری ہیں، اور جو انفعالات ہیں، وہ مامور بہ نہیں، کیونکہ وہ غیر اختیاری ہیں، البتہ وہ انفعالات بعض مطلقاً بعض خاص احوال میں محمود وثمرہ ہیں، اور اسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں، مگر وہ سب آثار وثمرات اُنہی افعال کے ہیں، اور وہ افعال ہی اُن کے اسباب ہیں، کہ ان کی طرف فی الجملہ بانی، لاکثر مفضی ہیں ان کے حصول نہیں کہ ان سے مختلف ہی نہ ہوں، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں، کیونکہ اصل مقصود قرب ورضا کی وہ شرطیں نہیں، والسلام"

کاوش | مذکورہ بالا مکاتبت کے بعد ایک دوخط ان بزرگوں کے درمیان آیا، اور گیا، اور اس پر آخری تاریخ ۲۹ر شوال ۱۳۳۹ھ کی ملتی ہے، انگریزی لحاظ سے ۱۹۲۱ء کا کوئی مہینہ ہوگا، اس کے بعد پھر تقریباً بیس برس تک کے لئے استفادہ وافادہ کا سلسلہ منقطع رہا، اور اس کی وجہ راقم نے خود حضرت والا کی زبانی سنی ہے کہ اس زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالہ "النور" مولانا ظفر احمد تھانوی کے زیر ادارت نکلتا تھا، اور غالباً

ے معارف" جب جب حکیم الامتؒ کی خدمت میں عریضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ النور
ن شائع ہوتا، اور اس کی وجہ سے طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی،

لی حاضری | ۱۹۳۴ء کے ختم اور ۱۹۳۵ء کے آغاز کا زمانہ تھا حضرتِ والاؒ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دعوت پر
سی کمیٹی میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، اب تک مولانا تھانوی قدس سرہٗ سے کبھی ملاقات نہ
نی تھی، لاہور سے واپسی میں خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اتر جائیں، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا
یا، اور اس حاضری سے مرشد تھانوی نے جو اثر لیا، اس کو خود انہی کے جچے تلے موثر الفاظ میں سنئے، مولانا عبد الماجد
دریابادی کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں،

"مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے، میں مکان پر تھا سنتے ہی حاضر ہوا، میرے
ذہن میں ان کا جثہ طویل عریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پا کر قلب کو بہت انس ہوا، پھر ملاقات
ومکالمت سے ان کی تواضع وسادگی، رعایتِ جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا، گیارہ بجے تشریف لائے
تین بجے واپس تشریف لے گئے، مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا،"[۵۲]

ع اور بیعت | اس ملاقات سے ظاہر ہے کہ فریقین کے دل محبت وعظمت سے معمور ہو چکے تھے لیکن پھر بھی
ے عرصہ تک خط وکتابت کی صورت نہ نکل سکی، حالانکہ اس عرصہ میں سلیمانی نگاہ، مرشد کامل کے لئے برابر
لاشی تھی، اور ہر پھر کر کہیں ٹھہرتی تھی تو وہ تھانہ بھون ہی کے شیخ الشیوخ کا آستانہ تھا، اس عرصہ میں
ے مرتبہ حضرت والاؒ کو عالمِ رویا میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی زیارت نصیب
ئی، حضرت سیدیؒ نے اپنے سینہ کی طرف اور حضرت حاجی صاحبؒ کے سینہ مبارک کی جانب اپنے ہاتھ سے اشارہ

---

۵۲ کیسے مفتری ہیں وہ لوگ جنہوں نے بزعم محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے لیکن مولانا
تھانویؒ نے ان کو مسخر کر لیا، اور خود مرید بنا لیا، اس بیان میں اگر مولانا تھانوی کی شکایت ہے تو سید والا مرتبت کے
بۂ عالی کا کوئی پاس ولحاظ ہے۔ ۵۲ حکیم الامت ص۴۳

کرتے ہوئے عرض کیا اس کو ایسا کر دیجئے، "حضرت حاجی صاحب مسکرائے اور فرمایا اب تو مین یہ کام نہین کرتا۔"

حضرت سیدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی تعبیر یہ ذہن مین آئی کہ حضرت حاجی صاحب چونکہ عالم ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہین، اس لئے اُن کو عذر ہے، اور اُن کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہئے، چنانچہ پھر نظر حکیم الامت ہی پر پڑی، ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف فرماتے تھے کہ حکیم الامت سے تعلق قائم ہونے مین مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے اصرار کو بھی دخل ہے، غرض پھر مستقل تعلق کے اسباب یون پیدا ہوئے کہ حکیم الامت قدس سرہ اگست ۱۹۳۸ء مین اپنے علاج کے سلسلہ مین لکھنؤ تشریف لائے تھے، اس موقع کو حضرت والا نے غنیمت سمجھا، اور حاضر خدمت ہو کر مستقلاً رجوع ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے،

حضرت والاؒ کی بیعت کے سلسلہ مین ایک واقعہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا، دو معتبر راویون[1] سے احقر نے یہ بات سنی ہے کہ قطب ارشاد مولانا تھانوی جب لکھنؤ تشریف لے گئے، تو تھانہ بھون مین ایک مجذوب نے آکے ایک مرید سے پوچھا "تمھارے پیر کہان گئے ہین"؟ انھون نے عرض کیا کہ علاج کے سلسلہ مین لکھنؤ تشریف لے گئے ہین، اس مجذوب نے قہقہہ لگایا، اور کہا علاج ولاج تو ایک بہانہ ہے، ایک شہباز کے شکار کو گئے ہین، وہ شکار کر لائین گے"۔۔۔ چنانچہ جب حضرت والاؒ کے رجوع وبیعت کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی بات کا یقین آگیا ع

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

خصوصی ربط غرض اب کیا تھا، اُدھر قوتِ فیضان جوش زن اور اِدھر طلبِ صادق بے اندازہ، چنانچہ اسی اضطراب مین فرماتے ہین،

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکے　　شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل مین ہے

جام پر جام مجھے دے کے بنا دے بدمست　　صبر سرجوشیِ از کار کہان سے لاؤن

---

[1] مراد حاجی عثمان خان صاحب مرحوم مالک کتب خانہ اشرفیہ اور محترمی ڈاکٹر عبدالغنی صاحب مدظلہم ہین،

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں   جو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے[1]

اور حضرت شیخ نے بھی اس تشنگی کو بجھانے کی پوری سعی فرمائی، بارگاہ تھانوی کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے کئی بار فرمایا کہ حضرت سید صاحب جب خانقاہ میں تشریف لائے تو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا، اور معلوم یوں ہوتا کہ گویا جوان ہو گئے ہیں، گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ طول دیتے تھے، اور محترم ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے فرمایا کہ خود حکیم الامت مجھ سے فرماتے تھے کہ جب رات کو دو بجے آنکھ کھلتی ہے، تو جی چاہتا ہے کہ سید صاحب کو بلاؤں اور باتیں کرتا رہوں، مگر ان کی زحمت کے خیال سے چپ ہو جاتا ہوں۔

شیخ و مرید کے اس خصوصی ربط سے متعلق کم از کم دو روایات اور سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک مرتبہ حضرت سیدی خانقاہ میں تشریف لے جا رہے تھے محفل آراستہ تھی، حکیم الامت کی نظر جو سید والا مرتبت پر پڑی، تو بے ساختہ کھڑے ہو گئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی "حضرت تشریف رکھیں" تو ارشاد فرمایا، "واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اٹھا، میں تو فرطِ محبت سے کھڑا ہو گیا"۔

ایک مرتبہ حکیم الامت نے ایک چھڑی تحفۂ محبت کے طور پر بھیجی، اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس کا آغاز اس پر از محبت اور بلیغ جملہ سے فرمایا تھا:

"راحتِ جان، راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہوں"۔

حضرت سیدیؒ نے اس عطائے شیخ کو دل و جان سے قبول فرما کر جواباً تحریر فرمایا کہ

---

[1] یہ سب اشعار حضرت سیدی کے ہیں، ان کو بطور استدلال پیش کرنے میں اس لئے تامل نہیں کہ حضرت والا نے خود اپنے اس دور کے کلام کے متعلق فرمایا کہ "یہ تو میرا سفرنامہ ہے"، اس کلام کا آغاز در انجام حکیم الامت سے رجوع اور ان کی رحلت پر ہوا بعد میں بمشکل پانچ چار غزلیں ہوئی ہیں، اس مجموعہ کا نام حضرت والا نے "غزل الغزلات" تجویز فرمایا تھا کہ یہ نام حضرت سلیمان علیہ السلام کے مجموعۂ کلام کا تھا۔ (غ)

"اس عطاءِ خاص سے میں نے استقامت فی العمل کی تعبیر لی"

حضرت شیخ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا تو انبساطات سے معمور ہو گئے، اور اس کا ایک طویل جواب تحریر فرمایا، جو سراسر دعاؤں سے لبریز تھا۔[1]

مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے فرمایا، کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد اس قدر رسوخ کیسے حاصل ہو گیا، مگر بعد کو پتہ چلا کہ یہ جوہر ای کچھ اور تھا،

اسی اثنا میں حضرت علامہ نے حکیم الامتؒ کی تحریک اور اشارہ کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر بعض اختلافی مسائل میں رجوع و اعتراف کا مضمون "معارف" میں شائع فرمایا اور اس کو ملاحظہ کے لیے بھیجا، تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے، اور خلافِ عادت دس بارہ توصیفی اشعار مثنوی کے وزن پر لکھ کر بھیجے[1]، چند یہ ہیں :-

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل	دان تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق	اے دلت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پر نور از انوارِ حق	اے دلت مسرور از اخبارِ حق

ہم کو نہیں معلوم کہ حسام الدین چلپی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ سعادت بجز حضرت سیدیؒ کے کسی اور کے بھی حصہ میں آئی ہو کہ شیخ نے مرید کی مدح میں بے ساختہ اشعار کہے ہوں،

---

[1] یہ دونوں باتیں حضرت سیدی نے احقر سے تنہائی میں ایک مرتبہ فرمائی تھیں، اور پھر اس کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی کہ احقر اس خط و کتابت کی نقل کر لے، جو حکیم الامتؒ اور ان کے درمیان رہی، مگر مرض الموت کی وجہ سے خود یہ خزانہ نکال کر عطا نہ فرما سکے، اور حضرت کے صاحبزادہ اپنی پریشانیوں میں اس سلسلہ کے ارشاد و ہدی کی تعمیل سے قاصر رہے، ورنہ آج اس سے بڑی مدد ملتی، تین چار ابتدائی خطوط کی جو نقلیں مل گئیں، وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا کرم ہے، سلہ ۵۲ یہ محرم سنہ ۱۳۶۱ھ کا واقعہ ہے،

خلافت | برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہوتی چلی گئیں، ایک مرتبہ حکیم الامت کی طرف سے ایک گرامی نامہ وصول ہوا جس کا عنوان تھا "استشارہ بعد از استخارہ" اور اس میں لکھا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں اس سلسلہ میں میں نے استخارہ بھی کر لیا اب آپ کا کیا مشورہ ہے، حضرت سیدؒ نے فرمایا کہ چونکہ قریب ہی میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا اس لئے میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ جب حاضر خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا، آخر ایک دن حضرتِ والا کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ آپنے میری استشارہ کا جواب نہیں دیا۔ ۔۔۔ اس اصرار پر میں نے یہ جواب لکھا کہ

"حضرتِ والاؒ کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی، کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری"[1]

بس یہ جواب پانا تھا کہ شیخ الشیوخ کے قلب سے الحمد للہ کی ایک صدا اٹھی، اور سید والا مرتبتؒ کو خلافت باطنی سے سرفراز فرما کر مسند ارشاد پر بٹھایا ۔۔۔۔ اور اس بات کے راوی حضرت حاجی عثمان خان صاحب مرحوم ہیں جو حکیم الامتؒ کے فدائی اور خلیفہ مجاز تھے کہ حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والا اس قدر مطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمد للہ اب مجھے کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں، ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

شور و غوغا | حیرت ہے کہ میں اس وقت جب کہ بارگاہِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سیرت نگار اپنے ممدوح کی حیاتِ طیبہ کے آخری نقش و نگار سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے میں مشغول تھا، بے بصروں نے اس کے خلاف ایک شور و غوغا بپا کیا کہ علامۂ عصر نے مسندِ علم چھوڑ دی، ہیں اس وقت جب کہ "وہ آبروئے ندوہ" اپنے ساتھ ایک جماعتِ کثیر پیدا کر کے اور اس کو برسر کار لگا کر فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ کی منزل طے کر رہا تھا بعض نادانوں نے اس کے اس عمل کو تعطل قرار دیا، ہیں اس وقت جب کہ وہ پیکرِ عبودیت اُن ساری خدمات علمیہ

---

[1] یہ سب روایت بالمعنی سمجھی جائے، مگر مفہوم کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔ (ر۔غ)

سے فارغ ہوکر جو ایک ادارہ سے بھی ممکن نہ تھیں، فاذا فرغت فانصب والی تربیت فارغیت کے حکم کے آگے سرنگون ہورہا تھا، تدعیانِ دانش نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ شغل کیسا؟ ــــ لیکن اس عارف نے اس سارے شور و غل کا جواب اپنے عمل کے استحکام اور معنی خیز تبسم کے ساتھ یہی دیا،

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اُسے اک دن نذرِ مے و میخانہ

کبھی خود ماننے والوں نے زیادہ شور مچایا، تو صرف اتنا فرمایا کہ لوگ مجھکو کہتے تو محقق اور علامہ ہیں، مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں، ــــ اور اگر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا، تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ جن کمالات کی بنا پر آپنے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، انہی کمالات نے مجھکو مولانا تھانوی کے آگے جھکا دیا، میں نے اپنے انجام کی فکر کرلی، اب آپ کو اختیار ہو کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کرلیں،

یہ ہنگامہ کوئی نیا یا ہمارے سید ذی شان کے ساتھ خاص نہیں، عرفاء و اتقیاء کی تاریخ میں ایسی اور بھی مثالیں مل جاتی ہیں، ــــ عارف رومیؒ نے جب شمس تبریزؒ کا دامن تھاما تھا، تو کیا خود مولانا رومؒ ہی کے شاگردوں نے شمس تاباں پر دھول جھونکنے کی کوشش نہیں کی؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدروں کے ہاتھوں عارف رومیؒ کو مدتوں بادیہ پیمائی نہیں کرنی پڑی؟ ــــ اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑیں، خود امام عالی مقام ہی کی زبانی کچھ روداد سنیئے،

"علماء اور ارکانِ سلطنت کو جب خبر ہوئی تو سخت نہایت اصرار کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بدنصیبی ہے، ایسی نفع رسانی (یعنی درس و تدریس) سے آپ کا دست بردار ہوجانا شرعاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ ــــ تمام علماء و فضلاء یہی کہتے تھے لیکن میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا، اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفعۃً کھڑا ہوا اور شام کی راہ لی"[1]

---

[1] الغزالی از علامہ شبلی نعمانی،

کیسی یکسانیت ہے عارف رومیؒ وامام غزالیؒ، اور اسی دور کے سید العلماء والصلحاء، مسند نشین شبلیؒ واشرفؒ میں!!

فنا، الفناء | سچ کہا ایک صاحب نظر نے کہ حضرت سید صاحب کو عروج کی حالت میں تو لوگوں نے کچھ پہچانا بھی، مگر نزول کے عالم میں کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ ان کا کیا مرتبہ ہے[۱]، راقم بلا خوف تردید عرض کرتا ہے کہ حضرت والا، کا پہلا قدم وہاں پڑا جو بہت سوں کی انتہا ہے، تفصیل کا موقع نہیں، فنی زبان میں مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ ایک شہرۂ آفاق محقق ومفکر اسلام اور ایک مرجع علماء عصر شخصیت کا کسی شیخ وقت کے آگے اپنے آپ کو پیش کر دینا ہی اس امر کی بین دلیل ہے کہ وہ مرتبۂ نفس سے گذر کر مرتبۂ روح میں داخل ہو گیا، اور مرتبۂ نفس کا طے کر لینا بلا مبالغہ بہت سوں کی منتہا ہے، —— پھر جب اس منزل پر بھی حضرت والا نے اپنے شیخ عالی مقام سے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت فرما دیجئے، تو حکیم الامتؒ کا خود بیان ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئے کہ ایک عالم عصر کو کیا نصیحت کریں، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی فرما دیا کہ اس راہ کی ابتداء و انتہا فنا ہے[۲]، یہ بات خاطر سلیمانی میں اس درجہ جم گئی، اور اس کے بعد اپنے آپ کو اس قدر مٹایا کہ خود مٹنے کا احساس بھی جاتا رہا، فنا سے گذر کر فناء الفناء تک پہنچ گئے، مدح وذم ایک ہو گئی منفوض کامل بن گئے، خود حضرت حکیم الامت کے متعدد خلفاء اجل مثلاً حضرت مفتی محمد حسن صاحب، مولانا محمد ولی الغنی صاحب، حاجی محمد عثمان خان صاحب مرحوم، مولانا عبد الباری صاحب ندوی، ڈاکٹر عبد الحی صاحب، مولینا مسیح اللہ صاحب وغیرہ کو راقم نے اس معاملہ میں ایک زبان پایا کہ حکیم الامت قدس سرہ سے فنائیت کا درس جیسے حضرت سید صاحب نے حاصل کیا، اور جو کمال اس مرتبہ میں پیدا کیا، وہ کہیں اور نظر نہیں آتا، —— مثالیں اس کی چند ہوتیں تو نقل بھی کرتا، یہ تو ایک مستقل باب ہے،

---

[۱] یہ ڈاکٹر عبد الحی صاحب مدظلہ کا جملہ ہے۔ [۲] یہ واقعہ تفصیلاً اشرف السوانح میں موجود ہے، مگر بغیر نام کے صرف ان الفاظ کے ساتھ کہ ایک فاضل اجل نے مجھ سے نصیحت کیلئے فرمایا، !

ع سفینہ چاہئیے اس بحر بیکران کے لئے

بس اس وقت تو بزرگون کی تصدیقات ہی پر یقین کر لیجئے !

صبر و شکر | حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصہ "شکر" ہی کا آئینہ ہے، علم و فضل، عزت و عظمت، دولت و ثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرافراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس مین اپنون کی ناقدری و ناسپاسی، اپنے محبوب ادارہ دارالمصنفین سے جدائی، تقسیم ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام، اور یہان کی مالی اور ذہنی پریشانیان یہ سب ایک مستقل مجاہدہ اضطراریہ تھا، پھر شدید شدید بیماریون کا سلسلہ اس سے الگ ہی — یہ وقت صبر کی آزمایش کا تھا، اور دیکھنے والون نے حضرت سلیمانؒ کے ظرف عالی کو دیکھا کہ وہ کس وقار اور متانت سے یہ مقام بھی طے کر گئے، مجھے ایک معتقد کی حیثیت سے یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ ایک پیکر مروت و شرافت اور ایک مرنجان مرنج ہستی کے خواہ مخواہ لوگ کیون درپے آزار ہو گئے تھے؟ حضرت سیدی کی رحلت کے بعد اپنا یہ استعجاب استاذی و مخدومی مولٰنا مناظر احسن گیلانی مدظلہ کی خدمت مین پیش کیا، اس کا جو عارفانہ جواب حضرت گیلانی کی طرف سے ملا، اس سے رنج و غم کے بادل چھٹ گئے، آپ بھی اس کو سُن کر بصیرت و سکینت حاصل کیجئے،

"ہمارے سید الملت قدس اللہ سرہ العزیز کی صبّاریت کے جن حالات کی طرف آپنے اشارہ فرمایا ہے، اُن کا تعلق سچ پوچھئے تو اس جہان سے زیادہ نہ تھا، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ شکوریت کے زیر اثر گذرا تھا، صباریت کی منزلین رہی جاتی تھین، زندگی کے آخری دور مین ان منزلون سے بھی وہ گذر گئے، اور خوب گذرے، صرف علامہ، ڈاکٹر اور اعظم المصنفین ہی ہونا اُن کے لئے مقدر نہ تھا،"

سید العارفین بن کر رفیق اعلیٰ مین قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا، —

ف۵ اس کی کچھ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون "علامہ سید سلیمان ندوی اور کراچی کے تین سال" جو ریاض کے خصوصی نمبر بابتہ ماہ مارچ ۱۹۵۴ء مین چھپا ہے،

.........اذیت نہ ہو تو صبر کا مطلب ہی بے معنی ہو جاتا ہے، صابریت کے اس دور میں اُن کو اذیت ہوئی، اور کافی اذیت ہوئی، لیکن جس راہ پر اب پڑ چکے تھے، اُس راہ کی سر اذیت دوسرے عالم کی مسرتوں کی ضمانت بنتی چلی گئی، انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب" یہ شعر نہیں لا ہوتی حقیقت ہے"

(مکتوب مورخہ ۱۵ فروری ۵۳ء)

جود وسخا — بخشش و عطا بزرگوں کا ایک خاص وصف ہے، بعض بزرگوں میں یہ وصف عیاں ہے، اور بعض میں مخفی، بھوپال کی حاضریوں میں اور کراچی کے دوران قیام میں احقر کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت والا چھپکے چھپکے بڑے اعتدال سے امداد فرمایا کرتے ہیں، لیکن رحلت کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس سے شیخ کے دست کرم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، مرض الموت سے کچھ قبل احقر نے اپنی مالی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا، اور اس سے مقصود بھی بجز حصول دعا کے اور کیا ہو سکتا تھا، پھر مرض الموت میں تو اس کا ذکر بھی بے جا تھا، لیکن وہ سراپا مہر و کرم ہستی، اس ناکارہ کے حال پر اس درجہ متوجہ تھی کہ میری پریشانی کا خیال آخر وقت تک قائم رہا، اور اس درد کی درمانی کئے بغیر چین نہ آیا ——— رحلت شیخ قدس سرہ کے شاید ہفتہ بھر بعد حضرت کی اہلیہ محترمہ مدظلہا نے ایک بند لفافہ اس ہدایت کے ساتھ عنایت فرمایا کہ گھر جا کر اس کو کھولئے ——— میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید کوئی راز کے کاغذات ہوں، یا حضرت والا کے مکتوبات لیکن گھر پہنچ کر جو لفافہ کھولا، تو اس میں یہ خط دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور پھر رقت طاری ہو گئی :-

"عزیز القدر سلمہ ——— السلام علیکم

"مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ، بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے، حضرت مولانا جب حیات تھے تو اکثر و بیشتر آپ کو ایک ہزار روپیہ ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے، مگر میں اپنی غفلت یا اُن کی علالت کا الجھاؤ کہیے کہ اُن کی حیات میں پورا نہ کر سکی، اب یہ اُن کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں

آپ اس کو قبول کر کے ممنون فرمائیں، آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہوا، اللہ پاک کی رحمت سے اُمید ہے کہ اُن کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا، رب رحیم اُن کو اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائیں، میرے خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجئے،

والسلام "والدۂ سلمان"

خدا جانے فیض روحانی کے ساتھ ساتھ جود وسخا کے دریا بھی کتنے بہائے گئے، — قدس اللہ اسرارہٗ،

کشف والہام | کشف والہام اور کرامت جیسی نہ مقصود ہیں نہ مطلوب، نہ اُن کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل ہے، البتہ بقول حکیم الامتؒ یہ قرب سے ناشی ضرور ہیں، اور جو حضرات اِن کی اہمیت کی نفی کرتے ہیں، وہ ان باتوں سے کچھ خالی نہیں — حضرت مرشدیؒ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے رہے، وہ سب اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ جو اشکال ذہن میں لے کر گئے، شیخ نے از خود ایک جملہ میں اس کا جواب عطا فرمایا، اور عرض معروض کی نوبت ہی نہ آئی، حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کئی کئی افراد کے ذہن میں مختلف نوعیت کے شبہات تھے، اور حضرت شیخ نے جب گفتگو فرمائی، تو ہر ایک شبہ کا ازالہ ہو گیا، حالانکہ کسی نے اس کا اظہار نہ کیا تھا، — "جگ بیتی" سنانے کے لئے تو ایک مستقل باب کھولنا ہوگا، "آپ بیتی" کا ایک جزو پیش کرتا ہوں:

ستمبر ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا، دو دن بعد ذہن میں یہ وسوسہ آیا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا، یہ نماز روزہ[1] تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا — اس وسوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کریں جو حضرت حکیم الامتؒ نے تجویز فرمائی ہیں لیکن وسوسہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، حتیٰ کہ ۲۴ گھنٹے اس خیال پر گذر گئے، اور میں نے حضرت والاؒ سے اس سلسلہ میں کچھ عرض نہ کیا، دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرت والاؒ مسجد جا رہے تھے، احقر بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے دفعتہً رُک گئے، چیں بہ جبیں ہو کر احقر کی طرف دیکھا، اور فرمایا: "تو آپنے مجھ پر کوئی احسان کیا" — بس یہ فرما کر پھر آگے چلے،

---

[1] یہ رمضان کا مہینہ تھا،

احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجھوڑ دیا، اور وہ وسوسہ کافور تھا! ۔ بعد انقطاع جب احقر نے اپنی اس حالت کا ذکر کیا، تو متبسم ہوئے، اور فرمایا!

"ہمارے حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے چور وہیں نقب لگاتا ہے' انشاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا"

دوسری مرتبہ مارچ ۲۹ء میں پھر خدمتِ شیخ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت والاؒ کچھ بیمار تھے، ایک روز پلنگ پر جو کمرہ کی دیوار سے متصل لگا ہوا تھا، دیوار ہی کی طرف رُخ کرکے لیٹے ہوئے تھے، خادم سرہانے کے قریب بیٹھا ہوا تھا، میرے دل میں اپنے شیخ کی عظمت و محبت کے خیالات موجزن ہوئے، یکایک حضرت اقدسؒ نے کروٹ بدلی اور مسکرا کر احقر سے فرمایا،

"آپ تو بس یہ سمجھئے کہ "پیرِ من خس است ولے اعتقادِ من بس است"

یہیں قیامِ کراچی کے دوران میں میں نے حسبِ عادت اپنا ایک احوال نامہ (جو ملفوف تھا) پیش کیا، اس میں کچھ عقلی الجھنوں کا ذکر تھا، ۔۔ بس جوں ہی عریضہ ہاتھ میں لیا، فرمانے لگے،

"معلوم ہوتا ہے فلسفیانہ کتابیں آج کل زیرِ مطالعہ ہیں' اُن کو چھوڑیئے، اس میں کیا رکھا ہے"!

احقر کے والد ماجد سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہیں، اور مولانا سید عبداللہ صاحب مجددی حیدرآبادی صاحبِ زجاجۃ المصابیح کے مرید رشید' وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت والاؒ کا مکاشفہ بھی بڑا زبردست تھا، گو وہ اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے!

اور یہ تو حاضری کا معاملہ ہوا، ورنہ حضرتِ والاؒ کے سارے منتسبین خواہ وہ ہند و پاک کے کسی گوشہ میں ہوں اس برکت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ کیسی ہی باطنی الجھن اور پریشانی ہو، جہاں حضرتؒ کی خدمت میں خط لکھا' اور ڈاک کے حوالہ کیا کہ وہ ساری تشویش، سکینت سے بدل جاتی تھی، اور احقر کے ساتھ تو حضرتِ والاؒ کے آخر حیات میں یہ معاملہ رہا کہ جب کوئی الجھن پیش آئی اور عریضہ لکھنے بیٹھا کہ اس کا جواب

خود بخود ذہن میں آگیا ایک مرتبہ حضرت والا سے یہ کیفیت عرض کی۔ اور معذرت کی کہ اسی وجہ سے ایک عرصے کوئی احوال نامہ پیش نہ کر سکا، تو فرمایا: "بھئی اس پر تو شکر ادا کیجئے، معذرت کی کیا بات ہے۔"

بحیثیت شیخ محقق اب تک حضرت والا سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا وہ اُن کی نیکی و پاکی تقویٰ و طہارت اللہ محبت و معرفت کا ایک بالکل اجمالی تذکرہ تھا، لیکن اہل فن جانتے ہیں کہ ہر زاہد و عابد اور ولی اللہ کا ایک مصلح و شیخ محقق ہونا بھی کوئی لازمی امر نہیں، تربیت روحانی کے لئے فن تربیت سے مناسبت اور اس میں درک نہایت ضروری ہے، ہمارے حضرت والا جہاں میدان علم کے شہسوار تھے، وہاں فنِ تصوف میں بھی "شیخ محقق" کی شان رکھتے تھے اور ان کے فیوض ہند و پاکستان کے طول و عرض میں جاری و ساری تھے بلکہ ہزاروں تک بھی متعین کا حال راقم کے علم میں ہے اس سلسلہ میں حضرت کے صرف چند اقوال نمونۃً پیش ہیں، جن سے اُن کی شانِ تحقیق کا اندازہ ہوگا،

ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ حضرت عمل پر تو بحمد اللہ دوام ہے لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا ہے، فرمایا:-

"خوب اپنے احوال کو اللہ میاں کے سر تھوپ دیا، اُن کی رضا و قبولیت کا حال تو دوسری دنیا میں معلوم ہوگا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے عمل میں لگے رہئے۔"

پھر عرض کیا کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے؟ —— ارشاد ہوا:-

"یہ بھی بندے ہی کے ظنون میں بڑے سے بڑے ولی کا بھی جو اعتقاد ہے وہ محض ظن غالب کی بنا پر ہے اور اپنے میں آثار قبولیت تلاش کرنا عجب ہے، کیسے آثار اور کیسی بزرگی، اس راہ میں تو اپنے آپ کو مٹانا ہی اصل شے ہے۔"

ایک مرتبہ احقر نے تنہائی میں بعض اپنے احوال عرض کئے، تو ارشاد فرمایا:-

"میرے ساتھ تو روزانہ کا یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کر دیتا ہوں تو سلا کرو

نور سے معمور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ ہر آنچہ می شود جز غیر خدا است"

ایک مرتبہ اذکار و اشغال کا تذکرہ تھا، تو ارشاد فرمایا کہ سلطان الاذکار، شغل اسم ذات، کشف قبور اور اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں ہیں، بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصود تو صرف حصول رضائے الٰہی اور اتباعِ سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے! —

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ مثنوی مولانائے روم بھی تصوف نہیں بلکہ "فلسفہ تصوف" ہے، اور فلسفہ سے بگڑے ہوئے دماغوں کا علاج ہے نہ کہ ہر ایک کا، اس سلسلہ میں احقر نے عرض کیا کہ مثنوی کے پہلے دو اشعار میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ تو ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عالم ارواح میں ایک مقام حق تعالیٰ کے قرب کا حاصل تھا جہاں وعدہ الست لیا گیا، تو کیا عجیب جواب مرحمت ہوا فرمایا،

"تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں، وہ تو ایک کانفرنس تھی جو بادشاہ نے طلب کی تھی، وہ مقام کیسے ہو گیا؟"

ایک محفل میں حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کا ذکر آیا، تو حضرت سیدیؒ نے کیسی گُر کی بات بتائی، ارشاد فرمایا:

"شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے توحید کی تعلیم پر زور دیا، اور اس کو فلسفیانہ انداز میں پیش فرمایا، ان کی اصطلاحات کے ذریعہ جو ضلالت پیدا ہوئی وہ توحید کی راہ سے آئی اور لوگ انا الحق کے مدعی بن گئے، اور حضرت مجدد الف ثانی نے اتباعِ سنت پر زور دیا، مگر ساتھ ہی نبوت کی فلسفیانہ توضیح و تشریح پیش فرمائی، اس کے ذریعہ جو ضلالت آئی وہ نبوت کی راہ سے آئی، اور انا النبی اور انا مہدی کہنے والے پیدا ہوئے"

ایک دفعہ احقر سے سوال فرمایا کہ "فنا فی الشیخ" کے کیا معنی ہیں، احقر نے عرض کیا کہ شیخ کی محبت جب ہر محبت

پر غالب آجاتی ہو تو اسی کا نام فنا فی الشیخ ہے، فرمایا کہ یہ تو ابتدائی کیفیت ہے "فنا فی الشیخ" ہو جانے کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ اپنے احوال و واردات بھی وہی ہو جائیں، جو شیخ کے ہیں، چنانچہ ہمارے مولانا عیسیٰ صاحب فانی فی الشیخ تھے!

رویا اور تعبیر رویا | مسلکِ اشرفیہ میں خواب کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں، ایک مرتبہ حضرت سیدیؒ نے ارشاد فرمایا کہ "اخلاق ہی سے قرب حاصل ہوتا ہے، اچھے اچھے خواب یا محض کثرت نوافل سے قرب نصیب نہیں ہوتا، حتیٰ کہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خواب میں رویت بھی گو بہت بڑی بات ہے، مگر قرب حق پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کی اتباع کی جائے، چنانچہ اگر رویت کے بعد اصلاحِ اخلاق کی زیادہ فکر نہیں کی گئی، اور محض رویت پر بزرگی کا خیال ہو گیا، تو پچھلی حالت بھی سلب ہو جاتی ہے" —— یہ تو امر واقعہ کا ذکر ہو گیا، ویسے ہماری حضرت والاؒ کو تعبیر رویا کا خاص ذوق حاصل تھا، دو ایک نمونے ذیل میں پیش ہیں، اہلِ فن کو ابنِ سیرینؒ کی یاد آ جائے تو کوئی عجب نہیں،

راقم کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ سر کے بال سفید ہو گئے، یہ خواب جب خدمتِ شیخ میں عرض کیا گیا تو جواب ملا:-

"شاید اولاد کی بشارت ہو، واشتعل الراس شیبا"

اس تعبیر کو پا کر تحقیق کی گئی تو بات بالکل صحیح تھی، —— اب ایک خواب اس خاکسار کا اور اس کی تعبیر سنئیے:-

راقم نے دیکھا کہ وہ اور مولانا سید عبدالجبار صاحب (حال منصورہ، سندھ پاکستان) راستہ سے چلے جا رہے تھے کہ ایک کافر مصیبت سے تڑپتا ہوا دکھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ میری نظر یوں کا ٹوٹا ہوا ایک لکڑی کے تختہ پر ہوا میں معلق ہے، اور اس کافر سے قریب ہونا چاہتا ہو مگر ہو نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے گوشت اور پوست کا پورا مجسمہ اپنے کندھے پر ڈالے

مولانا کے ساتھ چلا جا رہا ہوں آبادی بہت دور ایک قبر قد آدم سے زیادہ گہری کھدی ہوئی تھی، راقم نے اپنے گوشت پوست کی لاش کو اس کے اندر ڈال دیا، اور پھر ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا۔ اس کے بعد آنکھ کھلی تو طبیعت میں ایک سکون تھا، ـــ اس کی تعبیر جو ملی، ملاحظہ ہو،

"یہ کا نفس امارہ ہے، آپ کی اپنی لاش، آپ کا مرتبہ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے، حدیث میں ہے، عد نفسک من الاموات یہ کیفیت اسی مرتبۂ فنا کی طرف اشارہ کرتی ہے، بحمد اللہ"

حضرت کا آخری حال احقر کے فہم ناقص میں حضرت والا کا رنگ چشتی نہیں بلکہ نقشبندی تھا، وجد و حال کی جگہ سکون و وقار، قیل و قال کی جگہ اتباعِ سنت کا اہتمام حضرت کا خاص شعار تھا، پھر بھی منصب ارشاد پر تمکن ہونے کے بعد چند برس تک یہ حالت تھی کہ جب بولنے پر آتے تو سوز و گداز کے دریا بہا دیتے ہیں آہ! آج بھی اس تقریر کی یاد سے ایک کیفیت طاری ہو رہی ہے، جب حیدر آباد میں مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر یہ احقر بھی حاضر تھا، اور مولانا سید علی بحیار صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) کے علاوہ اور بھی چند عقیدت کیش موجود تھے، شیخ نے نہ جانے کس سوز میں ڈوب کر فرمایا،

"اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس کس چیز کی کمی ہے، مقام صدیقیت کیوں نہیں طلب کرتے یہ تو آپ کے ظرف کی کوتاہی ہے، حوصلوں کو بلند کیجئے"

ان جملوں سے سارے حاضرین محفل کی آنکھیں اشکبار اور دل شعلہ فگار ہو گئے تھے، لیکن آخر کے تین چار برس میں دریائے پرشور ایک بحر ذخار بن گیا تھا، دراصل سنہ ۱۹۵۰ء کے حج بیت اللہ کے بعد حضرت والا کو عبدیت کاملہ اور نزولِ تام حاصل ہو گیا، اور پانی اس سطح پر پہنچ گیا کہ بظاہر جوش کے سارے آثار ختم ہو گئے ہاں جو چھو لیتا اس کو پتہ چلتا کہ حقیقت حال کیا ہے،

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اپنی ساری نزاکت و نفاست طبع کے باوجود حضرت والا سپرد دوران قیام مکہ

...یت کا اس قدر غلبہ رہا کہ صرف ایک کرتہ اور پاجامہ یا تہمد میں ملبوس برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں طواف کرتے دکھائی دیتے تھے، اور اس پیرانہ سالی اور ضعف قویٰ کے باوجود اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ راقم نے خود حضرت سے سُنا کہ ایک روز اسی سادگی سے صحن حرم میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ کسی عرب عالم نے سلام کیا، اور پوچھا کہ اے شیخ ہم نے سنا ہو کہ آج کل آپ تصوف کا شغل رکھتے ہیں؟ — حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت کچھ تائید غیبی ایسی شامل حال ہوئی کہ مسلسل آدھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث ہی کی تائید سے تصوف کو ثابت کرتا چلا گیا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ رزائل نفس سے پاکی اور فضائل اخلاق کا حصول واجب ہے، وہ عرب عالم اس گفتگو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اقرار کر لیا کہ اگر تصوف ہے تو اس سے کس کو انکار ہے ـــــ غرض مکہ معظمہ میں شیخ کو جو فیوض حاصل ہوئے اور جو انشراح نصیب ہوا، اس کا اندازہ اُن کی نظم کے دو ایک شعر سے لگا لیجئے، جو اسی فضا میں کہی گئی تھی فرماتے ہیں

دیدۂ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں — جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینۂ مجاز میں

اس کے کرم کے ہیں نثار اسکی عطا کا کیا شمار — دیدیا عاصیوں کو بار اپنے حریم راز میں

اب مکہ معظمہ سے فارغ ہو کر دیار رسولؐ میں پہنچے، بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر سیرت نگار رسول نے چند نعتیہ اشعار کہے، جس پر شیخ کے کلام کا غالباً خاتمہ ہے، اس نعت کا آخری شعر ان کی حالت کا آئینہ دار ہے استدعا کرتے ہیں،

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

عاشق رسول کی یہ استدعا قبول ہو گئی، ایک رات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، اپنے آپ کو قدوم رسالت پر گرا دیا، رحمت عالمؐ نے اپنے تبدائی کو اٹھا لیا، اور ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کر دی ـــــ حضرت والا کی آنکھ کھلی تو حضور انور کی دعا یاد تھی اپنی اہلیہ

محترمہ کو بلاکر یہی دعا اُن پر دم کردی، اور پھر سارا مجاہدہ سنادیا، ــــ غالباً اس واقعہ کے بعد ہی وہ سکونِ خاطر اور عبدیت مطلقہ نصیب ہوئی، جو تا آخر حیات قائم رہی، ــــ اور اس نزولِ تام کی وجہ سے ان کی عظمت و مرتبت کی معرفت ہی مشکل ہو گئی، مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری ثم پاکستانی جو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے قدیم خلفاء میں سے ہیں، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مولانا کو تو پھر بھی پہچان لیں گے، مگر حضرت سید صاحب کے کمال کو پہچاننا بہت دشوار ہے، اور پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلام کر کے کمرہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ وہ کیفیت محسوس ہوئی جو حضرت حکیم الامت کی رحلت کے بعد پھر کبھی حاصل نہ ہوئی تھی،

اب آخر میں دو لفظ مرض الموت سے متعلق عرض کر کے اس صحبت کو مجبوراً ختم کرنا ہے، ۲۲ر نومبر ۵۳ء کے دن (جس کے بعد شام کو حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ داغِ مفارقت دے گئے) بعد نماز ظہر حضرت کی اہلیہ محترمہ حسب معمول حضرت والا کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک ایک سفید پوش ہستی نمودار ہوئی، اور اُس نے ایک دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ کی خدمت میں پیش کیا، محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے، اور پیچھے مڑ کر حضرت والا سے (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا کہ آپ نے کچھ دیکھا؟ ــ جواب ملا کیا ہوا؟ البتہ محترمہ نے واقعہ سنایا تو خلافِ عادت پورے اطمینان سے یہ ارشاد فرمایا :-

"یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے"

اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید حق تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو کوچ کا اشارہ فرما دیا تھا، ــــ دن گذر گیا، مغرب کی نماز پڑھ کر داہنی کروٹ ٹھیک مطابق سنت لیٹ گئے، راقم کی نظریں چہرۂ انور پر جمی ہوئی تھیں، دفعتاً ایک ہچکی آئی، اور روحِ سلیمانی لبیک کہہ کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو گئی، الا ان اولیاء اللہ لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون کا مشاہدہ کھلا

آنکھوں ہو گیا، روح کی مفارقت کے بعد اس عاشق رسول کے جسم میں کوئی تغیر آ گیا تھا، چہرۂ مبارک اسی قدر منور و تاباں ہو گیا، اور سکینت و فرحت کے ایسے جلوے نمودار ہوئے کہ جس کی بھی نظر پڑی اس کے دل نے سید الملت کے ولی اللہ ہونے کی تصدیق کی ——— آہ! ہندوستان کی تاریخ میں یہ دوسرا "ولی اللہ" پیدا ہوا تھا سو وہ بھی آج زینت تاریخ بن گیا،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلوک و تصوف

اور

طریقۂ تربیت

از

مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

آہ! علم و ادب، تاریخ و سیر میں یگانۂ روزگار، سلوک و تصوف میں ممتاز اور جملہ اسلامی علوم میں جامع و باکمال ہستی دنیا سے رخصت ہو گئی،

خدایا بران تربت نامدار بفضلت کہ باران رحمت ببار

اور اپنی تحقیقات علمیہ، حقائق دینیہ، نکات احسانیہ اور رموز روحانیہ کے ایسے نقش و نگار چھوڑ گئی، جو مدتوں باقی رہیں گے، ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں میں کہیں پیدا ہوتی ہے،

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

علمی بزم کے تو وہ صدر نشین تھے ہی سلوک و تصوف میں بھی اُن کا بڑا درجہ تھا، اور اس کے وہ اسرار و رموز اور معارف و حقائق بیان فرماتے کہ دل کیف یقین سے لبریز ہو جاتا، اس مختصر مضمون میں اس کے بعض جلوے دکھائے جائیں گے، اس راہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علمی صدارت کی بھری مجلس میں اپنی علمی لغزشوں اور کوتاہیوں کا اعتراف اور ہر اس تحقیق و رائے سے جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، رجوع کر کے "ذکر رہ ناصواب توبہ یارب" کی صدا بلند کی، علمی سلوک و تصوف کی یہ وہ تجلی تھی کہ مدعیانِ علم و عمل کی آنکھیں خیرہ

ہوکر رہ گئیں نفس پرستی کے اس دور میں محض رضاے الٰہی، اور اتباع حق کے لئے اتنی بڑی ہستی کا اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف اور اس سے برأت کرنا عرفان حقیقت کے کمال اور فنائیت وفنائے نفس کی روشن دلیل ہے،

فناے ذات اور اتباع حق کی یہ وہ مثال تھی جس پر خود شیخ طریقت نے مرید کی شان میں یہ اشعار ارشاد فرمائے، اور اس ناچیز کی عقیدتمندانہ نظر میں مرتبہ حضور والا رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی، ناچیز اس زمانہ میں حضرت مجدد تھانوی کی بیعت سے مشرف ہو کر مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے زیر تربیت تھا، حضرت والا رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا کہ اگر وہ مصلح پسند نہیں ہیں، تو مناسب حال کوئی دوسرا مصلح منتخب فرمالیں، اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنو اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی، اور شاہ گنج تک رفاقت کا شرف ملا، اس مختصر صحبت کا دل پر ایسا اثر پڑا کہ خط کے ذریعہ نذر عقیدت پیش کی، اس کے بعد حضور کے حسب طلب کئی مرتبہ آپ کے وطن دیسنہ میں حاضری کا موقع ملا، اور دوسرے سفر میں اخذ بیعت وارادت اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد بارہا شرف زیارت حاصل ہوا، مگر پاکستان کی ہجرت کے بعد اس سے محرومی رہی، البتہ مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا،

اس دس سالہ مدت میں حضور کی زبان وقلم سے جو ارشادات نکلے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے ان کے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں کہ شاید ان سے کسی قلب سلیم کو فیض وبرکت حاصل کرنے کی توفیق ہو، ان سے حضور کے سلوک وتصوف کی حقیقت اور آپ کے طریقہ تربیت کا بھی اندازہ ہوگا،

تواضع آپ میری نسبت یہ سمجھیں کہ یہ خاکسار حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر، اور رتبہ میں بھی فروتر ہے، اس پر بھی اگر اس ذرۂ بمقدار کی طرف اپنے دل کی کشش بے تکلف محسوس کریں تو ظاہر فرمائیں، ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتانا پڑے، میرے حالات کو بھی تحقیق فرمالیں کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو تو خدمت سے انحراف نہیں،

مقصد بیعت اور تفویض امانت بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ مرشد ومسترشد میں اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ مرشد

تعلیم وارشاد میں تا امکان غفلت و دریغ نہ کرے اور مسترشد تا امکان اطاعت و انقیاد میں کوتاہی سے کام نہ لے، مرشد کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہیں، اس کی ادائگی پر بالاخذ بیعت بھی تیار ہوں، اور چونکہ میں اپنے میں کوتاہی پاتا ہوں، اس لئے تاخیر کر رہا ہوں یا ابھی وقت اس امانت کی سپردگی کا نہیں آیا ہے، وقت کا انتظار کیجئے جب وقت آئے گا، تو خود بخود یہ دولت نصیب ہو جائے گی،

پیر اور مرید کے فرائض | غالباً یہ ذہن نشین ہوگا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے، اس لئے اس راہ میں جو قدم رکھا جائے وہ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے، پیر کی نسبت صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے کہ میری تلاش میں میری منفعت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہیں ہے، بہرحال یہ طرفین سے الحب فی اللہ کا معاہدہ ہے کہ طالب تعمیل میں اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم میں کوئی کمی اخلاص میں نہ کرے گا، اس سلسلہ میں چار باتیں بمنزلہ اصول کے ہیں، اعتقاد، انقیاد، اطلاع، اتباع اس راہ میں ضروری ہیں، اپنے کو مربی کے ہاتھ میں اس طرح دیدیں جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ میں اپنے کو دیدیتا ہے، اصول اربعہ کی پیروی رہے، میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ میری منفعت کے لئے میری تلاش میں یہ سب سے بہتر ہے، اس دوسروں سے انکار کی ضرورت نہیں ہے، مگر اتباع ایک کی چاہئے ایک ساتھ دو طبیبوں کا مریض مصیبت میں رہتا ہے، اعتقاد اور انقیاد تو معلوم کر لیا، اطلاع سے مقصود شیخ سے مکاتبت اور اتباع سے احکام شیخ کی پیروی ہے،

نماز کی حقیقت | نماز کو اپنی طرف سے پوری ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ادا کرنے کی کوشش کیجئے، جس قدر ہو اللہ کا شکر کیجئے، اور آئندہ کے لئے ہمت کیجئے، اور دعا کیجئے، ہمارے حضرت کی تحقیق ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کے لئے لفظ کی طرف اور متوسط معنی کی طرف اور منتہی ذات بحت کی طرف یہ تصور کرے کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے، اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کا اثر یہ ہو کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی و تواضع کی شان پیدا ہو، نماز میں اصل شے حضور اور خشوع ظاہری و باطنی ہے، اور نیز ہر قسم کے رذائل سے امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعت الٰہی پر مداومت، اور حصول رضائے الٰہی کا شوق

باقی غیر مقصود ہیں، تو امورِ مقصودہ ہیں ان امور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں،

التزام سنن و نوافل اور تہجد | نمازِ پنجگانہ کے بعد حسب ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کی جائے، نمازِ تہجد، بعد مغرب ۶ رکعات نفل اوابین، طلوعِ آفتاب کے بعد ۲، یا ۴ رکعت نفل چاشت، فرائض منتونہ

نماز پنجگانہ کے بعد، نماز میں اعتدال ارکان، اور حضورِ قلب کی کوشش رہے، تہجد کا التزام ازبس ضروری ہے یہی مفتاحِ اسرار ہے اگر رات کو احیاناً ناغہ ہو جائے، تو بوقت چاشت، بارہ رکعات پڑھیں، تہجد عجیب عبادت ہے جس پر خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً دوام فرمایا ہے، اس لئے سنتِ موکدہ ہے[1] اب اہل محبت کے لئے کیا گنجائش رہی، فضائلِ اعمال کے اکتساب کا سبق محدثین سے نہیں مجبین سے لیں اعلیکم بقیام اللیل فانہ داب الصالحین تو لزوم پر دال ہے، تہجد با جماعت اگر اتفاقی ہو تو جائز ہے ورنہ اہتمام اور تداعی کے ساتھ نہیں غور کرنا چاہئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں، اگر تہجد قضا ہو جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد دوپہر پہلے تک بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں، تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے،

دعا کا اہتمام | تہجد کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پوری درد و الحاح کے ساتھ اپنے لئے دعا کیجئے، دعا میں تضرع و خضوع ہونا چاہئے، عصر اور صبح کی نماز کے بعد دعا خوب کیا کیجئے، اور مانگئے جو آپکے لئے مناسب ہوگا انشاء اللہ ملے گا، اس در سے کوئی محروم نہیں پھرا ہے، اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ، اس کا اعلان ہے اور "الدعاء مخ العبادہ" ارشاد ہے،

احتسابِ نفس | اپنے عیوب کی تلاش میں رہیے، اور جو عیب سب سے زیادہ ابھرا ہوا علی العیان معلوم ہو، اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے، مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد، وغیرہ، ان عیبوں کی حقیقت دریافت کیجئے، اور پھر اس کا علاج معلوم کیجئے، اپنے میں شکستگی، افتقار، تواضع ہونی چاہئے، اور ہر وقت اپنے عیوب پر نظر بھی رہے، اور اس کے اصلاح

[1] سنتِ موکدہ کی تعریف اس پر صادق ہے، البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی، شفقۃً علی الامۃ، مگر اپنے عمل سے موکد ثابت کر دیا،

کی فکر دامنگیر ہو، استکبار و افتخار و تفرد کہ ہم جیسے من دیگرے نیست کے شیطانی پھندے مین گرفتار نہ ہو جائین
اپنے کو مجموعۂ ذمائم اخلاق سمجھنا خیر و برکت ہے، ابتہیل تذکرہ اسرار قلبی اور راز روحانی کو ظاہر کرنا بھی استکبار
مدیا مین داخل ہے، غیبت بہت بُری چیز ہے، اس سے نیکیان دوسرون کو مل جاتی ہین، اپنے قلم سے خود کو
مولوی لکھنا کبر کے آثار مین سے ہے، اگر یا اس کا اظہار ہو کہ لوگ اس کو بڑا سمجھیں، مکائد نفس بہت دقیق ہین،
اللہ تعالیٰ پناہ مین رکھین، تواضع اور فنائے ذات کی راہ پیش نظر رہے، افنائے نفس کے لئے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ
فِی عَیْنِیْ صَغِیْرًا کی دعا مفید ہے، اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا سب سے بہتر ہے، اس کا ہمیشہ اور ہر کام مین خیال رہے
بس اپنے عیوب پیش نظر رہین، اور اُن کی اصلاح کا خیال غالب اور اس باب مین اپنے نفس کے مکائد
پر نظر رہے،

اصل سلوک | حصول تقوی تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے، ہر قسم کے رذائل
سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش، اور اطاعت الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی
کا شوق، باقی غیر مقصود ہین، اپنی اصلاح و تربیت کی دھن مین لگے رہیئے تاآنکہ اللہ کے سوا دل سے ہر چیز
کی محبت فنا ہو جائے، ریا، عجب، کبر رنگ برنگ صورتون مین ظاہر ہوتے ہین، اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک
ہین، اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے، بڑی چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بُرائی کی نہ پڑے، تا
راستہ مردودیت کا ہے اِبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ، ہر حال مین تواضع اور فنا پر نظر رہے اور
ذمائم اخلاق پر،

حصول تقوی | منہیات و اوامر کی تصریح پیش نظر رہے، مقصود حصول تقوی ہے، کہ قرآن پاک ھُدًی
لِلْمُتَّقِیْنَ ہے، عبادت کا منشا بجا آوری کے بعد حصول تقوی ہی ہے، لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ، بعد فرائض و سنن
و نوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیات شرعیہ سے احتراز کا لزوم
کیا جائے،

اہتمام والتزام عمل اعمال تو سب کو معلوم ہیں ضرورت عمل کی ہے، اور حصول تقویٰ اور رضاے الٰہی کے لئے ساری کوشش اسی کی چاہئے، باقی سب فلسفہ ہے، کام میں لگے رہیں،

ع "تا دم آخر دمے فارغ مباش"

عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو، اصل یہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بیکار نہیں جاتا ہے، نمبر اسی سے ملتے ہیں، کسی اضطراری عذر کے سبب سے اگر کسی معمول میں کمی ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ ہم کو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اس کی جزاء عنایت فرمائیں گے، یہ ان کی شان رحیمی و کریمی ہے، عمل کیلئے صرف ہمت و عزیمت، دوام عمل، اور صحت فکر و نظر کی ضرورت ہے، عمل، عملیات اور تعویذ کی بیشن مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو، اور ہر حال میں ذکر لساناً و قلباً و عملاً جاری رہے،

احکام الٰہی کی اطاعت اور رضاے الٰہی کی طلب اصل شے احکام الٰہی کی کلی اطاعت، حلال حرام کا خیال، معاملات میں صفائی اخلاق کی نزاہت، اتباع نبوی کا دھیان، التزام سنت کا اہتمام ہے، بدعات و رسوم سے تمام امور میں احتراز، اور تمام امور میں رضاے الٰہی کی طلب، ان امور کی طرف توجہ فرمائیے کہ یہ اصول میں ہیں، اور باقی سب فروع، اور یہ دراصل پر دوام ذکر کا ظہور ہی ہے، طاعات و مرضیات الٰہی کی اتباع کا ذوق بڑھے اور اللہ تعالیٰ کی یاد حالاً ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں،

استقامت بڑی دولت ہے اب تو زندگی کے آخر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے، توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین کی دعا چاہئے، اپنے کام میں تادم آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئے، یہی بڑی دولت ہے "تادم آخر دمے فارغ مباش" معمولات پر استقامت مبارک "الاستقامۃ فوق الکرامۃ" قال اللہ تعالیٰ "قل اللہ ثم استقموا" سلوک کی اصل کلید ہے، عوارض کی وجہ سے کمی باعث افسوس نہیں، وہ کمی افسوس کے قابل ہے، جو غفلت یا کوتاہی کے باعث ہو، اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں بہر حالت

میں ناقص ہیں، یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، ذکر کا مقصود یہی ہے؛

ذکر دوام | ادعوا ربکم تضرعًا و خفیۃً الی و لا تکن من الغافلین تلاوت فرما کر دوام ذکر کے فضائل، ثمرات اور وعدے اور غفلت کے نتائج بد اور وعید بیان فرمائے، اور پھر ومن یعرض عن ذکر الرحمٰن الخ کے تفسیری نکات بیان کئے، اور ہر حرکت و سکون پر عمل و قول میں ذکر کی تاکید فرمائی، یادِ الٰہی کو مرکز خاطر کرنے کی ہدایت فرمائی، اور بیان کیا کہ احکام شرعیہ کی روح ذکر ہی ذکر ہے، جمال، قوال کمال کے اعتبار سے ذات باری ہی کو محبوبیت حاصل ہے، تو اسی محبوب حقیقی کی یاد واجب ہے، الذین اشد حبا للہ منصوص ہے، دنیا اور تعلقات دنیا کے ساتھ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے، اور یہی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم ہے، چنانچہ حضرت عروہ رض کا پاؤں جب کاٹا جانے لگا تو ہوش و حواس ہی میں پاؤں کاٹنے کا انھوں نے حکم دیا (اسم ذات یعنی اثبات ونفی کے ذکر کے جمالی و جلالی ہر دو طریق کو عملاً ظاہر فرما کر تکرار کی ہدایت کی، اور فرمایا کہ وقت ذکر قربت حق، سماعت حق، رحمت حق اور نزول رحمت پیہم و عام و نظر رکھنا چاہئے تاکہ ثمرات ذکر جلد سے جلد تر ظاہر ہوں، اپنی بابت فرمایا کہ مجھے تو ذکر جلالی میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے ذکر جمالی پر بیشتر عمل کرتا ہوں، اور اسی میں سہولت و لذت محسوس کرتا ہوں، آپ کو اختیار ہے کہ جس طریقہ کو چاہیں، اختیار کریں، نپولین اعظم جب کسی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا تو اس کا نام لے کر پکارتا تھا جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جاتا تھا، اسی طرح اسمائے الٰہی کی یاد اور تکرار اُن کی توجہ خاص کو اپنی طرف مبذول کرنا ہے، اس ارحم الراحمین کا نام پاک ورد کیا جائے گا تو اس کی رحمتیں ذاکر کی طرف متوجہ کیوں نہ ہوں گی، ماسویٰ سے بے نیازی کے لئے اثبات ونفی کا ذکر اس کے معنی کے استحضار کے ساتھ کافی و وافی ہے،

سلہ اسم میں خود محبوبیت نہیں اسم میں محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہوتی ہے کسی اسم کی محبوبیت ذات پاک کی محبوبیت کا نتیجہ اور ظل ہے،

پاس انفاس پاس انفاس کا مقصد بھی یہ ہے کہ کوئی سانس ذکرِ الٰہی سے خالی نہ جائے، اس کی صورت یہ بھی آسانی سے ہو سکتی ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری رہے، بغیر تلفظ لسانی محض ذکر جلی کے ساتھ اس کا فائدہ ذکر دوام ہے، جو حسب استطاعت مامور ہے،

مراقبۂ اللہ معی اللہ معی کا مراقبہ شروع کر دینا چاہئے، اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قریب اور ہمارے ہر فعل و خیال کا ناظر و حاضر ہے، اس کے مضمون پر غور کیا جائے، اور اس کے مناسب آیات کا استحضار رہے، واذا سألک عبادی عنی فانی قریب، وھو معکم اینما کنتم، ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، نحن اقرب الیہ منکم ولکن لا تبصرون، وھو علیم بذات الصدور ولا تخفی علیہ خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور، الا یعلم من خلق، الم یعلم بان اللہ یری، اسی کیفیت کا رسوخ اصل روح ہے جس کا طریقہ ذکر و شغل ہے،

قلب کا ذاکر ہونا قلب کا ذاکر ہونا یہ فن کی کوئی اصطلاح نہیں ہے، کثرتِ ذکر سے قلب میں ذکر کا لفظ اللہ اللہ ہو یا لا الٰہ الا اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیث نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے، بلکہ اس کا استحضار بھی نہیں رہتا ہے کہ ذکر جاری ہے، .... بہرحال اس کا طریقہ صرف کثرتِ ذکر پر توجہ تام ہے، اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے،

مجاہدہ و ریاضت اس کے ثمرات مجاہدہ و ریاضت سے فضل و رحمت، اور توفیقاتِ الٰہیہ کی صلاحیت و استعداد پیدا ہوتی ہے، ہر نبی و ولی کو مجاہدہ و ریاضت کے عقبات سے گذرنا ضرور ہے، رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں معتکف ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر قیام کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جنگلوں میں مقیم ہونا، اور اولیاء و فقراء کی نفس کشی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، لیکن باہمہ کسب و ریاضت ضروری نہیں کہ رحمت کا ورود اور برکاتِ روحانی کا نزول فی البدیہہ ہو، یہ سب فضلِ رحمانی ہے، وہ ذاتِ پاک بے نیاز ہے، مگر سالک کو پُر امید ہی رہنا چاہئے، جزاءً من ربک عطاءً، گویا مزد نہیں بخشش ہے، اور یہ بخشش بےحساب و کتاب ہوتی ہے،

اوامر و نواہی کی بجا آوری جس گرم جوشی اور خلوص سے ہوگی، اسی قدر انوار رحمت و برکات کا نزول ہوگا، بعض لوگ احکام و اعمال بجالاتے ہیں، ذکر و شغل بھی کرتے ہیں، مگر ثمرات و اثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلوص و محبت جو بمنزلہ روح کے ہے، وہ ان میں مفقود ہے، کوئی شخص کونین کھائے، اور کونین کے اثرات مرتب نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کے ناقص ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اسی طرح نماز و روزہ اور دیگر احکام و اعمال بجالاتے ہیں، اور ان کے اثرات و ثمرات ظاہر نہیں ہوتے ہیں، تو سمجھو کہ ان اعمال کی بجا آوری میں نقص ہے، اور پختگی والی میں تو قدر کمال کی ہے،

کیفیات | سالک کو بڑا دھوکہ ذوق و شوق اور لذت کا ہوتا ہے، سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں، مگر مقصود نہیں، ان کا منشا اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے، اور آسانی ہوتی ہے، مگر اس کو قرب و رضا، و حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں، اور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں، اور نہ مقصود، دوا کا اصل مقصود صحت بخشی ہے، خوش ذائقگی اور لذت نہیں، جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے، تو طاقت اور کھانے کی لذت تو خود بخود آجائے گی، اس کے لئے کوئی الگ دوا کی ضرورت نہیں، ابتدائی جوش و شوق میں کمی فطری ہے، یہ مرحلہ زندگی میں بھی پیش آتا ہے یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں جوش و شوق ہو یا نہ ہو، عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغاز شباب میں عروس نو کے ساتھ جو شورش و جوش طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ تسکین سے بدل جاتا ہے، اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت ..... اس کی جگہ لیتی ہے، میرا ایک شعر ہے،

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی　　　ہائے ہوئے جوش تو ہنگامۂ آغاز ہے

صبر و شکر | حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو بندہ کو نعمت ملتی ہے، تو اس پر شکر واجب ہے، یا ابتلا پیش آتا ہے، تو اس پر صبر مامور ہے، اور یہ دونوں حالتیں موجب ازدیاد و ترقی ہیں، اور یہی صبر و شکر کی دوہری منزل پوری زندگی کے سفر میں ملتی رہتی ہے، شکر و رضا بڑی چیز ہے، الموفقات الٰہی

پر بھی شکر کیجئے، آپ کو گردطانیت جوحاصل ہوئی ہے آپ اس طانیت کوذکر ومناجات مین صرف کیجئے، کہ اس کا شکر بھی ہے، شادی وغم دونون توام ہین،

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیون؟

خواب اوراس کی حیثیت | رویا اورخواب بشارات ہین، اس کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہین، نہ یہ ذریعۂ قربت ہین اور نہ ذریعۂ تکمال مفید طریق، البتہ خوش ہونا چاہئے کہ خواب سے مطلع کیا جاسکتا ہے، مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہین، ہان اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہین، بہرحال اس کے پیچھے نہ پڑیئے، یہ گو بشارات ہین، مگر مقصود نہین،

ع نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

بیداری کے معاملات کی طرف توجہ فرمایئے اسی کا سوال اور اسی کا مواخذہ ہے، باقی رویا اور خواب بشارات سے زیادہ نہین، دھن کے ساتھ اپنے کام مین لگے رہیئے، خواب کی حیثیت شرع مین صرف بشارات کی ہے اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارت سے کبھی ان شکلون کو منتخب فرماتے ہین، جن سے خواب دیکھنے والون کو موانست ہوتی ہے، اس مین خواب مین نظر آنے والے بزرگون کو کوئی دخل نہین ہوتا، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہار بشارت مین اپنا آلہ اپنے فضل سے بنالیا،

مکرر مکتوب ہے کہ خواب کی حیثیت صرف بشارات کی ہے، اوراس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہین، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ مین ساری توفیقات ہین، وہ جب چاہتے ہین تو کسی بندہ کو خواب مین یا بیداری مین تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہین اور اس کے لئے کبھی کبھی اوقات نفس ہونے کے لئے اس کی شکل وصورت کو بمنزلہ ...... وجہ وآلہ بناتے ہین جس سے صاحب معاملہ کو مناسبت اور محبت اور عقیدت ہوتی ہے ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء،

احترام نبوی اور حب رسول | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی اور ذکر گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کیجئے،

عزت واحترام ظاہری و باطنی دونوں چاہیئے عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ ہیں، اور خصوصاً جمعہ کے دن کہ وہ اس دن بارگاہِ نبوی میں پیش ہوتے ہیں، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ کو یہ درود پسند تھا، اللّٰھم صلِّ علیٰ سیدنا و مولانا محمد وعلیٰ اٰلہٖ سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم۔

جمعہ کی رات بالخصوص کثیر درود چاہیئے ایک خواب کے سلسلہ میں سوال ہے کہ کیا واقعاتِ عالم اور حوادثِ روزگار کا وقوع وحدوث بارگاہِ نبوی سے ہوا کرتا ہے؟

جواب:۔ استغفراللہ" واقعاتِ عالم اور معاملاتِ تکوین صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باعثِ رحمت ہیں، آپ پر اللہ تعالیٰ کی جو بظاہر رحمت ہوئی وہ مثالی بشارت رحمۃ للعالمین کے توسط سے دکھائی گئی، مکرر گذارش ہے صلوٰۃ وسلام بطور ذکر کے نہیں، بلکہ بطور درود کے پڑھ سکتے ہیں، خصوصاً جمعہ کے روز اگر بجائے ذکر درود پڑھا جائے تو اچھا ہے، دحشت دور کرنے کے لئے کسی مختصر درود کی کثرت کیجئے،

اے نامِ تو دافعِ بلاہا

بیماری قلب را شفا ہا

بحمداللہ آپ کے لئے حرمین میں دعا کی گئی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں آپ کا خواب مبارک ہوا اور اس سلسلہ میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے، اللّٰھم زد فزد مناجات مقبول میں جو کچھ ہے ادعیہ ہمارے ہاں معمول ہے اس کی اجازت ہے، بارک اللہ تعالیٰ،

تصور شیخ اور صالحین کی محبت — تصور شیخ بلاقصد وارادہ ہو تو حرج نہیں، اور ہمارے حضرت کے خلفاء میں سے جناب خواجہ عزیزالحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا ۱۸ شعبان کو انتقال ہوگیا، افسوس دعائے مغفرت کیجئے اور ایصال ثواب بتلاوۃ القرآن کیا کیجئے،

صالحین کی محبت کلید کامیابی ہے،

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود — وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم صحیح مختصر یہ جان لیجئے کہ صرف اسی کی ذات

پاک موجود ہے، ماسوی ذاتِ باری تعالیٰ سب کالعدم ہیں مگر اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ہر چیز خدا ہے، یہ تو وحدت نہیں، کثرت کا مفہوم ہے، نعوذ باللہ من ذالک، وہ وحدہٗ لاشریک ہے،

اور وحدۃ الشہود کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز میں اسکے وجود اور اس کی قدرت کا ظہور ہے اور بس،

تصوف علمی اور تصوف عملی | تصوف کی دو قسمیں ہیں، ایک علمی دوسری عملی، تصوف کی کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ تو تصوف علمی ہے، اور مجاہدہ اور عمل سے جو صوفیانہ شان پیدا ہوتی ہے، وہ تصوف عملی ہے، آپ تصوفِ عملی میں اپنا وقت صرف کیجئے، اور اس پر وقت صرف کرنا زیادہ مفید اور موجب خیر و برکت ہے،

ملفوظات قرآن وہ گنجینہ ہے کہ ہر نظریہ والا اپنے نظریہ کے مطابق اس میں نکات و رموز پاتا ہے، ایک متصوف کو تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کو سیاست ہی سیاست اوس میں نظر آتی ہے، مگر مجھے تو قرآن پاک میں تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے،

ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ تصوف وہی ہے، جو مجدد طریقت شیخ الکل حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کمال دین و اسلام کا نام تصوف ہے، احکام شرعیہ کی بجاآوری احسان و اخلاص کے ساتھ عین طریقت و حقیقت ہے، تصوف اسلام کا خلاصہ اہتمام طاعت اور اجتناب معصیت، اور دوام ذکر ہے اور بس،

افکار دنیا لاحاصل ہیں | قلب کو طمانیت اور دماغ کو سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے عدم حصول کا باعث کوئی دینی یا دنیاوی فکر ہوگی، اگر دینی فکر ہے تو مبارک، اور دنیاوی فکر ہے، تو اس فکر کا حاصل ہی کیا ہے، اللہ ولی المومنین و نعم الوکیل پیش نظر رہے،

فکر ما در کار ما آزار ما — کارساز ما بفکر کار ما

مجدد طریقت شیخ الکل کی تصانیف کا مطالعہ | برات و کرات مکتوب ہے کہ ہمارے حضرت کی تصانیف یعنی جس قدر ملفوظات اور مواعظ ہیں، انھیں مطالعہ کیا کیجئے، مواعظ و رسائل کا مطالعہ اکسیر ہدایت ہے،

اس سے استقامت اور بصیرت میں مدد ملے گی،

آپ التکشف فی التصوف اور بادۂ عرفان شرح دیوان حافظ پڑھا کیجیے، حضرتؒ والا کے مواعظ و ملفوظات کے مطالعہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ کشف حجابات ہوں گے، اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگی،

امام اور امامت کے فرائض | ناچیز کے ذمہ خطابت و امامت کی خدمت بھی سپرد ہے، اس لئے اس باب خاص میں بھی زبانی اور تحریری ہدایات فرمائیں، اور حاضری کے مواقع پر خطابت و امامت کے لئے آگے بڑھا کر عملاً ہدایات حاصل کرنے کا موقع دیا،

امام نماز کا انتخاب تو جماعت کے ہاتھ میں ہے، تو پھر انتخاب و اجازت کے بعد امامت کیلئے آپ کو بڑھنا چاہیے تھا، اور تقاضائے ادب تو یہی تھا کہ بعد اذن بلا پس و پیش آگے بڑھ جایئے، ہاں بلا اذن جماعت امامت کرنا غلط تھا، بصورت امامت امام میں جو ریائی کیفیات پیدا ہوتی تھیں، ان کو ظاہر فرما کر ان سے اجتناب و احتراز کی تاکید فرمائی،

تحسین صورت اور تکلف حسن و خوبی کے ساتھ قرأت ادا کرنے کی کوشش جو امام کرتا ہے اس کا مقصد مقتدیوں سے داد تحسین کے حصول کے سوا اور کیا ہے؟ اور یہ چیز خلوص کے بالکل منافی ہے، نماز میں تمام توجہ خلوص نیت کے ساتھ احکم الحاکمین خالق کائنات اور رب العالمین کی طرف ہونی چاہیے، نماز اور دیگر عبادات محض انہی کی رضا اور خوشنودی کیلئے تو ہونی ہی چاہئیں، ایک مومن و مسلم کو ہر معاملہ ہر فعل و عمل ہر حرکت و سکون میں خدا کی رضا پر نظر رکھنا چاہیے، اور ان ہی کے مرضی کی سعی چاہیے، روایات و آثار اور امثال سے امام و امامت و خطابت سے متعلق آداب و رعایات امام و ماموم بیان فرمائے،

کیفیات و احوال اور توحش کے بعد بھی ضبط و سکون کے ساتھ مخلصانہ طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہیے، کسی وقت نماز میں بندۂ بے چیدان سے سہو ہو گیا، جب سجدۂ سہو ادا کر کے نماز سے فارغ ہوا، تو اعادۂ نماز کے تو بنظر تحسین صلوٰۃ حکم فرمایا،

حضرت مولانا کا تفقہ | حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات سے پیشتر گاہے گاہے اور تعلقات کے بعد تو اکثر عاجز استفتا اور استفسارات کیا کرتا تھا، گاہے فرماتے کہ کسی مفتی سے فتوی طلب کیجئے، گاہے جواب عنایت فرماتے، چنانچہ چند فتاوی راقم کے پاس محفوظ ہیں، ان میں سے صرف ایک فتوی بابت رویت ہلال صوم و افطار جو علماء کے درمیان میں معرکۃ الآرا ہے، درج کیا جاتا ہے جس سے مولانا کے تفقہ فی الدین کی حیثیت ناظرین پر واضح ہو جائے گی،

استفتاء: علماء دین متین مسائل مندرجۂ ذیل میں کیا فرماتے ہیں:- ؟

مسئلہ (۱)

کسی مسلم ریاست کی مسلم جماعت یا کسی غیر مسلم ریاست کی مسلم جماعت نے رویت ہلال صوم، یا رویت ہلال فطر کی تحقیق و تفتیش اور شرعی شہادت لینے کے بعد کسی مسلم عادل مجاز شخص یا کسی غیر مسلم صادق و مجاز شخص کی زبانی، ریڈیو یا ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ رویت ہلال صوم، رویت ہلال فطر کی خبروں کو دیگر بلاد و شہور میں نشر کرایا، اور بیک وقت مختلف مقامات سے نشر کرایا، تو ایسی متحقق و مصدق اور متواتر خبروں پر مسلمانوں کا صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے، تو اس کی دلیلیں از روئے شرع عقلی و نقلی کیا ہیں؟

مسئلہ (۲)

کسی مسلم یا غیر مسلم ریاست کے کسی شہر کے عالم دین یا امام مسجد جامع جن کی عدالت و صداقت مسلم ہو خود بعد اخذ شہادت شرعی کسی ریڈیو اسٹیشن سے رویت ہلال صوم یا رویت ہلال فطر کی خبروں کو نشر کرتے ہیں، یا بجواب تار ٹیلیفون کے ذریعہ خبر ارسال کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز، اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ اس کی عقلی و نقلی دلیلیں از روئے شرع شریف کیا ہو سکتی ہیں،

بینوا و توجروا،

الجواب

(۱) کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست میں کوئی مسلمانوں کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویت ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعہ ریڈیو یا تار ٹیلیفون کرے تو اس کے قضا کے مطابق عمل کرنا درست ہے کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے، قضائے قاضی کا اعلان ہے مگر ضرورت ہے کہ ان آلات نشر کی پوری نگرانی کی جائے، اور اس کا سارا کام مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے،

(۲) تنہا عالم دین یا امام جامع مسجد ہونا کافی نہیں، اس کا مسلمانوں کی جماعت کا مقرر کردہ یا عملاً مسلّم ہونا ضروری ہے، اگر ایسا شخص ہلالِ فطر، اور ہلالِ صوم کی شہادت شرعی لیکر کسی آلۂ نشر سے شائع کرے یا تار ٹیلیفون سے ارسال کرے، تو اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے، جب کہ آج بھی توپ یا گولہ یا نقارہ یا گھنٹہ سے ہلال یا چاند کے طلوع وغروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلّمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے،

سید سلیمان تاریخ ۱۰ر اگست ۴۷ء

از ریاست بھوپال

اس فتوی میں یہ فقہی نکتہ کہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے، قضائے قاضی کا فیصلہ ہے، علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ نکتہ سنجی کی دلیل روشن ہے، دوسرے علماء نے اس شہادت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ آلات جدیدہ شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں، یا یہ آلات ذرائع شہادت کے قائم مقام نہیں ہو سکتے ہیں، اور اسی پر یا بار زور دیتے ہیں، شہادت اور نتیجہ شہادت کے فرق کی جانب کسی کی نظر نہیں گئی،

حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کا عارفانہ کلام
اور
تصوف میں اُن کا مقام

از

جناب سید حسین صاحب اڈیشنل کمشنر لکھنؤ ڈویژن

حضرت قبلہ سید صاحبؒ کے ذکر کو انہی کے شیخ کے اس مصرعہ سے شروع کرتا ہوں ،

ع از سلیمان گیر اخلاص عمل

یہ ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہے اور مصرعِ ثانی محفوظ نہیں ، اس کو خود حضرت قبلہ کی زبانِ مبارک سے سُنا تھا ،

غالباً ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ اور شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ تھا ، میں اس زمانہ میں بلیا سے رخصت پر دار المصنفین اعظم گڈھ گیا ہوا تھا ، حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا ، عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا ، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو تھانہ بھون سے گہرا ربط اور حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہو چکا تھا ، حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات سے گذر چکے تھے ، اور کن حالات سے عبور کر رہے تھے ، اس کا جاننے والا بجز ربّ العزت کے اور کوئی نہیں ، شیخ کامل واصل و طالب صادق و بے بدل دونوں اس دار فانی سے دار البقا میں پہنچ چکے ہیں انھوں نے اصول طریق کے مطابق اس چیز کو راز میں رکھا ، مگر عادۃ اللہ ہے کہ جن حالات سے مخلوق

آشنا کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے غیب سے سامان مہیا کر دیتے ہیں، ورنہ بزرگان پیشین کے حالات ہم تک نہ پہنچے!
چنانچہ اسی دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانوی کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم میں یہ تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامت سے عقیدت ہے، اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے، اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس زمانہ میں حضرت مولانا بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہیں تحریر فرماتے تھے، بلکہ دوسروں سے لکھوا دیتے تھے، لیکن حضرت قبلہ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا، یہ سن کر میں متوجہ ہو گیا کہ اگر کوئی خاص بات ہو گی تو خود ہی بتلائیں گے، میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا حضرت مولانا کبھی کبھی اشعار میں جواب تحریر فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ چار پانچ شعر حضرت مولانا تھانوی کے تحریر کردہ اس مکتوب پر تھے، اگرچہ مجھے زیادہ قریب ہو کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی، میرا اشتیاق دیکھ کر اس کا ایک شعر پڑھ کر سنایا، جس کا مصرعۂ اولیٰ اوپر تحریر کیا گیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرما دی کہ حضرت قبلہ اخلاصِ عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے، اس پر رسوخ ہو چکا تھا، اور دوسروں کے لئے ان کا اخلاصِ عمل نمونہ بن چکا تھا، حضرت تھانوی کو جن لوگوں نے دیکھا ہے، اور اُن کے معیار و مسلک سے آگاہ ہیں، وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کا فرمانا کہ فلاں شخص سے اخلاصِ عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی، یہ خط بھی یقیناً اُن کے کاغذات میں ہو گا،

میرا قیام اعظم گڈھ ہی میں تھا کہ حضرت قبلہ نے الہ آباد کا سفر کیا، دورانِ سفر راہ میں یہ غزل وارد ہوئی، جو کسی حد تک اُن کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے،

براہ الہ آباد ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۲ء

ابھی تو مشقِ فغاں[1] کُنجِ[2] میں ہزار[3] کرے
اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

---

[1] یعنی گوشۂ عمل و خمول یا خلوتِ شب [2] مراد خود طالب یعنی اپنی ذات ہے [3] مراد طالبِ صادق،

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے
وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے

اُنہی کے وسیلے سے ملتا ہو جس کو ملتا ہو
وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

ادب سے دیکھ لیں عشاق دور سے ان کو
محال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے

سنا تو دے اوسے افسانۂ غمِ ہجراں
وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے

وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو
وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے

پلا دے ساغرِ سرشار مجھکو وہ ساقی
خزاں کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے

تری نظر میں ہے تاثیرِ مستیِ صہبا
تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کے اس ارشاد، ع از سلیمان گیرا خلاصِ عمل وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہیں، اور آثارِ جذب و عشق سے پوری غزل اس کیفیت سے لبریز ہے، دوسرے ہی دن حضرت سید صاحب قبلہ نے الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور اس سفر میں وہ ارقام فرمائی، جو لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶، ۲۷، دسمبر ۱۹۵۳ء کو مولوی حمید صاحب نے اثرِ خرم پڑھ کر سنائی تھی، جس سے حاضرینِ جلسہ پر وہ حالت طاری ہوئی جو دیکھنے والے ہی جانتے ہیں اس کا بیان کرنا کم از کم میرے لیے مشکل ہے اور وہ غزل یہ ہے،

براہ لکھنؤ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء

صدقِ احساس کی دولت مجھے عطا دیجئے
غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دیجئے

وصل کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی
دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیجئے

اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے
دونوں ہاتھوں میں مجھے ساغر و مینا دیجئے

کھول دے میرے لئے علم حقیقت کے در　　　دل وانا دل بینا دل شنوا دیدے
قول میں رنگ عمل بھر کے بنا دے رنگین　　　لب خاموش بنا کر دل گویا دیدے
دل بیتاب سے مل دیدۂ پرآب سے مل　　　تپ آتش مجھے دیدے نم دریا دیدے

درد دل سینہ میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سید صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی بہترین غزلوں میں اور ان کی کیفیات روح و کمال کی آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اشعار میں جو عرض درگاہ قاضی الحاجات میں کی گئی تھی، وہ مقبول ہو گئی، اس کو پڑھکر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل یاد آتی ہے، اس کا شان ورود کچھ اسی قسم کا ہے،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند　　　واندر آن ظلمت شب آب حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتو ذاتم کردند　　　بادہ از جام تجلی بصفاتم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوشدل چہ عجب　　　مستحق بودم و این ها بزکاتم دادند

کیمیائیست عجب بندگی پیر مغان
خاک او گشتم و چندین درجاتم دادند

ایک مرتبہ لکھنؤ سے قبلہ کا سفر تھانہ بھون کا ہوا، اور شیخ کی بارگاہ میں تشنگی کو سیرابی عطا ہوئی، اسی کی مرقع ایک غزل اور ایک نعت ہے، نعت یہ ہے،

تھانہ بھون ۲۰ شوال ۱۳۶۱ھ
مطابق ۲ نومبر ۱۹۴۲ء عیسوی

نام محمد صلی علی نور محمد صلی علی　　　خود مودود صلی علی قند مکرر صلی علی

رحمتِ عالم صلِّ علیٰ فخرِ آدم صلِّ علیٰ
مرسلِ اکرم صلِّ علیٰ اسمک احمد صلِّ علیٰ

چہرۂ انور شمس ضحیٰ زلفِ معنبر لیل دجیٰ
قلب مطہر عین ہدیٰ ذکر محمد صلِّ علیٰ

شاہد عالم شاہ امم ہادیٔ اعظم شمع حرم
صاحبِ لطف و جود و کرم حق مؤید صلِّ علیٰ

راقم کا گمان غالب ہے کہ اس قیام تھانہ بھون میں قبلہ علیہ الرحمۃ فانی فی الرسول ہو گئے، اور سیرت نگار نبوی کے لئے فنا فی الشیخ ہونے کے بعد فانی الرسول ہونے میں کیا دیر لگ سکتی ہے جس شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے ہر ہر پہلو پر ۲۸ سال کے غور و فکر کے بعد قلم اٹھایا ہو، اور اس کو مدلل و مبسوط طریقہ سے ضبط کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنے حالات و اخلاق کو اسی سانچہ میں ڈھالنے کی سعی نہ کی ہوگی جن لوگوں کو حضرت علیہ الرحمۃ اور ان کی نشست و برخاست، ان کے رہن سہن، ان کے خندہ و تبسم، ان کے خورد و نوش، ان کی رفتار و گفتار، ان کے حالات و کردار، ان کے معاملات ــــــ ان کا صبر و تحمل، ان کی جود و عطا وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے جملہ حالات میں اسوۂ رسول کی کتنی جھلک تھی۔ اس کے علاوہ حضرت نجیب الطرفین سید تھے اور ان کے اسلاف میں سلسلہ بسلسلہ دولتِ ولایت ودیعت ہوتی چلی آئی تھی، خود ان کے ذاتی حالات اظہر من الشمس ہیں، ان کو قریب سے دیکھنے والوں کا جن میں ہر طبقہ، ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں، اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نگار نبوی کے ظاہری و باطنی اخلاق و اعمال پر خلق نبوی کا کتنا گہرا اثر تھا، خود حضرت مولانا تھانوی نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے خاص متعلقین سے فرمایا تھا کہ

"بھائی ان کے اندر کس بات کی کمی ہے، ان کی مثال تو بارود کی سی ہے، محض دیا سلائی لگانے کی دیر ہے"

تھانہ بھون میں دس بارہ روز کے قیام کے بعد جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو مجھے بھی اُن کے پروگرام کی اطلاع ہوئی رخصت پر تو تھا ہی اپنے نجی کام سے لکھنؤ گیا، اور بعد فجر ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ پر پہنچا، وہاں قبلہ

موجود پایا، آپ کے حالات و کیفیات کو بیان کرنا چیز کیا ہے سمجھ سکتا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت بے حد مسرور و شاداں ہیں! دار العلوم کے اساتذہ و طلبہ اور دیگر حضرات مہمان خانہ میں حضرت کے گرد جمع تھے، اور آپ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرما رہے تھے، چائے آئی، میں بھی شریک ہوا، چائے کے بعد مخصوص حضرات وہاں رہ گئے تھے، جن میں زیادہ دار العلوم ہی کے اساتذہ اور طالب علم تھے، اس مجلس میں قبلہ نے اپنی غزل مورخہ ۲ر نومبر جو اوپر درج ہو چکی ہے لوگوں کو سنائی، یہ مجلس تقریباً دس گیارہ بجے ختم ہوئی، کھانا کھایا گیا، قدرے قیلولہ کے بعد نماز ظہر مسجد دار العلوم میں جماعت کے ساتھ ہوئی، اس کے بعد پھر مہمان خانہ میں مجلس ہوئی، اس مجلس میں بھی کچھ غزلیں سنائیں، حاضرین میں سے چند حضرات کو میں نے علیحدہ کہتے ہوئے سنا کہ سید صاحب قبلہ میں غیر معمولی تغیر ہے، یہ باتیں ان میں نہ کبھی دیکھی تھیں اور نہ سنی تھیں، اس سے اُن کی مراد یہ تھی کہ ان کو کبھی اس طرح شعر پڑھتے نہیں سنا تھا، اس لئے بہت متعجب تھے، دو یا تین دن دار العلوم میں قیام رہا، اس درمیان میں برابر اس قسم کی مجلس ہوتی رہی، پھر لکھنؤ سے قبلہ کے ساتھ میں بھی ہم سفر ہوا، ریل میں یہ غزل ارقام فرمائی،

براہ شاہ گنج ۱۶ر نومبر ۴۲ء

ہر بات میں جس کی ہو کیفیتِ مستانہ
آباد رہے یا رب تا حشر وہ میخانہ

چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک تماشائی ہے
حیرت ہو یہ گھر اے دل مسجد ہو کہ میخانہ

زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی
گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ

دستار فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہو اسی کا ان نذرِ میخانہ

ہر قطرۂ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے
ہو دامن خالی کا وہ گوہرِ شاہانہ

وہ چشم محبت تو جو پاسِ محبت ہو
دیکھے تو ذرا کر کے اس کو کوئی پیمانہ

معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو
لیلیٰ کے جو اُن کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی

آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جاناںؒ

جو شعر لکھتے تھے اس کو کنیز کو سنانے تھے کچھ اشعار ظہر کی نماز سے پہلے لکھے، کچھ اس کے بعد اور عصر سے پہلے غزل مکمل ہو گئی، اور شاہ گنج ہوتے ہوئے ہم لوگ ۸ بجے شب کو اعظم گڈھ کو پہنچے، آخری شعر کے علاوہ پوری غزل میں یا تو شیخ کے فیوض و برکات کا ذکر ہے، یا خود اپنی ذاتی کیفیت و حالت کا بیان ہے، آخری شعر خاص طور پر کئی حیثیتوں سے قابلِ غور ہے، اس میں فنا فی اللہ کی دلالت پائی جاتی ہے،

حضورِ دوام کی تمنا کے ساتھ محبوبِ حقیقی سے دل میں سما جانے کی التجا عروج کا انتہائی مقام ہے جس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے، جس کی انتہا نہیں، اسی مقام کو کسی عارف نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے،

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کے بعد ۸ / نومبر ۱۹۷۲ء کو اعظم گڈھ ہی میں یہ غزل ہوئی،

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے

پاؤں تو صادب عشق میں باہر نہ رکھ
وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے

نام اُن کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن سے جیسے روحِ بسمل مائلِ پرواز ہے

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے ہوئے ہوش تو سرمایہ آغاز ہے

گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے تمہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

جو نہیں معلوم ہم اس کو کوئی جانے گا کیا
جب کہ جو معلوم ہے وہ بھی سراسر راز ہے

اس غزل کا بھی تقریب قریب وہی انداز ہے، جو اس سے پہلے کی غزل کا ہے، اب سید علیہ الرحمۃ فانی فی الشیخ ہو چکے تھے، اون کا کلام اسی نہج پر قائم ہوگیا،

دسمبر ۲۲؁ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا والا نامہ آیا، عصر کی نماز کے بعد حسب معمول کمرہ مین چائے آئی، سب اعزہ جمع ہوئے، چائے پی کر سب لوگ چلے گئے، مگر مین وہین بیٹھا رہا، قدرے سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے، تحریر فرمایا ہے کہ من جانب الٰہی وارد ہوا ہے کہ آپ کو طریق قادریہ نقشبندیہ سہروردیہ و چشتیہ مین اجازت بیعت کی دون، چنانچہ اس وارد غیبی کے تحت آپ کو اس کا اہل پاتے ہوئے اجازت بیعت کی دیتا ہون، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہون کہ برکت و صبر عطا کرین، اور آپ کے فیوض کو عرصۂ دراز تک جاری رکھین، آپ اس کی اطلاع اپنے ملنے والون اور دوستون کو بھی کر دین تاکہ لوگون کو علم ہو جائے، اور ان کو افادہ ہو،

یہ خبر سنانے کے بعد اپنے مخصوص انداز مین فرمایا کہ بھائی مین تو بالکل خام ہون، لیکن حضرت کے ارشاد کی تعمیل مین تم کو اس کی خبر کرتا ہون، تم اپنے عزیز بھی ہو، اور حضرت سے تم کو عقیدت بھی ہے، مین سُن کر باغ باغ ہوگیا، اس کے بعد بھی میرا قیام تقریباً ۳ ہفتہ اعظم گڈھ مین رہا، اور برابر قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میسر رہی، اور بہت قریب سے اُن کے حالات مشاہدہ مین آئے، جن کا پوری طرح تحریر مین لانا بیحد مشکل ہے، اور اس کی اس مختصر مضمون مین گنجایش بھی نہین ہے، اس لئے صرف نمونۂ مشتے از خروارے پیش کرتا ہون کہ اُن سے محبت کرنے والون کے اشتیاق کو کچھ سیری ہو سکے،

سب سے بڑی بات جو مین نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد بڑی تیزی سے ماسوا سے قطع تعلق کا سا علاقہ بھی منقطع فرمالیا، پہلے تصنیف کے کامون سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ مین صرف فرماتے، یا چھوٹے بچون سے بذلہ سنجی ہوتی، اب ان اوقات کا بڑا حصہ خلوت مین گذرتا، خواہ مسجد مین ہو یا اپنے مسکونہ کمرے مین، پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دار المصنفین کے ساتھ نوش فرماتے، اور مغرب تک اُن سے مختلف

مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی تقریباً ختم ہوگئی، کبھی اعزہ، اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے، عرصہ ہوا اُن کی صحبت جی بھر کر نہیں میسر نہیں آئی، تو وہ جاکر گوشہ خلوت سے لے آتیں، اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے، اہل وعیال واحباب کی درخواست بہت کم مسترد فرماتے تھے، اس لئے اُن کی دلجوئی واستمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے، اور جلد ہی اُٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا، تو تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتے لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا،

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح وشام کا
اب میں تمھارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک دیا، اور حضرت قبلہ کا اہل وعیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا' باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے، ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دیا، اور تصنیف کے کام کے اوقات کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے،

خورد ونوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہوگئی، پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے، نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں نے چاٹ لیا، اکثر اہلیہ محترمہ یاد کرکے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں، اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انھیں خیال نہ رہتا، تو خلاف معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جن کو مزاج عالی میں درخور تھا، کبھی عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، مسکرا کر فرماتے کہ اب بڑھا ہوگیا ہوں، یاد نہیں رہتا آپ یاد دلا دیا کریں،

چودھری اکبر حسین صاحب جج نے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، تحریر فرمایا کہ حضرت آپ تو خود علوم ومعارف کا سمندر ہیں، آپ کو مولانا تھانوی کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، دریا سمندر میں

گرتا ہو نہ کرسمند سو دیا میں، اور بھی بعض لوگوں کے اسی قسم کے خطوط آئے، ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان حضرات کو کہ ایک طرف مجھ سے اظہارِ عقیدت بھی فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف اپنی تجویز بھی پیش کر رہے ہیں، اور میرے فیصلہ پر تنقید بھی ہے، عقیدت کے تو یہ معنی ہیں کہ اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ میرے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ سب صحیح ہو تب بھی اُن کو غور کرنا چاہیئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ سوچ سمجھ کر، اور دیدۂ دانستہ جان کر کیا ہوگا، یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ اگر ایک فن میں مجھے مہارت نہیں، اور کوئی اس فن کا مجھ سے زیادہ واقف کار ہے، تو اس سے اس بات کے دریافت کرنے میں کونسی بات خلافِ عقل ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان میں سارے علوم موجود ہوں، تمام کمالات تو اللہ پاک ہی کے لئے ہیں، اور یہ تو نص سے بھی ثابت ہے کہ فضّل اللہ بعضھم علیٰ بعض، اس لیے ان کا یہ اعتراض میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر یہ بیچارے معذور ہیں، اُن کی نیت بُری نہیں ہے، کبھی کسی پر تعریض نہیں فرماتے، بات کو ختم کرنے کے بعد فیصلہ سامع پر چھوڑ دیتے، خود قطعی حکم نہ لگاتے، عجیب تھا وہ صاحبِ خلق و مروت انسان تھے، اکثر فرماتے کہ بھائی کیا میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میں اپنے کپڑے بھی خود سی لیا کروں، یہ توفن کی بات ہے، حضرت مولانا تھانوی کو اللہ پاک نے فنِ تصوف میں اس دور میں بڑی مہارت عطا فرمائی ہے، اس لئے ان کی مہارت سے اگر فائدہ اٹھایا جائے، تو اس میں کونسی عیب کی بات ہو،

انہی ایام میں اکثر دیکھا کہ حضرت قبلہ فرشِ زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے آپ وہیں بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے کبھی بعد نمازِ مغرب دارالمصنفین کی مسجد کی شمالی چار دیواری پر ایک کونہ میں ذکرِ حق میں مشغول ہوتے کبھی مکانِ مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے، کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرما دیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا، یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی، سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے، فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے، خود قبلہ کا شعر اس

موقع بہادر آباد

جون پور، ۷؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء،

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
خیالِ دو روزہ کا کیا عیش و غم سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاست مزاج میں مرزا جان جاناں شہید کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا، جس کی سیرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند بھی مقبول ہو چکی تھی، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا درخشندہ ستارا جس کی علمی شہرت ساری دنیائے اسلام میں تھی، وہ صاحب قلم جس کے قلم کا لوہا یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے، جس کے زورِ قلم نے الہلال کو بدر کامل بنا کر چمکایا، جس کی معارف نوازی نے علم و فن کے دریا بہا دیئے، جس نے استاد مرحوم کی وصیت کو اس درجہ نبایا کہ اعظم گڈھ جیسے ویرانے کے ایک گوشہ میں ساری عمر گذار دی، اس چھوٹے سے مقام کو علم و فن کا مرکز بنا دیا، اور دارالمصنفین کی علمی شہرت ساری دنیا میں پھیلا دی، جس کی زیارت کے لئے دور دور کے اہلِ کمال آتے تھے،

وہ جامع العلوم جس کو نادر شاہ نے کابل یونیورسٹی کا نصاب بنانے کے لئے منتخب کیا، جس نے اپنی عربی دانی کا سکہ عربوں تک پر بٹھا دیا، جس نے پیرس اور روم و لندن وغیرہ کے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا، وہ مورخ اعظم جو اپنے دور میں نہ تو معیارِ تاریخ سمجھا گیا اور وہ قدیم و جدید کا سنگم جس کی ذات میں دونوں کی سرحدیں ملتی تھیں، وہ پرتو صفات نبویؐ، وہ نمونۂ اخلاق اسلامی، وہ جامع کمالات انسانی وہ جسے دنیا کی ہر قسم کی جاہ و شہرت بے طلب حاصل تھی، وہ جب مقام فنا سے گذرتا ہے تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا ہے کہ موتوا قبل ان تموتوا کا مصداق بن جاتا ہو حضرت قبلہ کی ایک غزل اس کی بہترین ترجمان ہے،

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں
ہر سود و زیاں دوسرا بھول گیا ہوں

جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں

آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں

عالم کے تماشے نہیں اب جاذبِ دل ہیں
ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں

ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھکو
دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا
پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

سجدہ طرفِ کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے
اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں

حل جب سے ہوا فلسفۂ حُسنِ حقیقت
ہر مسئلہ اے ذہن سا بھول گیا ہوں

ہے آہِ سحرگاہ میں وہ ذوق لبِ گوش
چنگ و نئے و بربط کی صدا بھول گیا ہوں

منظور تری چشمِ رضا جب سے ہوئی ہے
امید جزا خوفِ سزا بھول گیا ہوں

اے رہبرِ توفیق مجھے راہ بتا دے
نقشِ قدمِ راہ نما بھول گیا ہوں

اے خضر مرا قافلہ کس سمت گیا ہے
تیسیرِ صداہائے درا بھول گیا ہوں

اُلٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

یہ غزل حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت ہونے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی، اس زمانہ میں جو کیفیات اُن پر طاری ہوئیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی،

تصوف میں حضرت کا جو مقام تھا، اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اس فن میں حضرت کو جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت کے اقوال سے کیا جاسکتا ہے، ایک بار میں نے استفسار کیا کہ حال و مقام کیا ہے، اور مراتب سلوک کسے کہتے ہیں، اس کے جواب میں تحریر فرمایا،

حال:۔ سالک کے قلب پر جو عارضی کیفیت اس کے اختیار کے بغیر

طاری ہو جائے،

مقام : وہ مرتبۂ سلوک جس پر سالک رسوخ قدم کے ساتھ قائم ہو جائے،

مراتب سلوک : یعنی مقامات جیسے صبر و شکر، توکل، استقامت علی الحق، زہد،
رجا، وغیرہ،

ایسے جامع کمالات کا تذکرہ جس کے قلم نے صدہا انسانوں کو زندۂ جاوید کر دیا، مجھ جیسے ہیچ میرز انسان کے بساط سے باہر ہے لیکن اُن کی جو شفقت اس ناچیز پر تا دم آخر رہی، اس کو کسی طرح بھولا نہیں جا سکتا، اور یہ کمترین فرو خانوادۂ سلیمانی اس وقت بھی اُن کے فیوض کو اپنے اوپر اسی طرح پاتا ہے جس طرح اُن کی حیات میں پاتا تھا، اور انہی کی روحانی برکت سے یہ چند سطر اس ناچیز کے قلم تحریر میں آگئیں،

اب میں اس ذکر کو حضرت قبلہ کے خواجہ تاش حضرت مولانا عبد الصمد صاحب مدظلہ دامت برکاتہ کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں، جو انھوں نے حضرت قبلہ کی وفات کے وقت مجھکو لکھی تھی،

" ایک خبر جانکاہ ریڈیو سے ۲۲ر نومبر کی شب میں پاکستان سے نشر ہوئی تھی کہ ہمہ صفت علوم دینیہ و ادبیہ و تاریخ و تصوف کے آن موصوف کے ارتحال کی تھی، اس کا صدمہ بہت ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون" اللہ تعالیٰ اُن کو بہتر ٹھکانا جنت الفردوس میں عطا فرمائیں، اور ان کے درجات عالیہ ہر روز وہاں بلند فرماتے رہیں، موت تو اس عالم آب و گل کے ہر بساط ہستی کے لئے لازم ہو چکی ہے مگر موصوف ہمہ صفت پر کیا ماتم کا حق ادا ہو سکے، سوا اس بات کے کہ ہند کی سرزمین کا ایسا فرد جو علمی و ادبی عالم میں مایۂ ناز ہستی تھا، جس کی تلافی اس عالم میں ایک کا اندازہ لگاتے ہوئے دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے، اللہ تعالیٰ آن موصوف کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام پر فائز فرمائیں،

اور ہم پس ماندگان کے لئے اُن کی ذاتِ اقدس کو نمونہ بنا کر درسِ عمل کی توفیق بخشیں،
آپ کی بہت سی خصوصیات (کتابی وغیر کتابی نوادرات میں سے تھیں جو قابلِ مطالعہ و
وسبق ہیں، اللہ تعالیٰ صبرِ جمیل عطا فرمائیں،

حضرت قبلہ مرحوم میرے محترم بڑے پیر بھائی تھے، جن کا صدمہ مجھے بہت زیادہ ہے"
اس کی تلافی تو بس اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہی کرسکتی ہے،"

ڈاکٹر سید سلیمان ندوی مرحوم اور انکا تشخص

از

ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی

مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی کی وفات ہم لوگوں کے لئے ایک جانکاہ حادثہ ہے، اس حادثہ ہائلہ سے ہندوستان کی مسلم سوسائٹی میں علی العموم اور ہماری علمی دنیا میں علی الخصوص ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر کرنا بہت ہی مشکل اور متعذر معلوم ہوتا ہے، سید صاحب مرحوم میں اُن کے علمی تبحر کے ساتھ ساتھ ایسی ذاتی اخلاقی اور نفسانی خوبیاں تھیں، جو آج کل ہم لوگوں میں مفقود ہیں، یہ خصائل حسنہ اُن کو اپنے آباء و اجداد سے وراثۃً ملے تھے، اور علمی تبحر انھوں نے اپنی مسلسل محنت و جانفشانی اور مطالعہ سے حاصل کیا تھا،

وہ علماء بہار کے ایک ایسے ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جن کی اخلاقی خوبیوں کی داستان وہاں کے اکثر بڑے بوڑھے بیان کیا کرتے تھے، اُن کا مولد و موطن بہار کا ایک چھوٹا سا گاؤں دسنہ تھا، جو اب بھی اہل علم کا جنم بھوم ہونے کی حیثیت سے اس صوبہ میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے، ایسی چھوٹی سی بستی کے علمی ماحول میں سید سلیمان مرحوم نے اپنی ابتدائی عمر صرف کی، اور عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی، زندگی کا یہ ابتدائی حصہ ہر شخص کے لئے بہت ہی اہم ہوتا ہے، اسی زمانہ میں انسان کے خصائل بچپن میں، اس کی سیرت کا بڑا اہم حصہ جڑ پکڑتا ہے، اور اس کا تشخص متعین ہوتا ہے، ماہرین نفسیات کی تو

راے ہو کہ پانچ سال کی عمر کے بعد انسان کے کردار میں عموماً کوئی اہم تغیر پیدا ہی نہیں ہوتا، سید سلیمان مرحوم کی سیرت اور خصائص وشمائل کی بنیاد اسی چھوٹے سے گاؤں کے علمی ماحول میں پڑی، اور اُن کا تشخص بھی متعین ہوا،

یہ ماحول ہمارے قدیم طرز کے علماے اسلام کا تھا، جو قرآن و حدیث وغیرہ کو پڑھ کر صرف اپنے حافظہ ہی میں نہ رکھتے تھے، بلکہ ان میں جو اخلاقی تعلیم ہے، اس کو اپنے دلوں میں سمو لیتے تھے، وہ محاسنِ اخلاق کے مجسمے ہوتے تھے، اُن کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر ہوتے تھے، عجز وانکسار، محبت و مودت، صداقت و امانت، صبر، استقامت، تحمل، و تشکر، عفت و پاکبازی، عام انسانی ہمدردی، خوفِ خدا، اور جذبۂ خدمتِ خلق، اور دوسری صفاتِ عالیہ کے ساتھ، جن کی تعلیم کلامِ پاک اور رسولِ کریمؐ نے دی ہے متصف ہوتے تھے، یہ لوگ اپنے بچوں اور طلبہ کو ابتدائی عمر میں کریما، اور پندنامہ جیسی اخلاقی کتابیں صرف پڑھاتے ہی نہ تھے، بلکہ انھیں جو اعلیٰ اخلاقی تعلیم دی گئی ہے، ان کا اپنے اعمال و افعال، اور حرکات و سکنات سے ان کے سامنے مظاہرہ بھی کرتے تھے، وہ جس طرح اپنے اوقات کی قدر کرتے تھے اسی طرح دوسروں کے اوقات کی قدر و قیمت کو بھی سمجھتے تھے،

یہ سارے صفاتِ حمیدہ سید سلیمان نے اپنے آباؤ اجداد سے وراثۃً پائے تھے، اور اُن کے ماحول نے اُن کی سیرت و کردار میں پختگی پیدا کر دی تھی، میری چند ملاقاتیں سید سلیمان صاحب مرحوم سے ہوئیں، اُن سے مجھ پر یہی اثر ہوا کہ سید صاحب مرحوم کے محاسن اخلاق، اہلِ اسلام کے لئے ایک نمونہ تھے، ان ملاقاتوں کی تفصیل یہ ہے؛

یہ عجیب افسوسناک واقعہ ہے کہ باوجود اس کے کہ میرا مولد و موطن ضلع پٹنہ ہی ہے، اور میں نے بھی علومِ عربیہ کی ابتدائی تعلیم شہر پٹنہ ہی میں حاصل کی، سید سلیمان مرحوم سے میری ملاقات صرف پانچ دفعہ ہوئی، اور ان میں بھی چار بار محض اتفاقی طور پر،

پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء میں ہوئی، جب میں مدرسۂ عالیہ رامپور سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، سید صاحب اُس زمانہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تھے، لاہور سے پٹنہ جاتے ہوئے میں مولانا شبلی مرحوم اور سید صاحب مرحوم کی زیارت کرنے کیلئے دو دن

لکھنؤ میں ٹھہر گیا، سید صاحب سے مسجد میں نماز ظہر کے وقت ملاقات ہوئی، صرف چند منٹ کچھ باتیں کیں پھر میں نے رخصت چاہی، تو سید صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، میں نے مدرسہ کے طلبہ کے شرارت آمیز انداز میں مسکرا کر عرض کیا کہ مولانا! رخصت کے وقت تو مصافحہ آیا نہیں ہے، سید صاحب مسکرائے، اور بجائے اس کے کہ اس مسئلہ پر بحث کرنا شروع کر دیتے، خاموش ہو رہے، حالانکہ وہ اس مسئلہ پر اچھی خاصی عالمانہ بحث کر سکتے تھے،

سید صاحب سے میری دوسری ملاقات ۱۹۳۶ء میں ندوۃ العلماء کے کتبخانہ میں محض اتفاقی طور پر ہوئی میں کتب خانہ میں ابن تیمیہ کی کتاب المعتبر کے مخطوطہ کی تلاش میں گیا تھا، اتفاق سے سید صاحب بھی وہاں موجود تھے، لیکن میں نے اُن کو نہ پہچانا، مہتمم کتب خانہ سے باتیں کر کے واپس ہونے لگا تو سید صاحب نے خود ہی بلا تکلف میرا نام دریافت کیا، میں نے عرض کیا "زبیر" تو فرمایا کہ میں بھی یہی سمجھا تھا، میرا نام "سید سلیمان" ہے، میں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا، اور نہ پہچاننے کی معذرت کی، اس کے بعد ندوہ کے متعلق چند باتیں ہوئیں، اور آیندہ تفصیلی ملاقات کی امید پر میں نے رخصت حاصل کی،

میری تیسری ملاقات سید صاحب سے اتفاقی طور پر ریل میں ۱۹۳۷ء میں ہوئی، سید صاحب حسب معمول نہایت بے تکلفی سے ملے، اس زمانہ میں میں تاریخ علم الحدیث پر کام کر رہا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھکر میں نے اُن سے استفادہ کے خیال سے فن اسماء الرجال کی ابتداء، اور نقد حدیث وغیرہ کے متعلق مختلف سوالات کئے، اور اس سلسلہ میں گولڈزیہر کی کتاب "مطالعات اسلامیہ" کی تعریف کی، سید صاحب کو میری یہ بات پسند نہ آئی، فرمایا کہ یورپین مصنفین اصطلاحات وغیرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے غلطیاں کرتے ہیں اور اسلام پر حملے کرتے ہیں، آپ ان لوگوں کی باتوں پر نہ جائیے، میں نے عرض کیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ پڑھے لکھے آدمی کو کسی دوسرے کے کہنے پر بے سوچے سمجھے آمنا وصدقنا کہنا چاہئے، بلکہ ہر مسئلہ پر جہاں تک ممکن ہو تو تحقیق کے بعد رائے قائم کرنا چاہئے .... لیکن اس کے ساتھ

ساتھ دوسرون مین کوئی خوبی ہو تو اس کی داد بھی ضرور دینا چاہئے، اور گولڈزیہر کی وسعت نظر کا مین قائل ہون اور اس کی داد دیتا ہون، مولانا نے فرمایا کہ جب آپ اوس کی کتاب کا زیادہ غائر مطالعہ کرین گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی تحقیق کی نوعیت کیا ہے، بعد کے مزید مطالعہ سے مولانا کا فرمانا اتنا بجا تو مجھ ثابت ہوا کہ گولڈزیہر کبھی کبھی اپنے نتائج محض مفروضات کی بنا پر نکالتا ہے، اور اس مین سخت غلطی کرتا ہے لیکن اس کا علمی تبحر اور اس کی وسعتِ نظر اپنی جگہ پر ہے،

اسی صحبت مین سید صاحب مرحوم نے مجھسے حضرت عائشہؓ کی تنقید حدیث کا ذکر کیا، اور اس مسئلہ پر سیوطی کے ایک چھوٹے سے رسالہ کا بھی نام لیا، بلکہ کچھ دنون بعد انھون نے یہ رسالہ میرے پاس عاریۃً بھیج بھی دیا، جس سے مین نے استفادہ کیا، لیکن بعد کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ان مین سے اکثر حدیثین مسند ابی داؤد طیالسی مین موجود ہین،

اس کے تھوڑے دنون بعد سید صاحب سے میری ملاقات حیدرآباد کے دائرۃ المعارف کے جلسہ منعقدہ ۱۹۳۰ء مین ہوئی، اس جلسہ مین ہندوستان کے مختلف حصون کے اکابر علماء شریک تھے، ان مین ایک نہایت جید فاضل بھی تھے جو میرے اور سید صاحب دونون کے دوست تھے، اُن کے علم و فضل کی سید صاحب بھی قدر کرتے تھے، اور مین تو اُن کے فضل و کمال کا قائل تھا ہی، اُن کی ایک کتاب پر دوسرے جید فاضل نے بہت سخت تنقید کی تھی، اور یہ تنقید سید صاحب نے معارف مین شائع کی تھی، انھون نے سید صاحب سے شکایت کی کہ یہ تنقید کیون شائع کی، سید صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک علمی مضمون تھا، اور معارف ایک علمی جریدہ ہے مین نے اس مضمون مین جو سخت اور نا ملائم الفاظ تھے، ان کو نکال کر شائع کر دیا، اور یہ میرا فرض تھا، آپ چاہین تو اس کا عالمانہ جواب لکھین، وہ بھی شائع کر دیا جائے گا لیکن اگر اس مین کوئی سخت اور نا مناسب لفظ ہوگا تو اُن کو بھی حذف کر دیا جائے گا، باوجود اس جواب کے جو میرے خیال مین نہایت معقول تھا، بہت زیادہ خفا ہونے لگے، اور سید صاحب مرحوم سنجیدگی اور متانت کے ساتھ جواب دیتے رہے، میرے دلچسپی کی گفتگو کا محض یہ تھی کہ باوجود انھون نے کسی طرح کے غم و غصہ کا اظہار نہ کیا

سید صاحب مرحوم سے میری پانچوین اور آخری ملاقات ڈھاکہ مین آل پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس کے جلسہ کے موقع پر ہوئی، سید صاحب مرحوم اس جلسہ کے صدر تھے، انھون نے اپنے خطبۂ صدارت مین چند تاریخی اور ادبی حقائق بیان کئے تھے جن سے کسی پڑھے لکھے آدمی کو انکار نہین ہوسکتا لیکن بعض خاص سیاسی اسباب کے باعث طلبہ مین غلط فہمی پھیل گئی، یا پھیلائی گئی، ان لوگون نے جلسہ کے دوسرے دن سید صاحب کے سامنے اُن کے خلاف نہایت سخت اور افسوسناک مظاہرہ کیا، اور اُن کو مجبور کیا کہ وہ جلسہ سے چلے جائین، جلسہ موقوف کر دیا گیا، اور مولٰنا رفع شر کے خیال سے اپنے جاے قیام پر چلے گئے، مین بھی وہان گیا، مولانا لیٹے ہوئے تھے، مین نے حال دریافت کیا، فرمایا سب ٹھیک ہے، پھر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور چند اساتذہ معافی مانگنے کے لئے آئے، اُن سے سید صاحب نے دوران گفتگو مین بلا کسی غم و غصہ کے فرمایا کہ جو کچھ مین نے کہا وہ تاریخی حقائق ہین، اور مظاہرہ اور ہنگامہ کرنے سے یہ حقائق تبدیل نہین ہوسکتے،

اس تمام ہنگامہ اور قصہ مین سید صاحب کا صبر و تحمل اور ضبط نفس قابلِ ستایش و آفرین تھا، انھون نے نہ تو طلبہ کی کسی سے شکایت کی، نہ کسی کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالا،

ان پانچون واقعات سے سید صاحب کے کردار اور اُن کی شخصیت پر نمایان روشنی پڑتی ہے، اُنکے اندر نہ تو کبر و نخوت تھا، نہ خود پسندی تھی، وہ لاطائل صحبت ناپسند کرتے تھے، چھوٹون سے محبت و خلوص سے ملتے تھے، علمی کام کرنے والون کی ہر طرح اعانت کرتے تھے، تحمل و بردباری اُن کی خاص صفت تھی، شر و فساد سے اُن کو نفرت تھی، جو لوگ ان کی تذلیل کرتے تھے، اُن کو بھی وہ مخلصانہ اور مصلحانہ نصیحتین کرتے تھے،

علماے اسلام کے طرۂ امتیاز یہی نفسانی اور اخلاقی فضائلِ حسنہ ہین، اگر علومِ اسلامیہ کی درس و تدریس کے بعد بھی یہ فضائل نہ پیدا ہون تو سارا علم و فضل بیکار ہے، معلم الملکوت سے زیادہ بڑا عالم کون

ہو سکتا ہے ؟ لیکن اس کا علم کس کام کا ہے ؟

سید سلیمان ندوی مرحوم فضائل عالیہ نفسانیہ کے ساتھ متصف ہونیکے ساتھ ساتھ عالم متبحر اور فاضل اجل بھی تھے، اور مختلف علوم اسلامیہ کا وسیع علم رکھتے تھے، انھون نے اپنی پچاس سالہ علمی زندگی مین سیکڑون مضامین الندوہ، الہلال، معارف اور دوسرے جرائد کے لئے لکھے، بیسیون چھوٹے بڑے خطبے پڑھے اور درجنون چھوٹی بڑی کتابین تصنیف کین، اُن کے ہر مضمون، خطبے اور تصنیف سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ اپنے موضوع سے کافی واقفیت رکھتے تھے،

سید صاحب جب کسی اہم موضوع پر قلم اٹھانا چاہتے تھے، تو اس کے متعلق کافی مطالعہ کرتے تھے اور جہان کہین بھی ان کو اپنے موضوع کے متعلق معلومات کے ملنے کی توقع ہوتی، وہان سے جو کچھ ان کو مل سکتا تھا، اس کو اخذ کرتے تھے، اور حتی الوسع تحقیق و تنقید کے بعد جو کچھ اُن کو ملتا تھا، اس کو نہایت سلیقے اور عالمانہ طور سے سجاتے تھے،

سید صاحب کا طرز تحقیق عموماً تو وہی تھا، جو اُن کے استاد مرحوم مولانا شبلی کا تھا، لیکن ایک حد تک وہ آزادانہ اپنے خیال کا اظہار کرتے تھے، چنانچہ بعض مسائل مین انھون نے مولانا شبلی سے اختلاف بھی کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب تقید فکر کے اُس جنجال سے جو گذشتہ دو تین صدیون مین مسلمانون مین پھیل گیا تھا، بہت باہر نکل آئے تھے، یہ لوگ تو علوم عقلیہ مین بھی اپنے اساتذہ سے اختلاف کرنے کو اثم عظیم سمجھتے تھے، چنانچہ میرے استاذ مولانا فضل حق رامپوری مرحوم نے جب میرزاہد امور عامہ کے حاشیہ مین مولانا عبد الحق خیرآبادی مرحوم پر جو میرے استاد الاستاد تھے بعض فلسفیانہ مسائل کے متعلق کچھ اعتراضات کئے، تو مولانا عبد الحق مرحوم کے معتقدین اور شاگردون مین غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا، اور مولانا ہدایت اللہ جونپوری مرحوم، مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی مرحوم، مولانا محمد طیب عرب رامپوری مرحوم، مولانا عبد العزیز بہاری مرحوم وغیرہم مین عتاب و عناد کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی، متعدد رسالے

شائع کیے گئے، اور آخر میں نواب حامد علی خان رئیس رامپور کے دربار میں مولانا عبدالوہاب بہاری مرحوم اور مولانا برکات احمد البہاری ثم التونکی کے درمیان مناظرہ ہوا، مسلمان علما میں جمود فکر اور تقلید ذہنی کی یہ حد تھی، حالانکہ فقہی اور مذہبی مسائل میں صحابۂ کرام نے آپس میں اختلاف کیا، ائمۂ فقہ میں بعض اہم اصولی اختلافات ہوئے اور مختلف مذاہب فقہیہ پیدا ہوئے، محمد بن جریر طبری نے بعض مسائل میں ائمۂ اربعہ سے اختلاف کیا لیکن ان اختلافات نے کبھی ذاتیات کی حیثیت نہ اختیار کی،

اسی طرح سید سلیمان مرحوم نے بھی بعض علمی اور تاریخی مسائل میں اپنے استاذ محترم سے مودبانہ اختلاف کرکے اپنی حریت فکر اور آزادانہ تحقیق کا بھی ثبوت دیا ہے،

مولانا سید سلیمان مرحوم کا طرز تحریر اور طریقۂ بیان صاف ستھرا اور سلجھا ہوا تھا نہ تو ان کی تحریروں میں کسی طرح کی تعقید ہوتی نہ ان کی تقریر میں کسی طرح کا جھول ہوتا تھا، بلکہ ان کی تقریریں صاف ستھری اور سادی ہوتی تھیں، ان میں نہ تو آواز کا اتار چڑھاؤ ہوتا تھا، نہ الفاظ کا خطیبانہ الٹ پھیر، تحریر میں وہ مختلف انداز میں مہارت رکھتے تھے، اور ہر موضوع کے لئے وہی انداز بیان اختیار کرتے تھے، جو اس کے مناسب ہوتا تھا، چنانچہ الہلال میں جو مضامین سید صاحب کے شائع ہوئے ہیں، ان کا طرز بیان خطبات مدراس کے انداز تحریر سے بالکل مختلف ہے، عربوں کی جہازرانی" اور "عرب و ہند کے تعلقات" کے انداز بیان میں نمایاں فرق ہے، ارض القرآن، سیرت عائشہؓ اور سیرت النبی کی زبان تو یکساں ہے لیکن ان میں بھی سلاست اور علمیت کے مختلف درجے نظر آتے ہیں،

سید سلیمان مرحوم کا شاہکار عام طور پر سیرت النبی کی جلدیں ہی سمجھی جاتی ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس کارنامے پر سید صاحب مرحوم جتنا بھی فخر کرتے کم تھا، انھوں نے سیرۃ النبی لکھ کر تمام مسلمانوں کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کر دیا ہے جس کا اجر ان کو خدائے تعالیٰ دے گا لیکن میرے خیال میں جس طرح مولانا شبلی مرحوم کا اہم ترین کارنامہ ان کی تصنیفوں میں مضمر نہیں ہے، اگرچہ وہ بھی یقیناً بہت اہم ہیں بلکہ ان کا سب سے بڑا کام علمی خدمت کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرنا، ان کی رہنمائی کرنا اور دارالمصنفین کی تاسیس ہے جس کے ذریعہ اسلامی علوم

کی مزید تحقیق اور اشاعت ہوتی رہی ہے، اسی طرح سید سلیمان مرحوم کا سب سے بڑا کارنامہ دار المصنفین کے قائم رکھنے، اور نئے کارکنوں کے پیدا کرنے میں مضمر ہے، دار المصنفین اب صرف مولانا شبلی کی یادگار نہیں ہے بلکہ زیادہ تر سید سلیمان مرحوم کی یادگار ہے،

دار المصنفین ہندوستان کا اپنے قسم کا سب سے پہلا قومی علمی ادارہ ہے جس نے اب تک نہایت مفید علمی خدمت کی ہے اس نے اب تک اپنی زندگی اور افادیت کا کافی ثبوت دیا ہے! اب اس کو قائم رکھنا اور اس کو ترقی دینا ہم لوگوں کا فرض ہے، حیدرآباد کا دائرۃ المعارف بھی اسی طرح کا ایک مفید علمی ادارہ ہے لیکن اولاً تو وہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ ہے، دوسرے اس کی افادیت عربی خواں طبقہ تک محدود ہے، اور اس کی اشاعتوں سے استفادہ کرنے، اور اہل ہند کے لئے عموماً مفید تر بنانے کے لئے بھی دار المصنفین جیسے ادارہ کی ضرورت ہے، دلی کا ندوۃ المصنفین دار المصنفین جیسا ایک علمی قومی ادارہ ہے لیکن ایک تو وہ ابھی نوعمر ہے، دوسرے ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ایک قسم کے دو علمی ادارے بھی کم ہی ہیں،

لہٰذا جو لوگ سید سلیمان مرحوم کی یادگار قائم کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے بہترین صورت یہ ہے کہ اُن کی اس زندہ یادگار کو مزید ترقی اور وسعت دیں اور اس میں نئی شاخیں پیدا کریں،

———⁂———

سفر حجاز کے چند تاثرات

از

جناب پروفیسر عبدالمنان صاحب بیدل، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

سنہ ۱۹۴۹ء سے پہلے الحاج سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بہ قصد انتفاع و استفادہ حاضر ہونے کی سعادت نصیب نہ ہوئی تھی،

سنہ ۱۹۴۹ء میں بفضل باری تعالیٰ، مکۂ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا موقع ملا، مکہ مکرمہ میں ایک عالم دوست، رفیق سفر نے خبر دی کہ مولانا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بیٹے محمد سلمان سلمہ المنان، اور چند خواتین کے ساتھ تشریف لائے ہیں، اور رباط بھوپال میں قیام فرما ہیں، مگر یہ خوشخبری ملنے کے بعد بھی میں اُن سے ملنے نہ گیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کی تمنا بھی تھی، اور ضرورت بھی، مگر اُن کے پاس نہ جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں فطرۃً کم آمیز ہوں، اور سید صاحب رحمۃ اللہ سے عمر بھر میں چند بار سے زیادہ اطمینان کے ساتھ ملنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع مجھے نہ ملا تھا، چند بار پٹنہ کالج کے پروفیسر محمد قاسم مرحوم کے بنگلہ پر اور چند مرتبہ ریاض حسن خان خیال مرحوم مظفرپوری کی قیام گاہ پر، پروفیسر محمد قاسم مرحوم میرے عزیزوں میں تھے، میری پٹنہ کالج کے بعض اساتذہ اور محلہ کے دو ایک وکیلوں کی شام کی نشست پروفیسر محمد قاسم مرحوم ہی کے یہاں ہوا کرتی تھی، کبھی کبھی خصوصاً جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما ہوتے، تو سیاسی، تاریخی، مذہبی اور

معاشی مسائل پر آزادانہ طور سے تبادلۂ خیالات بھی ہو جاتا، مگر علامہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ہم لوگوں میں اکثر سیاسی مسائل میں سخت اختلاف رائے تھا،

نہ ملنے کی دوسری اور اصل وجہ یہ تھی کہ میرے بعض بزرگوں اور دوستوں نے جو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ اُن کے ہم خیال و ہمراز تھے، مجھے واقف کر دیا تھا کہ اب سید صاحب اُس گروہ کے ایک بلند مقام فرد ہیں جن سے تم ملنے سے ڈرتے ہو شرماتے ہو اور ہچکچاتے ہو،

آپ شاید سوال کریں کہ وہ کونسا گروہ ہے، جواب ہے اہلِ دل، اور اہلِ نظر کا گروہ، آپ پوچھ سکتے ہیں، — کیوں؟ — بلا تصنع عرض کرتا ہوں — ڈرتا ہوں کہ کہیں اپنا بھرم نہ کھل جائے شرماتا ہوں کہ میرے مخفی عیوب سے اہلِ نظر واقف نہ ہو جائیں اور ہچکچاتا ہوں کہ کہیں میری حاضری سے اُن لوگوں کی طبیعت منغض نہ ہو جائے،

اسلئے تمنائے قدمبوسی کے باوجود علامہ مرحوم سے ملنے کی ہمت نہ پڑی، کئی بار صحنِ حرم میں مشغول نماز یا محوِ دیدارِ کعبہ نظر آئے، دو ایک بار سعی کرتے کوہِ صفا پر دعا مانگتے اور آنسو بہاتے ہوئے بھی دیکھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آنکھ والوں کو یہ بھی کہتے سُنا کہ

"ایمان و احتساب کی جلوہ ریزیاں اُن کی ہر نقل و حرکت سے ظاہر ہیں"

مگر مجھ کو سید صاحب علیہ الرحمہ میں کوئی خاص کیفیت نظر نہ آئی، قیامِ مکہ مکرمہ کی مدت ختم ہوئی، مدینہ منورہ جانے کا حکم ملا تو میرے ایک دوست نے کہا کہ تم کو مبارکباد دیتا ہوں کہ سید صاحب بھی اُسی دن تشریف لے جائیں گے جس دن تم کو جانا ہے، میں نے کہا کہ —— بھائی معاف کرنا میں نے سید صاحب کو نزدیک سے بھی دیکھا اور دور سے بھی، اور سوچتا رہا کہ تم اُن کو اب "علامہ سید سلیمان ندوی" نہیں بلکہ "سید العارفین" کہتے ہو آخر اس کی وجہ کیا ہے، مجھے تو آج سے تین سال پہلے کے سید صاحب اور آج کے سید صاحب میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا، میرے پھٹے پرانے کپڑے والے، خود فراموش

دوست نے کوئی جواب نہ دیا، اور یہ شعر گنگناتے ہوئے حرم شریف کی طرف روانہ ہو گئے،

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

(۲۰)

مدینہ منورہ میں ایک دن باب مجیدی کے قریب سید صاحب نظر آئے میں نے السلام علیکم کہا جواب ملا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ اس کے بعد مولانا آگے بڑھے، میں نے قریب جاکر عرض کیا حضور نے اس دیرینہ نیازمند کو یقیناً نہ پہچانا ہوگا فرمایا، ہاں، دیکھ کر تو نہیں پہچانا تھا، مگر آواز سُن کر اب پہچان گیا، بھلا کہئے تو کیسے پہچانتا نہ وہ سوٹ میں ملبوس بھرا ہوا بدن ہے، نہ منڈی ہوئی داڑھی، نہ ہاتھ میں طلائی دستہ کی چھڑی ہے، نہ لبکے داہنے گوشہ میں نیم سوختہ سگریٹ ہے، آپنے تو ایسی صورت بنائی ہے کہ میں کیا آپ کا قریب ترین اور قدیم ترین دوست بھی شاید ہی پہچانے، عرض کیا حضور صورت ہی صرف بدلی ہے، مسکرا کر فرمانے لگے، انشاء اللہ اس دربار سے جاتے جاتے سیرت بھی بدل جائے گی، ــــ اس جملہ کے ساتھ ہی ساتھ اُن کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے بھی نکل پڑے ــــ کہنے لگے، ــ بیدل صاحب کیا عرض کروں، جلال وجبروت والے کے دربار میں بھی بہت کچھ ملتا ہے، مگر رافت ورحمت والے کے دربار میں سب سے بڑی چیز یعنی محبت ملتی ہے آنا شرط ہے، آئے نہیں کہ ہدیۂ محبت ملا نہیں، ہاں ایک بات اور عرض کروں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو یہاں آئے بغیر بھی بہت کچھ دیدیا جاتا ہے، اللہ رے اُن کی قسمت،

مدینہ منورہ کے بارہ روزہ قیام کے زمانہ میں بھی سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سوا ایک بار کے گفتگو کا موقع نہ ملا، مجھے ایسا شبہہ ہوا کہ وہ مجھ سے اس سرزمینِ مقدس میں ملنے سے پرہیز کرتے ہیں، کوئی تعجب کی بات نہیں صحبتِ ناجنس، عذابِ الیم ہے،

ایک دن خبر ملی کہ مولانا جدہ کے لئے روانہ ہوگئے، مجھے بھی حکم ہوا کہ جدہ جاؤ جہاز تیار ہے، روانہ ہوگیا، مدینہ منورہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر دیکھا کہ کئی لاریاں بالو میں دھنسی ہوئی ہیں — کئی دنوں سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی کہ سونچ تک سڑکوں پر بڑے بڑے گڈھے پڑ گئے تھے، اور بھاری لاریوں کا گذرنا سخت دشوار ہوگیا تھا، حجاج کرام کو لاریوں سے اتر کر ڈرائیوروں کی ہدایت کے مطابق اپنی اپنی متعلقہ لاریوں کو ٹھیلنا پڑا، اس کام میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے، لاریوں کے پھنسنے چلنے، اور پھر رک جانے کا سلسلہ رابغ تک رہا، رابغ پہنچکر اطلاع ملی کہ مکہ مکرمہ کے قریب تک ایسا ہی راستہ ہے، اس لئے حکومت کا حکم ہے کہ پانچ چھ دنوں تک حجاج کرام رابغ ہی میں رہیں اور راستہ کے خشک ہو جانے اور بنجانے کا انتظار کریں، اس لئے چھ سات دن چھ سات سو حجاج رابغ ہی میں ٹھہرے رہے رابغ کے قیام کے دوران میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اکثر مسجد جاتے وقت یا مسجد سے لوٹتے وقت ملاقات ہو جاتی، ایک دو بار گفتگو کا موقع بھی ملا، رابغ میں دو مسجدیں ہم لوگوں نے دیکھیں، ایک منزل سے بہت قریب اور ایک بڑی مسجد منزل سے دو تین فرلانگ کے فاصلہ پر، مگر ان دونوں مسجدوں میں سے کسی میں بھی وہ سامان نہ تھا جس کے دیکھنے اور استعمال کرنے کے ہم ہندوستانی عادی ہوگئے ہیں، ایک مسجد میں تو چراغ وغیرہ قسم کی کوئی چیز بھی نہ تھی، نمازی اندھیرے میں نماز ادا کرتے تھے، بمبئی کے ایک بوہرے تاجر ظروف شیشہ کو توفیق ہوئی، انھوں نے لالٹین کا سامان کر دیا، جزاک اللہ فی الدارین خیرا، ایک روز مسجد سے واپس آرہا تھا کہ مولانا سے گفتگو کا موقع ملا، عرض کیا بڑے افسوس کی بات ہے مسلمانوں کا کثیر حجاج ابرار اس راہ سے گذرتے رہتے ہیں، مگر یہاں کی مسجدیں شکستہ حال ہیں، نہ وضو کا سامان ہے، اور نہ جانمازیں قرینہ کی ہیں، صرف دو چار گرد آلود چٹائیاں بچھی ہوئی ہیں، فرمانے لگے، — حالت تو ظاہر ہی ہے، مگر اس پر رائے زنی وہی کرے جو صاحب اختیار بھی ہو، اور دانائے اصول سیاست بھی، ایک دن میں نے عرض کیا، بیچارے عرب اب تک بہت مفلوک الحال نظر آتے ہیں، حالانکہ کہا جاتا ہے کہ یہ دیار محبوب خدا

او خداوند کریم کے محبوب ترین ممالک مین ہے، کاش امریکہ کی دولت کا کچھ حصہ ان لوگون کو بھی مل جاتا ـــ

ارشاد ہوا ـــ دنیا دارون خصوصًا غیر مسلمون کی ترقی پر رشک کرنا حکمتِ الٰہی سے ناواقفیت کا ثبوت ہے،

ایک روز مین نے کہا مسجد نبوی مین بعض لوگ اماموں کے پیچھے نماز نہین اداکرتے تھے بلکہ جب نماز جماعت ہو جاتی

تو اپنی ٹولی الگ بناکر نماز پڑھتے تھے، ارشاد ہوا ـــ ہو سکتا ہے، بیدل صاحب اب مذہب تو نہ رہا

مذہب کے جھگڑے رہ گئے، غرض جب تک رابغ مین قیام رہا، اور جب جب موقع ملا، سید صاحب رحمۃ اللہ

علیہ سے مختلف سوالات بہ نظر استفادہ کرتا رہا، اور ہمیشہ تشفی بخش جواب ملا، جب رابغ مین ٹھہرے ہوے

کئی دن ہوگئے، اور دل گھبرانے لگا تو ایک دن سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضور کہ مکرمہ اور

مدینہ منورہ کے بجاے بندرگاہ رابغ مین ہم لوگون کے ٹھہرانے مین کیا مصلحتِ خداوندی ہے، ـــ فرمایا

ـــ دعوی عبودیت کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے، سبق یہ دیا جا رہا ہے، کہ اپنی خواہش کو مرضی مولا

کے تابع بنانے کی عادت ڈالو،

(۳)

رابغ سے روانہ ہوکر جدہ پہنچا، جدہ مین سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے صرف دو بار عبدالمجید صاحب

حریری قونصل جنرل ہند کے آفس مین ملاقات ہوئی، کسی خاص قابلِ ذکر گفتگو کا موقع نہ ملا، صرف ایک دن

دوران گفتگو مین ایک جملہ کہہ گئے جس کا مفہوم مین نہین سمجھا ـــ قونصل صاحب ایک شخص کو کہہ رہے

تھے کہ آپنے لڑکپن کیا" مولانا نے کہا" لڑکپن نہین کیا جوانی کیا" بعد کو معلوم ہوا، کہ وہ حضرت کسی عرب

دوشیزہ سے محبت کرنے کے جرم مین ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے تھے، اسی نشست مین ایک جملہ اور

بھی ارشاد ہوا کہ ـــ سوچئے تو قونصل خانہ مین خاص قسم کے لوگون کا تقرر ہوا کرے تو زیادہ مفید ہو" معلوم

نہین اس سے کس کی طرف اشارہ تھا، اور کیا مطلب تھا،

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی شام کو عبدالمجید صاحب قونصل جنرل ہند سے ملنے گیا، تو انھون نے کہا کہ

خسرو جہاز کل بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا ہے چونکہ بمبئی سے جدہ آتے وقت آپ ہی امیر الحاج تھے، اس لئے ہم لوگ آپ ہی کو پھر امیر الحاج بنانا چاہتے تھے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی صاحب بھی اسی جہاز سے تشریف لیجا رہے ہیں اس لئے اُن کی موجودگی میں کسی دوسرے کو امیر الحاج بنانا سخت گستاخی ہے، میں نے بھی کہا کہ ان کے ہوتے ہوئے، کوئی بھی امیر الحاج ہونا پسند نہیں کرے گا،

۵ ردسمبر کو جب میں جہاز پر سوار ہو گیا، تو ظفر جمیل صاحب قونصل جنرل کے سکریٹری تشریف لائے اور مجھ سے کہا کہ مولانا (سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں، کہ بیدل صاحب کی موجودگی میں ہرگز یہ عہدہ قبول نہ کروں گا، میں نے جب بہت اصرار کیا، تو فرمایا میں اسی شرط پر امیر الحاج کہلائے جانے پر راضی ہو سکتا ہوں کہ عملاً آپ ہی اس خدمت کو انجام دیں، اور کپتان کے ساتھ ہر روز گشت میں بھی آپ چلیں تاکہ لوگوں کو معلوم رہے کہ آپ امیر الحاج کا کام کر رہے ہیں، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انکسار و خاکساری کا اس سے بہتر نقشہ اس سفر میں مجھے نظر نہ آیا، جہاز پر سوار ہونے کے چند دن بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار آ گیا، اور بمبئی پہنچنے کے بعد تک صحت نہ ہوئی، خسرو جہاز ۲۹ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی پہنچا، اتنی دیر میں پہنچنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اکثر گودیوں میں ٹھہرتا ہوا آیا تھا، مدت سفر طویل تھی، اس لئے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اکثر انتفاع و استفادہ کی خاطر حاضر ہوا کرتا تھا، وہ خود بھی ازراہ نوازش اکثر مجھے اپنے کیبن ہی میں بلا لیتے تھے، ایک روز سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بخار زیادہ تھا، اور طبیعت بے چین تھی میں نے جہاز کے ڈاکٹر کو خبر دی، مگر وہ گھنٹوں کے بعد آیا، جب میں جہاز کی رپورٹ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے لکھ کر لے گیا، اور سید صاحب کو ترجمہ کر کے سنانے لگا، تو سید صاحب نے فرمایا کہ ـــــ پڑھئے میں سمجھتا ہوں، ـــــ اس کے بعد فرمایا ـــــ رپورٹ بہت خوب ہے، مگر ڈاکٹر کی شکایت والا جملہ نکال دیجئے، اور عملہ کی کارگزاری کی تعریف میں دو جملے اور بڑھا دیجئے، میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر کی بے پروائی، اور سخت کلامی سے اکثر مریض ناراض ہیں، اور مجھ سے ان کے خلاف شکایات

کی ہے فرمایا:

"آپ اس کی شکایت نہ کیجئے ممکن ہے سمجھ آجائے گی، اور مسلمان بھی تو ہے"

جہاز پر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب تک اچھے رہے بعد نماز عصر کیبن سے باہر عرشہ پر آکر ادھر ادھر ٹہلتے، یا دیر تک کھڑے ہوئے سمندر کا نظارہ کرتے رہتے، میں بھی معمولاً اس وقت حاضر خدمت ہو جاتا، چونکہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ ان کا مخاطب نہ مولوی ہے نہ مولانا، نہ عالم ہے نہ عارف نہ مورخ ہے، نہ مفسر، بلکہ صرف اردو کا شاعر ہے، اور کبھی فارسی کا پروفیسر تھا، اس لئے جب وہ خود سلسلۂ گفتگو شروع کرتے، تو فرماتے ــــ بیدل صاحب کچھ پڑھیئے، ــــ عرض کرتا کہ کالج کے مشاعروں میں لڑکوں کی خاطر غزل لکھتا بھی ہوں اور پڑھتا بھی ہوں، مگر کالج کے مشاعرہ سے باہر شعر سنانے سے پرہیز کرتا ہوں، اسی لئے اشعار بھی یاد نہیں ہیں، ــــ اس کے بعد عرض کرتا ــــ شاید کہ آپ بھی تو شعر کہتے ہیں، کچھ اشعار یاد ہوں تو ارشاد فرمایا جائے، میری درخواست پر اکثر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نظمیں اور غزلیں مجھے سنائیں، میں نے عرض کیا اگر یہ اشعار لکھوا دیے جائیں تو میں انھیں اپنے رسالہ (معاصر) میں چھاپ دوں۔ پہلے تو مسکرا کر فرمایا، "اس کی اجازت نہیں" مگر جب میں نے بہت اصرار کیا، تو فرمایا ــــ سلمان سے کہئے وہ یہ اشعار لکھ کر آپ کو دیدیں گے، میں نے سلمان سے کہا، انھوں نے جو نظمیں مجھ کو دیں، ان میں سے حسب ذیل نعت جس کا عنوان ہے "گلہائے عقیدت" معاصر بابت نومبر دسمبر ۱۹۴۹ء میں چھاپ دی،

مکی، مدنی، ہاشمی و مطلبی ہے	آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سماجنت و فردوس	آرام گہ پاک رسول عربی ہے
کیا شان ہے اللہ ری محبوب نبی کی	محبوب خدا ہو وہ جو محبوب نبی ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابر کرم آج	جو آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ　　بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے

آہستہ قدم، نیچی نگہ، پست صدا ہو

خوابیدہ یہاں روح رسول عربی ہے

یاد نہیں کہ اُن کے علاوہ دوسرے اشعار کہاں رکھ دیئے، پھر جب دوبارہ سلمان سلمہ کو لکھا تو کوئی جواب نہیں ملا،

دوران سفر میں مولانا کا وقت اوراد و وظائف یا تبلیغ و تفہیم مسائل میں صرف ہوتا تھا، مجھے دیکھکر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا بیان مسائل میں "مصلحت وقت" اور اظہار حقیقت میں کسی شخصیت کا کوئی خیال نہیں کرتے تھے جس چیز کو جو سمجھا، اس کو کہہ دیا، ایک روز مجھ سے حاجیوں نے فرمایش کی کہ مجلس میلاد شریف منعقد کرنے کا ارادہ ہے، ۔۔۔ آپ مولانا صاحب کو راضی کر دیجئے کہ وہ بیان فرمائیں، میں نے کہا ۔۔ کوشش کروں گا، ۔۔۔ مگر شاید ہی کامیابی ہو، ۔۔۔ لوگوں نے نہ مانا اور میں سید صاحب کو مجلس میلاد النبی میں لے آیا، اور میلاد پڑھنے کی درخواست کی، انھوں نے مختصر سی تمہید کے بعد وعظ دینا شروع کر دیا، تقریر میں بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ اگر مجلس میلاد آپ اظہار محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے کے طریقوں کا ذکر کرنے کے لئے منعقد کرتے ہیں، تو آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ طریقۂ اظہار محبت غلط ہے جس کا پسندیدہ ہونا خود حضور سرور کائنات یا صحابۂ کرام سے ثابت نہیں ہے، جو شخص محبت رسول اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کو چاہیئے کہ ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور منشار کا لحاظ رکھے، صرف اسی حال میں انکی محبت اصلی معنوں میں محبت ہوگی، رسول اللہ سے محبت کرنے کا واحد اور شرعی طریقہ رسول کا اتباع کامل ہے، سن لیجئے کہ رسول سے جس قدر محبت بڑھتی ہے، اسی قدر اللہ کے محبوب رسول کریم کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کا شوق بڑھتا ہے، ۔۔ اسی طرح کی باتیں کہنے کے بعد سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائیے

اور مجلس میلاد ختم ہو گئی،

سفر میں عموماً اور سفر حج میں خصوصاً لوگوں کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، مگر میں نے دیکھا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حاجیوں کی بیجا حرکتوں، غلط شکایتوں اور احتجاجی فقروں کے باوجود کبھی غصہ نہ آیا، بلکہ جب کبھی میں تند و تیز لہجہ میں جواب دیتا، تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ آہستہ سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرماتے

"سراپا محبت و عنایت والے کے دربار سے ابھی نہ آپ آرہے ہیں"

مقلد کے کچھ عرب جہاز پر ساتھ تھے، اور اپنی سیٹ کے پاس ہی کھانا پکاتے تھے، جہاز پر اسٹوو جلا کر کھانا پکانا منع ہے، مگر وہ نہ کپتان کا حکم مانتے تھے اور نہ میری ڈانٹ سنتے تھے، میں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا ـــ آپ ان لوگوں کو ڈانٹئے اور کہہ دیجئے کہ اگر کپتان کا حکم نہیں مانیں گے، تو سزا کردی جائے گی، ـــ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آپ جو کہتے ہیں، وہ تو نہ کہوں گا، مگر سمجھا دوں گا، غالباً مان جائیں گے، ـــ چنانچہ میرے ساتھ ان عربوں کے پاس تشریف لے گئے، اور دو چار جملے عربی میں نہایت نرمی اور محبت سے ان سے کہے، کہنا تھا کہ اُن لوگوں نے اسٹوو گل کر دیا، اور کھانا پکانے کا سامان اس جگہ سے اٹھا لے گئے، جہاں جانے سے پہلے وہ انکار کر چکے تھے، میں نے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ کی زبان میں بلا کا اثر ہے، ـــ ارشاد ہوا کہ ـــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی پر غصہ نہیں فرمایا، ہم لوگوں پر اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرض ہے، درشتی و نرمی دونوں مفید ہیں، مگر نرمی زیادہ کارآمد ہے،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود سے کوئی دینی، شرعی یا تاریخی مسئلہ نہیں چھیڑتے تھے، جب میں خود کچھ پوچھتا تو مختصر الفاظ میں جواب باصواب دیدیتے، اور زیادہ تفصیلی گفتگو نہ فرماتے، ـــ ایک دن میں نے عرض کیا ـــ حج کے مقبول ہونے کی کوئی ایسی علامت بھی ہے جو ہم عامیوں کی سمجھ میں آجائے، فرمایا ـــ اگر آپ کی زندگی کا لاحق دور سابق سے بہتر ہو جائے تو سمجھئے کہ حج مقبول ہو گیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تحمل کی داد دینی پڑتی ہے میں دینی علوم سے ناواقف ہوں، اکثر ان سے عامیانہ گفتگو اور مہمل سوالات کرتا، غیر مفید نزاعی مسائل چھیڑتا، مگر کبھی بھی سید صاحب رحمۃ اللہ کے ماتھے پر شکن نہ آتی مہمل سوالوں کے پوچھنے پر مجھے کبھی نہیں جھڑکا پیچیدہ سیاسی مسائل بھی بحث میں لے آتا مگر سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہایت نرمی اور محبت سے میری تشفی کرنے کی کوشش فرماتے ایک روز شاہ حجاز کی روز افزوں دولت اور عرب تاجروں کے آرائش و آسائش کے سامانوں کی فراوانی پر اظہارِ مسرت کرکے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے خیال کی تائید چاہتا تھا — کہنے لگے، — بیشک دولت نعمت ہے، اور خداوند کریم کی نعمتوں میں ایک بڑی نعمت ہے اگر اس دور میں دولت کے دور کے بُرے نتائج کی تلافی و تدارک کا امکان بہت دشوار ہے، مولانا کے سیاسی شعور کی بلندیوں تک پہنچنا میرے لئے ناممکن ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان و پاکستان کے غیر دانشمندانہ تعلقات پر گفتگو کی، عربوں کی امریکہ نوازی پر رائے زنی کی، بھارت کے مسلمانوں کی بدحالی کے اسباب بیان کئے، ان مسائل کو میں بڑے بڑے لیڈروں کی توضیح و تفصیل کے بعد بھی نہ سمجھا تھا، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح سے پوری طرح سمجھ میں آگئے، اور کشفِ صدر ہو کر اطمینان ہو گیا، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر صحبت سے برسوں کی الجھن دور ہو گئی، غرض بمبئی پہنچنے تک مولانا کی تعلیمات سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا، مگر ایک تمنائے دیرینہ پوری نہ ہوئی، — ایک دن جو چشمِ کرم اپنی طرف دیکھی تو عرض کیا،

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

مسکرا کر رہ گئے اور کوئی جواب نہ دیا، صاحبِ نظر تھے، سمجھ گئے ہونگے، کہ کثرتِ گناہ سے وعظ و نصیحت کے قبول کی استعداد ہی ضائع ہو گئی ہے، سچ ہے

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل کہ خضر از آبِ حیوان تشنہ می آرد سکندر را

جب جہاز بندرگاہ میں پہنچ گیا تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہونے کے لئے اُن کی کیبن میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ جس کتابچہ کا نام آپ نے "اقوالِ اشرف" تجویز فرمایا ہے، اس کی تزئین کے لئے سوانحِ حیات محی الملت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھکر بھیجدیئے جائیں ——— ارشاد ہوا کہ انشاء اللہ تعالیٰ بہ شرطِ یاد ضرور بھیج دوں گا، آپ تصنیفات حکیم الامت کا مطالعہ جاری رکھیئے، اچھا شوق ہے، تھوڑے دنوں کے بعد یاد دہانی کی تو سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کراچی سے سوانحِ حیات لکھ کر میرے پاس بھیج دیئے، اور میں نے اقوالِ اشرف میں اُسے شامل کر دیا،

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رخصت ہوتے وقت درخواست کی کہ میرے حالِ زار و زبوں کے پیشِ نظر مجھ پر خاص توجہ فرمائی جائے، اور عرض کیا کہ

خورشید عمر بر سرِ دیوار و خفتہ ایم   فریاد از درازیِ خوابِ گرانِ ما

جواب ملا ——— جد و جہد جاری رہے، سعی محمود ہمیشہ مشکور ہوتی ہے، اس کے بعد حکم ہوا کہ ——— جائیے، سامان کی نگرانی کیجئے، سلام عرض کیا اور چلا آیا،

ع حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

از

جناب مالک رام صاحب ایم۔اے

آج سے رُبع صدی قبل کم و بیش ۱۹۲۹ء کی بات ہے، یاد بخیر، میری طالب علمی کا زمانہ تھا، میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتا تھا، جب علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" وہاں پہنچی، چونکہ موضوع میرے مذاق کے مطابق تھا، میں نے اسے شوق کے ہاتھوں لیا، اور عقیدت کی نظر سے پڑھا، اور جب پڑھ چکنے کے بعد کتاب ہاتھ سے رکھی، تو اس حسرت کے ساتھ کہ کاش یہ ابھی اور لمبی ہوتی، کتاب کی خوبی اور مصنف کی کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جا سکتا ہے، جب معلوم ہو کہ یہ آج تک اردو ہی میں نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی اپنے موضوع پر اکیلی کتاب ہے لیکن مجھے یہاں اس کتاب پر تبصرہ لکھنا منظور نہیں،

اس میں مصنف مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ لکھنے والوں نے جتنی توجہ فارسی ماخذوں پر کی ہے، اتنی ہی عربی سفرناموں اور تاریخ و جغرافیہ کی کتابوں سے بے اعتنائی برتی ہے، حالانکہ یہ قیمتی معلومات کا خزانہ ہیں، اور اُن سے کما حقہٗ استفادہ کئے بغیر ہمارے ملک کی تاریخ مکمل ہو ہی نہیں سکتی،

خدا انہیں خوش رکھے، میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست فیروز دین صاحب تھے، خدا معلوم

آج کل کہاں ہیں، میری عربی کی واقفیت تو شد بد سے زیادہ نہیں تھی لیکن وہ کم از کم مجھ سے زیادہ جانتے تھے، بی اے میں ان کا اختیاری مضمون عربی رہا تھا، ہم دونوں نے مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو یہ کام ضرور کرنا چاہئے، ارادہ یہ تھا کہ جس طرح ایلیٹ نے مختلف فارسی تاریخوں کے متعلقہ حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے، اسی طرح عربی ماخذوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے، چنانچہ میں نے ایک خط مرحوم کی خدمت میں لکھا کہ میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، اور یہ ہمارا ارادہ ہے۔ مہربانی ہوگی اگر اس معاملے میں ہمیں اپنی رہنمائی سے مستفید کریں، اور سب سے پہلی یہ بات کہ ان کتابوں کی فہرست لکھیں، جو آپکے خیال میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں، فوراً جواب آیا، اس میں بیس ایک کتابوں کی فہرست تھی، اس پر میں بازار سے بلاذری کی فتوح البلدان کا ایک نسخہ خرید لایا، اور ہم نے اس کے ہندوستان سے متعلق حصے کا ترجمہ شروع کر دیا، اسی دوران میں سلیمان تاجر کا سفرنامہ جو نسبتہً مختصر چیز ہے، میرے ہاتھ لگ گیا، اور میں نے جلدی سے اس کا ترجمہ بھی کر ڈالا لیکن افسوس کہ یہ مفید کام ہماری خواہش کے مطابق جاری نہ رہ سکا، پہلے تو ہماری تعلیمی مشغولیتوں کے باعث یہ بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا، پھر جب تعلیم سے فارغ ہوئے، تو غم روزگار نے وہ رہی سہی عافیت بھی نہ چھوڑی، وہ جگ ٹوٹ گیا، بھٹی صاحب کہیں اور میں کہیں، اور اس کے بعد آج تک اس موضوع کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا،

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن حسرتوں کے گنوانے سے فائدہ، ان کی فہرست بہت طولانی ہے، یہاں اس حکایت کے بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا کہ مرحوم سے میری واقفیت کی تقریب کیسے پیدا ہوئی، بہرحال اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوگیا،

سنہ ۱۹۳۶ء میں جناب امداد صابری صاحب دہلوی نے ایک رسالہ علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی

غلطیاں چھاپا ہیں ان دنوں دہلی میں تھا، ایک دن میں جناب نواب سراج الدین احمد خان سائل مرحوم کے مکان پر گیا، تو یہ رسالہ اُن کی بیٹھک میں پڑا مل گیا، میں اسے اٹھا لایا، اب یہ اتنے دن کی بات ہے کہ یقینی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا، تاہم اتنا یاد پڑتا ہے کہ اس میں سیرۃ النبی میں نقل کردہ آیات قرآنی کے ترجموں کی بعض غلطیاں مصنف نے اپنے نزدیک دکھائی تھیں، مولانا نے غالباً دسمبر ۱۹۳۲ء کے معارف کے شذرات میں اس کا اس طرح جائزہ لیا، جس سے مترشح ہوتا تھا کہ اُن کے خیال میں یہ رسالہ نہ صرف جناب امداد صابری نے کسی اور صاحب کے کہنے پر لکھا ہے، بلکہ یہ غالباً ان کا لکھا ہوا بھی نہیں ہے، اور انھوں نے کسی اور سے لکھوا کے اسے اپنے نام سے شائع کر دیا ہے، اس پر صابری صاحب نے ازالہ حیثیت عرفی اور ہتک عزت کے ہرجانے کا دعوی کر دیا،

مرحوم سے میری پہلی ملاقات اسی سلسلہ میں ہوئی، وہ اس مقدمے میں پیشی کے لئے دہلی آئے، تو حسب معمول جامعہ ملیہ (قرول باغ) میں بھی تشریف لائے، ان دنوں میرا بھی اسی قرب وجوار میں قیام تھا، یہیں ایک شام میں بھائی حامد علی خان صاحب کے مکان پر اُن سے ملا، نسبتہً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ، بڑی بڑی تیز آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک، جو پھننگ کے قریب قدرے موٹی ہوگئی تھی، "قصّ الشارب و اعفاء اللحی" کا مصداق چھوٹی لبیں، اور گھنی کھچڑی سی داڑھی، جو بہت لمبی نہیں تھی، اور جس میں سپید بال زیادہ تھے، اور سیاہ کم، صاف ستھرا، کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ جس کی دائیں طرف کی جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی، اور دوسری طرف لکھنے کا قلم نظر آرہا تھا، نیچے سپید پاجامہ، اور سر پر عمامہ، جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اڑس رکھا تھا، یہ تھا اُن کا حلیہ، میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں، اور اُن کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے،

جب مجھے اس مقدمے کی روداد معلوم ہوئی، تو میں نے پیشکش کی کہ اگر اجازت ہو تو میں نواب سائل صاحب کے ذریعہ صلح صفائی کی کوشش کروں، اس پر انھوں نے رضامندی کا اظہار کیا، میں نے

نواب صاحب مرحوم سے مل کر طے کیا کہ صابری صاحب سے ملنا چاہیئے لیکن اگلی صبح اُن کے ہاں جانے سے پہلے، مین پھر مرحوم کی خدمت مین حاضر ہوا، اور اُن سے دریافت کیا کہ آپ کن شرائط پر صلح کرنے کو تیار ہون گے، کیونکہ مین نے خیال کیا کہ فریق ثانی سے بات چیت کرنے سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ مین اُن کی طرف سے کس حد تک جانے کا مجاز ہون،

جاڑون کے دن تھے، مین یہی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح کے وقت اُن کے پاس پہنچا، وہ جناب سید مرتضیٰ علی صاحب کے مکان پر اُترے ہوئے تھے، جب مین نے اطلاع کرائی ہے، تو وہ ناشتہ کرکے باہر برآمدے مین تشریف لا چکے تھے، بہت لطف اور مہربانی سے پیش آئے، علیک سلیک کے بعد پہلے میرے متعلق دو چار باتین ہوئین، لیکن چونکہ وقت تنگ تھا، اس لئے مین زیادہ دیر ٹھہر نہین سکا، میرے پوچھنے پر فرمایا کہ یہ مقدمہ محض غلط فہمی کی بنا پر دائر کیا گیا ہے، مین نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے ہرگز میرا یہ منشا نہین تھا کہ کسی طرح جناب امداد صابری صاحب کی ہتک یا دل شکنی ہو، وہ اگر مقدمہ واپس لے لین، تو مین مناسب الفاظ معارف مین شائع کردون گا، تاکہ ان کا ملال دور ہو جائے، خود مجھے بھی یقین تھا کہ معارف کے بناسے دعویٰ شذرات سے صابری صاحب کی مخالفت مقصود نہین تھی، بلکہ مرحوم اس سے صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ

ع کوئی مشوق ہے اس پردۂ زنگاری مین

بہرحال اس وقت انھون نے جو کچھ مجھ سے کہا، اس سے میرا اطمینان ہو گیا، اور اس کے بعد سائل صاحب اور مین دہلی کے پاس پہنچے،

بقیہ حالات سب کو معلوم ہی ہین، فریقین نے راضی نامہ داخل کر دیا، اور مقدمہ واپس لے لیا گیا، مجھے اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس بہانہ میرا گذشتہ چھ سات برس کا غائبانہ تعلق، ذاتی واقفیت مین تبدیل ہو گیا، اور اب خط و کتابت مین بھی زیادہ بے تکلفی پیدا ہو گئی،

اس کے کچھ دن بعد میں نے عورت اور اسلامی تعلیم لکھی یہ اتنی بڑی جسارت تھی کہ میں آج بھی بعض اوقات اپنے آپ پر تعجب کرتا ہوں، موضوع نہ صرف اسلامی، بلکہ خالص علمی اور فقہی بھی، مجھے بجا طور پر اندیشہ تھا کہ کم کم عامۃ المسلمین اسے دخل در معقولات سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے لیکن لکھ ڈالنے کے بعد اُسے ضائع کرنا بھی مشکل تھا، میں نے سوچا کہ اس خسارے کے سودے میں نفع حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہو کہ اُسے چھپوا کر بیچا جائے، چنانچہ میں نے اُن سے ایک تو اس پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی، اور دوسرے مقدمہ لکھنے کی، انھوں نے کہا کہ میں وعدہ نہیں کرتا، مضمون بھیج دیں، تو دیکھ کر بتاؤں، جب مسودہ ان کے پاس پہنچا، تو انھوں نے میری توقع سے بہت زیادہ اس کی تعریف فرمائی لیکن اتنا اضافہ کیا کہ مجھے تمھارے بعض خیالات سے اختلاف ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت میں مقدمہ لکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، انھوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ انھیں کون سے مقامات پر مجھ سے اختلاف ہے، جب میں نے پوچھا تو فرمایا کہ لکھنے میں خواہ مخواہ طوالت ہو جائے گی، کبھی موقع ملے تو ذاتی ملاقات کے ذریعہ انھیں دور کیا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ مجھے یونہی سا خیال ہوتا ہے کہ انھیں یہ بھی شبہہ تھا کہ میں نے اسے دہلی کے ایک مشہور اہل قرآن عالم سے مشورہ کرنے کے بعد لکھا ہے، حالانکہ یہ ٹھیک نہیں میں نے جو کچھ لکھا تھا بالکل اپنے ذاتی مطالعہ کے نتیجے میں لکھا تھا، بہر حال چونکہ اس کے تھوڑی مدت بعد میں ملک سے باہر چلا گیا، اس لئے معاملہ وہیں پر ختم ہو گیا، نہ میں اُن سے مل سکا، نہ اس گفتگو کی نوبت آئی، یہ مسودہ بہت دن تک اُن کے پاس پڑا رہا، اور آخر انھوں نے اُسے ۱۹۴۶ء میں میرے ایک دوست کے پاس لاہور بھیج دیا،

اس دوران میں خود مجھے بھی غور و فکر کا موقع ملا، پہلے میں نے پردہ کی بحث میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ منہ چھپانا، اسلامی پردے میں شامل نہیں، لیکن بعد میں مزید مطالعے اور قرآن و حدیث پر زیادہ وقتِ نظر سے غور کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ منہ بھی اس حکم میں شامل ہے، اور بھی دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ میں نے نہ صرف یہ مقام ہی بدل ڈالے، بلکہ پورا مضمون نئے سرے سے دوبارہ

اُسے شائع کر دیا جب یہ مطبوعہ نسخہ ان کی خدمت میں پہنچا، تو انھوں نے اُس کی تعریف فرمائی،

اس تمام زمانے میں میری ان سے خط و کتابت رہی، وہ خط لکھنے میں فراشست تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دیر سویر انھوں نے خط کا جواب نہ دیا ہو، مجھے اپنی ہیچ میرزی اور ہیچ مدانی کا پورا احساس رہا لیکن جانے کیوں، اس کے باوجود میں بزرگوں کی خدمت میں ہمیشہ سے بہت بے باک رہا ہوں، اور کبھی الٹی سیدھی بات کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتا، پھر اس پر بھی خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اس پر طرح دیتے ہیں اور چشم نمائی کی جگہ چشم پوشی فرماتے ہیں، حضرت علامہ مرحوم سے بھی میرا رویہ کچھ اس سے مختلف نہیں تھا، میں اُن کی خدمت میں بھی گستاخ تھا، جو جی میں آتی، بے جھجک لکھ دیتا، لیکن یہ اُن کی ذرہ نوازی تھی کہ وہ کبھی ماتھے پر بل نہیں لائے، لطف فرماتے، میرے لکھے سے درگذر کرتے، اور جواب دیتے،

افسوس کہ ان کے تمام مکاتیب محفوظ نہیں رہے، تقسیم کے پہلے کے بیشتر خطوط لاہور میں رہ گئے، کچھ میرے مختلف ممالک کے سفروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے ہوئے کھو گئے، گذشتہ چند برس میں جو خط آئے تھے، ان میں سے جو اس وقت میرے پاس موجود ہیں، انھیں ضمیمہ میں درج کر رہا ہوں تاکہ کم از کم یہ ضائع ہونے سے بچ جائیں[1] بعض جگہ تلمیح کو واضح کرنے کے لئے میں نے حاشیہ میں چند لفظ لکھ دیئے ہیں،

اردو میں مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں کی کمی نہیں رہی، اُن میں سے بعض حضرات کی مصنفات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے لیکن اس کے باوجود اردو زبان کی تاریخ میں کہیں ان کا نام نہیں ملتا، اس کے دو سبب ہیں، اوّل نفسِ موضوع، اور دوسرا سے پیش کرنے کا طریقہ، موضوع بالعموم عام لوگوں کی دلچسپی کا نہیں ہوتا، بنیادی مذہبی عقائد کو تو رہنے دیجئے، کہ ان میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں لیکن جہاں موضوع میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ اپنوں کے علاوہ بیگانوں کے لئے بھی قابلِ مطالعہ اور کشش کا باعث ہو سکتا تھا، وہاں بھی بہت کم ایسا اتفاق ہوا ہے کہ اُن میں سے کوئی کتاب زبان و بیان کے پہلو سے بھی معیاری رہی ہو، یہ اللہ والے لوگ اس بارے میں الّا ماشاء اللہ عموماً بے نیاز واقع ہوئے ہیں، مشکل اور نامانوس الفاظ، اور

[1] معارف: جگہ کی قلت کی وجہ سے یہ خطوط شائع نہیں کیے گئے،

ترکیبون کی بھرمار سے پڑھنے والے کا سر چکرانے لگتا ہے، غیر ضروری تکرار اور طول نویسی اس پر مستزاد، اور ان سب سے بڑھکر بیجا اقتباسات، اپنے طرزِ استدلال اور متقدمین کی ہر رطب و یابس تحریر کی صحت پر اصرار، غرض کہ ان سب باتون کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابین ایک خاص حلقے مین محدود ہو کے رہ گئین، اور عام پڑھے لکھے ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہ گئے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت مین علم و ادب کی تاریخ لکھنے والے ان کا ذکر کیون کرنے لگے تھے،

خدا مغفرت کرے مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی، سب سے پہلے انھون نے اس بھول بھلیان سے نکلنے کی راہ دکھلائی، انھون نے خالص مذہبی اور علمی مضمونون پر کتابین اور مقالے لکھے، اور ایسی دلکش اور شستہ و رفتہ زبان مین کہ اس مین شیر و شکر کی حلاوت محسوس ہونے لگی اور صرف یہی، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ اُن سے پہلے اُردو مین صحیح علمی تحقیق بھی تقریباً مفقود تھی، اس میدان مین بھی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے، انھون نے مختلف اسلامی اور تاریخی موضوعات پر اپنے زندۂ جاوید مضامین لکھے، ہر طرف سے اس بدعتِ حسنہ پر آفرین اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوا، اس سے دوسرے اصحابِ قلم کو بھی توجہ اور جرأت ہوئی، چنانچہ اُن کے زمانے مین بعض صاحب نے اُن کے تتبع مین کتابین لکھین، اور اُن کے بعد دوسرون کے علاوہ خود اُن کے تربیت یافتہ تلامذہ نے اس پر جو اضافہ کیا ہے وہ اردو کا مایۂ ناز سرمایہ ہے، اس گروہ مین علامہ مرحوم کی ذات رئیس الطائفہ کی حیثیت رکھتی تھی، اگر انھون نے اپنی عمر بھر مین صرف سیرۃ النبی ہی کی تکمیل کی ہوتی، تو یہی اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ تاریخ علم و ادب مین ان کا نام زندہ رکھنے کو کافی تھا، لیکن انھون نے اس کے علاوہ ہمین خطباتِ مدراس دیئے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بالکل اچھوتے انداز مین روشنی ڈالتے ہین، پھر انھون نے جو تحقیقی کتابین — ارض القرآن اور عرب و ہند کے تعلقات اور عربون کی جہازرانی — لکھی ہین، وہ ہماری زبان کی بہترین کتابون مین شمار ہونے کے لائق ہین، اسی طرح سوانحعمریون مین حیاتِ امام مالکؒ، سیرۃ عائشہؓ، خیام، حیاتِ شبلی اپنے اپنے موضوع پر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہین، حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر ان کی تعلیم بھی سراسر مذہبی تھی لیکن انھون نے اپنے مطالعہ کو اسی حد تک محدود نہین رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اسلوبِ فکر مین تنوع پیدا

ہو گیا، اور انھوں نے اپنے گرامی قدر استاد کی پیروی میں ہماری زبان کو اپنی گوناگوں تصنیفات سے مالا مال کر دیا، اُن کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، جغرافیہ، سیرت، ادب، تنقید، شعر، سفر نامہ، کوئی موضوع اُن کے افادات سے محروم نہیں رہا، ان میں سے ہر ایک پر انھوں نے معیاری کتابیں لکھی ہیں، جو نہ صرف معلومات کا خزانہ ہیں، بلکہ خیال انگیز بھی، اور مزید کام کرنے والوں کیلئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتی ہیں،

جو جگہ خالی ہوئی ہے، وہ تو اب خالی ہی رہے گی، اس سے پہلے کس کی پُر ہوئی ہے، جو اُن کی ہوگی، لیکن ان کے اخلاف اتنا تو کر سکتے ہیں، کہ جو شمع انھوں نے جلائی تھی، اگر وہ اس کی روشنی میں اضافہ نہیں کر سکتے، تو کم از کم اس میں جان لڑا دیں، کہ اس کی تابناکی میں کمی نہ آنے پائے، اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہوگا کہ اس بہانے ان کا اپنا نام زندۂ جاوید ہو جائے گا، ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہیں کہ اگر کوئی انھیں بھلانا بھی چاہے تو وہ بھلائے نہیں جا سکتے،

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

علالت سے وفات تک

علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب سید ابو عاصم صاحب ایڈوکیٹ کراچی

"یہ مضمون ریاض کراچی کے سلیمان نمبر میں شائع ہوا تھا، اُس کے بعض حصے حذف کرکے جن کا تعلق علالت و وفات کے حالات سے نہیں ہے نقل کیا جاتا ہے" "م"

دم سرد ہے آہ پر آہ ہے — تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں مجھے اطلاع ملی کہ چچا جان کی طبیعت ناساز ہے، سیدھا اعظم گڈھ پہنچا، بیچ کا کمرہ حسب قاعدہ فرش و قالین سے مزین ہے، مسہری پر چچا جان لیٹے ہیں، سب عزیز و اقارب پہنچ چکے تھے، مجھے دیکھا، مسکرا کر فرمایا،

ع کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

علالت کی نوعیت یہ معلوم ہوئی کہ سینہ میں شدید درد تھا جس نے کئی رات مسلسل سونے نہیں دیا، ڈاکٹر حفیظ صاحب کا علاج تھا، اُن کی تجویز تھی کہ قلبی شکایت ہے، فوراً ابھی جاکر علاج ہو مگر ڈاکٹر حفیظ صاحب کے علاج سے جب افاقہ ہوگیا تو مزید جانچ نہ ہو سکی،

اسی سال جاڑوں میں راقم کے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے، رات کا وقت تھا کہ یک بیک تنفس کی

تکلیف شروع ہوئی، مگر مالش وغیرہ سے فوراً ہی یہ تکلیف جاتی رہی، اُس کے بعد یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی، اور معمولی ہومیو پیتھی دواؤں سے چلی جاتی تھی، اس وقت اس کی تشخیص نہ ہو سکی کہ اس کی نوعیت کیا ہے، ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حلق کی خرابی ہے، اور سانس کی نالی میں بلغم پھنس جاتا ہے جس سے یہ تکلیف ہو جاتی ہے،

اتفاق سے اسی زمانہ میں بھوپال اور حیدرآباد سے بلانے کی گفتگو جاری تھی، حیدرآباد میں اگرچہ تنخواہ زیادہ تھی لیکن بھوپال سے ایک تو شعیب قریشی صاحب مدظلہ کا اصرار تھا، دوسری طرف بقول شعیب صاحب قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا لیکن تعلیم عربی کی اصلاح کی خدمت کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے، وہ بھوپال میں قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ احمدیہ کی حیثیت سے بلائے گئے تھے، اور بالآخر جولائی ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال تشریف لے گئے، اور ۱۹۴۹ء اکتوبر تک مسلسل اُن کا قیام وہاں رہا، اور صحت اچھی رہی، کچھ لوگوں کو اُن کے دارالمصنفین چھوڑنے پر اعتراض تھا، اُن کی مظلومیت کی یہ انتہا ہے کہ خود مظلوم مورد الزام بنایا جا رہا ہے، اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی کو بُرا کہنا تو بڑی بات ہے کسی کا نام بھی اپنی زبان پر آنے نہیں دیا،

ع کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستان میری

یوں تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے، لیکن اُن کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ وہ دونوں سفر سیاسی تھے، اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز میں ہندی مسلمانوں کے نمائندہ بن کر تشریف لے گئے تھے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لئے نہ تھے لیکن اللہ کے بندے اور رسول کے عاشق نے ان کے دربار میں صرف انہی کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی، چنانچہ ۱۹۴۹ء اکتوبر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے،

واپسی شاید دسمبر میں ہوئی، راستہ ہی میں طبیعت خراب ہو گئی، بمبئی میں دو دن تو صحت سے رگ بیٹھا

مہمان بنانے کے متمنی تھے، لیکن بمبئی کے مشہور مخیر تاجر بھائی عزیز صاحب کی بے پناہ محبت سب پر غالب آئی، کسی کو پہنچنے کا موقع دیئے بغیر وہ اُن کو کرسی پر بٹھا کر اٹھا لائے، اور اپنی گاڑی میں بٹھایا، اپنے گھر لے آئے جس خلوص محبت اور تن دہی سے انھوں نے تیمارداری کی ہے، حق یہ ہے کہ اس نے بہت سے قریبی عزیزوں کو بھی شرمندہ کر دیا، ان ڈاکٹروں کی تشخیص یہ ہوئی کہ دوسری شکایتوں کے ساتھ دل بھی بڑھ گیا ہے، لیکن انھوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ یہی کہا کہ اس عمر میں عموماً دل بڑھ جایا کرتا ہے،

اسی زمانہ میں پاکستان آنے کی خبر گرم ہو چکی تھی، ہندوستان کے متعدد اخبار لکھ رہے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہیں، حالانکہ حقیقت اس وقت صرف اس قدر تھی کہ یہاں سے دعوت ضرور دی گئی تھی، مگر انھوں نے اب تک قبول نہیں فرمائی تھی بلکہ پیشکش کی مزید تشریح چاہی تھی، وہ بستر پر بیمار تھے، لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اتنے میں ایک اخبار کے نامہ نگار صاحب تشریف لائے، اور انھوں نے سوال کیا کیا آپ پاکستان تشریف لیجا رہے ہیں؟ اسکے جواب میں انھوں نے صرف یہ شعر پڑھا،

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

نامہ نگار صاحب تو اسی شعر کا مزہ لیتے ہوئے رخصت ہو گئے، جب صحت ہو گئی تو وہ بھوپال تشریف لے گئے، وہاں سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ اعظم گڈھ اور کانپور میں چند مہینے قیام رہا،

میں ۱۹۴۹ء کے اوائل ہی میں کراچی آ گیا تھا اُن کے یہاں آنے سے پہلے ایک مرتبہ اُن کے پاس بھوپال اور والدہ کے انتقال پر وطن اور بھی گیا اُن کو پاکستان کا مشتاق اور دعا گو پایا، مگر آنے کے متعلق مجھے یقین نہیں تھا ۱۳ جون ۱۹۵۰ء کی صبح کو میں نے اخبار میں یک بیک یہ خبر پڑھی کہ چچا جان لاہور تشریف لے آئے ہیں، اور ۱۴ جون کو کراچی تشریف لانے والے ہیں، ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے، اور ان کو ڈاکٹر منزل لائے، ڈاکٹر منزل خواجہ شہاب الدین جو ان دنوں وزیر داخلہ تھے، اُن کی عنایت خاص کی وجہ سے مجھے پہلے ہی مل چکا تھا، وہ ایک

خاص ورود کے ساتھ تشریف لائے تھے، اُن کی گفتگو میں کتنی امید اور کتنی آرزو جھلکتی تھی،

ڈار منزل جہانگیر روڈ کی ایک شاخ ٹمپن اسٹریٹ پر واقع ہے، یہ ایک پچھم رُخ کا مکان ہے پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے پندرہ فٹ بے آب وگیاہ میدان ہے، اس کے بعد ۱۰ فٹ کا پختہ صحن ہے، اسی سے ملحق تین کمرے سڑک کے رُخ پر ایک سلسلہ سے ہیں، پھاٹک کے سامنے کا کمرہ ملاقات کے لئے مقرر ہوا، اس کے بعد بیچ کا کمرہ اُن کی خوابگاہ بنا، اور آخری کمرہ میں میرا قیام تھا، ملفتن کوارٹرز کے پاس ایک مسجد تھی، لوگوں نے اس کا نام جامع مسجد سلیمانیہ رکھنا چاہا، انھوں نے اس کو ناپسند کیا لیکن لوگ نہ مانے، آخر وہ اسی نام سے مشہور ہوگئی، وہاں روز صبح بعد نماز درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اس مرتبہ میں نے ایک بات یہ دیکھی کہ تنفس کا دورہ عموماً رات کو کبھی کبھی پڑجاتا تھا، ہومیوپیتھی دوا سے فوراً سکون بھی ہوجاتا تھا، یہ تکلیف کھانے کے بعد تقریر کرنے یا کوئی حرکت کرنے سے ہوجاتی تھی، اس لئے ڈاکٹر کا خیال تھا کہ یہ تکلیف ریاح اور سوء ہضم کا فساد ہے، اسی لئے ساری توجہ ریاح اور اصلاح معدہ کی طرف رہی،

ایک مرتبہ مسجد سلیمانیہ میں درس دے رہے تھے، اسی دوران میں اُن کی آواز مدھم ہوتی گئی، اور انھوں نے گردن جھکالی، فوراً لوگوں نے پکڑلیا، اور اٹھاکر گاڑی پر گھر لائے، اور ڈاکٹر میجر حسن کو ٹیلیفون کیا، میجر حسن فوراً تشریف لائے، لوگوں کو خیال ہوا کہ فالج کا حملہ تھا، میجر حسن صاحب نے معائنہ فرمایا، سب سے پہلے خون کا دباؤ دیکھا، وہ بجائے زیادہ ہونے کے معمول سے بھی کم تھا جس سے اس خیال کی تردید ہوئی، تلوؤں میں تھوڑی سی بے حسی ضرور تھی، چچا جان کو شدت سے انکار تھا کہ ان پر کسی قسم کا حملہ تھا، وہ کہتے تھے رات کو نیند نہیں آئی تھی، اسی لئے آنکھ لگ گئی تھی، بہرحال احتیاطی طور پر میجر صاحب نے انجکشن دینے شروع کئے، انھوں نے بڑی محبت خلوص اور شرافت کا ثبوت دیا، جب میں نے فیس پیش کی، اور اصرار کیا تو انھوں نے سختی سے انکار کیا، اور فرمایا کہ مجھے کھانے کے مواقع تو بہت ملیں گے

لیکن آپ مجھے سعادت اور مسرت سے کیون محروم کرتے ہین حقیقت یہی تھی کہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی، اس مین ذرا بھی رسمی تکلف نہ تھا، وہ باوجود بے انتہا مشغول ہونے کے خود تشریف لاتے، اور انجکشن دیتے، اُن کے علاج اور توجہ سے وہ کچھ صحت مند ہوگئے، یہ غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے،

۱۹۵۲ء کی گرمیون مین بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی مین طے پایا، چچاجان بھی تشریف لے گئے، آٹھ ہزار فٹ کی بلندی اُن کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی، اور ان پر تنفس کا شدید دورہ پڑا، فوراً ڈاکٹر آئے، انھون نے دیکھا اور کہا کہ خون کا دباؤ بہت بڑھا ہوا ہے، خان عبدالقیوم خان اور میان ممتاز دولتانہ نے اپنے خصوصی اہتمام سے فوجی اسپتال راولپنڈی پہنچایا، وہان کرنل سرور نے معائنہ کیا، دل کافی بڑھ چکا تھا، اور سب سے پہلی بار یہ تشخیص ہوئی کہ یہ تنفس کی تکلیف بھی قلب ہی کی وجہ سے ہے، وہان سے لاہور تشریف لائے، لاہور کے ایک تجربہ کار ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی تشخیص کیا، اور نسخہ تجویز کیا، اور نمک کا سخت پرہیز بتایا، اس کے بعد کراچی تشریف لے آئے، یہان ڈاکٹر رحمان کی طرف رجوع کیا، انھون نے بھی اسی علاج سے اتفاق کیا، اور علاج ہوتا رہا، اور تنفس جاتا رہا، اور بہت دنون تک کوئی شکایت نہین رہی، یہان حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی نے جو اُن کے شاگرد بھی، شیدائی بھی، معالج خاص بھی، اور محرم درد دل بھی ہین، طاقت کی دوائین ہمیشہ جاری رکھین،

فروری ۱۹۵۳ء مین ڈھاکہ مین مجلس تاریخ کی کانفرنس تھی، اس کے صدر منتخب ہوئے، ڈاکٹرون کا مشورہ تھا کہ اتنا طویل سفر نہ فرمائین لیکن نہ مانے اور بذریعہ طیارہ تشریف لے گئے، ڈھاکہ کے خطبہ صدارت مین ایک تاریخی صداقت کے اظہار کے بعد وہان کے طلبہ نے جو شرمناک سلوک اُن کے ساتھ کیا، وہ سب کو معلوم ہے، ایک نیم جان قلب کے مریض و ضعیف کے ساتھ ایسا سلوک انسانیت سے گری ہوئی بات تھی،

جلسہ کے بعد محبی راحت رضوی صاحب کے یہان چند دن قیام رہا، اور وہان سے کلکتہ تک ہوائی جہاز اور بذریعہ ریل لکھنؤ ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، کہتے تھے کہ راہ مین بختیار پور جنکشن (جہان سے ہمارے وطن کی ریل لائن) بدلی تھی، بہت دیر تک حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا رہا، پٹنہ جنکشن پر مقامی ندوی حضرات تشریف لے آئے تھے،

کچھ دن لکھنؤ میں قیام رہا، اعظم گڈہ سے شاہ معین الدین صاحب اور سید صباح الدین صاحب بھی ملنے آئے، ان دونوں حضرات کو ان کی ذات سے والہانہ محبت تھی، اس غیر متوقع ملاقات کا ذکر مزہ لے لے کر اپنے خطوط میں مسیئون کرتے رہے، اور سیر نہ ہونے کا گلہ کرتے رہے، ان حضرات کو کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات اُن کے لئے آخری ثابت ہوگی، اور

بوئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کا مصرعہ ان پر صادق آئے گا،

اپریل ۱۹۵۳ء میں واپس کراچی تشریف لائے، کچھ ہی دنوں کے بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا، وہی انجکشن دیا گیا، جس سے سکون ہوگیا، اس کے بعد سیاسی ہنگاموں کا طوفان اٹھا، بنیادی کمیٹی کا جلسہ علمائے کرام کا اجتماع، کیا کچھ نہ ہوا، منتیں کیں، خوشامدیں کیں، روٹھا گیا کہ ان ہنگاموں سے آپ علٰحدہ رہیں،

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

ایک دن تو مجھ سے چڑھ گئے، وہ دن تھا اور آخری دن، میں نے زبان بند کرلی، میری آنکھوں میں آنسو آگئے، میرے انداز کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے، اکثر چھیڑا کرتے تاکہ میں کچھ بولوں لیکن میں نے طے کر لیا کہ میں ہرگز ان کی گرانی طبع کا باعث نہ بنوں گا، اس لئے صرف تعمیل حکم میں نے اپنا فرض بنالیا، کوئی آتا میں اطلاع کر دیتا، لوگ آتے، اور گھنٹوں بیٹھ جاتے، اور ہر قسم کے موضوع پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں، دل کڑھتا، اکثر آنکھیں روتیں، چہرہ متغیر ہو جاتا، پیشانی پر شکن پڑ جاتی لیکن زبان بہرحال بند رہتی،

اگست ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی کہ زکام کی کیفیت محسوس ہوئی، اور کچھ تنفس کی ہلکی سی تکلیف تھی، پھر حرارت آگئی جو ۹۹ - اور ۱۰۰ کے درمیان، ڈاکٹر رحمان کے یہاں خود تشریف لے گئے، انھوں نے کیلشیم کا نسخہ دیدیا، دو چار دن میں بخار اتر گیا لیکن تنفس کی تکلیف بڑھنے لگی، انہیں جو نیند آمین کا انجکشن دیا گیا تنفس کم ہوگیا،

ایک دو روز آصیلی بھی تشریف لے گئے لیکن گاڑی میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گئے، میں نے بے قرار ہو کر پوچھا کوئی خاص تکلیف ہی؟ فرمایا نہیں لیکن مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ گھلتے جا رہے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میری خواہش ہوتی کہ ان کو تکلیف نہ کرنی پڑے، اور اُن کی خواہش ہوتی کہ اُن کے لئے کسی کو تکلیف نہ ہو، میری خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر اُن کے پاس آتا لیکن میں ذکر نہیں کرتا، اس لئے کہ مجھے جواب معلوم تھا، وہ فرماتے مرض مجھ کو ہے یا کہ اُن کو، اور پھر جو شخص جتنا کرے، اس کا احسان ہے، نہ کرو تو اس کی کوئی شکایت نہیں، وہ پوچھتے تم کیسا ڈاکٹر چاہتے ہو، میں کہتا مجھے ایسا ڈاکٹر چاہئے جس کو جب جس وقت بلایا جائے، فوراً آجائے، خواہ اس کے لئے وہ کوئی فیس لے، وہ مسکرا دیتے، بات ختم ہو جاتی، لیکن دوسرے دن کپڑے پہن کر مجھ سے پہلے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاتے، اب میری بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی، میں تھوڑی دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہتا، نہ کچھ کہہ سکتا، نہ کچھ کر سکتا، شکست کھا کر گاڑی میں بیٹھ جاتا، اور گاڑی چل دیتی،

ساری تکلیفیں خود اٹھانی ان کی فطرت بن چکی تھی، کسی کو اُن کی ذات سے تکلیف نہ ہو، اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، اسی لئے ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کی مخالفت کرتے تھے، کوئی ڈاکٹر اُن سے فیس نہیں لیتا تھا، اور سب انتہائی محبت سے پیش آتے تھے، ڈاکٹر فاروقی سے بالکل عزیزوں جیسے تعلقات تھے، وہ خود بھی اپنی ذات سے بڑے متواضع اور خلیق انسان ہیں، ہمارے گھر میں کسی کو کچھ تکلیف ہو، اطلاع ملتے ہی آجاتے، دیکھتے، انجکشن لگانے، عثمان صاحب کمپونڈر کو متعین کر دیتے، عثمان صاحب بھی بڑے ہی شریف اور محبت والے آدمی ہیں، ان سب باتوں کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی کہ کسی کو تکلیف نہ دی جائے،

ڈاکٹر رحمان کے علاج کو ایک دو ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک دن مختار صاحب نے ٹیلیفون کیا کہ کرنل شاہ سید صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں، کس وقت تشریف لائیں، میں بہت خوش ہوا، کرنل شاہ کے اخلاق کی دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوا ابّا جان کو مطلع کیا، انھوں نے فرمایا جس وقت جی چاہے تشریف لے آئیں، اُن کی عنایت ہوگی، چنانچہ اسی دن گیارہ بجے تشریف لائے اور بہت دیر تک معائنہ کرتے رہے، میں نے

اُن کی رائے پوچھی، انھوں نے پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا میں ابھی کوئی رائے نہیں دے سکتا، کل اُن کو جناح اسپتال لے آئیے ہیں اُن کے قلب کا ایکسرے اور کارڈیوگراف لینے کے بعد کوئی فیصلہ کر سکونگا، چنانچہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے اُن کے دفتر پہنچ گیا، وہ دفتر میں نہیں تھے، چچا جان کو دفتر میں بٹھا دیا، اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش میں اسپتال کا رُخ کیا، وہ اسپتال کا چکر لگا کر آ ہی رہے تھے، جیسے ہی مجھے دیکھا، تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گلے میں پڑے ہوئے اسٹیتھو اسکوپ سے کھیلتے ہوئے دفتر کی طرف تشریف لائے، اور بڑی تعظیم و تکریم اور تواضع سے پیش آئے، اور دوسرے کمرے میں لے گئے، وہاں کارڈیوگراف لیا گیا، وہ پھر وہاں سے اپنی گاڑی پر دوسری جگہ گیا، وہاں ایکسرے لیا گیا، اور پھر تیسری جگہ خون کی جانچ کے لئے خون لیا گیا، اور دوسری جانچ مکمل ہوئی،

اتنی دوڑ دھوپ میں سانس کچھ تیز ہو گئی لیکن بڑے حوصلہ اور ہمت سے سارا کام کرتے رہے، گھر پہنچے تو سب لوگوں نے گھیر لیا جیسا کہ ہمیشہ سے قاعدہ تھا جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے، تو گھر کے سارے افراد اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے، لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے لیکن وہ چند جملوں میں ساری بات کہہ جاتے تھے جس سے گھر کے لوگوں کو تسلی نہیں ہوتی تھی، مزید تفصیل اور استفسار کے جواب میں ان کا ایک نیم تبسم بس تھا، چنانچہ اسی طرح اُن سے تفصیل کی فرمائش ہوئی، انھوں نے میری طرف اشارہ کر دیا اور خود پلنگ پر لیٹ گئے، اور زیرلب تبسم کے ساتھ اپنی ساری روداد لیٹے لیٹے سنتے رہے،

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں ساری رپورٹ لے کر خود آؤں گا، اور دوا اور علاج تجویز کروں گا، چنانچہ جب وہ تشریف لائے، تو کہا کہ قلب بڑھ گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قلب کی کسی شریان میں ایک ایسی گرہ بن گئی ہے جس سے دوران خون میں دقت ہوتی ہے اور قلب کو زور لگانا پڑتا ہے، اور اسی سے تنفس کی تکلیف ہوتی ہے، کم و بیش تشخیص وہی تھی جو سارے اطباء اور ڈاکٹروں کی تھی، انھوں نے ایک ٹکیہ ڈیجاکسن کا اضافہ کیا، کچھ دوائیں کھانسی وغیرہ کی بھی دیں، دن بارہ دانہ

کے علاج کے بعد حالت بظاہر اچھی خاصی معلوم ہونے لگی، اب وہ بستر سے ادھر ادھر چلنے پھرنے لگے، پاخانہ جو ان کے کمرے سے کچھ دور پر تھا، خود سے جانے لگے، اور فرماتے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی،

ڈاکٹروں کی شدید ہدایت تھی کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے، تاکہ دل و دماغ کو مکمل آرام نصیب ہو، کسی قسم کی علمی اور سیاسی گفتگو میں حصہ نہ لیں، صرف انہی حضرات کو ملنے دیا جائے جن کی باتوں سے دل خوش ہو، میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا، اور ان سے استدعا کی کہ آپ خود گزارش گذار کر دیں چنانچہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا، کہ آپ نے زندگی میں بہت کام کئے ہیں، اتنی خدمت کی ہے جتنی کم ہی لوگوں نے کی ہوگی، اور ابھی قوم کو آپ کی ضرورت ہے، اس لئے کچھ دنوں قومی، ملی، اور علمی مصروفیتوں سے بالکل علیحدہ ہو جائیے صحت کے بعد انشاء اللہ پھر حصہ لیجئے گا، انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کبھی مجھے اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مسکراتے رہے،

اُن کی علالت کی اطلاع قصداً اخبارات میں نہیں دی تھی، اس لئے کہ لوگوں کا ہجوم بس سے باہر ہو جاتا، اس پر بھی مشتاقوں، محبوں، اور مخلصوں کا تانتا لگا رہتا تھا، سمجھدار لوگ صرف دریافت حال کے بعد چلے جاتے تھے، میں لوگوں سے کہہ دیتا تھا کہ ان کا یہ حال ہے، آپ کہیں تو اُن کو مطلع کر دوں، کچھ لوگ کہتے میں اُن کی خیریت پوچھنے آیا ہوں تکلیف دینے نہیں، بعض لوگوں کو اصرار ہوتا کہ آپ میری آمد کی اطلاع کر دیجئے، میں جانتا تھا کہ اگر اطلاع کرائی گئی تو وہ ضرور بلا لیں گے، اور پھر کچھ نہ کچھ گفتگو بھی ہوگی، اور موضوع اور عنوان کی کوئی حدبندی باقی نہیں رہے گی،

شروع شروع جب لوگوں کو واپس کر دیا گیا، اور انھیں علم ہوا تو بہت خفا ہوئے، اور فرمانے لگے تم لوگ مجھے وزیر اعظم بنا دینا چاہتے ہو، مجھے یہ پابندیاں پسند نہیں ہیں، میرے پاس جو آتا ہے، محبت اور خلوص سے آتا ہے کسی غرض سے نہیں آتا ہے کسی کو نہ روکو چنانچہ جب کوئی بھی اطلاع کی گئی ضرور بلایا گیا، اور اُن کے جسم ناتواں پر جتنا بھی دباؤ ڈال سکتا تھا، اس کو برداشت کرتے، اور کبھی تکدر کا اظہار نہیں فرماتے،

کراچی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر اسلامی تاریخ کے پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں اُن سے مشورہ کرنے کے لئے تشریف لائے، انھیں ان کی علالت کا علم نہیں تھا، ملازم کے ذریعہ انھوں نے اطلاع کرائی، فوراً بلا لئے گئے، چچا جان رنج کے ساتھ اس ملک میں علمی فقدان کا ذکر کرنے لگے، اور فرمایا ہمارے پی، ایچ ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں، اور ساری عمر اسی کو چوستے چاٹتے رہتے ہیں، حالانکہ پی ایچ ڈی ہونا صرف اس بات کی سند ہے کہ تم تحقیق کر سکتے ہو، محقق نہیں ہو، بعد میں مجھ سے پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ علالت کا علم نہیں تھا، ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا، پھر بھی بیچارے پوری گفتگو کئے بغیر ہی اٹھ گئے، لیکن احساس والے لوگ کم ہی آتے،

ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لکچرار صاحب تشریف لائے، میں نے اُن کو ان کی حالت بتادی، کہنے لگے کوئی حرج نہیں، میں بھی علیگ ہوں، اس تعلق سے آپ ہی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں گا، چنانچہ مجھ سے برابر گفتگو کرتے رہے، اتنے میں چچا جان اندر کے کمرے سے باہر تشریف لے آئے، لکچرار صاحب نے سلام کیا، اور انھیں کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ گئے، مزاج پرسی کے بعد انھوں نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا، پہلے تو انھوں نے معذرت کی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں لیکن تھوڑی دیر بعد خود اُن سے نہیں رہا گیا، اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لکچرار صاحب الجھتے رہے، اور ان کی تسلی نہیں ہو پائی تھی، انھوں نے پھر سوال کیا، فرمانے لگے بھائی! بس اب دم نہیں ہاں اس سلسلہ میں سعدی کا صرف ایک شعر سُن لیجئے،

یکے قطرہ باران ز ابرے چکید — خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم — گر او ہست حقا کہ من نیستم

اس شعر کو سُن کر لکچرار صاحب جھومنے لگے، کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ اس شعر کو سُنا تھا لیکن کبھی اس مطلب کو نہیں سمجھا تھا، اب وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو سمجھ گیا، آپ سے صرف ایک گذارش ہے کہ کبھی خط لکھا

کی اجازت دیدیجئے، فرمایا بڑے شوق سے بیچ ہے،

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کچھ دنوں کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے، انھوں نے اپنی علمی لیاقت کے متعلق کوئی تحریر چاہی، فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے، اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے دیانت کے خلاف ہے، اس کے بعد خاموش ہوگئے، پروفیسر صاحب کے چہرہ پر افسردگی چھاگئی، یہ بھی ان سے دیکھا نہیں گیا، آخر میں اُن سے سوالات شروع کئے، اور وہ جوابات دیتے رہے، اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اس موضوع پر آپنے کون کونسی کتابیں پڑھی ہیں، ان کا نام بتایئے، جو انھیں یاد تھا، بتاتے رہے، اس کے بعد خود عربی، انگریزی، اردو کتابوں کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا، بیچارے پروفیسر صاحب کو پسینہ آگیا، لیکن انھوں نے نہایت صفائی سے جوابات دئے، جو جانتے تھے اس کو بتایا، جو نہیں جانتے تھے اس کا اعتراف کرلیا، اس کے بعد تحریر کا وعدہ فرمایا، پھر خود اس سوال کا جواب دینے لگے، سوال یہ تھا کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی عنصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوا، وہ گفتگو کررہے تھے، ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ان کا ہمیشہ کا قاعدہ تھا، لیکن تسلسل کا یہ عالم تھا کہ جیسے بند ٹوٹ چکا ہے اور سیلاب تھمتے نہیں تھمتا، اسی سلسلہ میں قدیم وجدید فلسفہ یونانی فلسفہ، اسرائیلیات، سارے عالم کے فلسفہ کی تاریخ کی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے رہے کہ کس طرح یونانی (Logos) جس سے (Logio) وغیرہ مشتق ہیں، کلمہ، کلام، اور پھر علم کلام کی بنا پڑی، اس دن کی ساری گفتگو بڑی ہی پر از معلومات تھی جو الحمدللہ محفوظ کرلی گئی،

میں بار بار کھانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن ان کی بات ہی نہیں ختم ہوتی تھی، یہاں تک کہ میں نے ان کو سہارا دے کر اٹھایا، اور دوسرے کمرے میں لے جانے لگا، پھر بھی وہ دو ایک بات بولتے ہی جاتے تھے، سانس تیز ہوچکی تھی، پیروں میں خود سے کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی، ہاتھ میرے کاندھے پر تھا، اور میں

ان کو اپنے سہارے پر کھڑا کئے ہوئے تھا، صرف زبان اور دماغ میں طاقت موجود تھی، جو آخر وقت تک اسلام اور دین کی خدمت میں مصروف رہی،

بنیادی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا، اسلام ریاستی مذہب ہو قوم کا مطالبہ تھا، ان کے بیان کا ایک مسودہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا، انھوں نے اس کو پڑھا اور رد کر دیا، دوسری مرتبہ جب محترمی راغب احسن صاحب اور مولانا عبد القدوس بہاری تشریف فرما تھے، انھوں نے خود سے اپنے بیان کی اصلاح کی، اور اخبارات کو بھیجنے کی اجازت دی،

اسلام کے ریاستی مذہب کی تائیدی جلسہ کی صدارت کے لئے انھوں نے پیر غلام مجدد سرہندی کو نامزد کیا، یہاں کے تمام علما، میں وہ پیر صاحب کے خلوص اور جوش جہاد کے بہت معترف تھے، اُن کی ذات پر انھیں بہت بھروسہ تھا،

ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے تھے، ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، دروازہ کھولا گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ ایک بیان پر دستخط لینے کے لئے تشریف لائے ہیں، اُن سے کہا گیا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ جگا دیا جائے، اور ان کی شدید علالت اور اسکی نوعیت بتائی گئی تو بڑی مشکل سے واپس تشریف لے گئے، اس ہنگامہ میں اُن کی آنکھ کھل گئی، فرمانے لگے، کہ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کون حضرات تشریف لائے تھے؟ اُن کی غرض نہ بتاؤ، جب انھیں نام معلوم ہوا تو ایک دم خاموش ہو گئے، صبح جب ڈاک میں اُن حضرات کا بیان دیکھا تو فرمایا کیا اسی لئے آئے تھے؟ دوسرے دن ڈاکٹر عبد الحئی صاحب تشریف لائے، تو اُن سے بڑے دکھ کے ساتھ شکایت کی ——————

—————— ڈاکٹر صاحب نے ندامت سے اس طرح سر جھکا لیا، جیسے انہی سے یہ غلطی ہوئی ہو،

ہمارے ایک عزیز لوہے کے تاجر ہیں، وہ ان سے ملنے کے لئے آئے، اُن سے تجارت کی حالت پوچھی،

انھون نے ملک کی اقتصادی بدحالی کا بہت ہی پردرد منظر کھینچا، وہ اُن کی بات بڑے غور سے سنتے رہے جب وہ ختم کر چکے تو فرمانے لگے ہین تو پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہین ہون، مشکلات فرد اور ملت کی آزمایش کیلئے ہوتی ہین، اور آزمایش ہی فرد اور قوم کو زندہ رکھتی ہے مشکلات سے گھبرانا نہین چاہئے، بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہئے،

اب انھین جلد جلد دورہ پڑنے لگا تھا، کرنل شاہ کی رائے ہوئی کہ اُن کو جناح اسپتال مین داخل کردین لیکن اسپتال مین داخل کرنے کے لئے گھر کا کوئی فرد تیار نہین تھا، ان کے ماحول اور بے بسی سے اور وحشت ہوتی تھی، آخر کرنل شاہ کی رائے کے مطابق ڈاکٹر عبدالصمد کانپور والے بھی علاج مین شریک کئے گئے، کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبدالصمد مین مشورہ ہوا، دونون بالکل متفق تھے، چنانچہ اسی نہج پر علاج ہوتا رہا،

جمعرات یعنی ۱۹ر نومبر ۱۹۵۳ء کے دن وزیر شام ۴ بجے تشریف لائے، اور انھون نے ایک مسئلہ چھیڑ دیا، چچا جان نے گفتگو شروع کی، بار بار کلام پاک سے حوالے دیتے جاتے تھے، جب وہ تشریف لائے تھے مین انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے جا رہا تھا مین ان کو لے کر واپس آیا تو وہ محو گفتگو تھے، حاضرین کی اجازت لے کر بستر پر لیٹ گئے، لاغری اور ضعف کے سبب سے رگ کی تلاش مین بڑی دقت ہوتی تھی، کبھی کبھی غلط جگہ سوئی چبھ جاتی تھی، تو بڑی تکلیف ہوتی تھی، انتہائی ضبط کے باوجود آہ نکل جاتی تھی، ایک ہاتھ مین ناکامی ہوئی تو دوسرے مین کوشش کی گئی، بارے اس مین کامیابی ہوئی، اس کے بعد وہ اٹھ بیٹھے، گفتگو کا تار جہان سے ٹوٹا تھا، وہین سے شروع کر دیا، کس کو یقین آسکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی دو منٹ قبل درد اور تکلیف سے بے چین تھا، میرا دل کڑھ رہا تھا، لیکن زبان سے بول نہین سکتا تھا، مین قیوم صاحب کو چھوڑ کر جب واپس آیا تو دیکھا کہ گفتگو اب بھی جاری ہے، یہان تک کہ مغرب کا وقت ہو گیا، وزیر شام نے باہر جا کر نماز پڑھی، اس کے بعد کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے، ساری گفتگو عربی مین ہو رہی تھی، مین ان کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا، وہ بڑے متحیر اور متاثر تھے،

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے، اُن کے ساتھ ایک اور صوفی منش بزرگ تھے، ان سے یہ طے تھا کہ ہم لوگ ماہر القادری صاحب کو دیکھنے جائیں گے، چنانچہ ان دونوں کو ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا، اور خود کپڑا بدلنے چلا گیا، اور فوراً واپس آ گیا، چچا جان اسی کمرے میں محو خواب تھے، ان صاحب نے مجھ سے روایت بیان کی کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے، عاصم صاحب جلد واپس آگئے، سید صاحب پر انوار کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا،

ایک دن مجھ سے سوال کیا کہ تمہارے والد کا کس عمر میں انتقال ہوا، میں نے عرض کیا کہ رحلت کے وقت اُن کی عمر باسٹھ برس کی تھی، پھر پوچھا اور بڑے بھائی (حکیم سید ابو حبیب صاحب) کی عمر کیا تھی،

ان کی عمر ترسٹھ برس تھی،

پھر کہنے لگے کہ میں نے تو خاندان میں سب سے زیادہ عمر پائی،

میں اُن کا مطلب سمجھ گیا، اسی لئے عرض کیا لیکن بڑے دادا (یعنی ان کے والد سید ابو الحسن صاحب) کی عمر تو ۷۰ برس کی تھی، وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن میں اس گفتگو سے سہم گیا، پھر اپنا وہم سمجھ کر اس کو ٹال گیا،

ایک دن حکیم فصیر الدین صاحب ندوی تشریف لائے، انھوں نے حسب عادت بڑے حوصلہ افزا الفاظ کہے،

قلب کی حالت بہت اچھی ہے، الحمد للہ نبض بھی متوازن ہے، چہرہ بھی شگفتہ ہے، ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے،

وہ اُن کی باتیں سنتے رہے، اور مسکراتے رہے، صرف یہ شعر پڑھ دیا،

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک مرتبہ شعیب قریشی صاحب کا لڑکا عمر جو سلمان کا ہم عمر اور مخلص دوست ہے، اور جسے

ملنے آیا، اس کو اپنے پاس بلایا، اور بٹھا کر فرمایا، تم تو محمد علی کی جوانی کی ہو بہو تصویر ہو،

آخری دنوں میں اپنے گذرے ہوئے بزرگوں اور عزیزوں کی یاد بہت آنے لگی تھی، ہم لوگوں کو اپنے قریب بلاتے، سب لوگ اُن کے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے، وہ اُن روحوں کو عجب انداز سے یاد کرتے، کبھی ان کے خلوص و محبت کو یاد کرکے بے چین ہو جاتے، کبھی اُن سے متعلق گذرے ہوئے واقعات اُن کو تڑپا دیتے، اُن کی آنکھوں میں اکثر محبت کے آنسو جھلکتے دیکھے، دور کے عزیزوں میں سے بھی کوئی ملنے آجاتا، تو سب سے پہلے اُس سے اپنا رشتہ بتاتے، پھر خاندانی تعلقات و روابط کے قصے اتنا مزہ لے لیکر بیان کرتے کہ سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ان بیتے ہوئے دنوں کا نقشہ پھر جاتا، اور اپنے پچھلے بزرگوں کی محبت اور عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی،

جمعہ ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار سے غسل کیا، اور مل مل کر بدن کو صاف کراتے رہے، غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی،

ہفتہ کا دن سکون سے گذر گیا، پچھلے پہر رات کو یک بیک میری آنکھ کھل گئی، کان میں بڑی درد ۲۱ر بھری ایک آواز آئی، غور سے سنا تو چچا جان بڑے درد و کرب سے یہ شعر پڑھ رہے تھے،

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں مضطرب ہو گیا، اتنے میں والدہ نے آواز دی، میں تڑپ کر بستر سے کودا اور ان کے کمرے کی طرف گیا، دیکھا کہ تنفس کا زور ہے، چہرہ درد و کرب کا آئینہ دار ہے لیکن مجھے دیکھکر مسکرا دیئے، میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں، کہنے لگے ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہوں گے، اُن کو تکلیف ہوگی، میں اب کچھ بہتر ہوں، نماز فجر کے بعد جانا،

میں نے والدہ سے کہا مجھے پہلے کیوں نہیں اٹھایا؟ انھوں نے فرمایا، وہ تو اب بھی مجھے روک رہے تھے،

رات کی تاریکی دور ہو چکی تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا، ہوا تیز تھی، ٹھنڈ خاصی تھی، فضا میں

ایک عجیب بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی،

۲۲ اتوار آج اتوار کا دن شروع ہو چکا تھا، مین نے فجر کی نماز پڑھی، بارگاہ الٰہی مین اُن کی صحت عاجلہ وکاملہ کے لئے دعا مانگی، ڈرائیور کو بیدار کیا، اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا، ان کا پھاٹک کھُل چکا تھا لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ تھا، مین ہر طرف دیوانون کی طرح بھٹکتا رہا تھا، اتنے مین ایک ملازم آیا، اُس نے کہا ڈاکٹر صاحب نماز فجر کے بعد سو گئے ہین،

مین نے کہا ڈاکٹر صاحب کو اٹھا دو، لیکن وہ چلا گیا،

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے دیکھا،

مین نے اُن سے حال بیان کیا،

انھون نے ڈاکٹر صاحب کو باہر بھیجا،

ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیے مین ابھی آتا ہون، جب مین لوٹ کر آیا، تو ان کو پہلے سے بہتر دیکھا، انھون نے از خود کہا کہ مجھے دوا کی ایک ٹکیہ اور دیدو، چنانچہ دیدی گئی، اتنے مین ڈاکٹر صاحب آگئے، انھون نے کہا اچھا کیا کہ ٹکیہ کھالی، پھر پوچھا کہ دل مین درد تو نہین؟ فرمایا الحمد للہ ذرہ برابر نہین ہے،

ڈاکٹر صاحب: پھر کوئی بات نہین ہے،

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا، ڈاکٹر صاحب! یہ مرض اچھا بھی ہو جاتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: کیون نہین، آپ اچھے ہو جائین گے،

پھر فرمایا میرے خیال مین کوشش بیکار ہے،

ڈاکٹر صاحب: ایسی مایوسی کی بات نہین ہے،

مین ڈاکٹر صاحب کو لے کر باہر آیا، اُن سے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے حملہ ہو گیا تھا، گذر گیا، مین نے پوچھا کوئی تشویش کی بات تو نہین؟ کہنے لگے کوئی بات نہین ہے، آج پھر انجکشن لگوا دیجئے گا، وہ

چلے گئے، میں واپس آگیا، اس کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ناشتہ کیا، دو توس جیلی لگے ہوئے اور ایک نیم برشت انڈا کھایا،

تھوڑی دیر بعد سفیر حجاز آگئے، میں نے کہا کہ اسی کمرے میں بلا لیجئے، کہنے لگے نہیں مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے چلو، میں نے ان کو سہارا دیا، اور اس کمرہ میں پہنچا دیا، وہاں بھی بستر لگا رہتا تھا، اس پر لیٹ گئے، خطیب صاحب بستر کے قریب ہی بیٹھ گئے، اُن سے بھی اسی طرح گفتگو کرتے رہے، جیسے ابھی دورہ پڑا ہی نہ تھا، گیارہ بجے کے قریب میں انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے گیا، حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ انھوں نے کہا کہ اگر میں ایک گھنٹہ کے بعد آؤں تو کوئی حرج تو نہیں، میں نے کہا کوئی ہرج نہیں، چنانچہ وہ ایک بجے آئے، اور انجکشن لگا کر چلے گئے، ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر ان کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے، اس دن انھوں نے کھیر کی فرمائش کی تھی، تھوڑی سی کھائی باقی رکھوا دی کہ بعد میں کھاؤں گا، شاید دو بجے ہوں، عادل میاں پینٹ وغیرہ پہن کر آئے اور ان کے پاس بڑی شان سے السلام علیکم مولانا صاحب کہکر کھڑے ہوگئے، اور کہنے لگے اب ہم صاحب بن گئے ہیں، انھوں نے کہا تم صاحب ہوگئے مولوی نہیں ہوگے، انھوں نے اسی بے تکلفی سے فرمایا، نہیں ہم صاحب بنیں گے" متبسم ہو کر بولے تو پھر ہم تم سے رنج ہو جائیں گے، عادل میاں نے فوراً جواب دیا، اچھا تو نہیں بنیں گے، اس پر وہ ہنسنے لگے، اور عادل میاں پینٹ میں ہاتھ ڈال کر اٹھلاتے ہوئے چلے گئے، اور وہ اس کو محبت بھری نگاہ سے دور تک دیکھتے رہے،

اب اتفاق سے میں تنہا رہ گیا، مجھ سے مخاطب ہوئے، اور بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہا عاصم میاں!

میں نے کہا جی!

آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا،

میں نے کہا جی نہیں،

پھر فرمایا تمھیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا، میں نے عرض کیا جی نہیں"

پھر تھوڑی دیر توقف فرمایا، اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے، میں ان کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا، انکی باتوں میں عجیب بات نظر آئی، میں اس کو بیان نہیں کر سکتا ہوں، شاید آنکھیں پرنم تھیں، بڑے ہی درد میں ڈوبی ہوئی دھیمی آواز میں فرمایا، لیکن اس مرتبہ تمھیں موقع مل گیا،

میں بلبلا اٹھا، اور بے اختیار زبان سے نکلا "میرے باپ! میں نے تو آپ کی کوئی خدمت نہیں کی"؟ صرف مسکرا دیئے، اور مجھے دیکھتے رہے، میرا دل بھر آیا، اور میں وہاں سے اٹھکر اپنے کمرہ میں چلا آیا، والد مرحوم کی یاد نے تڑپا دیا، اپنی کم فہمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میں بالکل نہیں سمجھا کہ یہ الوداعی فقرے تھے، ورنہ قدموں سے آنکھیں ملتا، اور پیر پکڑ کر کہتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جائیے،

کوئی چار بجے کے قریب والدہ سے مخاطب ہوئے، اور کہنے لگے کہ آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہیں،

وہ کہنے لگیں کہ یہ کوئی سوال ہے، ——؟

فرمایا میرے سوال کا جواب دیجئے، فضول باتوں میں مت الجھائیے،

والدہ نے ان کے سوال کا جواب دیا، "بے شک"

پھر فرمایا الحمد للہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے،

والدہ نے میرے پاس آکر اُن کے فقروں کو دہرایا،

میں نے اُن کی تسلی کر دی،

لیکن خود اپنا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا،

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن عجیب سناٹا سا معلوم ہوتا تھا، جیسی اداسی تھی وہ بیان سے باہر ہے میں اٹھا پھر اُن کے کمرہ میں گیا، دیکھا کہ سلمان وضو کرا رہے ہیں، یہ خدمت اُن کی سب سے چھوٹی لڑکی کے لئے مخصوص تھی، ہمیشہ وہی وضو کرایا کرتی تھی، عصر کی نماز پڑھی، اور وہ کھانے کے وقت کی بچی ہوئی کھیر مانگ کر نوش کی، پھر سلمان نے پان دیا، ان کا معمول تھا کہ ہر وہ کھانے کے ناشتہ

بعد شام کی چائے کے بعد دو گلوری پان کھاتے تھے، اور واقعہ خان مقتدا خان کا الائچی دانہ تمباکو نوش فرماتے تھے، اس مرتبہ پان کھانے کے بعد وہ دل نہیں رہا تھا، میں نے تلاش کرکے ان کو دیا، جب میں نے تمباکو دیا، تو انھوں نے مجھے بڑی عجیب نظر سے دیکھا، اور جب تک کھڑا رہا، دیکھتے رہے، میں ان کا مفہوم کچھ بھی نہیں سمجھا، اب سمجھتا ہوں کہ شاید وہ حسرت بھری نگاہ تھی، رخصتی کا پیام تھا، فرقت کا پیغام تھا، آہ مجھ کو کیا خبر تھی،

کیا خبر تھی انقلاب آسمان ہو جائیگا باپ کا ملنا نصیب دشمنا ہو جائیگا[1]

ساڑھے پانچ بجے مشتاق جوہری ملنے آئے، وہ بھی چچا جان سے خصوصی محبت کرتے ہیں، اُن سے وہ بیان کرتے رہے کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا، اب اچھا ہوں، اس کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، سلمان نے نماز پڑھوائی، بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی جب نماز سے فارغ ہوئے تو مسکرائے سلمان نے پوچھا کیا بات ہے ؟

فرمایا آج میں نے شوکت علی کی نماز پڑھی

سلمان نے پوچھا کیا مطلب ؟

فرمایا وہ اسی صورت سے نماز پڑھتے تھے،

اس کے بعد سلمان نے کہا اب سو جائیے آپ رات کو بھی نہیں سوئے ہیں، انھوں نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے، اور روشنی بجھا دی، اسکے بعد سلمان دبے پاؤں آئے اور اُن کے سر سے ٹوپی اُتارنے لگے، انھوں نے پوچھا کون ؟ سلمان نے کہا کوئی نہیں، اور پھر وہ سو گئے،

میں نے باہر صحن میں مشتاق صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، نماز کے بعد اسی چٹائی پر مشتاق صاحب سے باتیں کرنے لگا، اتنے میں تھوڑی دیر بعد غلام محمد صاحب آئے اب تاریکی کچھ بڑھ چلی تھی، وہ بھی

---

[1] یہ شعر اسی ترمیم کے ساتھ میری اہلیہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا، "ہم"

وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے، اور خیریت پوچھی، اُن کو حال بتاتا رہا، اتنے میں سلمان نے روشنی جلائی، اور پنکھا دیکھنے تو دیکھتے تو ہم لوگ دوڑ پڑے، دیکھا کہ وہ مٹھی بھینچ رہے ہیں، اور گہری سانس لے رہے ہیں، فوراً ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو ٹیلیفون کیا، انھوں نے فرمایا، ابھی میرے پاس دو بجے ہیں، ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ اس وقت نہ آسکیں گے، میں دوڑا کہ کسی دوسرے کو لاؤں مگر گاڑی باہر گئی ہوئی تھی، پیدل ہی بھاگا، تھوڑی دور جاکر ٹیکسی لی، اور مارٹن ہسپتال کے ڈاکٹر فاروقی کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں، اب وہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی گیا، ایک ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا، انھوں نے کہا یہ تو میرے مطب کا وقت ہے، میں نہیں جا سکتا، پھر پوچھا معالج کون ہیں، میں نے کرنل شاہ اور عبدالصمد کا نام بتایا، وہ کہنے لگے کہ ایسے ایسے ڈاکٹروں کے بعد میں کیا علاج کروں گا، میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو علاج کے لئے کہاں کہہ رہا ہوں، میں تو صرف اس لئے آپ کو لیجانا چاہتا ہوں کہ آپ دیکھ کر مجھے یہ تبلا سکیں کہ انکی حالت کیسی ہے، کہنے لگے کوئی بات نہیں نیند آگئی ہوگی، میں نے کہا ازراہِ کرم یہی بات وہاں دیکھ کر کہتے دیجئے گا، چنانچہ وہ راضی ہوگئے،

نہ معلوم کیوں یک بیک دل کا سارا اضطراب ساری بیقراری، ساری تڑپ، ساری دھڑکن ختم ہوگئی، جیسے سکون ہوگیا، دل نے کہا شاید اب بہتر حالت ہے، شاید اب وہ خطرہ سے باہر ہیں، شاید میں اُن کو دیکھ سکوں گا، اُن سے باتیں کرسکوں گا، ان کی نورانی صورت سے اپنے قلب کو منور کرسکونگا، اُن کی اس غفلت کی نیند پر اپنی پریشانی کا اظہار کروں گا، وہ مسکرا کر فرمائیں گے آپ کیا سمجھے تھے، میں چل بسا، میں کہوں گا، میں قربان ایسا کیوں ہونے لگا، تھوڑی دیر تک اسی کا چرچا رہے گا، ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی، میرے خیالات کی رَو اس سے بھی زیادہ تیز تھی،

لاکھ اجب گھر پہنچا کیسی خاموشی تھی، موت کی خاموشی، تاریکی بھیانک تاریکی، دل بیٹھنے لگا، تیز تیز قدم رکھتا ہوا دروازہ پر پہنچا، دیکھا غلام محمد صاحب اور مشتاق صاحب زمین پر بیٹھے ہوئے بیٹھے ہیں

میں نے ان سے لرزتے ہوئے پوچھا "خیریت!" ——— انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف گردن ہلا دی، ان کا اترا ہوا چہرہ اور بہتی ہوئی آنکھیں سب کچھ بتلا چکی تھیں۔ کمرہ کے اندر قدم رکھا، دیکھا کہ اُسی شان سے لیٹے ہوئے ہیں، اوپر سے چادر اوڑھا دی گئی ہے، عجیب قیامت کا منظر تھا، گھر کے سارے افراد اس شمع کے چاروں طرف پروانوں کی طرح کھڑے ہیں، سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے، والدہ، اُف چوڑی نذارد، چہرہ سفید، آنکھیں جل تھل لیکن ضبط و صبر کی کو وپیکر بنی کھڑی ہیں، مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئیں، اور کہا بیٹا ضبط و صبر کا مقام ہے، میں نے کہا امّاں میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔

ہاں میرے لال تم ڈاکٹر کو لاتے ہو لیکن وہ ڈاکٹر سے بے نیاز ہو چکے،

میرا سر چکرا گیا، معلوم ہوا جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی، حلق خشک ہو گیا، والدہ نے مجھے اپنے کلیجہ سے لگا لیا، اور میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا، وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتی رہیں اور زبان سے یہی کہتی رہیں "صبر بیٹا صبر" نسیمہ کو پکار کر مفرح منگوایا، اور مجھے دیا، پھر پانی پیتا رہا، ایک بیک کچھ خیال آیا، میں ہوش میں آگیا، ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے تھے، اُن کو دکھلا دوں، شاید ان لوگوں کا خیال غلط ہو، بس میں تیر کی طرح باہر گیا، اور ڈاکٹر کو لے آیا، والدہ کہتی رہیں کہ ابھی ڈاکٹر عبدالصمد آچکے ہیں، اور اعلان کر چکے لیکن دل نہیں مانا، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا (آہ! کتنا شاہانہ سکوت، کتنی پروقار نیند تھی، ابدی نیند، ہائے انھوں نے بھی دوسرا فیصلہ نہیں سنایا"

ان کو رخصت کیا ہی تھا کہ سلمان ڈاکٹر رحمان کو لیکر آئے اور آتے ہی چادر الٹ دی ——— اور اُن کی داڑھی چھو کر بے تابانہ پکارنے لگا، ابّا ——— ابّا ——— میرے ابّا ——— بولئے،!

ڈاکٹر رحمان نے بھی دیکھا اور کھڑے ہو گئے، سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہا، صبر کرو صبر، اور رخصت ہو گئے،

مجھ پر اب سکتہ کا سا عالم تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا، اور کیا ہو رہا ہے، میں بُت بنا کھڑا تھا، سلمان بہت بے قرار ہو رہا تھا، والدہ سلمان کو پکڑ کر لائیں، اور مجھ سے لپٹا دیا، میں نے اس کو سینہ سے چپٹا لیا،

میرے پاس الفاظ نہیں تھے جس سے میں اُن کو تسکین دیتا، شاید دل کی بات دل تک پہنچ رہی ہو،
میں سلمان سے علیحدہ ہوا اور صوفہ پر گر پڑا، والدہ نے مجھے پھر مفرح دیا، اور کہا بیٹا تم اپنے آپ کو سنبھالو
دل کو مضبوط کرو، تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، سب کام تم ہی کو انجام دینا ہے،
اب میں نے دل کی قوت کو مجتمع کرنا شروع کیا، مجھے ہوش آچکا تھا، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔
—— ریڈیو پاکستان کا ٹیلیفون تھا، انھوں نے پوچھا کہ میں نے بہت ہی افسوسناک خبر سنی، کیا وہ سچ ہے،
(ہاں! آپ نے جو کچھ سنا سب سچ ہے،
سب بچیاں، سلمان، —— والدہ پلنگ کے چاروں طرف کلام پاک لے کر بیٹھ گئے، اور تلاوت شروع
کردی، ریڈیو سے اعلان کے فوراً ہی بعد لوگوں کا تانتا شروع ہو گیا،
زہرہ آپا، مولانا محمد علی کی صاحبزادی، شوکت علی کی بہو، زاہد علی صاحب کی بیگم، روتی ہوئی آئیں اور
کہنے لگیں، للہ میرے چچا کو مجھے دکھادو، پھر بیگم وسیم، گلنار آپا، (بیگم شعیب قریشی) تشریف لائیں،
باہر لوگوں نے تجہیز و تکفین کے متعلق سوالات شروع کر دیئے، ان مسائل پر آہ میں نے کب سوچا تھا،
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، اتنے میں شعیب قریشی کے داماد ڈاکٹر عابد نے کہا، آپ متردد ہوں، جہاں ماموں
یعنی عبد الرحمٰن صدیقی کا مزار ہے، وہیں انتظام کر لیں گے، مجھے کچھ تجربہ ہے، اور لوگوں کی رائے ہوئی، کہ جہاں
مولانا شبیر احمد صاحب صاحب مدفون ہیں وہاں انتظام کیا جائے، اس لیے سب سے پہلے میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
کو ٹیلیفون کیا، اور اس جگہ دفن کرنے کی اجازت مانگی، انھوں نے کہا مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مولانا عثمانی
کہاں مدفون ہیں، میں نے اُن کو بتایا کہ میونسپلٹی کی زمین ہے اور آپ اجازت دے سکتے ہیں، میرے دماغ میں
تھا کہ نقوی صاحب چیف کمشنر کی وہ قائمقامی کر رہے ہیں، انھوں نے کہا آپ ان لوگوں سے ملئے جنھوں نے
مولانا عثمانی کی تدفین کا انتظام کیا تھا،
مجھے فوراً مولانا عبد القدوس بہاری کا خیال آیا، چنانچہ ان کو ٹیلیفون کیا، اُن کو کوئی پتہ نہیں تھا،

بجے ڈاکٹر عابد نے کہا کہ میرے ساتھ چلیے، میں انہی کے موٹر پر مولانا عبدالقدوس بہاری اور دوسرے لوگوں کے بیان سے ناکام ہو کر شعیب صاحب کے مکان پر پہنچا، اور وہاں سے ٹیلیفون کے ذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مکان کا پتہ چلایا، اور اُن کی تلاش میں نکلا، کچھ دیر تک بھٹکتا رہا، بالآخر یہ معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب نے میونسپل کمشنر مسٹر جہانگیر سے اجازت مانگی، انھوں نے فرمایا کہ میرا ارادہ اس زمین کو قبرستان بنانے کا نہیں، اس لئے نہیں مل سکتی،

اب میں اور عابد سیدھے اس قبرستان پہنچے، جہاں عبدالرحمٰن صدیقی سوئے ہوئے ہیں، اور انہی کے قریب مسجد کے دامن میں قبر کھودنے کا حکم دے کر گھر لوٹے، یہاں معلوم ہوا کہ مولانا تمیز الدین خان نے نقوی صاحب چیف کمشنر کو ٹیلیفون کیا تھا، انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ ان شاء اللہ صبح تک انتظام ہو جائے گا، اس کے بعد طے پایا کہ کل ساڑھے آٹھ بجے اس عاشقِ رسول کا جنازہ اُٹھے گا، دس بجے کے قریب شعیب صاحب کا اندرونِ سندھ سے ٹیلیفون پہنچا، کہ میں نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے صبح آؤنگا لیکن راستہ میں اُن کی گاڑی خراب ہوگئی، اس لئے نماز جنازہ میں شریک نہ ہو سکے،

اب خیالات اور خبر رساں ایجنسیوں کے مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہوئے، کہیں سے جنازہ کے متعلق استفسار، کہیں تدفین کے متعلق بعض اُن کے سوانح حیات جاننے اور چھاپنے کے لئے بیتاب، اور اس پر لوگوں کا ہجوم، بس قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا، اپنی بے بسی اور بیچارگی کو کیا کہوں کہ اتنی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ کہیں چھپ کر رو ہی لوں، روتے روتے پیر جواب دیکھے تھے، ایک بجے تک لوگ جمع رہے،

رات بھر دعاؤں اور قرآن خوانی، اگر، عود، اور لوبان نے کیا سماں کھینچا تھا، اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کے گھر کا سب سے بیش قیمت سرمایہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس سے چھن گیا ہو، جب کبھی فرصت ملتی، میں اُن کے قریب جاتا، اور اُن کی پیشانی کو بوسہ دیتا، اُن کے جسم کو غور سے دیکھتا، کیا کہوں یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا، بس یہی خیال ہوتا اب اٹھیں گے، اب بولیں گے، اب عشا

کی نماز کے لئے پکارین گے، اب وضو کے لئے بلا ئین گے، رات ڈوبتی جا رہی تھی، سناٹا بڑھتا ہی جا رہا تھا، اب ان کے تہجد کا وقت آگیا، لیکن وہ تہجد مین ناغہ کرین گے، انھون نے تہجد کبھی ناغہ نہین کی، اب وقت پر تہجد کی نماز کے لئے گھنٹی نہ بجے گی، اب اُن کے جسم کو حرکت ہوگی، لیکن آہ کچھ بھی نہین ہوا،

اُف صبح ہوگئی، رخصت کی صبح، دائمی فرقت کی صبح، وداع کی صبح، آہ وہ صبح جس مین کوئی پیغام حیات نہین، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضا نے کفن اوڑھ لیا ہے،

الا! ہم اس جسم اطہر کو اٹھا کر بیچ کے کمرے مین لائے، قینچی سے کاٹ کاٹ کر سارے کپڑے علحدہ کئے، بے اختیار جی یہی چاہتا تھا کہ بس لپٹ جاؤن اور کہون،

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملین گے کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

سب لوگون نے مل کر تخت پر لٹایا، آہ سارا جسم کتنا نرم تھا، جس طرف موڑا جاتا تھا، مڑ جاتا تھا، چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی وقار، وہی متانت، وہی تبسم، اب تک جو تھا، مین نے پھر پیشانی کو چوم لیا، ڈاکٹر عبدالغنی صاحب نے شہادت کی انگلی چوم لی، اور لرزتی ہوئی آواز مین کہا کتنی مبارک ہین یہ انگلیان جو سرور کائنات ﷺ کی سیرت نگاری مین زندگی بھر مصروف رہین، اللہ، مین ـــــ اور ـــــ شمون ماموں پانی ڈال رہے تھے، صوفی جی کپڑے سے طہارت کر رہے تھے، ڈاکٹر تبارہے تھے، سلمان بُت بنا کھڑا تھا، کبھی پانی ڈالتا، اور کبھی قریب آکر غور سے دیکھتا رہتا،

آخر آٹھ بجے رخصت کا لباس پہنایا گیا، داڑھی مین عطر لگایا گیا، کافور چھڑکا گیا، اور پلنگ پر لٹا دیا گیا،

دوسرے کمرے مین سفیر مصر، سفیر حجاز، ڈاکٹر محمود حسین، سابق وزیر تعلیم، اور بہت سے لوگ تھے، وہ بلائے گئے، انھون نے آخری زیارت کی، اور پھر کمرہ بند کر دیا گیا، اور عورتون کو بلا لیا گیا،

باہر ہر طرف کیمونڈ مین ہزارون کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ ہر طرف دری بچھا دی گئی تھی، سب

کلام پاک سے قرآن خوانی میں مصروف تھے،

ساڑھے آٹھ بجے گھر سے جنازہ نکلا، ٹرک پر رکھا گیا، دو بڑے بڑے بانس دونوں طرف لگا دیے گئے، تاکہ ہزاروں آدمی کاندھا دے سکیں، لوگوں نے پھول سے اُسے ڈھک دیا، اُس کے بعد جنازہ ایک جلوس کی شکل میں گھر سے رخصت ہوا، سفیر مصر نے کہا کہ آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جائیں لیکن انھوں نے کہا مجھے اس شرف سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں، ہر شخص کاندھا دینے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنا چاہتا تھا،

آہ! ان کے جنازہ کا منظر بھولتا ہی نہیں، امیر غریب، فقیر، سفیر، سب اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، جیسے اُن کا باپ اُن کا بھائی، اُن کا سب کچھ آج رخصت ہو رہا ہے جس راستے سے یہ جلوس گذرتا تھا، مکان کی چھتوں پر سے عورتوں کی آہ و بکا کی آوازیں آتی تھیں، ممالک اسلامیہ کی سفراء آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے، اُن کی آنکھیں نمناک اور لب کانپ رہے تھے، جیسے اُن کا عزیز ترین محبوب اُن سے چھن گیا ہو، یوں تو اُن کی محبوبیت کے بہت سے واقعات دیکھے لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ ہر خاص و عام کے قلوب میں ان کی کتنی جگہ تھی،

سفیر حجاز خطیب صاحب جنازہ کے آگے ایک طرف مجھے اور دوسری طرف سلمان کو اپنی طرف لئے ہوئے تھے،

بندر روڈ طے کرنے کے بعد نیو ٹاؤن مسجد جہاں ایک مرتبہ انھوں نے بقر عید کی نماز پڑھائی تھی اور ایک دو جمعہ بھی پڑھائے تھے، وہ ابھی زیر تعمیر مسجد ہے، اس کی تعمیر کا سامان پھیلا ہوا تھا، اس کے وسیع احاطہ میں مسجد کے محرابی در کے سامنے جنازہ رکھا گیا، اور ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے نماز پڑھائی،

آہ! افسوس کسی کا گھر لٹ گیا، اور کوئی اپنی شہرت کے لئے اس کو بھی وسیلہ بنانا چاہتا تھا، اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا، ان سے خلوص و محبت تھی، نماز کے بعد زیارت کے لئے لوگوں کا اصرار بڑھا، لوگوں کا ہجوم تھا، پھر ناظرین اور مشتاقین کی ایک قطار بنا دی گئی، جو یکے بعد دیگرے سامنے سے آتے، چہرہ انور کو

ایک نظر دیکھ کر گذر جاتے تھے ہر شخص آتا اور ایک نظر دیکھتا یا پھر شاید دیکھ بھی نہیں پاتا، اور صرف محبت اور عقیدت کے آنسوؤں کی بارگاہ میں پیش کر کے چلا جاتا، ایک انجینیر صاحب چیخ چیخ کر پکار رہے تھے زیارت کرتے جائیے اور چلتے جائیے،

تانتا کسی صورت سے ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی، اُن کا چہرۂ انور نور سے معمور تھا، ایک طرف آفتاب کی روشنی ان پر ——— پڑ رہی تھی دوسری طرف خود اس آفتاب کی تابانی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی کتنا شاہانہ سکون کتنا درویشانہ جلال، اور کتنا روحانی وقار تھا، سلمان اور میں اُن کے سرہانے کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا، دھوپ بچانے کے لئے چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے تھا، تین طرف سے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کلیجہ پھٹ رہا تھا خیالات وجذبات کا سیلاب امنڈا آرہا تھا، آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے کلیجہ تھا کہ بیٹھا جاتا تھا لیکن نگاہیں تھیں، کہ اُن کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ

جی بھر کے دیکھ لیں یہ جمال جہان فروز پھر یہ جمال نور تو دیکھا نہ جائیگا

کبھی جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر روؤں اور سینوں کے بند شکوے کے در کھول دوں،

اے عم محترم! آج کیوں نہیں بولتے، دیکھئے آج کتنے آپ کے مشتاقان دید جمع ہیں، آپنے کسی کو کبھی مایوس نہیں لوٹایا، آپکے نصیحت سننے کے لئے لامتناہی سلسلہ کلمہ گویوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے، یہ تو وہی ہیں جن کے لئے آپنے اپنے جین کو چین نہیں سمجھا، اپنی راحت کو راحت نہیں سمجھا، یہ کسی غرض سے نہیں آئے ہیں یہ آپکے محبت اور خلوص سے ملنے آئے ہیں، انجینیر صاحب کی آواز کانوں میں ہتھوڑے کی طرح سے پڑ رہی تھی،

حلیم صاحب وائس چانسلر آئے، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اور وہ گر گئے سابق فیڈریشن سابق وزیروں میں سے سب وزیر اعظم ان دنوں پنجاب میں علیل تھے، اُن کا نمایندہ اور گورنر جنرل کا نمایندہ شریک تھا، خواجہ ناظم الدین باہر تھے،

یہاں سے جنازہ اٹھا اور کئی فرلانگ کی مسافت طے کر کے اٹھارہ ہزار مربع گز زمین کا احاطہ دینیات تھا

جس کے ایک طرف مولانا شبیر احمد کا مزار ہے، وہاں پہنچا اُن کے مزار کے سامنے رکھا گیا، اور چونکہ اجازت ملنے میں دیر ہوئی، اس لئے ابھی تک قبر تیار نہ تھی، مولانا عثمانی کے مزار پر میکروفون لگا دیا گیا تھا، شام کو ابوالخیر صاحب نے ایسی تقریر کی، جس نے سب کو رُلا دیا،

اُن کی تقریر جذبات و خیالات اور معلومات سے لبریز تھی، آخری فقرہ تو ہمیشہ یاد رہیگا، انھوں نے کہا

"اے سلیمان! تمھارے جانے کا اتنا غم نہیں ہے جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ ہے جو تمھارے ساتھ دفن ہو رہا ہے"

اس کے بعد قبر تیار ہوئی،

قبر کے اندر ایک طرف غلام محمد صاحب دوسری طرف میں، اور میرے ساتھ صلاح الدین احمد صاحب ندوی اُترے، سلمان اوپر والے حصہ میں کھڑے تھے،

آہ اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو زمین پر لٹا دیا، آہ جس کی نفاست طبع شکن بستر پر بے کلی محسوس کرتی تھی آج وہ مٹی کی خوابگاہ میں سو رہا ہے،

چہرہ کھول دیا گیا، پھر ڈھک دیا گیا،

میرے بڑے ابا حکیم سید ابو حبیب صاحب کا نواسہ مصطفیٰ بیتابانہ چیخا،

ارے میرے چھوٹے نانا کو ایک مرتبہ اور دکھلا دو،

جس کو سردی سے گرمی سے ہوا سے لو سے ہمیشہ بچایا جاتا تھا، وہ آج منوں مٹی کے اندر چھپا دیا گیا،

میرے لئے ہر طرف تاریکی،

ہر طرف اندھیرا،

ہر طرف سناٹا تھا،

اللہ بس باقی ہوس

ٹھہرے گا دل تھمیں گے اشک آہ! مگر ابھی نہیں،

ہند و پاکستان میں ماتم

"ہندوستان و پاکستان میں اس حادثہ پر جس قدر ماتم کیا گیا، ان دونوں ملکوں کے اکابر نے جو بیانات دیئے، اور اخبارات و رسائل نے جس قدر لکھا، ان سب کی تفصیل کی گنجائش نہیں، نمونۂ چند بیانات اور تحریروں کے مختصر اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔" "م"

بیانات

عبدالوہاب عزام سفیر مصر:

"علامہ ندوی جیسے اہلِ علم کی موت سے نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ وہ قاہرہ کی عرب اکیڈمی کے ممبر بھی تھے، جہاں وہ عربی کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔......"

شیخ ابوالخیر سفیر شام:

"ہم کو علامہ سید سلیمان ندوی کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا دکھ ہے کہ جو علوم و فنون ان کے سینے میں تھے، وہ بھی اُن کے ساتھ دفن ہو گئے۔......"

گورنر جنرل پاکستان:

"... مولانا سید سلیمان ندوی کے پایہ کا عالم صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں بھی کوئی نہ تھا۔"

خواجہ شہاب الدین گورنر سرحد:

"..... علم و فضل کے لحاظ سے تمام عالم اسلام میں اُن کا پایہ بلند تھا، اُن کے انتقال سے عالم اسلام کو

زبردست نقصان پہنچا ہے، مجھکو بھی ذاتی نقصان ہوا کیونکہ مین نے اُن سے بہت سے فیوض حاصل کئے۔"

سردار عبدالرشید، وزیر اعلیٰ سرحد:

..... ابھی پاکستان کو مولانا جیسے علم و کردار کے آدمیون کی سخت ضرورت تھی،

سردار عبدالرب نشتر:

"..... انھون نے اسلامی تاریخ کی تدوین مین جو گران قدر خدمات انجام دی ہین، انھین ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔"

مس فاطمہ جناح:

"سید سلیمان ندوی کی وفات سے قوم ایسے جید اور فاضل عالم سے محروم ہو گئی ہے جس نے اپنی تمام زندگی اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی۔"

ابو صالح محمد اکرام: جج چیف جسٹس پاکستان و صدر قانون کمیشن:

..... مولانا ندوی قانون کمیشن کے رکن تھے، حکومت پاکستان نے یہ کمیشن ملک کی عدالتون مین اسلامی قانون جاری کرنے کے سلسلہ مین مقرر کیا تھا، اُن کی موت نے ہمین جو نقصان پہنچایا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے"

چودھری خلیق الزمان:

..... وہ نہ صرف ایک ممتاز عالم، بلند پایہ مورخ اور زبردست اہل قلم تھے، بلکہ دلآویز شخصیت کے بھی حامل تھے، بڑی میٹھی گفتگو کرتے تھے، خلافت اور دوسری اسلامی تحریکون مین انھون نے جو حصہ لیا، وہ فراموش نہین کیا جا سکتا، سچ ہے جب تک سیرۃ النبی زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہین گے،

مولانا قطب میان مرحوم فرنگی محل لکھنؤ:

"مولانا مرحوم کے ان روابط کے پیش نظر جو ہمیشہ سے ہمارے خاندان کے ساتھ قائم ہے مجھکو یہ سانحہ اپنے گھر کا سانحہ نظر آرہا ہے،

مولانا عبدالشکور صاحب لکھنؤ :

وہ نہ صرف علم و فضل بلکہ زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز درجہ کے مالک تھے"

مولانا محمد سعید مجتہد :

..... علامہ کے انتقال نے سب سے زیادہ نقصان ہند و پاکستان میں عربی ادب کو پہنچایا ہے، موصوف عربی ادب میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے تھے، ہندی الاصل ہونے کے باوجود قدیم اور عصری عربی ادب کے ماہر تھے، ان کے عربی مضامین کو نام ہٹا کر دیکھا جاتا تو یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ یہ مقالہ کسی عرب کا ہے یا ہندوستانی کا،

ڈاکٹر عبدالعلی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

..... تقریباً تیس سال موصوف کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، یہ مدت جتنی ہی بڑھتی گئی، اتنی ہی موصوف کی قدر میرے دل میں بڑھتی گئی، میں نے ذاتی تعلقات میں انھیں شفیق بھائی پایا، ندوۃ العلماء کے کاموں میں اُن کی رائیں رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی پائیں، اگر اختلاف رائے کی کبھی نوبت آئی تو میں نے انھیں ایک شریف اور کریم انسان پایا، اور جلد وہ اختلاف رائے اشتراک عمل میں تبدیل ہوگیا،

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مرحوم مشرقی اور اسلامی لٹریچر کے ایک مقبول ترین اور تسلیم شدہ عالم تھے، اور اس کے لئے انھوں نے عظیم ترین خدمات سرانجام دی تھیں، جدوجہد آزادی کے دوران میں قوم پرستانہ نظریات و خیالات کے دل و جان سے حامی تھے،

مفتی عتیق الرحمان ندوۃ المصنفین دہلی،

..... آہ! کسے خبر تھی کہ عالم اسلام کا یہ گوہر شب چراغ اس قدر جلد ہم سے جدا ہوجائے گا ....."

علمائے میرٹھ کی تعزیت:

"آج کے پر آشوب دور میں اسلامی تاریخ، اسلامی علوم و فنون اور مآثر اسلامی کو فلسفۂ جدیدہ کی روشنی میں جس حسن و خوبی کے ساتھ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا، اور تاریخ اسلامیہ کے بہت سے اہم پہلو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں مدون کئے، بالخصوص سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و تصنیف، یہ آپ کی زندگی کی زندہ جاوید یادگار اور صفحۂ زمین کے بسنے والے انسانوں کے لئے ہدایت و تعلیم کا ایک سرچشمہ ہے، اور امت مسلمہ بجا طور پر اس مورخ اسلام کے علمی کارناموں پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

اخبارات میں ماتم

جنگ کراچی، مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۵۳ء

"برصغیر بھارت و پاکستان کے عظیم ترین عالم، محقق، مورخ، ادیب اور مفکر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی وفات ایک پورے عہد کی موت اور ایک پورے دور کا اختتام ہے، یہ عہد مسلمانوں کی علمی و تحقیقی خدمات کا دور تھا، جس نے اس برصغیر میں اسلامی نشو و ارتقاء اور ملی تفکر و تجسس کی نئی اساسیں استوار کیں، اور برصغیر میں حضارت اسلامیہ کی بنیادیں رکھیں،

بصیرت لاہور مورخہ ۲۷ نومبر ۵۳ء:-

عہد حاضرہ کے فرزندان اسلام جن ممتاز اور نامور ہستیوں اور رہبروں پر بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں ان میں سے ایک حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ہیں۔۔۔۔۔"

نوائے وقت لاہور، ۳۰ نومبر ۵۳ء:

اسلامی علوم و فنون کی تحقیق و تصنیف کا جو پودا حضرت مولانا شبلی نعمانی نے لگایا تھا اس کی آبیاری میں سید سلیمان ندوی نے جس کاوش اور جانفشانی سے حصہ لیا، اہل علم و فضل ہمیشہ اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے، شاید ہی کوئی مسلمان گھرانا ہوگا جس میں سیرت نبوی، سیرت عائشہ، رحمت عالم

وغیرہ موجود ہوں، یہ بلند پایہ تصنیفات اُن کے لئے لازوال خراجِ تحسین کی حیثیت رکھتی ہیں۔......"

ڈان (اداریہ) کراچی :-

......وہ نہ ایک ممتاز مصنف اور مشہور اہلِ علم تھے، بلکہ اُن کی ایک یادوارالمصنفین کے بانی کی حیثیت سے ایک مدت مدید تک رہے گی، یہ وہی ادارہ ہے جہاں سے علم کی شعاعیں برابر پھیلتی رہی ہیں، جو علوم کا خزانہ اور صبر آزما علمی تحقیق و تدقیق کا بڑا مرکز رہا ہے، اور جس نے ایک عہد کے علمی ضمیر کو بنانے اور ترقی دینے میں گہرا اثر ڈالا ہے، ......علامہ موصوف کی زندگی کا مشن قرآن وسنت کی تعلیم کو خاطر خواہ طریقہ پر پیش کرنا تھا، ......ہر شخص اُن کو محبت کی نظروں سے دیکھتا تھا، اس لئے اُن کی رحلت سے ہر شخص کو ذاتی نقصان پہنچا ہے"

ڈان (رنگون ایڈیشن) کراچی،

"......اُن کی موت سے ایک ایسی دل آویز شخصیت، ایک ایسا متبحر اہلِ علم، ایک ایسا زبردست اہلِ قلم، ایک بے غیر جانب دار مورخ اور ایک ایسا عالم باعمل ہم میں سے اُٹھ گیا، جو صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتا ہے"،

حمایت اسلام لاہور، ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۳ء

......اُن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف زمانہ حاضر کے اسلوبِ فکر سے واقف تھے، بلکہ فکر کی پوری تاریخ اُن کے سامنے تھی، اور وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے، کہ فکر و عمل کے اسلوب ہر زمانہ میں بدلتے رہتے ہیں، ......انھوں نے تعلیماتِ اسلامیہ بورڈ کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کے دستور کے متعلق علما اور جدید پود کی جو رہنمائی فرمائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم افراط و تفریط سے بچ گئے ......"

الجمعیۃ دہلی، مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۳ء

"......آپ بیک وقت ادیب بھی تھے، اور شاعر بھی، مورخ بھی تھے، اور سوانح نگار بھی، فلسفی بھی تھے، اور متکلم، مفسر بھی تھے، اور فقیہ بھی، سیرۃ النبی اور دوسری بلند پایہ تصانیف سے جو شہرت

اور مقبولیت آپ نے حاصل کی، وہ بہت کم لوگوں کو ملا کرتی ہے، ....افسوس ہے کہ آج ہم سے وہ ہستی جدا ہو گئی جو پروفیسر مارگولیتھ کی تاریخ کا جواب دیا کرتی تھی، اور جس کی تحقیقات کا لوہا انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مصنفین کو بھی ماننا پڑا، .... افسوس آج ہم سے ایک ایسا عالم دین، مفسر، مؤرخ، ادیب اور اڈیٹر جدا ہو گیا جو عصری رجحانات اور نفسیات کا ماہر اور عقلی ترقی کے نئے تقاضوں کا آشنا سا تھا، ......"

مدینہ بجنور، مورخہ ۲ دسمبر ۵۳ء،

۲۲ نومبر کی شام کو کراچی میں مولانا سید سلیمان ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے، وہ آفتاب علم و حکمت گہن میں آ گیا جس کی شعاعوں نے ہندوستان اور پاکستان کی علمی مجلسوں، ادبی محفلوں، اور دینی انجمنوں کو اپنی آب و تاب سے بقعۂ نور بنا رکھا تھا، ...... رسالہ معارف کے صفحات ایک مدت سے جس راہ فکر اور جس روشن خیالی کی دعوت دے رہے ہیں، یہ مولانا مرحوم ہی کے فیضان نظر کا اثر اور ان ہی کے مانی الضمیر کا عکس ہے، معارف سے قبل رسائل میں مضامین کا انداز محققانہ نہیں ہوتا تھا سطحی موضوعات پر ہمارے ادبا، جو کچھ قلم برداشتہ لکھ دیتے تھے، اسے بہزار تشکر و امتنان زیب قرطاس کر دیا جاتا تھا لیکن معارف نے اسلوب نگارش کی پرانی قدریں کچھ اس انداز سے بدیں کہ سطحی نگارشات کی کوئی وقعت ہی باقی نہ رہی، مولانا کے اس تجدیدی کارنامے کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اگر ہم انھیں دنیائے ادب کا ایک مصلح یا ایک مجدد کہہ دیں تو یہ خطاب اس عظیم الشان شخصیت کو زیب دیتا ہے، ...."

سیاست کانپور:

.... معارف میں علامہ مرحوم کے شذرات ملک بھر میں شہرت رکھتے تھے، یہی حال ان کے قلم سے نکلنے والی تنقیدات کا تھا، گذشتہ چند سال سے وفیات کے عنوان سے وفات پانے والے معاصرین کے حالات لکھنے لگے تھے، یہ مضامین اپنے رنگ میں بہت خوب نہایت درجہ موثر، اور مرحوم کی زندگی

کی تصویر کشی میں کامل ہونے تھے......"

حق، لکھنؤ :

"..........یہ عظیم المرتبت ہستی........ اپنی نیکی، اپنے علم، اپنے اخلاق، اپنی خدا ترسی اور اپنے تقوی و طہارت کے باعث زمانہ قدیم کے ان بزرگوں اور پایہ کے نمونہ کی تھی جن کے زرین نقوش آج بھی زمانہ کی ریگ پر نظر آرہے ہیں، جو بھولے بھٹکے مسافروں اور گم کردہ راہ رفیقوں کو صراط مستقیم بتاتے ہیں......"

شاکر، مدراس :-

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی اچانک وفات سے علم و فضل کی ایک ایسی کرسی خالی ہو گئی جس کو پر کرنے والا اس وقت ساری دنیائے اسلام میں کوئی نظر نہیں آتا،"

انقلاب بمبئی، ۰ر دسمبر ۵۳ء

"......سید صاحب شروع سے نیک طبیعت اور شریف النفس انسان تھے، ان کی نیک فطرت ماحول پر غالب رہی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علم و تحقیق کی راہ میں ہمیشہ صراط مستقیم ہی کو پسند کیا....."

جمعیۃ العلمائے اسلام پاکستان کی تعزیتی قرارداد :-

"..........استاذ الاساتذہ بطل الاسلام علامۂ اجل حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات موجودہ حال و ماحول کے لئے سانحۂ عظیم اور مملکت اسلامیہ کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے.......... ان کی رحلت سے پورے عالم اسلام بلکہ عصر حاضر کی تمام علمی و تعلیمی و فکری اجتہادی حلقہ جات و مجالس کی تابناکیاں کم ہو گئیں........ وہ اس دور میں علوم اسلامی کی عزت و آبرو تھے، معیار علم و عمل تھے، اور دینی و ملی تحریکات و دوائر کے اعتبار سے اس منصب پر فائز تھے جو غالباً یوسف کے بعد حیات والوں میں مشکل ہی سے ہو سکتا ہے۔"

انجمن ترقی اردو پاکستان :

"........ مرحوم اردو زبان کے نامی انشا پرداز اور ادیب تھے، اپنی متعدد تصانیف اور مجلہ معارف کے ذریعہ اردو زبان اور ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابل فراموش ہیں۔"

نقیب امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ :

"حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کا حادثۂ انتقال دنیائے اسلام کے لئے عظیم ترین حادثہ ہے۔"

قطعات اور تاریخی مادے

از

جناب قاضی معراج الدین صاحب ھولپوری

آہ مرد پاک باطن سید سلیمان ندوی جانشین مولانا شبلی علیہ الرحمہ

۱۹۵۳ء

باسم اللہ الرافع الدرجات عز اسمہ

۱۳۷۳ھ

ھو الغفور الوھاب

۱۳۷۳ھ

تاریخ رحلت بلند پایہ

۱۹۵۳ء

آہ مرد حکیم سخن سید سلیمان ندوی

۱۳۷۳ھ

فاضل بلیغ

۱۹۵۳ء

مرد میدان تحقیق مؤرخ فلک اوج

۱۹۵۳ء

غریق حقائق و معارف آگاہ

۱۹۵۳ء

جانشین خاص، جادو کلک مولانا شبلی مرحوم،

۱۹۵۳ء

مغز سلوک معرفت

۱۹۵۳ء

اے بادب واحسرتا واحسرتا

۱۳۷۳ھ

بہشت منزل ہے خوش اقبال باد

۱۹ ۵۳

آج دانا ادب متقدمین کی یادگار زندہ نہیں رہی

۱۳ ۶۳

(۱)
آہ آن سید سلیمان ذی حشم | پاک صورت پاک باطن پاک دین
سن بہ ہجری رحلتش معراج گفت | رونق ہنگامہ خلد برین

(۲)
خبر یہ آئی کہ گئے دنیا کو آج | تھے سلیمان سید عالی نشان
۱۳ ۶۳ ھ
عیسوی میں کہہ دل معراج سال | عازم خلد برین فخر جہان
۵۳

(۳)
ازین دہر فانی بدار بقا رفت | چو سید سلیمان بزرگ و نعیم
۱۹ ء
بہ ہجری بیاورد معراج سال | مہ ملک اجلال باغ نعیم
۱۳ ھ ۶۳

(۴)
وہ سید سلیمان وذی اقتدار | گئے آج دنیا سے سوئے عدم
سن عیسوی میں ہے معراج سال | بہار تمنائے باغ ارم
۱۹ ء ۵۳

(۵)
ملے جہان را نمودی الم دیدۂ رنج ماتم،
مدین سرائے خیالی، ادب راچہ مغموم کوی
تباریخ ہجری، حزین قلب معراج گفتا
ب دلستان جنت، محمد سلیمان ندوی
۱۳ ھ

(۶)
لاطم سا اٹھا جہاں میں، ہوا عالم حشر برپا
ہر اک سمت چھائیں گھٹائیں صفیں بچھ گئیں رنج و غم کی
مسیحی پئے سال رحلت، او معراج تاریخ کہئے
زر افشان خلد برین میں، محمد سلیمان ندوی
۱۹ ء ۵۳

(۷)
قیامت نے انگڑائیاں لیں بنا دل سراپا محشر
زمانے نے آنسو بہائے ہوئی غیر حالت جہان کی
فلک نے پئے سال رحلت ہجری سنایا یہ مصرع
مقیم بہشت دل افزا، محمد سلیمان ندوی
۱۳ ہجری ۶۳

(۸)
بگرداب رنج مسلسل گرفتار کردہ جہانے
برفتہ بدریائے رحمت، محمد سلیمان ندوی
ملائک پئے سال رحلت مسیحی بہ معراج گفتا
سخن گوئے عرفان جنت، محمد سلیمان ندوی
۱۹ عیسوی ۵۳

(۹)

مچا تہلکہ اہل دل میں، اٹھا شور محشر جہان سے
زمانہ ہوا صرف ماتم، ہیں نمایاں اشک غم کی
خبر دی بسالِ ہلالی، ملائک نے سراجؔ تجکو
مکین بہشتِ حسین ہیں، محمد سلیمان ندوی

۷۳ ہجری ۱۳

(۱۰)

نمودم بہ خیلے تفکر ہمک دو تاریخ موزون
چو رفتہ آغوش رحمت، محمد سلیمان ندوی
سرودم بسالِ مسیحی، بگفتا سراجؔ محزون
تمنائے توسیع جنت، محمد سلیمان ندوی

۵۳ عیسوی ۱۹

دردمند غم دل سراجؔ دھولپوری

۵۳ عیسوی ۱۹

قطعۂ تاریخ

از

جناب قاضی فتح محمد فاتح بی اے منشی فاضل بھکر

آہ برفت آن ندوی سلیمان — جانب جنت شادان و فرحان
خلق برگش زار و پریشان — چاک گریبان سینہ بریان
اہل کراچی افتان خیزان — سوے جنازہ زود گریزان
جملہ مسلمان ششدر و حیران — آہ سلیمان آہ سلیمان
صورت و معنی ظاہر و پنہان — اسف و تاسف خوان و گریان
اشک پیاپے ریزان ریزان — آہ تو اتر افشان افشان
اشک بہ دیدہ دجلہ دجلہ — نالہ و گریہ قلزم و عمان
درد و عنا و کرب و مصیبت — ہوشربا شد صورت طوفان
روز بروز تألم افزون — رنج بمدن از حیطۂ امکان

رفت مورخ و عالم و شارح | صدرِ گرامی محفلِ عرفان
سیرت احمد مرسل گفتہ | سفتہ بہ سلک آن لی تابان
نثر معفی نظم مرتبع | فکر بہ اوجِ ثریا طیران
آہ ز مرگش گشت فسردہ | مسند ایمان منبر ایقان
تختِ فقہ را صدر نماندہ | رخت سلیمان رشک سلیمان
صبر و تحمل ہیچ نماندہ | قلب پریشان قالب بے جان
یادِ شبلی تازہ گشتہ | رفت بسویش بستہ دامان
لکھنؤ، پٹنہ و اعظم گڑھ را | شہرتِ خاص بدادِ سلیمان
مرقد شہر کراچی گشتہ | اللہ اللہ سبحان سبحان
قائلِ حکمت و تحقیقش را | رازی و سینا و سعدی ہمجان
نامِ بلندش تابان ہر سو | ماہِ درخشان انجم رخشان
باز نیامد از ما رفتہ | رفت بگوشۂ روضۂ رضوان
صبر و تحمل باید کردن | اے دلِ نالان اے دلِ نادان

فاتحہ خواند و تاریخ گفتہ

اہلِ ادب، دہ گونہ سلیمان
۹۱۰ = ۱۰ × ۱۹۱ × ۴۲-
۱۹۵۳ء

یادِ سیدؒ

از جناب یحیٰی اعظمیؒ

ہوگئی پھر تازہ یادِ سیدِ معجز رقم | آگئی تیئیس نومبر کی گذشتہ شامِ غم

گیا مصروفِ ماتم، پھر جہانِ علم و فن — وقفِ غم پھر ہوگئی دنیائے قرطاس و قلم
مسندِ استاذ پھر سونی نظر آنے لگی — بن گئی بزمِ معارف پھر سراپا بزمِ غم
زمزمے حکمت کے ہیں اب وہ نہ نکتے علم کے — ہوگئی ہے کس کے ماتم میں جبینِ خامہ خم
دیر سے روشن تھی جو وہ شمعِ دانش بجھ گئی — ہے بجا گر ہیں سیہ پوش آج اسرارِ حکم
کس کی محفل میں قلم اسکا ہو اب معجز طراز — وہ کہ مسجودِ ملک تھا جس کا ہر نقشِ قلم
نسخۂ سیرت ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے — اب کہاں سے لائیں ہم وہ خامۂ معجز رقم
ہم نے مانا منتظر تھی قدس کی محفل، مگر — اس قدر عجلت تھی کیا اے سیدِ والا شیم
کارنامے تیرے مقبولِ حریمِ قدس ہیں — تیری صورت کی قسم، پاکیزہ سیرت کی قسم
سرورِ کونین کے دربار میں ہے مستجاب — زندگی بھر کی تری سعیِ گرامی لاجرم
صرف کردی مدحِ سرکارِ دو عالم میں حیات — تیرے طغرائے شرف کے واسطے یہ کیا ہے کم
تیری ہی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص تھے — طرۂ تاجِ معارف، خاتمِ جود و کرم
تیرے فیضانِ معارف سے سبھی تھے بہرہ مند — ہند سے تا خاکِ پاکستان عرب سے تا عجم
روز اٹھتے ہیں کہاں ایسے رجالِ علم و فن — عصرِ نو میں یہ مبارک زندگی تھی مغتنم
غیر ممکن ہے تلافی آہ اس فقدان کی — تیری ہستی تھی وطن میں نازشِ خیر الامم
سینۂ امت سے مٹ سکتا نہیں ہرگز یہ داغ — کس طرح ملت بھلائے "سید الملت" کا غم
تیرے اس عزمِ سفر کی ہم کو کیوں ہوتی خبر — دیر سے تھے وہ تیری بزم سے اے محترم
آہ کیا معلوم تھا اے سید و مولائے ما — محفلِ امکاں سے اب اٹھنے کو ہیں تیرے قدم
ورنہ کچھ جلوے جمالِ آخریں کے پاکے ہم — اپنی چشمِ تر میں کر لیتے ادب سے مرتسم

آہ یہ تنہا نہیں اک ملت و امت کا غم
بلکہ ہے سارے جہانِ دانش و حکمت کا غم

صد آہ

از

جناب حکیم سید مصلح الدین صاحب کاظمی

آہ اے سید و علامہ سلیمان صد آہ — آہ اے باعثِ صد نازشِ ہندوستان صد آہ
آہ اے پرچمِ معمورۂ شبلی منزل — آہ اے طرۂ آن شبلیٔ ذیشان صد آہ
آہ اے آنکہ تو غالب و حالی نازان — آہ اے صاحبِ اقبالِ درخشان صد آہ
آہ اے رمز شناسِ ادب و روحِ سخن — آہ اے واقفِ اسرارِ قلندران صد آہ
آہ اے شاہِ سخن، فخرِ زمن، نازِ وطن — آہ ممدوحِ ہمہ گبر و مسلمان صد آہ
آہ اے تبعِ سنت و متبوعِ زمان — آہ اے پیکرِ اوصافِ رسولان صد آہ
آہ اے مجتنبِ جملہ نواہی ز شباب — آہ تا شیب چنان تابعِ قرآن صد آہ
عالمِ عظمتِ سرکارِ دو عالم بکمال — کاتبِ سیرتِ لولاک بدیسان صد آہ
صدقِ بوبکرؓ نظامِ عمرؓ و حبِ علیؓ — بود روشن ز تو با غیرتِ عثمانؓ صد آہ
اختران پرتوِ خود گرچہ فرو می ریزند — بود نورِ تو دگر، اے مہِ تابان صد آہ
آمدی دشتِ سخن گشت گلستانِ بہار — رفتہ، شد ہمہ گلزار بیابان صد آہ
گلشنِ علم و ادب آہ نمودی ویران — کردی آباد مگر شہرِ خموشان صد آہ
ہاتفم گفت بتاریخِ وفاتش ثاقب — رونقِ باغِ ادب آہ سلیمان صد آہ
۱۳۷۳ھ

عیسوی ہم ہمین لہجۂ غم ظاہر کرد
گو بہ استادِ زمان سنت نمایان صد آہ
۱۹۵۳ء

قطعۂ تاریخ

از

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمن اختر کاکوی

پھول پژمردہ ہیں اور کلیاں اداس
روح فرسا کیا خبر لائی صبا

مرثیہ خواں کیوں ہیں مرغانِ چمن
رنگ پھیکا ہو گیا کیوں باغ کا

رہبر قوم و امامِ اہلِ دین
مخزنِ صد علم و زہد و اتقا

فخرِ اشرف، نازِ شبلیؒ حیف حیف
ہائے وہ سیرت نگارِ مصطفیٰ

گلستانِ علم کو تھا جس پہ ناز
وہ گُلِ سرسبد ہی مرجھا گیا

وہ سلیمان باعثِ فخرِ بہار
سوگ میں ہے جس کے سارا انڈیا

ہند ہی کیا عالمِ اسلامیان
وقفِ نالہ وقفِ غم وقفِ بکا

اہلِ ندوہ غم کی اک تصویر ہیں
دارِ شبلی میں ہے اک محشر بپا

روح یہ کس کی چلی سوئے فلک
جس سے روشن ہو گئے ارض و سما

عالمِ بالا سے آئی ہے صدا
مرحبا اھلاً وسھلاً مرحبا

می شود بارانِ رحمت را نزول
بر مزارش روز و شب صبح و مسا

سالِ رحلت اس سے جب پوچھا گیا
بولا اختر فخرِ ملت ہائے وا

آہ سید سلیمان ندوی

از جناب فانی مرادآبادی

آج اک مہرِ درخشاں تیرگی میں کھو گیا
وسعتِ آغوشِ ظلمت میں سویرا ہو گیا

کھلا کر مسکراہٹ رہ گئی غنچوں کی آج
ہو گئی تبدیل اشکوں میں ہنسی پھولوں کی آج

لٹ گیا تاریخ حاضر کا مواد بے شمار
بجھ گئی شمع کمالی چھن گیا جوش بہار

اُف کہ ماہ بزم ندوہ پر گہن طاری ہے آج
دود اسود، ابر تیرہ، نور پر بھاری ہے آج

ایک اعظم گڑھ ہی کیا عالم ہوا ماتم کناں
جسم کیا دل بھی ہیں ملبوس لباس غم کناں

سیرت شاہ دو عالم کا مصنف مر گیا
گو ہر نایاب سے پہلو زمیں کا بھر گیا

مر گیا سید سلیمان؟ کون کہتا ہے ندیم
سو گیا وہ گور میں کس نے کہا تجھ سے ندیم

اُس کی تصنیفات لافانی تو زندہ ہیں ابھی
اُس نے جو سینچے تھے وہ پودے شگفتہ ہیں ابھی

موت اُس کی اصل میں اک دوسری تمہید ہے
ورنہ ہر سعی سلیمان زندۂ جاوید ہے

آنے والے ہر مورخ کے لئے زندہ ہے وہ
جادۂ تاریک میں نجم درخشندہ ہے وہ

اس کی تصنیفات دین گی تقویت اسلام کو
ڈال دین گی گردشوں میں گردش ایام کو

تاریخ وفات حسرت آیات علامہ سید سلیمان ندوی

از

جناب مشتاق راندیری

(۱)

سینہ کوبی میں ہر اک ہے مبتلا
ہے جہان غمگین و دل افگار آج

خلد کا پروانہ سید کو ملا
داخل جنت ہوا وہ سید آج

۱۳۷۳ھ

(۲)

سید عالی وسلیمان جاہ
وہ مورخ وہ فخر ملک عظیم

اُن کو جنت خدا نصیب کرے
جن کی خو تھی تو اضع و تکریم

۱۹۵۳ء

(۳)

موت عالم کی موت عالم ہے
مضطرب ہو رہے ہیں اہلِ دل
بے شبہ سید سلیمان تھے
زبدۂ خلق زینتِ محفل
۱۳۷۳ھ

(۴)

سید با خدا کے مرنے پہ
موت کو موت بھی نہیں آئی
باغ نسریں یا ہیں خلد میں وہ
جن کے غم میں ہے خلق بولائی
۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخ و تاریخی مادے

راقم تردامن سید مہدی حسن
۱۳۷۳ھ
جادو رقم - سیفِ قلم، علامہ - استاد الکل
۱۳۷۳ھ

علوم اسلام کے جو سے شیر کے فرہاد
سید محمد سلیمان بدر الاسلام
۱۹۵۳ء

غفرہٗ المجید
۱۳۷۳ھ

ہر طرح سے وہ کامیاب ہوئے
اُس کی رحمت سے فیضیاب ہوئے
اپنی خدمات کا صلہ پایا
داخل خلد بے حساب ہوئے
۱۳۷۳ھ

مدرسن رحلتش چو شد ما مور
ہاتفے گفت زاہدے مغفور
۱۳۷۳ھ

ہجری و عیسوی تاریخی مادے

از

جناب نسیم دہلوی

برائے ۱۳۷۳ھ

۱۔ آہ مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی سنوی انا للہ وانا الیہ راجعون

۲۔ آہ علامہ سید محمد سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ،

۳۔ آہ سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ بلند قصر تصنیف بے جان مولٰنا سید محمد سلیمان ندوی مرحوم

۵۔ ادیب دین سید محمد سلیمان ندوی رحلت کرد،

۶۔ ارتحال علامہ جہان سید محمد سلیمان صاحب ندوی

۷۔ یقولون انہ من سلیمٰن وانہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،

۸۔ آہ مقبول دوران عالیجناب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی چل بسے،

برائے ۱۹۵۳ء

۱۔ آہ ہادی مخدوم مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی انا للہ وانا الیہ راجعون،

۲۔ ادیب، مولانا سید محمد سلیمان ندوی غفرلہ اللہ،

۳۔ امیر علم و دین و ادب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ موحد ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی رضوان میں ہیں

۵۔ صاحب اقبال و علم و فضل مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی

۶۔ آہ واحد مورخ اسلام مولانا سید محمد سلیمان صاحب ندوی مرحوم

۷۔ ادیب مولانا سید محمد سلیمان صاحب کراچی پاکستان میں فوت ہوئے

۸۔ حضرت ادیب سید محمد سلیمان صاحب ندوی

قطعۂ تاریخ

از

جناب عطاء الرحمٰن پاروی

کرے کیا کوئی انسان مجبور ہے   خدائی میں حکم قضا ہے اٹل
سید سلیمان ندوی کی موت   ہے ماتم کی جا اور غم کا محل

یہ ان کی نہیں علم و فن کی ہے موت | نہ آنکھوں سے کیوں آئیں آنسو نکل
وہ علامۂ دہر شیریں مقال | کمل صفات و مجسم عمل
عطا کو ہوئی فکر تاریخ کی | تو یہ مادہ خود ہی آیا نکل

نہ کچھ تعمیہ اور نہ کچھ تخرجہ
غم عالم بے بدل با عمل

۱۳۷۳ھ

قطعۂ تاریخ ارتحال

از

جناب اصطفا خان صاحب لکھنوی

اہل مرتبت سید سلیمان ندوی

بفردوس سید سلیمان ندوی | ز دار فنا رفت شادان و فرحان
سبک گام چون بود بر جادۂ دین | گران بود منزل چہ سان گشت آسان
نماز عشا کرد او از اشارہ | بہ پیک اجل گفت لبیک شادان

گفت اصطفا سال رحلت ہجری
دلا شیخ الاسلام سید سلیمان

۱۳۷۳ھ

مجلسِ ادارت

(طابع و ناشر صدیق احمد)